جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن سید
محمد سجادؒ سیمینار منعقدہ ۱۵ ستمبر ۲۰۱۸ء میں پیش کردہ مقالات کا مجموعہ

مرتب

اختر امام عادل قاسمی

کنوینر مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد سیمینار

مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف ضلع سمستی پور (بہار)

جمعیۃ علماء الہند

”اذکروا محاسن موتاکم“(أبو داؤد)

تذکرۂ ابوالمحاسنؒ

جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجادؒ سیمینار (منعقدہ ۱۵؍دسمبر ۲۰۱۸ء) میں پیش کردہ مقالات کا مجموعہ

مرتب:

اختر امام عادل قاسمی

کنوینر مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد سیمینار

مہتمم جامعہ ربانی، منورواشریف، ضلع سمستی پور (بہار)

ناشر

جمعیۃ علماء ہند

۱- بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی-۲

تفصیلات

نام کتاب	:	تذکرۂ ابوالمحاسنؒ
مرتب	:	اختر امام عادل قاسمی (کنوینر مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد سیمینار)
سن اشاعت	:	۲۰۱۹ء
طباعت	:	شیروانی آرٹ پرنٹرس، دہلی
صفحات	:	٦٨٨
قیمت	:	چھ سو پچاس روپے Rs. 650/-
ناشر	:	شعبۂ نشر و اشاعت، جمعیۃ علماء ہند ۱- بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی-۲

ملنے کا پتہ:

الجمعیۃ بک ڈپو، گلی قاسم جان، دہلی-١١٠٠٠٦

مندرجات تذکرۂ ابوالمحاسنؒ

باب چہارم: افکار و نظریات

باب پنجم: تأثرات و اعترافات

اظہارِ تشکر

از: محمود اسعد مدنی، ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے جمعیۃ علماء ہند کی صد سالہ تقریبات کا پہلا سیمینار ’مفکرِ اسلام ابوالمحاسن حضرت مولانا سیّد محمد سجاد علیہ الرحمہ کی حیات وخدمات‘ پر ۱۵؍دسمبر ۲۰۱۸ء کو انعقاد پذیر ہوا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔ مولانا مرحوم جمعیۃ علماء ہند کے اُن معماروں میں سے تھے جن کو جمعیۃ علماء ہند کا دماغ سمجھا جاتا تھا۔ تاعمر کامل اخلاص کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے سرگرم عمل رہے۔ تاریخِ جمعیۃ میں شاید آپ کو ہی یہ خصوصیت حاصل ہوئی کہ آپ کے سانحۂ ارتحال (۱۸؍شوال ۱۳۵۹ھ) کے بعد آپ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ۲۸؍شوال ۱۳۵۹ھ مطابق ۲۹؍نومبر ۱۹۴۰ء کو پورے ملک میں جمعیۃ علماء ہند کی اپیل پر ’یومِ سجادؒ‘ منایا گیا۔

’تذکرۂ ابوالمحاسن‘ کے نام سے یہ مجموعہ مذکورہ سیمینار میں پیش کیے گئے وقیع علمی اور تحقیقی مقالات کا حسین گلدستہ ہے جس کو سیمینار کے کنوینر حضرت مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی زید کرمہم نے بڑی خوبی کے ساتھ سجایا ہے۔ مولائے کریم موصوف کو اس کی بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے، آمین۔

اسی کے ساتھ یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مقالات میں پیش کردہ آراء سے جمعیۃ علماء ہند کا اتفاق ضروری نہیں، صرف دیانۃً ان کو باقی رکھا گیا ہے، بالخصوص بعض مقالہ نگار حضرات نے مولانا مرحوم کو جمعیۃ علماء ہند کا بانی لکھا ہے جو حقیقتِ واقعہ کے خلاف ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے تاسیسی اجلاس منعقدہ ۲۲؍نومبر ۱۹۱۹ء بمقام دہلی اور آئینی و دستوری اجلاس منعقدہ ۲۸؍دسمبر ۱۹۱۹ء تا یکم جنوری ۱۹۲۰ء بمقام امرتسر میں مولانا مرحوم کی شرکت نہیں ہوئی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں مختصر حالات انعقاد جمعیۃ علماء ہند، جمعیۃ علماء کیا ہے، ص......)

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کے قیام سے قبل آپ علماء کی جماعت کے قیام کے لیے کوشاں وسرگرداں تھے اور صوبائی سطح پر ۱۹۱۷ء میں ’انجمن علماء بہار‘ قائم فرما چکے تھے۔

میں تمام مقالہ نگار حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی بلند پایہ علمی تحقیقات نے سیمینار کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور سیمینار کے کنوینر حضرت مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی زید مجدہم کا ممنون ومشکور ہوں جن کی انتھک جدوجہد اور مخلصانہ توجہ ولگن نے ہم خدامِ جمعیۃ کو اس ادائیگیٔ فرض میں بھرپور سہولت بہم فرمائی۔ جزاہم اللہ خیراً

محمد اسعد مدنی

۲۹؍فروری ۲۰۱۹ء

پیش گفتار

مفتی اختر امام عادل قاسمی
کنوینر مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد سیمینار

الحمدالله و کفی و الصلوٰۃ و السلام علیٰ نبینا محمدالمصطفیٰ

مفکر اسلام حضرت علامہ مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجادؒ اپنے عہد کی منتخب روزگار شخصیت تھے، آپ جاز نیری سادات کی ایک گمنام شاخ کے فرد تھے، صلاح وتقویٰ اور دوسروں کے کام آنے کی سرشت شروع سے اس خاندان میں رہی ہے، زمینداری کے باوجود اس گھرانے کے افراد دنیا طلبی اور حب جاہ و مال سے ہمیشہ دور رہے، آپ کے والد ماجد مولوی سید حسین بخش ایک فیاض اور متواضع بزرگ تھے، راجگیر کے راستے پران کا گاؤں ''پنہسہ'' واقع تھا، مہمانوں اور مسافروں سے ان کا دیوان خانہ ہمیشہ آباد رہتا تھا—آپ کے بڑے بھائی صوفی احمد سجاد صاحبؒ ایک فانی فی اللہ اور مجذوب صفت شخص تھے، انہوں نے اپنی ساری جائداد خلق خدا کے لیے چھوڑ دی تھی اور خود جنگل جنگل گھومتے رہے، مجاذیب اولیاء اللہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، والد کے بعد حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی سرپرستی بھی انہوں نے کی۔ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کے اکلوتے صاحبزادے مولانا حسن سجادؒ (فاضل دیوبند) تحریک خلافت کے پرجوش کارکنوں میں تھے، خلافت پر اپنی جان قربان کردی، تحریک خلافت کی حمایت میں باڑھ (ضلع پٹنہ) کے مقام پر ایک پرجوش تقریر کی اور اسی جرم میں گرفتار ہوئے، جیل گئے اور پھر بیمار پڑے اور داعی اجل کو لبیک کہا، شادی کی تاریخ طے تھی؛ مگر حوران بہشتی ان کے استقبال کے لیے پہلے سے منتظر تھیں۔ غرض!

این خانہ ہمہ آفتاب است

حضرت مولانا محمد سجادؒ نے خود کو دین وملت اور انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کردیا تھا، اپنے جملہ کمالات وفضائل، اور حصولیابیوں کے تمامتر مواقع واسباب کے باوجود اپنے یا اہل وعیال کے لیے کوئی مادی سرمایہ جمع نہیں کیا، ایک چھوٹا سا مکان بھی نہ بنوا سکے، بلکہ ملی مصروفیات کے ہجوم میں موروثی زمینوں پر بھی توجہ نہ دے سکے اور وہ نیلام ہوگئیں، اس وقت کی ہر بڑی تنظیم

اور جماعت میں بنیادی حصہ داری کے باوجود کبھی عہدوں اوراعزازات کی دوڑ میں شامل نہیں ہوئے، بڑے بڑے کام نہیں کارنامے انجام دیئے؛ لیکن بوریہ نشیں رہے، آپ نے اپنے عہد کے کئی اداروں کو عظمت بخشی، کئی ادارے اور جماعتیں آپ کے دم سے وجود میں آئیں؛ لیکن ہرنمائش سے دور رہے، واقعی مولانا محمد سجادؒ جیسی ہستیاں تاریخ میں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا کی شخصیت کا بڑا امتیاز یہ تھا کہ جہاں رہے وہاں روشنی تقسیم کی، اپنے جسم وجان کی تمامتر توانائیاں صرف کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا؛ اسی لیے آپ کی حیثیت ہر جگہ ممتاز رہی اور آپ ادارہ کے دماغ اور روح رواں بن کر رہے، الٰہ آباد میں ایک عرصہ تک اس شان سے رہے کہ جیسے اس شہر میں آپ کے علاوہ کوئی مفتی ہی نہ ہو، جب آپ وہاں سے رخصت ہونے لگے، تو پورا شہر اسٹیشن پر موجود تھا، اور سب کی زبان پر تھا کہ آج الٰہ آباد سے فقہ رخصت ہو رہی ہے۔ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف، مدرسہ انوارالعلوم گیا، انجمن علماء بہار اور امارت شرعیہ کے تو سب کچھ آپ ہی تھے، آپ کا وصال ہوا تو علامہ سید سلیمان ندویؒ نے کہا کہ 'بہار کی تنہا دولت وہی تھے۔ جمعیۃ علماء ہند اور تحریک خلافت کے بھی بانیوں میں تھے اور آخر تک آپ ان کے مرکز اعصاب کی حیثیت سے رہے اور کوئی عہدہ نہ رکھنے کے باوجود کوئی ایسا محاذ نہ تھا، جہاں آپ کے نقوش قدم موجود نہ ہوں۔ اسلامی سیاست، اسلامی قانون اور آئینی آگہی میں تو وہ رسوخ حاصل تھا کہ اکابر واصاغر سب آپ کا لوہا مانتے تھے، حضرت مولانا منظور نعمانی فرماتے تھے کہ میرے بس میں ہوتا تو میں خاص طور پر نوجوان علماء پر فرض قرار دیتا کہ ''مولانا کی صحبت میں رہ کر کچھ دن تربیت حاصل کریں''۔

آپ نے اپنی شخصیت سے زیادہ اپنے کام کو اہمیت دی، ہمیشہ کام کو آگے اور خود کو پیچھے رکھا، کام کی ایسی فنائیت کہ اپنا سب کچھ اس کے لیے قربان کردیا، اس شعر کا آپ سے بہتر مصداق ماضی قریب کے ہندوستان نے نہیں دیکھا:

پھونک کر اپنے آشیانے کو
روشنی بخش دی زمانے کو

جمعیۃ علماء ہند آپ کی آرزوؤں کا مرکز اور زندگی بھر کی محنتوں کا حاصل تھی، دم آخر تک اس

کی خدمت کی اوراس کے قافلہ سالار رہے، یہ آپ کی بنیادی شناخت تھی، اس پلیٹ فارم سے آپ نے ملک وملت کی وہ عظیم خدمات انجام دیں جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی، آپ نے جمعیۃ علماء ہند کی ایک جامع تاریخ ''تذکرہ جمعیۃ علماء ہند'' کے نام سے لکھی تھی، جس کو حکومت نے شائع ہونے کے بعد ضبط کرلیا، اگر وہ تاریخ محفوظ ہوتی تو جمعیۃ علماء ہی نہیں؛ بلکہ پوری ملت ہندیہ کو اس آئینہ میں دیکھا جاسکتا تھا۔

بڑی قابل مسرت بات ہے کہ آج جمعیۃ علماء ہند ایک صدی کا سفر مکمل کرنے جارہی ہے یقیناً یہ انہی بزرگوں کے سوز جگر اور صدق وخلوص کا ثمرہ ہے، اس موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند نے یہ تاریخی فیصلہ لیا کہ ان اکابر کے اعتراف خدمات کے طور پر ان کی حیات وخدمات پر سیمینار کرائے جائیں؛ تاکہ نئی نسل ان سے روشنی حاصل کرے، یقیناً حضرت مولانا سجادؒ کی شخصیت جامع کمالات اور مرکزی اہمیت کی حامل تھی۔

چنانچہ آج سے چند ماہ قبل جب اس سیمینار کا اعلان کیا گیا، تو اہل علم اور اصحاب قلم نے پوری گرم جوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اپنے قیمتی نگارشات سے ہمیں سرفراز کیا، جن میں شخصیت سجاد کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عہد حاضر میں سیرت سجاد اور افکار سجاد کی معنویت پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، ہم ان تمام اہل علم کے ممنون ہیں جنہوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور اس اہم کام کے لیے اپنا قیمتی وقت فارغ کیا، **فجزاهم الله أحسن الجزاء**. (آمین)

ہمیں امید ہے کہ تاریخ ساز سیمینار کی طرح ہماری یہ پیش کش بھی دستاویزی نوعیت کی حامل قرار پائے گی۔ (ان شاءاللہ)

یہ مجموعہ ''تذکرۂ ابوالمحاسن'' جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کو محض پچھلی چیزوں کا اعادہ تصور نہ کیا جائے؛ بلکہ اس میں بہت سی نئی چیزیں بھی شامل ہیں، جو پہلی بار تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں آئی ہیں، اس کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوگا، جب آپ اس کا خود مطالعہ کریں گے؛ لیکن بطور تعارف چند چیزوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں:

☆ حضرت مولانا سجاد کے خاندان اور علاقہ کے بارے میں پچھلی کتابوں میں بہت کم معلومات ملتی ہیں، جب کہ خاندان اور وطن کے احوال بھی تاریخ کا حصہ ہیں، کسی انسان کی سیرت اس کے مقامی حالات اور علاقائی پس منظر سے کٹ کر مکمل نہیں ہوسکتی، اس مجموعہ میں آپ کے خاندانی احوال اور علاقہ کے جغرافیائی، تمدنی اور دینی پس منظر پر پہلی مرتبہ تفصیل سے

روشنی ڈالی گئی ہے، مولانا ہی کے ہم وطن جناب مولانا کفیل احمد ندوی (بہار شریف) نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ افراد خاندان سے مل کر اور متعلقہ کاغذات کا مطالعہ کر کے ایک اہم تاریخی دستاویز تیار کر دی ہے۔ (جزاہ اللہ)

☆ مولانا سجاد مدرسہ کے آدمی تھے، مدرسہ نے ہی ان کو تیار کیا انہوں نے ایک طویل عرصہ تک مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیں، تعلیم و تدریس آپ کی زندگی کا اہم ترین باب ہے؛ لیکن مولانا کی ملی اور سیاسی خدمات پر جو توجہ دی گئی، وہ اس حصہ پر نہیں دی گئی اور مولانا کی قائدانہ حیثیت کو جس قوت کے ساتھ نمایاں کیا گیا، آپ کی معلمانہ حیثیت کو نہیں کیا گیا، آپ پر شائع شدہ مقالات کے پڑھنے سے بادی النظر میں مولانا محض ایک ملی رہنما اور قومی لیڈر محسوس ہوتے ہیں، بلاشبہ مولانا کی قائدانہ حیثیت بے حد بلند ہے؛ لیکن مولانا اصلاً علمی آدمی تھے اور اس کا اظہار آپ کی علمی و تدریسی زندگی کی تفصیلات کے بغیر نہیں ہوسکتا؛ اس لیے ضرورت تھی کہ مولانا کی زندگی کے اس حصہ کو بھی سامنے لایا جائے؛ تاکہ آپ کی علمی حیثیت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس حقیر نے آپ کی شخصیت کے اس حصہ پر ایک مقالہ تحریر کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ پچھلی معلومات کو اس طرح مرتب کر دیا جائے کہ آپ کی زندگی کا یہ گوشہ بڑی حد تک روشنی میں آجائے۔ مولانا مفتی محمد نذر توحید مظاہری (چترا جھارکھنڈ) اور مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند کے قیمتی مقالات بھی اسی موضوع پر ہیں۔

☆ حضرت مولانا سجاد صاحب اپنے زمانہ کے بڑے فقیہ تھے، وہ فقہ و قانون کی بے نظیر مہارت رکھتے تھے، جن علماء کی آپ سے ملاقاتیں ہوئیں، انہوں نے آپ کی فقہی اور قانونی بصیرت کا اعتراف کیا۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ اور حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ یہ تمام حضرات آپ کی فقہی دقیقہ رسی اور بالغ نظری کے معترف تھے، علامہ کشمیریؒ اور علامہ عثمانیؒ آپ کو فقیہ النفس کہتے تھے؛ لیکن مولانا کی شخصیت اس میدان میں جس قدر بلند تھی، اتنا ہی اس موضوع پر کم لکھا گیا، بعض اہل علم کی مختصر اور قیمتی تحریریں ضرور موجود ہیں؛ لیکن ضرورت تھی کہ اس پر مزید تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے؛ تاکہ مولانا کا فقہی مقام نئی نسل کے سامنے نکھر کر آسکے۔ مولانا مفتی عتیق احمد بستوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مفتی سعید الرحمٰن قاسمی مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ اور حقیر راقم الحروف نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے اور مولانا کے فقہی اور قانونی حصہ

کا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، مولانا کی فقہی بصیرت پر اتنی تفصیل کے ساتھ پہلے نہیں لکھا گیا تھا۔

☆ عصر حاضر میں ملکی اور عالمی حالات کے تناظر میں افکار سجاد کی بڑی معنویت ہے، یہ بہت حساس اور اہم مسئلہ ہے؛ لیکن پچھلے مطبوعہ ذخیرے میں اس پہلو کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی، حالاں کہ مفکرین ملت ہر دور میں مولانا محمد سجاد کے افکار کو رہنما خطوط کی حیثیت سے دیکھتے رہے ہیں۔ پہلی بار زیر نظر مجموعہ میں اس موضوع کو خاص ہدف بنایا گیا، کئی اصحاب علم نے اس پہلو پر اپنی قلمی کاوشیں ہمیں ارسال کیں، ان میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب جنرل سیکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، ڈاکٹر فہیم اختر ندوی صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسیٹی حیدرآباد، ڈاکٹر ابوبکر عباد دہلی یونیورسیٹی دہلی، مولانا عبدالحمید نعمانی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

☆ مولانا محمد سجادؒ جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں میں ہیں، مولانا اس کے قیام سے لے کر تا حیات جمعیۃ سے وابستہ رہے اور اس کے ذمہ دارانہ منصب پر بھی فائز رہے، اس میدان میں بھی آپ کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، خود امارت شرعیہ کا قیام بھی جمعیۃ علماء ہی کے پلیٹ فارم سے عمل میں آیا؛ لیکن جمعیۃ علماء ہند کی نسبت سے آپ کی خدمات کا تذکرہ بہت کم کیا گیا؛ بلکہ اب رفتہ رفتہ نئی نسل یہ بھولتی جارہی ہے کہ مولانا محمد سجاد کا جمعیۃ علماء ہند سے کیا تعلق تھا؟ اس مجموعہ میں رفیق مکرم مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری صاحب کا مقالہ اسی موضوع پر ہے، اور حقیر راقم الحروف نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔

☆ یقیناً انسان کی شخصیت کی تعمیر میں اس کے اساتذہ کا بڑا کردار ہے، اب تک کے لٹریچر میں مولانا محمد سجادؒ کی تعلیمی زندگی اور آپ کے اساتذۂ کرام کے احوال کا حصہ انتہائی تشنہ رہا ہے، عام طور پر صرف دو تین اساتذہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور وہ بھی غیر محقق طور پر، اس مجموعہ میں مولانا طلحہ نعمت ندوی استھانوی کا مقالہ اسی موضوع پر ہے، جس میں آپ کے تمام اساتذہ کی ممکنہ تفصیلات ذکر کی گئی ہیں، یہ بھی اس مجموعہ کی اہم حصولیابی ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی ابواب ہیں، جن پر اب تک کام نہیں ہوسکا ہے، مثلاً: ☆ مولانا سجاد کی طالب علمانہ زندگی اور تعلیمی ادوار کی تفصیلات، ☆ آپ کی روحانیت، بیعت طریقت اور آپ کی خانقاہی زندگی، ☆ آپ کی قانونی وآئینی بصیرت اور قوانین عالم پر آپ کی نگاہ، ☆ آپ کا نظریۂ تعلیم اور تعلیمی افکار ومساعی وغیرہ، میری خواہش تھی کہ ان موضوعات پر بھی

کچھ تفصیلی تحریریں شامل ہوں؛ لیکن اس میں کامیابی نہیں مل سکی۔ اللہ نے چاہا تو کسی اور طریقہ سے اس کی تلافی کی جائے گی۔

مولانا کی ملی وسیاسی خدمات میں امارت شرعیہ، نظام قضا اور آپ کی سیاسی پارٹی پر پہلے بھی بہت کافی لکھا جاچکا ہے اور اس مجموعہ میں بھی اس موضوع پر قیمتی تحریریں موجود ہیں؛ اس لیے کہ مولانا کی زندگی کے یہ وہ ابواب ہیں جن کے بغیر حیات سجاد کا تصور نہیں کیا جاسکتا؛ اس لیے تکرار مضامین کے باوجود ایسے مقالات شامل کئے گئے ہیں، البتہ ان میں بعض نئے گوشے بھی آگئے ہیں، جن کا پہلی کتابوں میں کوئی تصور نہیں تھا، اس باب میں جناب مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی چیرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ دہلی کا مقالہ انتہائی قیمتی ہے ان کے مضمون نے تاریخ کے بہت سے نایاب گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے، اور انہوں نے بڑے اعتدال اور توازن کے ساتھ امارت وجمعیۃ کی تاسیس کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے، حضرت مولانا شاہ ہلال احمد قادری خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کی تحریر بھی بہت اہم ہے انہوں نے بڑی صاف گوئی اور حقیقت پسندی کے ساتھ تحریک امارت کا جائزہ لیا ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم مظفرپوری صاحب قاضی شریعت امارت شرعیہ پٹنہ اور مفتی اشرف عباس صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند نے نظریۂ امارت کو قرآن وحدیث اور فقہی نصوص سے مدلل کیا ہے اور شکوک وشبہات کے گرد وغبار صاف کئے ہیں اور امارت شرعیہ کے تعارف پر مولانا نورالحق رحمانی صاحب استاذ المعہد العالی امارت شرعیہ کا مقالہ بھی بہت اہم ہے۔

اس موقعہ پر میں بحیثیت کنوینر جملہ اہل قلم کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند کے اکابر وذمہ داران کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، بالخصوص امیر الہند حضرت مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند، جمعیۃ علماء ہند کے فعال ناظم حضرت مولانا سید محمود اسعد مدنی صاحب اور حضرت مولانا معزالدین صاحب ناظم ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند کی خدمات عالیہ میں کلمات تہنیت وتشکر پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اس عظیم کام کا بیڑہ اٹھایا اور محض اپنے حسن ظن کی بنیاد پر سیمینار کی علمی ذمہ داری اس حقیر کے حوالے کی، اللہ پاک ان سب کو جزائے خیر سے نوازے۔ (آمین)

ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم

باب اول

شخصی حالات

(عہد، خاندانی پس منظر اور تعلیم و تربیت)

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ

عہد اور خاندان

ڈاکٹر محمد کفیل احمد ندوی
محلّہ بیل تل، بہار شریف نالندہ (بہار)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۸۰ء مطابق ۱۳۰۱ھ میں صوبہ بہار کے نہایت زرخیز خطہ میں پیدا ہوئے، جس کا نام نالندہ ہے، یہ نہایت قدیم زمانہ سے علم ومعرفت کی سرزمین رہی ہے، اس مقام کے علم وعرفان کی اہمیت وشہرت گپت عہد ۴۱۳ ق م سے جاری ہے، ہندوستان کے علمی، فکری، روحانی، ثقافتی، تہذیبی اور تربیتی عروج کی ابتدا اسی علاقہ سے ہوئی ہے۔(۱) اسی طرح دنیا کے قدیم اور بڑے مذاہب میں سے بدھ اور جین کی فکری ونظری ہلچل کا مرکز یا استھان یہی نالندہ ہے، جہاں راجہ کمار گپت اول نے عالمی شہرت یافتہ یونیورسٹی کی تعمیر کی تھی، جس کے کھنڈرات دنیا سے آنے والے زائرین ومشاہدین کو آج بھی محوِ حیرت بنانے کے لیے کافی ہیں، عربی میں ترجمہ کی ہوئی مشہور کتاب ''کلیلہ ومنہ'' کا سنسکرت متن اور مکمل مواد اسی علاقے میں تیار ہوا تھا، آج تک پوری دنیا کی زبانوں میں اس کے تراجم ہورہے ہیں، سنسکرت ادبیات کا نشوونما، چانکیہ کی آئین وقانونی دستور کی تدوین اسی خطہ میں ہوئی تھی۔

اسی طرح ہندوستان میں جب مسلم بادشاہوں کی حکومتیں آئیں تو بادشاہ قطب الدین ایبک سے لے کر بادشاہ شمس الدین التمش تک، پھر اس کے بعد شاہ عالم نابینا کے زمانہ تک نالندہ کے اطراف واکناف میں علم وعرفان کی بہاریں چھائی رہیں۔(۲)

نالندہ کے چہار جانب بہت ساری مسلم بستیاں تھیں اور اکثر آج بھی موجود ہیں، جہاں سے علم کی شعائیں ملک اور بیرون ملک میں پھیلیں، مثلاً: اوگانواں (۳)، شکراواں، شیخ پور، پیڑھوکہ، معافی، بلچھی، چند پورہ، میرداد، عماد پور، چندوارہ، رمضان پور، بربیگھہ، سلاؤ، راجگیر، اسلام پور، ہلسہ، دیسنہ، سرہدی، بڑاکر سکندر پور، ڈیاواں، دنیاواں، ڈمراواں (رمضان پور ڈمراواں)، سبیت، میزرہ، مولانا ڈیہہ، پلووا، کہٹا، انڈوس، بیر بیگھہ شریف، پیٹھانہ، جمواواں وغیرہ۔

نالندہ کے گردوپیش کی تواریخ، علماء کرام کے تذکرے، خدمات اوران کے کارنامے

حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالحئی رحمہ اللہ سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مایہ ناز کتاب اور سوانحی اور تاریخی دستاویز ''نزہۃ الخواطر'' میں مندرج ہیں، جو اہل تحقیق کے لیے نہایت اہم ہیں اور نہایت مددگار ہیں۔

نالندہ کے اس علاقے کے بہت سے علما کی کتابیں، مصر، حجاز، عراق، مغرب، خراسان، ماوراء النہر وغیرہ میں پڑھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ اسی نالندہ میں ڈھائی ہزار سالہ قدیم نالندہ یونیورسٹی سے بالکل متصل ایک بستی ہے، جس کا نام پنہسہ اسی بستی میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کی جائے پیدائش ہے، پنہسہ کا وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے تین طرف پانی سے بھرے ہوئے تالاب تھے، ایک طرف سرسبز وشاداب زمین تھی، اسی وجہ سے اس جگہ کا نام پنہسہ ہو گیا، دراصل پنہسہ لفظوں سے مرکب ہے، پن+ہاس اسی مرکب کی معمولی تبدیلی سے پنہسہ ہو گیا؛ یعنی پانی والا علاقہ، آج بھی پنہسہ میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی جو حویلی کے نقوش و دیار اور منقسم شدہ مکانات ہیں، اس کے پورب جانب بالکل متصل بڑا سا تالاب ہے۔

پنہسہ کی آبادی محی الدین عالمگیر اورنگ زیب کے زمانہ کی ہے، اس سے پہلے یہاں کے لوگ سلاؤ میں رہتے تھے، وہیں آباد تھے، وہیں ان لوگوں کی حویلی تھی، جس کے آثار اور نشانات آج بھی موجود ہیں، اسی طرح حویلی سے ملی ہوئی مسجد بھی تھی، جو ابھی تک موجود ہے اور وہ سلاؤ ڈبہ کی مسجد کہلاتی ہے، سلاؤ ڈبہ سے ہٹنے اور پنہسہ میں منتقل ہونے کے وجوہات واسباب کا سراغ نہیں مل سکا۔

مولانا کا عہد ولادت:

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کی ولادت ایسے پرآشوب اور پرفتن زمانہ میں ہوئی، جب ہندوستان سے سات سو سالہ مسلم حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا، ۱۸۵۷ء کا خون آشام واقعہ پیش آچکا تھا اور پورا ہندوستان انگریزی حکومت کا غلام ہو چکا تھا، ہندو مسلمان یہاں محکوں کی زندگی گذار رہے تھے، مسلم شرفا کے گھرانے کے لوگ بجائے مصر وحجاز اور دمشق وبغداد کی اسلامی تعلیم گاہوں میں جانے کے بجائے امریکہ، انگلستان اور یورپ وغیرہ کی یونیورسٹیوں اور درسگاہوں میں داخلہ لینے میں فخر محسوس کرنے لگے تھے، سرسید (۹۸-۱۸۹۷ء) نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد ڈال دی تھی، یہیں سے اس وقت عہد جدید اور پیروی مغرب کا نعرہ بلند ہونے لگا تھا، جیسا کہ سرسید کے رفیق مولانا حالی نے اپنے اس مصرعہ کے ذریعہ اپنی جدید

تعلیمی تحریک کی ترجمانی کردی تھی۔

حالی اب آؤ پیروی مغرب کریں

انہی نامساعد حالات اور آزمائش سے بھرے ہوئے ادوار میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے پنہسہ میں اپنی پیدائش کے بعد آنکھ کھولیں، یہ صفر کا مہینہ تھا، گھر میں خوشحالی، فارغ البالی تھی، آپ کی پیدائش پر گھر پر خوشی منائی گئی، آپ کے والد مولوی حسین بخش نے آپ کا نام محمد سجاد رکھا، کنیت ابوالمحاسن رکھی گئی، جو مستقبل میں اسم بامسمی ثابت ہوئی۔

ابھی بچپن کے چار سال ہوئے تھے کہ ۱۳۰۴ھ میں شفیق والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، صوفی مولوی احمد سجاد بڑے بھائی تھے، جو زہد وتقویٰ کی وجہ سے صوفی صاحب کہلاتے تھے، سرپرست ہوئے، ان کی سرپرستی میں گاؤں کے ایک مولوی صاحب سے اپنے گھر کے دلان پر چھ برس کی عمر میں پڑھنے کے لیے بیٹھائے گئے، قرآن کا قاعدہ، اردو کا قاعدہ، ناظرہ قرآن اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاسل کی۔

نو برس کی عمر میں ۱۳۱۰ھ میں مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں عربی کی ابتدائی تعلیم شروع کی، کچھ دنوں کے بعد کانپور میں مشہور زمانہ استاذ الکل حضرت مولانا احمد حسن کانپوری کے حلقہ درس میں شریک ہوئے، عمر کے پندرہ سالوں تک زندگی میں حصول تعلیم کا کمال شوق پیدا نہیں ہوا تھا، جب تعلیم کا شوق وذوق بڑھا تو کانپور سے دیوبند گئے، کسی مجبوری کی وجہ سے دیوبند چھوڑ کر ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں داخلہ لے کر پوری ہمہ جہتی سے ۱۳۲۲ھ تک مروجہ علوم وفنون حاصل کرتے رہے۔

قدم چوم لیتی ہے خود بڑھ کے منزل
مسافر اگر اپنی ہمت نہ ہارے

۱۷، ۱۸، ۱۹/ربیع الاول ۱۳۲۲ھ مطابق ۳، ۴، ۵/جون ۱۹۰۵ء کو مدرسہ سبحانیہ میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی رسم دستار بندی ادا کی گئی، (۴) تقریباً سولہ برس حصول تعلیم میں، سترہ، اٹھارہ برس تدریس اور تیئیس برس تحریک، تنظیم، جمعیت اور امارت کی تشکیل میں گذاری۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ نے اپنی زندگی کی آخری دو دہائی میں وطن عزیز ہندوستان اور اس کے باشندگان کے حالات ومشکلات کا جائزہ لیا اور غائرانہ مطالعہ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے افکار ونظریات اور حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کے

جذبۂ جہاد اور اسلامی حمیت اور ملی غیرت، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا سید بدر مجیبی، شاہ محی الدین قادری پھلواری رحمہم اللہ کے جذبۂ اخلاص وللہیت کو امت محمدیہ میں عام کرنے اور پوری ملت اسلامیہ کے لیے ایک رخ، ایک سمت مقرر کرنے، زندگی گذارنے کے لیے الٰی جہت کو متعین کرنے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک ''حزب اللہ'' کو جماعت کی شکل دینے، ایک ملت اور ایک جماعت بننے کے لیے عملی کردار ادا کرنے کے لیے ہر خاص وعام کو ایسی دلگیر اور جہاں گداز آواز دی کہ پوری اسلامیہ ہندیہ نے اس پر لبیک کہا اور تمام علما، مشائخ اور دانشوروں نے بلا اختلاف آپ کی فکر سے کلی طور پر یکجہتی کا اظہار کیا اور سبھوں کی ایک صدا یہ تھی۔

بتان رنگ وخون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی نہ طورانی نہ افغانی

جس کا بہترین ثمرہ اور نتیجہ یہ ہوا کہ سارے علماء ومشائخ امت اور دانشوران ملت متحد ہوئے، سبھوں نے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے درد پنہاں اور امت اسلامیہ کے ساتھ ان کی ہمدردی محسوس کیا اور سمجھا اور سب مل کر مخلصانہ، ہمدردانہ طور پر ایک مضبوط قلعہ بن گئے، چنانچہ حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اسی مضبوط قلعہ کے متحدہ محاذ نے تحریک خلافت، مجلس علماء بہار، جمعیۃ علماء ہند، امارت شرعیہ، بہار مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کے قیام عمل کو پورے طور پر کامیاب بنایا، جس کا اثر یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جو مسلمانوں میں احساس ناکامی، احساس کمتری پیدا ہوئی تھی، وہ امید صبح نو اور امید روز روشن میں بدلی، حالات امید افزا ہوئے، حوصلے بڑھے، خود اعتماد پیدا ہوئی۔

بہر حال مولانا کے طالب علمی سے لے کر تدریسی وتحریکی زندگی میری تحریر کا موضوع نہیں ہے؛ اس لیے میں نے مجمل اشارات پر اکتفا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے، خلط مبحث کے لیے قارئین وسامعین سے معذرت خواہ ہوں؛ لیکن مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی شخصیت اور عہد کا مختصر تعارف بھی ضروری تھا۔

دراصل میرا موضوع حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کا خاندانی پس منظر ہے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے خاندانی رشتے خواہ ان بزرگوں کے ہوں، یا وارثین اولاد در اولاد کے، سبھوں کے درمیان ان کی شخصیت بالکل منفرد، اکیلی، محیر العقول، نہایت معجز، الہامی اور شمس وقمر کی طرح

معلوم ہوتی ہے۔

دھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تائ ثیر ہے جس کی حسرت غم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے آباواجداد کے شجرۂ نسب کی صرف ایک کڑی اوپر سے ملتی ہے، یعنی صرف ان کے والد کی، اس سے آگے کی حسبی ونسبی کڑی جوان کے اصول خاندان کی ہے، نہیں ملتی ہے، کاش مولانا کے ہم عصر تذکرہ نگاروں نے اس اہم امر کی طرف توجہ دی ہوتی اور تحقیق سے کام لیا ہوتا، اسی طرح مولانا کے آل، اولاد، ازواج اور بعد کی نسلوں کی طرف بھی توجہات کی بڑی کمی رہی، سوائے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ امیر شریعت رابع کے کسی نے بھی اس کی طرف زحمت نہیں کی اور خود مولانا کے خاندان کے وارثین، متعلقین، متوسلین اور تلامذہ نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

خاندان سجاد کے اصول وفروع اور شجرۂ انساب اسی طرح حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کے خانگی حالات اور آپ کی اولاد وازواج کی تفصیلات کے سلسلہ میں تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں، چنانچہ میں نے اپنے اس مقالہ میں پھولوں سے رسوں کو کشید کر کے شہد جمع کرنے کی خاطر ''باغ سجاد'' اور ''خاندان سجاد'' تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ ''خاندان سجاد'' پر تحقیقی کام کے سلسلہ کو باقی رکھنے اور مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے؛ تاکہ ان کے خاندانی اور خانگی حالات وواقعات اور ان کے ازواج واولاد کے سلاسل ان کے چاہنے والوں کو مل سکیں اور اس کے ذریعہ ان کی بے لوث دینی، ملی اور قومی خدمات کو خراج عقیدت اور سلام پیش کیا جاسکے۔

حضرت مولانا کا خاندانی پس منظر:

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کا گھرانہ خاندانی اعتبار سے سادات تھا، یہ علاحدہ بات ہے کہ مولانا نے خود، یا اپنے خاندان کو سید یا سادات نہیں لکھا؛ مگر حضرت مولانا مسعود عالم ندویؒ نے اپنی والدہ کا نانیہال پنہسہ بتاتے ہوئے یہ بتایا کہ مولانا ان کی والدہ کے رشتہ میں ماموں زاد بھائی تھے اور اپنے خالہ زاد بہنوئی بھی تھے، (۵) اسی طرح سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے مولانا کا رشتہ سادات سے بتاتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ پنہسہ نام مسلمانوں کا ایک گاؤں ہے، جہاں سادات کے کچھ گھرانے آباد ہیں، انہیں میں سے ایک گھر میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ

الرحمہ کی ولادت ہوئی۔(۶)

ہم اس سے قبل سطور میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ حضرت مولانا کا خاندان مولانا کی پیدائش سے چھ سات آٹھ پست پہلے بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں سلاؤڈبہ سے منتقل ہوکر پنہسہ میں آباد ہوگیا تھا، اسی خاندان کے بزرگ سید نجف تھے، ان کے تین صاحبزادے تھے، ان میں سے ایک اڑیسہ میں، دوسرے دربھنگہ میں اور تیسرے پنہسہ میں آباد ہوئے؛(۷) لیکن افسوس کہ اڑیسہ اور دربھنگہ والے دونوں صاحبزدگان کی تحقیق تادم تحریر نہیں ہوسکی ہے۔

سید نجف کے اصول انساب کی بھی تحقیق نہیں ہوسکی ہے، ہاں! مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہار شریف کے دیہاتوں میں جازنیری سادات پھیلے ہوئے ہیں، یعنی سید احمد جازنیری رحمۃ اللہ علیہ اور سید محمد جازنیری رحمۃ اللہ علیہ دونوں بھائیوں کی اولادوں سے بارہ گاواں اور دیسنہ، بہار شریف، راجگیر، پنہسہ دھنچوہی وغیرہ میں سادات جازنیری کی نسل تاہنوز کسی قدر چلی آرہی ہے، کہا یہ جاتا ہے کہ سید احمد جازنیری(۸) کی اولاد بارا گاواں؛ یعنی جموارہ(۹)، (۲) پتریتا بزرگ، (۳) سید پور کنڈا، (۴) بروئی، (۵) امرتھ، (۶) محمد پور اکساری، (۷) فیروز پور منینڈہ، (۸) مدام پور جانے، (۹) چڑھیاری، (۱۰) رسول پور کٹنی کول، (۱۱) چواڑہ(۱۰)، (۱۲) سانحہ وغیرہ میں پھیلی، پھر پورے ہندوستان، پاکستان اور بیرون ممالک میں پھیلی اور پھیلتی جاری ہے۔

اس طرح سید احمد جازنیری علیہ الرحمہ کے دوسرے بھائی سید محمد جازنیری علیہ الرحمہ کی اولادیں ہرگاواں، بارہ دری، میر دار، اوگاواں، دیسنہ، بہار شریف، راجگیر، پیر بگھہ، گیلانی، استھاواں وغیرہ میں آباد ہیں۔

ممکن ہے کہ سید نجف جو حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کے ابوالاجداد تھے، سید احمد جازنیری علیہ الرحمہ کی اولادیں میں سے ہوں اور سید نجف کی تین اولادوں میں سے جو ایک کی اولاد پنہسہ میں آباد رہیں، انہی کی نسل میں سے بڑی تحقیق کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ سید فریدالدین نام کے ایک شخص پنہسہ میں پیدا ہوئے، ان سے چار اولادیں ہوئِ:

(۱) سید حسین بخش (۲) سید مخدوم بخش

(۳) سید افضال الدین (۴) سید یوسف علی

یہ چاروں اپنے سگے بھائی تھے۔(۱۱)

ان سبھوں کی پنہسہ میں بڑی حویلی تھی، جو ڈیڑھ بیگھہ رقبہ پر محیط تھی، مگر مٹی کی بنی ہوئی تھی،

اس کی موٹی موٹی دیواریں تھیں، اس کے چھتیس کمرے تھے، ایک ہانما دالان تھا۔ (۱۲)

اس کے پورب جانب بڑا تالاب تھا، آج بھی ہے، وہ مکان بہت پُر فضا تھا اور آج دم تحریر بھی حویلی کا بعض حصہ جو مشرقی جانب تالاب کے بالکل کنارے ہے، نہایت پُر فضا ہے، بچپن میں مجھے پنہسہ جانے کا اتفاق ہوا تھا، مولانا کے ایک پرنانا جو مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں پڑھتے تھے، ان کا نام سید تاج الدین تھا، انھی کے ساتھ پنہسہ تقریباً ۱۹۷ء میں گیا تھا، مولانا کی حویلی کا نقشہ پورا تو نہیں، دھندلا سا یاد ہے، حویلی کی حالت نہایت خستہ اور مخدوش تھی، ان دنوں دم تحقیق وتحریر وہ حویلی کئی وارثوں کے درمیان تقسیم ہوکر بہت سارے حصے میں مٹ گئی ہے، اس میں کئی مکانات بن گئے ہیں، اب غور سے مشاہدہ کرنے کے بعد بھی وہ حویلی پہچان میں نہیں آتی۔ (۱۳)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے اپنے دادا سید فریدالدین ایک بڑے کاشتکار تھے، تقریباً ان کے پاس پانچ سو بیگھہ کاشت تھی، جیسا کہ میری معلومات میں ان کے اعزہ واقربا کی یاد سے حاصل ہوا ہے، (۱۴) سید فریدالدین کے چار بیٹے تھے، جیسا کہ میں نے مذکورہ سطور میں سادات جازنیر کی نسل کے علاقے کے ذیل میں بتایا ہے، ان میں سے بڑے بیٹے کا نام مولوی سید حسین بخش ہے، منجھلے کا نام سید مخدوم بخش ہے، سنجھلے کا نام سید افضال الدین اور چھوٹے کا نام سید یوسف علی تھا، تحقیق کے باوجود اب تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ سید فریدالدین کی لڑکیاں تھیں یا نہیں؟ ہاں! اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ سید فریدالدین کے پہلے بیٹے سید حسین بخش اور چھوٹے سید یوسف علی ہم زلف تھے، دونوں کی شادیاں سید داؤد علی کی دو بیٹیوں سے یعنی مولوی سید حسین بخش کی شادی بی بی بصیرن (بصیرالنساء) اور سید یوسف علی کی شادی بی بی نصیرن (نصیرن النساء) سے ہوی تھی، اس اعتبار سے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی چھوٹی چچی اپنی خالہ بھی ہوئیں اور چھوٹے چچا اپنے خالو بھی ہوئے، ان دونوں بھائیوں اور ان کی اولاد کے درمیان قرابت دہری تھی اور سید داؤد علی حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے نانا تھے اور وہ بھی پنہسہ کے باشندہ تھے، جیسا کہ ۱۸۹۳ء کے ایک وثیقہ سے اس کی توثیق ہوتی ہے، اسی طرح یہ بھی کہ سید حسین بخش کی زوجہ بی بی بصیرالنساء عرف بصیرن تھیں اور سید یوسف علی کی زوجہ نصیرالنساء عرف نصیرن تھیں، یعنی دونوں بہنیں دو بھائیوں سے ایک ہی گھر میں بیاہی گئیں تھیں۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کے چاروں چچا حضرات میں اکثر کی اولادیں پنہسہ اور بہار شریف میں آباد اور سکونت پذیر ہیں، کچھ لوگ پاکستان، امریکہ، لندن وغیرہ کے

علاوہ دوسرے صوبے بالخصوص جھارکھنڈ وغیرہ میں بھی مقیم ہیں۔

سید مولوی حسین بخش، سید مخدوم بخش، سید افضال الدین، سید یوسف علی کی اولادوں سے پنہسہ میں سادات گھرانے کی تعداد تیس زائد ہیں، اس کے علاوہ بھی مسلمانوں کے ستر سے زیادہ گھرانے کے لوگ آباد ہیں، یہاں کی آبادی لب سڑک ہے، ان دنوں یہاں فور لین بن رہا ہے، یعنی پنہسہ شاہراہ اعظم پر آج واقع ہے، آبادی شروع ہونے کی جگہ پر ایک مسجد ہے، جس کی تعمیر بھی نئی ہے، کبھی یہ مسجد چھوٹی تھی؛ لیکن توسیع کے بعد اس میں تین سو آدمیوں کی فی الحال گنجائش ہے، اسی مسجد سے متصل مشرق میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے بڑے بھائی حضرت صوفی مولوی احمد سجادؒ اور ان کے صاحبزادہ حضرت صوفی ملا مبینؒ کے مزارات ہیں، پچھم کی جانب حضرت مولوی صوفی احمد سجادؒ کا مزار ہے، پورب کی طرف حضرت صوفی ملا مبین کا مرقد ہے، پھر ان مزارات کے حصار سے متصل شمال میں حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد کے داماد حضرت مولانا علی حسن ابو جمال رونق استھانویؒ کا مقبرہ ہے، جن کے شاعرانہ کمال، عارفانہ حال اور عالمانہ جمال کی بہار شریف میں شہرت ہے۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محدم سجادؒ کے والد ماجد جناب مولوی سید حسین بخش سند یافتہ عالم نہیں تھے، شروع میں پڑھانے کا سلسلہ تھا، اس مشغلہ کو چھوڑ کر گھر کی کھیتی اور خاندانی کاشت کی ٹھیکیداری میں زندگی صرف کردی، آبائی ذریعہ معاش یہی تھا، اسی سے گھر میں ہر طرح کی فراغت تھی، بذات خود وہ متقی، پرہیزگار، کافی دیندار، صدق وصفا کی علم بردار تھے اور کیوں نہ ہوتے یہ خوبیاں بزرگان سادات جاز نیری سے انہیں وراثت میں ملی تھی اور ان کے ذاتی امتیازات میں سے سب سے زیادہ یہ کہ وہ نہایت سخی، دلدار، فیاض اور برے بہ اخلاق تھے اور اس قدر مہمان نواز کہ مہمانوں کی آمدورفت روزانہ جاری رہتی، انہی عمدہ صفات وخصوصیات کی وجہ سے دور دراز علاقے، خطے، ضلعے اور گاؤں گاؤں تک آپ کے گھرانہ کی میزبانی اور مہمان نوازی کا شہرہ تھا، ہر مقام اور ہر جگہ آپ کی سخاوت کی خوب خوب مدح سرائی اور تعریف ہوتی تھی، چونکہ پنہسہ گاؤں عیں راستہ پر واقع تھا، بہار شریف سے راجگیر، مولانا ڈیہہ، انڈوس، بلووا، سلاؤ، میزرہ وغیرہ بہت سے مسلمانوں کے گاؤں جو آباد تھے، وہاں کے آنے جانے والے مسافر اور راہ گیر جاڑے، گرمی اور برسات کے زمانے میں آپ کے گھر مہمان ہوتے تھے اور آپ کی حویلی کا دروازہ ہمیشہ مسافروں کے لیے کھلا رہتا تھا۔

سید فریدالدین کے چار بیٹں میں سے سید مولوی حسین بخش بڑے تھے، ان سے پانچ اولادیں تھی، ایک مولوی صوفی سید احمد سجاد، دوسرے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، ان دونوں لڑکوں کے علاوہ تین لڑکیاں تھیں، ایک بڑی لڑکی تھی، ان کی شادی پنہسہ میں ہوئی تھی، ان کے نام کی تحقیق نہیں ہوسکی، وہ صاحب اولاد تھیں، بتایا جاتا ہے کہ ان چار لڑکیاں تھیں، جو وبائی امراض کا شکار ہوکر انتقال کر گئیں، دوسری لڑکی صغریٰ تھی، جن کے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں، صغریٰ کی سسرال پنہسہ میں ہی تھی، ان کے شوہر کا نام محمد خلیل تھا، تیسری لڑکی رابعہ تھیں، ان سے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جو بالکل بچپن میں انتقال کر گیا، رابعہ پنہسہ ہی میں مولانا کے گھر میں رہتی تھی،

(۱۵) سید مولوی حسین بخش کی صاحبزادی صغریٰ زوجہ محمد خلیل کے لڑکے کے نام:

(۱) جمیل احمد (۲) عبدالقیوم (۳) شکیل احمد (۴) عقیل احمد ہیں۔

اور ان کی لڑکیوں کے نام:

(۱) تہذیبہ (۲) تحریمہ (۳) نام کی تحقیق نہیں ہوسکی (۴) بُنی (۵) ریحانہ ہیں۔

اب ہم سید نجف اور ان کے بعد سید فریدالدین کی اولادوں کے نقشے پیش کرتے ہیں:

(الف) نقشہ سید نجف کی تین اولادیں ہیں:
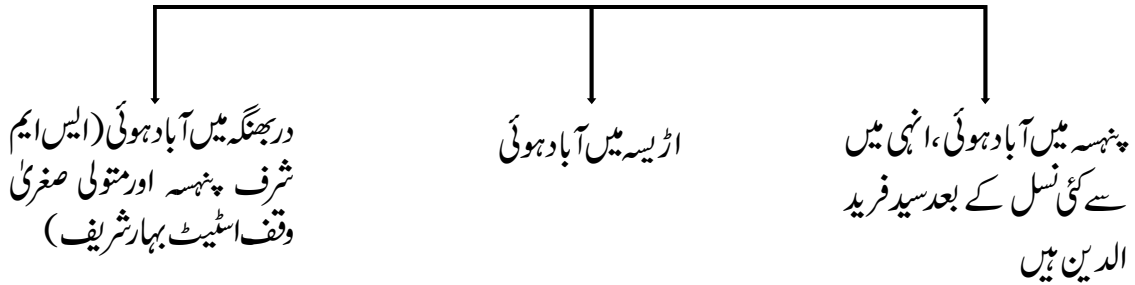
(ب) سید نجف کے کئی پشت کے بعد سید فریدالدین کی اولادوں کا نقشہ (۱۶)
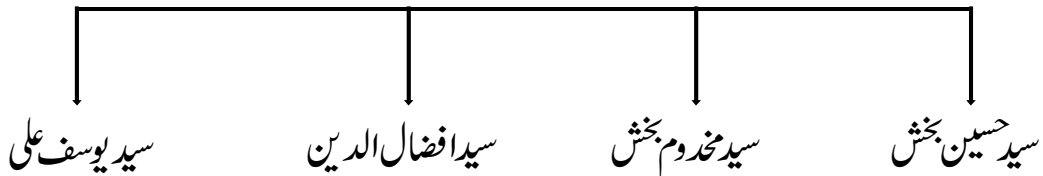
حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کے داد سید فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ کے چاروں لڑکوں کے اولادوں میں سے پہلے لڑکے کے اولادوں کے نام آ گئے ہیں، ان میں دو لڑکے ہیں اور تین لرکیاں ہیں، ان کے بعد ہم فرداً فرداً سب کی اولادوں کے نام بہ نام اور سمجھنے کے لیے ان کے

خاندانی نقشے بھی پیش کرنے کی حت الامکان کوشش کر رہے ہیں۔

نقشہ اولاد مولوی سید حسین بخش بن سید فرید الدین پنہسہ (۱۷)
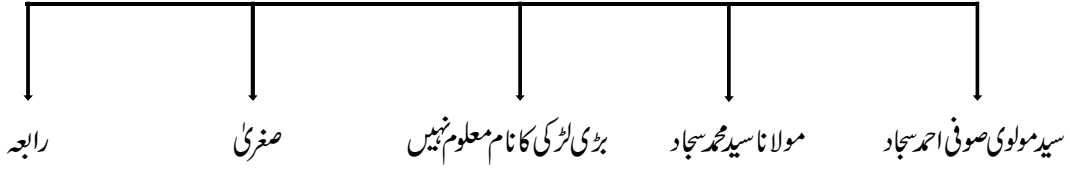
اس کے بعد ہم سب سے پہلے سید حسین بخش رحمۃ اللہ علیہ کی تین صاحبزادیوں اور ان کی اولاد کا خاندانی نقشہ پیش کریں گے:

سید مولوی حسین بخش کی صاحبزادیوں کے خاندانی سلاسل:
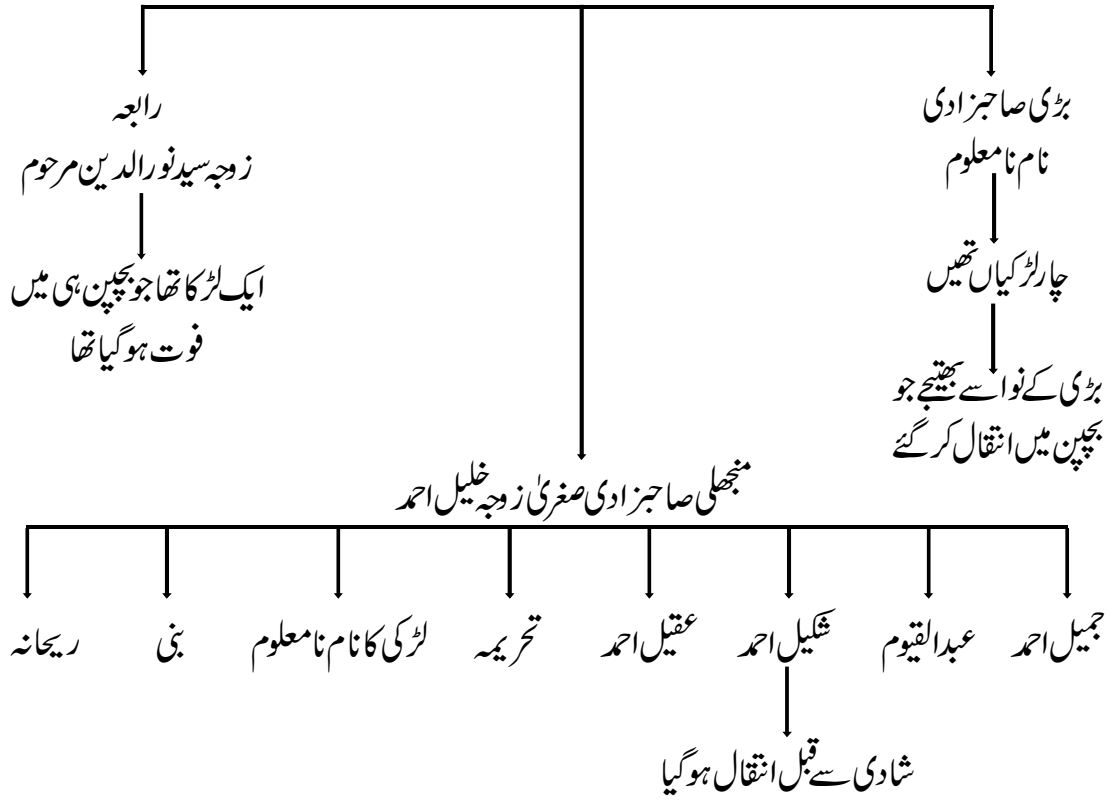
سید مولوی حسین بخش کے بڑے صاحبزادہ جن کا اسم گرامی سید مولوی احمد سجاد تھا، اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر صوفی صاحب کے لقب سے ملقب تھے، اپنے چھوٹے بھائی مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے اپنے والد کے انتقال کے بعد سرپرست، اتالیق اور مربی تھے، ان کی شخصیت کی تعمیر و ترقی میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کی فراغت کے بعد تک گھر کی دیکھ ریکھ وہی کرتے تھے؛ لیکن خاندانی طور پر صوفی مشرب ہونے کی وجہ سے ان پر بھی صوفیت کا رنگ آہستہ آہستہ

چڑھتا گیا، پھر تصوف کا ذوق وشوق اس قدر بڑھا کہ وہ مغلوب الحال ہو گئے۔

سید صوفی احمد سجادؒ کے زمانہ میں ایک نقش بندی بزرگ حضرت مولانا سید احمد شاہ جہاں پوری سے بیعت طریقت تھے؛ مگر ان کے سلسلہ میں تصوف کی طرف مائل ہونے کے متعلق ان کے اہل خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ وہ اور ان کے چچازاد بھائی یعنی یوسف علی کے لڑکے جن کا نام سید محمد ابوالحسن تھا(۱۸)، دونوں کہیں ساتھ جارہے تھے، راستہ میں کوئی پراگندہ حال فقیر ملا، اس نے اپنا کھایا ہوا جو بچا تھا یا کھیر جو بچی تھی، اس کو کھانے کو کہا تو سید نورالحسن نے نہیں کھایا اور سید صوفی مولوی احمد سجادؒ نے کھالیا، اس کے بعد ان کے دلی اور ایمانی حالت بالکل بدل گئے، اب ان کا دل گھر سے، کھیتی سے اور والد کے پرانے کاروبار سے اچاٹ ہو گیا، اس کے بعد ترک دنیا کی کیفیت پیدا ہو گئی، کبھی وہ راجگیر کے جنگلات اور اس کے پہاڑوں کی نکل جاتے اور کئی کئی روز پر کبھی کبھی نظر آتے، ایک مرتبہ طویل مدت یعنی تقریبا بارہ سال کے بعد پنہسہ میں آئے، اس وقت ان کی حالت، شکل، حلیہ اور صورت بالکل متغیر اور بدلی ہوئی تھی، یہاں تک کہ لوگ ان کو پہچان نہیں پارہے تھے، وہ براہ راست اپنے چچازاد نیز خالہ زاد بھائی کے گھر آئے، جن کا نام سید محمد ابوالحسن تھا، ان کی بیٹی بی بی زیتون نے یہ کہتے ہوئے پہچان لیا کہ میرے بڑے ابا ہیں، انہی کے گھر میں ایک حجرہ میں صوفی صاحب بہت زمانے تک اقامت پذیر رہے، پھر بہار شریف چلے آئے، کئی بزرگوں کے مزارات پر چلہ کشی اور مراقب رہے، آج بھی وہ حجرہ نئے اور پرانے تعمیرات کے امتزاج کے ساتھ پنہسہ میں موجود ہے، جو سید اکبر حسین کے حصہ میں ہے۔(۱۹)

یہ حجرہ جناب سید فریدالدین صاحبؒ کے چھوٹے صاحبزادہ سید یوسف علی کے اکلوتے فرزند سید محمد نورالحسن کے مکان کے پوربی حصہ میں دروازہ کے قرب واقع ہے، جو بی بی زیتون کی اولاد کے حصے میں ہے۔(۲۰)

سید مولوی صوفی احمد سجادؒ کے دو صاحبزادے تھے:

ایک کا نام سید امین الدین تھا، یہ لاولد تھے، دوسرے کا نام صوفی سید ملا مبین تھا۔ ان سے چار لڑکے تھے، جن کے نام یہ ہیں:

(۱) صلاح الدین مرحوم (۲) ضیاء الدین (۳) ریاض الدین (۴) منہاج الدین۔

اسی طرح ان کی تین لڑکیاں تھیں:

(۱) عبیدہ خاتون (۲) زبیدہ خاتون (۳) صغیرہ خاتون۔
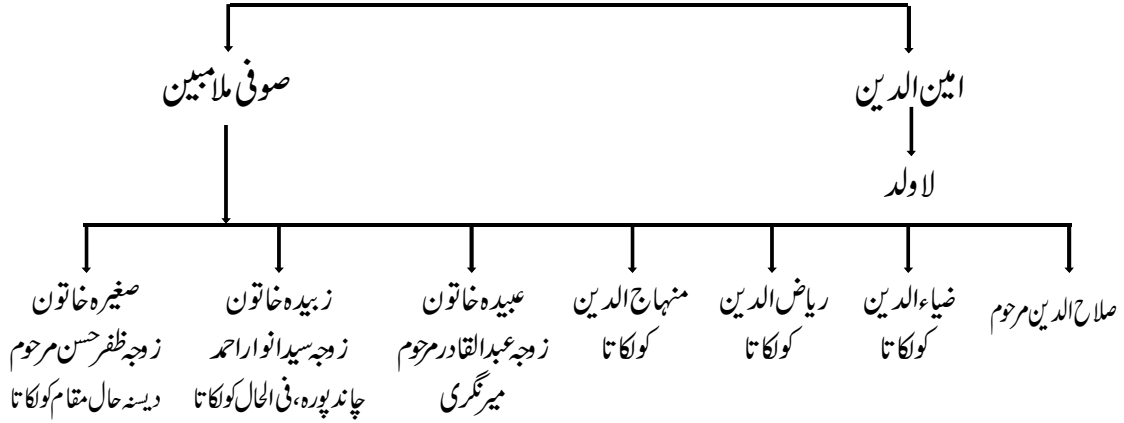
سید مولوی صوفی احمد سجادؒ کے مختصر تعارف اوران کی اولادوں کے مجمل نام کی نشاندہی کے بعد یہ بتادینا ضروری ہے کہ سید مولوی صوفی احمد سجادؒ کے صاحبزادہ سید صوفی ملامبینؒ مادرزاد ولی تھے، ان کی زیادہ تر زندگی بہار شریف میں گذری، کچھ لونگیا بیڑی والے کی حویلی میں جہاں ان کا کافی پاس ولحاظ، احترام اور بڑی عزت تھی اوراس سے کہیں زیادہ ان کو اطمینان، سکون اور راحت قلبی اور روحانی ’’درنور‘‘ کے اندر حاصل ہوتی تھی اور زیادہ وقت وہ اسی جگہ گذارتے تھے؛ مگر سب سے زیادہ ان کے مخصوص لمحات، قیمتی اوقات اور اللہ کی ذات گم بندگی کے ایام اور زمانے شیر و پر محلّہ کے جناب منصور خاں مرحوم کے اندرون خانہ کے ایک حجرہ میں جس کو اہل خانہ نے مخلصانہ طور پر آپ کے لیے محفوظ اور مخصوص کر رکھا تھا، تاہنوز وہ آپ ہی کے نام سے ان کے گھر والوں کے درمیان معروف ہے، اس حجرہ میں صوفی ملامبین کا ایک طویل عرصہ گذرا ہے، مجھے بھی بارہا ان کی دی اور دور سے مشاہدہ کی سعادت حاصل ہوئی ہے؛ لیکن قریب جارک کچھ سننے اور کہنے کی سعادت کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی؛ کیوں کہ ان کی شخصیت پُر رعب، پُر وقار اور بالکل خاموش تھی، میں اپنی طفلی اور بلوغ سے پہلے ان کے قیام گاہ سے گذرتا تو دردیدہ نگاہوں نے انہیں ضرور دیکھ لیتا، وہ مجھے اور میرے احساس میں خلق اور مخلوق سے کٹے کٹے اور بے نیاز اور مستغنی معلوم ہوتے تھے۔

یہ ثقہ ذرائع سے نہیں معلوم ہوسکا، انہیں اپنے والد، یا والد کے سلسلہ کے کسی پیر و مرشد سے خلافت تھی، یا نہیں؟ ممکن ہے کہ وہ اپنے والد کے ہی فیض یافتہ ہوں اوراجازت حاصل ہو، اسی طرح ان کے مریدین کا کوئی بڑا گروہ نظر نہیں آتا ہے، ہاں! ان کے ایک مرید خاص تھے، جن کا نام منصور خاں مرحوم تھا، وہ ان کے غایت عشق زار، بڑے راز دار، سب سے بڑھ کر خدمت گذار

ووفادار، ان کے شب وروز کے رفقائے کار اور حکم بردار بھی تھے، اسی طرح ان کی اہلیہ اور تمام بچے بھی ان کے فرمان کے مشتاق رہتے تھے۔

سید صوفی ملامبین کے قریب رہنے والوں میں سید یوشع درنور بہار شریف بھی رہے ہیں، وہ بقید حیات ہیں، ان کے سلسلہ میں بڑے واقف کار لوگوں میں سے ہیں، اگر کسی کو صوفی ملامبین کی شخصیت سے متعلق مزید جاننا ہے تو وہ ان سے مل کر ان کے احوال وکوائف جمع کر سکتا ہے، اسی طرح ان کے خاص جاننے والوں میں محمد جسیم الدین مترجم مکتوبات صدی ہندی ایڈیشن بھی ہیں۔(۲۱)

سید صوفی ملامبین کی بزرگی خاص خاص لوگوں اور اہل تعلق کو معلوم تھی، ورنہ عام لوگ ان کی عارفانہ حیثیت سے بالکل ناواقف تھے، خود ان کا مزاج بھی لاتعلقی کا تھا، وہ اصلی اور حقیقی تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، لباس، رہن سہن، غذا، پسند اور ظاہر وباطن مکمل اکمل صوفیانہ؛ بلکہ قلندرانہ تھا، جھاڑ پھونک سے اکثر اور زیادہ تر دوری تھی، عارف باللہ ہونے کی وجہ سے صاحب فراست اور مستجاب الدعوات بھی تھے، پریشان لوگوں کے مسائل کا مداوا دعا سے کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ اجنہ بھی ان کے مرید اور تابع تھے۔

سید صوفی ملامبین کے بعد ان کے مرید خاص اور بعض متوسلین اور عقیدت مندوں نے ان کے صاحبزادہ جو بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور ان کا نام صلاح الدین تھا، خلیفہ اور مجاز تسلیم کر لیا، پھر سالانہ فاتحہ اور عرس کی بھی رسم جاری ہوئی، ۲۷ محرم الحرام کو صوفی احمد سجادؒ کے فاتحہ وعرس کا دن منایا جاتا ہے اور ۲۴ رمضان المبارک کو صوفی ملامبین کے فاتحہ وغیرہ کا اہتمام ہوتا ہے، ان دونوں مزاروں پر گل پوشی اور چادر پوشی بھی اپنی تاریخوں میں ہوتی ہے، سید صوفی ملامبین کے بڑے بیٹے سید صلاح الدین کے انتقال کے بعد تولیت وخلافت صوفی ملامبین صاحبؒ کے منجھلے لڑکے سید ضیاء الدین کی طرف منتقل ہوگئی ہے، وہ زیادہ تر کولکاتا محلّہ بنیا پوکھر میں رہتے ہیں؛ مگر ان کی گدی یا خانقاہ نہیں ہے۔

سید صوفی ملامبین کے بڑے صاحبزادہ سید صلاح الدین کے دو لڑکے، دو لڑکیاں ہیں، منجھلے صاحبزادہ کی دو ہی اولادیں ہیں، تیسرے صاحبزادے کی دو لڑکیاں ہیں، چوتھے صاحبزادے سے تاہنوز کوئی اولاد نہیں ہے، وہ بھی کولکاتا میں آباد ہیں۔

حضرت صوفی ملامبین کی تین صاحبزادیاں ہوئی:

پہلی عبیدہ ہیں، ان کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں، دوسری زبیدہ ہیں، ان کے ایک لڑکا،

دولڑکیاں ہیں، تیسری صغیرہ ہیں جن کی آٹھ اولادیں ہیں: چار لڑکے اور چار لڑکیاں۔صوفی صاحب کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں کے اولادوں کو نام بہ نام میں نسبی نقشے میں پیش کررہاہوں، ملاحظہ فرمائیں:
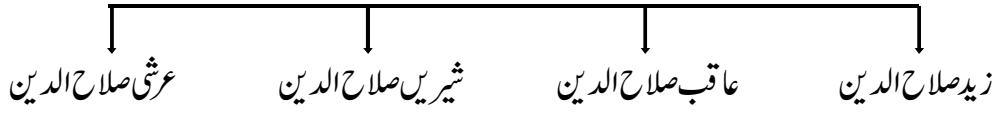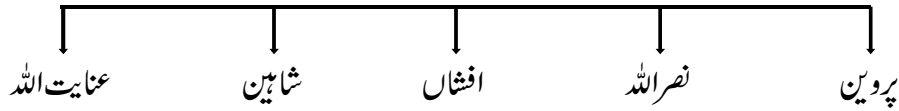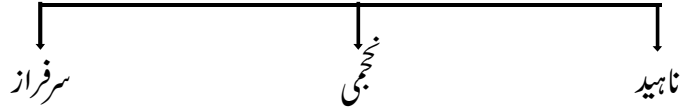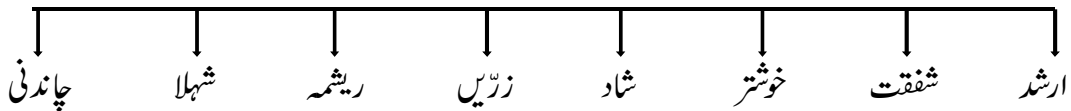
یہاں تک مولوی سید حسین بخش کے بڑے صاحبزادے کی نسلوں کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد ہم ان کے دوسرے ہونہار فرزند ارجمند مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کی ذاتی اور نجی زندگی اور ان کی تین شادیوں کے اسباب وعلل کے ساتھ ان کی ازواج، اولاد اور ذریات کا اختصار کے تذکرے کریں گے۔

حضرت مولانا کی پہلی شادی انیس برس کی عمر میں ۱۳۲۰ھ میں مولانا سید وحیدالحق صاحبؒ ناظم مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کی صاحبزادی سے ہوئی، (۲۲)ان کا نام عزیزالنساء تھا، وہ استھانواں کی رہنے والی تھیں،(۲۳) یہ چودہ سال تک بہ حیات رہیں۔

بقول مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت رابع علیہ الرحمہ: ان سے پانچ اولادیں ہوئی: دولڑکے، تین لڑکیاں، جن میں سے صرف ایک صاحبزادی موجود ہیں۔(۲۴)

اور حضرت مولانا کی نواسی نرگس بانو اپنی والدہ سیدہ بنت عزیزالنساء سے روایت کرتی ہیں کہ پہلے محل سے صرف تین ہی اولاد ہوئی، دولڑکے ایک لڑکی، بڑے لڑکے کا نام احسن امام تھا، جو ایام طفلی میں ہی گیا میں انتقال کر گئے، دوسرے حسن امام (۲۵) تھے، جو دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کے بعد بعد وصال کر گئے، صرف ایک صاحبزادی تھیں، جن کا نام سیدہ تھا، وہ اپنی والدہ عزیزالنساء کے انتقال کے وقت صرف دو سال کی تھیں تو ان کی پرورش و پرداخت ان کی چھوٹی پھوپھی رابعہ خاتون نے کیا تھا، رابعہ خاتون پنہسہ میں ہی رہتی تھی، ان کے ایک لڑکا تھا جو تین سال کی عمر میں انتقال کر چکا تھا۔

سیدہ جب بڑی ہوگئیں تو ان کی شادی ہرگاواں عبدالقدوس صاحب سے ہوئی، ان سے چھ اولادیں ہوئیں، پانچ لڑکیاں، ایک لڑکا، لڑکے کا نام شکیل تھا، جوان ہو چکا تھا، بہار کے مشہور مسلم کشا دفساد میں وہ اپنے والد کے ساتھ ۱۹۴۶ء میں ہرگانواں ندی کے کنارے شہید کر دیا گیا۔

سیدہ کے پانچ لڑکیوں کے نام مع زوجیت اس طرح ہیں:

(۱) عطیہ بانو زوجہ نصیرالدین، یہ میر نگر کے باشی تھے جو فی الحال شیخپورہ میں پڑتا ہے۔

(۲) رشیدہ بانو زوجہ سید ظفر، یہ مگھڑا ڈمراواں بہار شریف کے باشندہ تھے۔

(۳) آرزو زوجہ سید شہاب الدین، آرزو نکاح کے بعد ہی انتقال کر گئیں۔

(۴) نرگس بانو زوجہ سید شہاب الدین (عقد ثانی) شہاب الدین صاحب بھی مگھڑا ڈمراواں کے رہنے والے تھے۔

(۵) عشرت بانو زوجہ عبدالماجد، یہ بہار شریف کے محلّہ سُرابی پر کے رہنے والے ہیں، ان کا انتقال ۲۰۰۲ء میں ہوا، سرابی پر وہ محلّہ ہے، جو آج چھوٹی درگاہ کہلاتا ہے، جہاں حضرت بدر عالم زاہدی علیہ الرحمہ کا آستانہ ہے، (۲۶) یہاں ۱۹۸۱ء میں بہار شریف کے اندر فساد کے بعد کوئی مسلم آبادی نہیں ہے۔

حضرت ابوالمحاسن کی پہلی زوجہ عزیز النساء کی اولادوں کے سلسلے (۲۷)
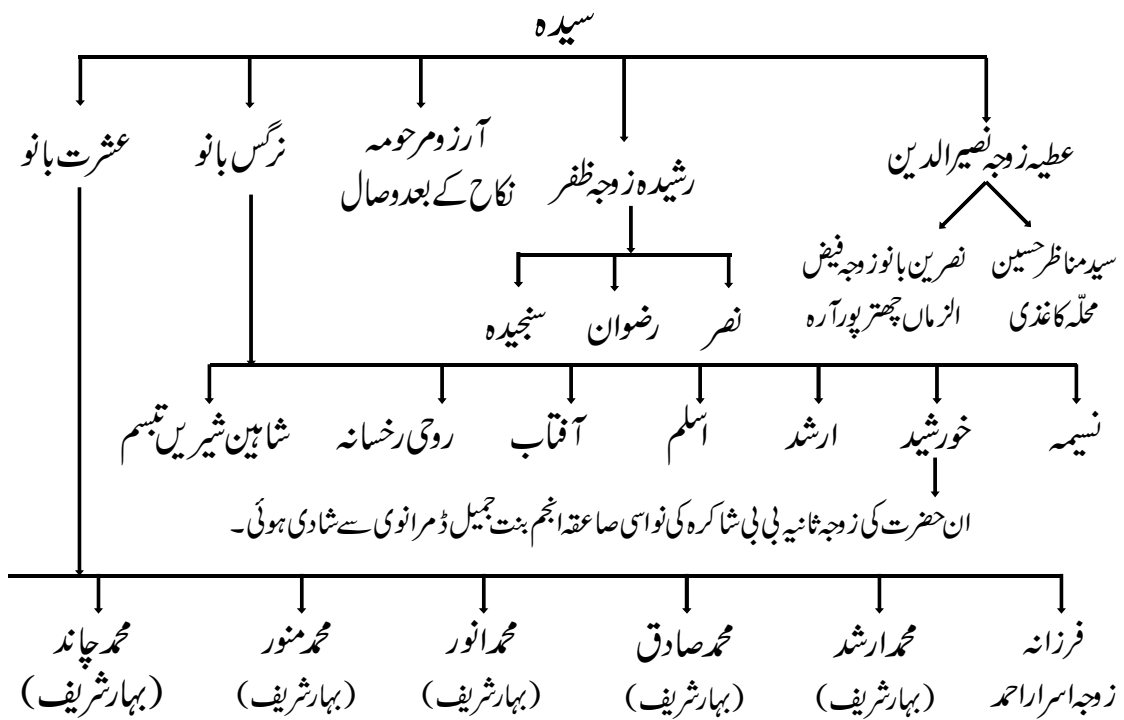
حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی دوسری شادی پہلی اہلیہ محترمہ عزیز النساء کے انتقال کے دو برس بعد ۱۳۳۶ھ میں گیلانی میں مولانا سید عبدالعزیز صاحب کی لڑکی سے ہوئی، ان کا نام شاکرہ تھا، یہ پہلی بیوی کی قریبی رشتہ دار تھیں، بہن کی بیٹی لگتی تھیں، یعنی عزیز النساء رشتہ میں خالہ تھیں، ان سے مولانا کی اولاد کے سلسلہ میں دو روایت ہے، ایک حضرت مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت رابع کی ہے کہ ان سے چھ اولادیں ہوئیں، تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ دوسری روایت مولانا محمد سجاد کی نواسی نرگس بانو کی ہے کہ ان سے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا، لڑکے کا انتقال پانچ سال میں عمر ہی میں ہو گیا تھا، پھر ایک لڑکی زبیدہ کا آٹھ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا، ان کے بعد دو لڑکیاں: (۱) طاہرہ (۲) نسیمہ زندہ رہیں اور ان دونوں سے حضرت مولانا کے نواسوں کا سلسلہ چل رہا ہے۔

یہاں پر ہم طاہرہ صاحبہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا مفید سمجھتے ہیں، طاہرہ کی شادی ایک

عالم فاضل طبیب وڈاکٹر سے ہوئی تھی، ان کا عرفی نام مولانا رونق استھانوی تھا اور مکمل نام مولانا علی حسن ابوجمال رونق استھانوی تھا، ان کی تعلیمی فراغت مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے ہوئی تھی، وہ اردو، فارسی کے قادرالکلام اور صاحب دیوان شاعر تھے، ان کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں استھاواں میں ہوئی تھی۔

طاہرہ صاحبہ زوجہ مولانا رونق استھانوی سے چار اولادیں ہوئیں، تین لڑکیاں اور ایک لڑکا، لڑکے کا نام جمال ہے، بڑی لڑکی کا نام نبیرہ خاتون تھا، ان کی شادی محمد سلیم صاحب سے ہوئی تھی، یہ بڑی درگاہ بہار شریف کے رہنے والے تھے، منجھلی نفیسہ تھیں، جن کی شادی پنہسہ میں مخدوم بخش (۲۸) کے پوتے سے ہوئی تھی، جن کا نام عبدالفتاح تھا، ان کا انتقال ۱۹۸۱ء میں ہوا اور نفیسہ کا انتقال ۲۰۰۶ء میں ہوا، تیسری لڑکی کا نام شفیقہ ہے، ان کی شادی صلاح الدین نام کے شخص سے ہوئی، یہ پنہسہ میں رہے۔

حضرت مولانا کی زوجہ ثانیہ شاکرہ خاتون سے دوسری صاحبزادی نسیمہ خاتون ہیں، ان کی شادی محمد اعظم سے ہوئی، ان سے چھ اولادیں ہوئیں: چار لڑکے، دو لڑکیاں، لڑکوں کے نام یہ ہیں:

(۱) محمد اسلم آرزو مرحوم (۲۹) (۲) محمد جاوید (۳) محمد شاہد پرویز (۴) شبیر احمد اور لڑکیوں کے نام اس طرح ہیں: (۱) افروز (۲) شمشی

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی دوسری زوجہ بی بی شاکرہ کی اولادوں کے سلسلے
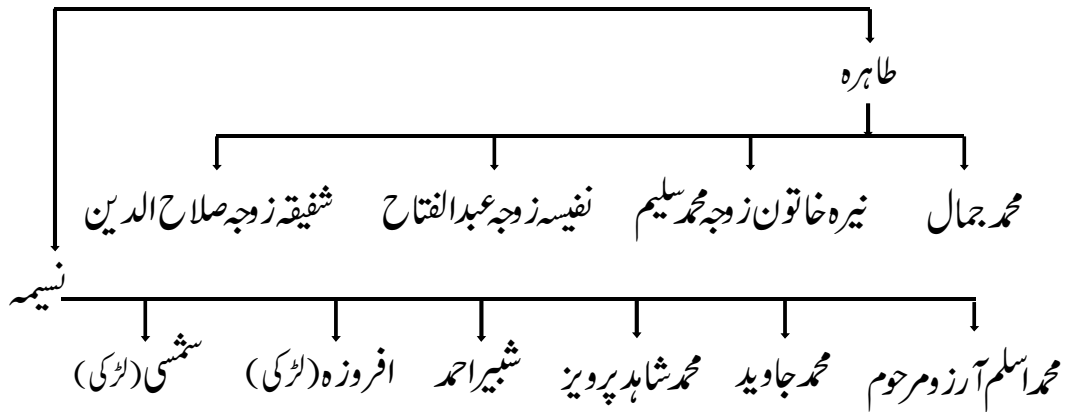
بی بی شاکرہ خاتون جب بہت علیل ہوگئیں، آنکھوں سے معذور اور بالکل مجبور ہوگئیں، گھر کا کام، بچوں بچیوں کی نگہداشت مشکل ہونے کی وجہ سے مجبوراً حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے تیسری شادی گیا میں ایک بیوی سے کی، ان کا نام نور جہاں تھا، ان کی پرنانیہال گیلانی تھی، جس طرح شاکرہ کی دادیہال گیلانی تھی، دونوں میں ہی نہایت قریبی رشتہ داری اور قرابت داری

تھی، گیلانی کے مشہور صوفی بزرگ جناب میر واعظ جن سے متاثر ہوکر مشہور آنتی کے راجہ نے اسلام قبول کیا تھا، پھر سلسلہ فردوسیہ کے مشہور و معروف بزرگ سید شاہ امیر الحسن سجادہ نشیں حضرت مخدوم جہاں علیہ الرحمہ کے دست حق پر بیعت کی تھی، انہیں جناب میر واعظ کی شاکرہ صاحبہ اپنی پوتی تھیں اور نور جہاں اپنی پرنواسی تھیں، یعنی نور جہاں کی شاکرہ اپنی ممیری خالہ تھیں اور نور جہاں شاکرہ کی اپنی پھوپھی کی نواسی تھیں، یعنی پھوپھی زاد بہن کی بیٹی تھیں اور نور جہاں کے والد کا نام حافظ ضمیر الدین تھا۔

نور جہاں اور شاکرہ (۳۰) کے درمیان رشتہ داری سلسلے
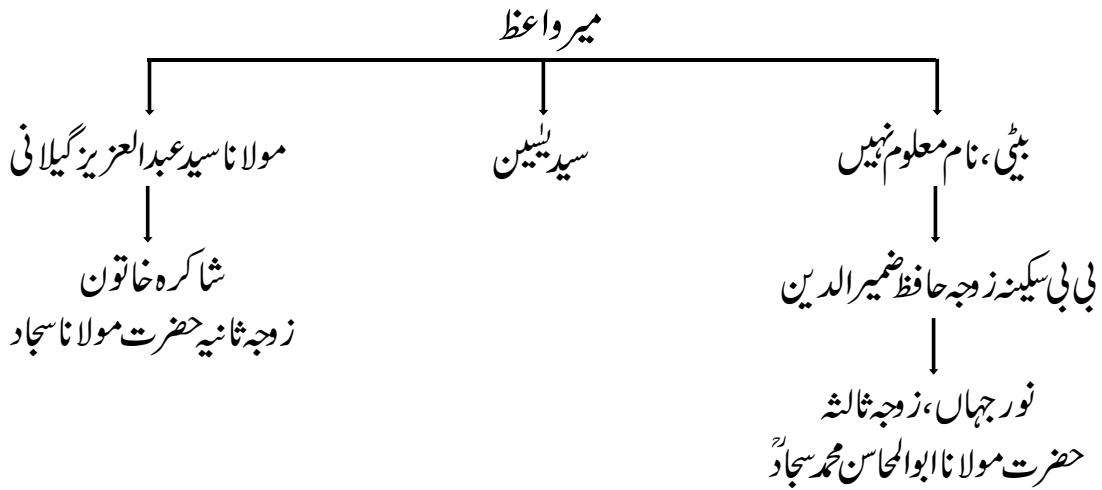
حضرت ابوالمحاسن کی تیسری زوجہ نور جہاں جو بیوہ تھیں، ان سے ایک اولاد ہوئی تھی، (۳۱) یہ اولاد نرینہ تھی، جن کا صغرسنی ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔

نور جہاں صاحبہ کی پہلی شادی پھڑ یا کے ڈاکٹر محمد شمس الدین سے ہوئی تھی، یہ سید مقبول احمد (۳۲) کے بھتیجے تھے، نور جہاں کے پہلے شوہر سے دو لڑکے: (۱) بدر زاہدی (۲) قمر زاہدی، بدر زاہدی کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا، قمر زاہدی سے خاندانی سلسلہ جاری ہے، ان کے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

لڑکوں کے نام یہ ہیں:

(۱) قیصر اقبال زاہدی، (۲) سرور اقبال زاہدی، (۳) مظفر اقبال زاہدی، (۴) منظر اقبال زاہدی، (۵) مظہر اقبال زاہدی۔

لڑکیوں کے نام اس طرح ہیں:

(۱) صبیحہ، (۲) طلعت ناہید۔ (۳۳)
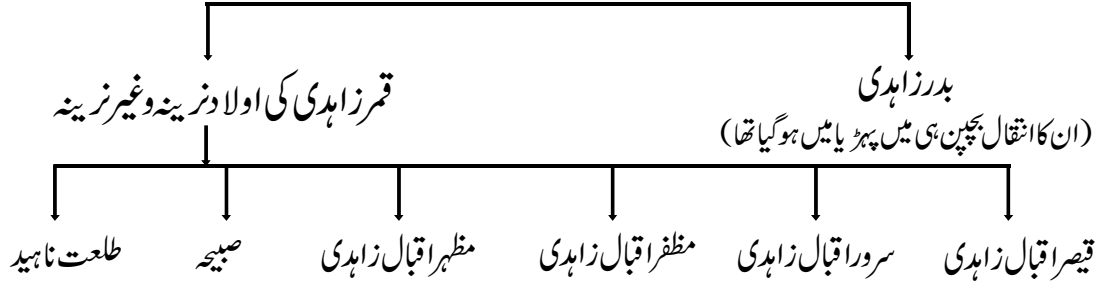
مولوی سید حسین بخش کے فروعی خاندان کا سلسلہ ان کے ہونہار صاحبزادہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی غیر نرینہ اولادوں سے چلا؛ یعنی صاحبزادیوں: (۱) طاہرہ (۲) نسیمہ سے آگے بڑھا، جن کے تذکرے پچھلے صفحات میں ہوئے، اب ہم مولوی سید حسین بخش کے بھائی سید مخدوم بخش کے خاندان اور اولاد کا تذکرہ کرنا بھی یہاں پر مفید سمجھتے ہیں؛ تاکہ سید فرید الدین کے دوسرے لڑکے کے سلاسل نسب بھی نظر میں سامنے آجائیں۔

سید مخدوم بخش کے ایک صاحبزادہ ہوئے، جن کا نام مولوی سید ظہیر الدین تھا، یہ حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد کے چچازاد بھائی تھے، ان سے تین لڑکے پیدا ہوئے اور ایک لڑکی۔

لڑکوں کے نام: (۱) انوار الحق، (۲) ابونصر، (۳) عبدالفتاح اور لڑکی کا نام رضیہ ہے۔

مولوی سید ظہیر الدین کے پہلے بیٹے انوار الحق کے دو بیٹے تھے اور تین بیٹیاں تھیں۔

بیٹوں کے نام:

(۱) عمیم الزماں، (۲) غلام ربانی۔

اور بیٹیوں کے نام:

(۱) صوفیہ، (۲) سلطانہ، (۳) عصمت ہیں۔

اسی طرح سید مولوی ظہیر الدین کے دوسرے بیٹے ابونصر کی چار لڑکیاں پیدا ہوئیں، جن کے نام:

(۱) نشاط فاطمہ، (۲) طلعت فاطمہ، (۳) نوشابہ خاتون، (۴) نور جہاں ناہید ہیں اور ایک لڑکا ہوا، جن کا نام سید محمد شرف ہے، جو ابھی صوبہ بہار کے بڑے وقف جس کا نام صغریٰ وقف اسٹیٹ بہار شریف (نالندہ) ہے، اس کے متولی ہیں۔

سید مولوی ظہیر الدین کے تیسرے بیٹے عبدالفتاح ہیں، ان کے صرف ایک ہی لڑکا ہے،

جس کا نام شمس النہار ہے، وہ پنہسہ ہی میں رہتے ہیں۔(۳۴)

مولوی سید ظہیر الدین کی ایک بیٹی تھیں، جن کا نام رضیہ تھا، ان کے شوہر کا نام مقبول احمد تھا، ان سے تین اولادیں ہوئیں: دولڑکے، ایک لڑکی۔

ان کے لڑکوں کے نام: (۱) شمیم مرحوم (۲) ذکی مرحوم۔ لڑکی کا نام ذکیہ مرحومہ ہے۔

(۲) نقشہ اولاد سید مخدوم بخش بن سید فرید الدین پنہسہ
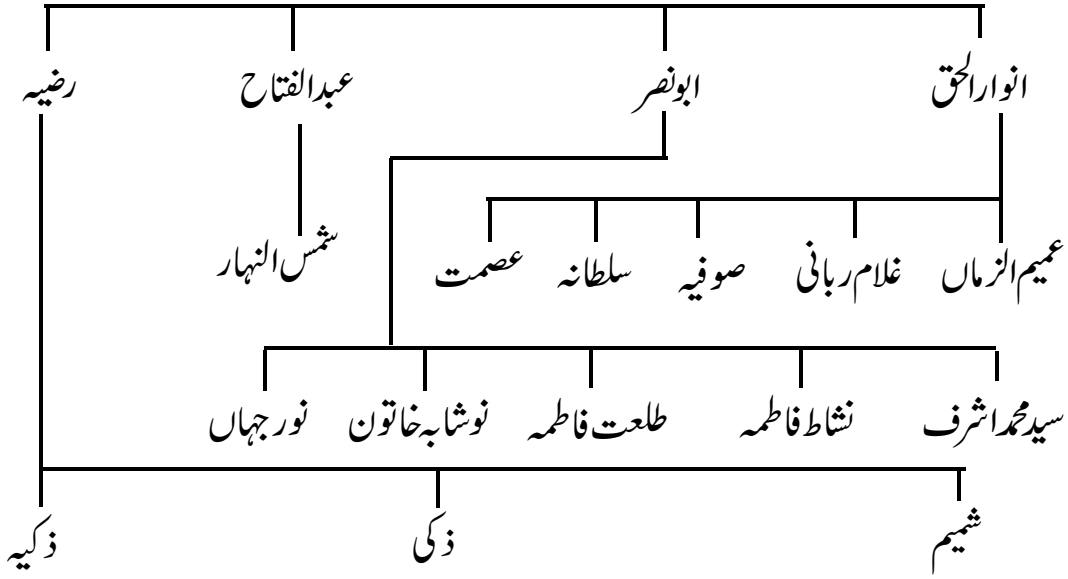
حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ بانی امارت شرعیہ بہار کے جد امجد سید فرید الدین کے چار صاحبزدگان سے دو صاحبزادے: (۱) سید حسین بخش، (۲) سید مخدوم بخش کی اولادوں کے تذکرے اور ان کے سلاسل فروعیہ کے نقشے آپ نے پڑھے اور دیکھے، پھر ان کے بعد ہم سید فرید الدین کے تیسرے صاحبزادے سید افضال الدین اور ان کی اولادوں اور چوتھے صاحبزادہ سید یوسف علی کے ذریات کا احاطہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

سید افضال الدین کے ایک لڑکے تھے، جن کا نام عزیز احمد تھا اور عزیز احمد کی دو شادیاں ہوئیں تھیں، پہلے محل سے ایک لڑکی تھی، جس کا نام بی بی آمنہ تھا، دوسرے محل سے دو لڑکے تھے، ایک کا نام مختار تھا، دوسرے کا نام شمس الہدیٰ تھا، بی بی آمنہ بنت عزیز احمد کے دو لڑکے ہوئے: (۱) فہیم، (۲) شمیم اور مختار بن عزیز احمد کی بھی دو شادیاں ہوئیں، پہلے محل سے صرف لڑکی بنی نام کی ہوئی، دوسرے سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں، لڑکوں میں پہلے کا نام سکندر رکھا گیا، دوسرے کا نام زبیر اور تیسرے کا نام خورشید تھا، شمس الہدیٰ بن عزیز احمد کی چار اولادیں ہوئیں:

(۱) آفتاب، (۲) کوثر، (۳) گلشن اور (۴) لڑکا نام معلوم نہیں ہوسکا۔

(الف) نقشہ اولاد اظہر حسین بن بی بی زیتون بنت ابوالحسن بن یوسف علی

زہرہ خاتون زوجہ الیاس — اختر حسین پاکستان — ناظرہ خاتون مرحومہ خانقاہ بہار شریف — اصغر حسین محلّہ کاغذی — انور حسین — انظر حسین — شاکرہ خاتون زوجہ ابوثمر کنڈہ
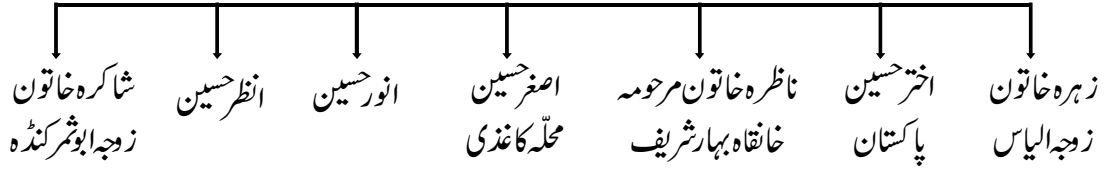
(ب) نقشہ اولاد زہرہ خاتون بنت سید اظہر حسین پنہسہ

محفوظ اختر — تبسم — ظہیر الیاس — شبانہ — منی مرحومہ
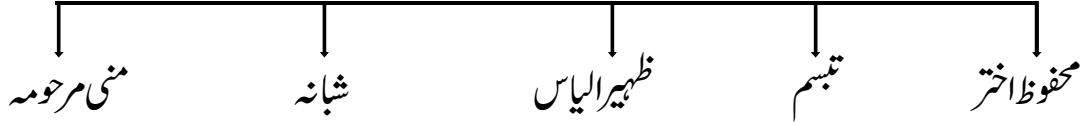
(ج) نقشہ اولاد سید اختر حسین بن سید اظہر حسین پاکستان

خرم — نازش — ریحان — فرحان — کرن (لڑکی) — فیضان

(د) نقشہ اولاد ناظرہ خاتون بنت اظہر حسین محلّہ خانقاہ بہار شریف

شمع — پرویز — شبنم — ظفر

(ہ) نقشہ اولاد سید اصغر حسین بن سید اظہر حسین محلّہ کاغذی بہار شریف

ارشاد — عرشی — آصف — ظفر

(و) نقشہ اولاد سید اکبر حسین بن سید اظہر حسین محلّہ کاغذی بہار شریف

سید حمزہ

(ذ) اولاد سید انور حسین بن سید اظہر حسین محلّہ کاغذی بہار شریف

لاولد

(ح) انظر حسین ساکن محلّہ کاغذی بہار شریف بن سید اظہر حسین

لاولد

(۳) نقشہ اولاد سید افضال الدین بن سید فرید الدین پنہسہ
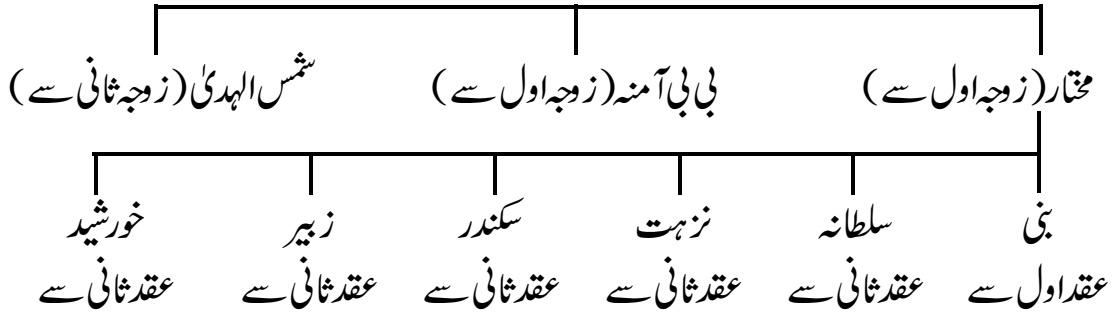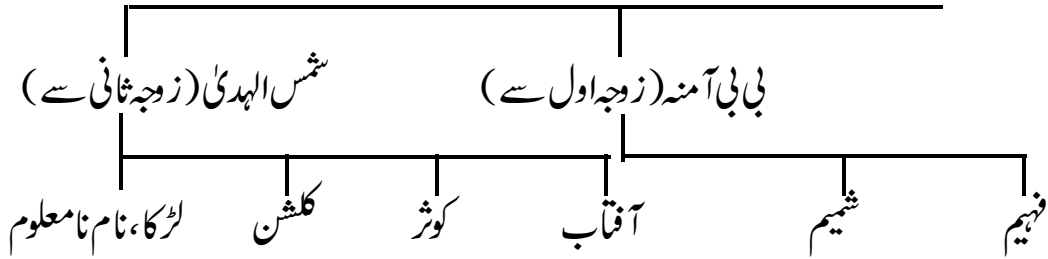
(۳) نقشہ اولاد سید یوسف علی بن سید فرید الدین پنہسہ
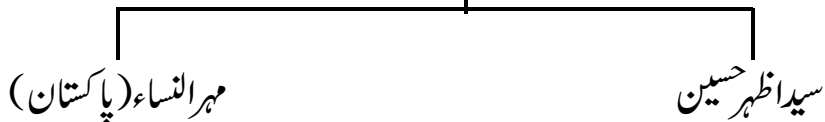
مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے خانگی حالات:

مولانا تو خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، ان کے گھر کی فیاضی اور خوش حالی کی شہرت دور دور تک تھی؛ لیکن والد کے انتقال کے بعد آمدنی کی صورت کم ہوتی چلی گئی، جب بھائی پر تصوف کا

غلبہ ہوا تو وہ بھی والد کی کاشت سے آہستہ آہستہ علاحدہ ہوتے چلے گئے اور مولانا کو امت کے کاموں سے بالکل فرصت ہی نہیں تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ پوری زمین مال گذاری نہ ادا ہونے کی وجہ سے نیلام ہوگئی، مولانا نے اس کی طرف کوئی توجہ بھی نہ کی، نہ کبھی اس پر حسرت وافسوس ہوا۔

مولانا نے چار سال کی عمر میں یتیمی کے دور میں بھی اپنے گھر میں خوش حالی دیکھی تھی، اس کے باوجود مولانا نے بڑے خاندان کے فرد اور مقبول گھرانے کے صاحبزادے کی طرح زندگی کبھی بھی نہیں گذاری؛ بلکہ طالب علمی کے زمانے سے لے کر تدریس کے ایام اور تحریکوں کے قائم کرنے کے عہد تک قناعت، توکل، خاکساری، فروتنی، عاجزی اور انکساری کو اپنا شیوۂ زندگی بنایا۔

مولانا بہت زیادہ سادگی پسند، سادہ پہنتے، سادہ کھاتے اور دوسروں کو اچھا کھلاتے، مہمانوں کے لیے فراغ دست اور خوب فیاض تھے، پیسے کو پس انداز کرنا نہیں جانتے تھے، اپنی ذاتی اور گھریلو ضروریات پر توکل اختیار کرتے، تحفہ وتحائد قبول کرنے میں نہایت غیرت محسوس کرتے۔

مولانا خود فقر غیور کے قائل، مائل؛ بلکہ اس پر عامل تھے، اپنی گھریلو ضرورتوں کے باوجود غیروں کی ضرورتوں کو پوری کرتے؛ بلکہ ترجیحات میں رکھتے۔

مولانا کی قناعت پسندی اور اختیاری غربت کا اندازہ مولانا کی رہائش سے ہوتا ہے کہ پنہسہ کے بڑے وسیع وعریض مکان کو چھوڑ کر پھلواری کے ایک بوسیدہ اور تنگ کرایہ کے مکان میں رہ کر امت کے کاموں میں ہمہ وقت مصروف ہیں اور خوش حال ہیں، یہ مولانا کی کمال سادگی نہیں تو کیا ہے، بہار میں اپنی حکومت ۱۹۳۶ء میں مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کے نام سے بنانے والے کی یہ حالت، یہ صورت اور یہ حقیقت ہے کہ خود ان کا گھر فقر وفاقہ کا شکار، مصارف زندگی کا محتاج، ان کے بھائی یاد خدا میں مستغرق ومصروف اور تلاش حق میں مجذوب اور عالمہ فاضلہ اہلیہ محترمہ دونوں آنکھوں سے معذور اور خود مولانا اپنے جواں سال بیٹے کی وفات سے مغموم، محزون اور شکستہ رنجور ان تمام رنج وغم کے باوجود ملت کے کاموں میں گم اور پریشان اپنی حالات میں مختصر سی علالت اور ۹/دنوں کی بیماری میں وہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جاملے۔

جان دی دی ہوئی اس کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

۱۷/شوال ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۰ء آپ کی وفات کی تاریخ ہے، آپ کے سانحۂ ارتحال کے بعد آپ کی جیب سے صرف ایک روپیہ نکلا، اس کے علاوہ اہل خانہ کے لیے گھریلوں

سامان اور علماء امت اور ان کے رفقائے کار کے چند خطوط اور مراسلے نکلے

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ سامان نکلا

مصادر ومراجع

(۱) تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو: حیات محی الملت والدین کا وہ مقدمہ جس کو حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے تحریر فرمایا ہے۔ (ص:۱۲)

(۲) دیکھئے: مولانا مناظر احسن گیلانی کا مقدمہ جو حیات محی الملہ والدین پر ہے۔ (ص:۱۴)

(۳) ہرگاواں نام کی بستیاں نالندہ میں ہیں: (۱) بہار ہرگاواں، (۲) بربیگھہ ہرگاواں

(۴) ملاحظہ ہو: حیات سجاد، ص:۱۴

(۵) حیات سجاد، ص:۱۸۴

(۶) حیات سجاد

(۷) بحوالہ خاندان سجاد کے اہم اور مشہور فرد ایس ایم شرف متولی صغری وقف اسٹیٹ بہار شریف اور سرپرست مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، نالندہ

(۸) سید احمد جاز نیریؒ کا مزار ندیاواں میں ہے، جو سیرانی ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے۔

(۹) یہاں سید احمد جاز نیری کے بیٹے جمال الدین کا مزار ہے۔

(۱۰) یہاں مغل شہزادی جیتی آرہ بیگم جو بہادر شاہ ظفر کی پوتی ہیں مدفون ہیں۔

(۱۱) بحوالہ سید ابوثمر کنڈہ، رابطہ 8108484468 ہے

(۱۲) بحوالہ ایس ایم شرف متولی صغری وقف اسٹیٹ بہار شریف

(۱۳) مقالہ نگار کی دید و مشاہدے

(۱۴) بحوالہ سید ابوثمر ساکن سید پور کنڈہ

(۱۵) بحوالہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی اپنی نواسی نرگس بانو بنت عزیز النساء زوجہ اولی بانی امارت شرعیہ بہار ساکن ڈاکٹر ذاکر حسین روڈ ۸۸۴ ضلع ہزاری باغ جھارکھنڈ

(۱۶) سید ابوثمر ساکن کنڈہ جو حضرت محمد سجاد کے عزیزوں میں ہیں، جن کا ذکر حاشیہ میں ہو چکا ہے۔

(۱۷) نرگس بانو حضرت مولانا ابوالمحاسن کی نواسی

(۱۸-۱۹) بحوالہ اکبر حسین محلّہ کاغذی یہ صوفی صاحب کے چچازاد بھائی ابوالحسن کے نواسہ کے صاحبزادے ہیں۔

(۲۰) بحوالہ ابوثمر ساکن سید پور کنڈہ

(۲۱) یہ کرایہ کے مکان درنور محلّہ شیر پور میں رہتے ہیں اور خانقاہ معظم بہار شریف کے زیر اہتمام مدرسہ میں

انگریزی، ہندی اور اردو کے استاد ہیں۔

(۲۲) حیات سجاد، ص:۲۱

(۲۳) نرگس بانو بنت سیدہ عزیز النساء زوجہ حضرت مولانا، مقیم ڈاکٹر ذاکر حسین روڈ ۸۴۴، ہزاری باغ جھارکھنڈ

(۲۴) حیات سجاد، ص:۲۱

(۲۵) بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا نام حسن سجاد لکھا ہے، ہوسکتا ہے کہ دیوبند میں پڑھنے کے زمانہ میں ان کا نام حسن سجاد ہو؛ مگر ان کی اپنی بھانجی نرگس ان کا نام حسن امام بتاتی ہیں اور پکارو نام حاسو تھا

(۲۶) نرگس بانو جو مولانا کی نواسی بقید حیات اور بہ ہوش وہواس ہیں، ان کی روایت ہے کہ فی الحال یہ ہزاری باغ کے ڈاکٹر ذاکر حسین روڈ نمبر ۸۴۴ پر مقیم ہیں، ان کے بیٹے محمد اسلم ہیں، جنہوں نے میری بڑی مدد کی ہے۔ (جزاہ اللہ خیرا)

(۲۷) بحوالہ نرگس بانو

(۲۸) یہ حضرت ابوالمحاسن کے چچا ہیں، جن کا خاندان پنہسہ میں آج بھی آباد ہے

(۲۹) یہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے نواسہ ہیں، امارت شرعیہ میں بحثیت منیجر نقیب تا حیات رہے۔

(۳۰) ان کی تین بہنیں تھیں: شاکرہ، حسنی، نام نامعلوم

(۳۱) حیات سجاد: ۲۱

(۳۲) پی ڈبلو ڈی کے بہار میں وزیر تھے

(۳۳) بحوالہ سید مجاہد فردوسی کی والدہ جو نور جہاں کے اپنے بھائی سید شاہ جہاں مرحوم کی بیوی ہیں، محلّہ خانقاہ کی باشندہ ہیں۔

(۳۴) شمس النہار جو سید مخدوم بخش کے پوتے ہیں اور حضرت ابوالمحاسن کے چچازاد پوتے ہیں اور ان کی نواسی نفیسہ کے اکلوتے لڑکے ہیں، جناب شمس نے خاندانی رشتوں کے سلسلہ میں مقالہ نگار کی مدد کی ہے۔

مولانا ابوالمحاسن سجاد علیہ الرحمہ

ولادت اور تعلیم و تربیت سے تعمیر شخصیت تک

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب
مہتمم جامعہ مدنیہ سبل پور پٹنہ وصدر جمعیۃ علماء بہار

شخصیت:

لمبا قد، دبلا بدن، سانولی رنگت، لمبا چہرہ، متوسط آنکھیں، رخساروں پہ ہلکی اور ٹھڈی پہ زیادہ داڑھی، باریک ہونٹ، گھنی مونچھیں، سر پر زلف، بال مثل ریشم، کھدر کی عربوں جیسی چوندار پگڑی، کھدر کا کرتا اور صدری جس کے دونوں طرف جیب، پیر میں معمولی جوتا، ہاتھ میں موٹی لکڑی کا عصا جس کے نیچے وزنی لوہا لگا ہوا، چائے اور زردہ والے پان کے عادی، ''نہیں نہیں'' تکیہ کلام، سادگی، انکساری، سخاوت، دردمندی، فکر ملت، ذہانت و فطانت، ثابت قدمی و بے باکی، دور اندیشی و بصیرت، نکتہ سنجی و معاملہ فہمی کا مرقع، سیاست و قیادت کی باریکیوں کا راز داں اور نباض وقت، ان ظاہری اور باطنی اوصاف کو ترتیب دینے کے بعد جو پیکر وجود میں آئے وہ کوئی اور نہیں؛ بلکہ اسم بامسمی ابوالمحاسن حضرت مولانا سجاد صاحبؒ ہیں، جو امارت شرعیہ کے بانی، جمعیۃ علماء ہند کے محرک اور مسلم انڈی پینڈنٹ پارٹی کے مؤسس ہیں۔

ولادت:

مولانا سجاد صاحبؒ ضلع نالندہ کے ایک قصبہ بہار شریف (جس کے نام پر پورے صوبے کا نام بہار پڑا) کے مضافات میں پنہسہ نامی ایک گاؤں میں سادات گھرانے کے مولوی سید حسین بخش صاحب کے یہاں ماہ صفر المظفر ۱۳۰۱ھ کو پیدا ہوئے، آپ کے والد صاحب نیک، متقی، دیندار، صوفی، با اخلاق اور سخی انسان تھے، ۱۳۰۴ھ میں والد ماجد مولوی حسین بخش صاحب کا انتقال، جب مولانا کی عمر صرف ۴؍سال تھی، مولانا دو بھائی تھے، بڑے بھائی مولوی احمد سجاد صاحبؒ نے آپ کی پرورش و پرداخت کی اور تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیا۔

تعلیم و تربیت:

۶/سال کی عمر میں گھر میں ہی مولوی صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھائے گئے اور اردو، فارسی اور قرآن مجید کی بنیادی تعلیم حاصل کی، عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ۱۳۱۰ھ میں پنہسہ سے ۶/میل دور مولانا سید وحید الحق صاحب استھانویؒ کے مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں داخلہ لیا، بچپن کے لاابالی پن اور تعلیم سے تنفر کی وجہ سے مدرسہ میں زیادہ دن نہ ٹھہر سکے اور بھاگ کر گھر آ گئے، کچھ عرصہ کے بعد بڑے بھائی کے ساتھ کانپور تشریف لے گئے اور مولانا احمد حسن صاحب کان پوری کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔

قیام کان پور کے زمانہ میں ایک بار بڑے بھائی مولوی احمد سجاد صاحب بیمار پڑ گئے، جس کی وجہ کر وہ مولانا محمد سجاد صاحبؒ کو لے کر وطن واپس آ گئے اور علاقے میں ہی تعلیم جاری رہی، اس وقت مولانا کی عمر ۱۵/سال ہو چکی تھی؛ لیکن پڑھائی سے بھاگنے کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔

حصول علم میں استقامت:

اسی بھاگا بھاگی کی وجہ سے ایک روز بڑے بھائی نے سخت پٹائی کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا گھر سے بھاگ گئے، کچھ دنوں تک کچھ اتا پتا نہ چلا، عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ کان پور میں کسی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، گویا بھائی کی مشفقانہ تنبیہ اور تربیت نے مولانا کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا اور مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ حصول علم میں منہمک ہو گئے، ۳/سال کے بعد گھر تشریف لائے، اس وقت آپ شرح وقایہ پڑھ رہے تھے۔

پھر آپ نے بغرض تعلیم دیوبند کا سفر کیا اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، ابھی ۶/ ماہ کا عرصہ گذرا تھا کہ ایک تبّتی طالب علم سے لڑائی ہوگئی اور مجبوراً آپ کو دیوبند چھوڑنا پڑا، ۱۳۱۷ھ میں آپ نے مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں داخلہ لیا اور اپنے وقت کے باکمال مدرس حضرت مولانا عبد الکافی صاحبؒ سے تفسیر جلالین، ملا حسن اور مشکوۃ شریف پڑھی، اور ۱۳۲۰ھ میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ ۱۷، ۱۸، ۱۹/ربیع الاول ۱۳۲۲ھ مطابق ۳، ۴، ۵/جون ۱۹۰۵ء مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں ایک سہ روزہ عظیم الشان جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا، جس میں آپ کو سند فراغت دی گئی اور دستار فضیلت سے سرفراز کیا گیا۔

تعمیر شخصیت میں اساتذہ کا کردار:

زمانہ طالب علمی آپ اپنے حسن اخلاق، پاکیزہ سیرت، ذکاوت و ذہانت، تعلیمی شغف و

انہماک، محنت ومطالعہ اورٹھوس علمی صلاحیت کے باعث طلبہ کے درمیان ہردل عزیزاوراساتذہ کی نگاہ میں محبوب ومقبول رہے،خصوصا مولانا عبدالکافی صاحبؒ کے معتمدخاص اور دست راست بن گئے تھے،زمانہ تعلیم میں آپ کی علمی لیاقت ایسی تھی کہ اساتذہ نے آپ پرمکمل اعتماد کر کے تدریسی خدمت بھی آپ کے سپردکردی تھی اورمنتہی درجات کے طلبہ کوآپ نے زمانہ طالب علمی ہی میں عمدہ درس دیا اورمقبول ہوئے،آپ کی تدریسی مہارت یہیں سے مشہور ہوئی، یہی وجہ ہے کہ فراغت کے بعد آپ کے اساتذہ نے اپنے مدارس میں تدریس کے لیے آپ کا انتخاب فرمایا۔اساتذہ کے مشفقانہ سلوک و اعتماد نے آپ کی شخصیت کی تعمیر وترقی میں اہم کردارادا کیا،آپ کے حوصلوں کوجلاملی اورخوداعتمادی میں بھرپوراضافہ ہوا۔

اساتذہ کا اعتماد:

فراغت کے بعد ناظم مدرسہ حضرت حکیم سید وحید الحق استھانویؒ اور آپ کے اولین استاذ جناب خان بہادر مولانا مبارک کریم صاحبؒ نے مدرسہ اسلامیہ بہارشریف میں تدریسی خدمت انجام دینے پرزورد یااورآپ مدرس ہوگئے،اس وقت آپ کی عمرصرف ۲۳رسال تھی،آپ امیدوں پرکھرے اترے، دیکھتے ہی دیکھتے مدرسہ کی تعلیم کا شہرہ ہوگیا،طلبہ جوق در جوق متوجہ ہونے لگےاوروہاں متوسطات سے بڑھ کرمنتہی درجات اوردورۂ حدیث تک کی تعلیم ہونے لگی۔

پھرتین سال کے بعد آپ کے استاذ حضرت مولانا عبدالکافی صاحبؒ نے آپ کو مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد آنے کی دعوت دی اورآپ وہاں مدرس اور مفتی کی حیثیت سے مقرر ہوگئے اور ۱۳۲۹ھ تک اس فرض کوانجام دیتے رہے۔ یہاں بھی وہی ہوا کہ آپ کے درس کی شہرت سن کر قرب وجوار کے مدارس سے حتی کہ کان پورسے طلبہ بڑی تعداد میں مدرسہ سبحانیہ میں جمع ہوگئے۔

تدریسی تجربات:

مدرسہ اسلامیہ بہارشریف اور مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد کے ایام تدریس میں آپ کو بہت سے تجربات ہوئے جس کی بناپرتعلیم کے سلسلے میں آپ کے مستقل نظریات تھے، دوسری طرف بہار میں دینی مدارس کی زبوں حالی،تعلیم وتدریس کا قدیم اور روایتی اندازاورروز بروزعلمی کیفیت کا انحطاط آپ کی نگاہوں میں تھا،اپنے علاقے کے لیے فکرمند تھےاور بہار کے طلبہ بہار میں مدرسہ سبحانیہ کے طرز پرایک مدرسے کی ضرورت محسوس کررہے تھے،آپ کودوبارہ بہارلوٹنے اورگیامیں ایک نیامدرسہ قائم کرنے پرزوردیتے تھے؛ کیوں کہ جب تک آپ معیاری حیثیت کی تعلیم گاہ کی

بنیاد رکھ کر جس میں کسی کا دخل نہ ہو نمونہ قائم نہیں کر دیں گے اور براہ راست جدو جہد کو کام میں نہیں لائیں گے، مدارس عربیہ کے بوسیدہ نظام میں انقلاب پیدا نہیں ہوگا۔

بالآخر مولانا گیا کے لیے تیار ہو گئے اور ۱۳۲۹ھ میں گیا شہر کے اندر مولانا عبد الوہاب صاحب کے قائم کردہ مدرسہ انوار العلوم کو (جو بالکل ختم ہو چکی تھی) دوبارہ زندہ کیا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ آپ اپنے دو شاگرد مولانا عبد الصمد رحمانی اور مولانا عبد اللہ صاحب آبگلوی دونوں صاحبان کو مقدمۃ الجیش کے طور پر گیا روانہ کیا، انہوں نے ایک مناسب مکان کا انتخاب کیا اور مولانا کو اطلاع دیدی، تقریبا ۱۵/دن کے بعد حضرت مولانا ۱۵، ۲۰ بہاری طلبہ کو لے کر گیا تشریف لے آئے اور ظفر منزل کے سامنے ایک دو منزلہ مکان کرایہ پر لے لیا، پھر گیا کی ایک خاتون نے مدرسہ کے لیے ایک وسیع قطعۂ اراضی وقف کی اور آپ کی شب و روز کی محنت اور تگ و دو سے مدرسہ کی شاندار عمارت بن گئی۔

شروع میں آپ کو اور طلبہ کو وہاں بڑی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا؛ لیکن سب نے ایک بلند مقصد کی خاطر یہ ساری صعوبتیں برداشت کیں، مولانا ارادے کے بڑے قوی، بلند ہمت اور صاحب صبر و عزیمت تھے؛ اس لیے شدائد و محن آپ کو اپنے راستے سے ہٹا نہ سکیں اور بلند عزائم و مقاصد کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں، چنانچہ آپ کی مخلصانہ کاوشیں بار آور ہوئیں اور تھوڑی ہی مدت میں وہ مدرسہ بہار کا ایک مرکزی اور مثالی ادارہ بن گیا، جہاں دور دور سے طلبہ آ کر اپنی علمی پیاس بجھانے لگے۔

سیاست سے وابستگی کا اصل محرک:

مولانا جب مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، اس وقت ایک شیعہ نوجوان زاہد علی خان، جو انگریزی کے بہت اچھے جانکار تھے، عصر کے بعد روزانہ آپ سے ریاضی اور معقولات کا درس لیا کرتے تھے، وہ روزانہ کے انگریزی، اردو اخبارات مولانا کو سنایا کرتے تھے، جن میں ممالک اسلامیہ کے بارے مین تشویشناک خبریں ہوا کرتی تھیں، جن سے مولانا کا دل و دماغ بہت متأثر ہوا کرتا تھا، اسی تأثر نے مولانا کے غور و فکر کے موضوع کو بدلا، ذہن نے پلٹا کھایا، وہ دماغ جواب تک مختلف علوم و فنون کی باریکیوں پر صرف ہوا کرتا تھا اور وہ فکر جواب تک مشکل سے مشکل مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں کام آیا کرتی تھی، وہ مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے اہم مسائل تک بھی پہنچنے لگی، اور درس و تدریس کے ساتھ مسلمانوں کے

دوسرے مسائل پر غور و فکر میں بھی صرف ہونے لگا۔

بیعت وخلافت:

آپ کم عمری ہی میں مولانا قاضی سید احمد صاحب شاہ جہاں پوریؒ سے بیعت ہو چکے تھے، قاضی صاحب نہایت دین دار، متقی و پرہیز گار، متشرع اور مشائخ حقہ میں سے تھے، حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کے والد ماجد، بڑے بھائی اور گھر کے دیگر افراد بھی قاضی صاحبؒ سے ہی بیعت تھے، مولانا نے اپنے مرشد سے علم باطنی بھی حاصل کی اور اجازت وخلافت سے بھی سرفراز کیے گئے، حضرت مولانا بیعت فرمایا کرتے تھے؛ لیکن بہت کم، اسی وجہ سے ان کے مریدین ومتوسلین کے بارے میں معلومات نہیں ملتی ہیں، وہ طریقۂ نقش بندی تھے، آپ مشرب عقل وشرع کے مطابق، ان ارباب تصوف سے جداگانہ تھے، جنھوں نے نوافل واوراد کے سلسلۂ دراز میں الجھ کر اجتماعی شیرازہ بندی کو پراگندگی سے محفوظ رکھنے کی نہ صرف ذمہ داری کا احساس ضائع کردیا؛ بلکہ اسی طریق عزلت کو حقیقت اسلام سمجھ کر عام دعوت وتلقین اور دعاء وتسخیر کے ذریعہ وسیع کرنا شروع کردیا۔ حضرت ابوالمحاسنؒ کو اپنی فطری صلاحیت کے ساتھ ماحول بھی ایسا ملا، جہاں نوافل واوراد کے اشغال قومی وملی خدمات اور مالی وجانی قربانیوں کے مقابلہ نہ صرف مرجوح؛ بلکہ سنت کے طریق سے جدا متصور ہوتے، پھر تبحر علمی ونکات فہمی کی تائید۔ آخر ان سب روشنیوں میں اصل حقیقت روشن ہوگئی کہ اسلام میں عبادت کی مانگ سے کہیں زیادہ اور شدید مانگ صداقت وامانت، تقوی وطہارت، مالی وجانی قربانی کی ہے۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ
ولادت سے تعمیر شخصیت تک

ڈاکٹر محمد کفیل احمد ندوی
محلّہ بیل تل، بہار شریف نالندہ (بہار)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت خداوندی نے اس متمدن، مہذب، زرخیز، علم دوست اور روح افزا خطہ میں وجود بخشا تھا، جس کی قسمت میں تقریبا پانچ ہزار سالوں سے اہم اہم نوابغ ازمنہ شخصیتوں کو پیدا کر کے گفتار و کردار کا مثالی نمونہ بنانا تھا، اسی مخصوص خطہ کا نام وِہار تھا، جو بعد میں بہار اور صوبہ بہار کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے، ہزاروں سال قبل یہ علم و معرفت کی مشہور و معروف نگری تھی، اپنے علمی امتیاز، روحانی شہرت اور امن و شانتی کی خصوصیت کی بنا پر پورے ایشیا اور یورپ کے محققین اور علوم و فنون کے طلب گاروں کا بالخصوص ڈھائی ہزار سال سے مرکز توجہ رہا ہے۔

وِہار (بہار) کی سرزمین ہمیشہ انقلاب خیز رہی ہے، یہاں کے لوگ مقلد تو رہے ہیں؛ لیکن تقلید جامد کے مقلد نہیں، ان کی خو میں ہمیشہ حریت، آزادی اور تفنن رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ کبھی وہار (بہار) کی راجدھانی مگدھ قرار پائی تو کبھی پاٹلی پتر اور کبھی راجگیر اور آخر میں بہار شریف بھی مفتوحہ علاقہ کا صدر مقام رہا ہے۔(۱)

اسی بہار شریف سے ۱۲ر کیلومیٹر کی دوری پر جنوب کی جانب نالندہ ہے اور ٹھیک اسی سے بالکل متصل حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کا گاؤں پنہسہ (Panhassa) ہے، یہی نالندہ اور پنہسہ ان کی جائے پیدائش ہے، نالندہ کی شہرت اس وجہ سے پورے ایشیا اور یورپ میں ہے کہ یہاں دنیا کی ایک عظیم یونیورسٹی تھی، جہاں پانچ ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے اور ان کی تدریس کے لیے ایک ہزار قابل فن اور ماہر علم اساتذہ مامور تھے، ملک و بیرون ملک کے طلبہ کثرت سے یہاں جوق در جوق آتے اور علمی پیاس بجھاتے، چین، کوریا، جاپان، برما اور تبت تک سے پڑھنے

والے طلبہ کی بڑی تعداد یہاں اقامت پذیر رہتی تھی، اس علاقے میں اس کے علاوہ بھی بڑی بڑی یونیورسٹیاں تھیں، مثلا: اوتنت یونیورسٹی، وکرم شیلا یونیورسٹی اور تکشیلا یونیورسٹی وغیرہ۔

اسی علاقہ سے وید مذہب، جین دھرم اور بدھ مت کا نظری، فکری، علمی، روحانی، تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی انقلاب پورے ایشیا براعظم اور بعض یورپ کے حصے میں پھیلا۔

اس طرح بہار شریف نالندہ اور اس کے اطراف، اکناف اور مضافات میں شہاب الدین غوری کے عہد حکومت سے انیسویں صدی کے نصف آخر تک احسان، طریقت، معرفت کے مراکز رہے ہیں اور اسی طرح بزرگان دین سے منسوب سلاسل؛ یعنی سلسلہ فردوسیہ، زاہدیہ، قادریہ، چشتیہ، شطاریہ کی خانقاہیں رہی ہیں اور مذکورہ سلسلوں کے بزرگوں کے مزارات اور آستانے آج تک جگہ جگہ موجود ہیں، جہاں ہندو مسلم معتقدین کی بھیڑ یا معتد بہ تعداد دکھائی دیتی ہے۔

بہار شریف کے گرد و نواح کے جس قریہ، جس علاقے اور جس محلّہ میں جا کر جائزہ لیجئے تو کسی ایک بزرگ کا مزار ضرور ملے گا، بعض معمولی سی آبادی میں کئی کئی بزرگوں کے مزارات ملیں گے، کہیں آپ کو غیر آباد زمین پر بھی بزرگوں کے آستانے ملیں گے، بہار شریف کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں بہت سارے نامعلوم ولیوں، شہیدوں اور قطب حضرات کے مزارات بھرے پڑے ہیں، اسی لیے بعض بزرگ بہار شریف میں بغیر چپل اور جوتے کے آتے تھے؛ تاکہ کسی بزرگ کے مزار کی نادانستہ بے ادبی نہ ہو جائے۔

بہار شریف صدیوں سے اہل اللہ کی پناہ گاہ رہی ہے؛ بلکہ ہر زمانہ میں یہ معرفت، روحانیت اور تصوف کی سرزمین رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ بہار شریف کے کسی گاؤں میں مخدوم کمال الدین بیابانی ہیں، (۲) تو یہاں پہاڑ پر فاتح بہار سید ابراہیم بن سید ابی بکر اپنے اقربا اور شیدائیوں کے ساتھ مدفون اعلاء کلمۃ الحق کی شاندار علامت بنے ہوئے ہیں، (۳) محلّہ انبیر میں حضرت احمد چرم پوش بن سید موسیٰ ہمدانی آسودۂ خاک ہیں، (۴) ان کے مزار سے پچھّم جانب کچھ معمولی فاصلہ پر محلّہ کاغذی میں حضرت مخدوم احمد سیستانی کا گنبد والا مقبرہ ہے، ان کے چہار جانب اولیاء اللہ کے بہت سارے مقابر ہیں، یہاں سے ایک کیلومیٹر جنوب میں بڑی درگاہ ہے، جہاں مخدوم شیخ شرف الدین احمد بہاریؒ کا آستانہ عالیہ ہے، ان کے ساتھ ان کی والدہ بی بی رضیہ، ان کے دائیں بازو میں متصل ہی آسودۂ خاک ہیں اور ان دونوں کی پائینتی میں برادر خاص شیخ جلیل الدین اور کاتب خاص حضرت زین بدر عربیؒ ہیں، ان کے علاوہ مخدوم جہاں سے پہلے کی چار سیدات کے مزارات ہیں۔

آستانہ عالیہ حضرت مخدوم جہاں سے مشرق میں چھوٹی درگاہ ہے، یہاں بھی حضرت مخدوم کے معاصر حضرت پیر بدرالدین بدر عالم زاہدی کا مرقد ہے، یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے بنگال، چاٹگام، اراکان، برما، تریپورہ میں دین حق کی نشر واشاعت کی تھی اور محنت سے بہت سارے لوگ راہ راست پر آئے تھے۔(۵)

اس طرح آستانہ عالیہ سے مغرب چند ہی قدم پر گنبد والا مقبرہ جس کا نام استاد درگاہ ہے، جہاں حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخیؒ اوران کے متعلقین کی آرامگاہ ہے، یہ مخدوم جہاں کے دوسرے سجادہ نشیں ہیں، ان کی بارگاہ سے جنوب میں ایک کیلومیٹر کے فاصلہ پر حضرت مخدوم یتیم اللہ سفید باز کا مدفن ہے، (٦) جو مخدوم جہاں کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں، اسی طرح چھوٹی درگاہ سے چند قدم کے فاصلہ پر شمال کی طرف حضرت مخدوم عطاء اللہ بغدادی کا مزار ہے، (۷)اور مخدوم احمد سیستانی سے متصل بزرگوں کے مزارات اور خانقاہوں کی مناسبت سے ایک محلّہ کا نام قدیم زمانہ سے چشتیانہ (۸) تھا، اسی طرح کی مناسبت سے بہار شریف میں استھاواں کے قریب ایک بستی کا نام چشتی پور ہے، جو شیوخ صدیقی بزرگان کی مشہور بستی ہے، جہاں مسلمانوں کی آبادی تو ہے؛ لیکن خانقاہ برائے نام ہے، آزادی ہند سے پہلے مشہور اوراچھی خانقاہ تھی، جو فی الحال عرس وفاتحہ تک محدود ہے اور سجادہ کی جگہ مدتوں سے خالی ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ بہار شریف کے چہار جانب چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں صوفیائے کرام کے مزارات اور ان کی خانقاہیں موجود تھیں، ان بزرگوں کے علمی، روحانی، عرفانی اور تربیتی خدمات کی وجہ سے یہ شہر صدیوں قبل عالمی شہرت حاصل کر چکا تھا، شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہاں کے بزرگوں نے اپنے عارفانہ اور صوفیانہ کمالات کے واضح نقوش بیرون شہر، بیرون صوبہ، بیرون ملک میں ثبت کئے اوراچھے نقوش چھوڑے، چنانچہ حضرت مخدوم جہاںؒ کے خلیفہ اول اورنہایت چہیتے مرید حضرت مولانا مظفر بلخی علیہ الرحمہ نے سلسلۂ فردوسیہ کا تعارف ہندوستان کے دہلی، ظفرآباد، جون پور، بنگال، مکہ مکرمہ اور عدن میں جا کر کرایا اور عدن ہی میں ۳/رمضان ۷۸۸ھ میں وفات پائی اور وہیں مدفون بھی ہیں۔(۹) اسی طرح مجددیت کا تعارف ماوراء النہر، خراسان، مغرب، عراق اور حجاز میں محمد درویش عظیم آبادی (۱۰) نے کرایا تھا، سلسلہ قادریہ کا تعارف ملک سوڈان میں تاج الدین نامی بہاری بزرگ نے کرایا تھا، (۱۱) بہار شریف کی قدیم روحانی اور عرفانی فضا نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کو دہلی میں ان کے عین شباب میں متاثر کیا تھا، جب ان کو خضر پارہ دوز

اوران کی خانقاہ کی تعریف معلوم ہوئی تو انہوں نے یہاں آنے کا عزم اور پکا ارادہ فرمالیا تھا، لیکن وہ نہیں آسکے اور وہیں حضرت بابا فرید سے بیعت ومرید ہو گئے، (۱۲) اسی طرح ہندوستان میں علوم شریعت وطریقت کے متفقہ ماہر عظیم شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی بہار کی عظمت رفتہ کی تعریف اس طرح فرمائی کہ بہار ایک زمانہ میں علما وفضلا کا مرکز تھا۔ (۱۳)

اسی طرح دنیا کے مایہ ناز عالم اور عربی زبان کے منفرد ادیب علامہ ابوالفضل نے اپنی کتاب دفتر ابوالفضل میں مخدوم جہاں کی تصنیف شرح آداب المریدین سے تین ابواب شامل کئے تھے۔ (۱۴)

مذکورہ مجمل اشارات اور نالندہ وبہار شریف کے فضائل کے متعلق قدیم یاد داشت، تذکرے اور تواریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ بہار شریف نالندہ میں ہزاروں سال سے علم وفضل جاری وساری تھا اور صدیوں سے مختلف سلاسل کے بزرگوں کے ذریعہ یہاں کی قدیم خانقاہوں میں تزکیہ، تصفیہ، تصوف اور احسان کے کام مسلسل ہوتے رہے۔

قدرت خداوندی نے چودھویں صدی کی ابتدا میں بہار شریف نالندہ سے متصل جاز نیری سادات کی ایک چھوٹی سی بستی پنہسہ میں انہی کی پاکیزہ نسل میں سے ۱۸۵۷ء کے خون آشام واقعہ کے دو دہائی کے بعد ماہ صفر المظفر ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں نابغۂ روزگار، نہایت ہونہار اور خوب صورت لڑکا مولوی سید حسین بخش کے گھر میں پیدا ہوا، والد نے نام محمد سجاد رکھا، گھر کے کسی بزرگ نے کنیت ابوالمحاسن رکھی، والدین کے لیے یہ دوسری اولاد تھی، خاندان میں مسرت وانبساط کی لہر دوڑ گئی، سب نے نئے بچہ کی پیدائش پر مبارکبادی دی، گھر اور خاندان کا تعلق کافی دین دارانہ تھا، نام رکھنے میں بھی والدین نے سنت اور شریعت کو ملحوظ رکھا، عشق محمدی کے جذبہ سے بڑے کا نام احمد، تو منجھلے کا نام محمد رکھا اور دونوں کے ساتھ سجاد مرکب کر کے نام کے حسن کو دوبالا کر دیا، پھر ابوالمحاسن کی کنیت اس کے ساتھ ملا دی تو معنویت گہری ہوگئی۔

گھرانہ خوش حال تھا، دادا سید فریدالدین مرحوم بڑے زمیندار تھے، اپنے زمانہ کے رئیس تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کی ریاست کے چار وارثین تھے، ان میں مولانا محمد سجاد کے والد بڑے تھے، نہایت دلدادہ اور بڑے اخلاق مند تھے، ذی شعور، روشن ضمیر اور صوفی مشرب تھے، شروع شروع میں اتالیقی اور معلّمی ان کا پیشہ تھا، جب اس سے جی اکتا گیا تو انہوں نے اپنی اراضی اور کھیتی سنبھالی، کچھ ٹھیکیداری بھی سے دلچسپی لی، مگر ان کی زندگی نے وفا نہیں کی، مولانا محمد

سجاد علیہ الرحمہ کوصرف چار سال کی عمر میں (۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں) چھوڑ کر راہی جنت ہوئے، اس کے بعد گھر میں ان کی والدہ بی بی بصیرن (بصیر النساء) نے دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھالی اور پھر ان کے بڑے بھائی مولوی سید احمد سجاد جو بہت بعد میں صوفی احمد سجاد کے لقب سے مشہور و معروف ہوئے، زبردست شفقت، محبت اور پیار کے ساتھ سرپرستی کی اور ان کی تعلیم وتربیت سے متعلق کافی فکر مند رہے اور پوری توجہ کے ساتھ ان کو گھر میں پڑھاتے رہے، چھ (۶) سال کی عمر میں ان کا داخلہ اپنے دالان کے مکتب میں کرادیا، جہاں وہ ۱۸۸۶ء میں ایک مولوی صاحب سے ناظرہ قرآن مع تجوید، اردو، فارسی کی تعلیم حاصل کی، ۱۸۹۲ء مطابق ۱۳۱۰ھ میں بہار شریف میں بی بی جین وقف اسٹیٹ کے زیر اہتمام ایک مدرسہ قائم کیا گیا، جس کا نام مدرسہ اسلامیہ رکھا گیا، اس کی بنیاد مولانا حافظ وحید الحق استھانوی بہاری نے رکھی تھی، وہی اس کے ناظم بھی تھے اور سرپرست بھی، انہی کے دم قدم سے بہار شریف کے محلّہ قمر الدین گنج میں یہ دانشکدہ رونق افروز ہوا، انہوں نے مدرسہ اسلامیہ میں جن عزیز بچوں کے داخلے لئے، ان میں سے ایک مولانا محمد سجاد بھی تھے۔ اس مدرسہ میں ان کے بھائی احمد سجاد نے اس لیے داخلہ کرادیا کہ یہ پنہسہ گاؤں سے قریب صرف بارہ (۱۲) کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھا اور اس کے ناظم وبانی حافظ سید وحید الحق اتھانوی بہاری رشتہ دار اور چچازاد بہنوئی تھے، انہی کے زیر تربیت عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، بعد میں وہ مولانا محمد سجاد کے خسر بھی ہوگئے۔

مولانا محمد سجاد بہت ذہین، کافی فطین، نہایت اخاذ اور سریع الحس تھے؛ لیکن طبیعت اور مزاج میں کم عمری کی وجہ سے یکسوئی پیدا نہیں ہوئی تھی تو سید مولوی صوفی احمد سجاد کا یہ خیال ہوا کہ ان کا داخلہ مشہور زمانہ استاد مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسہ میں کرادیا جائے، چنانچہ وہ اپنے بھائی مولانا محمد سجاد کو ساتھ لے کر کانپور تشریف لے گئے اور وہاں پہونچ کر انہوں نے مولانا محمد سجاد کا داخلہ مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسہ میں کرادیا، یہ ۱۸۹۵ء کی بات ہے، مولانا محمد سجاد کی عمر کا پندرہواں سال تھا، انہوں نے یہاں شرح وقایہ وغیرہ تک تعلیم حاصل کی، یہاں وہ تعلیم کے حصول کے شوق میں تقریباً تین سال زیر تعلیم رہے، جب یہاں تھے تو اس زمانہ میں مولانا محمد سجاد میں تعلیمی شوق بڑی تیزی کے ساتھ پروان چڑھ رہا تھا، پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں داخل ہوئے، ۱۳۱۷ھ سے ۱۳۲۲ھ تک وہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

حضرت مولانا محمد سجاد نے بارہ سال تک تعلیم حاصل کی، اس دوران اپنے تعلیمی نصاب کے

مطابق انہوں نے تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، عربی ادب، معانی وبیان، منطق، فلسفہ وغیرہ معقولات ومنقولات کی اہم مروجہ کتابیں پڑھیں، پھر مدرسہ سبحانیہ کی طرف سے ۱۷، ۱۸، ۱۹/ربیع الاول ۱۳۲۲ھ مطابق ۳، ۴، ۵/جون ۱۹۰۵ء کو ایک بڑے مجمع میں آپ کو سند فراغت عطا کی گئی۔

آپ کی پہلی تربیت گاہ

پنہسہ جہاں آپ کی جائے پیدائش ہے، وہ پہلی جائے تربیت اور پہلی درسگاہ بھی ہے، دیندار ماں کی آغوش، صوفی نما مولوی باپ کی چار سالہ معیت اور محبت وشفقت وگاؤں پنہسہ کے مولوی صاحب کی بحیثیت استاد واتالیق تربیت اوران کے برادر معظم مولوی احمد سجاد جیسی ہمدردانہ شخصیت ساز کی نگرانی اورنگہداشت کے پندرہ سالہ پیہم معاملات سب ملاکر آپ کی پہلی تربیت کے خاص عناصر ہیں۔

آپ کی دوسری تربیت گاہ:

آپ کی دوسری تربیت گاہ بہار شریف کا وہ مدرسہ اسلامیہ ہے، جس کا قیام ۱۸۹۲ء میں ہوا (۱۵) جس کے بانی وناظم حافظ سید وحید الحق استھانوی تھے، جو آپ کے چچازاد بہنوئی تھے اور پھر آپ کے سسر بھی ہوئے۔ آپ مدرسہ اسلامیہ کے قیام کے بعد ہی ناظم مدرسہ سے قرابت کی وجہ سے داخل ہوئے، ابھی مدرسہ اسلامیہ کی تعلیم وتربیت کی ابتدا ہوئی تھی کہ وہاں ناظم صاحب سے قرابت اوران کی تعلیمی صلاحیت اور تربیتی اہمیت کی وجہ سے آپ کو داخل درس کر دیا گیا۔

آپ کے تذکرہ نگاروں نے مدرسہ اسلامیہ میں داخلہ کا سن ۱۳۱۰ھ لکھا ہے اور آپ کی پیدائش کا سن ۱۳۰۱ھ اور مہینہ صفر لکھا ہے، (۱۶) اس اعتبار سے آپ تقریباً کچھ کم دس سال کی عمر میں داخل ہوئے، جبکہ مدرسہ اسلامیہ کے وقف نامہ کی تاریخ ۱۸۹۲ء ہے اور مولانا محمد سجاد کے داخلہ کا زمانہ وسال ایک ہے؛ یعنی ۱۸۹۲ء، تو انگریزی سال کے اعتبار سے مولانا کے داخلہ کے وقت آپ کی عمر بارہ (۱۲) سال ہوئی، کیوں کہ آپ کی پیدائش کا سال ۱۸۸۰ء ہے تو ۱۸۹۲ء میں مدرسہ اسلامیہ جاری ہوا، (۱۷) اوراسی سال آپ اس میں داخل ہوئے تو یقیناً بارہ سال کی عمر سے آپ کی ابتدائی عربی تعلیم کا آغاز ہوا، آپ کی تربیت مولانا وحید الحق کے ہی زیر سایہ ہوئی۔

آپ کی تیسری تربیت گاہ:

آپ کی تیسری تربیت گاہ اور درس گاہ مولانا احمد حسن کانپوری کا مشہور زمانہ مدرسہ کو بتایا

جاتا ہے، اس مدرسہ میں داخلہ کے وقت آپ کی عمر پندرہ (۱۵) سال تھی، یہاں آپ تین (۳) سالوں تک رہے اور شرح وقایہ پڑھنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے دیوبند گئے، وہاں چھ (٦) ماہ رہ کر واپس ہو گئے اور الہ آباد کے مولانا عبدالکافی کی درس گاہ اور وہاں کی تعلیم وتربیت کی پورے بہار اور یوپی میں شہرت تھی، چنانچہ آپ ان کے حلقۂ درس میں داخلہ کے شوق میں مدرسہ سبحانیہ الہ آباد چلے گئے۔

آپ کی چوتھی تربیت گاہ

آپ کی تعلیم مشکوٰۃ المصابیح سے لے کر آخری تعلیم تک مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں ہوئی اور ۳، ۴، ۵/جون ۱۹۰۵ء میں آپ کی دستار بندی کی رسم ایک عظیم الشان جلسہ میں ہوئی۔

آپ کی پیدائش کے سال سے سند فراغت کے حصول اور تعلیم کتب مروجہ کی تکمیل تک سنہ عیسوی کے اعتبار سے چوبیس (۲۴) سال چھ ماہ ہوئے؛ لیکن حضرت امیر شریعت رابع علیہ الرحمہ نے اس وقت کی عمر کو تئیس (۲۳) سال شمار کیا ہے۔(۱۷)

مذکورہ دانش کدوں اور تربیت گاہوں میں آپ نے علوم نقلیہ اور عقلیہ کو بڑی محنت، جانفشانی اور لگن سے پڑھا، ذہن ودماغ میں اتارا، قلب وجگر کو لگایا اور پڑھنے اور مطالعہ کی جدوجہد کو ساڑھے چودہ (۱۴) سال مسلسل لگے رہے، مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں طالب علمی کے آخری دور میں آپ نے وہاں منتہی درجات تک کی کتابیں پڑھائیں۔(۱۸)

اس طرح گھر خاندان سے پاکیزہ ماحول، والدہ کی توجہ اور بھائی صوفی احمد سجاد کی نظر عنایت، مدرسہ اسلامیہ بہار شریف، مدرسہ کانپور، دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ سبحانیہ الہ آباد کی علمی وروحانی اور عرفانی فضاؤں میں ایک پر ایک اللہ والے، لائق وفائق، قابل فخر اور کم یاب مخلص اساتذہ کی تربیت اور ان کے قیمتی عارفانہ توجہات نے آپ کی زندگی میں چار چاند لگا دیا۔

جب پوری تعلیم حاصل کر چکے اور اعلیٰ تربیت سے آراستہ ہو چکے تو سات سالوں تک اپنے دونوں مادر علمی (۱) مدرسہ اسلامیہ بہار شریف (۲) مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں تدریسی خدمات کے ذریعہ اپنے پڑھنے کا کفارہ ادا کیا، مزید یہ کہ اپنے وطن سے قریب گیا میں مدرسہ انوارالعلوم (۱۹) کو ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں دوبارہ قائم کیا، یہاں دس (۱۰) سال تک خون پسینہ ایک کر کے مدرسہ کے تعمیراتی، تدریسی اور انتظامی امور نہایت بہتر طریقے سے انجام دیتے رہے۔

یہاں سے آپ کے باصلاحیت تلامذہ نکلے، جنہوں نے قوم وملت کی خدمت کی۔ ان میں

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نائب امیر شریعت بہار، مولانا احمد اللہ آبگلوی رفیق دائرۃ المعارف حیدرآباد، مولانا اصغر حسین پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، مولانا ضمیر الحق چمپا پوری اور مولانا فرخند علی سہسرامی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مدرسہ انوار العلوم کے قیام کے بڑے اہم مقاصد تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ مدرسہ انوار العلوم کے ذریعہ ہندوستان کے علماء، مشائخ اور دانشوروں کو متحد کیا جائے، مسلم امت کا ایک متحدہ پلیٹ فارم ہو، تمام رہبران ملت ایک ہو جائیں، پوری ملت اسلامیہ ایک سمت ہو کر حالات حاضرہ کی نگرانی کرے، بدلتے ہوئے حالات پر کڑی نظر رکھی جائے، ہندوستان میں آئندہ نسلوں کے اسلام کی حفاظت اور اسلامی تشخص کی بقا کے لیے تنظیم اور جماعت کی تشکیل کی جائے۔

چنانچہ ان منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لیے ہندوستان کے سربرآوردہ علماء اور چوٹی کے مشائخ کے نام خطوط لکھے اور ان سے ملاقاتیں کیں اور بلاتفریق مسلک و جماعت سب کی تائید حاصل کی، (۲۰) اور ملک کے دانشوروں اور ملت کے بہی خواہوں کو قدم بہ قدم ساتھ رکھا، (۲۱) اور عصر حاضر کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ملت اسلامیہ کے رہنماؤں کے مشورے اور اتفاق رائے سے مندرجہ ذیل مجلس، تحریک، جمعیت، امارت اور پارٹی بنائی:

(۱) مجلس علماء بہار (۲) تحریک خلافت

(۳) جمعیۃ علماء ہند (۴) امارت شرعیہ بہار

(۵) امارت شرعیہ بورڈ (۶) بہار مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی

ان تمام تحریکات کے قیام اور تاسیس کا مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کے تشخص کا تحفظ تھا اور یہ بھی مقصد تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دعوت کی محنت، سید محمد جاز نیریؒ اور سید احمد جاز نیریؒ کا جہاد، حضرت مخدوم شیخ شرف الدینؒ کی عبادت، فاتح بہار سید ابراہیم ملک بیاؒ کی شہادت، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی عزیمت و دعوت، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی دور بینی، دوررسی اور فراست اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقائے کار کا جہاد سیف و قلم کی روح کی وحدت تاثیر کو آئندہ نسلوں میں پیدا کیا جائے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی اٹھان اور فکر کی پرواز کا سرچشمہ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیی منیری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے معاصرین بزرگان دین مثلاً حضرت احمد جاز نیری اور حضرت محمد جاز نیری اور حضرت سید ابراہیم ملک بیا فاتح بہار کی مساعی جمیلہ تھیں، انہی بزرگوں

کی دعوتی، اصلاحی، فکری جدو جہد کو سیرت فولاد کی شکل میں دوبارہ زندہ کر کے ایسا نظام پورے ہندوستان میں برپا کرنا چاہتے تھے جیسا کہ ان کی تصانیف، مقالات اور مکاتیب سے بھی واضح ہوتا ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے بزرگ حضرت مخدوم بہاریؒ کی روش کو اختیار کرتے ہوئے علماء ہند کے نام مکاتیب اور خطوط لکھے، حضرت سید احمد جاز نیریؒ اور حضرت محمد جاز نیریؒ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے قلمی جہاد کیا اور خانقاہ قائم کرنے کے بجائے اسی کام کے انجام دینے کے لیے انہوں نے مدرسہ قائم کیا، اسی خانقاہ نما مدرسہ میں بوریا نشیں ہوئے اور صوفیانہ طرز پر زندگی کو استوار کیا، بزرگوں، مشائخ، علما، شاگردوں اور عزیزوں کو اسی خانقاہ نما مدرسہ میں بلا کر ہندوستانی مسلمانوں کے اسلامی تشخص کی بقا اور ایسے نظام کے جاری کرنے پر غور وفکر کی دعوت دی۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی آفرینش نئے عہد، نئی صدی ہجری کے بالکل شروع میں ہوئی، جدت پسندی، تبدیلی، انقلاب اور شرار آرزو، ان کی خود، ان کے مزاج، ان کی فکر اور ان کی کوشش میں تھی، یہی سبب ہے کہ ساڑھے چودہ (۱۴) سالہ تعلیمی جدو جہد (۲۲) اور سترہ (۱۷) سالہ مدرسانہ، عالمانہ اور عارفانہ زندگی کے۔ طویل مطالعہ اور پیہم تجربات کی روشنی میں وہ دینی مدارس، مدارس کے طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم میں عصر حاضر کے تقاضے کے مطابق قدیم نافع اور جدید صالح کا حسین امتزاج چاہتے تھے، اسی طرح وہ زندگی کے تمام شعبوں میں نفع بخش بدلاؤ کے قائل ہی نہیں ؛ بلکہ اس کے داعی تھے ۔

اٹھے اور اٹھ کر رخ زندگی بدل دے
کوئی ایک جواں مجاہد وہی ایک مرد غازی

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد اپنے عہد کے تجدیدی کاموں کے بانی اور رہنما تھے، ان کا نظریہ مصالح دینیہ کے سلسلہ میں جدت پسندانہ تھا، وہ نئے دور میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کرنے کے لیے سخت سے سخت مجاہدے کر رہے تھے، صالح معاشرہ کے لیے ہندوستان کے علماء، مشائخ اور دانشوروں کو ایک صف میں کھڑا کر رہے تھے، تمام مسالک کے علماء ومشائخ کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر شیر وشکر کر رہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ عوام کی شیرازہ بندی کر رہے تھے، اسی طرح تمام مدارس اسلامیہ کو گول بند کر کے ایک نظام کے تحت لانے کی سعی کر رہے تھے، اسی کے ساتھ ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ اور دانشوروں کو علماء ومشائخ کے ساتھ متحد کر کے ملت اسلامیہ کو بنیان مرصوص اور آہنی قلعہ میں محفوظ کرنا چاہ رہے تھے؛ بلکہ ان کی دلی آرزو تھی کہ تمام ممالک

اسلامیہ اورتمام دنیائے اسلام کا متحدہ محاذ ہو، ان کی خواہش شاعر مشرق علامہ اقبال کی انقلاب انگیز آواز سے ہم آہنگ تھی۔

اک ہو مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد ملت اسلامیہ کے مجدد، علوم وفنون کے ماہر، شریعت کے خازن، اسلام کے مفکر، عصر حاضر کے مجاہد، عزم واستقلال کے پیکر، اکابر علما ومشائخ کے نورنظر، عوام وخواص کے درمیان راہبر وسردار، عہد ساز، زمانہ کے نبض شناس اور خط افلاس سے نیچے زندگی گذارنیوالوں کے ہمدرد ودلنواز، ملک کے بے لوث غریب پرور اور غریب نواز، اور علماء ومشائخ کے ہمدم وہمراز تھے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کا اخلاص تو طالب علمی کے دور سے ہی تھا، آپ پڑھنے کے زمانے میں اپنے سے اونچے درجات کے طلبہ کو پڑھاتے، ان کی درسیات کی مروجہ کتابوں کے مشکل مقامات کو حل کراتے تھے، لیکن جب آپ گیا آئے تو آپ کے بعد عالم باطن کے کے لیے راہبر اور شیخ کی تلاش ہوئی، چنانچہ آپ مولانا قاضی سید احمد صاحب شاہ جہاں پوری (۲۳) سے بیعت ہوئے، مولانا کے والد، بڑے بھائی مولوی صوفی احمد سجاد اور گھر کے اور لوگ بھی انہی کے دست گرفتہ تھے اور مولانا کو اجازت وخلافت بھی حاصل تھی۔ (۲۴)

انسانی فلاح وبہبود کے لیے جدوجہد کرنا، امن وآشتی کو قائم اور باقی رکھنے کی کوشش کرنا اور سب سے بڑھ کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو عملی شکل دینا وظائف سے اہم سمجھتے تھے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد تصوف واحسان کو رضاء الٰہی، قربت خداوندی کا ذریعہ سمجھتے تھے، جو خدمت خلق اور انسانی خدمات کے لیے، اس سلسلہ میں ان کی رائے وہی تھی جو حضرت مخدوم جہاں کی تھی کہ کوئی افضل عبادت اور مفید تر خدمت خلق سے نہیں ہے۔ (۲۵)

یہی وجہ تھی کہ مولانا نے ۱۹۳۴ء میں بہار کے زلزلہ کے عظیم حادثہ کے موقع پر تمام متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا، گاؤں گاؤں، بستی بستی گھوم گھوم کر تعزیت، مزاج پرسی کرتے، دلاسے دیتے اور امداد کا انتظام کرواتے، اتر سے دکھن، پورب سے پچھم گردش کرتے رہتے، کہیں رات بسر ہوتی تو کہیں دن گذر جاتا، کہیں فسادات میں مسلمانوں پر مقدمہ ہو یا قربانی کا جھگڑا ہو، کہیں آگ لگے یا کہیں سیلاب آئے، مظلومین کی مدد میں شب وروز لگے رہتے تھے، یہاں تک کہ آپ

نے اپنی جان جان آفریں کے حوالہ کردی۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حضرت مولانا پیدائشی خانقاہی ہیں، کیوں کہ لفظ خانقاہ مرکب ہے دولفظوں سے، یعنی خانہ+ کاہ، تحلیل لفظی کے بعد خانقاہ ہوا، جس کا معنی ہے گھانس کا گھر یا جھونپڑی، مولانا جھونپڑی میں پیدا ہوئے، جھونپڑی ہی میں اس دنیا سے اٹھائے گئے، وہ غریب تھے اور پوری زندگی غریبوں میں گذاری، (۲۶) مولانا ان اہل خانقاہ میں سے ہیں جنہوں نے رخصت کے بجائے عزیمت کو ترجیح دی ہے اور مسلسل اسی پر کار بند رہے اور اپنے زمانے کے علماء کو یہی دعوت دی اور عزیمت کی بنا پر ہی ان کی دنیا میں شناخت ہوئی اور عزیمت کی روح فقط اخلاص، للہیت اور تعلق مع اللہ ہے، یہی مولانا کی پوری زندگی کی جمالیات میں سے ہیں اور یہی ان کی ذات کی جامعیت کا انفرادی عنصر ہے، دوسرا اضافی جمالیاتی عنصر ان کا اختصاص فی العلم ہے، جس نے ان کی شخصیت کو عوام وخواص اور اخص الخواص کا جامع اور نور نظم بنا دیا تھا، مختصر یہ ہے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی ذات گرامی میں جامعیت کا ایک پہلو اور اس کا ایک اہم عنصر اخلاص تھا تو دوسرا اختصاص تھا، چنانچہ ہر جدوجہد اور تمام کارہائے تنظیم کو رضائے الٰہی کے لیے کرتے تھے؛ بلکہ اس کی مرضیات ہی کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئے تھے اور جو مخصوص الٰہی بن گیا تو رب بھی اپنے وعدہ کے مطابق اسی کا ہو گیا۔ (من کان للہ کان اللہ لہ)

مولانا کی ذات اقدس میں جامعیت کے پہلے عنصر یعنی اخلاص کا اگر ہم جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اخلاص کی یہ عظیم دولت کی نعمت بہار شریف کے بزگان سادات جازنیری سے آپ کو خاندانی طور پر ورثہ میں ملی تھی، اسی طرح یہاں کے مختلف سلاسل چشتیہ، قادریہ، شفاریہ، سہروردیہ اور فردوسیہ کے بزرگان دین اور مشائخ امت اسلامیہ سے روحانی طور پر آپ کے حصۂ اقبال میں نصیب ہوا تھا، خاص کر جس طرح مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ کے مختلف مکاتب فکر اور مختلف سلاسل کے رجال اللہ اور اعیان شہر کے ساتھ مل کر اور جڑ کر قلمی اور دعوتی جدوجہد کی اور پورے صوبہ بہار میں پھیلی ہوئی دیومالائی تہذیب کے خلاف عجیب وغریب انقلاب برپا کیا، خاص کر نالندہ، راجگیر اور بہار شریف کے گرد وپیش میں پھیلے ہوئی ویہاروں؛ یعنی بودھ مت اور جین مذہب کی خانقاہوں کو اسلامی خانقاہوں میں بدل

دیا، بڑے بڑے دیومالائی عالموں، پنڈتوں اور پجاریوں کو اسلام کی نعمت اور دولت سے سرفراز کر کے مالا مال کر دیا۔

اسی طرح مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے مذکورہ اصحاب دعوت وعزیمت کی پیروی کرتے ہوئے اوران اصحاب کی خاندانی اورروحانی فرزندگی اورغلامی کا حق ادا کرتے ہوئے اپنے معاصرین، علماء ومشائخ اوردانشوران ملت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والی انگریزی حکومت کی سازش، دیومالائی تہذیب کی مخالفت اورمنافقوں کی منافقت کے مقابلہ میں برے حالات اور پرفتن آزمائش کی شکست کے لئے مجددانہ کردار کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تھےاور ہندوستانی مسلمانوں کے تشخص کی حفاظت کے لیے ۱۹۱۱ء میں گیا شہر میں مدرسہ انوارالعلوم قائم کیا، پھر دیدار گنج پٹنہ (۲۷) کے قریب جھاؤ گنج شاہی مسجد جولب دریا واقع ہے، اس میں ایک ادارہ قائم کیا تھا اورارادہ یہ تھا کہ اس کو تعلیم کے ساتھ صنعتی مدرسہ بنادیا جائے، (۲۸) تاکہ طالبان علوم نبوت میں ایک گروہ ایسا بھی ہو جو صنعتی فنون سے آراستہ ہو، اسی طرح ۳۰/صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۱۷ء انجمن علمائے بہار قائم کیا؛ تاکہ یہ انجمن مسلمانوں کے مذہبی ومسلکی امور پر غور وفکر کرتی رہے اورملی حقوق کی بازیابی کی کوشش کرے، اس کا پہلا اجلاس بہارشریف کے مدرسہ عزیزیہ میں ۵/شوال ۱۳۳۶ھ کو منعقد ہوا، اس میں پچاس (۵۰) علماء ومشائخ نے شرکت کی تھی، اس انجمن علمائے بہار یا جمعیت علماء بہار نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی قیادت میں جمعیت علماء ہند کی راہ ہموار کی، چنانچہ ۱۹۱۹ء میں جمعیت علماء ہند قائم ہوگئی، اس کے اہم مقاصد میں سے یہ تھا کہ ایک نقطۂ نظر پر علماء ومشائخ کو جمع کر کے ہندوستانی مسلمانوں کے تشخص کی حفاظت اوران کی ملی، قومی اور دینی نگرانی اورنگہداشت کی جائے، اسی طرح فریضۂ شرعی کے احیااورشرعی قوانین پر عمل کے لیے حضرت مولانا ابوالمحاسن نے ۱۹/شوال ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۶/جون ۱۹۲۱ء کو بہار واڑیسہ کے پانچ سو (۵۰۰) علماء ومشائخ کے علاوہ تقریباً چار ہزار شرکاء مجلس کی موجودگی میں امارت شرعیہ کی تجویز پیش کی، چنانچہ اسی جلسہ میں جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد کر رہے تھے، امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا، پہلے امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ بدرالدین مجیبی بہ اتفاق مجلس منتخب ہوئے اورنائب امیر شریعت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد منتخب ہوئے۔

یہ مولانا ابوالمحاسن کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھا اور کسر نفسی، عاجزی، انکساری اور خاکساری

جواخلاص کے اجزائے ترکیبی میں سے ہے، خود جوامارت شرعیہ کے قیام کا پہلا محرک اور بانی مبانی ہو، وہ امیر شریعت کا مامور بن کران کا نائب اور معاون بن جاتا ہے اور کبھی یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کرتا ہے کہ یہ تحریک امارت شرعیہ مابدولت ہے، یا میری مساعی مسلسل کا ثمرہ ہے، مولانا کی انسانیت دوستی اور بقائے باہم کی مخلصانہ تحریک حزب اللہ بھی ہے، یہ تحریک دراصل مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر کا نتیجہ تھی، جس کو حضرت مولانا ابوالمحاسن نے ۴؍اگست ۱۹۲۷ء کو صوبہ بہار کے بتیا کے ہولناک فرقہ وارانہ فساد کے بعد قائم کیا تھا، ملک میں امن وامان اور بھائی چارہ قائم رکھنے کے لیے اور ہر طرح کے فتنے کے سد باب کے لیے یہ تحریک حزب اللہ ۹؍ذی قعدہ ۱۳۴۴ھ کو قائم ہوئی اور اس کے رضا کاروں کا بھی مختلف ضلعوں اور علاقوں کے لیے انتخاب عمل میں آیا، یہ تحریک زمانۂ جاہلیت کی سب سے اہم تحریک وتنظیم حلف الفضول کی طرح کی تھی، کاش حزب اللہ کی یہ تحریک زندہ رہتی تو ہندوستان میں تشدد کا موجودہ ماحول پیدا نہیں ہوتا، ہندوستان کے مسلمانوں کے تشخص ووقار اور ان کی سیاسی عظمت کو باقی رکھنے کے لیے اور ان کے فلاح وبہبود، ترقی اور تحفظ کے لیے ۱۹۲۶ء میں مولانا نے مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی قائم کرکے اس کو دوسری حریف پارٹیوں کے مقابلہ میں نمایاں کامیابی بلکہ فتح یابی سے ہم کنار کرایا اور اس صوبہ بہار میں انگریزوں کی حکومت کے دور میں اپنا وزیر اعلیٰ مسٹر یونس صاحب کو بنایا، اس سے کوئی نفع نہیں اٹھایا؛ بلکہ فقر اختیاری کو بہ رضا ورغبت فخر کے ساتھ قبول کیا، یہ تحریک، یہ جدوجہد بھی آپ کے اخلاص کی بہترین مثال ہے۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی ذاتی زندگی کا اگر غائرانہ جائزہ لیا جائے تو اس میں بھی زندگی کا ہر پہلو اخلاص سے سرسبز وشاداب نظر آتا ہے، آپ کی زندگی کے ہر گوشہ میں اخلاص کا حسن وجمال دکھائی دیتا ہے، آپ کے اخلاص کو آپ کی روزمرہ کی زندگی میں دیکھنا ہو تو ان کے لباس، خورد ونوش اور رہائش کا جائزہ لیں تو بخوبی اندازہ ہوگا کہ وہ پیشہ سے سادگی پسند تھے، سادہ زندگی گذارتے تھے، لباس سادہ کھدر کا زیب تن کرتے، عمامہ بھی جاڑے میں کھدر کا ہوتا، جوتا پرانے انداز کا اور پھٹا ہوا، کھانا بالکل سادہ موٹا چاول کا بھات، پتلی بگھری ہوئی دال اور آلو کا بھرتا کھاتے، مہمانوں کے لیے اچھا اہتمام کرتے، رہائش میں کافی سادگی تھی، اپنی حویلی کے آرام کو چھوڑ کر پھلواری شریف میں کرایہ کے مکان میں رہتے تھے، وہ بھی مٹی اور کھپڑیل سے بنی ہوئی غیر کشادہ جگہ میں رہتے، جہاں سونے کے لیے معمولی بستر چارپائی پر بچھا ہوا اور اس کے ایک

جانب چٹائی بھی لگی ہوتی، اندورن خانہ میں اہل وعیال اور بیرون کے حصہ میں مہمانوں کا آنا جانا اور ملاقات کرنے والوں اور مشورہ کرنے والوں اور مسائل دریافت کرنے والوں کی آمد ورفت، یہ تھا مولانا کے پیکر سے لے کر مولانا کا غریب خانہ، ہر زمانہ میں سادگی میں رہے، مدرسہ اسلامیہ سے لے کر الٰہ آباد کی درسگاہ میں طالب علمی کے ایام تک، مدرسہ انوار العلوم سے لے کر جمعیت وامارت کے قیام تک اور صوبہ بہار میں اپنی حکومت بنانے اور اپنا وزیر اعلیٰ بنانے تک بالکل سادہ اور عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے، مزید یہ کہ ہر شخص جو آپ سے متعلق تھا، اس کی پریشانی اور مصیبت میں پیش پیش، اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ بیٹا بستر مرگ پر اور آپ زلزلہ زدگان کی پریشانی کو دور کرنے میں سرگرداں، پھر جواں سال بیٹے کے انتقال کے غم کے باوجود ملت کے کام میں تین دن کے بعد مشغول ہو گئے۔

مولانا کا یہ ایثار، کردار، اخلاق، سیرت فولاد، ملت اسلامیہ کے لیے مجاہدانہ کردار اور دور رس افکار سب آپ کے اخلاص کے ملے جلے حسین ثمرات ہیں۔

اس سے پہلے ہم آپ کی جامعیت کا پہلا عنصر یعنی اخلاص اور اس کی وسعت اور ہمہ جہتی کو بیان کر چکے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی جامعیت کا دوسرا پہلو بھی وسیع معنوں میں آپ کی نظر میں آجائے، جو زمانہ طالب علمی سے لے کر زمانہ تدریس تک محیط ہے، اگر آپ کے اختصاص فی العلم کا جائزہ لیا جائے تو اس کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب آپ کی عمر پندرہ سال تھی، یہ کانپور میں حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے مدرسہ ہی میں تھے کہ علوم وفنون کی اساس سے آپ کی آشنائی کا آغاز ہوا، پھر علوم وفنون کے وفور شوق نے آپ کو دیوبند پہونچایا، پھر دیوبند سے مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد پہونچا دیا، یہاں بلکل یکسو ہو کر حصول علوم وفنون میں لگ گئے، یہاں تک کہ مروجہ علوم وفنون میں کمال حاصل کیا، آپ جب آخری درجہ میں پڑھ رہے تھے تو اپنے مدرسہ کے اونچے درجات کے طلبا کے استاد ہو گئے، وہاں سے جب سند فراغت اور دستار فضیلت کے اعزاز کے ساتھ فارغ ہو رہے تھے تو آپ کے اختصاص فی العلم کی قدر وعزت آپ کے اساتذہ میں بھی تھی، اس وجہ سے آپ کے مؤقر اساتذہ کا آپ پر اعتماد اور اعتبار تھا، اپنے زمانہ میں علوم عقلیہ، علوم نقلیہ بالخصوص قرآنی علم، اصول فقہ اور عربی ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے، یوں تو جملہ علوم عقلیہ یعنی فلسفہ، منطق کی کتب متداولہ، علم ہیئت، علم الہیات کے علاوہ علم طب پر مہارت تھی اور علوم نقلیہ علوم القرآن، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ اور عقائد کے علاوہ علوم آلیہ یعنی

لغات، صرف ونحو اور فلسفہ نحو وغیرہ پر پورا عبور رکھتے تھے، اس کے ساتھ اسلامی تواریخ کے تمام ادوار پر گہری نظر تھی، سیرت نبویہ کا عمیق مطالعہ تھا اور سیر وتواریخ کی روشنی میں مسلمانان عالم کے عروج وزوال کے اسباب سے کمال واقفیت تھی، افتاوقضا پر دسترس حاصل تھی، مادر علمی مدرسہ سبحانیہ میں آپ کو دارالافتاء کا شعبہ عطا کیا گیا، آپ کی علمی صلاحیت، علمی کمال، اعلیٰ علمی معیار، علمی تفوق وبرتری کو تسلیم کرتے ہوئے آپ کے زمانہ کے عربی، اردو کے ادیب، مؤرخ، سوانح وسیرت نگار، محدث، فقیہ اور مفسر حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے آپ کو حاضر العلم کہا، (۲۹) اور آپ کے ہم عصر محدث کبیر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری نے آپ کو فقیہ النفس کا خطاب دیا۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے اختصاص کے بھی دو پہلو ہیں: (۱) علمی، (۲) عملی۔ یہ دونوں ان کی زندگی کے تمام اعمال پر محیط ہیں، ان کے علمی وتعلیمی اختصاص میں درس وتدریس، افتاوقضا، تالیف وتصنیف، تدوین فقہ، استباطات فقہیہ اور ادبی ولسانی خدمات اس طرح ان کے علمی اختصاص میں تربیت، رجال سازی، اتحاد بین المسلمین، قیام امارت، تحریک خلافت، قیام جمعیت، مسلمانوں کی تعلیمی واقتصادی پالیسی کی فکر وسعی، دینی وعصری تعلیم کے نظم کی کوشش، اسلامی حقوق کی بازیابی کی جدوجہد، قومی نصاب تعلیم کے معیار کا تعین، جنگ آزادی میں حصہ داری، انگریزی حکومت کے بنائے ہوئے اسلام مخالف قوانین کا احتساب واختلاف مثلا شارد ایکٹ وغیرہ، چنانچہ ان اختصاصات کی بنا پر حضرت مولاناؒ اپنے عہد کی ایک جامع ترین شخصیت بن گئے۔

ڈھنڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تا ثیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

هذا فضل اللّٰه يوتيه من يشاء

مصادر ومراجع

(۱) بادشاہ ہند شہاب الدین کے سالار محمد خلجی کے دور میں اور اس سے پہلے راجہ اندر رمن کے زمانہ میں بہار شریف دارالسلطنت رہا تھا، جس سے محمد خلجی نے قبضہ کیا تھا، خلجی کی شہادت ۶۰۲ھ میں ہوئی، مزار بہار شریف کے محلّہ عماد پور میں ہے۔

(۲) محلّہ پہاڑی سے مشرقی جانب ایک جگہ جس کا نام بیابان ہے، وہیں آسودۂ خاک ہیں۔

(۳) ان کا عرف ملک بیا ہے، یہ محمد بن بختیار خلجی کے بعد دوسرے فاتح بہار ہیں۔

(۴) یہ حضرت مخدوم جہاں بہاریؒ کے خالہ زاد بھائی ہیں۔

(۵) وسیلہ شرف، ص:۸۷، ومعارف نمبر:۵، جلد:۹۲، ص:۳۵۹

(۶) جو باغیچہ بجون پر واقع ہے۔

(۷) یہ علاقہ پیرستہ گھاٹ کہلاتا ہے، حضرت موصوف شیخ عبدالقادری جیلانی کی چودھویں اولاد ہیں، اس لیے خاندانی قادری اور اجازتاً چشتی ہیں۔

(۸) چشتیانہ آج تین محلے (۱) کاغذی، (۲) بھساہپور (۳) کاشی تکیہ پر مشتمل ہے، شاید شیخ خضر پارہ دوز جیسے عظیم بزرگ کی خانقاہ چشتیانہ ہی میں ہے، جس کی شہرت خواجہ نظام الدین اولیاء تک پہونچی تھی، انہوں نے بابا فرید کے پاس جانے سے پہلے خضر پارہ دوز سے مرید ہونے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا، بحوالہ مقدمہ حیات محی الملۃ از مولانا مناظر احسن گیلانی، ص:۱۳۔۱۴

(۹) شرفا کی نگری، حصہ اول:۹۹

(۱۰) ان کا اصل نام مرزا رحیم اللہ بیگ تھا، بحوالہ مقدمہ حیات محی الملۃ، ص:۱۵

(۱۱) مقدمہ حیات محی الملۃ، ص:۱۶

(۱۲) مقدمہ حیات محی الملۃ، ص:۱۳۔۱۴

(۱۳) انفاس العارفین، ص:۶۲، از شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

(۱۴) معارف نمبر:۶، جلد:۹۲، ص:۴۵۹، بحوالہ دفتر ابوالفضل مطبوعہ نول کشور لکھنؤ

(۱۵) وقف ڈیڈ (وقف نامہ) میں تحریر کی تاریخ ۱۸۹۲ء ہے، بحوالہ ایس ایم شرف متولی صغریٰ وقف اسٹیٹ ومتولی بی بی جبیں اسٹیٹ، جس اسٹیٹ کے ماتحت اور زیر نگرانی مدرسہ اسلامیہ ہے، وقف اسٹیٹ کے دفتر میں بوسیدہ وثیقہ پر بھی یہی لکھا ہوا ہے۔

(۱۶) جیسا کہ حضرت امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانی نے حیات سجاد، ص:۱۳ پر لکھا ہے۔ وقف نامہ مدرسہ اسلامیہ زیر نگرانی بی بی جبیں وقف اسٹیٹ محلّہ لہیری بہار شریف نالندہ میں اس کی تاریخ ۱۸۹۲ء ہے، جبکہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے مدرسہ اسلامیہ کی تاسیس تیرہویں صدی کے شروع میں لکھا ہے، حالانکہ چودھویں صدی کے شروع میں مدرسہ اسلامیہ کی تاسیس ہوئی ہے، شاید یہ کاتب کا سہو ہے۔

(۱۷) حیات سجاد، مرتبہ مولانا انیس الرحمٰن قاسمی از مقالہ حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ

(۱۸) حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حیات وخدمات، ص:۲۷، از مقالہ مولانا نورالحق رحمانی

(۱۹) مدرسہ انوارالعلوم کے بانی مشہور معقولی عالم مولانا عبدالوہاب فاضل بہاری ہیں، لیکن وہ جب اس

سے دست بردار ہو گئے تو مدرسہ ختم ہو گیا، حضرت مولانا نے اس کو شعبان ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں دوبارہ گیا میں دوسرے مقام پر قائم کیا جو تادم تحریر چل رہا ہے، اس مدرسہ کی نظامت کا فریضہ بھی دس سالوں تک بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

(۲۰) حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد- حیات وخدمات، ص:۲۴، از مقالہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، ص:۱۲۶۔۱۲۷، از مقالہ شاہ محمد عثمان مکہ مکرمہ ۲۴۴/۲۴۵، از مقالہ مولانا احمد علی قاسمی

(۲۱) ایضا، ص:۵۴ از مقالہ پروفیسر ظفر احمد نظامی

(۲۲) حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے بارہ (۱۲) سال لکھا ہے، لیکن سنہ عیسوی کے اعتبار سے میری حقیر تحقیق ساڑھے چودہ سال تعلیمی دور ہوتے ہیں

(۲۳) یہ سلسلہ نقشبندیہ کے مرشد تھے۔

(۲۴) بحوالہ مفتی عبداللہ خالد از مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حیات وخدمات، ص:۵۸

(۲۵) مکتوبات صدی مترجمہ مکتوب نمبر:۱۷، خدمت کا بیان، یہ حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے، جیسا کہ مکتوبات صدی، ص:۴۴۶ پر درج ہے۔

(۲۶) مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حیات وخدمات، ص:۴۷۲، از مولانا مفتی جنید عالم ندوی قاسمی

(۲۷) مولانا عبدالصمد رحمانی جو حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے تلمیذ رشید ہیں اور نائب امیر شریعت تھے، انہوں نے اپنی تحریر میں دارگنج کی وسیع اور پر شوکت شاہی مسجد میں جولب دریا واقع ہے لکھا ہے، قرین قیاس دیدار گنج پٹنہ کی شاہی مسجد ہے، جوان دونوں مدرسہ کی مسجد کی کہلاتی ہے، فی الحال جھاؤ گنج میں ہے، یہاں عیدین کی نماز بھی ہوتی ہے، مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے، شاید شیر شاہ سوری کے کسی افسر یا گورنر نے اسے تعمیر کرائی ہو۔

(۲۸) بحوالہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حیات وخدمات، از مولانا عبدالصمد رحمانی، ص:۷۹

(۲۹) حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حیات وخدمات، ص:۸۰

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے جلیل القدر اساتذہ کرام

مولانا طلحہ نعمت ندوی استھانوی
استھانواں بہار شریف (نالندہ)

شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں اساتذہ کرام کا بنیادی کردار ہوتا ہے؛ اس لیے حضرت سجاد کے اساتذہ کرام کے تذکرہ اور حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مولانا سجادؒ نے چار جگہ تعلیم حاصل کی، مدرسہ اسلامیہ بہار شریف، مدرسہ جامع العلوم کانپور، دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ سبحانیہ الہ آباد، ان میں دارالعلوم دیوبند میں وہ صرف چند ماہ رہے؛ اس لیے اصل اعتبار ان تین ہی مدرسوں کا ہوگا، نیز ان کے اساتذۂ دیوبند کا ہمیں علم بھی نہیں۔

یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں جن اساتذہ نے نمایاں حصہ لیا، ان میں ان کے عزیز (چچازاد بہنوئی) وخسر حضرت مولانا سید وحید الحق استھانوی کا نام بہت نمایاں ہے؛ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کی شخصیت اتنی ہی زیادہ گمنام ہے، ان کے علاوہ حضرت مولانا احمد حسن کانپوری اور مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں حضرت مولانا عبدالکافی الہ آبادی سے استفادہ کیا تھا، حضرت سجادؒ کے شاگرد مولانا اصغر حسین صاحب قاسمی بنولوی نے مدرسہ سبحانیہ الہ آباد کے اساتذہ میں ایک نام مولوی عبدالحمید جونپوری کا بھی لیا ہے؛(۱) لیکن یہ نہیں لکھا کہ مولانا نے باضابطہ ان سے بھی استفادہ کیا تھا، ممکن ہے کہ انہیں مولانا عبدالکافی الہ آبادی رحمہ اللہ نے اپنے معاون کے طور پر رکھا ہو، اور وہ اونچے درجات کے طلبہ کو درس نہ دیتے ہوں، ہمیں ان کے حالات کا علم بھی نہیں ہوسکا۔ یہاں ہم حضرت والا کے انہیں اساتذہ کرام کے حالات ذکر کریں گے، جن کے حالات کا ہمیں علم ہوسکا ہے، ممکن ہے کہ آپ نے اور بھی اہل علم سے استفادہ کیا ہو؛ لیکن وہ ہمارے علم میں نہیں نہ تاریخ وسوانح میں ان کے نام محفوظ رہ سکے، البتہ ایک دو مضامین میں غلطی

سے انہیں حضرت شیخ الہندؒ کا بھی شاگرد لکھا گیا ہے، جس کی تردید کی گئی ہے۔

انہوں نے بالکل ابتدائی تعلیم اپنے برادر بزرگ صوفی احمد سجاد صاحب سے حاصل کی تھی، صوفی صاحب اس وقت مدرسہ اسلامیہ میں طالب علم تھے اور انہوں نے ہی پھر ان کا داخلہ اس مدرسہ میں کرایا، جناب زکریا فاطمی صاحب مولانا مبارک کریم کی یادداشت کی بنا پر لکھتے ہیں:

''مولانا مرحوم کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی میں شروع ہوئی اور اپنے والد ماجد نیز اپنے برادر کلاں مولوی احمد سجاد صاحب سے جو اس وقت بھی ماشاء اللہ بقید حیات ہیں اور عابد مرتاض ہونے کی وجہ سے صوفی صاحب کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں، قرآن مجید اور ابتدائی اردو وفارسی کی تعلیم پاتے رہے''۔(۲)

آگے لکھتے ہیں:

''ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے برادر کلاں کے حسب مشورہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں داخل کئے گئے، وہاں آپ نے اپنے رشتہ کے بزرگ حضرت مولانا سید وحید الحق صاحبؒ ساکن استھانواں ضلع پٹنہ (حال ضلع نالندہ، بہار شریف) بانی مدرسہ مذکورہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، آپ کے برادر موصوف پہلے ہی سے مدرسہ میں تعلیم حاصل کررہے تھے، چنانچہ اس دوران میں آپ کی نگرانی بھی کرتے رہے، غالباً یہ واقعات 1310 ہجری کے ہیں''۔(۳)

حضرت والا کے ان اساتذہ کرام میں دو نام ہمیں ایسے بھی ملتے ہیں، جن سے انہوں نے خود ان کی زمانہ طالب علمی میں استفادہ کیا ہے:

حضرت مولانا ابو نعیم مبارک کریم صاحب:

ان میں ایک مولانا مبارک کریم صاحب سپر ٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز بہار وشاگرد مولانا سید وحید الحق استھانوی تھے، جن سے مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے دوران قیام ہی استفادہ کا موقع ملا، مولانا موصوف اونچے درجات میں پڑھتے تھے اور حضرت سجاد نیچے درجات میں، چنانچہ اس دور کے رواج کے مطابق انہیں زیریں درجات کے طلبہ کی تدریس کی ذمہ داری دی گئی، اسی میں ان سے استفادہ کا موقع ملا، حضرت سجاد کی وفات کے وقت وہ حیات تھے اور اپنی یادداشت بھی لکھوائی تھی جس کو زکریا فاطمی صاحب مدیر الہلال پٹنہ نے مرتب کے محاسن سجاد میں شائع کروایا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''جس زمانہ میں مولاناؒ مدرسہ اسلامیہ بہار کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم حاصل کررہے تھے اسی زمانہ میں مولانا مبارک کریم صاحب بھی اوپر کے درجوں میں تحصیل علم میں مشغول تھے، تو جیسا کہ عام طور پر عربی مدارس کا قاعدہ ہے کہ اعلیٰ درجوں کے طلبہ کو ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کی تدریس کے فرئض سپرد کئے جاتے ہیں، اسی طرح مولانا مبارک کریم صاحب کے ذمہ بھی مولانا مغفور کی ابتدائی تعلیم کے فرائض سپرد کئے گئے''۔(۴)

مولانا ابونعیم محمد مبارک کریم کا آبائی وطن شیخ پورہ تھا، بعد میں ان کے والد مولوی حکیم عبدالکریم صاحب وہاں کا مکان ضائع ہونے کے بعد اپنی سسرال بہار شریف میں آباد ہوگئے تھے، یہیں انہوں نے حضرت مولانا سید وحید الحق استھانوی کے قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کی، بالخصوص ان سے استفادہ کیا، پھر قدیم مدرسہ جونپور میں مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری سے پڑھا، پھر وہاں سے کانپور جاکر مولانا احمد حسن کانپوری سے مدرسہ فیض عام میں استفادہ کیا، مولانا احمد حسن سے تکمیل کے بعد مولانا ابوالانوار نور محمد صدرالمدرسین احسن المدارس کانپور سے دوبارہ تمام کتابیں بالخصوص صحاح ستہ مکمل پڑھیں، فراغت کے بعد پہلے ایک اسکول میں ہیڈ مولوی مقرر ہوئے، پھر مدرسہ اسلامیہ کے بعض ذمہ داروں کے اصرار پر اس سے استعفیٰ دے کر مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں مدرس اول کے عہدہ پر بحال ہوئے، ان کے دوران قیام مدرسہ نے تعلیمی اعتبار سے بہت ترقی کی، بہار شریف میں مدرسہ عزیزیہ کے قیام کے بعد اس کے سب سے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے، پھر گورنمنٹ ایڈیڈ سینئر مدرسہ دارالعلوم ڈھاکہ کے پرنسپل ہوئے، پھر ۱۹۱۷ء میں گورنمنٹ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے ٹائٹل کلاس کے لیے منتخب ہوئے، پھر گورنمنٹ بہار نے سپرنٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز کے عہدہ پر بحال کیا، اس دوران مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی خصوصی نگرانی کی اور اس کو ترقی دے کر آگے بڑھایا، اس عہدہ سے ۱۹۴۰ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔(۵) 1955 سے 1960 کے درمیان کسی سال اعتکاف کی حالت میں اپنے محلّہ میں جہاں ان کا مسکن تھا؛ یعنی محلہ کہنہ سرائے بہار شریف میں ان کی وفات ہوئی۔(۶)

حضرت مولانا سید عبدالشکور آہ مظفرپوریؒ:

حضرت مولانا سجاد کے دوسرے طالب علم استاذ بہار کے مشہور عالم مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری مدرس مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ ہیں، ان سے منطق اور دوسری کئی اہم کتابیں پڑھ کر انہوں نے اپنی استعداد میں پختگی پیدا کی تھی، ان کے شاگرد مولانا اصغر حسین صاحب بنولوی نے لکھا ہے

کہ انہوں نے حضرت والا سے اپنی حیرت کا ذکر کیا کہ حضرت مولانا عبدالکافی الہ آبادی تو بہت ہی کم درس دیتے تھے، پھر آپ کے اندر اتنی استعداد کیسے پیدا ہوگئی، اس پر مولانا نے فرمایا کہ:

''میں ایک گونہ صلاحیت پیدا کرکے پہنچا تھا، مولانا عبدالشکور صاحب مظفر پوری (فی الحال مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ) سے سلم وغیرہ پڑھ کر کتاب فہمی کی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی''۔(۷)

آگے مولانا اصغر حسین صاحب لکھتے ہیں کہ:

''حضرت مفکر اعظمؒ تہذیب وغیرہ پڑھنے کے زمانہ میں کانپور سے دیوبند تشریف لے گئے تھے؛ لیکن ایک تبّتی طالب علم سے لڑائی ہوجانے کے قصہ میں جس کے سرخیل مولانا عبدالشکور صاحبؒ تھے، دیوبند کو خیر باد کہنا پڑا''۔(۸)

اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سجاد مولانا عبدالشکور کے ساتھ ہی دیوبند میں تھے، حالانکہ مولانا عبدالشکور کا قیام دیوبند میں صرف ایک سال رہا تھا، جیسا کہ ان کے حالات میں آگے آئے گا، اس سے پہلے انہوں نے کانپور میں حضرت مولانا احمد حسن سے استفادہ کیا تھا، جہاں حضرت سجاد بھی تھے؛ اس لیے بظاہر یہی صورت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ کانپور اور دیوبند دونوں جگہ ان کا ساتھ رہا ہو اور جب مولانا عبدالشکور کانپور سے دیوبند جارہے ہوں تو حضرت سجاد کو بھی ساتھ لے لیا ہو اور ان کا داخلہ نیچے کے درجات میں ہوا ہو؛ لیکن وہ یہاں رہ نہیں سکے اور پھر مولانا مبارک کریم صاحب کی اطلاع کے مطابق کانپور واپس آگئے، (۹) یہیں مولانا مبارک کریم بھی تعلیم حاصل کررہے تھے، وہی اپنے ساتھ حضرت سجاد کو لے گئے تھے، ممکن ہے دوران طالب علمی حضرت سجاد کے دنوں اساتذہ مولانا عبدالشکور اور مولانا مبارک کریم کے مراسم رہے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں نے ساتھ ہی تعلیم حاصل کی ہو۔

مولانا عبدالشکور آہ بن مولانا سید نصیر الدین احمد نصر مظفر پوری کا شمار بہار کے ممتاز علما میں ہوتا ہے، وہ بہت جید الاستعداد عالم اور ممتاز شاعر تھے، مدرسہ جامع العلوم مظفر پور اور کانپور کے مختلف مدارس میں بالخصوص مولانا احمد حسن کانپوری سے استفادہ کے بعد تکمیل تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند کا سفر کیا اور وہاں ایک سال رہ کر 1317 ہجری مطابق 1899 میں سند فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد وطن واپس آئے اور ایک عرصہ تک مدرسہ جامع العلوم مظفر پور میں جہاں انہوں نے مشکاۃ تک کی تعلیم حاصل کی تھی، تدریسی خدمت انجام دی، پھر دارالعلوم مئو

تشریف لے گئے اور بحیثیت شیخ الحدیث وہاں ایک عرصہ تک تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، پھر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں انہیں تدریسی خدمت کے لیے مدعو کیا گیا اور وہ یہاں تشریف لے آئے اور مسلسل 23 سال تک تدریسی خدمت انجام دے کر 1945 میں ریٹائرڈ ہوئے اور اپنے شہر مظفر پور تشریف لے آئے، یہاں اہل شہر اور ممتاز علما کے اصرار پر کچھ دن مدرسہ جامع العلوم میں اعزازی طور پر درس دیا؛ لیکن اسی دوران جلد ہی 17 رجب 1356 مطابق 17 جون 1946 کو ان کی وفات ہوگئی اور مظفر پور ہی میں تدفین ہوئی۔ حضرت آہ بہت با کمال عالم اور ایک کامیاب مدرس تھے، اردو نثر و نظم پر پوری قدرت رکھتے تھے، ان کا شعری مجموعہ ان کی یادگار ہے، انہوں نے بہت زیادہ علمی سرمایہ نہیں چھوڑا؛ لیکن ان کا اصل امتیازی کارنامہ ممتاز و باکمال شاگردوں کی ایک جماعت ہے، جو انہوں نے اپنے طویل تدریسی دور میں تیار کی۔ حضرت آہ کے تفصیلی حالات اور کلام کے لیے ان کے حفید عزیز جناب مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی کی سات سو صفحات کی کتاب ''تذکرہ مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری'' (۱۰) کا مطالعہ کرنا چاہیے، یہ معلومات اسی کتاب سے مستفاد ہیں۔

حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ:

دیوبند میں چند ماہ رہ کر پھر حضرت سجادؒ واپس کانپور آ گئے اور حضرت مولانا احمد حسنؒ سے تقریباً تین سال (۱۱) استفادہ کیا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت سجاد کے دونوں طالب علم اساتذہ مولانا مبارک کریم اور مولانا عبدالشکور آہ حضرت کانپوری ہی کے فیض یافتہ ہیں، حضرت کانپوری صدیقی النسب تھے، مولانا روم ان کے اجداد میں ہیں، ان کے دادا شیخ عظمت علی مدینہ منورہ سے ہجرت فرما کر صوبہ پنجاب میں پٹیالہ ضلع کے ڈسکا گاؤں میں آباد ہو گئے تھے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کر کے علم حدیث کی تکمیل کے لیے لکھنؤ کا سفر کیا اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے اس فن کی تکمیل کی، پھر علی گڑھ جا کر مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے مزید کتابیں پڑھ کر فراغت حاصل کی، پہلے مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں تدریسی خدمت انجام دی، پھر مدرسہ فیض عام کانپور تشریف لائے اور اسی شہر کے ہو کر رہ گئے، کچھ دنوں کے بعد چند اسباب کی بنا پر اس مدرسہ سے علاحدہ ہو کر اپنا مدرسہ دارالعلوم کانپور قائم کیا، جس میں تادم آخر درس دیتے رہے، حج کے لیے دوبار حجاز تشریف لے گئے اور دونوں بار دو دو سال قیام فرمایا اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمۃ سے باطنی وروحانی

استفادہ کیا اور اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے، اپنے شیخ کی ایما پر مثنوی مولانا روم کی شرح فرمائی، حضرت مولانا احمد حسن جامع معقول ومنقول تھے، پوری زندگی تدریس میں گذری اور ایک کامیاب مدرس کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی، شام وخراسان اور ماوراء النہر کے علاقہ کے طلبہ ان سے استفادہ کے لیے ان کے مدرسہ میں کانپور حاضر ہوئے، تدریس کے علاوہ تصنیفی خدمات بھی انجام دیں، ان کی قرآن پاک کی ایک تفسیر کا بھی ذکر کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ حاشیہ شرح حمد اللہ علی السلم، تنزیہ الرحمان عن شائبۃ الکذب والنسیان اور افادات احمدیہ کا ذکر کیا جاتا ہے؛ لیکن ان کا سب سے مشہور کارنامہ مثنوی مولانا روم کی شرح ہے۔ صفر 1322 مطابق 18 اپریل 1904 کو ان کی وفات ہوئی اور تکیہ بساطیان قبرستان کانپور میں دفن ہوئے۔ (۱۲)

حضرت مولانا خیرالدین کامل پوری ثم گیاویؒ:

کانپور کے دور طالب علمی میں حضرت مولانا خیرالدین صاحب کامل پوری سرحدی ثم گیاوی سے بھی استفادہ کا موقع ملا، جس کا علم راقم کو مولانا فخرالدین صاحب گیاوی کی کتاب ''درس حیات'' کے مطالعہ کے بعد ہوا، حضرت مولانا خیرالدین صاحب کی زبانی مولانا فخرالدین صاحب نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ انہوں نے کانپور سے فراغت کے بعد چند سال وہاں تدریسی خدمت بھی انجام دی، پھر تلامذہ کی فہرست میں حضرت سجاد کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ انہوں نے گیا میں ملاقات کے وقت خود اعتراف کیا کہ ان سے کانپور میں پڑھا ہے۔ (۱۳)

حضرت مولانا عبدالکافی ناروی الہ آبادیؒ:

حضرت سجاد کے آخری درجہ کے استاذ جن سے انہوں نے سند فراغت حاصل کی حضرت مولانا عبدالکافی الہٰ آبادی تھے، یہاں ان کے ہم وطن شہر بہار شریف کے ایک اور عالم بھی ان کے شریک درس تھے اور وہ ابوالحسن مولانا محمد امیر حسن بن محمد معصوم بہاری تھے، جن کے نامور فرزند اور ہندوستان کے مایہ ناز محقق مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی علیہ الرحمۃ (م 2010) تھے، مولانا موصوف اپنے والد کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ نے علوم دینیہ کے ابتدائی مراحل بہار شریف کے مدرسہ اسلامیہ (موقوفہ بی بی جین مرحومہ) میں طے کئے، مولانا سجاد احمد مرحوم جو بعد میں آسمان شہرت پر بدر کامل بن کر چمکے شروع سے رفیق درس رہے، کتاب مختصر المعانی وغیرہ تک پہنچ کر دونوں الہ آباد پہنچے، اور مدرسہ سبحانیہ میں حضرت الحاج مولانا عبدالکافی ودیگر کبار اساتذہ کے حلقہ درس

میں با قاعدہ حاضر رہ کر تکمیل فرمائی‘‘۔

مولانا معصومی نے اپنے والد کے کانپور میں استفادہ کا ذکر نہیں کیا ہے، جب کہ حضرت سجادؒ کے کانپور میں استفادہ کا ذکر ان کے تمام سوانح نگاروں کے یہاں ملتا ہے، شاید مولانا معصومی سے اس کا ذکر رہ گیا کہ بہار شریف اور الہ آباد میں دونوں کا ساتھ رہا، مولانا امیر حسن بہار شریف سے براہ راست الہ آباد پہنچے اور حضرت سجاد کانپور اور دیوبند کا چکر کاٹ کر، البتہ الہٰ آباد سے دونوں ساتھ ہی فارغ ہوئے۔ الہٰ آباد میں حضرت سجادؒ کے قیام کی مدت چار سال ذکر کی جاتی ہے، 1322ھ میں ان کی اور ان کے رفیق مولانا امیر حسن کی دستار بندی ساتھ ہی ہوئی، اس کے بعد پھر دونوں نے وہاں تدریسی خدمت بھی انجام دی۔ (۱۴)

حضرت مولانا عبدالکافی کے بہت زیادہ حالات کا علم نہیں ہوسکا۔ (۱۵)

صاحب نزہۃ الخواطر نے ان کا مختصراً تعارف کرایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

’’الشيخ العالم الفقيه عبدالكافي بن عبدالرحمن الحنفي الناروي الإله آبادي أحد عباد الله الصالحين‘‘. (۱۶)

ان کی پیدائش الہ آباد کے ایک معروف قریہ نارہ میں جس کی نسبت سے انہیں ناروی بھی کہا جاتا ہے، ربیع الاول 1285ھ میں ہوئی، ان کے استاذ خود ان کے چچا مولانا عبدالسبحان ناروی تھے، جن سے پہلے انہوں نے کڑا، الہ آباد میں حفظ قرآن پاک مکمل کیا، پھر انہیں کے ساتھ 1291 میں الہ آباد پہنچے اور انہی سے درس نظامی کی کتابیں پڑھ کر 1300ھ میں فراغت حاصل کی، محلّہ یاقوت گنج الہ آباد میں مولوی عبدالحمید صاحب کے مکان سے تدریس کا آغاز کیا اور اپنے استاذ ہی کی نسبت سے الہ آباد کی جامع مسجد میں مدرسہ سبحانیہ قائم کیا، حضرت مولانا حکیم فخر الدین الہ آبادی کے مرید وخلیفہ تھے، آپ کے مسترشدین میں ایک اہم نام مشہور شاعر سید اکبر حسین الہ آبادی کا بھی ہے۔ مولانا سید عبدالحی لکھتے ہیں:

’’لقيته غير مرة ووجدته شيخا منورا متعبدا، على وجهه سيما الصالحين‘‘.

21 شعبان 1350 میں ان کی وفات ہوئی، مزار یحیٰی پور الہٰ آباد میں ہے۔ (۱۷)

حضرت مولانا سید وحید الحق استھانویؒ:

اب اخیر میں ہم ان کے مربی اور خصوصی استاذ حضرت مولانا سید وحید الحق استھانویؒ جوان

کے خسر بھی تھے اور عزیز بھی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ حضرت والا کی تاریخ پیدائش کا علم نہیں، وہ اس دیار کے استاذ الکل اور عربی زبان وادب کے رمز شناس ہونے کے علاوہ ممتاز داعی الی اللہ بھی تھے، ان کے وطن اور شہر بہار شریف کے اکثر باکمال اہل علم انہیں کے خوان علم کے زلہ ربا ہیں اور مدرسہ اسلامیہ کے طویل دور میں تو ان سے نہ جانے کتنوں نے استفادہ کیا ہوگا، اس سے قبل بھی انہوں نے مختلف مقامات پر تدریسی خدمت انجام دی تھی، وہاں بھی ان کے تلامذہ ہوں گے، ان کے اہم تلامذہ میں مولانا مبارک کریم، ان کے چھوٹے داماد حضرت سجاد، مولانا عبدالغنی وارثی استھانوی معروف مصنف اور مولانا سید رحیم الدین استھانوی مدیر الپنچ پٹنہ کا نام نمایاں ہے، مولانا سید مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمۃ نے حضرت مولانا وحیدالحق کے شاگرد مولانا عبدالغنی وارثی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ!

''آپ کے وطن مالوف استھانواں کے ایک نوجوان عالم جو بعد کو بہار کے ممتاز ترین علما کی صف میں شمار کئے گئے؛ بلکہ سچ یہ ہے کہ بلا مبالغہ اس وقت بھی بہار کی علمی اور دینی ہلچل کا مختلف حیثیتوں سے آپ ہی کا وجود باسعود سرچشمہ ہے، ان کا نام مولانا سید وحیدالحق رحمۃ اللہ علیہ تھا، قصبہ بہار کا مشہور اسلامیہ مدرسہ جو اب تک باقی ہے، آپ ہی کا قائم کیا ہوا ہے اور آج بہار میں دین کی سرکاری تعلیم کا سررشتہ جس بزرگ کے ہاتھ میں ہے؛ یعنی خان بہادر مولانا مبارک کریم اور جس کی ذات غیر سرکاری اسلامی تحریکوں کا اسی بہار میں ملجا وماویٰ ہے؛ یعنی حضرت ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار، یہ دونوں سرکاری وغیر سرکاری ہستیاں اسی آسمان علم کے دو مختلف الجہات تارے ہیں..... مولانا عبدالغنی مرحوم ارقام فرماتے ہیں کہ (میں آرہ سے مولانا المولوی وحیدالحق کے پاس جو فارغ التحصیل ہوکر پٹنہ میں ایک امیر کے یہاں ملازم ہوئے تھے چلا آیا) مولانا وحیدالحق مرحوم جیسا کہ اشارۃً میں نے پہلے ہی عرض کیا: ایک خاموش انقلابی وجود کے مالک تھے، خاکسار کی والدہ محترمہ چوں کہ استھانواں ہی کی تھیں بچپن میں ان سے وحیدالحق بھائی (کہ اس لقب سے والدہ مرحومہ ان کو یاد فرماتی تھیں) کے متعلق جو واقعات میں نے سنے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ کر گذرنا چاہتے تھے، انہوں نے بجائے شہر کے ممبروں، لیڈری کے اسٹیجوں کے دیہات کی گلیوں میں اپنے مقصد کو تلاش کیا ہے، مشرکانہ عقائد ورسوم جن میں مسلمانوں کی پچھلی نسلیں غیر اقوام کی صحبت اور حکومت کی غفلت کی بدولت مبتلا ہوگئی تھیں، مولانا نے عورتوں اور جاہل مردوں کو کن خاموش راہوں سے بت خانوں کے اس

قافلہ کو حرم تک لے جانے کی کوشش فرمائی ہے، آبدیدہ ہوکر اماں مرحومہ یاد کرتی تھیں کہ موٹیا کا لانبا کرتا اور موٹیا کا پاجامہ، موٹیا کی ٹوپی میں اسلام کا یہ مخلص خادم گھر گھر مسلمان خواتین کو نرمی اور دل دہی کے ساتھ بدعات اور مشرکانہ رسوم کے چھوڑنے کی ہدایت کرتا تھا، اللہ نے ان کی باتوں میں تاثیر رکھی تھی''۔(۱۸)

استھانواں کے معاصر دور کے ایک مختصر کتابچہ میں بھی مولانا کا ذکر اس حیثیت سے آیا ہے کہ استھانواں کے مردوں میں دینداری مولانا کے ذریعہ پھیلی۔(۱۹)

علامہ سید سلیمان ندوی بھی اپنی تحریروں میں جابجا ان کے کمالات کے مداح و معترف نظر آتے ہیں، حضرت سجاد کے مضمون میں انہوں نے لکھا ہے کہ مولانا سید وحید الحق استھانوی کے دم قدم سے تیرہویں صدی کے شروع میں بہار میں علم کو ایک نئی رونق حاصل ہوئی۔ مولانا کے شاگرد مولانا عبدالغنی کے بیان کے مطابق انہیں ان کی پاک و بے ریا زندگی کی صحبت سے بہت فوائد حاصل ہوئے، (۲۰) انہیں کے بیانات سے ان کے جستہ جستہ حالات کا علم ہوسکا ہے، حضرت گیلانیؒ کے بقول ان کی عربی دانی بھی مسلم تھی، خود راقم کی نظر سے ان کے وطن استھانواں کے قدیم کتب خانہ الفلاح میں بعض قلمی عربی تحریریں ایسی گذری ہیں، جن سے اس کی مزید تایید وتوثیق ہوتی ہے۔ مولانا کے اساتذہ میں ان کے علاقہ کے ایک مشہور عالم جو حضرت سجاد کے وطن کے قریب ہی قریہ دھن چوہی متصل راجگیر کے رہنے والے تھے، مولانا لطف علی راجگیر ی کا نام ملتا ہے، جنہوں نے حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی سے تعلیم حاصل کی تھی اور علامہ شمس الحق ڈیانوی اور مولانا عبدالوہاب بہاری جیسے سرآمد روزگار علماء ومحدثین ان کے تلامذہ میں ہیں، دوسرا نام مشہور معقولی عالم مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری کا ملتا ہے، جن سے بہ ظاہر انہوں نے جونپور جاکر استفادہ کیا ہوگا۔(۲۱) بیعت کا تعلق مولانا اصغر حسین صاحب بہاری کی اطلاع کے مطابق حضرت قاری شاہجہاں پوری سے تھا، (۲۲) سید صاحب نے عربی قواعد میں ان کی ایک کتاب ''مغنی الصبیان'' کا ذکر کیا ہے، (۲۳) اس س کے علاوہ راقم کو ان کے وطن استھانواں کے کتب خانہ میں ان کی جو قلمی یادداشت نظر آئی، اس میں مترادف الفاظ کا ایک ذخیرہ ہے، شاید مترادفات پر مولانا کی غیر مرتب کتاب ہو جو ابوعلی رمانی کے الالفاظ المتر ادفہ کے طرز کی ہے، راقم کی نظر سے ردتعزیہ داری پر بھی ان کا ایک رسالہ بعنوان "نصیحۃ الاخوان" مطبوعہ لکھنؤ گذرا ہے، ان کے علاوہ کسی اور تصنیف کا علم تا حال نہیں، ممکن ہے انہوں نے اور بھی کتابیں لکھی ہوں، ان کے مدرسہ

اسلامیہ کا کتب خانہ جو بڑا نادر تھا، ضائع ہوگیا۔فراغت کے بعد انہوں نے اپنے شاگرد مولانا عبدالغنی وارثی کی اطلاع کے مطابق پٹنہ میں ایک امیر کے یہاں ملازمت اختیار کی، پھر نگرنہسہ اور اس کے علاوہ مختلف مقامات پر کئی سال گذار کر آرہ پہنچے، جہاں کے باشندوں نے انہیں تدریسی خدمت کے لیے بلایا تھا، چنانچہ وہاں انہوں نے مدرسہ فخر المدارس قائم فرمایا، اسی میں درس دیتے رہے، یہاں تک کہ زمانہ نے کروٹ لی اور مدرسہ ختم ہوگیا، اس کے بعد انہوں نے بہارشریف آکر مدرسہ اسلامیہ قائم فرمایا اور پھر مستقل یہیں قیام فرمالیا اور علمی وملی اور دینی خدمت انجام دے کر 1315 مطابق 1898 میں وفات پائی، اس کا علم نہیں ہوسکا کہ انتقال وتدفین خود ان کے وطن استھانواں میں ہوئی، یا بہارشریف میں۔مولانا کے مفصل حالات اس مختصر مضمون میں نہیں ذکر کئے جاسکتے؛ اس لیے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔(۲۴)

مصادر ومراجع

(۱) محاسن سجاد مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی، مطبوعہ الہلال بک ایجنسی پٹنہ 1941ء ص:17

(۲) محاسن سجاد ص10

(۳) ایضاً

(۴) ایضاً

(۵) نورالہدیٰ-حیات خدمات، نورالہدیٰ بیرسٹر ابن شمس الہدیٰ بانی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، مطبوعہ برقی مشین بانکی پور پٹنہ، 1941 ص۲۷،۳۰۔

(۶) تذکرہ علمائے بہار میں مولانا ظفیر الدین صاحب سابق صدرالمدرسین مدرسہ عزیزیہ کے حوالہ تاریخ وفات ۱۹۶۰ء لکھی ہے؛ لیکن مجھے مولانا کے محلّہ کے ایک معمر، ذی علم فاصل جناب نسیم اختر صاحب علیگ سابق استاد سائنسی علوم مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے معلوم کرنے پر انہوں نے بتایا کہ ان کی وفات تقریباً 1955 میں ہوئی؛ اس لیے ہم نے احتیاطا 55 سے 60 لکھا ہے، موصوف کو مولانا سے بہت سی باتیں سننے کا موقع ملا ہے اور بہارشریف کے ایک معزز گھرانے اور علمی خانوادہ کے فرد ہیں اور حضرت مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ امیر تبلیغی جماعت کی صحبت اٹھائی ہے، انہوں نے خود مولانا مبارک کریم کی زبانی سنا ہوا مولانا کی زندگی کا ایک اہم واقعہ بیان کیا جو ان کے اور حضرت سجادؒ کے مشترک استاذ حضرت مولانا وحیدالحق صاحب سے بھی متعلق ہے، مولانا مبارک کریم صاحب ایک غریب گھرانے کے فرد تھے اور بچپن میں تقریبات میں باجہ بجاتے تھے، کسی تقریب میں یہ ڈھول باجہ کے ساتھ بارات والوں کے ہمراہ استھانواں پہنچے، صبح میں ان کی ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی (نسیم صاحب کو نام یاد نہیں رہا؛ لیکن وہ حضرت مولانا وحیدالحق ہی ہوں

گے؛ کیوں کہ وہی مولانا کے اصل مربی اور استاد ہیں جیسا کہ یہاں معروف ہے)، انہوں نے مولانا سے کہ بچے کیا تم پڑھو گے، تمہاری پیشانی سے علم جھلک رہا ہے، انہوں نے کہا کہ اگر ہمارے والد اجازت دیں تو ضرور پڑھوں گا، چنانچہ والد سے اجازت لی تو اجازت مل گئی، اس کے بعد حضرت مولانا سید وحید الحق صاحب نے انہیں خود سے تعلیم دی اور اس کے بعد دنیا نے دیکھا کہ مولانا بڑے عالم ہوئے۔

(۷) ایضا،ص:۲۳

(۸) ایضا،ص:۲۳

(۹) ایضا،ص:۱۳

(۱۰) مطبوعہ جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور بہار ۲۰۱۷ء

(۱۱) محاسن سجاد،ص 11

(۱۲) ماخوذ از تذکرہ مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری،ص 224 تا 232

(۱۳) درس حیات،مطبوعہ مدرسہ قاسمیہ گیا 2010،ص 126

(۱۴) ادبیات، از مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی، مرتبہ ڈاکٹر محمد صدر الاسلام مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2014،ص 588

(۱۵) حوالہ سابق ومحاسن سجاد،ص 12

(۱۶) نزہۃ الخواطر ج 8 ص 280۔ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد

(۱۷) نزہۃ الخواطر کے علاوہ ضیائے طیبہ ڈاٹ کام سے بھی ان کے حالات میں استفادہ واضافہ کیا گیا ہے۔

(۱۸) مضامین گیلانی مرتبہ مظفر گیلانی، مطبوعہ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ، 1986 ص 95

(۱۹) مسماۃ گیندھریا دائی کی سوانح عمری، از مومنہ مطبوعہ یونائیٹیڈ ویلفیر ایسوسی ایشن استھانواں نالندہ 2015 ص:۱۳

(۲۰) محاسن سجاد ص 37

(۲۱) مضامین گیلانی مرتبہ مظفر گیلانی، مطبوعہ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ، 1986 ص 95

(۲۲) ملاحظہ ہو احسن البیان فی خواص القرآن از مولانا محمد احسن استھانوی، مکتبہ اسحاقیہ کراچی، ص 10

(۲۳) محاسن سجاد، ص 27

(۲۴) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں مرتبہ مولانا عمران خاں ندوی، بحوالہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نقوش وتاثرات، مرتبہ طلحہ نعمت ندوی، مطبوعہ علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی استھانواں، بہار شریف، 2016 ص 13

حضرت مولانا محمد سجاد کے رفقاء واحباب

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی
استاذ حدیث مدرسہ حسینیہ کائم کولم

سرزمین ہند آفاقی شخصیتوں کو جنم دینے میں کبھی بھی بخیل نہیں رہی اور نہ ہی ضرورتوں اورتقاضوں کے وقت اپنے سپوتوں کی قربانی دینے سے دریغ کیا ہے؛ کیوں کہ بادخزاں کے جھونکے ہوں، یا موسم بہار کی بھینی بھینی ہوائیں، سرد لہروں کے تھپیڑے ہوں یا چلچلاتی دھوپ کی شدت وحرارت ملک وملت کے الجھے ہوئے گیسو کو سنوارنے اوردرست کرنے میں قربانیاں مطلوب ہوتی ہیں، ان قربانیوں کی نوعیتیں مختلف ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں؛ کیوں کہ حالات ووقت کا تیور یکساں نہیں رہتا، لہٰذا اسی زد میں بہ جانا کمال نہیں؛ بلکہ اس کو اپنے فیور میں کر لینا مردمیدان کا کام ہوتا ہے، حکمت عملی کا سہارا ضرور ہو، مگر اصل مقصد نگاہ ونظر سے اوجھل نہ ہونے پائے، راہ کی دشواریوں سے اکتا کر سفر کو ملتوی کرنے کے بجائے پوری قوت صرف کر کے ان مشکلات کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا جائے، صرف گزرے ہوؤں کے نقش قدم کی تلاش نہ ہو؛ بلکہ نئے خدوخال کی ایجاد کا مزاج بن جائے، جلوت جس قدر پرکشش ہو، خلوت اس سے کہیں زیادہ تاباں ہو، جم غفیر کو لے کر چلنے کی صلاحیت ہی نہ ہو؛ بلکہ جس فرد پر نگاہ پڑجائے اور جس کو ہم نشیں بنالے، سب پر اپنا جلوہ چھوڑ جائے، دور میں نگاہ بصیرت، خیالات اورافکار کی پاکیزگی وتقدس کے ساتھ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اپنے کو کچھ نہ سمجھے، زبان سے زیادہ دل ونگاہ اور جسم وجان سے کام لیتا ہو، تب جا کر کسی بھی شخصیت میں حقیقی آفاقیت آتی ہے، ایسے لوگوں کے جسموں سے روح تو نکل جاتی ہے؛ مگر زندگی کی یہ لہر بت دنوں تک باقی رہتی ہے اور وہ اپنا کام کرتی رہتی ہے، ایسے جیالوں سے ہندوستان کی سرزمین ہمیشہ مالا مال رہی ہے، انھی آفاقی شخصیتوں میں سے ایک نمایاں نام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کا ہے، جنہوں نے زندگی کی بہاریں تو بہت کم دیکھی، مگر خزاں زدہ ہندوستان کو باد بہاراں سے بھرنے کا کام خوب سے خوب کیا، آپ نے جس دور میں آنکھ کھولی، وہ انتہائی پرآشوب اورفتنوں کا دور تھا، انگریزی تسلط اور سامراجی آمریت اپنے عروج پر تھی، ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کا سب کچھ لٹ چکا تھا، انگریزی ساہوکاروں نے ہر چیز پر دھاوا بولا تھا، دین

وایمان پر تو ان سامراجوں کے نشتر چلتے ہی رہتے تھے، سیاسیات واقتصادیات سے بھی ڈاکہ زنی کر کے خوروش کر دیا تھا، عرصے سے پیشر وبن کر رہنے والی قوموں میں نفرتوں وعداوتوں کی دیوار کھڑی کر دی تھی، جس کی وجہ سے باشندگان وطن کی اجتماعی قوتیں تار تار ہوگئی تھیں، ان سامراجیوں سے ملک کو آزاد کرانے میں اور مسلمانوں کو اجتماعی پلیٹ فارم پر لانے میں مسلمانوں، خاص طور پر یہ اصحاب علم وفضل نے کتنی قربانیاں دی ہیں، ان کی داستان تو بہت طویل ہیں، تاریخ کے صفحات کے صفحات ان ریکارڈوں سے سیاہ ہیں، اس دور کی علمی وفکری، نیز سیاسی زبوں حالی کا حال حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ کی ایک چشم کشا تحریر سے عیاں ہے۔

تیرہویں صدی ہجری اور انیسوی صدی عیسوی پورے عالم اسلام میں سیاسی زوال اور فکری اضمحلال کی صدی ہے، اسی صدی میں عالم اسلام کی نہایت اہم زرخیز ومردم خیز ملک مغربی اقوام کے غلام بنے، ہر جگہ اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم کو موت وزیست کی کش مکش سے سابقہ پڑا، عالم اسلام میں نئے نئے دینی فتنے، گمراہ کن تحریکیں، یہاں تک کہ مدعی نبوت تک پیدا ہوئے، عیسائی مبلغین نئے جوش وخروش کے ساتھ میدان میں آئے، نئے نظام تعلیم نے جو خالص مادی بنیادوں پر قائم تھا، سارے اسلامی ممالک پر اپنا سایہ پھیلایا، عالم اسلام کے یہ ساعت اس بات کے لیے بالکل کافی تھے کہ ذہانت وجرأت کے سب سوتے خشک اور اسلامی فکر وحیات کا درخت خزان رسیدہ اور بے برگ وبار ہو جائے۔

ہندوستان کا حصہ اس عالمگیر سیاسی زوال اور فکری اضمحلال میں دوسرے ممالک سے زیادہ ہی ہونا چاہیے تھا، یہاں سلطنت مغلیہ اور درحقیقت مسلمانوں کے آخری سیاسی اقتدار کا شراغ ابھی گل ہوا تھا اور اس پر براہ راست انگریزی تسلط قائم ہوا تھا جو مسلمانوں کی آخری قوت مقابلہ کا زخم کھا کر مسلمانوں کے لیے ہمدردی ورواداری؛ بلکہ حاکمانہ عدل وانصاف اور مساویانہ سلوک کے جذبات وتر دداور بے کسی وکسمپرسی کا دور تھا، ایسی حالت میں اگر ہندوستان عظیم ومنفرد شخصیتوں سے خالی اور قحط الرجال کا دور دورہ ہوتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، مگر اس کے برعکس یہ دورا کابر رجال ومردان کار کی حیثیت سے بھی، ماہرین فنون، اہل تصنیف اور اصحاب فکر کے لحاظ سے بھی، اہل قلوب اور اصحاب باطن کے نقطۂ نظر سے بھی اور تعلیمی واصلاحی تحریکوں کے اعتبار سے بھی اور اس حیثیت سے بھی کہ اس دور میں بعض عظیم ترین تعلیمی مراکز اور ادارے جو صرف درسگاہیں نہیں؛ بلکہ مدارس فکر اور مستقل دبستان ہیں، قائم ہوئے، سارے عالم اسلام میں خصوصی امتیاز رکھتا ہے۔(۱)

فرنگی ظلم وبربریت وحاکمیت وآمریت کے کم وبیش ڈیڑھ سو سالہ عرصے میں بہت سے

مردان میدان نے علمی وفکری، نیز سیاسی سہارا دینے کی بھرپور کوششیں کیں، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ اسی سلسلہ کی سنہری کڑی کا نام ہے، اس خاموش میر کارواں نے اپنا سب کچھ لٹا کر مسلمانوں اور ہندوستانیوں کی قیادت کا بوجھ اٹھایا اور راہ کی دشوار گذار گھاٹیوں سے گزرنے کا حوصلہ بخشا، نیز ان کے عزم وحوصلہ، یقین واعتماد اور مشین کی طرح متحرک عمل پیہم کے سامنے چٹانوں کے چٹان، ریزے ریزے ہوتے چلے گئے، پھر کارناموں کی بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کی، اگر ان عمارتوں کے ایک کونے پر جمعیۃ علماء ہند، امارت شرعیہ، انڈی پنڈٹ پارٹی اور بہار کی وزارت یونس کی تشکیل لکھ دیا جائے تو ایک سچی حقیقت کی ترجمانی ہوگی، مگر اتنی بڑی بڑی حقیقتوں کے متوجہ ہونے کے باوجود کہیں ان کو اپنے نام کی فکر نہیں، جب بھی موقع نام وری کا آیا، تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے دوسرے کے نام کو آگے کر دیا، آپ کی زندگی کا نقشہ حقیقت سجاد کے مؤلف سید احمد عروج قادری جنہوں نے بیس سالوں تک ان کے شبانہ روز کے احوال کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا، نے اس طرح کھینچا ہے:

''مجاہد جلیل مولانا ابوالمحاسن سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے صرف صوبہ بہار بلکہ سارے ہندوستان کے ان چند مجاہدین میں سے تھے، جنہوں نے پوری للّٰہیت اور خلوص کے ساتھ اپنی زندگیاں ملک وملت کے لیے وقف کردیں، مولانا سجاد اس دن سے جب وہ اس میدان میں اترے، اپنی زندگی کی آخری سانس تک کبھی نہ رکنے والی مشین کی طرح متحرک رہے، ان کے دبلے پتلے جسم میں خدا نے عزم ویقین اور ایمان وعمل کی ایک ایسی برقی رو دوڑا دی تھی، جس نے انہیں زندگی بھر دین ووطن کی بھلائی کے لیے بے چین رکھا''۔(۲)

ملک وملت کے متعلق ان کے خیالات کیا تھے؟ کس انداز سے سوچتے تھے، نیز وہ اپنی ذات میں کیا تھے، کس طرح کے عزم ویقین کے مالک تھے؟ پھر اس عزم کو روبعمل لانے کے لیے کتنا کچھ جتن کرنے پر ایمان رکھتے تھے؟ اور کیسا کچھ حکیمانہ ومخلصانہ طریقہ اختیار کرتے کہ مخالف سے مخالف انسان بھی فریفتہ ہوئے بغیر نہیں رہ جاتا تھا، یہ سب سلسلہ وار مضمون کا حصہ ہے، راقم مختصر طور پر عینی مشاہدین کی کچھ تحریریں پیش کرتا ہوں، جن سے ان کے عزم وعمل، قوت واعتماد اور طور وطریق کا عکس سامنے آسکے گا۔

مولانا راغب صاحب آپ کے ناقدین میں سے ہیں، مگر مندرجہ ذیل تحریر میں ان کی تڑپ کا احساس کئے بغیر نہیں رہ سکے:

''مولانا سجاد کی زندگی کا گلوب اپنے دور حیات میں جس محور پر گھومتا رہا، وہ اسلامی

مرکزیت کی فکراوراس کی پیدائش کے لیےتعمیری جدوجہد کامحورتھا‘‘۔(۳)

’’لیکن ان شاءاللہ اب پوری ملت اسلامیہ ہندجن میں مولانا سجاد کے تربیت دادہ بہت سےپیش پیش ہوں گے، ہندوستان میں ایک آزادمستقل اسلامی مرکزیت کوقائم کرنے اورمولانا مرحوم کے حقیقی نصب العین کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں کامیاب ہوگی، لامرکزیت دور ہوگی، مولانا کا خواب تقدیرالٰہی کے مطابق پورا ہوگا اور ہندوستان ایک اسلامستان بن کر رہے گا، کیوں کہ جیسا کہ مولانا کا اصلی عقیدہ تھا، اس ملک کی نجات نہ ہوتو پراچین بھارت کے دھوم راشٹریا میں ہےاورنہ نوین بھارت کی گاندھیت اوررام راجیہ میں ہےاورنہ فرنگی سیاست کی پارلمنٹری جمہوریت یااشتراکیت، ناریت وفسطائیت میں ہے؛ بلکہ اس کی حقیقی حدیث صرف سلطنت اسلامی کی تعمیراورنظام تمدن اسلامی تاسیس میں ہے‘‘۔(۴)

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ جنہوں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا تھااوران کے ہی خواب وخیال میں ڈھل کراپنی زندگی کارخ متعین کیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

’’لیکن مولانا کی طرح مذہب کی لگن، قوم وملک کا جنون، کام کا سودا اورپھراس سلسلہ میں پوری طرح خودفراموشی کسی اورمیں نہیں دیکھی‘‘۔(۵)

’’ہروہ شخص جس نے مولانا کی زندگی کا مطالعہ کیاہے، وہ اس اعتراف پرمجبورہے کہ اتنے بہتردل ودماغ کا مالک، فکروعمل کاایساجامع، ایثاروقربانی کاایساپتلا، علوم وفنون کاایسا ماہر، خلوص وللٰہیت کا ایسا مجسمہ اورپھران ساری بڑائیوں کے ساتھ ایسا منکسراورمتواضع شخص کم دیکھا گیا‘‘۔(۶)

حضرت مولانا احمدسعید جو جمعیت کے فعام منتظم رہے ہیں اورانہوں نے ۱۳۳۴ھ کے تباہ کن زلزلہ بہار کے موقع پرایک ماہ مولانا سجاد کےساتھ گزاراتھا، اپنے آپ کومولانا سجاد کا روحانی بیٹاتصورفرماتے تھے، وہ ان کے افکاروخیالات کی ترجمانی ان الفاظ میں کیا کرتے ہیں:

’’وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندی کوبغیرامیر کے غیرشرعی زندگی سمجھتے تھے، کسی اسلامی ملک پرکفار کےتسلط کووہ نہایت تشویش کی نظرسے دیکھتے تھے۔ان کا خیال یہ تھا کہ کفرکےاس بے پناہ غلبہ اوراثرات کوجس قدرکم کیا جاسکے کرناہے، اس راستے میں جس قدرقربانیاں پیش کرنے کی ضرورت ہو، اس سے دریغ نہ کیا جائے، حکومت متسلطہ مداخلت نہیں کرتی اورجوچیزیں اس کی دست بردسے باہرہیں، ان میں اپنا ملکی نظام قائم کیا جائے، وہ فرماتے تھے: اسلام ایک تنظیمی مذہب ہے، اس مذہب کی روح ڈسپلن اورنظم چاہتا ہے،

اگر مسلمان منتشر رہیں اور کسی ایک شخص کی اجتماعیت نہ کریں اور اپنا کوئی امیر منتخب نہ کریں تو یہ زندگی غیر شرعی ہوگی''۔(۷)

''نظام حکومت کی تخریب جب ہی ہوسکتی ہے، جب دونوں قومیں مل کر اس کام کو کریں اور دونوں قوموں پر پورا پورا اشتراک ہو، یہ رائے انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر قائم کی تھی''۔(۸)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب اپنی ذات میں انجمن تھے، سیاسی قوت کی بازیابی کے لیے ایک پارٹی کے مؤسس، مسلمانوں کی صف میں اجتماعیت لانے کے لیے امارت شرعیہ بہار، اڈیشہ وجھارکھنڈ کے بانی، جمعیۃ علماء ہند کے خاکہ ساز کمیٹی کے روح رواں اور وقتاً فوقتاً اس سے مربوط رہنے والے کامیاب منتظم بھی تھے، آپ کے گذر جانے سے جمعیت کو کتنا کچھ نقصان کا احساس تھا، اس درد کا احساس مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے:

''میں بلا شبہ مبالغہ نہ صرف اپنی بلکہ اپنے تمام رفقائے کار کی متفقہ رائے کے مطابق یہ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی شخصیت جمعیۃ علماء ہند کے مقاصد کی تکمیل میں زبردست معین ومددگار رہی اور ان کی وفات سے جمعیۃ علماء ہند کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے''۔(۹)

ان چند شہادتوں سے ان کے افکار وخیالات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اللہ نے ان کے اردوں کو قبول کیا اور دیکھتے دیکھتے ان کے حامی ومددگار، اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین رفقا تک ہوگئے اور ان کے سوچے سمجھے مشن کو آگے بڑھانے میں سب نے اپنی اپنی وسعت کے بقدر حصہ لیا، اساتذہ وتلامذہ کا باب چوں کہ مستقل ہے؛ اس لیے زیر نظر مضمون میں ان کے ان رفقائے کار کے تذکرے پر اکتفا کیا جاتا ہے، جن کی سوانح عمریاں کتابوں کے سفینوں میں محفوظ ہیں اور راقم کی پہنچ بھی وہاں تک ہوسکی، مگر ان چند نفوس کے علاوہ بھی رفقا کی خود فراموش جماعت ایسی ہوں گی، جو گمنامی کے دفینے میں گم ہوں گی، ہم ان حضرات کے لیے دعائے رحمت ومغفرت کے سوا اور کسی چیز پر قادر نہیں ہیں، خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی:

ہندی سلسلہ حضرت غوث پاک کے واسطے سے ہاشمی خاندان تک پہنچتا ہے، والد بزرگوار مولانا شاہ حکیم محمد داؤد ہاشمی قادری ضلع سارن بہار کے رہنے والے تھے، مگر حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان کی ولادت اپنے نانا کے گھر ۱۰/اگست ۱۸۵۹ء کو پھلواری شریف پٹنہ میں ہوئی، پھر یہیں بود وباش اختیار کرلیں، گھریلو ماحول عالمانہ اور عارفانہ تھا، گھر پر ہی ابتدائی تعلیم ہوئی، بلکہ پٹنہ سے

میبذی وملاحسن وغیرہ تک پڑھ کر فرنگی محل لکھنؤ حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محل کی خدمت میں پہنچے، حدیث کی تکمیل حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا سید نذیر حسین دہلوی شیخ الکل فی الکل سے کی، ان کے علاوہ شیوخ حرمین جن کی تعداد ستر کو پہنچتی ہے، ان سے سنن ومسانید کی اجازت حاصل کی، یہ سارے اساتذہ اپنے وقت کے بالغ النظر ووسیع الفکر مشائخ میں سے تھے۔

آپ کو عربی، اردو، فارسی ہرسہ زبان پر عبور حاصل تھا، تینوں زبانوں میں اشعار بے تکلف کہا کرتے تھے، فارسی میں اشعار کی تعداد کچھ کم ہیں، اردو وعربی میں اشعار آپ نے زیادہ کہے ہیں، شعری تخلص بہت ہی بامعنیٰ ''حاذق'' تھا۔

تصوف وسلوک کا خاص ذوق رکھتے تھے، اس سلسلہ میں آپ نے سب سے پہلے شاہ قدرت اللہ علیہ الرحمہ سے بیعت ہوئے، شاہ قدرت اللہ نے بھی حضرت محدث سہارنپوری سے سماع حدیث کیا ہے، اسی زمانہ میں حضرت پھلواروی صاحب وہاں زیر درس تھے، دونوں ایک ساتھ رہتے تھے، شاہ قدرت اللہ اس راہ کے مجھے ہوئے سالک وکامل تھے، بارہا تصوف کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، آخر حضرت پھلواروی کا دل مطمئن ہوا اور ان ہی سے سلسلہ چشتیہ میں بیعت ہوکر خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے، پھر جب حجاز مقدس کا سفر ہوا تو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمہ سے بھی اس سلسلہ کی اجازت حاصل ہوئی، دلائل الخیرات کی اجازت بھی آپ کو حضرت حاجی صاحب سے ملی۔

حضرت حاجی صاحب کی صحبت کا اثر تھا کہ مثنوی مولائے روم کے اشعار جھوم جھوم کر پڑھا کرتے تھے، جب سریلی آواز میں ترنم کے ساتھ مثنوی کے اشعار پڑھتے تو مجمع بے خود ہو جاتا، اپنی تقریر وبیان کے دوران اشعار اتنی کثرت سے پڑھا کرتے کہ مثنوی کی اشاعت وہرت کا سہرا بھی آپ کے سر باندھا جاتا ہے، ۱۹۲۰ء میں جب عراق کا سفر ہوا، وہاں آستانہ غوث پاک کے سجادہ نشیں سید عبدالرحمٰن علیہ الرحمہ سے سلسلہ قادریہ کی نسبت کی تکمیل فرمائی، آپ اپنے خسر محترم مولانا شاہ علی حبیب نصر پھلواروی کے دست گرفتہ بھی تھے، اس طرح علمی وروحانی ہر دو کے مختلف مکاتب فکر ومراکز معرفت سے خوب سیراب ہوئے، جس کی وجہ سے فکر وخیال میں توازن واعتدال آ گیا تھا، چنانچہ سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کے معاون بھی سمجھے جاتے تھے، اہل تصوف وسلوک کو بھی دل وجان سے عزیز رکھتے، ملک وملت کی خدمت وقیادت میں بھی انفرادی شان کے مالک تھے، مختلف کانفرنسوں اور انجمنوں کے روح رواں کی حیثیت سے شاہ صاحب کی پہچان تھی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قائد ورہبر، انجمن اسلامیہ پٹنہ، انجمن حمایت الاسلام لاہور کے مقبول ومعروف رہنما ولیڈر سمجھے جاتے تھے، علامہ اقبال کی اقبال مندی بھی اسی انجمن حمایت

السلام سے ہی متعلق ہے، علامہ اقبال جیسا فلسفی انسان بھی بعض مسائل میں حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرتا تھا اور آپ کے جواب سے مطمئن ہو جاتا تھا، آپ کے قلم سے مختلف وقیع کتابیں بھی تصنیف ہوئیں، شجرۃ السعادۃ وسلسلۃ الکرامۃ (بزبان فارسی)، رسالہ فی الصلاۃ والسلام، ذکر الحبیب، شرح قصیدہ غوثیہ، شرح حدیث مسلسل بالاولیۃ (بزبان عربی)، تذکرہ بزرگان پھلواری، کتاب الاشغال والاوراد، عین التوحید اور شمس المعارف جو کہ علمی وعرفانی مکاتیب کا مجموعہ ہے، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نمایاں خدمات میں سے ندوۃ العلماء کی تاسیس ہے، حضرت مولانا محمد علی مونگیری علیہ الرحمہ کے شانہ بشانہ رہے اور ہر نظام و پروگرام میں برابر شریک رہے، جب ندوۃ العلماء کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا تو اندرونی نظام تعلیم وتربیت سنبھالنے کے لیے معتمد تعلیمات کے عہدہ پر فائز بھی رہے؛ مگر بہت دنوں تک بعض روشن خیال علماء کی وجہ سے نہیں رہ سکے، کچھ اختلافات ہوئے، چنانچہ سبکدوش ہو کر وطن مالوف پھلواری شریف چلے گئے اور وہیں بروز جمعہ ۳۱ رمئی ۱۹۳۵ء میں انتقال کر کے خاک وطن میں مل گئے۔ (۱۰)

حضرت مفکر اسلام ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ نے جب جمعیۃ علماء بہار کی تشکیل کے لے تگ ودو شروع کی اور پھر امارت شرعیہ کا نظام مرتب کیا تو دونوں کی موقعوں پہ آپ کا ساتھ دینے والوں اور سرتوڑ کوشش کرنے والوں میں حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی علیہ الرحمہ کا نام نامی بھی آتا ہے؛ لیکن یہ رفاقت بھی تادیر نہیں رہ سکی، خیالات نے پلٹا کھایا اور دونوں رفیقوں کے مابین بعد بھی ہو گیا، مولانا محمد اصغر حسین بہاری جو مفکر اسلام کے شاگرد رشید ہیں، وہ مختصر تعلیمی وسیاسی زندگی کے عنوان سے لکھتے ہوئے جمعیۃ علماء بہار کی تشکیل کا قصہ رقم کرتے ہیں:

’’آخر جمعیۃ علماء بہار کی تشکیل کا عزم ہوا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہار شریف تشریف لا کر تگ ودو شروع کی، مسٹر سید قاسم مرحوم (متولی صغریٰ وقف اسٹیٹ بہار) کو راضی کر کے مدرسہ عزیزیہ میں جلسہ کرنے کی اجازت لی اور استقبالیہ کمیٹی قائم کر کے اس ناچیز کو صدر استقبالیہ مقرر فرمایا، پھر اس کے ماتحت کارروائی شروع ہوئی، تاریخ جلسہ معین کر کے علماء بہار کی خدمات میں دعوتی رقعہ ارسال کئے، شوال ۱۳۳۶ھ میں حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین احمد قدس سرہ کے عرس کے موقع پر یہ جلسہ طلب کیا گیا اور مدرسہ عزیزیہ کے وسیع صحن میں شامیانے کے تلے علماء مدعوئین اور عوام کے جلسہ میں جمعیۃ علماء بہار کی بنیاد رکھ دی گئی، حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی غفرلہ مع اپنے صاحبزادہ

شاہ حسین میاں کے شریک ہوئے تھے۔۔۔ پھر دوسرے سال پھلواری شریف میں بڑے پیمانہ پر اس کا جلسہ ہوا، مولانا آزاد سبحانی و دعوت دے کر بلایا گیا، انہوں نے اپنی زبردست تقریر و سحر بیانی سے حاضرین میں جوش وولولہ کی روح پھونک دی، جلسہ نہاء کامیاب رہا، اس میں شک نہیں کہ کامیابی میں حضرت مولانا شاہ سلیمان مرحوم کا بڑا ہاتھ تھا۔

پھر جب حضرت الاستاذ نے امارت شرعیہ کی تمہید ڈالی تو حضرت شاہ صاحب مرحوم نے اس کی تاسیس و تعمیر میں ساتھ دیا؛ لیکن امارت کے دوسرے دور کے بعد خیال نے پلٹا کھایا، جس کے باعث دونوں ہستیو کے درمیان مخالفت کی خلیج حائل ہوگئی''۔(۱۱)

حضرت مولانا خدا بخش مظفرپوری:

جمعیۃ علماء ہند کے اولین قائدین اور مولانا سجاد صاحبؒ کے اہم مشیرین میں سے حضرت مولانا خدابخش مظفرپوری تھے۔(۱۲)

آپ ایسے گھرانہ کے چشم و چراغ ہیں، جس میں علم دین کا چرچہ نہ تھا، تھوڑا بہت انگریزی و ہندی کا رواج تھا، رائس برادری سے تعلق رکھتے تھے، ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں مظفرپور میں پیدا ہوئے، ۱۹۳۶ء مطابق ۱۳۵۵ھ میں وفات پائی، تھوڑی تاخیر سے تعلیم کا آغاز کیا، متوسطات تک جامع العلوم مظفرپور میں حاصل کی، پھر حضرت مولانا نصیرالدین نصر جو ایک جید عالم دین، نقشبندی بزرگ و درویش، حضرت مولانا فضل رحمان کے ہردلعزیز اوران کے عاشق زار، جامع العلوم مظفرپور کی تاسیس، دنیا کے مشیر کار اور بڑے بڑے علماء وا کابر ے استاذ تھے، ان کے حلقہ درس میں داخل ہوگئے، حضرت مولانا نصیرالدین نے اپنی چشم بصیرت سے اس ہونہار طالب کو تاڑ لیا تھا، چنانچہ پوری زندگی ان کی تعلیمی وفکری سرپرستی فرماتے رہے، مولانا نصیرالدین نصر کے تعلقات حلقۂ کانپور سے بھی تھے اور دیوبند سے بھی، چنانچہ اولا دان کو کانپور بھیجا، پھر دیوبند کے لیے روانہ کیا، چنانچہ شعبان ۱۳۱۸ھ نومبر ۱۹۰۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی، مولانا ریاض بتیاوی وغیرہ آپ کے ساتھیوں میں سے تھے۔(۱۳)

آپ نے مظفرپور میں ''فیض عام'' کے نام سے ایک مدرسہ کی بنا کی، جو بیس سالوں تک اپنا فیض بکھیرتا رہا، آپ کی وفات کے وہ بند ہوگیا، آپ نے دوشادیاں کیں، مگر نرینہ اولاد نہ ہوسکیں، البتہ تین لڑکیاں پیدا ہوئی، ایک کی شادی جناب محمد اسماعیل صاحب محلّہ اسلام پور مظفرپور سے ہوئی، دو کی شادیاں بعد میں ہوئیں۔

آپ کے حالات بہت زیادہ دستیاب نہیں ہیں، مگر حضرت مولانا نصیرالدین نصؔر کی چوں

کہ سرپرستی رہی ہے، ان کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے علماء کی لمبی فہرست ہے، ان میں ایک ان کے صاحبزادہ حضرت مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری ہی ہیں، حضرت مولانا عبدالشکور کا حضرت مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ کی علمی فکر پر گہرا اثر تھا، مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ بھی اس کا اعتراف کیا کرتے تھے اور ذہانت وفطانت، فہم وفراست کو بالیدہ بنانے میں ان کا احسان مانتے تھے، بعض تحریروں سے ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ مولانا محمد سجاد کی سیاسی سوجھ وبوجھ اور ملی ودینی فکر کے ہم خیال وہم نوا مولانا عبدالشکور بھی تھے، ظاہر ہے کہ مولانا خدا بخش مظفر پوری ان کے گھر کے پروردہ اور ان کے والد کے زیر تربیت رہے ہیں، وہ بھی انہی افکار وخیالات کے حامی ہوں گے، جو مولانا عبدالشکور صاحب اور مولانا محمد سجاد صاحب کے تھے، چنانچہ اس کی شہادت کے لیے ناظرین کی توجہ پانچ سو علما کے دستخط سے جاری ہونے والا متفقہ فیصلہ کی طرف پھیرتا ہوں، یہ فیصلہ وفتویٰ انگریزوں کے خلاف ترک موالات کے متعلق تھا، جس کو حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کے فکر ساز قلم نے تحریر کیا تھا اور جمعیت کے پلیٹ فارم سے پانچ سو علما ودانشوران نے اس پر اپنے اپنے دستخط ثبت کیا تھا، ان دستخط کنندہ لوگوں میں مولانا خدا بخش مظفر پوری علیہ الرحمہ کا نام بھی ہے، اس سے جمعیۃ کے کاز اور مولانا محمد سجاد کی فکر سے آپ کی وابستگی جھلکتی ہے۔ واللہ اعلم

شیخ عدالت حسین رحمہ اللہ:

شیخ عدالت حسین صاحب ضلع چمپارن کے رہنے والے اور وطن کے بگہی گاؤں میں ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے، والد بزرگوار شیخ دلاور حسین تھے، ابتدائی تعلیم علاقہ میں ہوئی، پھر گورکھپور وجونپور میں اردو وفارسی اور عربی میں مہارت پیدا کی، تھوڑا بہت ہندی سے بھی واقف تھے، ۱۹۱۴ء میں آپ قوم کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہوگئے، انگریزوں کے ان مظالم کا خاص طور پر سینہ سپر ہوکر مقابلہ کیا، جو کاشتکاروں پر ان کے زرعی پیداوار واراضی پر ہو رہے تھے، ضلع کی خلافت تحریک وکانگریس کے روح رواں بھی تے، آپ نے جدوجہد کرکے بگہی مڈل اسکول بھی قائم کیا تھا، ۱۹۳۰ء میں ستیہ گرہ میں حصہ لیا، چنانچہ فرنگی ظلم کے شکار ہوکر پکڑے گئے، ایک سال کی سزا دی گئی، انگریز دشمنی آپ کی گھٹی میں تھی، چنانچہ ایک مینا بازار کے نام سے انگریزوں کی موافقت میں مارکیٹ لگتی تھی، آپ نیدوسری مارکیٹ اس کے مقابلہ میں لگوائی، جس کو جرم قرار دیا گیا، بالآخر اس میں بھی گرفتار ہوئے اور سزایاب ہوئے۔

۱۹۳۷ء میں آپ کی کوششوں سے کانگریس کا اجلاس بگہی میں منعقد ہوسکا، ۱۹۳۸ء میں عبدالغفار خاں کو اپنے علاقہ کا دورہ کرایا، ۱۹۴۲ء میں جب ''ہندوستان چھوڑو'' { کوئٹ

انڈیا}(۱۴)تحریک ملک گیر پیمانہ پر شروع کی گئی اور کانگریس نے ماہ اگست میں کھلے لفظوں میں انگریزوں کو الٹی میٹم دے دیا کہ بہت جلد ہندوستان چھوڑو، ورنہ حالات سنگین ہوں گے، اس کی تائید جمعیۃ علماء ہند کے ارکان کی طرف سے بھی ہوئی۔(۱۵)

چنانچہ ہر طرف باغیانہ نعرے شروع ہوئے، املاک حکومت کو نقصان بھی پہنچایا گیا، مسلم قائدین گرفتار بھی ہوتے رہے؛ مگر ''نعرۂ مستانہ'' کی آواز دب نہ سکی؛ بلکہ روز بروز بڑھتی رہی، اس تحریک میں شیخ عدالت حسین بہت پیش پیش رہے۔(۱۶)

شیخ عدالت حسین حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کے قابل اعتماد رفقا میں سے تھے، حافظ محمد کافی علیہ الرحمہ کا بیان ہے:

''حضرت مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ کے دورہ میں احقر اور شیخ عدالت ہمیشہ ساتھ رہتے تھے''۔(۱۷)

اسی لیے امارت شرعیہ کے قیام کے وقت سے ہی امارت کے فعال ارکان میں شمار ہوتے تھے، امارت کو سب سے زیادہ فعالیت اور قوت جن اضلاع میں ملی، ان میں چمپارن سرفہرست ہے، اس کو فعال بنانے میں آپ نے کلیدی کردار ادا کیا ہے، جن کے نمایاں اثرات آج تک دیکھے جاسکتے ہیں، اس لیے حضرت مفکر اسلام بھی ان پر ناز کیا کرتے تھے، کم وبیش سات دہائی تک شیخ قائدانہ کردار ادا کرتے رہے، بالآخر ۱۹۸۳ء ۲۱/مارچ کو ۸/بجے صبح انتقال کرگئے۔(نقیب فروری:۱۹۵۶ء، مولانا سجاد حیات وخدمات، ص:۵۲۰)

بیرسٹر مسٹر محمد یونس مرحوم:

حضرت مفکر اسلام کے احباب ورفقا میں ایک نمایاں مقام مسٹر یونس کا ہے، مسٹر یونس کی پیدائش ۴/مئی ۱۸۸۴ء کو پنہرا گاؤں، ہربت پور، داناپور پٹنہ میں ہوئی، والد محترم پیشہ کے ایک کامیاب مختار تھے، ابتدائی تعلیم اوراردو، فارسی، عربی پڑھ کر اولاً پٹنہ اسکول میں داخلہ لیا اور انٹر پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے پٹنہ کالج میں داخل ہوئے۔

۱۹۰۳ء میں لندن تشریف لے گئے، وہاں تین سال رہ کر بیرسٹر کی تعلیم حاصل کی اور ۲۶/جنوری ۱۹۰۶ء کو وطن واپس آگئے، روزگار کے لیے وکالت کا پیشہ ہی اختیار کیا، چنانچہ پہلے کلکتہ ہائی کورٹ میں، پھر پٹنہ ہائی کورٹ میں کامیاب بیرسٹر سے شہرت رکھتے تھے، دہلی فیڈرل کورٹ میں بھی کام کیا اور اکثر مقدموں میں کامیابی بھی ملی۔

مسٹر محمد یونس صاحب سماجی وسیاسی خدمت سے بھی جڑے رہے، بہار ینگ ایسوسی ایشن

کے سکریٹری، بہار اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے صدر، پٹنہ سٹی میونسپلٹی میں تین بار میونسپل کمشنر، ۱۹۰۸ء میں کانگریس لاہور سیشن میں لیجلیٹو کانسل کے ممبر، ۱۹۲۱ء و۱۹۲۲ء میں بہار قانون ساز کونسل کے رکن وغیرہ عہدوں پر فائز رہے، اس طرح مختلف کونسلوں اور عہدوں سے جڑ کر جتنا بن پایا، قوم کی خدمت کرتے رہے۔

مسٹر محمد یونس بھی حضرت مفکر اسلام کی طرح مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں حکومت کی مداخلت یا سیاسی جمہوری اداروں کی دخل اندازی کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، ان کا بھی خیال تھا کہ جن معاملات میں حکومت متسلطہ کی مداخلت کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ وہ پرسنل لا کے تحت آتے ہیں، ان میں مسلمانوں کا اپنا مکمل نظام ہونا چاہیے اور کوئی خالص مذہبی تنظیم ہونی چاہیے، چنانچہ جب امارت شرعیہ کا قیام حضرت مفکر اسلام کے ذریعہ ہوا تو مکمل طور پر مسٹر محمد یونس صاحب اس کے حامی ومعاون ثابت ہوئے۔

اسی طرح مسٹر محمد یونس مرحوم کانگریس کے نظریات کو بھی سراہتے تھے، مگر حضرت مفکر اسلام کی طرح ایسی سایسی تنظیم کے خواہاں تھے جو آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والی سیاسی جماعتوں کے ساتھ اشتراک عمل بھی کرے اور بوقت ضرورت مسلم قوم کے مفاد کے لیے اس سے الگ بھی ہوسکے، جب حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی تو مسٹر محمد یونس اس کے سب سے بڑے لیڈر ہوئے۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۱ کے بعد انڈی پنڈنٹ کی حکومت سازی:

چنانچہ ۱۹۲۵ء میں انگریزوں کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ ہندوستانی قوم پر جبر وتشدد کے ساتھ حکومت آسان نہیں ہے، نیز ہندوستانیوں کے حقوق کو پامال کرکے بہت دنوں تک حکومت قائم نہیں رکھی جاسکتی ہے، اس لیے نیا دستور وضع کیا گیا کہ ہندوستانیوں کو اپنی حکومتیں قائم کرکے داخلی اختیارات دے دیئے جائیں؛ لیکن اس کے لیے الیکشن کو شرط قرار دیا گیا، الیکشن کا قانون اپنی چالبازی ''لڑو اور حکومت کرو'' سے یہ بنایا کہ ہندو ہندو امیدوار کو اور مسلمان مسلم امیدوار کو ہی ووٹ دے سکتا ہے، چنانچہ ۱۹۳۶ء میں الیکشن ہوا، کانگریس نے پورے ملک میں برتری حاصل کی، اس موقع پر مسلم لیگ نے بھی قسمت آزمائی کی تھی۔ (۱۸)

بہار میں مولوی شفیع داؤد کی احرار پارٹی اور میاں سید عبدالعزیز سابق وزیر تعلیم کی بھی پارٹی امیدوار میدان میں تھے، مگر انڈی پنڈنٹ کے رہنماؤں نے بالخصوص حضرت مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ بانی وصدر پارٹی اور مسٹر محمد یونس نے شب وروز ایک کرکے پارٹی کا ایسا تعارف کرایا

اور ووٹروں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا کہ ووٹوں کی گنتی ہوئی تو کانگریس بڑی پارٹی ضرور تھی، ،مگر دوسرے نمبر پر سب سے بڑی پارٹی انڈی پنڈنٹ ہی تھی،۱۵۲؍سیٹوں والی اسمبلی میں اس پارٹی کو ۲۸؍سیٹیں حاصل ہوئیں،حکومت سازی کے لیے اصل حقدار کانگریس تھی،مگر کانگریس کے کچھ مطالبات وتقاضے تھے،جن کو گورنر نے تسلیم نہیں کیا تو کانگریس بھی حکومت سازی سے ہاتھ کھینچ لیا، مجبورا گورنر نے انڈی پنڈنٹ پارٹی کو دعوت دی، چنانچہ حضرت مفکر اسلام نے وزارت کی تشکیل کے لیے مسٹر یونس کو آگے کردیا اور وزارت عظمیٰ کے لیے محمد یونس صاحب کا نام پیش کردیا، چنانچہ ۱۹۳۷ء کے اوائل میں مسٹر محمد یونس کی حکومت قائم ہوئی،کل تین مہینے اس پارٹی کی حکومت رہی، کانگریس سے گورنر کو جو اختلافات تھے،ان کو دور کرلیا گیا تو کانگریس بھی حکومت بنانے کے لیے تیار ہوگئی اور اس طرح مسٹر محمد یونس کی حکومت گرگئی، ۱۹۳۹ء تک وزارتوں کا دور رہا،اسی سال کے آخر میں بطور احتجاج وزرا نے استعفیٰ بھی دے دیا۔

مسٹر محمد یونس نے بہت کم مدت میں بڑے بڑے کام کئے، عدالتوں میں اردو رسم الخط کو جاری کیا، پٹنہ عدالت اور ایوان کونسل کی عمارتیں بھی اس حکومت کی یادگار ہیں۔

مسٹر محمد یونس مرحوم کی یہ وزارت پہلی مسلم وزارت تھی اور وزارت عظمیٰ پر محمد یونس فائز تھے،مگر پارلیمنٹری بورڈ کے صدر نشیں حضرت مفکر اسلام ہی تھے،حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں:

> ''لہٰذا یونس صاحب نے وزارت ترتیب دے کر قلمدان وزارت سنبھال لیا اور اس طرح بہار کی حکومت اگرچہ یونس صاحب کی وزارت کے ہاتھ میں تھی،مگر دراصل پارٹی کے پارلیمنٹری بورڈ کے صدر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب اس حکومت کے روح رواں تھے''۔(۱۹)

آخر عمر میں طبیعت خراب ہوئی تو علاج کے لیے لندن گئے،۳۰؍مئی ۱۹۵۲ء کو وفات پاگئے اور بروک وود کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

مفتی اعظم ہند حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب:

ہندوستان کے فقیہ بے مثال، مدرسہ امینیہ کے محدث عالی وقار،تحریک آزادی کے قائد وسالار، جمعیۃ علماء ہند کے بانی ورہنما حضرت مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ دہلوی علیہ الرحمہ ایک کامیاب سیاست داں اور مختلف کمالات واوصاف کی جامع شخصیت کا نام ہے۔

خاندان وہندوستان: شیخ جمال یمنی کے نسل سے ہیں،شیخ جمال اس قافلہ کے سردار کا معصوم بچہ ہے، جو یمن سے ہندوستان آرہا تھا،بحرین سے موتی خرید کر ہندوستان میں فروخت کرتا اور یہاں کے مسالہ جات اور دیگر اشیاء تجارت اپنے ملک میں لے جاکر فروخت کرنا مقصد سفر تھا،مگر

بادبانی کشتی بیچ سمندر میں ہچکولے کھا کر غرق ہوگئی، ساتھ میں کشتی پر سوار ہر فرد سمندر کی نذر ہوا، صرف میر قافلہ کا ننا بچہ جمال زندہ بچ سکا، جو کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختے پر بہتا ہوا کسی ساحل کے قریب پہنچا تو بھوپال کے ایک آدمی نے اس کو بچالیا اور اپنے ساتھ بھوپال لے گیا، اس شخص نے اچھی تربیت کی اور اپنے خاندان کی کسی دوشیزہ سے نکاح بھی کردیا، شیخ جمال مفتی اعظم کے مورث اعلیٰ ہیں۔

کچھ عرصہ بعد یہ خاندان بھوپال سے یوپی شہر شاہ جہاں پور پہونچ گیا، وہیں ۱۲۹۲ھ ۱۸۷۵ء کو قلہ ''سب زئی'' میں ایک غریب گھرانہ یعنی شیخ عنایت اللہ بن فیض اللہ کے گھر مفتی صاحب پیدا ہوئے۔(۲۰)

والد صاحب انتہائی متقی، پرہیزگار انسان تھے، غربت کے باوجود ارادے بلند رکھتے تھے، اپنے فرزند کے تئیں جذبات محض دینی تھے، وہ چاہتے تھے کہ ان کو عالم بنایا جائے، نامساعد حالات کے باوجود باپ کی نیت اور بیٹے کی جدوجہد، اساتذہ کی شفقت رنگ لائی اور غریب گھر کا بچہ ہندوستان کے علمی و دینی، نیز سیاسی افق پر ماہ تاباں بن کر طلوع ہوا۔

تکمیل تعلیم: پانچ سال کی عمر میں محلّہ کے حافظ برکت اللہ کے پاس مکتب میں بیٹھائے گئے، قرآن مجید کی تعلیم تک اسی مکتب میں رہے، اردو و فارسی کی تعلیم کے لیے حافظ نسیم اللہ کے مکتب جو محلّہ ''درک زئی'' میں تھا، داخل کئے گئے، پھر محلّہ خلیل شرقی میں مولوی اعزاز حسن خاں کے مدرسہ اعزازیہ میں داخل ہوکر فارسی ادب، نیز عربی کی ابتدائی کتب ماہر استاذ حافظ بدھن خاں کے زیرسایہ شروع کی، اسی مدرسہ میں حضرت مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے شاگرد رشید مولانا عبیدالحق خاں افغانی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا، مولانا عبیدالحق ان کو دارالعلوم دیوبند بھیجنا چاہتے تھے؛ مگر والد صاحب کی غربت کی وجہ سے یہ طے پایا کہ جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد میں پڑھایا جائے، چنانچہ وہاں دوسال رہ کر حضرت نانوتوی کے شاگرد رشید حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھی اور مولانا محمد حسن وغیرہ سے کسب فیض کیا، ۱۳۱۲ھ میں دارالعلوم تشریف لے گئے، اس وقت دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا منیر صاحب اور صدرالمدرسین حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان دونوں بزرگوں کے سایہ میں رہ مسلسل تین سالوں تک دارالعلوم میں پڑھتے رہے، اساتذہ میں مشہور شیخ الہند، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا حسن وغیرہ رحمہم اللہ ہیں، دورہ حدیث کے ساتھیوں میں حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا ضیاء الحق اور مولانا امین الدین وغیرہ رحمہم اللہ ہیں۔

درس وتدریس: درس وتدریس کا آغاز مدرسہ عین العلم سے کیا، جس کو آپ کے مشفق

استاذ حضرت مولانا عبید الحق صاحب نے شاہ جہانپور میں ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں قائم کیا تھا، مسلسل پانچ سال اسی مدرسہ میں پڑھاتے رہے، مدرسہ کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، پھر بھی حضرت مفتی صاحب نے انتہائی صبر اور تمام تر استغنا کے ساتھ ۱۳۲۱ھ یعنی مولانا عبید الحق کے انتقال تک خدمت کرتے رہے، اسی مدرسہ کے تلامذہ میں حضرت مولانا اعزاز علی استاد حدیث وفقہ دار العلوم اور حضرت مفتی مہدی حسن مفتی دار العلوم دیو بند بھی ہیں۔

دوسری طرف آپ کے ساتھی اور رفیق خاص حضرت مولانا امین الدین صاحب نے ۱۳۱۵ھ میں مدرسہ امینیہ کے نام سے دہلی میں ایک معتبر ادارہ قائم کیا تھا، جس کے پہلے استاذ حضرت علامہ کشمیری مقرر ہوئے؛ لیکن حضرت کشمیری کے گھریلو حالات کچھ خراب ہوئے، جن کی بنا پر آپ کو وطن مالوف لوٹنا پڑا، ان کے بعد مدرسہ بانی نے اپنے دوسرے رفیق حضرت مفتی صاب کو اپنے یہاں آنے پر مجبور کیا، آپ وہاں پہونچے اور جب تک زندہ رہے، مسند حدیث وفقہ کو رونق بخشتے رہے، مولانا امین الدین صاحب کے دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد اس مدرسہ کی باگ ڈور بھی سنبھالنی پڑی، آپ کے دور مسعود میں مدرسہ امینیہ کا وقار بہت بلند ہوا، ہر طرح کی عظمتوں ورفعتوں کے لیے علمی حلقوں میں جانا پہچانا جانے لگا، نیک نامی وشہرت سے متأثر ہوکر مدرسہ عالیہ فتح پور کے احباب حل وعقد نے بھی ذمہ داری آپ کو تفویض کردی، مدرسہ عالیہ نے بھی کافی بلندی کو چھوا، علمی وقار میں کافی ترقی ہوئی، مولوی وفاضل کے امتحانا میں اس مدرسہ کے طلبہ کی کامیابی نمایں رہنے لگی۔

علمی سرمایہ: مدرسہ عین العلم کے زمانے سے ہی آپ کی دلچسپی فقہ وفتاویٰ کی طرف تھی اور اس کام کو بحسن وخوبی انجام دینا شروع بھی کردیا تھا، حضرت مولانا عبید الحق صاحب کی ستائش اور تعریفی کلمات سے حوصلہ کو بلندی ملتی رہی، چنانچہ اسی زمانے سے آپ کے فتاویٰ کو علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا، دہلی منتقل ہونے کے بعد اس معتبریت میں اور بھی اضافہ ہوا، چنانچہ آپ کو مفتی اعظم ہند کے اعزازی لقب سے سرفراز کیا گیا، جو آپ کی شخصیت کے لیے انتہائی موزوں ثابت ہوا، آپ کے فتاویٰ ''کفایت المفتی'' کے نام سے شائع ہوئے، کفایت المفتی جدید وقدیم مسائل حل کرنے کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے، بہت سے راز سربستہ جو علمی نکات اس سے کھلتے ہیں، اس کے علاوہ تعلیم الاسلام کراماتی تحریر وترتیب ہے، زمانہ ہر قسم کے نشیب وفراز سے دوچار ہوا، مگر تعلیم الاسلام اپنے مقصد کی حفاظت کرنے اور اپنی حیثیت واہمیت کو بحال رکھنے میمس اپنی مثال آپ ثابت ہوئی، اس کے علاوہ روض

الریاضین، مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت، مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ، جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ وغیرہ بیش بہا علمی یادگار ہیں، عین العلم میں رہتے ہوئے آپ نے قادیانیوں کا تعاقب کیا اور البرہان نامی مجلّہ نکالنا شروع کیا، یہ رسالہ اس وقت تک نکلتا رہا، جب تک آپ دہلی منتقل نہیں ہوئے، اس رسالہ میں قادیانی عقائد کی زبردست تردید موجود ہے۔

سیاسی خدمات: فقہ وحدیث کا یہ سرتاج جب سیاسی اکھاڑے میں قدم رکھتا ہے تو اپنی ذکاوت وذہانت سے دشمنوں کی سازشیں طشت ازبام کر دیتا ہے، کوئی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ بوریہ پر بیٹھ کر حدیث وفقہ میں مگن رہنے والا سیاست کا اتنا تجربہ کار بھی ہوگا، آپ کی سیاسی بصیرت کا تھوڑا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ الہند جب بھی سیاسی امور میں مشورہ کرنا چاہتے تو حضرت مفتی اعظم کو ترجیح دیا کرتے تھے، بعض حضرات کے استفسار پر حضرت شیخ الہند نے تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

''بے شک تم لوگ سیاست داں ہو؛ لیکن مولوی کفایت کا دماغ سیاست ساز ہے''۔(۲۱)

۱۹۱۹ء میں جب جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد پڑی اور جن لوگوں نے اپنی جدوجہد سے قائدانہ رول ادا کیا، ان میں سرفہرست حضرت مفتی اعظم ہی تھے، اس موقع پر متفقہ طور پر آپ کو صدر چنا گیا، ہرچند کہ حضرت شیخ الہندؒ کے احترام میں جو کہ جیل میں تھے، صدر کہلانے سے کتراتے رہے، مکمل ۱۹؍سالوں تک آپ منصب صدارت پر فائز رہ کر جمعیۃ کو بام عروج پر پہنچایا اور تحریک آزادی کی ہر کوشش میں راست حصہ لیتے رہے۔

جمعیۃ کا سب سے پہلا دفتر مدرسہ امینیہ دہلی آپ کے کمرے میں قائم ہوا، کوئی محرر اور خادم نہیں تھا؛ بلکہ آپ خود اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند اپنے ہاتھوں سے کام کیا کرتے، آپ کے بلند اخلاق اور پاکیزہ کردار اور مضبوط ومحکم عزم وارادہ کا نتیجہ تھا کہ مختلف الخیال علماء جو ہمیشہ جزوی مسائل میں الجھتے رہتے تھے، ایک جگہ جمع ہوکر مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے۔ جمعیۃ علماء کی آپ نے اپنے ہاتھوں پرورش کی اور اپنی محنت وجانفشانی سے پروان چڑھایا۔(۲۲)

تحریک آزادی کی جدوجہد اور حکومت ہند کے خلاف کارروائیوں کی پاداش میں آپ کو دومرتبہ جیل بھی جانا پڑا، سول نافرمانی کی تحریک جو ۱۹۳۰ء میں شروع ہوئی، اس کے آپ اول ڈکٹیٹر بھی رہے، باغیانہ عزائم وخطرناک تقریری کے جرم میں ۱۱؍اکتوبر ۱۹۳۰ء مطابق ۱۷؍جمادی الاولی ۱۳۴۹ھ کو دولت خانہ کوچہ چیلان سے رات چار بجے گرفتار کیا گیا، چھ ماہ قید بامشقت کی سزا سنائی گئی، دہلی وگجرات کے جیل میں سزا کے ایام گزارے گئے۔

۱۹۳۱ء میں دوبارہ تحریک کی ابتدا ہوئی اور آپ اسٹیج پر کھڑے ہوکر طوفانی تقریر کرنا چاہ رہے تھے کہ پولیس نے لاٹھی چارج شروع کیا، لوگوں کی بھیڑ منتشر کرکے آپ کو گرفتار کرلیا اور ۱۸/ ماہ قید بامشقت کی سزادی گئی، جو نیوسینٹرل جیل ملتان میں گزارنا پڑا۔

ترک موالات کی بات علماء کا متفقہ فیصلہ جو تقریبا ۹/ صفحے پر مشتمل ہے اور چار پانچ صفحات میں اس وقت کے اساطین امت کے دستخط ہیں، اس کو حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ نے جمعیۃ کے ناظم رہنے کے زمانے میں مرتب کیا ہے، جو حقیقت میں دستخط کنندہ بزرگوں کی متفقہ رائے وخیال کی ترجمانی ہے، اس میں حضرت مفتی صاحب کا دستخط بھی سب سے اوپر ثبت ہے، اس متفقہ فیصلہ کو یہاں نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا، اس مجلّہ میں ان شاء اللہ کسی نہ کسی مناسب جگہ پر ضرور اس کا ذکر آجائے گا۔

وفات حسرت آیات: کروڑوں مسلمان کا یہ رہنما، مختلف دینی و مذہبی تنظیموں کا سرپرست ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱/ دسمبر ۱۹۵۲ء رات ساڑھے دس بجے نئے عیسوی سال شروع ہونے سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل اپنے مکان کوچہ چیلان میں وفات پاگیا، یک جنوری کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے قریب مہرولی میں ان کو دفن کردیا گیا، وقت کے بڑے بڑے اکابر نے جنازہ می شرکت کی، مولانا احمد سعید دہلوی نے نماز پڑھائی، آپ کی تاریخ وفات مندرجہ ذیل مصرعہ سے نکلتی ہے، جو آپ کی قبر پر کندہ بھی ہے۔

ہوگیا گل آہ دہلی کا چراغ

آپ کے جلوت وخلوت دونوں یکساں منور، جسم وجان کے ساتھ دل ودماغ بے نیازی کی دولت سے مالا مال، علم وعمل کے سلطان، اخلاص وللٰہیت کے پیکر، زہد وتقویٰ میں باکمال، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھنے والی خود فراموشی، ملک ووطن کی خدمت کے لیے جان نثار کرنے والا مجاہد، خلاصہ یہ کہ ایسی جامع شخصیت نایاب نہیں تو بھی کمیاب ضرور ہوتی ہے، کسی نے بہت خوب کہا ہے:

یہ رنگ جلوت یہ کیف خلوت یہ جامعیت خدا کی قدرت
یہ علم و حکمت یہ زہد وتقویٰ جمال ایسا کمال ایسا
جہاں سارا تو چھان مارو بتاؤ انصاف سے خدارا
کہیں بھی اے مہر وماہ دیکھا جمال ایسا کمال ایسا

حضرت مولانا سید شاہ محمد نورالحسن پھلواروی:

۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں پھلواری شریف میں پیدا ہوئے، حضرت مولانا عبدالوہاب

صاحب سے تعلیم حاصل کی، انتہائی متقی و پرہیز گار، صاحب علم وفن، بزرگانہ اوصاف کے حامل، اخلاق و مروت، تصوف واحسان میں قابل رشک، نمونۂ اسلاف، حدیث وفقہ، تفسیر وکلام میں باکمال اور تجربہ کار قاضی تھے، علمی وفکری گہرائی و گیرائی، فہم وفراست، ملی ودینی مسائل پر گرفت میں آپ کی شہرت تھی۔

امارت شرعیہ کے قیام سے پہلے جمعیۃ علماء بہار سے بڑے رہے، بیت المال کا حساس شعبہ آپ کے ذمہ تھا، نیز جمعیۃ علماء بہار کے دارالقضاء کے قاضی آپ ہی تھے، جب امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا اور یہ دونوں شعبے امارت شرعیہ کے ساتھ ضم کردیئے گئے تو امارت شرعیہ کے اول قاضی کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور تازندگی اس اہم عہدہ پر فائز رہے، آپ کو معاملہ فہمی کی خداداد صلاحیت تھی، جس کی وجہ سے کسی بھی کیس میں تہہ تک پہنچ کر فیصلہ فرمایا کرتے تھے، آپ کے فیصلے اتنے بے لاگ ہوتے کہ مسلم وغیر مسلم سب آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔

وفات ۳ر رمضان ۱۳۲۵ھ مطابق ۲۷ر اپریل ۱۹۵۶ء میں ہوئی اور پھلواری شریف میں مدفون ہوئے، آپ کی وفات پر حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی علیہ الرحمہ نے تحریر فرمایا:

> ''آہ جمعیۃ علماء اور امارت شرعیہ کے ایک مخلص خادم بے ریا، راست باز ہستی اپنی جگہ بے وقت خالی کردی، جبکہ ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، ان کی زندگی گوناگوں خصوصیتوں کی حامل تھی''۔(۲۳)

مرد مجاهد مولانا نورالدین بهاری:

دارالعلوم دیوبند کا مایہ ناز فرزند، جنگ آزادی کا ہیرو، جمعیۃ علماء بہار کے صف اول کے رہنما، انتہائی غیور انسان مولانا نورالدین علیہ الرحمہ بھی اس کاروان سجاد کے رفیق دم ساز ومحرم راز ہیں، ۱۸۹۷ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، جہاں والد محترم ہائی اسکول کے ٹیچر تھے، اصل وطن مہونی تھانہ استھاواں ضلع پٹنہ تھا، مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد میں ابتدائی تعلیم ہوئی، پھر کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں تعلیم پائی، اس کے بعد مولانا ماجد جونپوری سے مکتلف کتب درسیہ پڑھ کر ۱۹۱۸ء میں دیوبند تشریف لے گئے اور امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری سے شرف تلمذ پاکر فارغ ہوئے۔

فراغت کے بعد مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد میں پڑھانے لگے؛ مگر تحریک ترک موالات کی مہم شروع ہوئی تو آپ نے مدرسہ کو محض اس وجہ سے خیر باد کہہ دیا کہ مدرسہ نیم سرکاری تھا، اس میں خدمت کرنا یک گونہ انگریزوں کی اعانت ہے، اس زمانہ میں امارت شرعیہ کا قیام بھی ہوچکا تھا، آپ ایک مبلغ کی حیثیت سے منسلک ہوگئے اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے سجاد امارت

شرعیہ کی تعمیر وترقی میں لگ گئے، اس کے بعد دہلی تشریف لائے اور جنگ آزادی کی مختلف مہموں میں قائدانہ کردارادا کیا۔۱۹۳۰ءمیں تحریک نمک سازی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، تحریک سول نافرمانی ۱۹۳۱۔۱۹۳۲ء میں چوتھے ڈکٹیٹر منتخب ہوئے، ۶/مئی ۱۹۳۲ء میں ایک عظیم جلوس کی قیادت کرتے ہوئے گرفتار ہوئے۔(۲۴)

اس طرح آپ آزادی وطن کی جدوجہد میں متعدد بار قید وبند کی صعوبت سے دوچار ہوئے اور ہر مرتبہ بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا کہ!

بمصیبتے گرفتم نہ بمعصیتے

جمعیۃ علماء ہند کے نائب ناظم اور صوبائی کانگریس کے صدر بھی رہے، ان کی جنگی وجہادی مہمات کے ساتھ درس قرآن کا سلسلہ برابر جاری رہا، ہر ہفتہ شہر بھوپال جاکر تفسیر بیان کیا کرتے تھے، سیاسی سوجھ بوجھ میں داد دی جاتی تھی، دلیری، بے خوفی اور بلند ہمتی میں کافی شہرت رکھتے تھے۔(۲۵)۱۶/اکتوبر ۱۹۵۶ء کو انتقال ہوا۔(۲۶)

حضرت مولانا شاہ قمر الدین صاحب امیر شریعت ثالث:

حضرت مولانا شاہ قمر الدین صاحب خانقاہ مجیبیہ کے چشم وچراغ اور امیر شریعت اول حضرت شاہ بدرالدین صاح قادری کے منجھلے صاحبزادے، حضرت شاہ محی الدین جو امیر شریعت ثانی ہیں، ان کے برادر عزیز ہیں۔

تعلیم وتربیت والد بزرگوار حضرت شاہ بدرالدین کی ہی نگرانی میں ہوئی، اپنے برادر مکرم حضرت شاہ محی الدین سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، مولانا عبدالعزیز اجھری سے متوسطات کی تعلیم حاصل کی، پھر شہر دربھنگہ قلعہ گھاٹ کے مشہور ادارہ مدرسہ حمیدیہ میں رہ کر ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں تکمیل فرمائی، یہاں کے اساتذہ میں مولانا عبدالحمید صاحب ساکن راجو ضلع دربھنگہ اور مولانا مقبول احمد خاں ساکن گوراضلع دربھنگہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، آپ کی فراغت پر مدرسہ حمیدیہ میں جلسہ کیا گیا اور خانقاہ مجیبیہ میں بھی جلسہ تہنیت ہوا، جن میں اکابرامت نے شرکت کرکے سر پر دستار فضیلت باندھی، مائخ حجاز سے بھی سند حدیث حاصل تھی، مدینہ منورہ میں سید عبداللہ بن محمد غازی سے قصیدہ بردہ کی اجازت بھی ۲/ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ میں حاصل ہوئی، راہ سلوک کی سازی منزلیں والد بزرگوار سے طے کی۔اس خانوادے کا اصل امتیاز وشغل احسان وتصوف ہے، سالکین ومسترشدین کی روحانی تربیت ہی خاندان کی پہچان ہے، اس لیے گمنامی وخلوت اس خانقاہ کا ہر زمانے میں شعار رہا ہے، عہدہ ومنصب اس خاندان کو کھلتا ہے، مگر ضرورت

وتقاضوں کو پورا کرنے کا احساس بھی رہا ہے، جب بھی گلستان وطن وقوم کو ضرورت پڑی، کسی بھی قربانی سے دریغ بھی نہیں ہوا، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ نے جس نظام امارت شریعہ کا سراغ لگایا تھا، اس کو عملی جامہ پہنانے میں خانوادہ مجیبیہ پیش پیش رہا، حضرت شاہ بدرالدین صاحب اول امیر شریعت کی حیثیت سے بزرگانہ اقدار کے ساتھ مفکر اسلام کا ساتھ دیتے رہے، آپ کے بعد آپ کیلائق وفائق فرزند صوفی وصافی شخصیت حضرت شاہ محی الدین قادری اپنی پرزور قیادت سے امارت کے نظام کو آگے بڑھاتے رہے اور جب امیر شریعت ثانی کا بھی وصال ہوگیا تو ٦۔٧رشعبان ١٣٦٦ھ مطابق ٢٦۔٢٧رجون ١٩٤٧ء کو ڈھاکہ مشرقی چمپارن میں انتخاب امیر کا جو اجلاس منعقد ہوا، اس میں حضرت شاہ قمر الدین کو امیر شریعت ثالث کے جلیل القدر عہدہ کے لیے منتخب کیا گیا، ارباب حل وعقد نے بیعت سمع وطاعت کر کے اپا قائد اسی خاندان مجیبی کے ایک باہوش وبارعب شخصیت کو بناڈالا، چند ہی ماہ بعد ہندوستان آزاد ہوا، ہزار ہا قربانیاں ملک کی آزادی میں دینی پڑھی تھیں، بے حدوحساب مالی ملک وملت کی نذر کرنا پڑا۔

ملک آزاد تو ہوا، مگر منقسم ہوکر تقسیم کا سارا ٹھیکرا مسلمانوں کے سر پھوڑا گیا، ہر طرف فساد پھوٹ پڑا، ملک کا بیشتر حصہ خونیں رنگ میں رنگ گیا، خطۂ بہار بھی بہت متأثر ہوا، امارت شرعیہ اور اس کے قائد نے اس پُر آشوب دور میں وقت کے لیڈروں کو اس طرف متوجہ کیا، تب جاکر عبدالغفار خاں، مہاتما گاندھی وغیرہ بہار کی طرف متوجہ ہوئے، ان لیڈروں کے بہار دورے سے خاطر خواہ فائدہ ہوا، امارت شرعیہ کا وقار بھی اہل ملک کی نگاہوں میں بلند ہوا، ہر چند کے لیلائے آزادی کے حصول کے وقت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ دنیا میں موجود نہیں تھے، مگر آپ کی کوشش اور آپ کے رفقا کی جدوجہد رنگ لا چکی تھی، بچی کچھی کمی حضرت مولانا شاہ قمر الدین صاحب امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے پوری کر رہے تھے، بالآخر شاہ قمر الدین کا سنہرا ومنور دور بھی تمام ہوا اور ١٩رجمادی الثانی ١٣٧٦ھ مطابق ٢١رجنوری ١٩٥٧ء کو جمعہ کی شب میں آپ کا انتقال ہوگیا اور باغ مجیبی میں ہمیشہ کے لیے آسودۂ خواب ہوگئے۔(٢٧)

مجاھد آزادی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ:

تحریک آزادی کا نڈر کمانڈر، فکر شیخ الہند کا امین، مالٹا کا یار غار، حرم نبوی کا کامیاب استاذ، حدیث وفنون حدیث کا رمز شناس، دینی وملی ہر مجلس کے لیے قابل فخر صدر نشیں، انکسار وتواضع کا پتلا کا نام مولانا سید حسین احمد مدنی ہے، آپ کی زندگی ہمہ وقت نقل وحرکت سے عبارت تھی، خدمت خلق اور خدمت ملک کے لیے ہر وقت سرگرداں رہتے، جو جذبہ مفکر اسلام کو بے چین

رکھتا، وہی احساس وشعور مولانا مدنی کو ہر لمحہ پریشان کیے رہتا، اسی لیے جمعہ کے کاز سے وابستگی دونوں ہی بزرگوں کو عشق کی حد تک تھی، آزادی ہند کے ان دونوں متوالوں کے سوچنے کا انداز ایک طرح تھا، خواہ تقسیم ہند کا مسئلہ ہو یا انگریزوں سے ہندوستان کو خالی گرانے کا قضیہ، سول نافرمانی کی تحریک ہو، یا رشدی فکری وسایسی ارتداد سے مقابلہ کرنے کا طریقہ، نہرو رپورٹ پر نقد وتبصرہ کا وقت ہو، یا کانگریس سے وابستگی کا مسئلہ، دونوں ہی بزرگوں کی یکساں آواز سنائی دیتی تھی، یہ الگ بات ہے کہ حضرت مدنی بہت بڑی یونیورسٹی سے وابستہ رہے اور بڑی تنظیم کو اوڑھنا بچھونا بنایا، نیز خاندانی وجاہت ووقار اور مدنی نسبت وساداتی انتساب نے چہار دانگ عالم میں اتنا معروف ومشہور کردیا کہ ہر کسی کو حضرت مدنی سے ادنی وابستگی پر فخر وناز محسوس ہونے لگتا ہے۔(ذلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء)

حضرت مدنی-ذاتی احوال:

آپ کا آبائی وطن قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد یوپی ہے، ۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۶ر اکتوبر ۱۸۷۹ء کو ناگر مئو ضلع اٹاؤ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد بزرگوار سید حبیب اللہ علیہ الرحمہ یہاں اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے، اپنے والد صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء کو ۱۳ر سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند پڑھنے کی غرض سے تشریف لے گئے اور اپنے برے بھائی مولانا صدیق احمد نیز حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی سرپرستی میں ہر علم وفن سے بہرہ ور ہوئے، ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، بڑے بڑے مشائخ وقت اور ماہرین فن کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ تہہ کیا، ان میں سے حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، حضرت مولانا عبدالعلی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا حکیم محمد حسن، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا غلام رسول اور مولانا حبیب الرحمٰن نامور اسما ہیں، روحانی کمالات قطب عالم حضرت گنگوہی کی صحبت بافیض سے حاصل ہوئے، ۱۳۱۷ھ سے ۱۳۳۵ھ تک حجاز مقدس اور روضۂ اطہر کی مجاورت کا شرف حاصل رہا، اس دوران ہندوستان بھی تین مرتبہ آنے کا اتفاق ہوا، جس میں چار سال صرف ہوئے، جتنی مدت بھی ارض پاک میں رہنے کا اتفاق رہا، اس کے ایک لمحہ کو علم ودین کی راہ میں خرچ کر کے محفوظ کرلیا، اس طرح ۱۴ر سال حرم مدنی میں تدریس کی سعادت حاصل رہی، حضرت شیخ الہند جب گرفتار کرلیے گئے تو آپ نے بھی گرفتاری پیش کی، اس طرح حضرت شیخ الہند کی رفاقت مالٹا میں بھی رہی، امروہہ، کلکتہ، سلہٹ وغیرہ میں تدریسی خدمت انجام دی، ۱۳۴۶ھ میں از ہر ہند دارالعلوم دیوبند میں

مسند شیخ الحدیث پر فائز ہوئے اور تا زیست ہر طرح کے ہنگاموں اور پروگراموں کے باوجود اس پر فائز رہے، تین ہزار آٹھ سو چھبیس طلبہ نے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فضیلت حاصل کی۔ (۲۸)

سینکڑوں لوگوں کو راہ سلوک کی رہنمائی فرما کر کامل بنایا، بہت سے مدرسوں کی سرپرستی ونگرانی کی، واردین وصادرین کا آپ کے در پر ہجوم رہتا تھا، سب کی ضیافت بنفس نفیس انتہائی خندہ پیشانی سے فرماتے، مہمان نوازی کا ایسا منظر کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ خود ہی سارے مہمانوں کو اپنے ہاتھ سے روٹیاں تقسیم کر رہے ہیں، درمیان میں سالن کا کعب رکھا ہے، سارے لوگ آپ کے ساتھ شریک طعام ہیں، کسی کے لقمہ کا کچھ حصہ دستر خوان پر رہ جاتا ہے تو آپ بے تکلف اس کو اٹھاتے ہیں اور کھا لیتے ہیں، حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ اپنی چشم دید گواہی اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس زمانۂ قیام میں مہمانوں کی کثرت اور اس پر مولانا کی مسرت وبشاشت بچشم خود دیکھی، مہمانوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی، مستقل مہمان خاصی تعداد میں الگ تھے، بعض اوقات خود اندر سے کھانا لاتے، مہمانوں میں ہر طبقہ کے لوگ تھے، ارکان جمعیت، مشاہیر علماء، سیاسی کارکن، نوجوان ورکر، جیل سے آنے والے خفیہ پولس کے خفیہ اشخاص، بیعت کے خواہش مند، تعویڈ کے طالب وغیرہ وغیرہ، یہیں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی زیارت ہوئی، کئی ہفتے ان کی ہمسائیگی رہی اور ان کے محاسن کا علم ہوا''۔ (۲۹)

حضرت مدنی اورتحریک آزادی:

ہندوستان کی آزادی کے لیے مجاہدانہ اسپرٹ جو عشق وجنون کی حدوں سے بھی آگے ہو چکی تھی، آپ کو حضرت شیخ الہند نے کہتے ہوئے بطور امانت سونپی تھی، جب تک فتح کامل نصیب نہ ہو جائے اور ہندوستان آزاد نہ ہو جائے، ۱۸۵۷ء کا علم جہاد سرنگوں نہ ہونے پائے اور جنگ آزادی پورے حوصلے، ہوش مندی اور جان نثاری کے ساتھ جاری رہے، پھر یہ ایسا حرز جان بن کر رہا کہ ساری تگ ودو کا محور اور ساری جد وجہد کا مقصد آزادی ومکمل آزادی تھا، آپ اس کو محض جنگ نہیں؛ بلکہ دینی فریضہ سمجھتے تھے، چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''دین کا خدمت کا یہی مطلب نہیں ہے کہ آپ لوگ مدرسہ وخانقاہ میں گوشہ گیر ہو کر کتاب ہی تک منحصر رہیں، مسلمانوں کی اور ملک کی اقتصادی، معاشی نیز سیاسی ترقی بھی دینی فرائض میں شامل ہے''۔ (۳۰)

چنانچہ آپ کے طرز عمل میں خود غرضی اور موقع پرستی کی نحوست کے بجائے خلوص وللہیت کا

بے پناہ تقدس پایا جاتا تھا، مولانا ندوی ایک سفر کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اس سفر سے اندازہ ہوا کہ مولانا اس کام کو اپنا ایک دینی فرض سمجھ کر اور ایک عقیدہ وارادہ کے ماتحت کر رہے ہیں، وہی بے غرضی، وہی مستعدی، وہی جفاکشی جو ایک سپاہی میں میدان جنگ کے اندر ہوتی ہے''۔(۳۱)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''مولانا سے تمام اصحاب اجتہاد کی طرح خطائے اجتہادی تو ممکن ہے؛ لیکن خود غرض، موقع پرستی، سربلندی وقیادت کی خواہش، حب جاہ وہ چیزیں ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نے مولانا کو بہت بلند کر دیا ہے''۔(۳۲)

حضرت نے ہر موقع پر انگریزوں کو للکارا، چیلنج دھمکی کے ساتھ آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کی، اپنوں اور غیروں سے طرح طرح کے طنز آمیز جملے؛ بلکہ اذیت ناک حد تک رویوں کی پرواہ کئے بغیر انگریزوں کے لیے صاعقہ آسمانی سے کم نہیں تھے

آں نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من
آن منستم کہ درمیان خاک وخون بینی سر کے

کے حقیقی مصداق تھے۔

اس سنگلاخ وادی کو طے کرنے اور حصول آزادی کے نیا کو پار لگانے میں چار بار قید وبند کی صعوبتوں کو بھی برداشت کرنا پڑا، تقریباً ساڑھے سات سالوں تک انگریزوں کے اسیر رہے، مگر جب تک آزادی کی صبح کو اپنی آنکھوں سے طلوع ہوتا ہوا دیکھ نہیں لیا، چین وسکون سے بیٹھنے کا نام نہیں لیا۔

جس وقت حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب، حضرت مولانا احمد سعید دہلوی جیسے چوٹی کے علما اور صف اول کے قائدین جمعیت کی تأسیس کا تانا بانا بُن رہے تھے، اس وقت آپ فرنگیوں کی قید میں مالٹا کے اسیر تھے، مگر یہ اسیری بھی آزادئ وطن کے لیے تھی؛ اس لیے جب جیل سے رہا ہو کر آئے ہیں تو اس تنظیم سے ایسا وابستہ ہوئے کہ جمعیت اور مولانا مدنی کی شخصیت کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا، ۱۹۲۳ء میں اس کے عاملہ کے رکن بے، ۱۹۴۰ء میں (اس وقت ناظم مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ تھے) منصب صدارت تفویض ہوئی اور مسلسل ۱۷/سال ۱۹۵۷ء تک آپ صدر رہے، عہدوں سے انسلاک ان دونوں (مولانا مدنی ومولانا ابوالمحاسن محمد سجاد) ہی بزرگوں کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، اصل نظر مقاصد پر تھی، جن

کی تکمیل کے لیے شروع سے ہی کسی نہ کسی طرح مربوط تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سول نافرمانی تحریک ۱۹۳۱۔۱۹۳۲ء میں پروان چڑھی، اس میں مولانا مدنی کو دیوبند سے دہلی آتے ہوئے گرفتار کرلیا گیا، پھر ترک ولایت کا ہنگامہ ہو، یا ہندوستان چھوڑو کا نعرہ، کامل آزادی کا مطالبہ ہو، یا نہرو رپورٹ کی خامی اجاگر کرنے کی مہم، متحدہ قومیت کا فلسفہ ہو، یا تقسیم ہند کی مخالفت کا نظریہ، ہر میدان میں شہ سوار کی حیثیت سے قائدانہ رول ادا کرتے ہوئے مولانا مدنی نظر آتے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ملک کے گوشہ گوشہ میں خوف وہراس کا ماحول تھا، کسی بھی طرح اس ملک سے نکل جانے کو غنیمت سمجھنے لگے تھے، ایسے موقع پر مولانا مدنی اوران رفقائے کار کا بڑا احسان ہے کہ یہاں کی مسلم برادری کو دلاسہ دیا، ہر طرح اطمینان دلایا، سیاسی لیڈروں پہ دباؤ سخت کردیا کہ فسادی غنڈوں کا محاسبہ کیا جائے، حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

’’مسلمانوں میں سخت مایوسی، مستقبل سے ناامیدی اوراپنے بارے میں بے اعتمادی اوراحساس کمتری رونما تھا، ان کا کوئی پُرسان حال نہ تھا، ہر شخص ایک یتیم اور کسمپرسی کی سی کیفیت محسوس کرتا تھا، اب مولانا اوران کے رفقا کی جماعت تھی کہ انہوں نے مسلمانوں میں خوداعتمادی، مستقبل کی طرف سے اطمینان، اپنے وطن میں رہنے اورناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم پیدا کرنے کی تبلیغ کی‘‘۔(۳۳)

حضرت مدنی نے جامع مسجد دیوبند میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

’’آج خوف وبزدلی کا جو عالم ہے، اس کے تصور سے بھی شرم آتی ہے، گھروں میں بیٹھے ڈرتے ہو، راستے چلتے ہوئے ڈرتے ہو، کیا تم اپنے بزرگوں کے جانشیں نہیں ہو جو اس ملک میں گنی چنی تعداد میں آئے تھے، جب یہ ملک دشمنوں سے بھرا ہوا تھا، آج تم چار کروڑ کی تعداد میں اس ملک میں موجود ہو، یوپی میں تمہاری تعداد ۸۵ رلاکھ سے زیادہ ہے، پھر تمہارے خوف کا عالم یہ ہے کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہو، آخر کہاں جارہے ہو، کیا تم نے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے، جہاں خدائی گرفت سے بچ سکوگے، جہاں تم کو موت نہیں پاسکے گا، موت سے بچ کر کہاں جاؤگے‘‘۔

پھر آگے فرمایا:

’’صبر واستقلال کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرو، کسی فساد کی ابتدا نہ کرو، اگر فسادی تم پر چڑھ آئیں تو تم ان کو سمجھاؤ؛ لیکن اگر وہ نہ مانیں اورکسی طرح باز نہ آئیں تو پھر تم معذور ہو، بہادری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرو اوراس طرح مقابلہ کرو کہ فسادیوں کی چھٹی کا دودھ

یاد آئے، تمہاری تعداد خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو، مگر قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور اپنی عزت و حرمت کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دو، یہ عزت و شجاعت کی موت ہوگی، اس ملک کو تم نے اپنے خون سے سینچا ہے، آئندہ بھی اپنے سے سینچنے کا عزم رکھو، یہی ملک کی حقیقی وفاداری ہے، اس ملک پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا کسی دوسرے باشندے کا اور اس کی خدمت کی ذمہ داری تم پر بھی اسی طرح ضروری ہے، جس طرح کسی دوسرے شخص پر عائد ہوتی ہے''۔ (۳۴)

حضرت کی یہ تقریر صرف ایک فرد کی سوچ نہیں؛ بلکہ پوری جماعت کی فکر تھی، جو بزبان حضرت مدنی ادا ہو رہی تھی، یہ اس وقت کے تناظر میں کی گئی تقریر ہے؛ مگر ایسا لگتا ہے، آئندہ زمانہ کو بھی مدنظر رکھا گیا تھا، آج مسلمان ۲۰؍کروڑ سے زائد اس ہندوستان میں ہیں، پھر بھی قنوطیت و مایوسی کا جالا تنا ہوا ہے، عزم و حوصلہ چاہیے، تعداد کی قلت و کثرت پر فتح و کامرانی کا راز نہیں؛ بلکہ عزم کی پختگی اور ہمت کی بلندی میں سرفرازی منحصر ہوتی ہے، آج حرف بحرف ۴۷ء کی تقریر کے خدشات سامنے آرہے ہیں، بہر حال اس مرد مجاہد کی جہادی وسیاسی سرگزشت بہت طویل ہے، خود اس مجادہ کو بھی اس کا احساس ہے، اس لیے ہمہ وقت مصروفیت کے باوجود اپنی زندگی کی روداد نقش حیات کے نام سے لکھا تو اس میں ایک حصہ خاندانی حالات و ذاتی احوال پر مشتمل ضرور ہے؛ مگر اس کا معتد بہ حصہ ہندوستان میں انگریزوں کے ظلم وجور کی داستان اور مردان حق اور طائفہ ربانی کی پامردی وحکمت علمی کے بیان، نیز آزادی کی جدوجہد کے کارنامے پر مشتمل ہے۔

عزم و حوصلہ کا یہ پہاڑ انسان، وقت کا مایہ ناز محدث، اللہ کا ولی، انسانیت واخلاق کا پتلا، سچا محبّ وطن بالآخر اپنی زندگی کی ساعت مکمل کر کے ۱۳؍جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ مطابق ۵؍دسمبر ۱۹۵۷ء کو اپنے مولائے حقیقی سے جا ملا اور ہمیشہ ہمیش کے لیے مزار قاسمی میں اپنے استاد و مربی حضرت شیخ الہند کے پہلو میں آسودۂ خواب ہو گیا۔

امام الھند مولانا ابوالکلام آزاد:

حضرت مفکر اسلام کے ان رفیقوں میں سے جنہوں نے ان فکری و عملی کاوشوں کو سراہا اور میدان عمل میں شانہ بشانہ رہ کر قابل رشک کارنامہ انجام دیا، ان میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بھی شامل ہے۔

آبائی وطن تو دہلی ہے، مگر مادری وطن حجاز مبارک کا مقدس شہر مکہ ہے، آبائی و مادری ہر دوسلسلے ایسے خاندان سے ملتے ہیں، جو علم و فضل، معرفت وسلوک اور حال وقال میں شہرت رکھتے

ہیں، ان کی والدہ ایک عرب خاندان کی چشم و چراغ تھیں، وہ حضرت شیخ محمد بن طاہر وتری جو کہ مفتی مدینہ اور اپنے وقت کے پایہ کے محدث اور شیخ حرمین تھے، کی بھانجی تھیں، داد مولانا محمد ہادی دہلی کے ایک مشہور وممتاز علمی وعرفانی خانوادہ سے تھے، اسی طرح والد مولانا خیرالدین کے نانا رکن المدرسین مولانا منورالدین مشہور صاحب طریقت اور صاحب سلسلہ بزرگوں میں سے تھے، نیز شاہ عبدالعزیز کے اجلہ تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، ہرات کے قضاۃ، خاندان کے قابل فخر فرد تھے، مولانا آزاد کے مورث اعلیٰ شیخ جمال الدین دہلوی تھے جو کہ بہلول دہلوی سے مشہور تھے اور صرف دو واسطوں سے حافظ ابن حجر کے شاگرد تھے۔ (۳۵)

مولانا منورالدین صاحب احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہندوستان آئے، پھر بعض وجوہ سے مکہ مکرمہ ہجرت کی تو مولانا خیرالدین بھی نانا کے ساتھ مکہ پہنچ گئے، وہیں ایک مکی خاتون سے شادی کی اور حرم میں بساط علم بچھا کر خوب افادہ کا کام کیا، مولانا آزاد مکہ معظّمہ میں باب السلام سے متصل ''قدوۃ'' محلّہ میں ۸ یا ۹/ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء کو پیدا ہوئے، تاریخی نام فیروز بخت اور اصلی نام احمد اور مشہور ابوالکلام سے ہوئے، مولانا آزاد خود لکھتے ہیں:

> ''موسوم بہ احمد اور مشہور ابوالکلام ہے، ۱۸۸۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم ۔۔۔۔ والد مرحوم نے تاریخی نام فیروز بخت رکھا تھا اور مصرعہ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا۔
>
> جواں بخت و جواں طالع جوان'' (۳۶)

تعلیم وتربیت:

سات سال کی عمر میں والدہ کا سایہ اٹھ گیا، جبکہ بسم اللہ کی تقریب بعمر پانچ سال حرم میں ہو چکی تھی، اپنے گھر میں اپنی خالہ سے پڑھنا شروع کیا، وہ عربی لب ولہجے میں قرآن پڑھتی تھیں، مولانا آزاد نے مکہ میں رہتے ہوئے ہی قرآن کریم ختم کر لیا تھا، اس کے بعد ہندوستان کا سفر پیش آ گیا اور پورا گھر مولانا خیرالدین کی معیت میں کلکتہ میں فروکش ہوا، اس کے بعد ساری تعلیم وتربیت والد صاحب کے زیر سایہ گھریلو ماحول میں ہوئی، پندرہ سولہ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۰۳ سے پہلے ہی سارے علوم وفنون میں مہارت حاصل کر کے شہرت حاصل کر لی تھی۔ (۳۷)

آپ کے کچھ اور اساتذہ کا بھی سراغ ملتا ہے، جیسا کہ مولانا آزاد حافظ ولی اللہ کا ذکر مربی ونگران کی حیثیت سے کیا کرتے ہیں، اسی طرح مولوی نذیر الحسن سے معقول پڑھنے کا ذکر بھی ملتا ہے، مولوی ظہیر الحسن سے شاعری کی اصلاح بھی لی اور آزاد تخلص رکھا۔

والد صاحب کا شمار مشائخ وقت میں ہوتا تھا، خانقاہی آب متاب، شان وشوکت کا نظارہ حویلی میں رہتا، سینکڑوں مریدین ومعتقدین کا جمگھٹا لگا رہتا، اندر وباہر ہر ایک ماحول نورانی وروحانی تھا، ہر وقت علم وعرفان کے چرچے تھے کچھ غیر ضروری راہ ورسم کی پابندی بھی پائی جاتی تھی، بعض رسوم وخیالات سے مولانا آزاد بھی مانوس ومتاثر تھے، مگر وقت گذرنے کے ساتھ اور سوچ سمجھ میں پختگی آنے کے بعد رفتہ رفتہ اس کا راز کھلتا چلا گیا اور مولانا آزاد کی طبیعت ان قیود وشرائط سے مکمل طور پر آزاد ہوگئی، مولانا آزاد کے الفاظ ہیں:

''میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو علم ومشیخیت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا، اس لیے خلقت کا جو ہجوم واحترام آج کل سیاسی لیڈروں کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے، وہ مجھے مذہبی عقیدت مندوں کی شکل میں بغیر طلب وسعی کے مل گیا تھا، میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں کو چومتے تھے، ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے تھے، خاندانی پیشوائی ومشیخیت کی اس حالت میں نوعمر طبیعتوں کے لیے بڑی آزمائش ہوتی ہے۔۔۔۔لیکن جہاں تک اپنی حالت کا جائزہ لے سکتا ہوں، مجھے کہنے میں تامل نہیں کہ میری طبیعت کی قدرتی افتاد مجھے بالکل دوسری طرف لے جارہی تھی''۔(۳۸)

مولانا آزاد اورخدمت خلق:

اللہ نے علوم وفنون میں مہارت کے ساتھ روشن دماغ اور اجتہادی شان سے سرفراز کیا تھا، تقریر وبیان میں بلا کی سحر انگیزی اور طوفان برپا کرنے کی قوت تھی، لکھنے کا اچھا اور شگفتہ ذوق تھا، آپ نے ان نعمتوں کو دین وملت کی آبیاری کے لیے استعمال کیا، تقریر کی للکار سے ہندوستان کا کونہ کونہ گونج اٹھا، انداز شیریں بھی، تندوتیز بھی، دریا کی روانئ وشمشیر کی تابانی بھی، انداز وترتیب بھی تو اصلاح وترغیب بھی، قلم کا زور بیان اس سے بھی کہیں دوبالا، سفر وحضر، آباد دنیا ہو یا جیل کی نامانوس فضا ہر وقت قلم کی جنبش جاری اور ہمہ وقت ماضی پر نگاہ، حال کی فکر اور مستقبل کا کوئی نہ کوئی پروگرام طے ہوتا ہوا نظر آتا، ماضی وحال کے واقعات سے بے چین ضرور تھے، مگر مستقبل سے مایوس بھی نہ تھے اور نہ کسی کو مایوس ہوتا دیکھنا پسند فرماتے تھے، ایک اقتباس سے اندازہ کیجئے:

''بڑوں بروں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان واسباب کار فراہم نہیں؛ لیکن وقت کا عازم وفاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا ہے تو

میں اس کو ساتھ لوں گا، اگر سر و سامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کرلوں گا، اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے، اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے، اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیے، اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ، درختوں کو دوڑنا چاہیے، دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں، اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہوگیا، راہ صاف نہیں کرتے، وہ زمانہ کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے، وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے، وہ زمانہ کے حکموں پر نہیں چلتا؛ بلکہ زمانہ آتا ہے؛ تاکہ اس کی جنبش لب کا انتظار کرے، وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے، جس سے دامن بھرلوں، وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کیا کیا نہیں ہے، جس کو پورا کروں‘‘۔(۳۹)

آپ کی انشاپردازی وادب نوازی، نیز علمی وسیاسی خدمات پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا، یہاں تو صرف اتنا جتانا مقصود ہے کہ امام الہند اور مفکر اسلام دونوں میں ایک ہی جذبہ، ایک ہی فکر، ایک ہی خیال اور خدمت خلق ومحبت وطن کے لیے ایک ہی قسم کا پیمانہ و پروگرام ہے؛ اس لیے مختلف محاذ پر اور تحریک آزادی کے مختلف پلیٹ فارم پر دونوں یکجا بھی نظر آتے ہیں، مولانا آزاد کا کانگریس سے کتنا کچھ تعلق تھا، وہ محتاج بیان نہیں، لیلائے آزادی کے حصول کے بعد ملک کے پہلے وزیر تعلیم کانگریس کی طرف سے آپ ہی ہوتے ہیں، نیز آزادی سے پہلے تقریبا سات سال کانگریس کے صدر بھی رہے، حضرت مفکر اسلام کا رشتہ بھی کانگریس سے مضبوط و پرانا رہا ہے، اشتراک عمل کے وہ بھی قائل تھے؛ مگر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کو بھی دماغ میں بسائے رکھتے، مولانا آزاد ابتدا سے ہی جمعیت کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے اور آخر تک اس کے کارکو آگے بڑھانے میں سرگرمی دکھاتے رہے، ملک کی آزادی کے بعد مسلمانوں میں عجیب وغریب قسم کا خوف طاری ہوا اور ملک سے بھاگنے کو سب سے زیادہ غنیمت تصور کیا جانے لگا، اس موقع پر جمعیت نے قائدانہ رول ادا کیا تھا، مولانا آزاد کی دل سوز آواز اور روک تھام کی اندوہ گیں پکار بھی اس طرح سنائی دیتی تھی:

’’یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر بھی غور کرو، تمھیں محسوس ہوگا کہ یہ فیصلہ کتنے عاجلانہ ہیں، آخر کہاں جارہے ہو اور کیوں جارہے ہو، یہ مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کردیا ہے، ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ

تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے، حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر بنیادی تبدیلی پیدا کرو، جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش خروش بیجا تھا، اسی طرح آج تمہاری خوف وہراس بیجا ہے، بزدلی اور مسلمان ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے، سچے مسلمان کو نہ کوئی طمع ہوسکتی ہے، نہ کوئی خوف ہلاسکتا ہے''۔(۴۰)

یہ تقریر ۲۴/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جامع مسجد دہلی میں ہوئی تھی، مولانا آزاد کانگریس سے منسلک ضرور تھے، مگر آمنا وصدقنا کے قائل نہیں تھے، اکابر کی روح ان میں رہ رہ کر پھڑکتی تھی، جب بھی کوئی فیصلہ ونظریہ مسلم مفادات سے ٹکراتا نظر آتا، برملا اپنی بے زاری کا اظہار اکابر جمعیت کی طرح کردیا کرتے تھے، تقسیم ہند کی بابت آپ نے کبھی بھی لچک دار رویہ اختیار نہیں کیا، ۱۴/ جون ۱۹۴۷ء کی کانگریس کی اہم میٹنگ سے متعلق لکھتے ہیں:

''میں اس کمیٹی کے بہت سے جلسوں میں شرکت کرچکا ہوں، مگر اب تک ایسے عجیب وغریب جلسہ میں شرکت کی نوبت نہیں آئی تھی، وہی کانگریس جس نے ہمیشہ ملک کی آزادی اور اتحاد کے لیے جان کھپائی تھی، اب ملک کی تقسیم کے بارے میں خود ایک تجویز پر غور کرنے جارہی ہے۔ کانگریس اپنے آپ کو اس طرح گراکر ہتھیار ڈال دے، میرے لیے یہ ناقابل برداشت تھا، میں اپنی تقریر میں صاف صاف کہہ دیا کہ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ واقعات کے ایک بہت افسوس ناک سلسلہ کا نتیجہ ہے، ہندوستان کی تقسیم کا ہوجانا ایک جانکاہ حادثہ ہے''۔(۴۱)

مسلمانوں کی دینی وملی اجتماعیت کو باقی رکھنے کے لیے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب علیہ الرحمہ نے امارت شرعیہ کا جو پروگرام مرتب کیا تھا، چوں کہ حضرت مفکر اسلام جمعیت کی بھی ذمہ داری نبھارہے تھے، اس لیے ان کی دلی خواہ تھی کہ اس نظام کو ملکی سطح پر پر شروع کیا جائے، مگر بعض اسباب کی بنا پر اس وقت ایسا نہیں ہوسکا تو صوبائی سطح پر ہی اس کو قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا، چنانچہ ۱۹/ شوال ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۶/ جون ۱۹۲۱ء کو امارت شرعیہ کے نام سے اس اجتماعی نظام کی تاسیس پٹنہ میں عمل میں آئی، اس جلسہ کی صدارت مولانا آزاد نے ہی کی تھی، اسی میں حضرت شاہ بدرالدین قادری سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ کو امیر منتخب کیا گیا اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کو نائب امیر بنایا گیا۔(۴۲)

یہ ان دونوں بزرگوں میں ذہنی ہم آہنگی کی دلیل ہے، مولانا آزاد جب تک زندہ رہے، اپنی مصروفیات کے باوجود ہمیشہ امارت سے چل چسپی لیتے رہے، ۲۲/ فروری ۱۹۵۸ کو آسمان علم وسیاست کا یہ آفتاب بھی غروب ہوکر جامع مسجد دہلی کے سامنے روپوش ہوگیا۔

مرد درویش حضرت شاہ محمد قاسم فردوسی سملوی:

ایک گمنام مجاہد، باکمال شیخ طریقت حضرت شاہ محمد قاسم فردوسی قافلہ سجاد کے رکن رکین اوردم ساز ومحرم راز ہیں، ضلع اورنگ آبادمی سملہ نامی چھوٹی سی بستی کے خانوادہ عثمانی کے چشم وچراغ میں اڑتیسویں پشت میں خلیفۂ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے سلسلۂ نسب ملتا ہے، ہر دور میں یہ خاندان قافلہ رشد وہدایت کا سپہ سالار رہا ہے، حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی کی ولادت ۹ رصفر ۱۳۰۷ھ بمقام سملہ ہوئی، تصوف کے پُرکیف ماحول، خانقاہ کی پُرلطف فضا اورذکر وشغل، تسبیح وتلاوت کی گونج میں آنکھیں کھولی، ابتدائی ردونوشت وخواند، نیز قرآن مجید وفارسی کی تعلیم گھریلوں ماحول میں ہوئی، پھرانگریزی تعلیم کے لیے گیا کے مشہور تعلیمی ادارہ ''ہری داس سیمزی اسکول جوٹاؤن اسکول گیا سے معروف تھا داخل کرائے گئے، بعدازاں علی گڑھ مسلم یونوریسٹی میں داخل ہوکر میٹرک پاس کیا، تعلیم کے درمیان ہی تحریک خلافت اورتحریک ترک موالات شروع ہوئیں تو آپ تعلیم کوترک کر کے ان تحریکوں میں حصہ لینے لگے، عملاتحریکوں سے وابستہ ہونے سے حوصلہ میں اضافہ ہوتا چلا گیا، علما سے قرب بھی حاصل ہوا، انگریزی جانتے تھے، اردو کے نوک وپلک کو درست کر چکے تھے، اس لیے علما کو بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی، مختلف مجلّات واخبارات سے رابطے بھی قوی ہوا، کلکتہ سے مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں ہلال طلوع ہوا تو آپ مترجم کی حیثیت سے شامل ہوئے، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی جیسے انشاپرداز اوردرددل رکھنے والے حضرات اس کی ادارت میں شریک تھے، اس لیے علمی وادبی ذوق میں انقلاب آیا، مولانا آزاد کی تحریک حزب اللہ سے بھی وابستہ رہے، اس لیے علمی وادبیذ وق میں انقلاب آیا، مولانا آزاد کی تحریک حزب اللہ سے بھی وابستہ رہے، اس لیے جب مولانا آزاد کورانچی میں نظ بند کیا گیا، آپ بھی رانچی منتقل ہوئے، وہاں اس زمانہ میں مدرسہ اسلامیہ کے نام سے ادارہ شروع ہوا تو آپ اس مدرسہ میں مدرس اول کی حیثیت سے مقرر کیئے گئے۔

آپ نے روحانی تعلیم وتربیت کے لیے پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبہ کا بھی رخ کیا، اسی زمانے میں خانقاہ سے معارف کے نام سے ماہنامہ بھی نکلتا تھا، آپ اس کے مدیر رہے، ماہنامہ سے التحاق اورخانقاہ میں قیام نے دینی بصیرت کواور بھی جلا بخشا، علمی معلومات اورعملی اسپرٹ میں خانقاہی ماحول میں خوب ترقی ہوئی، اسکولوں اورکالجوں کا ان کی زندگی پر مطلقا اثرنہیں تھا، دیکھنے والا اوران سے بات کرنے والا ہرگز یہ محسوس نہیں کرپاتا کہ وہ عالم نہیں ہے۔

بیعت وارشاد کاتعلق اپنے جدامجد مولانا شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تھا،

جومخدوم شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے سلسلۂ فردوسیہ میں کامل اورصاحب نسبت بزرگ تھے، انہوں نے ہی بیعت طریقت کے ساتھ بیعت جہاد بھی لینا شروع کیا، حضرت شاہ محمد قاسم اسی نسبت سے فردوسی کہلاتے ہیں اورانہوں نے بھی جدامجد سے طریقت کی بیعت کے ساتھ بیعت جہاد بھی کیا، حضرت شاہ محمد قاسم فردوسی کی زندگی سراپا عشق نبوی، اخلاص وللٰہیت اوراتباع سنت سے عبارت تھی، آپ کے نایاب کچھ خطوط کا مجموعہ بھی نقش دوام کے نام سے بعض مجلّات میں دیکھنے کا اتفاق ہوا، ان سے خوداعتمادی، شریعت پر مر مٹنے کا جذبہ، اللہ پر یقین، رسوم وبدعات سے بیزاری جیسی تعلیمات عیاں ہوتی ہیں، اس کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حصہ سیاست وحکومت سے بھی متعلق ہے، یہ تمام خطوط وہ ہیں جو انہوں ے اپنے متوسلین ومعتقدین اورراہ تصوف کے سالکین کومختلف اوقات میں لکھا ہے۔

۱۹۱۲ء سے لے کر۱۹۴۲ء تک کی جنگ آزادی کی جملہ تحریکات میں حصہ لیتے رہے، تحریک ریشمی رومال میں بھی آپ کا اہم رول تھا، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی سے اچھے اورذاتی مراسم تھے، مولانا سندھی کے ہندوستان سے فراء وغیرہ میں آپ کا کردار بہت اہم تھا۔(۴۳)

امارت شرعیہ کی تاسیس میں کلیدی کردار:

حضرت شاہ محمد قاسم علیہ الرحمہ خانقاہ مجیبیہ کے تربیت یافتہ اورایک عظیم خانقاہ کے چشم وچراغ؛ بلکہ قائد وروح رواں تھے، امارت شرعیہ دراصل علما وخانقاہ کے مشائخ کی مشترکہ جدوجہد کا نتیجہ ہے، اس کی داغ بیل حضرت مولانا ابوالمحاسن کے ہاتھوں ڈالی گئی، نیز ان کی بے پناہ کوششوں کا عکس جمیل بھی ہے؛ لیکن پانچ سو بڑے بڑے علما ومشائخ کی تائید حاصل رہی، پہلی مجلس استقبالیہ کے صدر خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ کے سجادہ نشیں حضرت مولانا سید شاہ حبیب الحق رحمۃ اللہ علیہ تھے تو پہلے امیر شریعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے روحانی پیشوا حضرت شاہ بدرالدین قادری علیہ الرحمہ تھے؛ مگر حضرت قاضی احمد حسین اورحضرت شاہ محمد قاسم کی ذات برکات بنیادعناصر اور بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتے تھے، ان سہ رکنی (حضرت مولانا سجاد، حضرت قاضی احمد حسین، حضرت شاہ محمد قاسم) کاروان نے ہی خاکہ ونقشہ تیار کیا تھا، پھر حضرت شاہ محمد قاسم صاحب زندگی بھراس سے وابستہ رہ کرخدت کرتے رہے، مگر خاندانی جذبۂ خودفراموشی نے خاک شوگم نام شو، واقعتاً ان کوگمنام ہی کردیا۔

وفات: کارساز عالم کی طرف سے بہت طویل عمر نہیں ملی تھی، ۵۹؍سال کی عمر میں اس مجاہد جلیل پر لقوہ کا دورہ پڑا، فالج کا اثر چہرہ وحلق پر تھا، جس کی وجہ سے چھ ماہ تک غذا سے محروم رہے،

ڈاکٹروں نے علاج ومعالجہ کی ہر ممکن کوشش کی، مگر تمام کوششیں تقدیر کے سامنے ناکام ہوگئیں، مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، ہندوستانی افق پر آزادی کا سورج طلوع ہونے میں چند روز باقی تھے کہ ۱۹/جولائی ۱۹۴۷ء کو اپنے آبائی گاؤں سملہ میں انتقال کر گئے، خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

سحبان الھند حضرت مولانا احمد سعید دھلوی:

خوش بیان مقرر، مفسر قرآن، مناظر اسلام، تحریک آزادی کے چوٹی کے رہنما، جمعیۃ علماء ہند سے کم وبیش ۴۰/سال تک وابستہ رہ کر بے لوث خدمت انجام والے خادم کا نام احمد سعید بن حافظ نواب بن خواجہ نواب علی تھا، خاص وعام حلقے میں سحبان الہند سے جانے پہچانے جاتے تھے، آپ کے دادا محترم مشہور صوفی اور خدا رسیدہ بزرگ تھے، متوسط گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے۔

پیدائش وتعلیم: سحبان الہند علیہ الرحمہ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء کو دلی کے مشہور محلّہ دریا گنج کوچہ ناہر خاں میں پیدا ہوئے، ساری تعلیم دلی کے مختلف مدرسوں میں ہوئی؛ اس لیے آپ دلی کی ٹکسالی زبان میں تقریر کیا کرتے تھے، نیز تقریر میں دریا کی روانی پائی جاتی تھی، اس لیے سحبان الہند سے مشہور ومعروف ہوئے۔

اولاً مولوی عبدالحمید مصطفیٰ آبادی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، عربی کی ابتدائی تعلیم قاری یٰسین سکندرآبادی رائے پوری سے حاصل کی، حفظ قرآن کی تکمیل بزرگوں کی دانش کدہ مدرسہ حسینیہ میں ہوئی۔ ۱۳۲۸ھ میں مدرسہ امینیہ میں داخل ہوکر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب ودیگر مشائخ سے تکمیل علوم وفنون کی، ۱۳۳۶ھ میں فارغ ہوئے اور عرصہ تک مدرسہ امینیہ میں پڑھاتے رہے۔ (۴۴)

زیادہ شغف آپ کو تفسیر قرآن سے رہا، چھوٹی بری تقریبا بیس کتابیں آپ کے قلم سے منظر عام پر آئیں، تسہیل القرآن، پردہ کی باتیں، رسول کی باتیں، جنت کی کنجی، دوزخ کا کھٹکا، پہلی تقریر سیرت، دوسری تقریر سیرت، مواعظ حسنہ، مضامین احمد سعید وغیرہ آپ کی گراں قدر تصانیف میں شمار ہوتی ہیں۔

سیاست میں حصہ اورحضرت مولانا ابوالمحاسن سے رفاقت کی مختصر سرگزشت:

۱۹۱۹ء میں جمعیت کا قیام ہوا، اس کے سب سے پہلے ناظم منتخب ہوئے، بیس برس فعال ناظم رہے، اس کے بعد ۱۷/سال نائب صدر اور دو سال صدر کے عہدے پر فائز رہے، سیاسی خدمات کی ابتدا ۱۹۱۹ء سے ہی ہوتی ہے، جتنی تحریکیں چلائی گئیں، سب میں حضرت سحبان الہند

کسی نہ کسی طرح شریک رہے، اس کی پاداش میں ۸؍مرتبہ جیل کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، سب سے پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں گرفتاری ہوئی اور آخری مرتبہ ۱۹۴۲ء میں تین سالوں کے لیے مختلف جیلوں میں رہنا پڑا، آزادیٔ کامل کا نعرہ جمعیت کی طرف سے کانگریس کے نعرے سے پانچ سال پیشتر ہی لگایا گیا، ظاہر ہے تنظیم سے وابستہ علما و دانشوران خاص طور پر صدر و ناظم کی تائید حمایت کے بغیر کسی قرارداد کا منظور ہونا ممکن نہیں؛ اس لیے سہ روزہ الجمعیۃ ۱۹۳۰ء کی فائلوں میں نمک ستیہ گرہ میں حصہ لینے والے بزرگوں میں دوسرے نمبر پر آپ کا ہی نام ثبت ہے، تحریک سول نافرمانی ۱۹۳۱ء۔۱۹۳۲ء میں حکومت آپ سے اتنی خائف ہوئی کہ بھنک لگتے ہی آپ کو اور مولانا حبیب الرحمٰن کو گرفتار کرلیا، آپ کے جذبات و خیالات خواہ خدمت خلق سے متعلق ہوں، یا تحریکات آزادی سے متعلق، وہی تھے جو حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ جیسے ابتدائی خاکہ ساز لوگوں کے تھے؛ بلکہ حضرت سحبان الہند ہر مشن میں حضرت مفکر اسلام کو روحانی باپ و مربی کا درجہ دیا کرتے تھے، حضرت مولانا ابوالمحاسن کا رویہ بھی اپنے اس رفیق کار کے ساتھ فرزند جیسا ہی تھا، بہار کے ۱۹۳۴ء کے بھیانک زلزلہ میں ایک ماہ کا دورہ بھی حضرت مفکر اسلام کی رفاقت میں کیا، جس کی وجہ سے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔(۴۵)

حضرت مفکر اسلام کی ہر فکر کو سینے سے لگاتے بھی تھے اور خوب سراہتے بھی تھے، آزادی کی جدوجہد میں ہندو مسلم دونوں قوموں کے اشتراک کے بابت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کا نظریہ لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''نظام حکومت کی تخریب جب ہی ہوسکتی ہے، جب دونوں قومیں مل کر اس کام کو کریں اور دونوں قوموں پر پورا پورا اشتراک عمل ہو، یہ رائے انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر قائم کیا تھا''۔(۴۶)

وفات وتدفین: جمعیت کا جان باز سپاہی اور مفکر اسلام کا مخلص رفیق چالیس سالہ بھاگ دوڑ کے بعد اپنی آخری منزل پر پہنچ گیا، ۴؍دسمبر ۱۹۵۹ء مطابق ۳؍جمادی الثانیہ ۱۳۷۹ھ بعد نماز مغرب حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا، درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے جوار میں مہرولی میں اپنے استاد محترم مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہ صاحب کے پہلو میں آرام فرما ہوا۔(اناللہ وانا الیہ راجعون)

قاضی سید احمد حسین:

گیا (موجودہ نوادہ) بہار کے ایک گاؤں ''کونی ہر'' میں قاضی عبداللطیف صاحب کے گھر

۱۸۸۸ء میں ان کے لخت جگر قاضی سید احمد حسین پیدا ہوئے، پشتہا پشت سے محکمۂ قضا اس خاندان کو سپرد تھا؛اس لیے ''قاضی'' ان کے نام کا جز بن گیا، خاندان سادات سے تعلق تھا، نانیہال سملہ ضلع اورنگ آباد کے عثمانی خاندان میں تھا، جو رشدوہدایت، احسان وتصوف میں مشہور ومعروف تھا، دادیہال زمین دار وخوش حال تھا تو نانیہال شب زندہ دار کا آئینہ شفاف تھا، نانیہالی بزرگوں سے روحانی تعلیم پائی، اس طرح طبیعت ومزاج میں سلطانی کے ساتھ درویشی کا دل نشیں امتزاج ہوگیا، جناب طیب عثمانی لکھتے ہیں:

''ان کو دن میں دینی وملی اور سیاسی واجتماعی سرگرمیوں میں مشغول پایا تو راتوں کو اخیر شب میں تہجد گزاری، ذکر واشتغال، اپنے خدا کے حضور روتے گڑگراتے اور آہ وبکا کرتے دیکھا، ایسی جامع شخصیت کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے''۔(۴۷)

جب آپ کی عمر ۱۴؍سال ہوئی تو والد وفات پا گئے، البتہ اس وقت حفظ قرآن سے فارغ ہوچکے تھے، پھر باضابطہ تعلیم تو حاصل نہ کرسکے، مگر علما کی صحبت بالخصوص مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن کی رفاقت نے آپ کو کافی معلومات فراہم کیا، پھر اسی رفاقت کا اثر تھا کہ ۱۹۰۶ء جو عین شباب کا زمانہ تھا، سیاست سے دل چسپی لینے لگے، خلافت کمیٹی جس کے در پردہ روح رواں حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد تھے، اس کے سرگرم رکن قاضی صاحب تھے، حتی کہ اس کی سرگرمی میں گرفتار ہوکر چھ ماہ تک پابند سلاسل بھی رہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بھی ۱۹۲۶ء میں رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۳۰ء تک فعال ممبر رہے اور ہمیشہ بقول ان کے ''تعمیر کی پہلی اینٹ'' ہوئے، جس پر پوری عمارت کھڑی ہوئی؛ مگر کسی کو نظر نہیں آئی، قاضی صاحب کا مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی گہرا ربط تھا، الہلال نکالنے کے لیے صرف دباؤ والا مشورہ ہی نہیں دیا تھا؛ بلکہ بطور چندہ دس ہزار روپے کا تعاون بھی پیش کیا تھا، سیاسی لیڈران بالخصوص مہاتما گاندھی اور راجندر پرساد جیسے دانشوروں سے اچھے مراسم تھے، مذہبی وملی کاموں میں عشق کی حد تک دل چسپی رکھتے تھے، نیز جو کچھ بھی خدمت کرتے انتہائی خلوص سے کرتے، کودغرضی کا شائبہ تک نہیں ہوتا، ملک کے لیڈروں کو بھی اس کا اعتراف تھا، گاندھی جی نے ۲۲؍دسمبر ۱۹۲۱ء کو اپنے اخبار ''ینگ انڈیا'' میں لکھا:

''کرشن پرساد، راج رنگ دت، رانا شنگر، قاضی احمد حسین گیا کے یہ سب رہنما شخصیتیں ڈیڑھ سو رضا کاروں کے ساتھ گرفتار کرلی گئیں ہیں، بہار کی زمین غم والم بن گئی ہے، یہ حضرات ہندوستان کے سب سے زیادہ بے غرض کارکن ہیں، جو خاموشی سے کام کرتے ہیں اور بغیر ریا

اور نمائش کے‘‘۔(۴۸)

امارت شرعیہ اور جمعیۃ علماء ہند کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، امارت شرعیہ کے شعبہ تبلیغ سے وابستہ رہ کر دور و نزدیک دیہاتوں اور گاؤں کا اصلاحی و تبلیغی دورہ کیا، قاضی صاحب اور مولانا ابوالمحاسن میں ذرہ برابر دوری محسوس نہیں ہوتی تھی، ایک کی ذمہ داری دوسرا بحسن وخوبی انجام دیتا تھا، بالخصوص امارت شرعیہ کی تنظیم و تنسیق میں دو جان ایک قالب جانے جاتے، اسی وجہ سے ان کو گیا سے پھلواری شریف منتقل ہونا پڑا کہ جب مولانا ابوالمحاسن دفتر میں نہ ہوں تو کارکنان کو قاضی صاحب کے مشورے کی ضرورت ہوگی، نیز آپ مشورہ دے کر نگرانی فرماتے بھی رہے، اپنی نگرانی میں بیت المال کو منظّم کیا، حساب و کتاب باضابطہ انتظام کیا؛ لیکن ناگاہ اہلیہ کی وفات ہوگئی تو گیا منتقل ہونا پڑا، بالآخر وہیں ۲۹/جولائی ۱۹۶۱ء کو ہارڈ اٹیک ہوا اور ہمیشہ کے لیے ملت کا غم خوار و غم گسار اور سماج کا بے لوث خادم و کارکن آبگلہ قبرستان گیا میں ابدی نیند سو گیا۔(۴۹)

نقیب کے ایک مضمون نگار نے بہت صحیح لکھا ہے:

’’وہ ایک ایسے مرد مومن تھے، جن کے دنوں کی تپش اور شبوں کے گداز کو ان آنکھوں نے تقریباً دو سال شب و روز، خلوت و جلوت میں ساتھ رہ کر دیکھا اور ان کی حکمت و دانائی، روحانی و اخلاقی و فکر و عمل سے فیض یاب ہوا، ان کی پوری زندگی جنگ آزادی کی جد وجہد، ملک و ملت کی خدمت گزاری اور دعوت دین میں گزری‘‘۔(۵۰)

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی:

ضلع بجنور کے سیوہارہ گاؤں کے صدیقی اور خوش حال خاندان میں ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے، آپ کا اسم گرامی تو معز الدین تھا؛ مگر تاریخی نام حفظ الرحمٰن رکھا گیا، والد بزرگوار کا نام مولوی شمس الدین تھا، وہ بھوپال اور پھر بیکانیر کی ریاستوں میں اسسٹنٹ انجینئر تھے، ان کی کئی اولادیں تھیں، سب کی اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہوئی تھی، صرف مولانا حفظ الرحمٰن کو ان کی والدہ کی خواہش پر دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا گیا، زیادہ تر تعلیمی مراحل سیوہارہ کے مدرسہ فیض عام میں طے ہوئے، کچھ کتابیں شاہی مرادآباد میں بھی پڑھیں، ۱۳۴۱ھ کو دارالعلوم میں داخل کئے گئے اور ۱۳۴۲ھ میں حضرت علامہ کشمیری سے دورہ پڑھ کر فارغ ہوئے، مختلف مقامات پر درس و تدریس کا مشغلہ اپنے اساتذہ کے مشورہ سے جاری رکھا، دارالعلوم دیوبند، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، پرتاپیٹ چنئی تمل ناڈو درس و تدریس کے لیے مرکز توجہ رہے ہیں، دارالعلوم میں داخل ہونے سے قبل ہی آپ سیاسی میدان میں قدم رکھ چکے تھے، ۱۹۱۹ء وہ سال ہے،

جس میں جمعیۃ کا قیام عمل میں آیا، اسی سال کانگریس نے ستیہ گرہ کا آغاز کیا اور جلیانوالہ باغ کا حادثہ فاجعہ اسی سال پیش آیا، چنانچہ آپ کو سیاست میں حصہ لینا پڑا اور ۱۹۲۲ء میں گرفتار بھی ہونا پڑا، رہائی پر آپ نے تعلیم کی تکمیل کی، فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک تو روایتی درس وتدریس سے وابستہ ضرور رہے؛ مگر ملک کے حالات نے آپ کو سیاسی اکھاڑے میں کھینچ ہی لیا، پھر قوم کے لیے جو کچھ بن پایا، کرتے رہے، مختلف سماجی وسیاسی تنظیموں سے وابستہ رہ کر ملک کے پراگندہ ماحول کو پاکیزہ بناتے رہے اور منتشر گیسو کو سنوارتے رہے، آخری بیس سال کا دور یعنی ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک مسلسل جمعیۃ کے ناظم کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے۔

ندوۃ المصنفین سے وابستگی اورعلمی ذوق کی آبیاری:

۱۹۳۷ء مطابق ۱۳۵۲ھ میں تصنیفی وتالیفی ادارہ ندوۃ المصنفین کے نام سے قائم ہوا جو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور ان کے دیرینہ رفیق حضرت مولانا عتیق الرحمٰن ومولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحبان کی کوششوں کا نتیجہ ہے، حقیقت میں حضرت مجاہد ملت صرف اس جے شریک کار ہی نہیں؛ بلکہ اصلی معمار بھی ہیں، آپ نے اس کوشش کو عملی جامہ پہنا کر ایک ملی ضرورت کی تکمیل فرمائی، متعدد گراں قدر کتابوں کی اشاعت وتصنیف کا سہرا اسی ادارہ کو ہے، خود آپ کے قلم سے قصص القرآن نامی اردو زبان میں پہلی بار ایسی شاہکار کتاب شائع ہوئی، جو اپنے موضوع میں لاثانی ولافانی ہے، اس کی نظیر ومثیل اردو ہی نہیں، عربی میں کم یاب ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا علی میاں ندوی لکھتے ہیں:

> ''وہ ندوۃ المصنفین دہلی کے بانیوں اور مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے نہ صرف شریک کار اور ندوۃ المصنفین کے ایک معمار تھے؛ بلکہ ان دونوں حضرات کو ان سے تقویت اور ندوۃ المصنفین کو ان سے اعتبار وعزت حاصل تھی، اس سلسلہ میں ان کی دو تصنیفات ایک تو قصص القرآن، دوسرے اسلام کا اقتصادی نظام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اردو میں ہمارے علم میں قصص القرآن انبیاء علیہم السلام کی سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی مستند تاریخ وتفسیر (جو قرآن مجید کے گہرے مطالعہ اور صحف قدیم اور جدید تحقیقات کی مدد سے مرتب کی گئی ہو) اس سے پہلے نہیں دیکھی۔۔۔مولانا نے اردو میں یہ کتاب تصنیف فرما کر ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کی اور اسلامیات اور علوم قرآن کے طالب علموں کے لیے ایک قیمتی ذخیرہ مہیا کر دیا، یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے، جلد چہارم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے

واقعات وحالات پر مشتمل ہے‘‘۔(۵۱)

آپ کے قلم سے اخلاق اور فلسفۂ اخلاق، سیرت نبوی کا عقلی تصور، اسلام کا اقتصادی نظام جیسی بے نظیر کتابیں شائع ہوئی، تصنیف وتالیف کا ذوق آپ کا کبھی بھی ماند نہیں پڑا، بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ جیل میں قید تھے، اس وقت بھی تالیف میں مشغول رہے، بلاغ مبین آپ نے جیل میں ہی تصنیف فرمائی ہے، یہ کتاب دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب وفرامین مقدسہ کا مجموعہ ہے، جس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: (الف) اصول تبلیغ، (ب) فرامین سید المرسلین، (نتائج وعبر، ۲۹۵ر صفحات پر مشتمل ہے، امجد اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

مجاهد ملت سیاسی میدان میں اورحضرت مفکر اسلام کے ساتھ رفاقت:

سیاسی زندگی کا آغاز تو زمانۂ طالب علمی میں ہی ہوگیا تھا، حتی کہ دورۂ حدیث سے فراغت بھی موقوف کرنی پڑی، سزائے قید کے بعد ہی تکمیل کی نوبت آسکی، ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کے جھنڈے تلے آئے، ۱۹۳۲ء میں مجلس عاملہ کے رکن ہوئے، ۱۹۴۲ء سے تا حیات ۱۹۶۲ء تک اس کے ناظم عمومی کے عہدے پر فائز رہے، تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے، جس کی وجہ سے ۶ر بار جیل جانا پڑا، تحریک ستیہ گرہ کا آغاز ۱۹۳۰ء میں کیا گیا تھا، اس تحریک میں جن اکابر ملت نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بالآخر گرفتار ہوئے، ان میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا نام بھی جلی حرفوں میں آتا ہے۔(۵۲)

سول نافرمانی تحریک میں جمعیۃ علماء ہند نے ۱۹۳۱ء-۱۹۳۲ء میں شرکت کی، اراکین نے بھرپور حصہ لیا، قریب ۹۰ر ہزار افراد گرفتار ہوئے، جن میں ساڑھے چوالیس ہزار مسلمان تھے۔(۵۳)

اس نافرمانی کا طریقہ یہ تھا کہ ایک ڈکٹیٹر متعین کیا جاتا، وہ اپنی قیادت میں ملکی قانون کی نافرمانی عدم تشدد کے ساتھ کرتا اور گرفتاری دیتا، اس کے سب سے پہلے ڈکٹیٹر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب تھے، ان کے بعد دوسرے نمبر پر حضرت مجاہد ملت سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔(۵۴)

روح آزادی پھونکنے کے لیے کانگریس وجمعیۃ نے سول نافرمانی کا فارمولہ اپنایا تھا؛ مگر اس پر عمل کرنا اور اس تحریک کو کامیاب بنانا آسان نہیں تھا؛ اس لیے کہ حکومت کی پالیسی پہلے سے زیادہ سخت تھی، کسی لیڈر کو تحریک میں جانے سے پہلے ہی گرفتار کرلیا جاتا؛ اس لیے اس کو خفیہ رکھنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پری، چنانچہ کانگریس نے جنگی کونسل کے نام سے اور جمعیۃ نے ادارہ حربیہ کے نام سے مستقل نظام قائم کیا، بقول مؤلف ومجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (ایک

سیاسی مطالعہ،ص:۱۳۹)اس کی قیادت مختلف بزرگوں کے ہاتھوں میں رہی؛مگراصل کلید بردار حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ تھے۔

''مگر وہ ڈکٹیٹر جس کو بہت سے انجکشن دیئے گئے تھے ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب (نائب امیر شریعت بہار) تھے، ادارۂ حربیہ کے کلید بردار یہی حضرات تھے، جمعیۃ علماء ہند کے دفتر سے علاحدہ محلّہ بلی ماران کی ایک تاریک گلی میں ایک مکان لیا گیا تھا،حضرت مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اسی مکان میں رہتا تھا، جس کا علم دفتر کے لوگوں میں سے غالبا قاضی اکرام الحق کو تھا۔ جماعت کے جو حضرات اسی ادارہ کی ضرورت سے حضرت موصوف سے ملاقات کرنا چاہتے تھے تو قاضی اکرام الحق ہی ان کے رہبر بنتے تھے،ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کو دست راست اور نفس ناطقہ یہی رفیق محترم مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کو اس نظام کا ناظم اعلیٰ، یا کمانڈر بنایا گیا تھا اور ان کا کام یہ تھا کہ ملک میں گھوم پھر کر تحریک کا جائزہ لیں اور اس نظام کو کامیاب بنائیں''۔(۵۵)

تقسیم ہند کے بعد جو ناگفتہ بہ حالات پیدا ہوئے، ان حالات میں عزم وحوصلہ سے کام لیتے ہوئے حضرت مجاہد ملت نے وہ عظیم خدمات انجام دی ہیں، جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں، اس سلسلہ میں تحریک آزادی ہند میں مسلم علما اور عوام کا کردار نامی کتاب سے ایک پیراگراف ملاحظہ ہو:

''واقعہ یہ ہے کہ اگر عالم اسباب میں دارالحکومت دہلی میں حضرت مجاہد ملت کا وجود باوجود نہ ہوتا تو اس شہر کی مسلم آبادی، اسلامی آثار وشعائر اس طرح کھرچ دیئے جاتے کہ جن کا بعد میں نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا، حضرت مجاہد ملتؒ نے مسٹر گاندھی اور جواہر لال نہرو سے مل کر دہلی میں مسلمان پناہ گزینوں کی حفاظت اور اجڑے ہوئے مسلمانوں کی باز آبادکاری کا کام سردار پٹیل جیسے فرقہ پرست وزیر داخلہ کے علی الرغم انجام دیا،قتل وغارت گری کو روکنے کے لیے مسٹر گاندھی نے جو میرن برتھ رکھا تھا، وہ بھی دراصل جمعیۃ کی مخلصانہ جدوجہد کا ایک مظاہرہ تھا، جس نے حکومت کا رخ بدلنے میں نہایت مؤثر کردار ادا کیا، اسی طرح دلی کے اطراف میں میوات کے تقریباً تین لاکھ مسلمانوں کو اپنی جگہ استقامت کے ساتھ جمائے رکھنے میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے بنیادی کردار ادا کیا، ورنہ فرقہ پرستوں کا پلان تھا کہ یا تو میواتی مسلمانوں کو ترک وطن پر مجبور کیا جائے یا انہیں مرتد بنالیا جائے، حضرت مجاہد ملت کی کوششوں سے شرپسند اپنے منصوبہ میں کامیاب نہ ہوسکے، اسی طرح بزرگان دین کی درگاہوں: درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی، درگاہ حضرت خواجہ

قطب الدین بختیار کا کی اور درگاہ سرہند شریف کو واگذار کرانے میں مجاہد ملت نے زبردست جدوجہد فرمائی"۔(۵٦)

حضرت مجاہد ملتؒ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد پارلیمنٹ کے ممبر بھی بنے؛ تاکہ حکومتی سطح پر قوم وملت کی خدمت کی جاسکے، یہ ساری خدمت خودغرضی سے پاک وبےلوث تھی، حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب نے ان کو قریب سے دیکھا ہے، ان کا تبصرہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے:

"سب واقف جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم آزادی کے بعد بننے والی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر بنے، پھر تادم آخر ممبر رہے، مولانا کی زندگی کا آخری الیکشن ۱۹٦۲ء میں ہوا، مولانا اپنی شدید علالت میں مبتلا رہنے کی وجہ سے ایک دن بھی ورک نہیں کر سکے؛ لیکن اس کے باوجود الیکشن میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے، یہ کامیابی ایک طرف تو مولانا کی غیر معمولی مقبولیت اور اخلاص کے ساتھ ان کی قومی خدمات کا ثبوت ہے تو دوسری طرف قوم کی بیدار مغزی اور محسن شناسی کی بھی علامت ہے، اتنی طویل مدت تک پارلیمنٹ کے ممبر رہنے اور بلاشرکت غیرے مدتوں تک مسلمانوں کے عظیم رہنما ہونے کے باوجود مولانا اپنا ذاتی مکان دہلی میں نہیں بنا سکے اور پرانی دہلی کے محلّہ بلی ماران میں جہاں اس وقت جمعیۃ علماء ہند کا صدر دفتر تھا، اس کے قریب ایک متوسط درجہ کے کرایہ کے مکان میں رہتے رہے، جو کسٹوڈین کی تحویل یا ملکیت میں تھا (آزادی کے بعد ہندوستان سے پاکستان منتقل ہوجانے والے مسلمانوں کی جائیداد پر قبضہ اور اس کی نگرانی کرنے کے لیے ایک مستقل کررکھا تھا، پھر ان مکانات کو نیلام کیا گیا اور خریداری کا اولین حقداران کے ساکنوں کو قرار دیا گیا تھا) مولانا کے مرض وفات میں اس مکان کی نیلامی کا نوٹس آیا، اتفاق سے جس وقت مولانا کو اس نوٹس کی اطلاع ان کے معتمد حاجی حسام الدین نے دی، راقم الحروف (محمد برہان الدین) مولانا کے پاس حاضر تھا، مولانا نے یہ اطلاع پاکر جس تاثیر بھرے؛ بلکہ درد بھرے لہجے میں اظہار خیال کیا، اسے رقم بھولتا نہیں، مولانا نے فرمایا کہ ہمارے پاس تو اتنے پیسے نہیں کہ یہ مکان خرد ی سکیں اور ہمارے تو آبائی مکانات جو سیوہارہ میں تھے ڈھ کر ختم ہوگئے اور یہ فرماتے ہوئے ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں"۔(۵۷)

بیماری ووفات:

زندگی بھر کی جہد مسلسل نے آپ کے خطرناک ومہلک مرض کینسر میں مبتلا کردیا تھا، ہندوستان کا علاج جب کارگر نہیں تو امریکہ لے جایا گیا، ڈھائی مہینہ علاج کے بعد واپسی ہوئی، مگر یکم ربیع الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۲/اگست ۱۹٦۲ء کو صبح ساڑھے تین بجے آپ اس دار فانی سے کوچ

کر گئے اور دلی کی مشہور قبرستان مہدیان میں ہمیشہ کے لیے آسودہ خواب ہو گئے۔

الحاج محمد شفیع تمنائی پھلواری:

الحاج محمد شفیع کی پیدائش ۱۹۰۲ء میں ہوئی، ایک خوش حال اور کھاتے پیتے گھرانہ سے ہیں، جو جگدیش پور میں آباد تھا، مگر فرنگیوں نے بہت ظلم ڈھایا، سب کچھ لوٹ لیا گیا، بالآخر یہ خاندان جگدیش پور گاؤں سے پھلواری شریف منتقل ہو گیا، انگریزوں کے ظلم و بربریت نے تمنائی صاحب کے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا، ابتدا سے ہی ایسی نفرت بلکہ عداوت پیدا ہوگئی جو اخیر تک ختم نہ ہوسکی، بلکہ وقت و حالات نے نفرت و عداوت کی چادر کو اور بھی دبیز کر دیا، تمنائی صاحب کو مشہور شاعر تمنا پھلواری کا تلمذ بھی حاصل ہے؛ اس لیے آپ کو آپ اپنے کو تمنائی کہا کرتے تھے۔

حضرت مولانا سجاد صاحب کی سیاسی پارٹی انڈی پنڈنٹ کی تشکیل کے بعد اپنی تعلیم کو ادھوری چھوڑ کر حریت و آزادی کی جدوجہد میں پورے دم خم کے ساتھ لگ گئے، جب امارت شرعیہ کا قیام ہوا تو تقریباً ۶۰/ برسوں تک پوری ذمہ داری اور انتہائی خلوص کے ساتھ شعبہ دارالقضاء سے منسلک رہے اور اپنی صلاحیت کے مطابق اس کی خدمت کرتے رہے۔

کانگریس کے بھی سرگرم رکن تھے، وضع قطع کانگریسی بنا کر رکھتے، بڑے بڑے لیڈروں جیسے مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، ڈاکٹر راجندر پرساد وغیرہ سے قریبی مراسم تھے اور ان کے ہم مجلس و ہم نشیں شمار ہوتے تھے، مولانا سجاد اور جمعیۃ علماء ہند کی طرح تقسیم کے بالکل مخالف تھے، انگریزوں سے نفرت کے تعلق سے فرماتے تھے:

> ''ہماری شعوری زندگی ۵۷ء کے نام انقلاب سے بہت متاثر تھی، اس لیے کہ ہمارے دادا جگدیش پور کے ایک کاشتا کرتے تھے، انقلابی تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں کے ہولناک مظالم اور قتل و گارت گری سے بچ کر نکل آئے؛ لیکن اس طرح اقتصادی اور معاشی پستی میں زندگی بسر کی کہ ہم آج بھی کسی سطح پر کھڑے ہو کر اپنے آپ کو روشناس نہیں کرا سکتے، کہنا یہ ہے کہ اس حادثہ نے ہمیں انگریزوں کا دشمن بنا دیا تھا اور کچھ سمجھ بوجھ ہو، یا نہ ہو؛ لیکن اتنی سمجھ ضرور تھی کہ ہمیں انگریزوں سے نفرت نے دل کا رجحان اس طرف موڑ دیا، بس جی چاہتا ہے کہ غیروں ہی کے ذریعہ سہی لیکن انگریزی حکومت کا قلع قمع ہو جائے''۔(۵۸)

آپ کی وفات ۲۶/جنوری ۱۹۸۳ء ہوئی، ۲۷/جنوری ۱۹۸۳ء کو خانقاہ مجیبیہ کے قبرستان ''باغ مجیب'' میں دفن کیا گیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

مصادر ومراجع

(۱) مقدمہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری، ص:۱۷۔۱۹
(۲) حقیقت سجاد، مقدمہ (۳) محاسن سجاد، ص:۱۲۵
(۴) محاسن سجاد، ص:۱۴۹ (۵) حیات سجاد، ص:۲۱
(۶) حیات سجاد، ص:۲۵ (۷) حیات سجاد، ص:۹۲۔۹۳
(۸) حیات سجاد، ص:۹۶، مضمون حافظ احمد سعید
(۹) حیات سجاد، ص:۹۷، مضمون حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
(۱۰) تاریخ ندوۃ العلماء جلد اول، مجلّہ رفیق پٹنہ، علمائے بہار نمبر، الواقعہ پاکستان، نزھۃ الخواطر:۸/۱۷۰ و دیگر نٹ سائٹس سے ماخوذ
(۱۱) حیات سجاد، ص:۶۸۔۶۹، مرتبہ مولانا انیس الرحمٰن قاسمی
(۱۲) جمعیۃ علماء ہند پر ایک تاریخی تبصرہ، مؤلفہ مولانا حفظ الرحمٰن واصف، امینیہ دہلی، ص:۱۱۵
(۱۳) ماخوذ: تذکرہ آہ، ص:۱۳۱، مصنف: مفتی اختر امام عادل قاسمی
(۱۴) ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک کی مختصر سی سرگزشت یہ ہے کہ جنگ عظیم کے موقع پر برطانیہ کو ہندوستان سے امداد کی سخت ضرورت محسوس ہوئی، مگر ہندوستانیوں کے تیور باغیانہ تھے؛ بلکہ عدم تعاون کی قسمیں کھائے بیٹھے تھے، برطانیہ اور سفید فاموں کے خلاف غم وغصہ شباب پر تھا، لہٰذا برطانیہ نے جنگی امداد پر آمادہ کرنے کے لیے ''سر اسٹیفورڈ کرپس'' کو خصوصی نمائندہ کے طور پر یہاں بھیجا؛ تاکہ ہندوستانی لیڈروں سے گفت وشنید کرکے امداد پر آمادہ کرسکے؛ اس لیے اس نے عارضی حکومت کی پیش کش کی، لیکن ہندوستانیوں کو اختیارات منتقل کرنے کی بابت اختتام جنگ کا انتظار کرنے لیے کہا، حالانکہ ہندوستانی لیڈروں کا کہنا تھا کہ اسی جنگ کے دوران اختیارات کی منتقلی مکمل ہونی چاہیے؛ اس لیے کانگریس سمیت جمعیۃ علماء ہند نے کرپس کے مشن پر پانی پھیر دیا اور ۱۹۴۲ء میں پوری قوت کے ساتھ ہندوستان چھوڑو مہم کی تحریک چھیڑ دی۔ (تاریخ جمعیۃ علماء ہند، ص:۱۰۹)
(۱۵) تاریخ جمعیۃ علماء ہند، ص:۱۱۷
(۱۶) مولانا سجاد، حیات وخدمات، ص:۵۲۰، نقیب:۱۹۵۶ء
(۱۷) تاریخ امارت شرعیہ، ص:۴۴۸
(۱۸) تحریک آزادئ ہند میں مسلم علما اور عوام کا کردار، ص:۱۰۰
(۱۹) حیات سجاد، ص:۸۱
(۲۰) ضمیمہ کفایت المفتی:۱/۳۵
(۲۱) بیس بڑے مسلمان:۴۲۶
(۲۲) ضمیمہ کفایت المفتی:۱/۴۰
(۲۳) نقیب:۲۰/اپریل ۱۹۵۶ء، مولانا سجاد حیات وخدمات، ص:۵۰۰
(۲۴) تحریک آزادی ہند میں مسلم علما اور عوام کا کردار، ص:۹۸۔۹۹، علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے:۲/۱۲۳
(۲۵) نقیب، پٹنہ: جنوری ۱۹۵۶ء

(۲۶) ٹوٹے ہوئے تارے از شاہ محمد ثانی، ص: ۳۳۴

(۲۷) ماخوذ تذکرہ علمائے بہار، مولانا سجاد حیات وخدمات، ص: ۴۰۹، نقیب امارت نمبر

(۲۸) ماخوذ: تحریک آزادی ہند میں مسلم علما اور عوام کا کردار، ص: ۱۸۴

(۲۹) پرانے چراغ، ص: ۹۸/۱

(۳۰) مکتوبات مولانا حسین احمد مدنی: ۲۱/۱

(۳۱) پرانے چراغ: ۱۰۱/۱

(۳۲) پرانے چراغ: ۱۰۳/۱

(۳۳) پرانے چراغ: ۱۰۴/۱

(۳۴) الجمعیۃ، جمعیۃ علماء نمبر، ص: ۱۱۸، بحوالہ تحریک آزادئ ہند میں مسلم علما اور عوام کا کردار، ص: ۱۲۷۔۱۲۸

(۳۵) ماخوذ تذکرہ: ۲۶۔۳۱

(۳۶) تذکرہ: ۳۱۰

(۳۷) ماخوذ: بڑوں کا بچپن، ص: ۲۲۱۔۲۲۳، تالیف حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری

(۳۸) بڑوں کا بچپن، ص: ۲۳۷

(۳۹) تذکرہ، ص: ۲۴۸، بحوالہ پرانے چراغ: ۶۰/۲

(۴۰) الجمعیۃ، جمعیت علماء نمبر، ص: ۱۲۰

(۴۱) تحریک آزادی میں مسلم علما اور عوام کا کردار، ص: ۱۲۰

(۴۲) امارت شرعیہ بہار واڑیسہ تاریخ وخدمات کی روشنی میں، ص: ۹

(۴۳) آئینہ، ۳۰/مئی ۲۰۱۶ء، مضمون طیب عثمانی ندوی

(۴۴) ماخوذ تحریک آزادی ہند میں مسلم علما اور عوام کا کردار، ص: ۲۱۳

(۴۵) مستفاد: حیات سجاد، ص: ۹۲۔۹۳، مقالہ نگار: حضرت سحبان الہند

(۴۶) حیات سجاد: ۹۶، مضمون: سحبان الہند

(۴۷) نقیب: ۴/اپریل ۲۰۱۵ء، مضمون طیب عثمانی ندوی

(۴۸) نقیب: ۴/اپریل ۲۰۱۵ء، مولانا طیب عثمانی ندوی

(۴۹) مولانا سجاد حیات وخدمات، ص: ۵۰۱

(۵۰) نقیب: ۴/اپریل ۲۰۱۵ء، مولانا طیب عثمانی ندوی

(۵۱) پرانے چراغ: ۹۷/۳، مکتبہ فردوس لکھنؤ

(۵۲) سہ روزہ الجمعیۃ: ۱۹۳۰ء، بحوالہ تحریک آزادی ہند میں مسلم اور عوام کا کردار، ص: ۹۸

(۵۳) کاروان احرار: ۱۰۶/۱

(۵۴) تحریک آزادی ہند میں مسلم علما اور عوام کا کردار، ص: ۹۹

(۵۵) مجاہد ملت، ایک سیاسی مطالعہ، ص: ۱۳۹

(۵۶) ۱۲۶۔۱۲۷، بعنوان: بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

(۵۷) پرانے چراغ: ۹۵/۳۔۹۶

(۵۸) مولانا سجاد حیات وخدمات، ص: ۵۱۶

باب دوم

علمی خدمات اورمقام

مولانا سجاد کی تدریسی خدمات وخصوصیات

مفتی نذر توحید المظاہری
مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ رشید العلوم، چترا، جھارکھنڈ

''پنہسہ'' جسے میں، آپ اور یہ دنیا جانتی نہ ہی، یہ کبھی اہل علم وقلم کی گفتگو کا محور اور تحریروں کا موضوع بن پاتا، اگر اس چھوٹے سے گم نام؛ بلکہ کافی حد تک بے نام گاؤں میں ''محمد سجاد'' نامی بچے کی ولادت سے لے کے اس کی طفولیت اور اٹھان تک کی اس کی گلیاں، محلے، سڑکیں اور درودیوار گواہ نہ ہوتے۔ مولانا محمد سجاد یوں تو عالی ذہن مفکر، دور بیں مدبر، ژرف نگاہ سیاست داں، ذہین ترین قائد، فقیہ النفس عالم اور ملت کے بے لوث و بے غرض خادم کی حیثیت سے معروف ومقبول اور متعارف ہیں؛ مگر عطا کرنے والی ذات نے انہیں جہاں ان بیش بہا خوبیوں سے آراستہ کیا تھا، وہیں تدریسی خصوصیات وامتیازات سے بھی خوب نوازا ہے۔ آپ کی تفہیم کا انداز، طلبہ کے ساتھ غایت درجہ شفقت اور ہر مقام پر ان کی بہی خواہی کے جذبے نے جہاں تلامذہ کے دلوں میں ان کی عظمت کے نقوش ثبت کیے، وہیں ان کی مہارت وکمال کا شاہد وگرویدہ بھی بنا دیا۔

ویسے تو مولانا کے تدریسی عمل کا دورانیہ نہ کئی دہائیوں پر محیط رہا، نہ ہی اس مدت کو مسند درس سے انسلاک کا ایک معتد بہ حصہ کہہ کر تعبیر کیا جا سکتا ہے؛ مگر یہ حقیقت جتنی ناقابل تردید ہے، اتنی ہی حیران کن بھی کہ اس تھوڑی مدت اور مختصر وقت میں آپ نے طلبہ کے آگے علم وآگہی کے جو بیش قیمت جواہر بکھیرے ہیں، اسے اگر نایاب کہنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی تو کم از کم کم یاب کہنے میں بھی کسی باک کے احساس سے دوچار نہیں ہوا جا سکتا۔

مولانا کی حیات بابرکات سے واقفیت رکھنے والے اس سے بخوبی واقف ہیں کہ آپ کی ابتدائی تعلیم کے لیے اولاً مدرسہ اسلامیہ نامی جس درس گاہ کا انتخاب کیا گیا تھا، وہ آپ کے گاؤں ''پنہسہ'' سے محض چھ میل کے فاصلے پر ''بہار شریف'' میں واقع تھا، جہاں کے ناظم مولانا حافظ سید وحید الحق صاحب استھانوی مولانا کے رشتہ دار بھی تھے، (۱) چنانچہ آپ جب حصول تعلیم سے

فارغ ہوئے تو جوہر شناس نگاہوں نے آپ کی لیاقتوں کی تابانی کو چونکہ زمانۂ طالب علمی سے ہی دیکھ اور بھانپ رکھا تھا۔ سو حکیم وحید الحق صاحب استھانوی کے بلاوے پر ہی ۱۳۲۰ھ میں مدرسہ اسلامیہ، بہار شریف چلے گئے؛ یعنی جس مٹی سے آپ نے اٹھان پائی تھی، اب وہیں کی ''کوزہ گری'' کی ذمہ داری آپ کی ذہانت اور حوصلے سے پُر کاندھوں کو سونپ دی گئی تھی، (۲) دیکھتے ہی دیکھتے آپ کے انداز جداگانہ نے طلبہ کے اندر وہ جادو جگایا کہ مشاہدہ کرنے والی آنکھیں مارے حیرت واستعجاب کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور طلبہ کا ایک جم غفیر مولانا کی مقناطیسی شخصیت کا شہرہ سن کے ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کو بے تاب ہوا ٹھا۔ یوں صرف تین سال کے وقفۂ تدریس میں آپ نے ایک مثال قائم کردی۔ مولانا کی مدرسہ اسلامیہ آمد پر رونما ہونے والے انقلاب کو مولانا کے تلمیذ خاص مولانا اصغر حسین بہاریؒ (نائب پرنسپل: مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ) کی زبانی ملاحظہ کیجیے! لکھتے ہیں کہ:

''ایک مدت سے مدرسہ قائم تھا؛ لیکن شرح وقایہ، جلالین شریف، قطبی میر قطبی وغیرہ سے اوپر پڑھنے والے طلبہ کبھی نہ رہے؛ جہاں ملا حسن وغیرہ پڑھنے کی نوبت آئی اور یوپی کی راہ لی؛ مگر حضرت ابوالمحاسنؒ کے پرمحبت درس نے ایسی سحر کاری کی کہ اب طلبہ مدرسہ میں جمنے لگے، چنانچہ میں بھی میر زاہد رسالہ اور ترمذی شریف تک پہنچ گیا''۔ (۳)

مولانا نے اپنے تدریسی دورانیے کا ایک بڑا حصہ جن ہستیوں کے سایۂ شفقت تلے گزارا، ان میں ایک جلی نام مولانا عبدالکافی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ آپ مولانا مدرسہ سبحانیہ الہ آباد کے قابل ترین اساتذہ میں سے تھے۔ علوم عربیہ پر دسترس رکھنے اور اپنے تبحر علمی کے حوالے سے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ مولانا سجاد نے شرح جامی کی دقیق بحثوں سے لے کر قطبی تک کے گنجلک مسائل کی تمام کتابیں آپ سے ہی پڑھیں۔ بعدازاں آپ مدرسہ سبحانیہ سے ہی فارغ التحصیل ہوئے۔ (۴) مولانا نے جب آپ کے سامنے دامن استفادہ دراز کیا تو استاذ کی دوراندیش ذہن کو اس کا ادراک ہو گیا کہ اپنے تمام ساتھیوں میں فائق، مطالعے کا رسیا، فطانت کا منہ بولتا مجسمہ ''محمد سجاد'' بے پناہ خوبیوں کے باعث مستقبل کا معمار ثابت ہوگا۔ مولانا عبدالکافی رحمۃ اللہ علیہ پر آپ کی ہنرمند طبیعت پہلے سے آشکارا تھی۔ چنانچہ مولانا عبدالکافی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا سجاد نامی اس ذی استعداد شاگرد کو ۱۳۲۳ھ میں مدرسہ سبحانیہ الہ آباد کے لیے طلب فرمالیا اور ان کی لیاقت پر اعتماد کرتے ہوئے صدر المدرسین کی نیابت کا منصب باوقار سپرد کردیا، گویا مولانا کی ''خاک''

ایک بار پھر وہیں جا پہنچی جہاں کا خمیر تھا۔(۵)

مولانا کی درسی کتب وفنون پر گرفت، ان کی علمی جلالت اور طلبہ کے دلوں میں ان کے لیے موجود والہانہ محبت کا اندازہ عرصے تک ان سے اکتساب فیض کرنے والے شاگرد اور بعد کے ایام میں رفیق کار مولانا عبدالحلیم اوگانوی کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ:

''میں اس زمانے میں کانپور میں پڑھتا تھا، جب یہ معلوم ہوا کہ مولانا الہ آباد تشریف لے آئے ہیں تو میں کانپور سے الہ آباد چلا آیا اور مولانا کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو گیا اور اپنی بقیہ کتابیں مولاناؒ ہی سے تمام کیں اس لئے آج مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں مولاناؒ کا شاگرد ہوں اگرچہ حقیر اور کم ترین ہوں۔ یوں تو مولاناؒ جامع العلوم تھے مگر جن علوم میں کافی بلکہ کافی سے زیادہ دست گاہ رکھتے تھے، وہ منطق، فلسفہ، بلاغت اور علم ادب تھا۔ کانپور میں کوئی عالم آپ کے پایہ کا نہ تھا اور الہ آباد میں بھی بجز مولانا منیر الدین مرحوم الہ آبادی کے کوئی مدرس عالم آپ کا ہمسر نظر نہ آیا۔ مولاناؒ کے درس تدریس کا یہ حال تھا کہ بڑی محنت اور کاوش سے پڑھاتے تھے اور کتاب کے مطالب مع مالہ وما علیہ اس آسانی سے طلبہ کے دماغ میں اتار دیتے تھے کہ دماغ چمک اٹھتا تھا، مولانا کے طرز تدریس کی بڑی شہرت اور دھوم رہی اور بہت سے تشنہ کامان علم اس چشمہ سے سیراب ہوئے اور اپنی پیاس بجھائی''۔(٦)

بات مولانا کے تدریسی امتیازات وخصوصیات سے متعلق ہے تو آپ کے بستان علم کے نام ور خوشہ چیں، فقیہانہ بصیرت کے حامل اور دنیائے تالیف وتصنیف کے شہ بے تاج، معتبر عالم دین مولانا عبدالصمد رحمانی (نائب امیر شریعت ثانی: ''امارت شرعیہ'') کے قلم سے حیات پانے والی یادداشتوں کے تفصیلی تذکرے؛ بلکہ شہادت سے چیدہ چیدہ عبارات نقل کی جاتی ہیں؛ تاکہ اس سے مولانا کی درسی خوبیوں، اس تعلق سے ان کی اختراعی صلاحیتوں اور افہام وتفہیم کی بے کراں ہنرمندی کی ہلکی سی جھلک سامنے آسکے۔ مولانا اس دور کے تعلیمی نظام میں موجود افراط وتفریط کی صورت ذکر کرنے کے بعد مولانا سجاد کے منفرد طریقۂ تدریس کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''... حضرت استاذ کا طریقۂ تعلیم اس افراط وتفریط سے الگ بین بین تھا وہ طلبہ کو کتاب سے اخذ مطلب پر زور دیتے تھے اور اس طرح ان کی قوت مطالعہ میں پختگی ہو جاتی تھی اور کتاب سے خاصی مناسبت پیدا ہو جاتی تھی، استاذ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ پڑھنے والے کے سامنے دو باتیں رہنی ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ جس مسئلہ کو تم کتاب میں پڑھ رہے

ہو، پہلے اس کو کتاب سے سمجھو کہ صاحب کتاب اس مسئلہ کے متعلق کیا کہہ رہا ہے اور اس سمجھنے میں جو کچھ سمجھو، اس کی عبارت سے سمجھو اور کسی خیال کو اپنی طرف سے زبردستی اس میں نہ ٹھونسو، اس کے سمجھ لینے کے بعد دوسری چیز یہ ہے کہ یہ سمجھو کہ اصل مسئلہ کی حقیقت ہے کیا؟ اور جب اصل مسئلہ کی حقیقت سمجھ لو تو اس کے بعد یہ بھی دیکھو کہ صاحب کتاب سے اس حقیقت کے سمجھنے میں چوک تو نہیں ہوئی ہے، پس حضرت استاذ پہلے کتاب کی تفہیم فرماتے، پھر نفس مسئلہ کی طرف رہنمائی فرماتے، اس طرح پڑھنے والے میں تحقیق، تلاش، محنت، مطالعہ فکر کا جذبہ پیدا کر دیتے تھے اور پڑھنے والے کے دماغ کی تربیت فرماتے تھے۔ حضرت استاذ طلبہ کو نہ تو بے محابا، بگ ٹٹ۔ ایسا رواں دواں دیکھنا چاہتے تھے کہ بے خبری میں ہر موڑ اس کے لیے خطرناک خندق بن جائے اور اس کے لیے مغلطہ کا باعث ہو اور نہ وہ طلبہ کے لیے یہ پسند فرماتے تھے کہ صرف کتاب کا رٹو ہو کر رہ جائے اور دماغ اس جوہر لطیف سے خالی رہے، جو علم کا مقصود و مطلوب ہے"۔(۷)

دوران درس مولانا کی چہرہ شناسی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے طریقۂ تعلیم کی ایک خصوصی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے عمیق تعلیمی تجربہ اور تبحر کی بنا پر اول نگاہ میں پڑھنے والے کی صلاحیت، اس کی استعداد، اس کی خامی اور اس کے نقص کو بھانپ لیتے تھے اور سبق کے وقت سب سے پہلے اس کی اس خامی کا ازالہ فرما دیتے تھے، جس کا ہونے والے سبق سے تعلق ہوتا تھا؛ تا کہ فہم سبق کی راہ میں دشواری نہ رہے اور اس کے لیے ایسا لطیف پیرایہ اختیار فرماتے تھے کہ دوسرے ہم سبق کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا اور اس کے دل کی گرہ کھل جاتی تھی"۔(۸)

طلبہ کے ساتھ مولانا کی شفقت، محبت، غم گساری، ہمدردی و اشک شوئی کا حال مولانا منت اللہ رحمانی (امیر شریعت رابع: "امارت شرعیہ") کے قلم سے پڑھیے! فرماتے ہیں کہ:

"مولانا کا سلوک طلبا کے ساتھ اس درجہ بہتر تھا کہ ان دنوں اس کا تصور مشکل ہے، کھانے پینے رہنے سہنے، پہنے، اوڑھنے میں مولانا نے کبھی امتیاز روا نہ رکھا، یہ ناممکن تھا کہ مولانا کھائیں اور طالب علم بھوکا رہ جائے، بیمار طلبہ کے علاج کا نظم خود مولانا کیا کرتے تھے۔ حکیم کے یہاں لے جانا، دوا لانا، تیمارداری کرنا، ان میں سے زیادہ کام مولانا خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیا کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ مولانا پر اپنی جان قربان

کرنے کو تیار رہتے تھے، آج بھی مولانا کے جو شاگرد موجود ہیں، وہ اس وقت بھی مولانا کی شفقت اور مہربانیوں کو ہمیشہ یاد کرتے ہیں اور انہیں اس کا اعتراف ہے کہ جتنی خدمت مولانا نے ہماری کی ہوگی، اتنی خدمت ہم مولانا کی نہیں کر سکے"۔(۹)

قیام الہ آباد کے دوران مولانا کے درس کا شہرہ مدرسہ کی چہار دیواری سے نکل کے زبان زد عام ہو چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ ایک شیعہ صاحب بعد نماز عصر پابندی کے ساتھ ریاضی پڑھنے آیا کرتے تھے، وہ چونکہ انگریزی داں تھے؛ اس لیے حاصل شدہ خبروں سے بین الاقوامی حالات مولانا کے گوش گزار کرتے رہتے۔ مولانا ہجوم کار اور کثرت اشغال سے نہ کبھی گھبرائے، نہ کبھی ان کے آگے گھٹنے ٹیکنا گوارہ کیا؛ بلکہ سینہ سپر ہو کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیوانہ وار مقابلہ کیا، مدرسہ کے اوقات میں درس دینے کے علاوہ نماز صبح سے پہلے جہاں دیتے، وہیں نماز سے فراغت کے بعد بھی متصلاً پڑھایا کرتے۔

الہ آباد کے بعد اپنے ذی فہم استاذ مولانا عبدالکافی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کی تعمیل میں مولانا ۱۳۲۹ھ میں گیا چلے گئے، گیا میں مدرسے کی تاریخ، نشاۃ ثانیہ اور اس کی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے صوبہ بہار کے مشہور و معروف بزرگ خان بہادر مولانا ابونعیم محمد مبارک کریمؒ (سابق سپریٹنڈینٹ آف اسلامک اسٹڈیز بہار واڑیسہ) کی یادداشتوں پر مشتمل معلومات کو ترتیب دیتے ہوئے زکریا فاطمی صاحب (مدیرِ 'الہلال') رقم کرتے ہیں کہ:

"آپ گیا تشریف لائے اور وہاں جا کر آپ نے مدرسہ انوار العلوم کو دوبارہ جاری کیا، جو قاضی فرزند احمد صاحب رئیس گیا کے صاحب زادہ قاضی انوار احمد مرحوم کے نام سے شمس العلماء مولانا عبدالوہاب فاضل بہاری کا قائم کیا ہوا تھا؛ مگر شمس العلماء مرحوم کے الگ ہو جانے کے باعث بند ہو گیا تھا۔ الختصر جس وقت آپ تشریف لائے، گیا میں کوئی مدرسہ نہیں تھا اور ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی عربی درس گاہ جاری کی جائے، چنانچہ آپ نے مدرسہ انوار العلوم کو جاری فرمایا، اس مدرسہ کا فیض دور دور تک پہنچا اور نہ صرف اس صوبہ میں؛ بلکہ دوسرے صوبوں کے تشنہ گان علوم بھی اس کے چشمۂ فیضان سے سیراب ہوتے رہے، مدرسہ کے جلسہ کا افتتاح اور سالانہ دستار بندی کے جلسوں میں نامی گرامی علمائے کرام تشریف لایا کرتے تھے، جس سے گیا کی پبلک بھی مستفید ہوا کرتی تھی۔ آپ کی سعی بلیغ سے مدرسہ کو نہ صرف معنوی ترقی؛ بلکہ صوری ترقی بھی ہوئی، مدرسہ کی شاندار

عمارت تعمیر ہوئی، دارالاقامہ بھی تعمیر ہوگیا اور بہتیرے غیر مقامی طلبہ کے نہ صرف قیام؛ بلکہ طعام کا بندوبست بھی باضابطہ ہوگیا''۔(۱۰)

یہ مدرسہ ابتداءً ''ظفر منزل'' کے سامنے والی عمارت میں چلتا رہا، پھر ''مسماۃ مریم'' نے زمین جائداد وغیرہ وقف کیا، اس کے بعد یہ مدرسہ آئندہ کی ترقی کے مراحل اور عروج کے منازل طے کرتا چلا گیا، یہی وہ ادارہ تھا، جہاں سے مولانا کی فکر کا رخ تبدیل ہوا اور ذہن نے پلٹا کھایا، پھر دنیا نے دیکھا مسند درس پر بیٹھ کر علم وحکمت کے یواقیت ولآلی بکھیرنے کے علاوہ بھی مولی نے مولانا نے بے شمار خوبیاں ودیعت فرمائی تھیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مصادر ومراجع

(۱) ''حیات سجادؒ'' صفحہ:۹ (مرتب: مولانا عبدالصمد رحمانیؒ)

(۲) ''مولانا سجاد نمبر'' (ہفت روزہ: نقیب) صفحہ:۱۱

(۳) ''محاسن سجادؒ'' صفحہ:۱۹ (مرتب: مولانا مسعود عالم ندویؒ)

(۴) ''محاسن سجادؒ'' صفحہ:۳

(۵) ''مولانا سجاد نمبر'' (ہفت روزہ: نقیب) صفحہ:۱۲

(۶) ''محاسن سجادؒ'' صفحہ:۵

(۷) ''حیات سجادؒ'' صفحہ:۲۹

(۸) ''حیات سجادؒ'' صفحہ:۳۰

(۹) ''حیات سجادؒ'' صفحہ:۱۲

(۱۰) ''محاسن سجادؒ'' صفحہ:۱۴

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد کی
تعلیمی و تدریسی خدمات و خصوصیات

مولانا اشتیاق احمد قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کو خدائے ذوالمنن کی طرف سے بہت سی خوبیاں ملی تھیں، ان میں ان کے علمی محاسن سب پر غالب تھے، وہ بڑے مشاق مدرس، حاضر دماغ باحث، قابلِ رشک معقولی اور قابلِ فخر فقیہ تھے، ان کی فکر رسا اور رائے صائب تھی ان کا علم کتابی نہیں، آفاقی تھا، ملک بھر میں ان کے طرز تدریس کی دھوم تھی، دور دور تک ان کا کوئی ہمسر نظر نہ آتا تھا، طلبہ ان کے عاشقِ زار تھے، وہ اسلامی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کے داعی اور ساعی تھے، دیارِ کفر میں اسلامی شیرازہ بندی کے ذریعے مسلمانوں کو ایک نظام کے تحت دیکھنا چاہتے تھے، ان کی حاضر دماغی ضرب المثل تھی۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

> فلسفۂ تاریخ کے ماہر کہتے ہیں کہ علم اور عمل کم یکجا ہوتے ہیں؛ لیکن انہی کم یاب مثالوں میں مولانا محمد سجادؒ کی ذات تھی، وہ اپنے وقت کے بڑے مشاق مدرس اور حاضر العلم عالم تھے، خصوصیت کے ساتھ معقولات اور فقہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، جزئیات فقہ اور خصوصاً ان کا وہ حصہ جو معاملات سے متعلق ہے، ان کی نظر میں تھا، امارتِ شرعیہ کے تعلق سے اقتصادی و مالی و سیاسی مسائل پر ان کو عبور کامل تھا، زکوٰۃ، خراج و قضا و امامت و ولایت کے مسائل کی پوری تحقیق فرمائی تھی...... جب بھی گفتگو کی گئی ان کا علم تازہ نظر آیا، ان کا علم محض کتابی نہ تھا بلکہ آفاقی بھی تھا...... اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا عطیہ فکر رسا اور رائے صائب تھی، مسائل و حوادث میں ان کی نظر بہت دور پہنچ جاتی تھی، وہ ہر گتھی کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتے تھے"۔(۱)

حضرت مولانا وحید الحق استھانویؒ سے ان کے مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں فیض حاصل

کیا، پھر وقت کے معروف مربی ومدرس حضرت مولانا عبدالکافیؒ سے ''مدرسہ سبحانیہ الہ آباد'' میں علوم وفنون حاصل کیے، دیوبند تشریف لائے؛ مگر سوئے اتفاق کہ ایک تبتّی طالب علم سے لڑائی ہوگئی، اس کی وجہ سے جن طلبہ کو دیوبند چھوڑنا پڑا، ان میں موصوف بھی تھے، دیوبند سے واپس ہونے کے باوجود دیوبند کی یاد ہمیشہ تازہ رہی، اپنی مجلسوں میں برابر دیوبند کا تذکرہ فرماتے، بالآخر حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک سے جڑ گئے، جمعیۃ علمائے ہند اور امارت شرعیہ کے اوّلین یوم تاسیس سے اپنے دم واپسیں تک ساتھ رہے، (۲) غرض یہ کہ مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں ہی اپنی تعلیم مکمل فرمائی۔

علمی مقام:

حضرت ابوالمحاسن کا زمانہ معقولات کے غلبے کا تھا، حضرت کو بھی معقولات میں کافی عبور تھا؛ اس لیے عام طلبہ معقولی سمجھتے تھے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کو منطق وفلسفہ سے زیادہ فقہ میں عبور تھا، تفسیر اور حدیث شریف سے بڑی مناسبت تھی، علم بلاغت اور عَروض میں بھی اچھی خاصی مہارت تھی، تھوڑی دیر میں عربی زبان میں قصیدہ منظوم فرمالیتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالحکیم اوکانوی لکھتے ہیں:

''یوں تو مولانا جامع العلوم تھے، مگر جن علوم میں کافی؛ بلکہ کافی سے زیادہ دست گاہ رکھتے تھے، وہ منطق، فلسفہ، بلاغت اور علمِ ادب تھا، کانپور میں کوئی عالم آپ کے پایہ کا نہ تھا اور الہ آباد میں بھی بجز مولا امنیر الدین مرحوم الہ آبادی کے کوئی مدرس عالم آپ کا ہمسر نظر نہ آیا''۔ (۳)

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد کے عزیز ترین شاگرد رشید مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے موصوف کی قرآن وسنت، فقہ اسلامی اور معقولات سے مناسبت کو بڑے اچھے انداز میں بیان فرمایا ہے، معقولات سے مناسبت کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اس دور میں عموماً طلبہ میں معقولات کا ذوق زیادہ تھا اور اس کی جانب دل چسپی میرے خیال میں افراط کی حد سے بھی زیادہ تھی، اسی بنا پر عموماً اس دور میں طلبہ میں مولانا کی ممتاز حیثیت معقولی ہونے کی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا اس فن میں ناقدانہ نظر رکھتے تھے اور ہر مسئلہ میں مولانا کی رائے قولِ فیصل کا درجہ رکھتی تھی......''۔

آگے قرآن مجید سے طبعی مناسبت کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کا مولانا کو طبعی ذوق تھا وہ مجھ سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں جب

قرآن مجید تلاوت کرنے بیٹھتا ہوں تو بہ مشکل گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں ایک صفحہ کی تلاوت کر پاتا ہوں، قرآن کی بلاغت، اس کا عمق، پھر اس کے احکام، پھر احکام کی روح اور اس کا مناط، پھر اس کے ماتحت اس کے فروع پھر فروع کے تنوعات، پھر ان میں باہم تفاوت کی بوقلمونی؛ اس طرح ایک ساتھ سامنے آنے لگتی ہیں کہ میں اس میں کھو جاتا ہوں اور اکثر ایک ہی دو آیت میں وقت ختم ہو جاتا ہے اور تھک کر تلاوت ختم کر دیتا ہوں''۔

احادیثِ نبویہ سے متعلق مولانا ابوالمحاسن کی مناسبت یوں بیان کرتے ہیں:

''احادیث کے متعلق مولانا کا نظریہ بہت بلند تھا، مولانا فرماتے تھے کہ ہر حدیث قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت کی تفسیر ہے، نیز یہ کہ ہر حدیث مشکوٰۃِ نبوت کی ہی تنویر کی روشنی میں جو ''بِمَا اَرَاکَ اللّٰہ'' کے ماتحت - آپ کو حاصل تھی، اس امر پر زبردست دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تشریح وتبیین آیاتِ قرآن کی فرمائی ہے؛ سب کے لیے آپ نے قرآن کے الفاظ میں اشارات پائے ہیں، جس طرح مجتہدین آیات منصوصہ میں مدارِ حکم کے اشارات پاتے ہیں، پھر اس پر قیاسات کی بنیاد رکھتے ہیں اور فروعی احکامات کا استخراج کرتے ہیں۔

اس لیے مولانا کی رائے تھی کہ ہر حدیث کا تعلق قرآن سے بتانا چاہیے اور ہر نوع کے مسائل کے متعلق سب سے پہلے قرآن کریم سے جو کچھ ثابت ہے، اس کو زیر بحث لانا چاہیے، اس کے بعد احادیث سے جو کچھ سمجھا ہے، اس کو بتانا چاہیے، اس کے بعد طلبہ کو اس طرف رہنمائی کرنی چاہیے کہ مسئلہ کے اس خاص نوع میں مجتہدین کی کیا خدمات ہیں؟ اور کیوں کر ہیں؟ اور ان کا مدار کیا ہے؟''۔

مولانا رحمانی اپنے استاذ محترم کے فقہی درک، گہرائی و گیرائی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا جس طرح اختلافات احادیث کے باب میں جمع وتطبیق سے کام لیتے تھے اور اختلاف احوال اور مقتضائے ماحول پر اس کو محمول فرماتے تھے، یا اختلاف مدارج یعنی اباحت، رخصت، عزیمت کو سبب قرار دیتے تھے، اسی طرح فقہاء کے مختلف اقوال میں جمع وتطبیق سے کام لیتے تھے اور امام صاحب اور صاحبین کے اختلاف کو نیز دوسرے ائمہ: امام شافعیؒ وغیرہم کے اختلاف کو خصوصاً معاملات میں مقتضائے ماحول اور اسی طرح کے دوسرے اسباب پر محمول فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ مختلف جہات کی بنا پر جو مختلف احکام ہیں، ان میں واقعیت کے اعتبار

سے کوئی اختلاف ہی نہیں ہے‘‘۔

آگے لکھتے ہیں:

’’یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بنا پر مولانا ان مسائل میں جو ارتقائی اسباب کی بنا پر آئے دن نئی نئی صورتوں میں رونما ہوا کرتے ہیں، بلا تکلف صائب رائے دیتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کو پہلے سے سوچ بیٹھے ہیں اور اس کے شواہد اور نظیر پر غور وفکر کے تمام مراحل کو طے فرما چکے ہیں...... میرے خیال میں مولانا کی اصلی خصوصیت ’’تفقہ فی الدین‘‘ کی خداداد دولت تھی، جس میں وہ فقیہ اور یگانہ تھے‘‘۔(۴)

الٰہ آباد سے رخصت ہوتے وقت محبوبیت کے مظاہر:

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو روئے زمین پر اس کے مظاہر دکھا بھی دیتے ہیں، حضرت مولانا اپنے عزیزوں، دوستوں اور ہم عصروں میں محبوب تھے، طلبۂ کرام بے پناہ محبت کی نظروں سے دیکھتے تھے، عام لوگوں میں بھی محبوبیت کی یہی شان نظر آتی تھی۔ حضرت مولانا محمد یوسف خاں لکھتے ہیں:

’’مولانا علیہ الرحمہ جس وقت الٰہ آباد چھوڑ رہے تھے، شہر کے عمائدین ورؤسا اسٹیشن پر آکر رو رہے تھے‘‘۔(۵)

اور حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی لکھتے ہیں:

’’......عمائدین کی ایک جماعت مولانا کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر آئی تھی تو ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ الٰہ آباد سے ’’فقہ‘‘ رخصت ہو رہا ہے‘‘۔(۶)

مولانا کے تین ادارے:

فراغت کے بعد سب سے پہلے ’’مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد‘‘ میں درس وتدریس کا آغاز فرمایا، وہاں اپنے محسن ومربی استاذ محترم کے زیر سایہ رہنے لگے، (معلوم ہوا ہے کہ اب یہ مدرسہ سرکاری ہو گیا ہے، اس کے ذمہ دار جناب مولانا ریاض الدین صاحب ہیں) پھر اپنے وطن کی مادر علمی یعنی ’’مدرسہ اسلامیہ بہار شریف‘‘ آئے، یہ موصوف کے استاذ اور خسر حضرت مولانا وحید الحق صاحبؒ کا مدرسہ تھا، اس کو بھی سنبھالا دیتے رہے، پھر جب مولانا عبدالکافی صاحبؒ نے اصرار فرمایا تو وہاں سے دوبارہ الٰہ آباد آگئے اور ’نائب مدرس اوّل‘ کی حیثیت سے پڑھانے لگے، وہاں سے گیا تشریف لائے اور ’’مدرسہ انوار العلوم‘‘ کی بنیاد رکھی۔(۷)

تدریس کا آغاز:

جب اپنی مادر علمی میں اسباق شروع کیے تو مدرسہ کی بڑی شہرت ہوئی، بڑی محنت و جانفشانی سے پڑھاتے تھے، مزاج کی نرمی، عفو و درگزر اور طلبہ کے ساتھ ہمدردی نے آپ کی مقبولیت کو دوچند کردیا، مدرسہ کے تعلیمی قالب میں نئی روح پھونک دی، مدرسہ میں متوسطات کے ساتھ علیا کی کتابیں بھی پڑھائی جانے لگیں، آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد اصغر حسینؒ نائب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ رقم طراز ہیں:

"...... مدرسہ اسلامیہ تشریف لے آئے اور درس جاری فرمایا، مزاج کی نرمی، عفو و درگزر کی طینت اور طلبہ کی ہمدردی کے ساتھ جو اپنی طباعی اور انہا کی شان سے شب و روز درس و تدریس کی مہم شروع کی تو تھوڑے ہی عرصہ میں مدرسہ کے تعلیمی قالب میں نئی روح پھونک دی، ایک مدت سے مدرسہ قائم تھا؛ لیکن شرح وقایہ، جلالین شریف، قطبی اور میر قطبی وغیرہ سے اوپر پڑھنے والے طلبہ کبھی نہ رہے، مگر حضرت ابوالمحاسن کے پُرمحبت درس نے ایسی سحر کاری کی کہ اب طلبہ مدرسہ میں جمنے لگے؛ چناں چہ (مدرسہ) میر زاہد رسالہ اور ترمذی شریف تک پہنچ گیا"۔(۸)

تدریس کا نرالا انداز:

حضرت ابوالمحاسن کے طریقۂ تعلیم و تدریس کو حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے بڑے اچھے انداز میں لکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت طلبۂ کرام سے کتاب حل کراتے تھے، ان کی قوتِ مطالعہ کی پختگی کی طرف متوجہ رہتے اور اس حد تک محنت کراتے کہ طلبہ کو کتاب سے اچھی خاصی مناسبت پیدا ہو جاتی، وہ فرماتے تھے:

"پڑھنے والے کے سامنے دو باتیں رہنی ضروری ہیں:

۱- ایک تو یہ کہ جس مسئلہ کو تم کتاب میں پڑھ رہے ہو، پہلے اس کو کتاب سے سمجھو کہ صاحبِ کتاب اس مسئلہ کے متعلق کیا کہہ رہا ہے؟ اور اس کے سمجھنے میں جو کچھ سمجھو اس عبارت سے سمجھو اور کسی خیال کو اپنی طرف سے زبردستی اس میں نہ ٹھونسو۔

۲- دوسری چیز یہ ہے کہ یہ سمجھو کہ اصل مسئلہ کی حقیقت کیا ہے؟ اور جب اصل مسئلہ کی حقیقت سمجھ لو تو اس کے بعد یہ بھی دیکھو کہ صاحبِ کتاب سے اس حقیقت کے سمجھنے میں چوک تو نہیں ہوئی ہے"۔(۹)

آگے لکھتے ہیں:

”پس حضرت استاذ (سبق میں) پہلے کتاب کو سمجھاتے، پھر نفسِ مسئلہ کی طرف رہنمائی فرماتے، اس طرح پڑھنے والے میں تحقیق، تلاش، محنت، مطالعہ کی فکر کا جذبہ پیدا کر دیتے اور پڑھنے والے کے دماغ کی تربیت فرماتے تھے“۔(۱۱)

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے اپنے استاذ محترم کے طرزِ تدریس کو بیان کرنے سے پہلے اس وقت کے رائج دو طریقوں کو بیان کر کے، دونوں کے افراط وتفریط کی نشاندہی کی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ!

(الف) اس زمانے میں ایک انداز تو یہ تھا کہ طالب علم ایک اندازے سے پورے سبق کی عبارت پڑھ جاتا اور پڑھانے والا مدرس پورے سبق کی تقریر کرتا تھا، مطلب بیان کرتا، اس سے متعلق اعتراض وجواب کو ذکر کرتا، پھر طالب علم ترجمہ کرتا اور سبق ختم ہو جاتا۔

اس طریقے پر نقد فرمایا ہے کہ اس سے طالب علم کو ہر مسئلہ پر رواں دواں تقریر تو آجاتی تھی؛ مگر کتاب سے مناسبت نہ ہو پاتی تھی، قوتِ مطالعہ میں کمزوری ہوتی، بہت سے طلبہ کتاب سمجھانے پر قادر نہ ہو پاتے تھے، ایسے طلبہ کی رواں دوں تقریر کے دوران اگر کوئی اعتراض کر دیتا تو ساری تقریر پانی ہو جاتی تھی۔

(ب) اس زمانے کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ طالب علم ایک دو سطر عبارت پڑھتا اور استاذ صاحب اس کا مطلب بیان کرتے، اعتراض وجواب ذکر کرتے، پھر طالب علم آگے بڑھتا، ایک دو سطر عبارت پڑھتا اور اسی طرح سبق پورا ہو جاتا تھا۔

اس صورت میں طلبہ کو کتاب سے مناسبت ہو جاتی، تفہیم کی صلاحیت بڑھتی اور قوتِ مطالعہ میں اضافہ ہو جاتا تھا؛ مگر طالب علم اپنے دماغ میں کسی مسئلہ سے متعلق کوئی خاص روشنی نہیں رکھتا تھا، نہ یہ قدرت ہوتی کہ کتاب سے الگ ہو کر ایک سلجھی ہوئی تقریر میں مقصدِ کتاب کو بیان کر دے۔

اس لیے حضرت ابوالمحاسن نے اپنے اندازِ درس کو معتدل کیا اور زمانے کے طرز میں تبدیلی کر کے اپنا امتیاز قائم کیا، جس نے ان کو اپنے معاصرین میں ممتاز کر دیا۔

تدریس کی تیاری اور تفہیم پر محنت:

حضرت ابوالمحاسن کے امتیازات میں ان کی تدریس وتفہیم کو اوّلیت حاصل ہے، زبان میں لکنت کے باوجود اتنی کامیاب مدرسی تاریخ میں نظر نہیں آتی، بڑی محنت سے تیاری کر کے درس دیتے، سمجھانے کا انداز آسان اختیار کرتے، اور اس طرح کامیابی کے ساتھ طالب علم کے ذہن

ودماغ میں مضمون بٹھاتے کہ ان کے دلوں سے صدائے آفریں بلند ہونے لگتی، موصوف کے طرز تدریس کی بڑی شہرت تھی طلبہ کو مدرسہ کے اوقات کے علاوہ وقت بھی دیتے اگر مدرسہ میں کسی وجہ سے چھٹی ہوجاتی تو اپنے گھر بلا کر اسباق پڑھاتے اور کھانے پینے کا انتظام بھی کرتے تھے، حضرت مولانا عبدالحکیمؒ لکھتے ہیں:

''مولانا کے درس وتدریس کا یہ حال تھا کہ بڑی محنت اور کاوش سے پڑھاتے تھے اور کتاب کے مطالب مع مالہ وماعلیہ اس آسانی سے طلبہ کے دماغ میں اُتار دیتے تھے کہ دماغ چمک اٹھتا تھا، مولانا کے طرز تدریس کی بڑی شہرت اور دھوم رہی، بہت سے تشنہ کامانِ علم اس چشمہ سے سیراب ہوئے اور اپنی پیاس بجھائی''۔(۱۲)

اور حضرت مولانا محمد اصغر حسین نائب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ لکھتے ہیں:

''درس وتدریس میں جن امور کی رعایت سے طلبہ کو پوری تشفی ہوسکتی ہے، مولانا اس میں کسی طرح کی کمی جائز نہ رکھتے تھے، مطالب کتاب کو خوب کھول سامنے رکھنے کی سعی فرماتے، ظاہر ہے کہ اس کے لیے کس قدر گہرے مطالعہ اور توسیع معلومات کی محنت برداشت کرنے کی ضرورت ہے (اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے)''۔

آگے لکھتے ہیں:

''پھر ایک بار کی تقریر سے تشفی نہ ہوتی تو دوبارہ سہ بارہ تقریر کرنے میں چیں بہ چیں نہ ہوتے اور اگر اوقات مدرسہ میں آسودگی نہ ہوتی تو خارج وقت دینے میں کوئی دریغ نہ فرماتے، حتی کہ شروح وحواشی دکھلا کر تشفی فرمانے کی زحمت گوارہ کرتے؛ بلکہ کتاب کے مشکل مقامات کو اہلِ فضل کے سامنے رکھ کر تشفی کرانے میں بھی بے نفسی کا ثبوت دیتے، اگر مدرسہ ہفتہ دو ہفتہ کے لیے بند ہوجاتا تو پندرہ بیس طلبہ کو اپنے مکان لے جاتے اور سب کے ناشتے کھانے کے خود کفیل ہوکر مکان ہی پر درس میں مشغول ہوتے''۔(۱۳)

جواب میں برجستگی:

حضرت مولانا کو علمی بحث میں مضمون کا بڑا استحضار رہتا تھا، گفتگو میں سامنے والے کو الزامی جواب دے کر خاموش کردینا ان کے لیے چٹکی کا کھیل تھا، موصوف کے شاگرد رشید جناب مولانا محمد یوسف خاں ایک واقعہ اس طرح لکھتے ہیں:

''ایک آریہ مناظر مولانا رحمہ اللہ سے ملنے آیا اور کہنے لگا کہ مولانا اس میں تو کوئی

مضائقہ نہیں کہ مسلمان گائے کی قربانی ترک کردیں اور ہنود مسلمانوں کو بکرا دے کر قربانی کا انتظام کردیں، مولانا نے فوراً برجستہ فرمایا کہ میاں! ہم لوگوں کو جانور کے بالوں کی تعداد کے مطابق ثواب ملتا ہے، اتنا بال اور جانور میں کہاں؟ وہ لاجواب ہوگیا اور کچھ دیر خاموش ہوکر رخصت کی اجازت چاہی اور چلا گیا''۔(۱۴)

جمعرات کو تقریر ومناظرہ کی تربیت:

حضرت ابوالمحاسن کا زمانہ مناظروں کا تھا، پورے ملک میں عیسائی اسلام کو چیلنج کرتے پھرتے تھے؛ اس لیے طلبہ کو کتاب کے علم کے ساتھ ہی مناظرہ بھی سکھایا جاتا تھا، جگہ جگہ اسلام کی حقانیت کی دلیل بیان کرنے کے لیے تقریر کی مشق کی ضرورت تھی، حضرت نانوتویؒ اور ان سے پہلے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ڈاکٹر وزیر خان کے مناظرے مشہور ہیں؛ غرض یہ کہ حضرت مولانا تقریر کے ساتھ مناظرے کی تربیت بھی دیتے تھے، اس کے لیے جمعرات کا دن متعین تھا، مولانا محمد یوسف خاں لکھتے ہیں:

''مولانا طلبہ کو بلاناغہ ہر پنج شنبہ کے روز تقریر ومناظرہ کی تعلیم دیا کرتے تھے''۔(۱۵)

مولانا کی قبولیت عامہ:

زبان میں لکنت کے باوجود حضرت ابوالمحاسن کی تدریس کے اسلوب کی مقبولیت عام تھی، دور دور سے طلبہ مولانا کے پاس آتے اور علوم وفنون کی تشنگی دور کرتے، مولانا کے عاشق زار شاگرد رشید جناب مولانا محمد یوسف خان جن کو ناز تھا کہ انھوں نے ساری کتابیں مولانا سے ہی پڑھی ہیں، لکھتے ہیں:

''(الٰہ آباد میں) ایک شیعہ رئیس زادہ مولانا سے ریاضی پڑھنے آتا تھا وہ سارے ہندوستان کی خاک چھان چکا تھا؛ لیکن کہیں اس کی تشفی نہیں ہوئی، آخر میں وہ مولانا کے طرز تعلیم پر فریفتہ ہوگیا اور باوجود رئیس زادہ ہونے کے برابر مولانا ہی کی خدمت میں قیام گاہ پر (جاکر) تعلیم حاصل کرتا تھا اور اس کے والدین مولانا کو پچیس روپے دیا کرتے تھے، مولاناؒ اس سے روپے لے کر طلبہ کی ذات میں کل کا کل خرچ کردیا کرتے تھے اور اپنے لیے ایک ایک پیسہ بھی نہیں رکھتے تھے''۔(۱۶)

طلبہ کے امتحانات سے حضرت ابوالمحاسن کی کامیاب تدریس کا اندازہ:

درخت اپنے پھل سے استاذ اپنے شاگرد سے پہچانا جاتا ہے، حضرت ابوالمحاسن کی شب وروز

کی محنت اور مادرِ علمی کے لیے جانفشانی نے طلبہ کے اندر حیرت انگیز استعداد پیدا کردی، سارے طلبہ کو ساری کتابیں نوک زباں رہتی تھیں، اس کا اندازہ سالانہ امتحان میں طلبہ کے شان دار مظاہرے سے کیا جاسکتا ہے، اس مضمون کو مولانا محمد اصغر حسین صاحبؒ نے اس طرح بیان کیا ہے:

''ممتحن اور طلبہ کے گرد اگرد دوسرے حضرات اہل علم امتحان کی کیفیت کا تماشہ کرنے کو بیٹھ جاتے تو اس وقت کی تعلیمی نمائش کا قابلِ دید منظر ہوتا تھا، مولانا محمد احسن استھانوی...... امتحان کے لیے تشریف لائے اور میر زاہد رسالہ مع حاشیہ غلام یحییٰ بہاری کے امتحان کے سلسلہ میں، میں اور مولانا عبدالرحمٰن جون پوریؒ پیش کیے گئے تو انھوں نے فرمایا کہ آج ایک عجیب منظر دیکھنے میں آرہا ہے کہ بہار شریف میں ان کتابوں کے پڑھنے والے طلبہ موجود ہیں، پھر جو انھوں نے اپنی منطقیانہ شان سے امتحان لینے کے دوران سوالات شروع کیے اور ہم دونوں جوابات دینے لگے تو اس دن کے اس منظر کی لذت آج بھی اہلِ علم بزرگوں کے کام و دہن میں باقی ہے''۔

آگے لکھتے ہیں:

''مولانا سید شاہ اسماعیل (مدرس فقہ مدرسہ عالیہ کلکتہ) سے جب ملنے کا اتفاق ہوتا تو اس امتحانی مظاہرہ کا تذکرہ مزہ لے کر فرمایا کرتے تھے''۔

حضرت ابوالمحاسن کی محنت کا نتیجہ تھا کہ جس مدرسہ میں بڑی مشکل سے متوسطات تک کے طلبہ ٹھہر پاتے تھے، وہاں تعلیمی ترقی اتنی ہوئی کہ وہاں سے طلبہ فضیلت کی سند بھی حاصل کرنے لگے۔ (۱۷)

چند باکمال شاگردان:

حضرت ابوالمحاسن کے شاگردوں کی بہت بڑی فہرست ہے؛ مگر افسوس اس بات پر ہے کہ اس کی تفصیل سوانح نگاروں نے بیان نہیں کی ہے؛ اگر زندگی میں یا وفات کے بعد فوراً منظّم طور پر سوانحی تحریریں تیار کی جاتیں تو اس کی فہرست بھی ملتی، ہمارے لیے ان میں رہنمائی ہوتی؛ بہرکیف جن شاگردوں کا تذکرہ بعض خاکہ نگاروں نے کیا ہے، وہ درج ذیل ہیں۔

۱- حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ امیر شریعت امارتِ شرعیہ، پٹنہ
۲- حضرت مولانا عبدالحکیمؒ اوگانوی مہتمم مدرسہ انوار العلوم، گیا
۳- حضرت مولانا محمد اصغر حسینؒ نائب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ

۴- حضرت مولانا عبدالرحمٰن جون پوری

۵- حضرت مولانا محمد شرافت کریم

۶- حضرت مولانا محمد یعقوب گیاوی

۷- حضرت مولانا فرخند علی سہسرامی

۸- حضرت مولانا محمد یوسف خان بن مولانا الٰہی بخش خاں بہار شریف

۹- حضرت مولانا احمد اللہ آبگلوی محقق دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

انقلابی تعلیمی نظریہ:

حضرت ابوالمحاسن کی علمی گہرائی، گیرائی، سیاسی سوجھ بوجھ، ملی اور تصنیفی خدمات سے اکثر اہل علم واقف ہیں؛ مگر بہت کم لوگوں کو ان کے انقلابی تعلیمی نظریہ کی واقفیت ہے، غیر مسلم اکثری ملک میں امارت شرعیہ اور جمعیۃ علماء ہند کے ذریعہ ہندی مسلمانوں کو اسلام اور شعائر اسلام کے بقا وتحفظ کی نعمت نصیب ہوئی ہے، یہ انھیں دوررَس نگاہ والے بزرگان کی بے لوث جدوجہد کی وجہ سے ہے؛ غرض یہ ہے کہ حضرت ابوالمحاسن کے انقلابی افکار میں سے ان کا تعلیمی نظریہ بڑی اہمیت کا حامل تھا، کاش اس کی عملی تنفیذ کا موقع نصیب ہوجاتا تو آج ہندوستان کے مدارس اسلامیہ کی یہ درگت نہ بنتی جو دیکھنے کو مل رہی ہے، اس زمانے میں مدارس کا تعلیمی معیار آج سے کہیں اونچا تھا، پھر بھی حضرت ابوالمحاسن بے چین تھے، وہ یہ چاہتے تھے:

۱- تمام مدارس کے لیے ایک مرکز بنایا جائے۔

۲- نصاب کو مزید مضبوط، مفید اور بہتر بنایا جائے۔

۳- سارے مدارس کا نصاب ایک رہے۔

۴- ہر قابل اعتناء مدرسہ کے ذمہ ایک مخصوص فن کیا جائے، جس کی تکمیل وہاں ہو، ابتدا ہی سے وہاں کے ہر درجہ میں اس کا لحاظ رکھا جائے، مثلاً کسی مدرسہ میں تفسیر کا اختصاص ہو تو کسی میں حدیث کا، تو کسی میں فقہ اسلامی کا، وغیرہ۔

۵- امتحانات کے لیے تمام مدارس کے لائق علماء کی ایک مجلس ممتحنہ ہو جو سوالات مرتب کرے اور نتائج شائع کرے۔

اسی خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے حضرت ابوالمحاسن نے الہ آباد چھوڑا اور انوار العلوم گیا کی بنیاد رکھی اور وہیں سے اس تحریک کی ابتدا کی؛ مگر وسائل کی کمی کی وجہ سے مشکلات پیش

آئیں اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

خلاصہ:

حضرت ابوالمحاسن سجادؒ ہندوستان کی انقلابی شخصیات میں سے ہیں، ان کی زندگی میں بہت سی خوبیاں جمع تھیں، سارے علوم شرعیہ میں قابلِ رشک مہارت رکھتے تھے، ’’مدرسہ سبحانیہ الہ آباد، مدرسہ اسلامیہ بہار شریف اور مدرسہ انوار العلوم گیا‘‘ کے ذریعے اپنے فیوض پھیلائے، تدریس کا انداز نرالا تھا، اس وصف سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے، مناظرے میں برجستہ جواب سے مقابل کو خاموش کردیتے تھے، اسلامی تعلیم کے سلسلے میں نہایت ہی معتدل انقلابی نظریہ رکھتے تھے، موصوف کی ظاہری شکل وصورت کو دیکھ کر کوئی متاثر نہ ہوتا تھا؛ لیکن گفتگو کے بعد مرعوب اور گرویدہ ہوجاتا تھا، زبان میں لکنت کے باوجود تقریر ایسی کرتے ہیں کہ اہلِ علم سامعین صدائے آفریں بلند کیے بغیر نہ رہتے، موصوف کی بے لوث تعلیمی، تدریسی، تصنیفی اور ملی خدمات تاریخِ ہند کے صفحات پر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں، اگر موصوف کے انقلابی تعلیمی نظر پر ٹھیک ٹھیک عمل ہوتا تو آج مدارس اسلامیہ کی زبوں حالی دیکھنے کو نہ ملتی۔

۞۞

مصادر ومراجع

(۱) محاسنِ سجاد، ص:۴۰، الہلال بک ایجنسی۔

(۲) محاسن سجاد، ص:۲۳)

(۳) محاسن سجاد، ص:۵۔

(۴) حضرت استاذ کی یاد: مولانا عبدالصمد رحمانی، ص:۳۱، ۳۷۔

(۵) محاسن سجاد، ص:۳۲۔

(۶) حضرت استاذ کی یاد، ص:۳۷۔

(۷) محاسن سجاد، ص:۱۲، ۱۳۔

(۸) محاسن سجاد، ص:۲۰۔

(۹) حضرت استاذ کی یاد، ص:۳۰۔

(۱۱) حضرت استاذ کی یاد، ص:۳۰۔

(۱۲) محاسن سجاد، ص:۵۔

(۱۳) محاسن سجاد، ص:۲۲۔

(۱۴) محاسن سجاد، ص:۳۲۔

(۱۵) محاسن سجاد، ص:۳۱۔

(۱۶) محاسن سجاد، ص:۳۲۔

(۱۷) تفصیل کے لیے دیکھیے: محاسن سجاد، ص:۲۰، ۲۱۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی
تدریسی خدمات، امتیازات وخصوصیات

مفتی اختر امام عادل قاسمی
مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف، سمستی پور (بہار)

حضرت مولانا محمد سجادؒ کی علمی خدمات کا سب سے اہم ترین باب زندگی کا وہ حصہ ہے، جو مدارس میں طلبہ کی تعلیم وتدریس میں گذرا اور یہ حصہ آپ کی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اسی دورانیہ میں آپ کے علم میں پختگی اور مطالعہ میں وسعت پیدا ہوئی، مختلف سوالات وجوابات کے تجربات ہوئے، نئے حالات ومسائل سے آگاہی ہوئی، یہیں سے آپ کو کام کرنے والے افراد کی ٹیم میسر ہوئی، ملک کے علماء واعیان سے آپ کے روابط قائم ہوئے، عوام میں آپ کی علمی وانتظامی صلاحیتوں کا تعارف ہوا اور عوامی اعتماد کی راہ ہموار ہوئی، لکھنے پڑھنے کے مواقع حاصل ہوئے، جن سے آپ کے علمی ذخائر وجود میں آئے، غرض آپ کی علمی، فکری، ملی اور سیاسی شخصیت کی تعمیر میں مدارس میں گذرے ہوئے لمحات کا بڑا حصہ ہے اور کسی بھی عالم دین کے لیے علمی وملی سیادت کے مقام تک پہونچنے کے لیے اس سے بہتر اور معتبر راستہ کوئی نہیں ہے۔

ایک بڑی غلطی:

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب شخصیت بڑی ہوجاتی ہے اور اس کا حلقۂ اثر وسیع ہوجاتا ہے تو قافلہ میں شامل ہونے والے نئے شہسوار پرانے خون کو نظر انداز کردیتے ہیں اور شخصیت جہاں سے بن کر آتی ہے، اسی کو فراموش کردیا جاتا ہے، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کے ساتھ بھی یہی ہوا، ان کی ساٹھ (٦٠) سالہ مختصر سی زندگی کا بڑا عرصہ مدارس میں گذرا ہے، وہ خالص علمی اور درسی آدمی تھے، ان کو پڑھنے پڑھانے میں جو لذت ملتی تھی، وہ کہیں میسر نہ تھی، مدرسہ ہی میں انہوں نے پڑھا، یہیں کی چٹائیوں پر ان کی شخصیت تیار ہوئی، یہیں سے پڑھے ہوئے طلبہ نے ہر میدان میں ان کی جانشینی کی؛ لیکن ان کی بیس بائیس (۲۲) سالہ ملی وسیاسی زندگی کو جس قدر اہمیت دی گئی اور لکھنے والوں نے جس تفصیل اور تسلسل سے اس پر روشنی ڈالی کہ تاریخ کی نگاہ میں یہی زندگی ان کی اصل زندگی سمجھی جانے لگی اور مدارس دینیہ میں گذرے ہوئے

لمحات تاریکی میں چلے گئے، جیسے وہ عہد طفولیت ہو اور یہ عہد شباب، وہ عہد ظلمت ہو اور یہ عہد نور اور وہ دور جاہلیت ہو اور یہ دور شعور، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے ہر قسم کے شباب ونور وشعور کی پرورش وپرداخت مدارس ہی کے ماحول میں ہوئی، ہر رنگ یہیں پیدا ہوا اور ہر بلندی تک پہونچنے کی گذرگاہ یہی رہے ہیں۔

تدریسی ادوار:

مولانا محمد سجادؒ کی تدریسی زندگی کو تین (۳) ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

☆ تدریس بہ عہد طالب علمی- زمانہ قیام الہ آباد

(۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء تا ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء- چار (۴) سال)

☆ تدریس بہ عہد ملازمت تدریس- زمانۂ قیام بہار شریف والہ آباد

(۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء تا ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء- سات (۷) سال)

☆ تدریس بہ عہد اہتمام- زمانۂ قیام گیا

(۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء تا ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء- دس (۱۰) سال)

علماء میں بہت کم ایسے خوش نصیب لوگ ہوئے ہیں، جن کی زندگی میں یہ تینوں ادوار جمع ہوئے ہوں، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے بہت مختصر زندگی پائی؛ لیکن ان کی زندگی کے دوسرے حصوں کی طرح ان کی تدریس میں بھی کافی تنوعات پائے جاتے ہیں۔

تدریس بہ عہد طالب علمی:

(۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء تا ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء- چار (۴) سال)

زمانۂ طالب علمی مدرسہ سبحانیہ الہ آباد:

مولانا محمد سجاد صاحبؒ مدارس کے جس دور کی پیداوار ہیں اس دور میں ذہین طلبہ سے نیچے کے طلبہ کی تدریس کا کام لیا جانا ایک عام سی بات تھی، خود مولانا محمد سجاد صاحبؒ بھی ایک عرصہ تک طالب علم اساتذہ (مولانا مبارک کریم صاحبؒ اور مولانا سید عبدالشکور صاحبؒ وغیرہ) سے پڑھ چکے تھے؛ لیکن مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے زمانہ طالب علمی ہی میں جس تدریسی مہارت ومقبولیت کا مظاہرہ کیا، وہ عام بات نہیں تھی۔

مولانا محمد سجادؒ کی تدریس کا آغاز الہ آباد میں مدرسہ سبحانیہ کی عہد طالب علمی سے ہوا، جس کے کچھ احوال آپ کی عہد طالب علمی کے بیان میں آچکے ہیں، اس عہد کا آنکھوں دیکھا حال آپ کے تلامذہ میں مولانا اصغر حسین صاحب بہاری نے بیان کیا ہے، مولانا کی تدریسی صلاحیت

کا جوہر اسی زمانے میں سامنے آنے لگا تھا، جس شہر میں حضرت مولانا عبدالکافی الہ آبادیؒ، حضرت مولانا عبدالحمید جونپوریؒ، حضرت مولانا منیرالدین الہ آبادیؒ اور استاذ القراء حضرت حافظ قاری عبدالرحمٰن مہاجر مکیؒ جیسے اساتذۂ فن موجود ہوں، وہاں ایک طالب علم کے اسلوب تدریس اور طریقہ تفہیم کو ایسی قبولیت حاصل ہونا کہ اساتذہ کے بجائے طلبہ اپنی کتابیں اسی طالب علم سے پڑھنے کی تمنا کرنے لگیں، یہ بجائے خود علمی تاریخ میں ایک عظیم واقعہ ہے اور اس کو مولانا سجاد کی کرامات وخصوصیات میں شمار کیا جانا چاہئے، مولانا اصغر حسین صاحبؒ کے الفاظ میں:

''اس کشش سے ظاہر ہے کہ طلب علم ہی کے زمانہ سے آپ کی تعلیم میں مقناطیسی اثر تھا''۔ (محاسن سجاد ص ۱۷)

مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں مولانا محمد سجادؒ کا داخلہ ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں ہوا تھا؛ لیکن ظاہر ہے کہ پہلے ہی سال ان کی اس صلاحیت کا جوہر سامنے نہیں آیا ہوگا اور نہ تدریس کے مواقع میسر آئے ہوں گے، مولانا اصغر حسین صاحب نے ۱۹۰۲ء مطابق ۱۳۲۰ھ کے واقعات لکھے ہیں؛ لیکن اندازہ یہ ہے کہ مولانا سجاد کو یہ موقعہ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء ہی سے مل گیا ہوگا۔

ممتاز تلامذہ:

اس دور کے تلامذہ میں مولانا فرخند علی سہسرامیؒ بانی ومہتمم مدرسہ خیریہ سہسرام، (مولانا فرخند علی سہسرامیؒ سیاسیات میں تاحیات اپنے استاذ محترم حضرت مولانا محمد سجادؒ کے دست وبازو رہے، افکار سجاد کی توسیع واشاعت میں آپ کا بڑا حصہ تھا۔) مولانا حافظ عبدالرحمٰن بادشاہ پوری جون پوریؒ سابق صدرالمدرسین مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور جناب حکیم مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ساکن کڑا (گیا) قابل ذکر ہیں۔ (محاسن سجاد ص ۱۸)

تدریس به عهد ملازمت تدریس:

(۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء تا ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء- سات (۷) سال)

مدرسہ سبحانیہ الہ آباد سے سند فراغت اور دستار فضیلت لے کر ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں مولانا محمد سجاد صاحب اپنے وطن واپس تشریف لے آئے، اس وقت تک الہ آباد سے آنے جانے والے طلبہ اور دیگر واردین وصادرین کے ذریعہ آپ کی علمی وتدریسی صلاحیت کی گونج آپ کے اساتذہ کے کانوں تک بھی پہونچ چکی تھی، علاقہ کو ایسے عالم ومدرس کی سخت ضرورت تھی۔

مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں تقرر:

چنانچہ حکیم سید وحید الحق صاحبؒ ناظم مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کی خواہش

اورمولانا مبارک کریم صاحب مدرس اول مدرسہ اسلامیہ کے ایما پرآپ علاقہ کی سب سے مرکزی درسگاہ ''مدرسہ اسلامیہ بہار شریف'' سے وابستہ ہوگئے۔(۱) یہاں کے بزرگوں سے آپ کے خصوصی مراسم کے علاوہ یہ مدرسہ آپ کی مادر علمی بھی تھا، اس کے بانی حضرت مولانا سید وحید الحق استھانویؒ (متوفی ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء) آپ کے استاذ خاص اور خسر محترم تھے، انہوں نے بڑی شفقت ومحبت کے ساتھ عہد طفلی میں آپ کی تربیت کی تھی، یہ مدرسہ ان کی یادگار تھا؛ اس لیے اس مدرسہ کا آپ پر حق بنتا تھا کہ آپ اس کی خدمت کریں۔

☆ نیز یہ وطن سے قریب تھا، والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ چکا تھا، شادی کے بعد اہل وعیال کی ذمہ داری بھی آ گئی تھی، گھر سے قریب رہ کران ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا جاسکتا تھا، انہی وجوہات سے مولانا محمد سجاد نے مدرسہ اسلامیہ میں خدمت کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا۔(۲)

مدرسہ اسلامیہ میں ایک نئے تعلیمی دور کا آغاز:

مولانا محمد سجادؒ کے آتے ہی مدرسہ نے ایک نئی کروٹ لی، بقول مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ:

''اس وقت مولاناؒ کی عمر صرف ۳۲ سال کی تھی؛ لیکن آتے ہی مدرسہ کا رنگ بدل گیا، طلبہ کا شوق، مدرسین کی جدوجہد، اور مقامی حضرات کی توجہ اور دلچسپی ہر چیز میں اضافہ ہوگیا''۔(۳)

اور آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا اصغر حسین صاحب کے الفاظ میں:

''مزاج کی نرمی، عفو ودرگذر کی طینت، اور طلبہ کی ہمدردی کے ساتھ جو اپنی طباعی اور انہما کی شان سے شب وروز درس وتدریس کی مہم شروع کی تو تھوڑے ہی عرصہ میں مدرسہ کے تعلیمی قالب میں نئی روح پھونک دی''۔(۴)

آپ نے تعلیمی نظام کی اصلاح پر پوری توجہ دی، طلبہ پر اجتماعی اور انفرادی دونوں سطح پر محنتیں کیں، کتاب کی تفہیم وتدریس کا وہ معیار اختیار کیا جو انہوں نے کانپور اور الٰہ آباد وغیرہ درسگاہوں میں دیکھا تھا، خود بھی مطالعہ کرتے اور طلبہ کو بھی مطالعہ کی عادت ڈلواتے، ان میں مشکلات کا مقابلہ کرنے کا عزم بیدار فرماتے، طریقۂ تفہیم میں ایسی شیرینی اور سحر کاری تھی کہ طلبہ آپ کے دلدادہ ہو جاتے تھے، اس طرح آپ کی توجہات عالیہ سے مدرسہ میں خوبصورت تعلیمی ماحول پیدا ہوگیا، طلبہ کا شوق فراواں دیکھ کر منتظمین کے حوصلے بلند ہوئے، مدرسہ کے تعلق سے عوامی اعتماد میں بھی اضافہ ہوا، ایک عرصہ دراز سے مدرسہ قائم تھا، کئی نسلیں ختم ہو چکی تھیں؛ لیکن اس کا معیار تعلیم شرح

وقایہ، جلالین اور قطبی و میر قطبی سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا، ملا حسن، رسالہ میر زاہد اور صحاح ستہ جیسی اعلیٰ کتابوں کی تعلیم کا تو یہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، طلبہ ٹھہرتے ہی نہیں تھے، بلکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کانپور اور دہلی کی راہ لیتے تھے۔

مدرسہ اسلامیہ کا عہد عروج :

مولانا محمد سجاد کی تدریسی مساعی اور ان کی شخصیت کی سحر کاری نے طلبہ کا دل جیت لیا اور نہ صرف یہ کہ طلبہ یہاں جمنے لگے؛ بلکہ دوسرے مدارس کو چھوڑ چھوڑ کر یہاں آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے منتہی درجات تک کی تعلیم ہونے لگی اور طلبہ یہاں سے سند فراغ بھی حاصل کرنے لگے۔ مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے الفاظ میں :

> ''یوں تو مدرسہ ایک عرصہ سے قائم تھا؛ مگر نہ کبھی طلبہ کی تعداد زیادہ رہی اور نہ کبھی جلالین، شرح وقایہ اور میر قطبی سے اونچے پڑھنے والے مدرسہ میں آئے؛ لیکن ایک ہی سال میں مولانا کے درس کا ایسا شہرہ ہوا کہ طلبہ جوق در جوق آنے لگے اور دوسرے ہی سال عربی کے نصاب کی آخری کتابیں ہونے لگیں''۔(۵)

مولانا اصغر حسین صاحب حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے اسی تدریسی عہد شباب کی یادگار ہیں، اپنا وہ دور یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''میں بھی میر زاہد رسالہ اور ترمذی شریف تک پہونچ گیا''۔(۶)

اسی زمانہ میں ایک بار مولانا محمد احسن استھانوی تلمیذ رشید مولانا ہدایت اللہ خان صاحبؒ مدرسہ میں امتحان کے لئے تشریف لائے، جو کسی زمانہ میں یہاں مدرس اول رہ چکے تھے، ان کے پاس جب طلبہ (مولانا اصغر حسین اور مولانا عبدالرحمٰن جونپوری وغیرہ) رسالہ میر زاہد مع حاشیہ غلام یحییٰ بہاری لے کر امتحان دینے کے لیے پہونچے تو ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں، انہوں نے فرمایا کہ:

> ''آج عجیب منظر دیکھ رہا ہوں کہ بہار شریف میں ان کتابوں کے پڑھنے والے طلبہ موجود ہیں''۔(۷)

پھر انہوں نے اپنی منطقیانہ شان سے جو سوالات کئے اور ان طلبہ کی طرف سے ان کے جوابات دیئے گئے، اس نے ان کے تحیر کو انتہا تک پہونچا دیا۔

اسی دور میں مولانا سید شاہ محمد اسمعیل صاحب استاذ فقہ مدرسہ عالیہ کلکتہ بھی امتحان کے لیے بلائے گئے تھے، وہ ساری زندگی ان امتحانی مناظر کو فراموش نہ کر سکے، جب ادھر آتے، یا یہاں کا کوئی طالب علم مل جاتا، تو بہت لطف لے کر اس منظر کو بیان فرماتے تھے۔(۸)

امتحانی مظاہرے:

مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے ایک طرف تدریس اور طلبہ کے جمانے پر پوری توجہ دی، دوسری طرف ناظم صاحب اور مدرس اول مولانا مبارک کریم کے مشورہ سے طلبہ کے معیار تعلیم اور بدلے ہوئے ماحول سے عام مسلمانوں کو باخبر کرنے کا منصوبہ بنایا، وہ اس طرح کہ امتحان کے مواقع پر شہر کے معززین اور اصحاب علم کو مدرسہ میں مدعو کیا جائے، ان کے لیے ضیافت کا اہتمام ہو اور امتحانات ومناقشات کا سارا منظر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور عوام وخواص اپنی آنکھوں سے مدرسہ کی تعلیمی کارکردگی کا مشاہدہ کریں۔۔۔۔ چنانچہ اس منصوبہ کے بے شمار فوائد مرتب ہوئے، مدرسہ کی عظمت واہمیت کا احساس دلوں میں بیدار ہوا، لوگوں کی آمد ورفت سے مدرسہ میں چہل پہل رہنے لگی، اصحاب خیر مدرسہ کے تعاون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے، مدرسہ کی مالی حیثیت مستحکم ہوئی، اور لوگوں کی ضیافت (صرف چائے بسکٹ) پر جو معمولی اخراجات ہوتے تھے، اس سے کہیں زیادہ مالی منافع مدرسہ کو حاصل ہونے لگے، اس کا اثر اساتذہ کی تنخواہوں پر بھی پڑا، تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافے کئے گئے اور خوش دل مزدوروں نے جی جان لگا کر محنت کی اور مدرسہ اپنی تاریخ کے نقطۂ ارتقا پر پہونچ گیا، دستار بندی کے جلسے ہوئے اور فضلاء مدرسہ کے سروں پر دستار فضیلت باندھی گئی، درس نظامی کے فارغین کو سند تکمیل عطا کی گئی اور تعلیم میں بہار کے خود کفیل ہونے کی تاریخ ایک بار پھر رقم کی گئی۔(۹)

ایک جلسۂ دستاربندی:

اسی طرح کے ایک جلسہ دستار بندی میں دیگر بہت سے اکابر علماء کے علاوہ الہ آباد کے استاذ العلماء حضرت مولانا منیر الدین الہ بادیؒ (ناظم مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد وتلمیذ رشید حضرت علامہ مولانا احمد حسن کانپوریؒ) بھی بحیثیت مہمان خصوصی تشریف لائے، اور ان کے خادم کی حیثیت سے مولانا اصغر حسین صاحب (جو ان دنوں مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد میں زیر تعلیم تھے) بھی شریک ہوئے، وہ اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''بہار شریف میں مدرسہ قائم ہونے کے مدتوں بعد یہ پہلا زریں موقعہ تھا، جس میں درس نظامی کے فارغین کو سند تکمیل عطا ہوئی اور بیضاوی شریف میں امتحان لیے جانے کے بعد ان کے سروں پر دستار فضیلت باندھی گئی، اس جلسہ میں عمائدین شہر اور عوام بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوئے، یہ حضرت سجادؒ ہی کی محنت وکاوش وحسن تعلیم کا نتیجہ تھا، ۔۔۔خصوصاً عربی پڑھنے والے طلبہ بغیر کانپور، دہلی وغیرہ سے فراغت کئے ہوئے علماء معتبر

کی صف میں جگہ نہیں پاتے تھے، ایسی صورت میں طلبۂ عربی کو فراغت تک پہونچانا، یہ حضرت سجادؒ کی کرامت تھی"۔(۱۰)

ممتاز تلامذہ:

حضرت مولانا کے اس دور کے تلامذہ میں جناب مولانا اصغر حسین صاحب (۱۱) اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب جونپوریؒ، (۱۲) مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب بہاریؒ، (۱۳) اور مولانا شرافت کریم صاحب برادر خورد مولانا مبارک کریم صاحبؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔(۱۴)

مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں بحیثیت نائب صدر مدرس تقرر:

مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں مولانا سجاد صاحب کے قیام کو ابھی صرف تین (۳) سال ہوئے تھے کہ مولانا عبدالکافی الہٰ آبادیؒ نے اپنے مدرسہ کی شدید ضرورت کے پیش نظر آپ کو الہٰ آباد طلب فرمایا اور آپ تعمیل حکم میں الہٰ آباد تشریف لے گئے، یکم محرم الحرام ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۳؍فروری ۱۹۰۷ء کو مدرسہ سبحانیہ میں بحیثیت نائب مدرس اول (نائب صدر المدرسین) آپ کا تقرر عمل میں آیا۔(۱۵)

مدرسہ سبحانیہ میں آتے ہی براہ راست نائب صدرالمدرسین کے عہدہ پر تقرر بجائے خود آپ کی علمی قابلیت اور حضرت مولانا عبدالکافی الہٰ آبادیؒ کے نزدیک بے انتہا اعتماد و استناد کی دلیل ہے، مدرسہ سبحانیہ کی اس زمانہ میں جو شان تھی اور الہٰ آباد کی علمی تاریخ میں اس کا جو مقام رہا ہے، اس کے پیش نظر اسی مدرسہ کے ایک پروردہ طالب علم کا نائب صدر مدرس کے عہدہ پر راست فائز ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے،۔۔۔۔لیکن مولانا سجاد صاحب کا تدریسی جوہر چونکہ الہٰ آباد کے زمانہ طالب علمی میں سامنے آچکا تھا اور آپ کی تفہیم و تعلیم کا سکہ پڑھنے کے زمانے ہی میں بیٹھ چکا تھا؛ اس لیے کسی منتہی سے منتہی جماعت کی کتاب آپ کے حوالہ کرنے میں کسی تامل کی بات نہیں تھی؛ لیکن جہاں تک انتظامی صلاحیت کی بات ہے تو مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں جو خوشگوار تبدیلیاں آپ کے دم قدم سے پیدا ہوئی تھیں، مولانا عبدالکافی صاحب یقیناً ان سے بے خبر نہیں تھے اور مولانا کی طلبی کے پیچھے عجب نہیں کہ یہ بھی اس کا بھی دخل رہا ہو۔

بہر حال مولانا سجاد صاحب نے الہٰ آباد میں بھی اپنا کام اسی شان کے مطابق شروع کیا، جس کی آپ کے اساتذہ اور مدرسہ کے ذمہ داروں کو توقع تھی، تھوڑے ہی دنوں میں مدرسہ کی شہرت اور نیک نامی میں اضافہ ہوا اور طلبہ کا رجوع عام شروع ہو گیا، الہٰ آباد اور اطراف ہی سے

نہیں؛ بلکہ کانپور جیسے علمی مراکز سے بھی طلبہ مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد کی طرف رخ کرنے لگے اور یہیں سے سند فضیلت حاصل کرنے لگے۔ حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

''جب مولانا بہار شریف سے مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد تشریف لے گئے تو چند ہی دنوں کے بعد آپ کے درس کا ایسا چرچا ہوا کہ طلبہ کانپور چھوڑ کر الٰہ آباد آنے لگے، باوجودیکہ کانپور میں اچھے فضلاء موجود تھے''۔(۱۶)

یہی وہ دور ہے جب مولانا عبدالحکیم اوگانویؒ صاحب کانپور میں زیر تعلیم تھے اور مولانا کی شہرت سن کر الٰہ آباد چلے آئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں اس زمانے میں کانپور میں پڑھتا تھا، جب یہ معلوم ہوا کہ مولانا الٰہ آباد تشریف لے آئے ہیں تو میں کانپور سے الٰہ آباد چلا آیا اور مولانا کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہوگیا اور اپنی بقیہ کتابیں مولانا ہی سے تمام کیں، اس لیے آج مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں مولانا کا شاگرد ہوں اگرچہ حقیر اور کمترین ہوں''۔(۱۷)

مولانا عبدالحکیم صاحب نے کانپور سے قبل مولانا سجاد کا ذکر ضرور سنا ہوگا، شاید کہیں ملاقات بھی ہوئی ہو؛ لیکن آپ سے اخذ واستفادہ کا موقعہ غالبًا نہ ملا تھا؛ مگر جب وہ کانپور سے الٰہ آباد پہونچے اور مولانا محمد سجاد کی ہمہ گیر صلاحیت اور علم بیکراں کا مشاہدہ کیا تو محسوس ہوا کہ اگر وہ کانپور چھوڑ کر الٰہ آباد نہ آتے تو علم کے بڑے باب سے محروم رہ جاتے؛ اس لیے کہ:

''کانپور میں کوئی عالم آپ کے پایہ کا نہ تھا اور الٰہ آباد میں بھی بجز مولانا منیر الدین مرحوم الٰہ آبادی کے کوئی مدرس عالم آپ کا ہمسر نظر نہ آیا''۔(۱۸)

الٰہ آباد سے بہار شریف واپسی:

لیکن الٰہ آباد میں ابھی صرف چند ماہ ہوئے تھے کہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کی طرف سے آپ کی واپسی کا مطالبہ ہونے لگا؛ اس لیے آپ کی سعی جمیل سے مدرسہ کا جو تعلیمی معیار قائم ہوا تھا، وہ اضمحلال کا شکار ہونے لگا تھا، چنانچہ ذمہ داران مدرسہ کے بے حد اصرار پر چار (۴) ماہ کے بعد ہی آپ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف واپس تشریف لے آئے اور پھر ڈیڑھ سال یہاں خدمت انجام دی۔(۱۹)

دوبارہ بہار شریف سے الٰہ آباد:

ڈیڑھ سال کے بعد اہل الٰہ آباد کے مسلسل اصرار پر ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں آپ دوبارہ مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں اپنی ذمہ داریوں پر واپس تشریف لے آئے اور مسلسل ۱۳۲۹ھ

مطابق ۱۹۱۱ء تک یہیں خدمت انجام دی، اس دوران آپ نے انہی تعلیمی خطوط کو تسلسل بخشا، جو آپ نے ایک ڈیڑھ سال قبل قائم کئے تھے اور مدرسہ کی نیک نامی اور علمی مرکزیت کو اپنے نقطۂ عروج تک پہونچایا۔

الٰہ آباد میں آپ کا قیام تقریباً چار (۴) سال رہا، جو آپ کی تعلیمی و تدریسی زندگی میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے، الٰہ آباد میں آپ نے جملہ علوم وفنون کی کتابوں کا درس دیا، بالخصوص منطق وفلسفہ، بلاغت، علم ادب اور فقہ اسلامی میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ (۲۰)

الٰہ آباد میں کتب فقہ کی تدریس کے علاوہ کارافتا بھی آپ کے ذمہ تھا، مدرسہ سبحانیہ میں اسی دور کے طالب علم اور حضرت مولانا محمد سجاد کے شاگرد رشید مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کے بیان کے مطابق:

''اکثر دن کے کھانے کے بعد کتب خانہ میں جو دارالطلبہ کے نیچے کی منزل میں تھا، تشریف لے آتے اور اہم استفتاء کا جواب تحریر فرماتے تھے''۔ (۲۱)

اسلامی قانون کی تشریح وتفہیم میں آپ کو کمال حاصل تھا، فقہی مسائل میں الٰہ آباد میں آپ کو ایک مرجع کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی؛ اسی لیے جب آپ الٰہ آباد سے دائمی طور پر رخصت ہونے لگے تو عمائدین اور رؤساء شہر کی ایک بڑی جماعت اسٹیشن تک آپ کو رخصت کرنے کے لیے آئی اور ان میں سے ہر ایک کی زبان پر یہی جملہ تھا کہ:

''آج الٰہ آباد سے ''فقہ'' رخصت ہورہی ہے''۔ (۲۲)

آپ کے طرز تعلیم اور اسلوب درس سے متاثر ہوکر ایک شیعہ رئیس زادہ جناب زاہد حسین خان دریا آبادی (۲۳) بھی آپ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوگیا تھا، انگریزی اور علوم عصریہ سے وہ واقف تھا اور بڑی بڑی درسگاہوں کا تجربہ کر چکا تھا، مولانا سے ریاضی اور معقولات پڑھتا تھا اور بہت اہتمام اور عقیدت کے ساتھ حاضر ہوتا تھا۔ (۲۴) اس منظر کے عینی شاہد جناب قاری یوسف حسن خان صاحبؒ (جو اس وقت مدرسہ سبحانیہ میں زیر تعلیم تھے) لکھتے ہیں کہ:

''دوران قیام ایک شیعہ رئیس زادہ مولاناؒ سے ریاضی پڑھنے آتا تھا، وہ سارے ہندوستان کی خاک چھان چکا تھا؛ لیکن کہیں اس کی تشفی نہیں ہوئی، آخر میں وہ مولانا کے طریقہ تعلیم پر فریفتہ ہوگیا اور باوجود رئیس زادہ ہونے کے برابر مولانا ہی کی خدمت میں قیامگاہ پر تعلیم حاصل کرتا تھا اور اس کے والدین مولانا کو پچیس (۲۵) روپے دیا کرتے تھے، مولاناؒ اس سے روپے لے کر طلبہ کی ذات میں کل کا کل خرچ کر دیا کرتے تھے اور اپنے لیے ایک پیسہ بھی نہیں رکھتے تھے''۔ (۲۵)

الہ آباد میں آپ کی وجہ سے بہار کے طلبہ کی بڑی تعداد رہتی تھی، مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کے بقول:

''جب وہ کانپور سے الہ آباد حصول تعلیم کی غرض سے پہونچے تو ''مدرسہ سبحانیہ کا دارالطلبہ بہار کا ایک گاؤں معلوم ہوتا تھا''۔(۲۶)

ممتاز تلامذہ:

یہاں جن تلامذہ نے آپ سے فیض پایا ان میں حضرت مولانا عبدالحکیم اوگانویؒ، (۲۷) حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ (۲۸) اور مولانا قاری یوسف حسن خان صاحبؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔(۲۹)

تدریس به عهداهتمام - زمانۂ قیام گیا:

(۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء تا ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۳ء-بارہ (۱۲) سال)

الہ آباد سے گیا تشریف آوری:

تدریس کا تیسرا دور زمانۂ قیام گیا سے متعلق ہے اور مسلسل بارہ (۱۲) سالوں پر محیط ہے اور اس پورے دور میں مدرسہ کے اہتمام وانتظام اور دیگر کئی ملی وقومی ذمہ داریوں کے ساتھ مولانا سجادؒ نے درسی خدمات انجام دی ہیں، یہ بے حد ہما ہمی اور مصروفیت کا دور تھا، اسی دور میں مولانا سجاد کی ایک شخصیت سے دوسری شخصیت وجود میں آئی، یہ انقلابات کا دور تھا، ملک میں افراتفری مچی ہوئی تھی اور مولانا سجاد کے فکر وخیال میں بھی ارتعاش برپا تھا، ایک پرت سے دوسری پرت نکل رہی تھی؛ لیکن ان حالات میں بھی مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے اندر کا مدرس پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر تھا اور انہوں نے اپنا درسی اشتغال اور افرادسازی کا عمل برقرار رکھا تھا۔

الہ آباد چھوڑنے کے اسباب:

مولانا محمد سجاد صاحب نے الہ آباد کیوں ترک کیا؟ اور وہ کیا اسباب تھے، جن کی بنا پر وہ الہ آباد چھوڑنے پر مجبور ہوئے؟ ان کے کئی تلامذہ نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے:

☆ مولانا قاری حکیم یوسف حسن خان صاحب ان دنوں وہیں مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں زیر تعلیم تھے، انہوں نے اجمال کے ساتھ صرف اتنا لکھا ہے کہ:

''شروع رجب ۱۳۲۹ھ (مطابق ۱۹۱۱ء) میں مولانا مرحوم کو چند ناگزیر واقعات کی بنا پر الہ آباد چھوڑنا پڑا''۔(۳۰)

ممکن ہے کہ بعض خلاف مزاج واقعات سے مولانا کے دل پر چوٹ پہونچی ہو اور مدارس

کے کردار و معیار کے بارے میں آپ کو کچھ مایوسی ہوئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

☆ البتہ مولانا کے دوسرے تلمیذ مولانا عبدالصمد رحمانیؒ بھی ان دنوں الہ آباد میں ہی تھے، انہوں نے تھوڑی تفصیل کے ساتھ الہ آباد چھوڑنے کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، جس کا خلاصہ دو باتیں ہیں:

(۱) مولانا ہندوستان کے بدلتے پس منظر میں اپنے وسیع تر تعلیمی نظریات کے لئے کسی کھلی تجربہ گاہ کی ضرورت محسوس کرتے تھے، جہاں وہ خود اختیاری کے ساتھ اپنے افکار و نظریات کے تجربات کر سکیں اور روایت کے ساتھ جدت کے عملی نمونے پیش کر سکیں، یہ چیز ان کو الہ آباد میں میسر نہیں تھی۔

(۲) دوسرا سبب مدارس کی زبوں حالی اور علمی واخلاقی معیار کا روز بروز زوال تھا، بالخصوص بہار کے مدارس سب سے زیادہ گراوٹ کا شکار تھے، مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے مسلسل مدارس پر محنت کی تھی اور نسل نو کی تعمیر میں اپنا خون جگر صرف کیا تھا، لیکن مادیت کے غلبہ اور نئے تعلیمی نظام کے نفوذ کی وجہ سے مدارس کو اب نئے امکانات کی تلاش پر بھی توجہ دینے کی ضرورت تھی۔

مولانا عبدالصمد رحمانی صاحبؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ کئی بہاری طلبہ مولانا کو ایک معیاری اور نمونہ کا مدرسہ قائم کرنے مشورہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ جب تک نمونہ عمل کے طور پر آپ کوئی مدرسہ قائم نہیں کریں گے، آپ کے تعلیمی نظریات کی افادیت سامنے نہیں آسکے گی اور نہ مدارس کے نظام میں انقلاب کی روح پھونکی جا سکے گی، قدرتی طور پر مولانا اس قسم تقاضوں سے متاثر ہوئے اور تعلیمی میدان میں عملی اقدامات کا فیصلہ فرمایا۔ (۳۱)

☆ مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اس انقلاب کے پیچھے ان عالمی اور ملکی احوال واطلاعات کا دخل تھا، جو حضرت مولانا کے انگریزی داں شاگرد (زاہد حسین خان) کے ذریعہ آپ کو پہونچتی تھیں، وہ انگریزی اخبارات برابر لا کر سناتے تھے، جن میں ممالک اسلامیہ کے بارے میں بے حد تشویشناک خبریں ہوا کرتی تھیں، جن سے مولانا کے دل ودماغ بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے، اسی تاثر نے مولانا کے غور و فکر کے موضوع کو بدلا اور بال و پر کے لیے ایک آزاد آب و ہوا کی تلاش ہوئی، جہاں نئی فکر، نئی ترتیب اور نئے اعتماد کے ساتھ تعلیمی وتربیتی سفر کا آغاز کیا جا سکے اور یہی ضرورت ان کو الہ آباد سے گیا (بہار) لے گئی۔ (۳۲)

فکروعمل کے ایک جامع مرکز کا منصوبہ:

یعنی صرف روایتی مدرسہ کے لئے آپ نے الہ آباد ترک نہیں کیا؛ بلکہ ایک ایسے مدرسہ

کا منصوبہ لے کر آپ وہاں سے اٹھے، جو ہر طرح کی دینی، ملی، قومی اور سیاسی تحریکات کا مرکز بننے کی صلاحیت رکھے، جو ملک وملت کو ہر صلاحیت کے افراد دے سکے، جو صرف روایتی تعلیم گاہ نہ ہو؛ بلکہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے لیے مناسب افراد وشخصیات تیار کرنے کا کارخانہ ہو، مولانا الٰہ آباد سے اسی عزم کے ساتھ اٹھے، یہ محض ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسہ کی طرف منتقلی نہیں تھی؛ بلکہ تاریخ کے ایک دور سے دوسرے دور کی طرف انتقال اور ماضی سے مستقبل کی طرف کا ایک سفر ارتقا تھا۔

۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء کے رجب کا آغاز تھا جب استاذ محترم حضرت مولانا عبد الکافی الٰہ آبادیؒ کے مشورہ اور اجازت سے آپ نے الٰہ آباد ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔ (۳۳)

مگر گیا جانے سے قبل آپ نے پہلے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک دونفری وفد وہاں روانہ فرمایا، جس میں آپ کے دو تلامذہ مولانا عبد الصمد رحمانیؒ اور مولانا احمد اللہ صاحب آبگلویؒ شامل تھے، ان حضرات نے پورے شہر کا دورہ کیا، ایک ایک محلے میں گئے، خواص اور رؤسائے شہر سے ملاقاتیں کیں، مولانا کے منصوبوں سے ان کو آگاہ کیا، ان کی آراء اور ممکنہ تعاون کا جائزہ لیا اور بالآخر ایک مکان کو مناسب سمجھ کر اس پر نشان انتخاب ڈال دیا اور وہیں سے مولانا کو (غالبًا ڈاک سے) تحریری رپورٹ ارسال کی، رپورٹ ملنے کے پندرہ بیس (۲۰) دن کے بعد حضرت مولانا سجاد کے قافلہ نے جس میں بہار کے پندرہ بیس طلبہ بھی شامل تھے الٰہ آباد سے گیا کی طرف کوچ کیا، الٰہ آباد اسٹیشن پر آپ کو الوداع کہنے والوں کا بڑا ہجوم تھا، جس میں خاصی تعداد شہر کے رؤساء اور عمائدین کی تھی، سب نے نم آنکھوں کے ساتھ آپ کو رخصت کیا اور آپ اوائل شعبان ۱۳۲۹ھ مطابق اگست ۱۹۱۱ء میں بذریعہ ٹرین شہر گیا جلوہ افروز ہوئے۔ (۳۴)

گیا کا تاریخی پس منظر:

''گیا'' بہار کا انتہائی قدیم تاریخی اور افسانوی اہمیت کا حامل شہر ہے، اس کا ذکر ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں رامائن اور مہابھارت وغیرہ میں بھی ملتا ہے، یہ بہار کے بڑے سیاحتی مقامات میں سے ایک ہے، گیا بہار کا دوسرا بڑا شہر ہے، جس کی آبادی 470، 839. دریائے فالگو کے کنارے پر واقع (یا نرنجانا، جیسا کہ رامائن میں ذکر کیا گیا ہے) جین، ہندو اور بودھ تینوں مذاہب کے لئے ایک مقدس مقام کا درجہ رکھتا ہے، یہ تین جانب میں چھوٹی پہاڑیوں (منگلا-گوروری، شرپرا-شانان، رام- شیہ اور برہمونی) سے گھرا ہوا ہے، اور چوتھی (مشرقی) سمت میں دریائے فالگو ہے، شہر قدرتی مناظر اور خوبصورت عمارات سے آراستہ ہے۔ (۳۵)

ذرا تاریخ میں اور پیچھے کی طرف جائیں تو گیا دنیا بھر میں لوگوں کے لیے جیاہ حج کی جگہ تھی

اور ہندوستانی برصغیر کی سرحدوں سے بھی پرے وسیع علاقوں پر مشتمل تھا، اس مدت میں گیا مگڑ علاقے کا حصہ تھا، مایا میگڑ علاقہ سے بہت سے راجاؤں کے عروج وزوال کی داستانیں وابستہ ہیں، چھٹی صدی قبل مسیح سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک اس پورے خطے کا ثقافتی تاریخ میں ایک اہم مقام رہا ہے، تہذیبی تاریخ میں ایک اہم جگہ حاصل کرنے کے بعد، بی بسارا کے دور میں گوتم بدھ اور بھجن مہاویر نے اس علاقے کو اپنی رزمگاہ بنایا، نالندہ خاندان کی مختصر حکمرانی کے بعد گیا اور پورے مگدھ کا علاقہ بدھ مت کے اشوک (272 قبل مسیح - 232 ق م) کے ساتھ موریان کی حکومت کے تحت آ گیا۔۔۔۔گپت سلطنت کے دوران گیا بہار کا ہیڈ کوارٹر تھا، پھر گیا پالا سلطنت کا حصہ بن گیا، مورخین کا خیال یہ ہے کہ بوہیا کا موجودہ مندر گوپال کے بیٹے دھرمپل کے دور میں تعمیر کیا گیا تھا۔

بارہویں صدی عیسوی میں محمد بختیار خلجی نے حملہ کیا اور یہ مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔(۳۶)

گیا کا انتخاب:

اس تاریخی پس منظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ گیا کو بین الاقوامی شہر کی حیثیت حاصل رہی ہے اور آج بھی یہ شہر اپنی اہمیت برقرار رکھنے کی پوری جدوجہد کر رہا ہے، بہار کا انٹرنیشنل ایرپورٹ بھی اسی شہر میں واقع ہے، ایک سیاحتی شہر کی حیثیت سے اس کی بین الاقوامی حیثیت آج بھی قائم ہے، دنیا کے مختلف ملکوں کے سیاح یہاں آتے ہیں، خاص طور پر برما، جاپان اور چائنا کے لوگوں کی توجہات کا یہ مرکز ہے، یہ شہر آج بھی بہت سی سہولیات سے مالا مال ہے، جو بہار کے دوسرے شہروں میں میسر نہیں ہیں۔۔۔۔اور عجب نہیں کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے انہی وجوہات سے اپنی تعلیمی، ملی، دینی اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے اس بین الاقوامی شہر کا انتخاب کیا ہو اور وہ گیا میں نالندہ کی تاریخی یونیورسیٹی کے طرز کا کوئی عالمی ادارہ قائم کرنے کے آرزومند ہوں۔(۳۷)

گیا کے بعض مدرسے:

گیا میں بعض مدارس اسلامیہ مولانا سجاد کی آمد سے پہلے سے بھی قائم تھے، مثلاً:

مدرسہ (قاسمیہ) اسلامیہ:

☆ حضرت مولانا عبدالغفار خان سرحدیؒ (متوفی ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء) خلیفۂ ارشد قطب العالم حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ نے ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء سے قبل ایک مدرسہ ''مدرسہ اسلامیہ'' کے نام سے قائم کیا تھا، جو آپ کے داماد حضرت مولانا سید خیرالدین گیاویؒ (متوفی ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء) کے عہد اہتمام میں مدرسہ قاسمیہ اسلامیہ کے نام سے

مشہور ہوا۔(۳۸) یہ مدرسہ مولانا محمد سجاد صاحبؒ کی گیا تشریف آوری کے زمانہ میں جاری تھا؛ لیکن کسی بلند حیثیت کا حامل نہیں تھا۔

مدرسہ انوارالعلوم (بناء اول):

☆ اسی طرح ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں مولانا محمد سجادؒ کے ہم وطن اور استاذ مشہور منطقی عالم دین شمس العلماء حضرت مولانا عبدالوہاب فاضل بہاریؒ نے بھی قاضی فرزند احمد صاحب رئیس گیا کے تعاون سے قاضی صاحب کے صاحبزادے قاضی انوار احمد مرحوم کے نام پر ''مدرسہ انوارالعلوم'' کی بنیاد ڈالی تھی، جس کے سالانہ جلسہ میں مولانا عبدالوہاب صاحب کی دعوت پر علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا عبدالحق حقانی دہلویؒ جیسے مشاہیر ہند تشریف لا چکے تھے۔(۳۹)

لیکن ایک دوسال کے بعد ہی مولانا عبدالوہاب بہاریؒ کے چلے جانے کے بعد وہ مدرسہ بند ہوگیا تھا، ظاہر ہے کہ ایک دوسال کے عرصہ میں مدرسہ کی اپنی عمارت ہونے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، لگتا ہے کہ مدرسہ کسی عارضی عمارت میں رہا ہوگا، جو بند ہونے کے بعد صاحب ملکیت کے پاس واپس چلی گئی۔(۴۰)

غرض مولانا محمد سجاد صاحبؒ کی گیا تشریف آوری کے وقت یہاں کوئی بھی قابل ذکر مدرسہ موجود نہیں تھا اور غالباً آپ نے اپنی آمد سے قبل جو وفد یہاں بھیجا تھا، اس کا مقصد حالات کا جائزہ لینے کے ساتھ مدارس کی صورت حال اور کسی نئے مدرسہ کی فی الواقع ضرورت کا پتہ لگانا بھی تھا۔ مولانا زکریا فاطمی ندوی صاحبؒ رقمطراز ہیں:

> ''المختصر جس وقت آپ تشریف لائے، گیا میں کوئی مدرسہ نہیں تھا اور ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ کوئی عربی درسگاہ جاری کی جائے''۔(۴۱)

مدرسہ انوارالعلوم گیا کا احیا:

حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے نئے نام سے کوئی مدرسہ قائم کرنے کے بجائے مناسب محسوس کیا کہ حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب والے مدرسہ ہی کا احیا کیا جائے، مدرسہ تو ختم ہو چکا تھا، نہ اس کی کوئی عمارت تھی اور نہ اس کا بچا ہوا کوئی اثاثہ، البتہ مدرسہ کا نام ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے محو نہیں ہوا تھا، اس نام نے ایک زمانہ میں لوگوں کا کافی اعتماد سمیٹا تھا؛ اس لیے اس نام کو دوبارہ زندہ کرنے سے قدیم مخلصین ومعاونین بھی خوشی محسوس کریں گے۔

☆ نیز اس نام پر اس سے قبل ملک کے مشاہیر کی تشریف آوری ہو چکی تھی؛ اس لیے یہ نام ان کے ذہنوں کے کسی گوشہ میں بھی ضرور محفوظ ہوگا اور اس سے مدرسہ کی تشہیر واشاعت میں

مدد ملے گی۔

☆ ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ یہ نام ملک کے ایک شمس العلماء کا تجویز کردہ تھا، جو حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے استاذ بھی تھے اور ہم وطن بھی۔

☆ اور غالباً اس نام کو باقی رکھنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوا کہ جب حضرت مولانا سجاد صاحبؒ قیام مدرسہ کے ارادہ سے گیا تشریف لائے تو یہاں کے مقامی لوگوں میں سے جن خاص لوگوں نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا، ان میں قاضی احمد حسین صاحب کی شخصیت سرفہرست تھی، (۴۲) قاضی صاحب کی ایک خالہ جو نیک کاموں میں دل کھول کر خرچ کرتی تھیں اور مخیّرہ ہونے کی وجہ سے سرکار عالیہ کہلاتی تھیں، قاضی صاحب کی سفارش پر انہوں نے ایک بڑی رقم مدرسہ کھولنے کے لیے عنایت کی، سرکار عالیہ کو کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، قاضی فرزند احمد صاحب کے اکلوتے صاحبزادے قاضی انوار احمد صاحب (جن کا ذکر اوپر آیا) ان کے داماد تھے اور عین جوانی میں دو بچوں کو یتیم چھوڑ کر انتقال کر چکے تھے، ممکن ہے کہ سرکار عالیہ کی خواہش رہی ہو کہ میرے داماد کا نام زندہ رہے۔

یہ بات خود قاضی احمد حسین صاحبؒ کی سوانح حیات ''حسن حیات'' میں ان کے پھوپھی زاد بھائی شاہ محمد عثمانی صاحبؒ مہاجر مکی نے لکھی ہے، (۴۳) اس سے قبل حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب بہاریؒ کا تعاون بھی قاضی انوار احمد مرحوم کے والد قاضی فرزند احمد صاحب نے کیا تھا اور اب مولانا محمد سجاد صاحبؒ کو بھی اسی کام کے لیے قاضی انوار احمد کی خوشدامن صاحبہ خطیر تعاون پیش کر رہی تھیں؛ اس لیے قدرتی طور پر وہی قدیم نام ''انوار العلوم'' باقی رکھنا ہر لحاظ سے قرین مصلحت تھا۔

غرض یہ نام برکتوں اور دینی و دنیوی منافع سے خالی نہیں تھا، بس مولانا سجاد صاحب نے اسی نام سے شعبان المعظم ۱۳۲۹ھ مطابق جولائی ۱۹۱۱ء میں ایک نئے ادارہ کی بنیاد ڈالی، کرایہ پر ایک دومنزلہ مکان ''ظفر منزل'' کے سامنے مولانا سجاد صاحب کی آمد سے قبل ہی لے لیا گیا تھا، یہی دارالاقامہ بھی تھا اور یہی درسگاہ بھی۔۔۔ آپ نے ایک شاندار افتتاحی اجلاس کے ذریعہ مدرسہ کا آغاز فرمایا، جس میں اپنے استاذ و مربی حضرت مولانا عبدالکافی الہ آبادی علیہ الرحمہ کو بھی مدعو فرمایا۔ (۴۴)

بے مثال صبر وایثار:

مولانا نے مدرسہ کی تعمیر و ترقی کے لئے بے پناہ محنت کی، الہ آباد کی آمدنی سے جو کچھ بچا تھا

سب مدرسہ کے طلبہ پر خرچ کردیا، اس کے بعد فاقہ تک کی نوبت آگئی؛ مگر نہ مولانا کے پائے استقلال میں فرق آیا اور نہ آپ کی برکت سے طلبہ مایوس ہوئے، مدرسہ کے ابتدائی دور میں بڑے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا اور سخت تکلیفیں اور صعوبتیں اٹھانی پڑیں، بقول مولانا عبدالحکیم صاحب اوگانویؒ:

''یہ ایک داستان لرزہ خیز اور حیرت انگیز ہے، جن کو کچھ میں ہی جانتا ہوں؛ کیوں کہ میں مولانا کا رفیق اور ساتھی تھا''۔(۴۵)

مولانا عبدالصمد رحمانی صاحب بھی یہاں شریک کار رہے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ:

''یہاں پہونچ کر قیام کے بعد سب سے پہلا اہم مسئلہ طعام کا تھا، جس کا حل یہ کیا گیا کہ جس کے پاس جو کچھ تھا، وہ سب ایک جگہ جمع کردیا گیا اور اسی سے قوت لا یموت کا یہ انتظام کیا گیا کہ اکثر کھچڑی اور کبھی صرف خشکہ پکا لیا جاتا تھا اس کو سرخ مرچ کے بھرتہ کے ساتھ جو آگ پر بھون لی جاتی تھی اور اس میں نمک ملا دیا جاتا تھا مولانا ایک دسترخوان پر بلاتکلف طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیتے تھے، اور مولانا کی پیشانی پر کبھی شکن بھی نہیں پڑتی تھی، مجھ کو یاد ہے کہ ایک عید ایسی بھی گذری تھی کہ مولانا مدرسہ کی ضرورت سے کہیں باہر تشریف لے گئے تھے، اس روز کھانے کا کوئی سامان نہ تھا، صرف چند سیر گیہوں تھے، ان ہی کو بھون کر صوم عید کی حرمت سے گلو خلاصی کرکے صبر وشکر کے ساتھ عید کا دوگانہ ادا کیا گیا تھا۔ ان غیر معمولی حالات میں مولانا کو میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ اس رنج ومحن کے کٹھن ایام میں کبھی مایوس ہوئے ہوں، یا یہ کہ ان کو کبھی خیال ہوا ہو کہ بیٹھے بٹھائے کیوں اللہ آباد کی طمانیت کی خوش عیش اور خوشگوار زندگی کو چھوڑ کر اس دردسر کو خریدا، مولانا ہمیشہ پر امید رہتے تھے اور طلبہ کو بھی پر امید رکھتے تھے، مشکلات سے نہ گھبراتے تھے، نہ کام کے ہجوم سے پریشان ہوتے تھے، ان ایام میں وہ تنہا سب کام انجام دیتے تھے، خود ہی مدرسہ کے مہتمم بھی تھے، مدرس بھی تھے، سفیر بھی تھے اور طلبہ کے اتالیق بھی تھے اور ان کے غمگسار اور مربی بھی تھے''۔(۴۶)

فتوحات کا آغاز:

آخر مولانا کی محنت رنگ لائی، آپ کی امیدوں کے شجر ہرے ہونے لگے، خزاں کے دن رخصت ہونے لگے، بہار کی ہوائیں چلنے لگیں اور آپ کے صبر واخلاص کی گرمی نے اس سنگلاخ شہر کا جگر پگھلا کر رکھ دیا، شہر کے عمائدین متوجہ ہوئے، ہر طرف سے مدرسہ کو تعاون ملنے لگا، مسماۃ

بی بی مریم صاحبہ دختر مرزا دوست محمد دیوان ریاست ٹکاری گیا نے زمین، کئی مکانات اور جائیدادیں مدرسہ کے لئے وقف کیں، جس سے مدرسہ میں کافی سہولتیں پیدا ہوگئیں، مولانا طلبہ کے ساتھ کرایہ کے مکان سے منتقل ہوکر موقوفہ مکانات میں چلے آئے۔(۴۷)

اس کے بعد مولانا نے معقول سرمایہ کا انتظام کر کے اینٹ کا بھٹہ لگوایا اور احاطہ باغ (محلّہ معروف گنج) میں تعمیری کام کا آغاز فرمایا۔ تعمیر کے دوران رات میں مولانا طلبہ کے ساتھ خود اینٹیں ڈھوڈھوکر مقام تعمیر تک پہونچاتے تھے، تاکہ مدرسہ زیادہ زیر بار نہ ہو، نیز تعمیری کام جلد مکمل ہوسکے، طلبہ میں بھی بڑا جوش وخروش تھا، ہر طالب علم بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا اور اس کو اپنے لیے سعادت تصور کرتا تھا۔(۴۸)

منتھی درجات تک تعلیم:

تعمیرات کے ساتھ مولانا نے اس مدرسہ کی علمی بنیادیں بھی مستحکم کیں، ایک ہی چھت کے نیچے ابتدائی درجہ سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہونے لگی، قریب وبعید کے طالبان علوم نبوت کا رجوع عام ہوگیا، صرف بہار ہی نہیں؛ بلکہ ملک کے دوسرے صوبوں سے بھی تشنگان علم وفن کی قطار لگ گئی اور جس عظیم اسلامی یونیورسیٹی کا آپ نے خواب دیکھا، اس کا نقشہ سامنے آنے لگا، مدرسہ کے بڑے بڑے جلسے ہونے لگے، جس میں ملک کی ممتاز شخصیتوں کی شرکت ہوتی تھی اور فضیلت حاصل کرنے والے طلبہ کو دستار بھی عنایت کی جاتی تھی اور سند بھی۔(۴۹)

ملی، تعلیمی وقومی تحریکات کا مرکز:

علاوہ اس مدرسہ کی بڑی خصوصیت، جس میں برصغیر کے کم مدارس اس کی ہمسری کرسکیں گے، یہ تھی کہ حضرت مولانا محمد سجاد کی اکثر دینی، ملی، قومی اور سیاسی تحریکات کی جائے پیدائش یہی ہے، فکر سجاد کی نشو ونما اسی آب وہوا میں ہوئی اور مولانا سجاد کے افکار وخیالات اور امیدوں اور آرزؤں کا اصل دار السلطنت یہی مدرسہ تھا۔ حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ کے الفاظ میں:

> ’’علماء کی تنظیم، جمعیۃ علماء کا قیام، تمام مدارس عربی میں ایک اصلاحی نصاب کا اجرا، امارت شرعیہ کی اسکیم وغیرہ یہ سب چیزیں مولانا کے دماغ نے گیا ہی میں پیدا کیں اور اسی زمانہ میں مولانا نے اپنی اسکیموں کو عملی شکل بھی دینا شروع کردی‘‘۔(۵۰)

اس مدرسہ کے ممتاز فضلاء میں جنھوں نے یہاں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے پاس دورہ حدیث کی تکمیل کی اور یہیں سے فراغت حاصل کی۔ حضرت مولانا مظہر علی صاحب (مقام شمس پور تھانہ بیلا، ضلع گیا بہار) بطور خاص قابل ذکر ہیں، اس خطہ میں ان کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔(۵۱)

خوبصورت تسلسل :

مدرسہ کی ایک مطبوعہ سند ہمیں دریافت ہوئی ہے، جو مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے بعد طبع ہوئی تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا سجادؒ کے بعد بھی دورہ حدیث کے اسباق یہاں جاری تھے ورطلبہ یہاں سے فارغ ہوتے رہے، مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے بعد اس مدرسہ کے مہتمم آپ کے شاگرد رشید مولانا عبدالحکیم صاحب ہوئے، جن کو خود حضرت سجادؒ نے اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر یہ ذمہ داری اپنی حیات میں حوالے کردی تھی، ان کے دور میں بھی مدرسہ کی ہمہ جہتی ترقیات کا سفر جاری رہا اور یہ اعلیٰ تعلیم کے مرکز کی حیثیت سے اپنی نیک نامی میں اضافہ کرتا رہا، غالبًا دورۂ حدیث کی یہ سند مولانا عبدالحکیم صاحب ہی کے زمانے میں طبع کرائی گئی تھی۔

زوال کی طرف :

مولانا عبدالحکیم صاحب کا انتقال حضرت سجادؒ کی وفات کے ایک ہی سال کے بعد ہو گیا تھا، مولانا عبدالحکیم صاحب کے وصال کے بعد مدرسہ کی نظامت حضرت مولانا سجاد ہی کے ایک اور تربیت یافتہ قاضی احمد حسین صاحبؒ کے سپرد ہوئی، قاضی صاحب نے اس مدرسہ کو ترقی دینے کی بھرپور کوششیں کیں، وہ اعلیٰ درجہ کے اساتذہ کی تلاش میں سرگرداں رہے اور کئی باصلاحیت اساتذہ کی خدمات انہوں نے حاصل کیں، انہی میں ایک نامور استاذ مولانا مظاہر امام صاحب بھی تھے، جو شیرگھاٹی گیا کے رہنے والے تھے، ایک عرصہ تک بہار شریف میں پڑھا چکے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی ان کی استعداد کی تعریفیں کرتے تھے، وہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ جیسی عظیم درسگاہ میں پرنسپل بننے کی لیاقت رکھتے تھے؛ لیکن انگریزی میں دستخط نہ کرسکنے کی بنا پر اس دوڑ میں پیچھے رہ گئے، ــــ جمعیۃ علماء اور کانگریس کے حامی تھے اور یہی چیز مدرسہ کیلئے فتنہ بن گئی، حضرت مولانا سجاد کے بعد گیا کی ملی سیاست کا نقشہ ہی تبدیل ہو گیا تھا، جو شہر جمعیۃ علماء ہند اور اس کے واسطے سے کانگریس کا گہوارہ رہ چکا تھا، جہاں، خلافت، جمعیۃ اور کانگریس کے بڑے بڑے اجلاس ہو چکے تھے، مولانا سجاد صاحب کے بعد ملکی حالات کے تغیرات کے نتیجے میں وہاں کی اکثریت کانگریس اور جمعیۃ سے بیزار ہونے لگی تھی، مسلم لیگ کے پاکستان جیسے خوشنما نعروں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، شہر کے اکثر مسلمان مسلم لیگ کے حامی ہو گئے تھے، مولانا مظاہر امام صاحب کا جمعیتی اور کانگریسی انتساب ان کو قطعی گوارا نہیں ہوا، ناظم مدرسہ قاضی احمد حسین صاحب ان دنوں امارت شرعیہ پھلواری شریف میں مقیم تھے، ان کی غیر موجودگی میں مقامی لیڈروں نے مدرسہ پر قبضہ کرلیا، آگے کی رپورٹ قاضی صاحب کے

پھوپھی زاد بھائی اور سوانح نگار شاہ محمد عثمانیؒ کی زبانی سنئے:

''قاضی صاحب کو تار دیا گیا، وہ گیا تشریف لائے اور چاہتے تھے کہ مقدمہ کی کاروائی کریں؛ لیکن ان کے چھوٹے بھائی نے مشورہ دیا کہ لڑائی نہ کی جائے، انہوں نے کہا کہ مدرسوں کی کیا اہمیت ہے، ملک میں ہزاروں مدرسے ہیں اور ان کو علماء دین جو جمعیۃ علماء سے وابستہ ہیں چلا رہے ہیں، ایک مدرسہ نہ سہی، مولانا سجاد کی یادگار صرف یہی مدرسہ تو نہیں، ان کی یادگار جمعیۃ علماء اور امارت شرعیہ بھی تو ہے، ان کو چلایا جائے، چنانچہ قاضی صاحب نے لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور پھلواری شریف واپس تشریف لے گئے۔

اس کے بعد یہ مدرسہ مختلف دوروں سے گزرتا رہا مولانا ابو محمد صاحب مرحوم اور مولانا اصغر حسین نے اس کے لئے بہت بڑی جائیداد بھی حاصل کی، پھر اس کا انتظام ان لوگوں کے قبضہ میں چلا گیا جن کا مزاج عربی مدارس کے چلانے کا نہ تھا، وہ کوئی اسکول البتہ اچھی طرح چلا سکتے تھے''۔(۵۲)

اس طرح ملت کا یہ قیمتی سرمایہ زوال پذیر ہو گیا اور باوجود بے پناہ جائداد موقوفہ کے اس مدرسہ کا معیار تعلیم گرتا چلا گیا، اب یہ درجات حفظ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

آج کل یہ مدرسہ بہار وقف بورڈ کے ماتحت ہے، سرکاری تنخواہ یاب ملازمین ہیں، وسیع وعریض عمارتیں ہیں، بڑی جائیداد ہے اور سب کچھ ہے؛ مگر مولانا محمد سجادؒ جیسا کوہ کن کوئی نہیں ہے۔

گرچہ ہیں تابدار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات
قافلہ حجاز میں کوئی حسین ہی نہیں

تدریسی امتیازات وخصوصیات:

بے نظیر استاذ:

حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ بڑے عالم ہونے کے ساتھ کامیاب مدرس بھی تھے، طالب علمی کے زمانہ ہی سے ان کو اس میدان میں شہرت حاصل ہو گئی تھی، مختلف علوم وفنون پر بے پناہ قدرت کے ساتھ تفہیم کی جو صلاحیت اللہ پاک کی جانب سے ان کو عطا ہوئی تھی، اس کی بنا پر وہ طالب علم کے ذہن ودماغ پر چھا جاتے تھے اور طالب علم محسوس کرتا تھا کہ علم اسے گھول کر پلایا جا رہا ہو، گوکہ مولانا کا زمانہ تدریس بہت زیادہ طویل نہیں رہا، زمانہ طالب علمی کی تدریس کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل مدت تدریس بیس اکیس (۲۱) سال ہوتی ہے، اس مختصر سی مدت میں جس طرح آپ کی تدریس کے جوہر کھلے، اگر کچھ عرصہ اور بھی آپ کو موقعہ

ملا ہوتا تو شاید پورے غیر منقسم ہندوستان میں کوئی آپ کی نظیر نہ ہوتا اور یہ خیال میرا نہیں؛ بلکہ آپ کو بہت قریب سے دیکھنے والے اور پورے ملک کے اداروں اور شخصیات پر گہری نظر رکھنے والے ماہر تعلیم اور مبصر حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کا ہے۔تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں بڑے فضلاء اور کامیاب ترین درس دینے والے گذرے ہیں اور آج بھی کچھ موجود ہیں؛ مگر کم لوگوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس قدر جلد علمی صفوں میں نمایاں ہوئے ہوں، جس قدر جلد اور جتنی کم سنی میں مولانا کے علم وتبحر کو اہل علم نے تسلیم کرلیا، اگر مولانا نے اپنی زندگی کا رخ دوسری طرف نہ پھیر دیا ہوتا، اور وہ برابر پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے، تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہندوستان کے سب سے زیادہ کامیاب مدرس اور سب سے زیادہ شفیق استاذ ہوتے''۔(۵۳)

اور یہ رائے تنہا مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی نہیں؛ بلکہ مولانا کے تمام تلامذہ اس باب میں متفق الرائے ہیں، جس نے ایک سبق بھی مولانا سے پڑھا، وہ ساری زندگی کے لیے آپ کا گرویدہ ہوگیا اور اس سعادت کو اپنے لئے سرمایہ فخر تصور کرنے لگا، آپ کے سب سے بڑے علمی وفکری جانشین مولانا عبدالحکیم صاحب نے پورے یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ میں نے اپنی پوری علمی زندگی میں مولانا کے پایہ کا نہ عالم دیکھا اور نہ مدرس دیکھا، مولانا کی شاگردی پر اظہار فخر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں مولانا کا شاگرد ہوں، اگرچہ حقیر اور کمترین ہوں۔۔۔مولانا کے درس وتدریس کا یہ حال تھا کہ بڑی محنت اور کاوش سے پڑھاتے تھے اور کتاب کے مطالب مع مالہ وما علیہ اس آسانی سے طلبہ کے دماغ میں اتار دیتے تھے کہ دماغ چمک اٹھتا تھا، مولانا کے طرز تدریس کی بڑی شہرت اور دھوم رہی''۔(۵۴)

مولانا کے متعدد تلامذہ نے مولانا کے درس کی جو کیفیات لکھی ہیں، ان کی روشنی میں آپ کے درس کی درج ذیل خصوصیات نظر آتی ہیں:

درسی خصوصیات:

☆ مکمل مطالعہ وتیاری کے بعد پورے انہماک کے ساتھ آپ کتابوں کو سمجھاتے تھے، نہ اس میں الفاظ کا بخل ہوتا تھا اور نہ وقت کی تنگ دامانی کا گلہ۔

☆ اگر ایک بار کی تقریر سے تشفی نہ ہوتی تو دوبارہ سہ بارہ تقریر کرنے میں چیں بجبیں نہ ہوتے۔

☆ اگر اوقات مدرسہ میں آسودگی نہ ہوتی تو الگ سے وقت دینے میں دریغ نہ فرماتے۔

☆ حدتو یہ تھی کہ کسی طالب علم کوآپ کے بیان کردہ مطلب پراعتماد نہ ہوتا تو شروح وحواشی دکھلا کراس کی تشفی فرماتے۔

☆ مشکل مقامات میں کسی طالب علم کوشبہ ہوتا تو اپنے سے بڑے صاحب علم وفضل کے سامنے مقام شبہ کی تقریرفرما کرطالب علم کومطمئن کرتے اوراس میں ذرا بھی اپنے لیے عارمحسوس نہ کرتے اور نہ طالب علم سے بدگمان ہوتے۔(۵۵)

طلبہ کی ضروریات کالحاظ:

☆ طلبہ کی تمام ضروریات کا خیال رکھتے، پڑھنے لکھنے کے علاوہ ان کے کھانے پینے رہنے سہنے، صحت وبیماری اورگھریلو حالات سے بھی واقف رہتے اوراپنی اولاد کی طرح ان کو ہرممکن سہولیات بہم پہونچانے کی کوشش کرتے تھے۔مولانا منت اللہ رحمانی صاحب نے لکھا ہے کہ:

”مولانا کا سلوک طلبہ کے ساتھ اس درجہ بہتر تھا کہ ان دنوں اس کا تصورمشکل ہے کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے میں مولانا نے کبھی امتیاز روا نہ رکھا، یہ ناممکن تھا، کہ مولانا کھائیں اور طالب علم بھوکا رہ جائے، بیمار طلبہ کے علاج کا نظم خود مولانا کیا کرتے تھے، حکیم کے یہاں لے جانا، دوالانا، دواپلانا، تیمارداری کرنا، ان میں سے زیادہ تر کام مولانا خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیا کرتے تھیاس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ مولانا پراپنی جان قربان کرنے کوتیار رہتے تھے، آج بھی مولانا کے جوشاگرد موجود ہیں، وہ اس وقت بھی مولانا کی شفقت اورمہربانیوں کو ہمیشہ یادکرتے ہیں اورانہیں اس کا اعتراف ہے کہ جتنی خدمت مولانا نے ہماری کی ہوگی اتنی خدمت ہم مولانا کی نہیں کرسکے ہیں“۔(۵۶)

بغیراحترام ومحبت کے علم دل ودماغ میں نہیں اترتا، طلبہ کے ساتھ مولانا کا یہ سلوک محض انسانی خدمت کے نقطہ نظر سے نہیں تھا؛ بلکہ ان کے لئے علم کی منزل کوآسان کرنا بھی مقصود تھا، مولانا اپنے حسن سلوک اورمحبت کے ذریعہ طلبہ پرعلم کا ایسا نشہ چڑھادیتے تھے کہ حصول علم کے لیے ثریا تک کے لیے وہ آمادہ سفر ہوجاتے تھے، بقول ڈاکٹر محمد اقبال:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

تدریسی فنائیت:

☆ مولانا ایک نہ تھکنے والے مدرس تھے، ان کا درس فجر کی نماز سے قبل شروع ہو جاتا تھا، اورسونے کے وقت جاری رہتا تھا، دوپہراورعصر کے بعد کا وقت بھی ان کا خدمت علم ہی

میں گذرتا تھا، استاذ الکل حضرت مولانا احمد حسن کانپوری کے بعد کسی بھی مدرس کی ایسی تدریسی فنائیت سننے میں نہیں آئی۔

چھٹیوں میں تعلیم :

☆ طلبہ کے اوقات کا خیال رکھنا، اور زیادہ سے ان کو تعلیم میں مشغول رکھنا، مولانا اس کے لئے کبھی خود بھی زیر بار ہوتے تھے؛ لیکن ممکن حد تک اس کو گوارا فرماتے تھے، مثلاً مدرسہ میں لمبی چھٹیاں ہوجاتیں تو آپ کچھ طلبہ کو اپنے گھر لے جاتے اور ان کو گھر پر تعلیم دیتے اور ان کے اخراجات کی کفالت خود برداشت کرتے تھے، مولانا اصغر حسین صاحب بہاریؒ ان خوش نصیب طلبہ میں سے ایک ہیں، جو تعلیمی چھٹیاں کاشانۂ سجاد پر گذار چکے ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں:

''طلبہ کے اسباق کا اس قدر احساس تھا، کہ شہر کی آب وہوا کی ردائت کے باعث مدرسہ ہفتہ دو ہفتہ کے لیے بند ہوجاتا تو پندرہ بیس طلبہ کو بنفسہ اپنے مکان لے جاتے اور سب کے ناشتے کھانے کے خود کفیل ہوکر مکان ہی پر درس میں مشغول ہوتے، مجھ کو بھی ایک مرتبہ ایسا موقعہ ملا ہے، اس وقت مولانا کے یہاں خوب کاشتکاری ہوتی تھی''۔(۵۷)

طلبہ میں اعتماد کی روح پھونکنا:

☆ وہ طلبہ میں اعتماد کی روح پھونکتے تھے، وہ کتاب کی تفہیم ضرور فرماتے تھے؛ لیکن چاہتے تھے کہ طلبہ کتاب کی عبارت سے بالاتر ہوکر نفس موضوع پر بھی قابو پالیں اور وہ مسئلہ پر براہ راست غور کرنا سیکھ جائیں؛ تاکہ کتابوں کی مرعوبیت سے آزاد ہوکر کسی بھی مسئلہ میں صحت وسقم کا فیصلہ کرنے کی ان میں صلاحیت پیدا ہوجائے، آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ جو خود بڑے اعلیٰ درجہ کے عالم، فقیہ اور مدرس ہوئے ہیں اور جنھوں نے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنے استاذ کے طریقۂ تعلیم پر روشنی ڈالی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''استاذ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ پڑھنے والے کے سامنے دو باتیں رہنی ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ جس مسئلہ کو تم کتاب میں پڑھ رہے ہو، پہلے اس کو کتاب سے سمجھو کہ صاحب کتاب اس کے متعلق کیا کہہ رہا ہے اور اس سمجھنے میں جو کچھ سمجھو اس کی عبارت سے سمجھو کسی خیال کو اپنی طرف سے زبردستی اس میں نہ ٹھونسو، اس کے سمجھ لینے کے بعد دوسری چیز یہ ہے کہ یہ سمجھو کہ اصل مسئلہ کی حقیقت ہے کیا؟ اور جب اصل مسئلہ کی حقیقت سمجھ لو تو اس کے بعد یہ بھی دیکھو کہ صاحب کتاب سے اس حقیقت کے سمجھنے میں چوک تو نہیں ہوئی ہے، پس حضرت استاذ پہلے کتاب کی تفہیم فرماتے، پھر نفس مسئلہ کی طرف رہنمائی

فرماتے، اس طرح پڑھنے والے میں تحقیق، تلاش، محنت، مطالعہ اور فکر کا جذبہ پیدا کردیتے
تھے اور پڑھنے والے کے دماغ کی تربیت فرماتے تھے، حضرت استاذ طلبہ کو نہ تو بے محابا،
بگ ٹٹ، ایسا رواں دواں دیکھنا چاہتے تھے کہ بے خبری میں ہر موڑ اس کے لیے خطرناک
خندق بن جائے اور اس کے لئے مغلطہ کا باعث ہو اور نہ وہ طلبہ کے لیے یہ پسند فرماتے
تھے کہ صرف کتاب کا رٹو ہو کر رہ جائے اور دماغ اس جوہر لطیف سے خالی رہے، جو علم
کا مقصود و مطلوب ہے"۔(۵۸)

ظاہر ہے کہ اس کے لیے وسیع علم، گہرے مطالعہ اور طویل تجربہ کی ضرورت ہے اور لازم ہے کہ استاذ کتاب وفن دونوں پر پوری طرح حاوی ہو، حضرت مولانا سجاد کا یہ طریقہ تدریس ان کے بے پناہ علم وکمال اور تدریس کی مجتہدانہ صلاحیت کی علامت ہے، حضرت مولانا سجاد کو ہر علم وفن میں کمال حاصل تھا اور ہر فن کی کتاب وہ اسی شان سے پڑھاتے تھے، آج علم وفن کی درسگاہیں ایسے باکمال مدرسین سے خالی ہیں؛ بلکہ پہلے بھی خال خال ہی ایسے لوگ ہوئے ہیں۔

طلبہ کی نفسیات تک رسائی :

☆ ایک استاذ کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات سے واقف اور طلبہ کا نبض شناس ہو؛ تاکہ جہاں مرض ہو وہیں سے علاج شروع کیا جاسکے اور طالب علم میں کتاب سے محبت اور فن میں بصیرت پیدا ہو، حضرت مولانا سجاد کو اس میں خصوصی امتیاز حاصل تھا، مولانا عبدالصمد رحمانی صاحب ؒ رقمطراز ہیں:

"استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے طریقہ تعلیم کی ایک خصوصی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے
عمیق تعلیمی تجربہ اور تبحر کی بنا پر اول نگاہ میں پڑھنے والے کی صلاحیت، اس کی استعداد، اس
کی خامی اور اس کے نقص کو بھانپ لیتے تھے اور سبق کے وقت سب سے پہلے اس کی اس
خامی کا ازالہ فرمادیتے تھے، جس کا ہونے والے سبق سے تعلق ہوتا تھا؛ تاکہ فہم سبق کی راہ
میں دشواری نہ رہے اور اس کے لیے ایسا لطیف پیرایہ اختیار فرماتے کہ دوسرے ہم سبق کو
اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا اور اس کے دل کی گرہ کھل جاتی تھی"۔(۵۹)

طریقہ تفہیم کی انفرادیت:

☆ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب ہر میدان کی طرح طریقہ تدریس میں بھی ایک انفرادی شان کے حامل تھے، وہ مروجہ طریقہائے تدریس کی پابندی کے بجائے ایک مستقل طرز تدریس کے بانی تھے، ان کا طرز تدریس افراط وتفریط سے پاک اور عدل کامل کا نمونہ تھا، مولانا

کے طریقہ تعلیم کے سب سے بڑے مبصر مولانا عبدالصمد رحمانی صاحبؒ مولانا کے طرز تفہیم کی انفرادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہیں:

''میں جس دور میں حضرت استاذ کے حضور میں حاضر ہوا تھا، طریقہ تعلیم میں عجب قسم کی افراط وتفریط تھی، جو تمام مدارس عربیہ میں الا ماشاء اللہ عام تھی''۔(۶۰)

☆ درس کے وقت اساتذہ کا معمول یا تو یہ تھا کہ پڑھنے والا ایک انداز کردہ مقدار میں عبارت پڑھ جاتا تھا اور پڑھانے والا اس کے متعلق ایک زوردار تقریر میں اس کے مطالب کو پیش کردیتا تھا اور اسی سلسلہ میں اعتراض وجواب اور اس کی ضروری تنقیحات کو بیان کردیتا اس کے بعد پڑھنے والا عبارت کا ترجمہ کرتا تھا اور اس طرح پر وہ سبق ختم ہوجاتا تھا۔(۶۱)

☆ یا یہ دستور تھا کہ پڑھنے والا ہونے والے سبق کی ایک دوسطریں پڑھ کر ترجمہ کرتا تھا اور پڑھانے والا اس کا مطلب بیان کرتا، پھر اس عبارت پر جو ایراد واعتراض ہوتا اس کو بیان کرکے جواب دیتا، پھر اسی طرح دو چار سطریں پڑھی جاتیں اور ان کا ترجمہ اور مطلب اور ایراد واشکال اسی طرح بیان کیا جاتا، یہاں تک کہ اندازہ کردہ مقدار میں عبارت پوری ہوجاتی، اور یہاں پہونچ کر سبق ختم ہوجاتا۔(۶۲)

پہلی صورت میں عملاً یہ نقص ہوتا تھا کہ طلبہ میں محاکات اور نقل کی استعداد تو تام ہوجاتی تھی اور کتاب کے ہر مسئلہ پر وہ ایک رواں دواں تقریر کے عادی تو ہو جاتے تھے؛ مگر کتاب سے خصوصی مناسبت نہیں ہوتی تھی اور نہ قوت مطالعہ قوی ہوتی تھی اور بسا اوقات پڑھنے والا اس تفہیم پر بھی قابو نہیں رکھتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، عبارت اس کی متحمل ہے، یا نہیں؟ اور اگر متحمل ہے تو اس کے لیے سبق کی کون سی عبارت منشا وماخذ ہے؟ پھر اس کے علاوہ اگر اس کی محاکاتی تقریر پر بیچ میں اگر کوئی اشکال پیش کردیا جاتا، تو میں نے دیکھا کہ یہ ساری تقریر اس طرح الجھ کررہ جاتی تھی کہ اس کو سمجھنا مشکل اور دشوار ہوجاتا تھا کہ اس کی تقریر کے جس ٹکڑے پر یہ ایراد ہورہا ہے یہ کیوں ہورہا ہے؟ اور اس کا جواب خود عبارت میں موجود ہے یا نہیں؟

دوسری صورت میں عموماً عملاً یہ تو محسوس ہوتا تھا کہ طلبہ میں کتاب سے کافی مناسبت بھی ہے، قوت مطالعہ بھی ہے، وہ عبارت کا صحیح مفہوم بھی سمجھتا ہے؛ مگر اسی کے ساتھ یہ بڑی کمی دیکھنے میں آتی تھی کہ وہ اپنے دماغ میں کسی مسئلہ کے متعلق کوئی خاص روشنی نہیں رکھتا ہے اور نہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ کتاب سے الگ ہوکر ایک سلجھی ہوئی تقریر میں اس چیز کی ترجمانی کرے، جو صاحب کتاب کا مقصد ہے اور جو خود اس کے پڑھنے کا مطلوب ومقصود ہے۔

حضرت استاذ کا طریقہ تعلیم اس افراط وتفریط سے الگ بین بین تھا، وہ طلبہ کو کتاب سے اخذ مطلب پر زور دیتے تھے اوراس طرح ان کی قوت مطالعہ میں پختگی ہوجاتی تھی اور کتاب سے خاصی مناسبت پیدا ہوجاتی تھی۔(۶۳)

۞۞

مصادر ومراجع

(۱) مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کی بنیاد جامع الکمالات حضرت مولانا سید وحید الحق صاحب استھانویؒ نے رکھی اور تاحیات اس کے ناظم رہے، یہ اپنے علاقہ کا مرکزی مدرسہ تھا، دورہ حدیث شریف تک یہاں تعلیم ہوتی تھی، بڑے بڑے علماء نے یہاں تعلیم حاصل کی اور اکابر علماء کی خدمات اس ادارہ کو حاصل رہی ہیں، مولانا سجاد صاحب کی بہت سی علمی وتحریکی سرگرمیوں کا یہ مرکز تھا، مولانا سجادؒ نے مدارس کے جس وفاقی ڈھانچہ کی بنیاد رکھی تھی اس کا مرکزی آفس بھی یہی مدرسہ تھا، اس کے سالانہ جلسے بڑے یادگار ہوتے تھے، اس کے جلسوں میں حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی نسبت ارضی سے بڑے بڑے اکابر اپنی تشریف آوری کو باعث سعادت تصور کرتے تھے۔

اس مدرسہ کی بنیاد کب پڑی؟ جناب سید محمد شرف صاحب موجودہ متولی بی بی صغریٰ وقف اسٹیٹ بہار شریف کا بیان ہے کہ مدرسہ اسلامیہ کے وثیقۂ وقف پر ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء کی تاریخ درج ہے، اس سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ مدرسہ اسی سال قائم ہوا، لیکن یہ بھی امکان ہے کہ مولانا سید وحید الحق صاحب نے اپنے طور پر مدرسہ پہلے ہی قائم کیا ہو اور وقف کی یہ جائیداد بعد میں حاصل ہوئی ہو، وثیقہ کی تاریخ زمین کی رجسٹری کی تاریخ ہوتی ہے، قیام مدرسہ کی تاریخ سے اس کا تعلق نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ بلکہ مجھے تو زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ پہلے ہی قائم ہوا ہوگا، اس لیے کہ بانی مدرسہ مولانا سید وحید الحق صاحب استھانوی کا وصال ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں ہوا، اس مدرسہ نے حضرت استھانویؒ کی حین حیات تعلیم وتربیت کے میدان میں جو مثالی شہرت ونیک نامی حاصل کی، وہ عام حالات میں اس مختصر سی (پانچ چھ سال کی) مدت میں مستبعد ہے، جبکہ اسی علاقے کے نامور مورخ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جن الفاظ سے مولانا سید وحید الحق استھانویؒ اور مدرسہ اسلامیہ کی انقلابی تعلیمی خدمات کا ذکر کیا ہے کہ:

''تیرھویں صدی کے شروع میں صوبہ بہار میں مولانا وحید الحق صاحب استھانویؒ بہاری کے دم قدم سے علم کو نئی رونق حاصل ہوئی، قصبۂ بہار میں انہوں نے مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور بہت سے عزیزوں کی تربیت کی، ان میں سے ایک مولانا سجاد بھی تھے۔(محاسن سجاد ص ۳۷)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید مولانا استھانویؒ کی حیات میں اس مدرسہ کا تعلیمی وتدریسی سفر نصف صدی سے بھی متجاوز رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

مگر افسوس اب یہ مدرسہ روبہ زوال ہے اور معمولی مکتب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

(۲) محاسن سجاد ص ۱۹

(۳) حیات سجاد ص ۱۱

(۴) محاسن سجاد ص۱۹

(۵) حیات سجاد ص۱۱

(۶) محاسن سجاد ص۲۰

(۷) بہار شریف کے ایک ممتاز عالم اور بزرگ تھے، حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے وصال سے چند سال قبل ان کی وفات ہوئی۔ (محاسن سجاد ص۲۱ حاشیہ)

(۸) محاسن سجاد ص۲۱ (خلاصہ) مضمون مولانا اصغر حسین صاحب

(۹) محاسن سجاد ص۲۰، ۲۱ (الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ) مضمون مولانا اصغر حسین صاحب

(۱۰) محاسن سجاد ص۲۱، ۲۲ مضمون مولانا اصغر حسین صاحب

(۱۱) (مولانا اصغر حسین صاحب مولانا سجاد صاحب کے بالکل ابتدائی دور کے تلامذہ میں ہیں، آپ نے مولانا سجاد کا عہد طالب علمی بھی دیکھا اور عہد معلّمی بھی، عہد اہتمام بھی اور عہد قیادت بھی، آپ کے علمی عہد عروج کے بھی مشاہد رہے اور ملی وسیاسی دور میں بھی قدم بقدم اپنے استاذ محترم کے ساتھ ساتھ چلے، آپ کی پیدائش محلّہ بنولیہ بہار شریف میں شعبان المعظم ۱۳۰۲ھ مطابق مئی ۱۸۸۵ء کو ہوئی، مکتب اور ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی، اس کے بعد مولانا رفیع الدین صاحب زمیندار موضع شکرانواں کی خدمت میں حاضر ہوکر صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی، پھر مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں داخلہ لیا اور ترمذی شریف اور میر زاہد تک یہیں تعلیم حاصل کی، درمیان میں (۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں) قطبی کے سال ارادہ متزلزل ہوا تھا اور وہ حصول تعلیم کے لئے مدرسہ سبحانیہ الہ آباد پہونچ گئے تھے، جہاں حضرت مولانا سجاد صاحب پہلے سے ہی درجات علیا میں تعلیم حاصل کررہے تھے اور یہیں انہوں نے پہلی مرتبہ مولانا سجاد کی عظمت کا مشاہدہ کیا، جو پڑھنے کے زمانے ہی میں پڑھانے کی شہرت رکھتے تھے، لیکن بعض اسباب کی بنا پر داخلہ سے قبل ہی ان کو وطن مالوف بہار شریف واپس آنا پڑا، اور مدرسہ اسلامیہ ہی میں داخل ہوکر تعلیمی سلسلہ شروع کردیا، ۱۹۰۴ء میں مولانا سجاد صاحب مدرس ہوکر مدرسہ اسلامیہ بہار شریف تشریف لائے تو آپ کے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، اور بشمول میر زاہد وترمذی شریف کئی کتابوں کا درس آپ سے لیا، اس کے بعد قریب ایک سال مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد میں حضرت مولانا منیر الدین الہ آبادی کے حلقۂ تلمذ میں داخل رہے، شوال المکرّم ۱۳۲۶ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۸ء میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور دو سال وہاں رہ کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور دیگر اساتذہ کرام کے زیر سایہ علوم عالیہ اور حدیث میں کمال واختصاص پیدا کیا، ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں دیوبند سے فراغت کے بعد غالباً استاذ محترم کے حکم پر مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں مدرس ہوئے، اور عرصہ دراز تک وہاں علمی وملی خدمات انجام دیں اور اعلیٰ کتابوں کا درس دیا اور اس دوران حضرت مولانا محمد سجادؒ کی خاص عنایات حاصل رہیں، حضرت مولانا سجاد کی تحریکات کا دور شروع ہوا تو حکم کے مطابق استاذ محترم کے قدم بقدم ساتھ ساتھ چلتے رہے، ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں حضرت مولانا کی اجازت سے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی ملازمت اختیار کرلی، کچھ دنوں کے بعد اس کے وائس پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے، ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی توجہ سے انجمن محمدیہ پٹنہ سیٹی کے صدر مقرر ہوئے، ۱۴/اپریل ۱۹۴۱ء سے ۱۵/مئی ۱۹۴۸ء مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل رہے، بڑے

عالم دین، صاحب قلم اور اپنے استاذ کے افکار کے سچے جانشین تھے، بقول آپ کے شاگرد رشید مولانا ابوسلمہ شفیع بہاری ثم کلکتوی (متوفی ۱۹۸۵ء) مولانا اصغر حسین صاحب نے ترمذی شریف کو حنفی نقطہ نظر سے حل کرنے کے لیے سوال وجواب کے طرز پر دو جلدوں میں عربی زبان میں "نزل الثوی" کے نام سے لکھی، جس کی پہلی جلد مطبوعہ ہے، کہتے ہیں کہ اس کا ایک نسخہ مدرسہ قومیہ محلّہ شیخانہ بہار شریف کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ (محاسن سجاد ص ۱۷ تا ۲۹ مولانا اصغر حسین کے مضمون سے ماخوذ، بعض چیزیں تذکرہ مولانا ابوسلمہ شفیع بہاریؒ ص ۲۸ مرتبہ مولانا رشید احمد فریدی شائع کردہ ادارہ ترجمہ وتالیف، سرسید احمد روڈ کلکتہ، ۲۰۰۹ء سے بھی لی گئی ہیں۔) ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(۱۲) مولانا مسعود عالم ندوی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ’’قدیم طرز کے معقولی علماء میں خاص امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ (محاسن سجاد ص ۲۰ حاشیہ) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں مدرس تھے۔

(۱۳) آپ مولانا اصغر حسین صاحب کے ساتھ دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوئے اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں صدر مدرس ہوئے۔ (محاسن سجاد ص ۱۲، مضمون مولانا زکریا فاطمی ندوی صاحب)

(۱۴) محاسن سجاد ص ۱۲، مضمون مولانا زکریا فاطمی ندوی صاحب

(۱۵) محاسن سجاد ص ۵ مضمون مولانا حافظ عبد الحکیم اوگانویؒ و ص ۱۳ مضمون مولانا محمد زکریا فاطمی ندویؒ ☆ حیات سجاد ص ۱۰ مضمون مولانا سید منت اللہ رحمانی

(۱۶) اس زمانہ میں کانپور کے بڑے مدارس میں دار العلوم کانپور، مدرسہ فیض عام اور مدرسہ جامع العلوم بہت مشہور تھے؛ لیکن ان اداروں کی ممتاز اور بڑی شخصیتیں رخصت ہو چکی تھیں، شہر کے سب سے ممتاز عالم ومدرس استاذ الکل حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں انتقال کر چکے تھے، جو مدرسہ فیض عام اور دار العلوم کانپور کے روح رواں تھے، اسی طرح مدرسہ جامع العلوم کی سب سے بافیض شخصیت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء ہی میں اس شہر کو خیر باد کہہ کر وطن منتقل ہو چکے تھے؛ اس لیے قدرتی طور پر کانپور کے بازار علم کی رونق ماند پڑنے لگی تھی اور طلبہ اپنے اپنے لحاظ سے تعلیم کے نئے میدانوں کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے تھے۔

(۱۷) حیات سجاد ص ۱۱

(۱۸) محاسن سجاد ص ۵ مضمون مولانا حافظ عبد الحکیم اوگانویؒ

(۱۹) محاسن سجاد ص ۵ مضمون مولانا حافظ عبد الحکیم اوگانویؒ

(۲۰) محاسن سجاد ص ۵ مضمون مولانا حافظ عبد الحکیم اوگانویؒ

(۲۱) حیات سجاد ص ۳۰ مرتبہ مولانا عبد الصمد رحمانیؒ

(۲۲) حیات سجاد ص ۳۵ مضمون مولانا عبد الصمد رحمانیؒ ☆ محاسن سجاد ص ۳۲ مضمون مولانا حافظ قاری حکیم یوسف حسن خان صاحب بہار شریف

(۲۳) دریا آباد الٰہ آباد کا ایک محلّہ ہے۔ (حیات سجاد ص ۱۲)

(۲۴) حیات سجاد ص ۳۰ مضمون مولانا عبد الصمد رحمانیؒ و ص ۱۲ مضمون مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ

(۲۵) محاسن سجاد ص ۳۲ مضمون مولانا حافظ قاری حکیم یوسف حسن خان صاحب بہار شریف

(۲۶) حیات سجاد ص ۲۷

(۲۷) حضرت مولانا عبدالحکیم اوگانویؒ حضرت مولانا سجاد کے ابتدائی دور کے تلامذہ اور رفقائے کار میں بہت زیادہ ممتاز، مقرب اور راز دار تھے، اپنے استاذ محترم کے ہر علمی، ملی اور سیاسی کام میں پوری طرح شریک رہے، کانپور پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے، پھر مولانا سجاد کے درس کی شہرت سے متاثر ہوکر الہ آباد چلے آئے اور تمام کتابیں مولانا کے پاس پڑھیں، ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں مدرسہ سبحانیہ سے فراغت کے بعد مدرسہ انوارالعلوم گیا کی تاسیس میں اپنے استاذ کے حکم سے شریک رہے اوراس کے لیے بے پناہ قربانیاں دیں اور ہر تکلیف وراحت میں استاذ محترم کے دامن سے وابستہ رہے، حضرت مولانا سجاد صاحب اکثر ملی، تنظیمی اور سیاسی امور میں جہاں وہ خود شریک نہیں ہو سکتے تھے، مولانا عبدالحکیم صاحب ہی کو اپنے نمائندہ کی حیثیت سے بھیجتے تھے، کئی اہم میٹنگوں اور کانفرنسوں میں آپ نے اپنے استاذ محترم کی شاندار نمائندگی کی، خلافت، جمعیۃ، امارت اور سیاسی پارٹی ہر تحریک کے بنیادی مشیروں اور کارکنوں میں تھے، یوم النقرہ کے سلسلہ میں گیا کے ایک چھوٹے سے محلّہ سے ڈیڑھ سو روپیہ (۱۵۰) چندہ جمع کر کے انہوں نے دفتر میں داخل کیا، امارت شرعیہ کے قیام کے بعد جب مولانا سجاد کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ گئیں تو مولانا سجادؒ نے مدرسہ انوارالعلوم گیا آپ ہی کے حوالہ کیا اور آپ اس مدرسہ کے مہتمم مقرر ہوئے، اس مدرسہ کی تعمیر وترقی میں مولانا سجاد صاحب کے بعد سب سے زیادہ جس شخص نے اپنا خون جگر صرف کیا، وہ مولانا عبدالحکیم اوگانویؒ ہی تھے، مولانا سجاد کے تلامذہ میں شاید ہی کوئی ہو، جس کو فکر وعمل میں مولانا عبدالحکیم صاحب کا ہم پلہ قرار دیا جاسکے، فکر سجاد کی معنویت کو جس بہتر انداز میں انہوں نے سمجھا تھا اور جس طرح ہر اہم کام میں مولانا سجاد صاحب ان کو اپنی نیابت کے لئے منتخب فرماتے تھے، اس کے پیش نظر مجھے فکر وعمل اور ذہنی وذوقی ہم آہنگی کے لحاظ سے وہ پورے حلقۂ سجاد میں بڑے بھائی اور مربی کی طرح نظر آتے ہیں، افسوس ان کی عمر نے وفا نہ کی، اگر مولانا سجادؒ کے بعد ان کو کچھ عرصہ اور زندہ رہنے کا موقعہ ملا ہوتا تو شاید ان کے سامنے دوسروں کے چراغ روشن نہ ہو پاتے؛ لیکن حیرت ہے کہ حلقۂ سجاد میں ان کو آہستہ آہستہ فراموش کر دیا گیا اور ان کی وہ قدر شناشی نہیں کی گئی، جس کے وہ مستحق تھے، آپ کی وفات ربیع الاول ۱۳۶۰ھ مطابق اپریل ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔ (محاسن سجادؒ ص ۵ تا ۸ ماخوذ از مضامین مولانا مسعود عالم ندوی ومولانا عبدالحکیم اوگانویؒ)

(۲۸) مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کی ولادت ۱۳۰۰ فصلی میں قصبہ باڑھ (ضلع بیگوسرائے) کے ایک گاؤں ''بارند پور'' میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، عربی کی تعلیم ہدایۃ النحو کی جماعت تک مولانا حکیم محمد صدیق صاحب سے حاصل کی، اس سے آگے کی تعلیم کے لیے ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں کانپور حاضر ہوئے اور مدرسہ جامع العلوم کانپور میں داخلہ لیا؛ لیکن وہاں جی نہیں لگا اور بالقائے ربانی الٰہ آباد چلے آئے اور مدرسہ سبحانیہ میں حضرت مولانا محمد سجادؒ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، یہاں کے بعد دیوبند تشریف لے گئے اور ۱۳۳۲ھ یا ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، علم باطن کے لیے قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ سے رجوع فرمایا اور کسب کمال کیا، حضرت مونگیری کے ساتھ رد قادیانیت اور رد آریہ سماج اور رد عیسائیت کی تحریکوں میں پیش پیش رہے اور کتابیں تصنیف کیں، رد آریہ سماج میں بارہ (۱۲) رسالے لکھے، جن میں ''وید کا بھید'' اور ''آریہ دھرم کا انصاف'' بہت مقبول ہوئے۔

ابتداء میں علوم معقولہ کی طرف زیادہ رجحان تھا، چنانچہ حضرت مونگیری سے بیعت کے بعد ان کو معلوم ہوا کہ صوبہ سرحد میں کابل سے قریب ''غورغشتی'' گاؤں میں علامہ شمس الحق معقولی رہتے ہیں، جو معقولات کے امام مانے جاتے ہیں، بس خاموشی کے ساتھ حضرت شیخ کی اجازت واطلاع کے بغیر غورغشتی کے لیے روانہ ہوگئے اور امام المعقولات سے منطق وفلسفہ کی بعض کتابوں کا درس لیا، واپسی پر ایک دن ڈرتے ڈرتے حضرت مونگیریؒ سے اس کا ذکر کیا تو حضرت نے فرمایا: ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' اس سے کیا حاصل؟ معقولی کے مزار پر جاکے دیکھو، تاریکی محسوس ہوگی اور ایک محدث یا فقیہ کی قبر پر جاؤ انوار ہی انوار ہی نظر آئیں گے، حضرت کی اس تنبیہ سے ذہن بدل گیا اور پھر ساری توجہ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی پر مرکوز کردی۔

مولانا رحمانیؒ نے کچھ دنوں انجمن حمایت اسلام مونگیر میں درسی خدمات انجام دیں، جامع مسجد مونگیر کے امام بھی رہے، آپ کی امامت کے زمانہ میں مونگیر کے تعلیم یافتہ طبقہ میں قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا خاص ذوق پیدا ہوگیا تھا، مونگیر والوں میں اچھی تقریریں اور تحریریں سننے اور پڑھنے کا مزاج اور دینی مذاق آپ ہی کی سعی جمیل کا ثمرہ ہے، اسی زمانے میں امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے صرف ونحو اور منطق کی بعض کتابیں مولانا سے پڑھیں۔

۱۹۲۷ء میں جامعہ رحمانی قائم ہوا تو آپ اس سے وابستہ ہوگئے اور عرصہ تک وہاں مدرس رہے، بہت زمانہ تک خانقاہ رحمانی مونگیر سے شائع ہونے والے علمی ماہنامہ ''الجامعہ'' کے مدیر بھی رہے۔

۱۹۳۰ء میں مولانا محمد سجادؒ کی سیاسی جماعت ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' کے دفتر کے ذمہ دار اعلیٰ مقرر ہوئے۔ جمعیۃ علماء ہند کی سول نافرمانی تحریک کے موقعہ پر جب اکابر جمعیۃ گرفتار کر لیے گئے تھے تو جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اور مرکزی دفتر کے ذمہ دار اعلیٰ بنائے گئے۔

حضرت مونگیریؒ کے وصال کے بعد اپنے استاذ محترم حضرت مولانا محمد سجادؒ کی خواہش پر مونگیر سے پھلواری شریف منتقل ہوگئے اور امارت شرعیہ کے مرکزی دفتر کے نگران اعلیٰ مقرر ہوئے اور اپنی پوری زندگی امارت شرعیہ کی تعمیر وترقی اور علوم سجاد کی تشریح وترجمانی کے لیے وقف کردی۔

۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا سجاد کے وصال کے بعد امیر شریعت ثانی حضرت مولانا شاہ محی الدین پھلوارویؒ نے آپ کو نائب امیر شریعت ثانی نامزد فرمایا۔ مولانا عبدالصمد رحمانی نے اپنی کتابوں اور خدمات کے ذریعہ امارت شرعیہ کا وقار بڑھایا، بانی امارت کے چھوڑے ہوئے کاموں کی تکمیل کی، بہت سے مختلف فیہ مسائل پر یادگار علمی تحریریں چھوڑیں، آپ ایک عظیم محقق اور فقیہ تھے، فقہ وفتاویٰ اور اصول فقہ میں اپنے دور میں فرد فرید تھے، بقول فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ قاضی القضاۃ امارت شرعیہ:

''معقولات ومنقولات دونوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے، دینیات کے متبحر عالم، مسائل پر بڑی وسیع اور گہری نظر تھی اسلام کے اجتماعی نظام اور فقہ کے اصولوں پر بڑی اچھی نگاہ تھی، فقہ اسلامی پر ہندوستان کے علمی ودینی حلقہ میں آپ کا منفرد اور ممتاز مقام تھا، تفقہ فی الدین کی دولت سے مالا مال تھے اور اس میں ہندوستان گیر شہرت رکھتے تھے''۔ (کتاب الفسخ والتفریق مصنفہ: حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ پر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا مقدمہ ص ۱۸، ۱۹ شائع کردہ: مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۰ء)

آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً سرسٹھ (۶۷) ہے، ان میں حیات سجاد، تفسیر القرآن، ہندوستان اور مسئلہ امارت،

قرآن محکم، کتاب العشر والزکوٰۃ، تاریخ امارت، کتاب القضاء، کتاب الفسخ والتفریق، غیر مسلموں کے جان ومال کے متعلق اسلامی نقطہ نظر اور ''پیغمبر عالم'' کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

پیغمبر عالم زندگی کے عہد آخر کی تصنیف ہے، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مولانا عبدالصمد صاحب رحمانیؒ نے اپنے اخیر زمانے میں حضرت اقدس محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح پر ایک خاص جہت سے قلم اٹھایا اور خوب لکھا، خانقاہ مونگیر ہی کے کتب خانہ میں بیٹھ کر لکھتے تھے اور جب تھک کر باہر نکلتے تو کبھی کبھی علامہ شبلیؒ کا یہ قطعہ پڑھتے:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

۱۰؍ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۴؍مئی ۱۹۷۳ء بروز دوشنبہ گیارہ (۱۱) بجے دن میں خانقاہ رحمانی مونگیر میں وفات پائی، مزار مبارک خانقاہ رحمانی کے قبرستان میں ہے (حوالہ بالا، ☆ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد-حیات وخدمات ص ۵۰۱ تا ۵۰۳ مضمون مولانا ابوالکلام قاسمی صاحب، ناشر مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ ۲۰۰۳ء)

(۲۹) مولانا حکیم حافظ قاری یوسف حسن خان صاحب بہار شریف کے جنوب میں پنہسہ سے تین چار میل کے فاصلہ پر ''بڑا کر'' گاؤں کے رہنے والے تھے، اپنے وقت کے ممتاز اہل حدیث عالم اور بیسیوں کتاب کے مصنف مولانا الٰہی بخش خان صاحب بڑاکری بہاریؒ کے صاحبزادہ ہیں ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں آپ کی ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، حافظ عبداللہ صاحب (سابق پیش امام جامع مسجد بہار شریف) کے پاس حفظ مکمل کیا، پھر مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں داخل ہوئے، خان بہادر مولانا مبارک کریم صاحب سے مرقاۃ، شرح تہذیب اور مولانا اصغر حسین صاحب سے شرح وقایہ اور ابوداؤد پڑھی، ۷؍صفر المظفر ۱۳۲۹ھ مطابق ۷؍فروری ۱۹۱۱ء کو مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد پہونچے اور مولانا محمد سجاد کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے اور باقی تمام درسی کتابیں آپ ہی کے پاس پڑھیں، فن تجوید کے لیے مولانا سجاد صاحب ہی نے مدرسہ احیاء العلوم الٰہ آباد میں استاذ القراء قاری عبدالرحمٰن مہاجر مکیؒ کے پاس ان کا نظم فرما دیا تھا، تجوید مکمل کرنے کے بعد وطن واپس لوٹ گئے، ان سے اور ان کے والد صاحب سے مولانا سجاد صاحب کے خصوصی مراسم تھے، تاریخ وفات کا علم نہ ہوسکا۔ (محاسن سجاد ص ۳۰ تا ۳۴ مضمون مولانا قاری یوسف حسن خان صاحب مع حواشی مولانا مسعود عالم ندویؒ)

علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنے مضمون ''ارتسامات گیلانیہ'' میں اپنے ایک رفیق درس (ٹونک راجپوتانہ کے زمانہ تعلیم کے) مولانا فضل الکریم کا ذکر کیا ہے جن کو کثرت کلام کی بنا پر امام المعقولات حضرت مولانا حکیم برکات احمد بہاریؒ نے ''بالشٹر'' کا خطاب دیا تھا، وہ بہار شریف کے محلّہ ''محل پر'' کے رہنے والے تھے اور اپنے نام کے آخر میں اپنے محلّہ کی نسبت سے ''محلپر وی'' لکھتے تھے، ان کو بھی الٰہ آباد میں مولانا سجاد صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہوا تھا اور مولانا کے خصوصی عقیدت مندوں میں تھے، یہ بعد میں آگرہ کی جامع مسجد کے مدرسہ میں مفتی ومدرس ہوئے، علامہ گیلانیؒ نے ان کا ذکر ''مولوی بالشٹر'' کے نام سے کیا ہے، اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں ہیں۔ (حیات سجاد ص ۴۹، ۵۰، ارتسامات گیلانیہ)

(۳۰) محاسن سجاد ص ۳۲

(۳۱) حیات سجاد ص ۳۵، ۳٦ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ

(۳۲) حیات سجاد ص ۱۲، ۱۳ مضمون مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ (خلاصہ مفہوم)

(۳۳) محاسن سجاد ص ۳۲۔ یہ مولانا حکیم یوسف حسن خان صاحب کی روایت ہے، جوان دنوں خود الہ آباد میں حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے پاس موجود تھے، جب کہ مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب نے الہ آباد سے گیا تشریف آوری کی تاریخ شعبان ۱۳۲۹ھ (مطابق ۱۹۱۱ء) لکھی ہے۔ (حیات سجاد ص ۱۰)
ممکن ہے کہ حضرت مولانا محمد سجادؒ نے رجب ہی میں الہ آباد چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہو اور اس کی ضروری تیاری بھی شروع کردی ہو، لیکن باقاعدہ روانگی شعبان المعظم میں ہوسکی ہو، اس طرح دونوں روایتوں میں تطبیق ہو جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

(۳۴) حیات سجاد ص ۳٦ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ

(۳۵) The Hare Krsnas Battles of Vishnu Avatars

Gayasur". Harekrsna.com. Archived −January 2016. March 2016. Retrieved 7

from the original on 4

(۳٦) گیا کے بارے میں یہ معلومات وکی پیڈیا سے لی گئی ہیں۔

(۳۷) تاریخی دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ بودھ مت کے زمانہ میں نالندہ میں جو یونیورسیٹی قائم تھی اس میں صرف ہندوستان نہیں؛ بلکہ تمام ایشیائی ممالک کے طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے، جہاں اعلیٰ علوم کی تعلیم پانے والوں کی تعداد کبھی کبھی بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) تک پہونچ جاتی تھی۔ (اعیان وطن، مقدمہ حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ ص ٦، شائع شدہ دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ)

(۳۸) درس حیات ص ۱۱۴، ۱۱۵، مرتبہ حضرت مولانا قاری فخرالدین گیاویؒ (متوفی ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۸ء) ناشر: مدرسہ قاسمیہ اسلامیہ گیا، ۲۰۱۰ء)

(۳۹) محاسن سجاد ص ۱۳ مضمون مولانا محمد زکریا فاطمی ندویؒ ☆ نیز خطبہ استقبالیہ دوروزہ عظیم الشان جلسہ دستار بندی ۱۵، ۱٦/ اپریل ۲۰۰٦ء، ص ۳ پیش کردہ منتظمہ کمیٹی مدرسہ انوارالعلوم گیا ☆ مدرسہ انوارالعلوم کا تعارف ص ۴ مرتبہ قاری غضنفر قاسمی، ۲۰۰۰ء۔

(۴۰) محاسن سجاد ص ۳۷، ۳۸ مضمون علامہ سید سلیمان ندویؒ

(۴۱) محاسن سجاد ص ۱۳ مضمون مولانا محمد زکریا فاطمی ندویؒ

(۴۲) محاسن سجاد ص ۱۳

(۴۳) قاضی حسین احمد صاحب بہار ہی نہیں؛ بلکہ ملک کے ممتاز ملی اور سیاسی قائدین میں تھے، آپ کا خاندان سادات سے تھا اور بڑے زمینداروں میں شمار ہوتا تھا، اس خاندان میں قضاء کا محکمہ پشتہا پشت تک رہا ہے، اسی نسبت سے قاضی کا لفظ اس خاندان کے نام کا جزو بن گیا ہے، دادیہالی اعتبار سے آپ کا شجرۂ نسب حضرت امام حسینؓ کے واسطے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک اور نانیہالی اعتبار سے حضرت سیدنا عثمان غنیؓ تک پہونچتا ہے، قاضی صاحب کا نانیہال عثمانی پیرزادوں میں تھا، پورا شجرہ نسب (پدری اور مادری) شاہ

محمد عثمانی صاحبؒ نے ان کی سوانح حیات ''حسن حیات'' میں محفوظ کر دیا ہے، قاضی صاحب کے والد گرامی کا نام عبداللطیف اور والدہ ماجدہ کا نام بی بی رحمت تھا، قاضی صاحب دو بھائی تھے، آپ بڑے تھے اور آپ سے چھوٹے کا نام محمد حسین تھا، آپ کی پیدائش مقام ''کونی بر'' ضلع گیا میں ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں ہوئی، ۱۴ رسال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا، والد نے بڑی جائیداد چھوڑی تھی، اس کا دیکھنے والا کوئی نہ تھا، اس طرح کمسنی میں گھر کا سارا بوجھ سر پر آ گیا اور تعلیم پوری نہ کر سکے، چھوٹے بھائی محمد حسین کو تعلیم کیلئے علی گڑھ بھیج دیا، قاضی صاحب کی تعلیم حفظ قرآن اور ابتدائی اردو فارسی تک محدود رہی؛ لیکن مسلسل مطالعہ اور قدیم وجدید علماء کی صحبتوں سے دل و دماغ کے دروازے کھل گئے تھے۔

والدہ ماجدہ بی بی رحمت کے چچا شاہ ابوالحسن خانقاہ برہانیہ دیورہ کے سجادہ نشیں تھے اور انہوں نے ہی آپ کی والدہ اور سب بھائی بہنوں کی شادی کرائی تھی، ان کی بار بار کی زیارت وملاقات سے تصوف کا ذوق پیدا ہو گیا اور انگریزوں کی مخالفت کا شوق بھی۔ قاضی صاحب کے منجھلے خالو میر ابو صالح ضلع گیا کے سب سے بڑے نواب تھے اور مذہبی آدمی بھی تھے، شہر کے علماء دین روزانہ ایک خاص وقت میں ان کے یہاں جمع ہوتے تھے اور مذہبی امور پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔

قاضی صاحب کو اپنے نانیہال والوں سے بڑی عقیدت تھی؛ لیکن بیعت وہ مولانا عبدالعلیم آسیؒ (جون پوری) سے ہوئے، جہاں سے ان کے والد کا روحانی سلسلہ قائم تھا، البتہ روحانی استفادہ زیادہ تر اپنے نانیہال والوں ہی سے کیا۔

قاضی صاحب تحریکی آدمی تھے، ان کی زندگی کی بڑی خصوصیت ایمان وعبادت اور تدبیر وسیاست کا اجتماع تھا، انہوں نے اپنے گاؤں میں ''تعلیم بالغاں'' کا کام اس وقت شروع کیا، جب ہندوستان میں اس تصور سے بھی لوگ نا آشنا تھے، کہتے ہیں کہ اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ ان کے گاؤں میں ایک شخص بھی ناخواندہ باقی نہ رہا، ۔۔۔ خلافت کمیٹی کے سرگرم رکن رہے، ۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس کے دوران گرفتار ہوئے اور چھ (۶) ماہ کی سزا ہوئی، ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا کانگریس کے ممبر منتخب ہوئے، آزادی کے بعد پارلیامنٹ کے ممبر نامزد ہوئے۔ ۔۔ ۱۹۲۶ء ہی میں حج کی سعادت سے سرفراز ہوئے اور مؤتمر عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں بھی شرکت کا موقعہ ملا، مولانا ابوالکلام آزادؒ سے خاص تعلق تھا، الہلال کو جاری کرنے میں ان کی تحریض کا خاص دخل تھا، انہوں نے مولانا آزاد کو اس کیلئے دس ہزار (۱۰۰۰۰) کی خطیر رقم سے بطور امداد پیش کی تھی، تبلیغی جماعت سے بھی گہرا رابطہ تھا، مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر راجندر پرشاد سے بھی گہرے تعلقات تھے، حضرت مولانا سجاد صاحب کے خصوصی عاشقوں میں تھے، آپ کے اشارے کو حکم کا درجہ دیتے تھے، مولانا سجاد کی تحریکات: مدرسہ انوار العلوم گیا، امارت شرعیہ، تحریک خلافت، جمعیۃ علماء ہند، تحریک عقد بیوگان، مسلم انڈی پنڈینٹ پارٹی سب میں پیش پیش رہے، امارت شرعیہ کے ناظم اعلیٰ بھی ہوئے، تحریکی سرگرمیوں کی وجہ سے وقت پر شادی نہ کر سکے، حضرت مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے تاخیر کے ساتھ ان کی شادی قاضی نور الحسن صاحب پھلوارویؒ کی صاحبزادی سے کرا دی، شعبان المعظم ۱۳۴۱ھ بروز یک شنبہ آپ کی شادی ہوئی، ۱۳۴۶ھ میں وہ بیمار پڑیں اور انتقال کر گئیں، مرحومہ سے قاضی صاحب کو کوئی اولاد نہیں ہوئی، قاضی صاحب نے اس کے بعد پھر شادی نہیں کی، ۱۴ رصفر المظفر ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۹ رجولائی

۱۹۶۱ء کوحرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے تہتر (۷۳) سال کی عمر میں قاضی صاحب کا انتقال ہوا، انتقال گیا شہر میں ان کے اپنے مکان میں ہوا اور تدفین شہر کے دوسری طرف پھلکو (فالگو) ندی عبور کر کے آبگلہ کے قبرستان میں ہوئی، مولانا محمد طٰہٰ ندوی جو اس وقت مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں استاذ تھے قاضی صاحبؒ کی وفات پر ایک دردانگیز نظم لکھی تھی، جس کا یہ شعر خاص طور پر قابل ذکر ہے:

خدا بخشے بڑا بے باک ہمت ور مجاہد تھا
سپاہی دن کو وہ راتوں کو شب بیدار عابد تھا

(حسن حیات ص ۲۵۲ تا ۲۵۴)

(۴۴) حسن حیات- سوانح قاضی سید احمد حسین صاحبؒ- ص ۳۹ مصنفہ: شاہ محمد عثمانیؒ، شائع کردہ مجلس علمی، ذاکر باغ اوکھلا نئی دہلی، ۱۹۹۱ء

(۴۵) محاسن سجاد ص ۳۳، مضمون قاری یوسف حسن خان صاحب، یہ بات قاری صاحب کے نام مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے ایک مکتوب گرامی سے معلوم ہوئی۔

(۴۶) محاسن سجاد ص ۶

(۴۷) حیات سجاد ص ۳۷، ۳۸

(۴۸) حیات سجاد ص ۳۸، مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ، تعارف مدرسہ انوار العلوم ص ۴

(۴۹) حیات سجاد ص ۳۸، ۳۹ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانی

(۵۰) محاسن سجاد ص ۱۳، مضمون مولانا زکریا فاطمی ندویؒ

(۵۱) یہاں پر یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اگر مولانا سجاد کی توجہ خالصتاً اسی مدرسہ پر مرکوز رہتی اور وہ خلافت، جمعیۃ، امارت شرعیہ اور مسلم پارٹی جیسی تحریکات کی وجہ سے مدرسہ سے بالکلیہ دستبردار نہ ہوتے تو بالیقین وہ اس مدرسہ کو غیر منقسم ہندوستان کی منفرد یونیورسیٹی بنا سکتے تھے، جو دینیات میں دارالعلوم دیوبند کا عکس جمیل اور علوم وفنون اور عصریات وسیاسیات میں نالندہ کی قدیم تاریخی یونیورسیٹی کی نشأۃ ثانیہ ہوتی، جہاں صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایشیا سے یورپ تک کے طالبان علوم نبوت مستفید ہونے کے لیے آتے، جیسا کہ جمعیۃ علماء ہند اور امارت شرعیہ جیسے بے مثال اداروں کے قیام سے ان کی بے نظیر صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے بقول:

''وہ ایک ایسے دریا کے مانند تھے، جس میں تموج وطغیانی کی سرجوشی تو نہ ہو لیکن روانی کا پورا جوش وخروش موجود ہو، جو بغیر دم لیے ہر آن وہر لحہ چٹانوں سے ٹکراتا، پتھروں سے لڑتا، جھاڑیوں سے الجھتا، رواں دواں، ۔۔۔۔ان کے پبلک اشغال نہ فیشن کے طور پر تھے، نہ حصول سروری وسعات کی طمع میں، وہ جس مسئلہ کو اٹھاتے وہ زندگی اور موت کا سوال بن کر ان سے چمٹ جاتا؛ اس لیے وہ کسی کام کو بے دلی (Disheartedly) کے ساتھ کر کے اپنے نفس کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے، بلکہ مجبور تھے کہ اس کے لیے اپنے فکر وعمل کی تمام قوتیں میدان میں ڈال دیں، سوتے جاگتے، بس وہی مسئلہ ان کے سامنے ہوتا اور ان کی ساری راحت وطمانیت اس کے اندر سمٹ آتی ۔۔۔۔اور چونکہ وہ ایک زبردست عالم تھے؛ اس لیے یقیناً یہ چیز انہوں نے پیغمبران عظامؑ کے اسوہ حسنہ سے اخذ کی تھی، میں نے یہ چیز وقت کے بڑے بڑے لیڈروں

میں بھی نہیں پائی‘‘۔(محاسن سجاد ص۵۳)

مگر مولانا کی مثال اپنے زمانے میں ’’یک انار صد بیمار‘‘ کی تھی، بیمار ملت کے ایک مرض کے علاج سے چھٹی نہیں ملتی تھی کہ دوسرا بڑا مرض سامنے آجاتا تھا اور مولانا ترجیح کے اصول پر اس کو چھوڑ کر دوسرے مرض کے علاج میں مشغول ہو جاتے تھے، جیسا کہ مولانا کے سیاسی امور کے شریک کار اور مزاج شناس جناب مسٹر محمد یونس صاحب سابق وزیر اعظم حکومت بہار لکھتے ہیں:

’’مولانا مرحوم کی ذات ’’یک انار وصد بیمار‘‘ کے مصداق تھی، وہ جس وقت ایک چیز کی تخلیق کر کے، اس کی ابتدائی مبادیات کو درست کر کے عملی ڈھانچہ میں لا کر کھڑا کرتے، زمانہ دوسری ضروری چیز ان کے سامنے اس طرح لا کھڑا کر دیتا کہ وہ اس کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہو جاتے، اور اس کی فکر میں لگ جاتے‘‘۔(حیات سجاد ص۸۷)

بقول ڈاکٹر کلیم عاجز:

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں ایک چراغ جلا دیا

(۵۲) حیات سجاد ص۱۳،۱۴
(۵۳) حیات سجاد ص۱۲
(۵۴) حسن حیات مصنفہ شیخ محمد عثمانیؒ ص۱۱۱،۱۱۲
(۵۵) حیات سجاد ص۱۲
(۵٦) محاسن سجاد ص۵
(۵۷) محاسن سجاد ص۲۲ مضمون مولانا اصغر حسین بہاریؒ
(۵۸) حیات سجاد ص۱۱،۱۲
(۵۹) حیات سجاد ص۳۰، مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ
(٦۰) محاسن سجاد ص۲۲ مضمون مولانا اصغر حسین بہاریؒ۔ مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے بھی حیات سجاد میں مولانا کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔(حیات سجاد ص۴۰)
(٦۱) حیات سجاد ص۲۹،۳۰ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ
(٦۲) حیات سجاد ص۳۰ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ
(٦۳) حیات سجاد ص۲۸،۲۹ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ
ایک نابغۂ روزگار شخصیت

جناب ایس ایم شرف صاحب
موضع پنہسہ ضلع نالندہ متولی صغریٰ وقف اسٹیٹ بہار شریف

ضلع نالندہ بہار کی زرخیز و مردم خیز سرزمین کی اپنی منفرد دینی، اصلاحی، علمی، ادبی، تخلیقی، تعمیری اور تشکیلی ایک قدیم و منفرد تاریخ رہی ہے۔ایک جانب جہاں شعر وادب اور تحقیقی وتنقیدی میدان عمل میں ارض ہند کے صف اول کے علماء اور ادباء کا یہ مسکن رہا وہیں مفکرین و مدبرین اسلام اور ثقہ و نابغۂ وقت کی بھی یہ آماجگاہ رہی ہیں۔جن چند اسماء نے نہ صرف اقلیم ہند بلکہ آفاقی شہرت وعزت ومقبولیت حاصل کی؛ بلکہ اپنی قلمی وقلبی جولانیوں کا سکہ رائج کیا۔ان میں حضرت سید سلیمان ندوی دیسنویؒ اور حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے اسمائے گرامی اولین صف میں شمار کئے جاتے ہیں۔آپ دونوں ہی حضرات ۱۹ ویں صدی کے وہ بے بہا جواہر ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی ہے۔آپ دونوں کے علاوہ مزید ایک جید ومتبرک شخصیت نے اس خاک پُر فیض پر جنم لیا، جس کا نام نامی حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ ہے۔آپ کے والد ماجد کے نام نامی حسین بخشؒ تھا، جو علاقہ کی ایک معزز شخصیت تھی۔آپ کے والد ماجد دو بھائی تھے، ایک کا نام: محمد مخدوم بخشؒ اور دوسرے کا نام محمد حسین بخشؒ تھا۔حضرت مخدوم بخشؒ راقم الحروف کے پردادا تھے، حسین بخشؒ کے دو صاحبزادے ایک احمد سجادؒ اور دوسرے محمد سجادؒ تھے۔

آپ کی ولادتِ باسعادت حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے شہر مسکن بہار شریف سے کوئی پندرہ کیلومیٹر جنوب کی جانب ایک قصبہ پنہسہ ہے، آپ اسی پر فیض سرزمین پر 1299ھ بمطابق 1881ء میں اس جہاں فانی میں قدم رنجہ فرمایا اور عہد طفلی سے ہی اپنی ذہانت و فطانت کے جلوے بکھیرنے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب اہل فرنگ وطن عزیز پر مطلقاً قابض و قادر ہو چکے تھے، یہاں کے ماحول وفضا میں خوف وہراس کا غلبہ تھا، مفلوکیت ومظلومیت رقص فرما تھی، انسانیت اشک ریز تھی اور استحصال واستبداد کا بازار گرم تھا، تعصّبات و

تہذیبی تصادم کا بول بالا تھا، عدم مساوات کا زہر معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا، جہالت اور غربت نے ہندوستان کو معذور بنا کر رکھ دیا تھا، محکومی نے غیرت و جرأت کو یک لخت کچل کر رکھ دیا تھا، یہ وہ دور تھا جب جز چند محبان افرنگ کے کسی کو سر اٹھا کر جینے کی اجازت نہیں تھی، شوق و ارمان اور جذبات ومحسوسات تمام کے تمام ناپید ہو چکے تھے، بچی تھی بس ناامیدی، محکومی اور تذلیل وخواری، ایسے میں کسی قوم کی فلاح و بہبود کا تصور بھی شجر ممنوعہ تھا، جہاں ناکردہ گناہوں کی بھی سزا ملتی تھی، وہاں مظلوم قوم وملت کے لیے آواز بلند کرنے والوں کا کیا حشر ہوسکتا تھا، اس امر کا ہر ذی فہم وشعور انسان اندازہ لگا سکتا ہے، ایسے میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے اصلاح ملت اور بقائے اسلام واہل اسلام کا بیڑا اپنے کاندھے پر اٹھایا، جس طرح سر سید احمد خان اصلاح معاشرہ کے لیے فکرمند رہے۔ خصوصاً قوم وملت کی بدحالی اور جہالت نے انھیں فکرمندی کے لیے مجبور کیا، عین اسی طرح مولانا موصوف کو اہل اسلام کی جہالت اور ان کا داخلی انتشار معاشرتی بے ڈھنگی اور اخلاقی تنزلی آپ کے دل پر کچوکے مارتی رہی۔ آپ کو یہ علم تھا کہ معاشرے خصوصاً حصولِ مقاصد کے لیے کسی نہ کسی کو عملی طور پر میدان کارزار میں اترنا ہوگا اور ہر قسم کی قربانی وایثار کے لیے ہمہ اوقات آمادہ رہنا ہوگا، چنانچہ آپ نے خود اپنی کمر کس لی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوئے، یہ وہ دور تھا جب ملت میں انتہائی انتشار تھا۔ لوگ فرقوں اور مسلکوں میں منقسم تھے، آپ نے اپنے کچھ معاصر باشندگان وطن کو آیات قرآنی کے حوالے سے ملت اسلامیہ میں باہمی اتفاق واتحاد قائم کرنے کی تلقین فرمائی اور امداد باہمی کے لیے انھیں قائل کیا، چونکہ موصوف ایک بہترین قیادت کی صلاحیت رکھتے تھے، چنانچہ آپ نے اس مقصد کے حصول کے لیے باضابطہ طور پر 1919ء میں جمعیت علماء ہند کی اساس ڈالی، مذکورہ تنظیم بہت ہی کم وقت میں قومی طور پر اپنا اعتماد واعتبار قائم کرلیا۔ اس متعلق مولانا محمد ثناء اللہ قاسمی یوں رقم طراز ہیں:

> ’’یہ انجمن اور جمعیت مقصود اصلی نہیں تھا، مقصد تو منہاج نبوت پر اعلاء کلمۃ اللہ کی کوشش تھی، امت کو کلمہ کی بنیاد پر متحد ومتفق کرنا تھا، مسلمانوں کو عائلی قوانین، نکاح، طلاق، میراث، خلع اوقاف وغیرہ کو اصلی شرعی صورت میں قائم رکھنے کی جدو جہد کرنا تھا۔ مسلمانوں کو تعلیم، معاش اور ترقی کے میدان میں اسلامی نظم تعلیم اور اسلامی نظام تجارت کو پھر سے رائج کرنا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امیر شریعت کے ماتحت سارے مسلمانوں کو جمع کر کے اطاعت اولاد کے قرآنی حکم کو زمین پر نافذ کرنا تھا‘‘۔

متذکرہ بالاسطور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے جو خواب تھے، اس کی تکمیل جمعیۃ علماء ہندنامی تنظیم سے ہوتی نظرنہیں آرہی تھی، چونکہ مولانا موصوف کے ساتھ مذکورہ تنظیم میں ارض ہند کی کئی جید شخصیات شامل تھیں، ان میں مفکرین بھی تھے اور مدبرین بھی، اسی کے باہم ناظم بھی، چنانچہ لوگوں نے آگے کا لائحہ عمل اور حکمت عملی طے کرتے ہوئے ایک نئ تنظیم کی تشکیل پر غور وفکر کیا اور اس نتیجے پر پہونچے کہ مزید ایک تنظیم تشکیل دی جائے اور یہ تنظیم ''امارت شرعیہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ امارت شرعیہ کی تشکیل کے متعلق جناب محمد ثناء اللہ قاسمی یوں فرماتے ہیں:

''19 رشوال 1339ھ مطابق 26 جون 1921ء کو مولانا کی جدوجہد رنگ لائی اور غیر منقسم بہار میں ایک زریں دور کا آغاز ہوا۔ حضرت مولانا سید بدرالدین قادریؒ سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پہلے امیر شریعت منتخب ہوئے، مولانا سجاد کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کی نیابت قبول کرنے کو بھی تیار نہیں تھے، بڑی مشکل سے انھیں اس بات پر آمادہ کیا جاسکا کہ وہ نائب امیر شریعت کی حیثیت سے ان خاکوں میں رنگ بھریں، جو انھیں نے برسوں کی فکر کے بعد بنائے ہیں، چنانچہ مولانا 17 شوال المکرّم 1359ھ مطابق 18 نومبر 1940ء تک جو ان کے وصال کی تاریخ ہے اس عہدہ پر کام کرتے رہے اور امارت عرعیہ کی بقا، استحکام کے لیے چوطرفہ لڑائی مول لیتے رہے، علمی اشکالات کے جوابات دیئے ریاست کا دورہ کیا، گاؤں گاؤں میں تنظیم قائم ہوئی دارالافتاء اور دالقضاء نے کام شروع کیا، اس طرح دیکھا جائے تو یہ پورا ادور امارت شرعیہ کی توسیع ااور استحکام کا دور ہے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بجا لکھا ہے کہ 'بہار میں امارت شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت ہے، زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں''۔

یہ واقعی حیرت انگیز امر ہے کہ ایک انسان معاشرے کی اصلاح اور ملت کے فروغ کے لیے اس قدر فکرمند اور اس سے زیادہ مسرت آفریں نکتہ یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف فکر کی؛ بلکہ اپنی فکر کو عملی جامہ دیتے ہوئے ایک ایسی تنظیم کی تشکیل دی، جو قومی طور پر مددگار و معاون ثابت ہوا اور گمراہ، کم علم، کم بصیرت انسانوں کو احکام الٰہی اور اسوہ نبوی کو اختیار کرنے کے لیے آمادہ کیا علاوہ ازیں زندگی اور خانگی معاملات میں شریعت کو ملحوظ رکھنا بھی انھوں نے سکھایا۔ یہ کام محض ایک عام انسان کا نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے موصوف کو اپنے دین متین کی حفاظت اور تبلیغ واشاعت کے لیے خود منتخب کر رکھا تھا۔ آپ نے جس جاں سوزی، صبر وتحمل، بردباری کا مظاہرہ

کیا ہے وہ آپ ہی کا خاصہ ہے۔ اللہ رب العزت آپ کو اس کار خیر کا جزائے عظیم عطا فرمائے۔

محترم ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ نے اس حب ملت، تقویٰ اور قوم وملت کے مفاد کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ یوں ہی پیدا نہیں ہوا؛ بلکہ آپ نے یہ تمام صفات عالیہ اپنے اتالیق سے اخذ کیا، آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے چچیرے بہنوئی مولوی حافظ سید وحید الحق استھانوی کی معیت وصحبت میں حاصل کی اور پھر 15 سال کی عمر میں آپ بڑے بھائی مولانا احمد حسن کانپوری کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے اور اس کے بعد آپ دیوبند تشریف لے گئے؛ مگر محض 6 ماہ کے اندر دیوبند کو خیر آباد کہہ دیا اور پھر 1317ھ میں مولانا عبدالکافیؒ سے مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں مشکوۃ المصابیح، تفسیر جلالین، ملا حسن وغیرہ پڑھی اور 1322ھ میں یہیں سے سند فراغت حاصل کی۔ 17 تا 19 ربیع الاول 1322ھ مطابق 3 تا 5 جون 1905 میں سہ روزہ جلسہ کے موقع سے اکابر کے ہاتھوں سر پر دستار فضیلت باندھی گئی۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ نے جہاں حصول تعلیم میں اپنے شب و روز محنت شاقہ میں گذارا، وہیں تدریسی میدان عمل میں بھی آپ نے آرام وراحت کو نا قابل اعتنا بھی نہیں سمجھا، چنانچہ آپ نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز مدرسہ اسلامیہ بہار شریف (نالندہ) سے کیا؛ لیکن جلد ہی اپنے استاد مولانا عبدالکافیؒ کی طلبی پر تین سال بعد 1335ھ میں مدرسہ سبحانیہ الہٰ آباد چلے گئے چار ماہ قیام کے بعد پھر مدرسہ اسلامیہ آگئے اور ڈیڑھ سال اس مدرسہ کو اپنی تدریسی صلاحیتوں سے نوازتے رہے۔ 1326ھ میں دوبارہ الہٰ آباد جانا ہوا، جہاں وہ 1329ھ تک تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ شعبان 1329ھ میں الہٰ آباد کو خیر باد کرکے شہر گیا (بہار) کی طرف رخ کیا اور مولانا عبدالوہاب فاضل بہاری کے ذریعہ قائم کردہ مدرسہ انوار العلوم کی نشاۃ ثانیہ کا کام اپنے ذمہ لیا اور دیکھتے دیکھتے اس ادارہ نے مرکزی مقام حاصل کرلیا، یہاں آپ نے ایک طرف ایک منتظم کی حیثیت سے اپنی صلاحت کا لوہا منوایا، دوسری طرف کامیاب مدرس کی حیثیت سے منتہی کتابوں کا درس دیا، طلبہ آپ کے درس سے بھی استفادہ کرتے اور آپ کی شفقت سے بھی بہرہ ور ہوتے، اس زمانہ کے واقعات جو کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت طلبہ کی فلاح کے لیے سرگرم اور مستعد رہا کرتے، مولانا کی زندگی کے سترہ سال اس کام میں صرف ہوئے، یہ سترہ سال مولانا کی زندگی کے اس لیے بڑے قیمتی ہیں کہ ان سالوں میں مسلسل مطالعہ کے نتیجہ میں مولانا کو وہ مقام حاصل ہوا، جسے علمی دنیا میں رسوخ فی العلم، تفقہ فی الدین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف مدرسہ کے انتظام وانصرام کی وجہہ سے مولانا کی تنظیمی صلاحیتوں کو جلا ملی،

جو آگے کے مراحل میں مولانا کو بہت کام آئے اور کہنا چاہیے کہ یہ ایک ربانی نظام تھا، جو مولانا کو مستقبل میں عظیم کام کے لیے تیار کر رہا تھا۔

مولانا موصوف نے جہاں اپنی علمیت کا لوہا منوایا وہیں آپ نے تدبر اور سیاست میں بھی چابک دستی کا خوب خوب مظاہرہ کیا۔ آپ نے جب معاشرے کا مشاہدہ جب بغائرنظر کیا تو آپ کی فہم میں یہ امر حقیقی آیا کہ محض تعلیم اور تقریر سے ملت اسلامیہ کی معاشی ومعاشرتی ترقی ممکن نہیں ہے؛ کیوں نکہ سیاسی طور پر یہ ملت معتوب ہے، چنانچہ ابنائے اسلام کے فروغ کے مدنظر میدان سیاست میں بھی اترنے کے لیے کمر بستہ ہوئے، چنانچہ اس مقصد کے تحت آپ نے انڈی پنڈنٹ پارٹی قائم کی اور ایس زرردار تحریک چلائی کہ 1936ء کے الیکشن میں سیاست کے مرد میداں مولوی شفیع داؤدی کی احرار پارٹی اور عبدالعزیز صاحب کی پارٹی کو منہ کی کھانی پڑی اور مولانا انڈی پنڈنٹ پارٹی کو ایسی جیت دلائی کہ کانگریس کے حکومت سازی سے انکار کے بعد دوسری بڑی پارٹی کی حیثیت سے انڈی پنڈنٹ پارٹی کی حکومت بن گئی، مولانا نے اپنی نگرانی میں مسٹر محمد یونس بارایٹ لا کو وزیر اعظم کے عہدے کا حلف دلوادیا، بے نفسی کا یہ عالم کہ حلف برداری کی تقریب میں پیدل اور یکہ کے ذریعہ تشریف لے گئے، مسٹر یونس جن کے پاس اس زمانہ میں دو گاڑی تھی، وہ بھی ہمت نہیں جٹا پائے کہ مولانا کو لینے کے لیے گاڑی بھیج دیتے۔

الغرض مولانا موصوف کی شخصیت نہ صرف قومی طور پر؛ بلکہ پورے برصغیر میں منفرد اور یکتا تھی، آپ نے جس میدان عمل میں اپنا قدم رکھا، وہاں اپنا نشان راہ چھوڑ دیا، جس پر لوگ چلتے ہوئے مقبولیت اور شہرت کی معراج حاصل کی، جہاں اس امر کی توضیح ناگزیر ہے کہ انسان کی نیت میں اگر اخلاص ہو اور عزم وارادہ مستحکم ہو تو مثل فرہاد کے پہاڑوں کا سینہ چیر کر جوئے شیر نکالنے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے، بلاشبہ مولانا نے اسی حقیقت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے یہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیا، جو فقید المثال ہیں، بلاشبہ آپ نے بیک وقت کئی محاذ پر جنگ چھیڑ رکھی تھیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تمام محاذ پر آپ کو کامیابی عطا کی اور سرفراز کیا۔ آپ کی ہمہ جہت شخصیت جس قدر مستحکم نظر آتی ہے، وہ بے نظیر ہے۔ آپ بیشک ملت اسلامیہ کے سچے اور حقیقی ہمدرد تھے، جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے 17 شوال 1359ھ مطابق 8 نومبر 1940ء بروز دوشنبہ 4:45 بجے شام کو اپنے جوار رحمت میں بلالیا۔ آپ کا جسد خاکی قصبہ پھلواری شریف میں مدفون ہے۔ فرحمہ اللہ

✿✿

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد
ایک جامع کمالات اور جامع محاسن شخصیت
ایک اجمالی، سرسری تعارف

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی
مولویان، کاندھلہ، ضلع شاملی (یوپی)

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد

یوں تو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں خصوصاً انگریزوں کے خلاف سیاسی جدوجہد اور اقدام کے سلسلہ میں پچاسوں فتاویٰ اور تحریریں لکھی گئیں اور عام ہوئیں، لیکن اس وسیع فہرست میں ایک فتویٰ یا تحریر اس پہلو سے منفرد ہے کہ اس نے اس ملک کو، جس کو غیر منقسم ہندوستان کہا جاتا ہے، بہت دور تک اور بڑے بھرپور انداز میں متأثر کیا ہے، ایسا کہ اس کے اثر سے پورے ملک میں ایک بیداری آ گئی، احساس عمل کی دنیا متحرک ہوئی اور انگریزوں کے خلاف بڑی منظّم، پر جوش، متحرک اور ہمہ جہت جدوجہد کا دروازہ کھل گیا، یہ تحریر برصغیر کے ایک ممتاز عالم، فقیہ، مدبر او رمفکر مولانا ابوالمحاسن سجاد کا وہ تاریخی فتویٰ ہے، جس کو جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس کلکتہ میں علمائے ہند اور رہنمایان ملت کی مشترکہ دستاویز کے طور پر پڑھا، سنا اور منظور کیا گیا، اس سے پہلے جمعیۃ علمائے ہند، عدم تعاون کی تحریک شروع کر چکی تھی، اس فتوے نے اس تحریک کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ جمعیۃ علمائے ہند کے جو اجلاس ہوئے ان میں بھی اس فتویٰ کی بازگشت بلکہ گونج سنائی دیتی رہی اور اس کے اکثر رہنماؤں اور صدور نے اس کی تائید کی اور اس کو ایک قومی ضرورت اور اس دور کی دستاویز بنانے کے لئے اقدامات کا اعلان فرمایا۔

خود مولانا ابوالمحاسن سجاد نے بھی اپنی بعد کی تحریرات خصوصاً اجلاس امروہہ میں، اس مسئلہ کو اور زیادہ وضاحت اور قوت کے ساتھ بیان کیا اور اس خطبہ کا آخر کا بڑا حصہ اسی بحث پر مشتمل ہے (۱) اور وہاں موجود تمام علماء اور اس کے بعد ہندوستان کے اکثر ممتاز اہل علم وفتویٰ نے اس سے اتفاق کر کے اس پر اپنی تائید ثبت کر کے، اس کو ایسی بڑی، ملی، قومی دستاویز بنا دیا تھا، جس نے ہندوستانی قوم، خصوصاً مسلمانوں میں حرکت وعمل کی، ایک ایسی لہر دوڑا دی تھی جس کا کوئی کنارہ

نہیں تھا۔

یہ فتویٰ کب لکھا گیا، اس کی صحیح تاریخ مجھے معلوم نہیں۔ سب علماء اور قائدین نے اس کو وقت کی ضرورت اور اپنے دل کی آواز اور اہم دینی تقاضہ سمجھ کر، اس پر تائیدی دستخط فرمائے، یہ دستخط کب شروع ہوئے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ فتویٰ کے بعد جو تائیدی دستخط ہیں، ان میں پہلے دستخط مولانا عبدالقدیر بدایونی کے اور دوسرے مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی کے ہیں، جس کے نیچے ۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ [۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء] تحریر ہے، اسی سے سنہ اور تاریخ تحریر متعین کی جاسکتی ہے۔

اس فتوے کو جمعیۃ علماء کے اجلاس کلکتہ منعقدہ: ۲۵ تا ۲۸ شعبان ۱۳۴۴ھ۔ ۱۱ تا ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء میں پیش کیا گیا اور وہاں موجود سب علماء کی تائیدی تحریرات کے بعد اس کو ایک قومی دستاویز اور ملت کے اجتماعی فتوے کے طور پر شائع اور عام کر دیا گیا تھا۔

اس فتویٰ کے مؤلف ومرتب، فاضل جلیل مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب تھے، مولانا ابوالمحاسن سجاد صرف اسی ایک تحریر کے مرتب نہیں تھے، بلکہ وہ بڑے جید فاضل، منجھے ہوئے کامیاب مدرس، طلباء کے ذہن ودماغ میں علم کو انڈیل دینے والے استاذ، صاحب نظر مصنف، فقہ اور عصر حاضر کے معاملات ومسائل پر بصیرت کے ساتھ نظر رکھنے والے مبصر ومفتی اور بہت بڑے سیاسی رہنما تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

> ''ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا عطیہ، فکر رسا اور رائے صائب تھی، مسائل اور حوادث میں ان کی نظر بہت دور دور پہنچ جاتی تھی، وہ ہر گتھی کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتے تھے، حریف کی چالوں کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے، باوجود تواضع وخاکساری کے اپنی رائے پر پوری قوت کے ساتھ جمتے تھے، اور محض ہٹ اور ضد سے نہیں بلکہ دلائل کی قوت اور مصالح کی طاقت سے، وہ دوسروں سے منوانے میں کامیاب ہوجاتے تھے'' (۲)

یہ فتویٰ اگرچہ صرف آٹھ صفحات پر مشتمل ہے مگر مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب نے اپنی خداداد صلاحیت وفقاہت کو کام میں لاکر، اس کا واضح، مختصر اور جامع جواب لکھا ہے، جس میں متعلقہ تمام سوالات ومباحث کو مختصر الفاظ میں پوری طرح حل کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ یہ فتویٰ غالباً سب سے پہلے، ہندوستان میں تحریک خلافت اور انقلابی تحریرات وخطبات کی اشاعت میں سب سے آگے اور نمایاں ممتاز شخصیت منشی مشتاق احمد صاحب میرٹھی نے اپنے قومی دارالاشاعت، محلّہ کوٹلہ، میرٹھ سے اسی وقت شائع کر دیا تھا، بعد میں اور مقامات سے بھی چھپا۔ (۳) پہلی طباعت پر ایک سوا ٹھارہ

[۱۱۸] علماء کے تائیدی دستخط ہیں، بعد کی اشاعتوں میں یہ دستخط بڑھتے بڑھتے پانچ سو تک پہنچ گئے تھے، یہ فتویٰ کیا تھا ایک بانگ جرس اور شعلہ جوّالہ تھا، جس نے پورے ملک میں جذبہ حریت کو عام اور انگریزوں کے خلاف تحریک اور جدوجہد کو عوام کے مقصد حیات میں تبدیل کر دیا تھا۔

اگر چہ اس فتویٰ کے بعد انگریز کے خلاف جدوجہد کے سلسلہ میں اور بھی کئی فتوے لکھے گئے اور شائع ہوئے، لیکن کسی بھی فتویٰ اور تحریر کو وہ مرتبہ، اعتماد اور شہرت حاصل نہیں ہوئی جو اس فتویٰ کو ہمیشہ حاصل رہی، اس فتویٰ کو انگریز کے خلاف جدوجہد کی تاریخ میں ہمیشہ ایک دستاویزی مقام حاصل رہے گا، لیکن یہ مولانا ابوالمحاسن سجاد کا واحد کارنامہ نہیں ہے، بلکہ مولانا کی زندگی کی خدمات کے ایسے اور بھی بہت سے عنوانات ہیں، جن میں سے ہر ایک کو اک سنگ میل اور پڑاؤ کہا جاسکتا ہے، چند صفحات میں ان سب خدمات کے تذکرہ کی بات مشکل ہے، لیکن مولانا کی جمعیۃ علمائے ہند کے حوالہ سے سیاسی خدمات اور بعض تحریرات کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا، مگر اس سے پہلے مولانا کے بعض احوال قابل ذکر ہیں۔

وطن، خاندان اور سنہ پیدائش:

نالندہ، بہار کا ایک بہت پرانا اور علمی نسبتوں سے آراستہ تاریخی مقام ہے، اسی نالندہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''پنہسّہ'' (Panhassah) میں، سادات کے بھی چند گھرانے آباد تھے، ان ہی میں سے ایک گھر میں جو مالی اعتبار سے آسودہ اور زمین وجائیداد کی وجہ سے باحیثیت تھا، چودہویں ہجری کے سرآغاز پر، صفر ۱۳۰۱ھ [دسمبر ۱۸۸۳ء] (۴) میں ایک بچہ پیدا ہوا، جو بعد میں نہ صرف اس خطہ بلکہ برصغیر میں تمام مسلمانوں اور دنیائے علم وکمال کے لئے سوغات اور علم وعمل کی دنیا میں ایک نادر مثال بن کر، مثل ماہتاب جلوہ گر ہوا۔ اس بچہ کا نام ''سجاد'' رکھا گیا، دنیا نے اس کو ''ابوالمحاسن سجاد'' کے نام سے پکارا اور یاد رکھا۔ مولانا کی عمر ابھی صرف چار سال کی تھی کہ مولانا کے والد مکرم ۱۳۰۴ھ [۱۸۸۶ء] میں دنیا سے رخصت ہوگئے، بڑے بھائی احمد سجاد نے تربیت کی، چھ سال کی عمر میں تعلیم کی ابتداء ہوئی، وطن کے نواحی علاقے بہار شریف میں، مولانا کے قریبی رشتہ دار، مولانا سید وحید الحق کا مدرسہ اسلامیہ، اس نواح کے دینی، تعلیمی اداروں میں بہت ممتاز تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

''تیرہویں صدی کے شروع میں صوبہ بہار میں، مولانا وحید الحق صاحب استھانوی بہاری کے دم قدم سے علم کوئی رونق حاصل ہوئی، قصبہ بہار میں انہوں نے مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور بہت سے عزیزوں کی تربیت کی، ان میں سے ایک

مولانا سجاد بھی تھے“

مولانا کا گاؤں بہار شریف سے صرف چھ میل کے فاصلہ پر تھا اور یوں بھی مولانا کی طبیعت اس وقت تک تعلیم سے مانوس نہیں ہوئی تھی، اس لئے مولانا کے بھائی مولوی احمد سجاد صاحب، مولانا ابوالمحاسن کو کانپور لے گئے، وہاں ہندوستان کے نامور معقولی، بہت برگزیدہ اور مشہور استاذ، مولانا احمد حسن پنجابی کانپوری کے درس میں شامل ہوگئے۔ مولوی احمد سجاد صاحب کانپور میں بیمار ہوگئے تھے، اس لئے دونوں بھائی مجبوراً وطن واپس ہوگئے، لیکن مولانا ابوالمحاسن سجاد، اس وقت تک بھی حلقۂ تعلیم سے مانوس نہیں ہوئے تھے، ایک روز بڑے بھائی نے سخت تنبیہ اور پٹائی کی، مولانا اسی دن گھر سے غائب ہوگئے، کچھ دنوں تک تو پتہ ہی نہ چلا، بعد میں معلوم ہوا کہ کانپور میں ہیں اور پڑھ رہے ہیں، یہ مولانا کی باقاعدہ تعلیم کا سر آغاز تھا، کانپور سے تین سال کے بعد واپس ہوئے، اس وقت شرح وقایہ پڑھ رہے تھے، تعلیم کے اسی جذبہ میں سرشار کانپور سے دیوبند پہنچے اور اسباق میں شریک ہوگئے، دیوبند میں چھ ماہ رہے ہوں گے کہ وہاں تبت کے ایک لڑکے سے لڑائی ہوگئی، اس لئے مولانا وہاں سے تعلیم چھوڑ کر واپس ہوگئے، ۱۳۱۷ھ [۱۹۰۰ء] میں کانپور سے الہ آباد آئے، اور مدرسہ سبحانی میں داخل ہوکر، مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر جلالین، اور ملاحسن وغیرہ مولانا عبدالکافی سے پڑھنے لگے، الہ آباد میں مولانا کا ۱۳۲۲ھ [۱۹۰۴ء] تک قیام رہا اور عربی کے تمام نصاب کو وہیں مکمل کیا۔ (۵)

ربیع الاول ۱۳۲۲ھ [جون ۱۹۰۴ء] میں مدرسہ سبحانیہ کا جلسۂ دستار بندی بڑی شان سے ہوا، اسی میں مولانا کی دستار بندی کی گئی۔

تدریس:

مدرسہ الہ آباد سے فراغت کے بعد مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں بحیثیت مدرس تقرر ہوا، یہاں تین سال تک کام کرتے رہے، پھر اپنے استاذ مولانا عبدالکافی کی ہدایت پر الہ آباد واپس ہوگئے، اور اپنی مادر علمی مدرسہ سبحانیہ سے یکم محرم ۱۳۲۵ھ [۱۵ رفروری ۱۹۰۷ء] کو بحیثیت مدرس وابستہ ہوئے، لیکن چار مہینے کے بعد واپس مدرسہ اسلامیہ بہار شریف آگئے، یہاں ڈیڑھ سال پڑھایا تھا کہ استاذ مکرم نے پھر طلب کرلیا اور ذی قعدہ ۱۳۲۶ھ [دسمبر ۱۹۰۸ء] میں مولانا واپس مدرسہ سبحانیہ کے مدرس بنالئے گئے، جہاں ۱۳۲۹ھ [۱۹۱۱ء] تک کام کرتے رہے، شعبان ۱۳۲۹ھ [اگست ۱۹۱۱ء] میں الہ آباد ترک کرکے، گیا کے ایک قدیم مدرسہ، انوارالعلوم کو زندہ کیا، مولانا کی غیر معمولی صلاحیت، اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور غیر معمولی، فکری تصرفات واجتہادات کی وجہ سے اس مدرسہ کو بہت

جلد مقبولیت حاصل ہوئی، ہر طرف سے طلباء آنے لگے، اگرچہ ابتدائی سالوں میں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا ہوا، چنوں اور پتوں پر گذارا کرنا پڑا، لیکن مولانا کے پایۂ استقلال میں کوئی کمی نہ آئی، مدرسہ اور طلباء کو ہر قسم کے سامان اور سہولتیں میسر آئیں، اور مدرسہ کی شاندار عمارت بھی تیار ہوگئی۔

مولانا کا ایک اعلیٰ درجہ کا کمال اور خوبی یہ تھی کہ:

جہاں بیٹھ جائیں، وہی میخانہ بنے

مولانا جس مدرسہ میں جاتے، اس کی علمی شان کا چرچا اور مقام دوبالا نہیں بلکہ کئی گنا زیادہ ہوجاتا اور اچھے اچھے مدرسوں کے طلباء کھنچ کر مولانا کے حلقۂ درس میں پہنچ جاتے اور ان سے استفادہ کی کوشش کرتے اور خود مولانا بھی طلباء پر ایسے شفیق اور مہربان تھے کہ جس حال میں طلباء رہتے مولانا بھی وہی انداز اختیار کرلیتے اور جو کچھ طلباء اور بچوں کو کھانے کو ملتا، اپنا گذارا بھی اسی پر کرتے۔

سیاسی دلچسپی اور مصروفیات:

الٰہ آباد کے زمانۂ تدریس میں مولانا کے ایک شاگرد انگریزی اخبارات سے مولانا کو خبریں سناتے، خصوصاً عالم اسلام کی زبوں حالی سے واقف کراتے تھے، مولانا جو بڑی حساس طبیعت کے صاحب نظر شخص تھے، ذکاوت، تدبر، فکر رسا اور جرأت وہمت کا فراواں ذخیرہ رکھتے تھے، ممکن نہ تھا کہ وہ ملت اسلامیہ ہندیہ اور عالم اسلام کے مسائل سے یکسر علیحدہ اور یکسو رہتے، جیسے جیسے سوچتے اور معلومات میں اضافہ ہوتا، ویسے ویسے مولانا کی یہ فکر، یہ احساس بڑھتا رہتا تھا کہ درس وتعلیم سے بڑھ کر ملت کے اور بھی بہت سے کام ہیں، ان کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ اس خیال کا عمومی اظہار اس وقت ہوا، جب مولانا گیا پہنچے، اور وہاں رہتے ہوئے علماء کی ایک تنظیم قائم کی جو تنظیم علماء بہار کے نام سے موسوم ہوئی اور جو غالباً غیر منقسم ہندوستان میں اپنی طرح کی پہلی مرتب تنظیم تھی، یہ تنظیم ۳۶-۱۳۳۵ھ [۱۹۱۷ء] میں قائم ہوئی تھی، عربی مدارس میں ایک نیا اور اصلاحی نصاب تعلیم نافذ کیا، جمعیۃ علماء کے قیام کے لئے وسیع جدوجہد کی، امارت شرعیہ اور ہندوستان کی تمام ملی، سیاسی تنظیموں سے قریب رہے اور ان کے معاملات ونظریات کو جاننے کی کوشش کی۔

سب سے پہلے ۱۹۱۷ء [۳۶-۱۳۳۵ھ] میں مولانا نے انجمن علماء قائم کی تھی، اور اسی وقت سے ہندوستان میں ایک بڑی، قومی، ملی تنظیم کے قیام کے لئے متحرک اور سرگرم ہوگئے تھے، جب مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا مفتی کفایت اللہ اور حکیم اجمل خاں کی تائید سے جمعیۃ علماء کے لئے ابتدائی بات اور مشورے ہوئے تو علامہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں ''مولانا موصوف اس کے لبیک کہنے والوں میں سب سے اول تھے'' (۶)

نیز مولانا احمد سعید دہلوی نے جو جمعیۃ کے سب سے پہلے رفقاء میں ممتاز اور اس کے سکریٹری جنرل بھی رہے اس کی اس طرح صراحت کی ہے:

''مولانا مرحوم سے سب سے پہلی ملاقات، جہاں تک مجھے یاد ہے، خلافت کانفرنس میں ہوئی، یہ خلافت کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی تھی، اسی خلافت کانفرنس میں بعض اہل علم نے یہ مشورہ کیا کہ ہندوستان کے علماء کی تنظیم ہونی چاہئے، چنانچہ علماء کی ایک مختصر اور مخصوص جماعت کا خفیہ اجتماع، دہلی کے مشہور بزرگ سید حسن رسول نما کی درگاہ پر منعقد ہوا، اس میں تمام حضرات نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، حضرت مولانا سجاد صاحب نے بھی اس جلسہ میں ایک مختصر تقریر فرمائی تھی، اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا کے جذبات ایمان کا ترجمان تھا۔ حاضرین کی تعداد اگرچہ دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی، لیکن کوئی آنکھ اور کوئی دل ایسا نہ تھا جس نے اثر قبول نہ کیا ہو، یہ مجلس اگرچہ دو گھنٹے سے زیادہ کی نہ تھی، ایک گھنٹہ بحث ومباحثہ میں خرچ ہوا اور ایک گھنٹہ عہد و پیمان میں صرف ہوا، لیکن اسی جلسہ کا یہ اثر تھا کہ جمعیۃ علمائے ہند قائم ہوئی اور اس کا پہلا جلسہ امرتسر میں خلافت کانفرنس کے ساتھ منعقد ہوا''۔(۷)

تحریک خلافت کا قیام اوراس کے لئے مولانا کی کوشش:

مولانا کی کس کس خدمت اور پہلو کا تذکرہ کیا جائے، تحریک خلافت کی بنیادوں میں بھی ابتدائی مشورہ مولانا کا تھا، مولانا اس کے لئے سب سے پہلے لکھنؤ، پھر بمبئی گئے، اور جب تک کہ تحریک خلافت کے ابتدائی نقوش، نظام اور ترتیب کار متعین نہیں ہوگیا، مولانا اس کے لئے فکرمند رہے۔

جمعیۃ علمائے ہند کی تشکیل وتاسیس کے لئے سب سے پہلی آواز مولانا کی تھی اور مولانا جمعیۃ کے سب سے پہلے بانیان میں سے ہیں:

جمعیۃ کی بنیاد کے سلسلہ میں کوشش اور سعی پیہم کا مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی ذکر کیا ہے:

''جمعیۃ علمائے ہند کے قیام کے لئے ہندوستان کے اکثر صوبوں میں سفر کر کے علماء میں اس کی تبلیغ کی اور لوگوں کو آمادہ کیا، لیکن عمل کی طرف پہلا قدم مولانا [سجاد] کا تھا اور پہلا اجلاس ہندوستان میں جمعیۃ کا، بنام انجمن بہار، شہر بہار میں بزمانۂ عرس حضرت مخدوم الملک منعقد ہوا، اس کے بعد جمعیۃ علمائے ہند قائم ہوئی''۔(۸)

اس وقت کارزار سیاست میں جو قدم رکھا اور ملت کی فلاح و بہبود کے لئے کھڑے ہوئے تو زندگی کے آخری دنوں تک، اسی فکر وجد وجہد میں لگے رہے۔ تحریک خلافت، جمعیۃ علمائے ہند،

کانگریس، امارت شرعیہ اور اس وقت کے جو بھی علمی، ملی کام اور میدانی خدمات تھیں، مولانا تہہ دل سے ان کے رفیق اور تمام قوت وصلاحیت کے ساتھ ان کے دم ساز رہے، جمعیۃ سے مولانا کا رشتہ بہت گہرا اور دائمی تھا، جس دن سے جمعیۃ کی بنیاد پڑی اور اس نے عملی اقدامات کا ارادہ کیا، اسی وقت سے مولانا اس کے ساتھ ساتھ چلے، اس کے ناظم رہے، تمام اہم جلسوں میں شرکت کرتے، ہر ایک کی منصوبہ سازی میں آگے آگے رہتے، اسی مقصد سے جمعیۃ کے اجلاس کلکتہ [۲۵/تا۲۸/شعبان ۱۳۴۴ھ۔۱۱/تا۱۴/مارچ ۱۹۲٦ء] کے لئے وہ معرکہ آرا فتویٰ لکھا، جس کا اوپر تذکرہ آچکا ہے۔

جمعیۃ کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار اور حاضر رہتے تھے، ۱۳۴۳ھ [۱۹۲۵ء] میں جمعیۃ کا جو سالانہ خصوصی اجلاس مرادآباد میں منعقد ہوا، اس کی صدارت کے لئے مولانا کا نام منتخب ہوا تھا، مولانا نے اس کے لئے ایک بھرپور اور طاقت ور خطبہ صدارت تحریر فرمایا، جو بڑے سائز کے ستانوے [۹۷] صفحات پر مشتمل ہے، یہ خطبۂ صدارت برقی پریس مرادآباد سے چھپا تھا۔ (۹) جس میں مولانا نے فرمایا تھا:

> ''کہ اگر ہم نے جلد از جلد اسلام اور مسلمانوں کی فکر نہ کی تو یقین مانئے کہ تمام بطالت پرست، اسلام اور مسلمانوں کے بیخ وبن کو اکھاڑ کر رکھ دیں گے، اگر کوئی طاقت اس وقت ہندوستان میں موجود ہے، تو وہ صرف جمعیۃ علماء ہے، کیوں کہ جتنے مصائب مسلمانوں پر آرہے ہیں، وہ صرف ترک شریعت کے باعث، اس لئے اگر اس کا دفاع بھی ممکن ہے تو اعتصام بالشریعۃ کے ذریعہ'' (۱۰)

اس میں جمعیۃ علمائے ہند کے مقاصد اور مسائل مہمہ کا تذکرہ ہے، مثلاً خلافت اسلامیہ کی بات ہے، سیاسیات سے علمی بے اعتنائی اور عملی غفلت پر گفتگو کی ہے، سیاسیات میں علماء کے دخل کی ضرورت کی جانب توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے، کہ سیاست عین دین ہے، علمائے سلف کا سیاست میں کس طرح اشتغال رہا، اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، حجاز اور مسئلۂ خلافت کا بھی تذکرہ ہوا ہے، ترکِ موالات اور اس کے فتویٰ پر بھی بات کی گئی ہے۔

مولانا برسوں سے اس بات کے لئے کوشش کررہے تھے کہ پورے ملک میں مسلمانوں کے لئے ایک مؤثر نظام شریعت قائم کیا جائے اور اس کے لئے امیر شریعت فی الہند مقرر ہو، اس مقصد کے لئے مولانا بہار میں کوشش کررہے تھے، جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس لاہور، ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ [دسمبر ۱۹۲۱ء] میں امیر شریعت کے فرائض واختیارات کا مسودہ، مرتب کرکے پیش کیا گیا اور اس میں امیر اور ان کے ماتحتوں کے کیا اختیارات وفرائض ہوں گے، اس پر مولانا ابوالمحاسن سجاد

نے ایک تحریر مرتب کی، جو مولانا عبدالحلیم صدیقی [نائب ناظم جمعیۃ علمائے ہند] کی جانب سے رجب ۱۳۴۰ھ [مارچ ۱۹۲۲ء] میں شائع کر کے، جمعیۃ کی تمام شاخوں اور ذمہ داروں کو بھیجی گئی تھی، اس کے بعد بھی جمعیۃ کے جو جلسے ہوتے رہے، جو تحریریں لکھی گئیں اور منصوبے طے کئے گئے، ان سب میں مولانا کی بنیادی شرکت رہتی تھی، ایسی کئی تحریریں میرے ذخیرہ میں موجود ہیں، افسوس ہے کہ یہاں ان سب کا تفصیلی تعارف پیش کرنے کا موقعہ نہیں۔

نہرو رپورٹ پر تبصرہ:

مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد کو جن باتوں نے کانگریس سے دور کیا اور ان کو مسلمانوں کے حوالہ سے کانگریس کا صحیح چہرہ دیکھنے کا موقعہ ملا، ان میں سے ایک نہرو رپورٹ بھی تھی، جو ۱۶/اگست ۱۹۲۸ء [۲۹/صفر ۱۳۴۷ھ] کو شائع ہوئی تھی، اور اس کی وجہ سے مسلم تنظیموں میں ایک ہیجان پھیل گیا تھا اور سخت ناگواری کا اظہار کیا گیا تھا۔ اور اس پر غور کرنے کے لئے اگست کے آخر میں، لکھنؤ میں مسلمانوں کی تنظیموں اور ان کے رہنماؤں کا ایک اجتماع ہوا، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء، لکھنؤ نے ایک مشاورتی جلسہ کا اعلان کیا، جس میں اس رپورٹ کی کمزوریوں اور مسلمانوں کے لئے اس کے ناپسندیدہ پہلوؤں پر مشورہ ہوا، اس مشورہ میں جمعیۃ علماء کے نو ذمہ داران تشریف فرما ہوئے، جس میں سے چوتھا نام مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب کا ہے۔ جمعیۃ علماء نے اس پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک کمیٹی متعین کی، اس میں بھی مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب شریک تھے، اس کمیٹی نے نہرو رپورٹ پر جو تنقید و تبصرہ کیا، اس کو جمعیۃ نے ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دیا تھا، یہ چوبیس [۲۴] صفحات پر مشتمل ہے، اس کے آخر میں [مولانا مفتی کفایت اللہ، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ابوالمحاسن سجاد کے علاوہ مولانا احمد سعید کے بھی] دستخط ثبت ہیں۔ یہ رپورٹ جید برقی پریس، دہلی سے دسمبر ۱۹۲۸ء میں چھپ گئی تھی۔ (۱۱)

اسی طرح انگریز حکومت نے سفر حج کے متعلق بعض قوانین منظور کئے تو مولانا ابوالمحاسن سجاد نے اس سے برملا اختلاف کیا اور ایک مفصل خط یکم اگست ۱۹۳۲ء [۲۷/ربیع الاول ۱۳۵۱ھ] کو کونسل آف اسٹیٹ اور مسلم ممبران اسمبلی کو لکھا، یہ خط [جو فل اسکیپ سے بھی کچھ نکلتی ہوئی پیمائش کے] آٹھ [۸] صفحات پر مشتمل ہے، مجلس تحفظ ناموس شریعت جمعیۃ علمائے ہند نے شائع کر کے، تمام متعلقہ لوگوں کی خدمات میں بھیج دیا تھا۔

یہی نہیں بلکہ مسلم وقف بل، وقف علی الاولاد بل، حج بل، معلم بل، قانون انفساخِ نکاح اور جہیز بل، ہر ایک پر مولانا کی گہری، شرعی، قانونی، تنقیدی نگاہ رہی۔ حکومت نے ان قوانین کے

لئے جو مسودات جاری کئے، مولانا نے ان سب کا مفصل جائزہ لیا، ان کی کمزوریوں کو اجاگر کیا اور یہ بل کس طرح مسلمانوں کے لئے مفید اور قابل قبول ہوسکتے تھے، اس کی تحریری وضاحت کی اور تمام قانون کی صحیح صورت کیا ہوسکتی ہے اس کی رہنمائی بھی کی (۱۲) اور ان تصریحات کا بہت جرأت اور دینی غیرت کے ساتھ اظہار کیا، اور ان میں سے متعدد قوانین میں مولانا کی تحریر کے مطابق، ترمیمات ہوئیں اور اس کے بعد ہی یہ قوانین نافذ کئے گئے۔

مولانا کی نگاہ صرف دینی، فقہی معاملات نہیں بلکہ دوسرے معاشرتی، سماجی، سیاسی پہلوؤں پر بھی اسی طرح وسیع، گہری اور مبصرانہ رہتی تھی۔ چنانچہ مولانا نے لوکل باڈیز(Local Bodies) ڈسٹرک بورڈ(Disttic Board) اور میونسپلٹی کے سرکاری قوانین پر بھی نظر کی اور ان کو بہتر طور پر نافذ کرنے کے لئے تجویزیں پیش کیں جس میں سے کئی ایک سرکاری عہدیداران کے یہاں منظور بھی کی گئیں، اس سے مولانا کی ہمہ جہت صلاحیتوں اور بے پناہ قوت عمل کا اندازہ ہوتا ہے۔

جمعیۃ کے بعض بڑے فیصلوں سے صاف اختلاف:

مولانا نے کانگریس کے ساتھ کامل شرکت کے باوجود کانگریسی وزارتوں میں جمعیۃ کے نمائندوں کی شرکت پر کھل کر اختلاف کیا اور منظّم شرکت کی، ایک خاص صورت تجویز کی اور اس کے لئے ''نظام ملت'' کے عنوان سے ایک مفصل اسکیم بھی مرتب کی۔ (۱۳)

تحریک مدح صحابہ(۱۴) سے تعلق:

لکھنؤ میں شیعہ صاحبان کی مجلس میں اہل سنت کی شرکت ہوتی تھی، جس پر بعد میں انہوں نے مختلف پابندیاں لگانی شروع کیں جس کی وجہ سے اختلاف ہوا اور بات اختلاف رائے سے آگے بڑھ کر معاذ اللہ! تنقیص حضرات صحابہؓ تک پہنچی، تو اہل سنت میں اس کا ردعمل ہونا بالکل فطری تھا، یہ اختلاف یہاں تک بڑھا کہ علمائے اہل سنت نے اس کی باقاعدہ تردید اور مقابلہ کا ارادہ کیا، یہ سلسلہ ۱۹۳۷ء کے بعد باقاعدہ مقابلہ میں تبدیل ہوگیا، اہل سنت، مدح حضرات صحابہؓ کے جلوس نکالتے اور اپنے دینی، شرعی حق کے اظہار کے لئے مدح صحابہؓ کا باقاعدہ اہتمام کرتے تھے اور جب حکومت نے اس تحریک کو خلاف قانون قرار دیا اور اس کے کارکنوں پر سختی کی اس وقت تحریک مدح صحابہ کا ایک بڑا نظام بنایا گیا، جس میں ملک کے مختلف علاقوں سے اہل سنت کے بڑے بڑے جلسے آتے، لکھنؤ میں مدح صحابہ کرتے اور باقاعدہ قانون شکنی کرکے گرفتاریاں دیتے تھے اور جو اصحاب اس نظام کے باقاعدہ نافذ کرنے اور چلانے کے ذمہ دار تھے ان کو ڈکٹیٹر کہا جاتا تھا۔ اس تحریک میں حضرت مولانا حسین احمد کے ساتھ مولانا ابوالمحاسن سجاد بھی پیش پیش رہے

اور کسی طرح اپنی شرعی ذمہ داری اور اس حق سے دست بردار ہونے پر تیار نہ ہوئے۔

مولانا کا بالکل نرالا کام، بہار میں سیاسی پارٹی کا قیام:

مولانا ابوالمحاسن کچھ منفرد خصوصیات اور ایسی قوت عمل رکھتے تھے، جس کا وجود بہت کم تھا، مولانا نے جہاں متعدد بڑی طاقتور، پرزور تنظیمیں قائم کیں وہیں بعض پہلوؤں سے ایک نرالا کام یہ کیا تھا کہ اپنے صوبہ بہار میں ایک سیاسی پارٹی قائم کی اور چھ مہینے کے اندر اندر اس پارٹی کو ایسا باعمل بنایا کہ اس کے ممبران الیکشن میں کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے اور ان ممبران کی بنیاد پر مولانا نے بہار میں حکومت قائم کی اور خاص بات یہ ہے کہ مولانا نے اس کے لئے جو ممبران منتخب کئے وہ نہایت سخت شرائط اور مولانا کے منتخب معیار کے تھے، جس کا نبھانا آسان نہیں تھا، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے صلاحیت دی کہ انہوں نے ایسے افراد تلاش کئے، ان کو الیکشن کے میدان میں اتارا اور ان کو کامیاب بنا کر ان کے ذریعہ سے ایک نظام اور حکومت قائم کی۔

دینی معاملات میں پختگی اور استقامت:

عام مشاہدہ یہ ہے کہ جو لوگ سیاست کی دنیا میں آجاتے ہیں، اور پوری طرح اس میں گھر جاتے ہیں، ان کو دینی معاملات، ان کی اپنی فکر اور تصلب فی الدین میں کچھ نہ کچھ کمی کا اظہار ہوجاتا ہے، لیکن مولانا ان لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

رہیں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی

مولانا کے احوال وزندگی پر نظر رکھنے والے صاحب بصیرت علماء، مولانا کے سفر وحضر کے ساتھیوں اور شاگردوں، ہر ایک نے اس کا بہت اہتمام اور قوت سے تذکرہ کیا ہے کہ مولانا کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا معلوم نہیں، جس میں مولانا نے دینی معاملات میں ذرا کمزوری دکھائی ہو، یا کسی بڑے سے بڑے شخص اور مفاد کی وجہ سے کسی مصلحت کا نام لیا ہو، یا پسپائی کا ارادہ کیا ہو۔

دینی غیرت اور کفر وشرک کے معاملات میں، مولانا کے یہاں معمولی سے معمولی مفاہمت کا بھی دروازہ بند تھا، رسومات شرک اور غیر مسلموں کے ساتھ معاملات میں دینی، شرعی احکامات کو ادنیٰ درجہ میں مؤخر یا نظر انداز کرنا، مولانا کی سرشت میں تھا ہی نہیں، مولانا پر لکھنے والے تمام اکابر واہل نظر نے اس کا بہت اہتمام سے تذکرہ کیا ہے، تفصیلات طویل ہیں، ان کے نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔

مصروفیات کے باوجود وسعت مطالعہ کا بے نظیر حال:

مولانا کی زندگی کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ ملی، قومی جدوجہد، بے پناہ اسفار اور ہمہ وقت تنظیمی، تحریکی مصروفیات کی وجہ سے اس طرح گھر گیا تھا کہ اس میں درس وافادہ کی کوئی گنجائش نہیں

رہی تھی، اور مطالعہ کے لئے بھی بہت فرصت دستیاب نہیں تھی، خیال ہے کہ آخری دور میں مطالعہ کا بالکل موقع نہیں ملتا ہوگا، لیکن اس وقت بھی مولانا کی نظر ایسی وسیع اور بنیادی علوم اسلامیہ، تفسیر ومطالب قرآن کریم، حدیث شریف اور اس کے متعلقات اور ان سے مستخرج مسائل اور فقہ کے اصول ومباحث اور کلیات وجزئیات پر نگاہ، اس قدر گہری اور وسیع تھی اور ہر ایک معاملہ کو کامل جزئیات اور اس کے مالہ وماعلیہ کے ساتھ اس قدر اہتمام سے بیان کرتے تھے کہ بڑے بڑے علماء ششدر رہ جاتے تھے، مولانا کی یہ نگاہ صرف عام فقہی مسائل میں نہیں، بلکہ ان تمام مباحث وعنوانات میں بھی ایسی دقیق اور بے نظیر تھی جو سیاسی ضرورتوں میں سامنے آتے، یا جماعتوں، تنظیموں کی قراردادوں اور ملکی قوانین میں منظور اور پیش کئے جاتے تھے، یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ مولانا کسی بھی مسئلہ میں ادنیٰ تساہل یا مداہنت کرلیں، ہر ایک نازک سے نازک اور بڑے سے بڑے مسئلہ کے تمام پہلو حضرت مولانا کے ہر وقت اس طرح نوک زباں رہتے تھے کہ جیسے ایک عرصہ سے صرف اسی عنوان کا مطالعہ کر رہے ہوں اور اسی کے جزئیات ومتعلقات پر غور وفکر کرتے رہے ہوں۔

دینی، فقہی معاملات اور ان کے قانونی نکات اور ان کی ترتیب وتدوین اور ان کے مفید سے مفید تر بنانے کے تمام اسالیب اور گوشے بھی مولانا کو اچھی طرح یاد رہتے تھے کہ:

ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

مولانا کے لکھے ہوئے تمام فقہی رسائل وتحریرات، فتاویٰ اور جمعیۃ وکانگریس اور دوسری تنظیموں کے لئے مرتب خطبات وتحریرات، ہر ایک میں مولانا کا یہ غیر معمولی وصف نمایاں ہے، افسوس کہ مولانا کے فتاویٰ اور سیاسی تحریرات دونوں کا افادہ عام ہونا چاہئے تھا، جو بالکل نہیں ہوا، (۱۵) فتاویٰ کا ایک مجموعہ مرتب ہوا لیکن وہ بھی غالباً مکمل اور بہت عام نہیں ہے اور سیاسی رسائل وتحریرات جمع کرنے کی کسی کوشش کا مجھے علم نہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم ان دونوں چیزوں میں مولانا کے نظریات وخیالات سے بھرپور استفادہ کریں، اصحاب فقہ وفتاویٰ اور اہل سیاست دونوں کے لئے بلکہ ہم سب کے لئے جاننے، سمجھنے اور کچھ کرنے کے لئے، بہت کچھ ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا موقع اور سمجھ عطا فرمائے۔

مولانا کے بعض اہم سیاسی نظریات:

مولانا تحریک خلافت، جمعیۃ علماء، کانگریس سے پوری گہری اور واقفیت اور سربراہی کے باوجود، کئی باتوں میں اپنی رائے بالکل الگ رکھتے تھے، اور اس کا صاف اظہار کرتے تھے، ملک کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی، وہ گاندھی جی ہوں، کانگریس کے اور رہنما ہوں، یا جمعیۃ علماء وغیرہ کے

ذمہ داران، مولانا کو ان میں سے کسی کی رائے سے، شرعی اور فکری اختلاف ہوتا، تو اس میں کسی مصلحت کے شکار نہ ہوتے اور اپنی رائے صاف صاف ظاہر کرتے تھے، ان کی کئی آرا جمعیۃ علماء کے بعض معروف نظریات کے خلاف بہت واضح تھیں۔ اسی طرح گاندھی جی کے ''اسلام میں اَہنسا'' کے نظریہ کی پرزور تردید کرتے تھے اور کہتے تھے کہ:

''سیاسی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھنے کے باوجود، گاندھی جی کی معلومات اسلام کے بارے میں ایک طفل مکتب سے زیادہ نہیں ہیں''(۱۶)

مولانا کے مجموعی کمالات:

مولانا کے کمالات، علم کی پختگی، درس وتدریس میں ناقابل بیان مہارت، علوم قرآن وحدیث میں عمیق نظر، فقہ وفتاویٰ میں عدیم النظیر مہارت کا ایسا عالم تھا کہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے نقل کیا ہے کہ علامہ انورشاہ فرماتے تھے کہ مولانا ابوالمحاسن فقیہ النفس ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''جماعت کے ذمہ دار ارکان میں میں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب دلائل وبراہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے ہیں تو حضرت مفتی صاحب [مفتی کفایت اللہ] بھی بے حد متأثر ہوئے اور ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان سے کلمات تحسین نکل جاتے، حضرت مولانا سید محمد انورشاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مولانا سجاد ''فقیہ النفس'' عالم ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مسائل کی روح سمجھنے کا ان کو فطری ملکہ عطا فرمایا ہے''(۱۷)

سیاسی مسائل میں بہت دور تک دیکھنے، پہنچنے والی نگاہ، تمام علمی، سیاسی مسائل کی مشکل سے مشکل گرہ اور بحث کو سلجھانے کی نادر روزگار صلاحیت، عقیدہ اور دین کے بارے میں پختہ اور ناقابل ترمیم وتغیر نظریہ اور ہر ایک ہوشیار سے ہوشیار آدمی کے ذہن کو پرکھنے، اس کے مقاصد کی تہہ تک پہنچنے اور اس کی رائے یا تجویز کے پیچھے چھپی ہوئی چالاکی کو جاننے میں بھی مولانا بے نظیر تھے۔

اس کے علاوہ تقویٰ وطہارت، اتباع شریعت وسنت، اصابت وصلابت رائے، عزم وہمت، نہ تھکنے والا مزاج، نہ پسپا ہونے والی طبیعت، حوصلہ، جرأت، قربانی، جدوجہد اور ہر ایک قومی، ملی خدمت میں پیش پیش رہنے اور ہر کام کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ میں انجام دینے کی صفات کا ایسا مجموعہ تھا، کہ مولانا کے ممتاز ترین معاصرین اور اعلیٰ درجہ کے اہل نظر نے لکھا ہے کہ ایسا کوئی دوسرا آدمی اس وقت بھی نہیں تھا۔ مولانا نے ملی خدمات کے لئے اپنے گھر، زمین جائیداد اور تمام اثاثہ کو

اس طرح قربان کر دیا تھا اور آخر میں نہایت غربت وعسرت کی زندگی گزاری، لیکن ایسا صبر اور ایسی برداشت تھی کہ کبھی کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہونے دیا، اظہار تو کیا کرتے۔

مولانا خاندانی طور پر ایک خوشحال گھرانے کے فرد تھے، اچھی بڑی جائیداد، زمین اور مکانات کے مالک تھے مگر ان سب کو ملت اور ملی خدمات پر خرچ کر دیا، لٹا دیا یہاں تک کہ جب وفات ہوئی تو کرایہ کے گھر میں رہتے تھے، نہ کوئی زمین باقی رہی تھی نہ جائیداد۔

مولانا کے قریب سے دیکھنے والے واقف اصحاب نے لکھا ہے کہ بڑی، قومی اور ملی خدمات میں مصروف ہونے کے باوجود، کبھی کسی سے کوئی تعاون نہیں لیا، کسی قومی امانت یا پیسہ کو اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا، یہاں تک کہ وفات کے وقت، گھر میں دوسرے دن کی ضروریات کا بھی انتظام نہ تھا۔

کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گذر گئے
جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

آخری مرض اور وفات:

مولانا اپنے مزاج ومعمول کے مطابق زندگی کے آخری ایام تک، سراپا جدوجہد اور نمونۂ حرکت وعمل بنے رہے، آخر میں بہار کے علاقہ تُرہٹ میں اپنی خدمات اور سفر میں مشغول تھے، اس علاقہ میں ملیریا اس وقت بہت شدید تھا، ایسا کہ لوگ وہاں جاتے ہوئے ڈرتے تھے، مگر مولانا اس کے باوجود وہاں بار بار جاتے اور جو کام کرنے تھے، وہ سب کرتے رہے، آخری سفر بھی وہیں کا ہوا اور وہاں سے ملیریا کی، سخت بیماری ساتھ لائے، اسی بیماری میں آٹھ دن علیل رہ کر ۲۱ رشوال ۱۳۵۹ھ [۲۳ رنومبر ۱۹۴۰ء] کو اپنے وطن میں سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون. دوسرے دن نماز جنازہ ہوئی اور خانقاہ مجیبیہ کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

مولانا کا حادثۂ وفات اک صور ماتم تھا، جس کی آواز پورے غیر منقسم ہندوستان میں پہنچی، ہر ایک جاننے والا، آنسو بہانے پر مجبور ہوا، علامہ سید سلمان ندوی نے مولانا کی وفات پر ''معارف'' میں بہت زوردار مضمون لکھا، جو پورا کا پورا ہی پڑھنے کا ہے، اس کی چند سطریں پڑھ لیجئے:

''یہ کیسے بتاؤں کہ اس ناگہانی اور غیر متوقع غم سے مجھے کیوں چپ سی لگ گئی، ہر چند زبان خاموش تھی، لیکن کئی دن تک سوتے جاگتے مرحوم کی صورت آنکھوں میں پھرتی اور خواب میں نظر آتی رہی، **تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا بفراقک لمحزونون**''(۱۸)

اور مولانا احمد سعید دہلوی کے الفاظ میں:

''ان کے متعلق اس وقت جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ سچ جانئے کہ سمندر میں سے ایک قطرہ کی حیثیت بھی نہیں ہے''۔(۱۹)

اور مولانا نے یہ بھی لکھا ہے:

''کہ مسلمان قوم کے سر پر سے ایک ایسے بزرگ کا سایہ اٹھ گیا جس کا بدل مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا''۔(۲۰)

اس وقت کے ممتاز ترین سیاسی قائد، مفکر، مدبر اور سیاست داں اور بعد میں ہندوستان کے وزیر خارجہ ڈاکٹر سید محمود کہتے ہیں:

''جلسوں کی شرکت کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ان کی نسبت میری پچھلی رائے عاجلانہ تھی، وہ اس سے بہت زیادہ ہیں جتنا میں نے ان کو سمجھا ہے، اسکیموں کا بنانا، گتھیوں کا سلجھانا، عقدوں کا حل کرنا، پیچوں کا سمجھنا، بند راہوں کا کھولنا، یہ باتیں کتنی ہی وقیع اور اہم سہی اور ان سے مولانا کے ذہن کی صفائی اور عقل کی تیزی اور چترائی کی کتنی ہی شہادتیں فراہم ہوتی ہوں، مگر یہ سب مولانا کی شخصیت کے ظاہری پہلو ہیں، ان کی اصلی بڑائی ان کے اس کردار کے اندر چھپی ہوئی ہے، جس میں وہ پوری طرح پختہ ہو چکے ہیں، جس طرح ان کی ہر خاموشی، بامعنی اور ہر گویائی گرہ کشا ہوتی ہے، اسی طرح ان کی ہر ادا، ان کی سیرت کی پختگی اور ان کے کردار کی مضبوطی کا پتہ دیتی ہے''۔(۲۱)

ڈاکٹر سید محمود صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ:

''اس عزیمت کے ساتھ وہ انتھک کام کرنے والے تھے، میں نے ان کو کبھی خالی الذہن یا غیر مشغول نہیں پایا، وہ سوچتے یا کام کرتے، ستاتے کبھی نہیں تھے، وہ ایک ایسے دریا کے مانند تھے جس میں تموج وطغیانی کی سرجوشی تو نہ ہو، لیکن روانی کا پورا جوش وخروش موجود ہو، جو بغیر دم لئے ہر آن ولمحہ چٹانوں سے ٹکراتا، پتھروں سے لڑتا، جھاڑیوں سے الجھتا، رواں دواں، ان کے پبلک اشتغال نہ فیشن کے طور پر تھے، نہ حصول سروری وسعادت کی طمع میں وہ جس مسئلہ کو اٹھاتے، وہ زندگی اور موت کا سوال بن کر ان سے چمٹ جاتا، اس لئے وہ کسی [کام] کو بے دلی (Disheartedly) کے ساتھ کر کے اپنے نفس کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے، بلکہ مجبور تھے کہ اس کے لئے اپنے فکر وعمل کی تمام قوتیں میدان میں ڈال دیں، سوتے جاگتے، بس وہی مسئلہ اسن کے

سامنے ہوتا اوران کی ساری راحت وطمانیت اس کے انہماک کے اندر سمٹ آتی، وہ اپنے پبلک اشتغال سے تھک کر نہ تو کوئی امن کا گوشہ تلاش کرتے، نہ دوسری غیر پبلک دلچسپیوں کو ان کے ساتھ شریک کر کے ان کی حرمت کا پٹہ لگاتے، اس اعتبار سے ان کا مزاج ایک سیاسی لیڈر سے بالکل مختلف تھا، ان کی ذہن میں عاشق کی دھن کی شان تھی، اور چوں کہ وہ ایک زبردست عالم تھے اس لئے یقیناً یہ چیز انہوں نے پیغمبرانِ عظام کے اسوۂ حسنہ سے اخذ کی تھی، میں نے یہ چیز وقت کے بڑے سے بڑے لیڈروں میں بھی نہیں پائی۔'' (۲۲)

اور مولانا احمد عروج قادری نے، جو مولانا کو بہت قریب سے اور بہت زیادہ غیر جانبدارانہ تنقید کی نگاہ سے دیکھنے والے تھے، اپنے تأثرات کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

''میں نے ان کو عقیدت کی نظر سے بھی دیکھا، اور ایک غیر جانبدار کی نگاہ تنقید سے بھی، آج ان کا انتقال ہو چکا ہے، مجھے نہ تو کوئی خوشامد اظہار حق سے روک سکتی ہے اور نہ کوئی مروت، میں اپنی روح کی پوری ایماندارانہ صلاحیتوں کے ساتھ اس کا اقرار واعلان کرتا ہوں کہ وہ میری نظروں میں ہمیشہ دین ومذہب کے ایک بے ریا خادم ثابت ہوئے، وہ نبی نہ تھے، معصوم عن الخطا نہ تھے، لیکن اتنا تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مرتے دم تک اپنی زندگی کے حقیقی نصب العین سے پیچھے نہ ہٹے۔'' (۲۳)

جمعیۃ علمائے ہند نے مولانا سجاد کی وفات کا صدمہ، جیسا کہ ہونا بھی چاہئے تھا بہت ہی زیادہ محسوس کیا، مولانا کی وفات پر ایک سے زائد مرتبہ تعزیتی قراردادیں منظور کی گئیں اور جمعیۃ نے اور اس کے نمائندوں نے کئی اجلاس کئے اور مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا۔

● جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس جو دہلی میں ۵/۶ جولائی ۱۹۴۱ء مولانا حسین احمد مدنی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اس میں یہ تعزیتی قرارداد منظور کی گئی تھی:

''جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ زعیم الامۃ، مجاہد ملت، مفکر جلیل، عالم نبیل حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب، ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند ونائب امیر شریعت صوبہ بہار کی وفات پر [جو ۱۸/شوال ۱۳۵۹ھ کو پھلواری شریف میں ہوئی] اپنے عمیق رنج واندوہ کا اظہار کرتا ہے اور اس سانحہ روح فرسا کو مسلمانان ہند کے لئے ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے، مولانا کی ذات گرامی مذہب وملت اور

اسلامی سیاسیت کی ماہر خصوصی تھی، ان کی مذہبی، قومی، وطنی خدمات صفحات تاریخ پر آب زر سے لکھی جائے گی اور مسلمان ہند کو کبھی فراموش نہیں کریں گے''(۲۴)

- ایسی ایک اور قرارداد منعقدہ: ۴/۳/۲ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ [۲۲/۲۱/۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء] منعقدہ لاہور میں پیش کی گئی:

''جمعیۃ علماء ہند کا یہ جلسہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب، نائب امیر شریعت صوبہ بہار و ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے، مولانا کی ذات گرامی مجمع الکمالات تھی، جس طرح ان کو علوم دینیہ میں اعلیٰ مہارت حاصل تھی، اسی طرح اسلامی سیاست میں بھی قدرت نے ان کو کامل دست گاہ عطا فرمائی تھی، خلق خدا کی خدمت اور مسلمانوں کی حفاظت ان کے نصب العین کے خاص اور اہم اجزاء تھے، علماء ہندوستان میں ان کی شخصیت ان کی خدمات جلیلہ کے لحاظ سے نمایاں تھی، ان کے اخلاص و ایثار کے موافق اور مخالفت یکساں معترف تھے، حق تعالیٰ ان کی تربت کو اپنی رحمتوں سے سیراب کرے اور جنت الفردوس میں ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔''(۲۵)

حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے ان کی تعزیتی قرارداد منظور کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ہندی ملت اسلامیہ کے بطل جلیل تھے۔

جمعیۃ علماء نے مولانا کی یاد میں کئی جلسے منعقد کئے اور کئی طرح سے اظہار غم کیا، اسی طرح کے دو جلسے جامع مسجد، دہلی میں کئے گئے، پہلا جلسہ ۲۱/شوال کو جامع مسجد دہلی میں مولانا عبیداللہ سندھی کی صدارت میں ہوا، جس میں مولانا ابوالمحاسن سجاد کی وفات پر تقریریں ہوئیں، جس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ایک ہفتہ کے بعد اسی جگہ ایک بڑا عام جلسۂ تعزیت ہوگا۔

اس تجویز کے مطابق دوسرا جلسہ ۲۸/شوال ۱۳۵۹ھ [۲۹/نومبر ۱۹۴۰ء] جامع مسجد دہلی میں ہی ہوا، جس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی بھی تقریر ہوئی اور اسی دن ایک اور جلسۂ تعزیت جوبلی باغ دہلی میں کیا گیا، جس کو جمعیۃ نے یوم سجاد سے موسوم کیا تھا۔(۲۶)

مولانا سجاد کی وفات کا صدمہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برسوں تک تازہ رہا اور جب بھی کوئی بڑی ملی ضرورت یا سانحہ پیش آتا اس وقت مولانا سجاد کی بصیرت، دانشمندانہ قیادت اور دوراندیشانہ رہنمائی کی یاد کی جاتی اور شاید لوگ زباں سے کہتے ہوں گے:

جب کوئی فتنہ زمانہ میں نیا اٹھتا ہے

لوگ اشارہ سے بتا دیتے ہیں تربت میری

خصوصاً ۱۹۴۷ء کے حادثہ، مسلمانوں کے قتل وخوں ریزی، خانہ بربادی اور بے کسی کے موقع پر یہ خیال آتا رہا کہ اگر اس وقت مولانا سجاد حیات ہوتے تو شاید ہندوستان میں مسلمانوں کی حفاظت اور بہتر مستقبل کے لئے کوئی بڑا اقدم اٹھاتے اور ممکن تھا کہ اگر وہ موجود ہوتے تو جو حالات پیش آئے اور جس طرح مسلمانوں کو یہاں کے نظام سیاست اور قانون میں نظر انداز اور بے حیثیت کیا گیا، مولانا کی جرأت ودانش مندی اور مفکرانہ بصیرت سے اس میں کچھ کمی آتی۔

وَللّٰہ الأمر من قبل و من بعد

مصادر ومراجع

(۱) ملاحظہ ہو: خطبۂ صدارت۔ اجلاس امروہہ صفحہ: ۵۹ تا آخر

(۲) یادرفتگاں، علامہ سید سلیمان ندوی ص: ۲۴۴ [طبع اول۔ کراچی: ۱۹۵۵ء]

(۳) اس فتویٰ کی قدیم طباعت کے متعدد نسخے ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔ [نور]

(۴) یادرفتگاں ـــــ علامہ سید سلیمان ندوی ص: ۲۴۰ ـــــ نیز دیکھئے: محاسن سجاد ص: ۱۹

(۵) یادرفتگاں ـــــ سید سلیمان ندوی ص: ۲۴۱، مضمون۔ مولانا منت اللہ رحمانی ۱۶۲/۹

(۶) خطبۂ صدارت، اجلاس مرادآباد مولانا ابوالمحاسن سجاد

(۷) محاسن سجاد ۱۲۲/۱۰۱ ـــ ۱۰۲/۲۲۳

(۸) محاسن سجاد ۲۰۹/۶۸

(۹) اس کی قدیم طباعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

(۱۰) خطبۂ صدارت، اجلاس مرادآباد ـــــ ص: ۱۱، از مولانا ابوالمحاسن سجاد

(۱۱) اس کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

(۱۲) ان میں سے بعض تحریریں ''قانونی مسودے'' مرتبہ ضمان اللہ ندیم صاحب، مطبوعہ امارت شرعیہ بہار ۱۴۱۹ھ [۱۹۹۹ء] میں شامل ہیں۔

(۱۳) مولانا منظور احمد نعمانی نے، مولانا پر اپنی تحریر میں اس کا خاصا تذکرہ کیا ہے۔ محاسن سجاد ۲۱۴/ ۵۸، ۲۱۵/ ۵۹

(۱۴) تحریک مدح صحابہؓ ۱۹۰۹ء میں اہل تشیع کی طرف سے سنیوں پر ان کی مجالس میں شرکت پر کچھ پابندیاں لگائی گئیں تھیں، اہل سنت نے اس کے خلاف احتجاج کیا، جو بالآخر یہاں تک پہنچا کہ اب ہم لکھنؤ میں کسی کو بھی مدح صحابہ نہیں کرنے دیں گے، اس اعلان نے باقاعدہ ایک ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کرلی، جس میں جمعیۃ علماء، مجلس احرار اسلام اور دوسری مسلم تنظیمیں شامل ہوتی چلی گئیں، اور یہ معاملہ ۱۹۳۶ء میں خوب گرم ہو گیا تھا اور اس کے

بڑے قائدین میں مولانا حسین احمد مدنی کے علاوہ مولانا ابوالمحاسن سجاد بھی شامل تھے۔بعض معلومات وتفصیلات کے لئے دیکھئے:تحریک مدح صحابہؓ مظہر علی اظہر۔لاہور

(۱۵) قانونی مسودے۔تالیف:مولانا ابوالمحاسن سجاد ــــــ مطبوعہ:امارت شرعیہ بہار ۱۴۱۹ھ [۱۹۹۹ء]

مقالات سجاد۔جمع وترتیب:محمد ضمان اللہ ندیم ــــــ مطبوعہ امارت شریعہ بہار ۱۴۱۹ھ [۱۹۹۹ء]

حکومت الٰہی۔تالیف:مولانا ابوالمحاسن سجاد ــــــ مطبوعہ امارت شرعیہ بہار ۱۴۱۹ھ [۱۹۹۹ء]

مکاتیب سجاد۔جمع وترتیب:محمد ضمان اللہ ندیم ــــــ مطبوعہ امارت شرعیہ بہار ۱۴۱۹ھ [۱۹۹۹ء]

یہ اہم ترین کتابیں جو اس ملک کے تمام مسلمانوں کے لئے اسوۂ راہ اور پیغام عمل کی حیثیت رکھتی ہیں،افسوس ہے کہ ہماری اجتماعی،ملی بے حسی کی وجہ سے ان کی ایسی عزت افزائی اور قدردانی نہیں ہوئی جیسی ہونی چاہئے تھی، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان کے پچاس پچاس ہزار کے ایڈیشن چھپتے اور ایک باشعور مسلمان کے ہاتھوں میں جاتے اور مطالعہ میں رہتے مگر المیہ یہ ہے کہ یہ مشکل سے پانچ پانچ سو چھپے اور ان کی اشاعت پر دس دس بیس بیس سال گذر جانے کے باوجود اب تک بھی فروخت نہیں ہوئے۔

(۱۶) تحریر مولانا منظور نعمانی ص:۲۱۶

(۱۷) دیکھئے:مجموعۂ مضامین بر مولانا ابوالمحاسن سجاد،مرتبہ:مولوی طلحہ نعمت ندوی ص:۸۶[مطبوعہ:دفتر جمعیۃ علمائے ہند، دہلی:۲۰۱۸ء]

(۱۸) یادرفتگان،ص:۲۳۹

(۱۹) مضمون مولانا احمد سعید،ص:۲۳۹

(۲۰) ایضاً

(۲۱) محاسن سجاد ص:۸۹

(۲۲) محاسن سجاد ۹۰/۵۳ــــ ۹۱/۵۴

(۲۳) محاسن سجاد ۲/۱۰۴

(۲۴) جمعیۃ العلماء کیا ہے۔مولانا سید محمد میاں دیوبندی ص:۳۲۵،مطبوعہ:دہلی

(۲۵) جمعیۃ العلماء کیا ہے۔مولانا سید محمد میاں دیوبندی ص:۳۳۱،مطبوعہ:دہلی

(۲۶) اندراج روزنامچہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی فقہی، قانونی اور سیاسی بصیرت

مولانا عتیق احمد بستوی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ ربّ العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم الأنبیاء والمرسلین
محمد بن عبد اللّٰہ الأمین وعلیٰ آلہٖ وصحبہ أجمعین أما بعد!

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ بانی امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ اللہ کے منتخب بندوں میں سے ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ شانہ نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا، کتاب وسنت پر گہری نظر کے ساتھ وہ اپنے زمانہ کے حالات، ملکی اور عالمی سیاسیات پر گہری نظر رکھتے تھے، غیر مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے شرعی نظام زندگی کا اجتماعی خاکہ جس کی بنیادیں کتاب وسنت پر استوار ہیں، اسے انھوں نے بہت غور وخوض، فکر وتدبر کے بعد تیار کیا، اور اس خاکہ میں رنگ بھرنے کی ہر ممکن کوشش کی، کل ہند پیمانے پر امارتِ شرعیہ کا قیام ان کی زندگی کا ایک اہم منصوبہ تھا، جس میں انھیں کامیابی نہیں مل سکی؛ لیکن صوبۂ بہار کی سطح پر انھوں نے بڑی محنت کر کے صوبۂ بہار کے علماء ومشائخ اور عمائدین کو جوڑ کر امارتِ شرعیہ کی داغ بیل ڈالی، اور اس کا مکمل خاکہ تیار کر کے اسے عمل میں لانے کی بھر پور جد وجہد کی۔

ولادت ووفات اور تعلیم:

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کی پیدائش ۱۳۰۱ھ اور وفات ۱۳۵۹ھ میں ہوئی، انھوں نے بہار کے بعض مدارس میں تعلیم حاصل کی، کانپور کے مدرسہ فیض عام میں حضرت مولانا محمد حسن صاحبؒ سے متوسطات تک تعلیم حاصل کی، اور مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں اپنی رسمی تعلیم مکمل کی، مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں حضرت مولانا کفایت اللہ صاحبؒ سے خصوصی استفادہ کیا، ان کا خانوادہ کوئی

ممتاز علمی اور روحانی خانوادہ نہیں تھا، بچپن میں پندرہ سال کی عمر تک تعلیم میں ان کی طبیعت بھی نہیں لگتی تھی، جیسے کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے ان کے حالات میں لکھا ہے؛ لیکن پندرہ سال کی عمر کے بعد جب ان کا دل تعلیم میں لگا، تو چند ہی سال میں انھوں نے علوم اسلامیہ میں کمال ومہارت پیدا کرلی، ماضی کی کوتاہی کی تلافی اچھی طرح کرلی اور وہ ایسے ٹھوس عالم وفاضل بن کر نکلے کہ جنھیں صرف ونحو، ادب وبلاغت نیز تمام اسلامی علوم میں اچھی مہارت حاصل تھی، تقریباً پندرہ، بیس سال تدریسی زندگی گزاری، جس مدرسہ میں تدریس کے لیے پہنچتے تھے کھنچ کھنچ کر طلبا وہاں پہنچ جاتے تھے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے موصوف کو تعلیم وتربیت کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا، اپنے طلبا کا حد درجہ خیال رکھتے تھے، ان کے ساتھ شفقت وکرم کا معاملہ فرماتے تھے۔

کہنہ مشق مدرس:

وہ ایک کامیاب مدرس ومعلم تھے، طلبا کو نہ صرف علوم پڑھاتے بلکہ پلاتے تھے اور جس مدرسہ میں ان کے قدم پہنچے، وہ آباد اور بارونق بن گیا، ان کی زندگی میں جو بڑی تبدیلی رونما ہوئی اس کا سبب یہ ہوا کہ ایک صاحب جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے، اور انگریزی اخبار ورسائل پڑھا کرتے تھے، وہ حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ کی خدمت میں عربی پڑھنے کے لیے آنے لگے، اور حضرت مولانا سے بہت مانوس ہوگئے، اس زمانہ میں اخبارات پڑھنے کا عام رواج نہیں تھا، ملکی اور عالمی حالات سے باخبری آسان نہیں تھی، وہ صاحب مولانا کو انگریزی اخبارات کا خلاصہ اور ان کی اہم خبریں سنایا کرتے تھے۔

حالاتِ حاضرہ سے واقفیت اور ملی تڑپ:

بیسوی صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیاں تھیں، جنگ عظیم اوّل ہوچکی تھی، اور اس کی وجہ سے پوری دنیا کے حالات ابتری کا شکار تھے، عالم اسلام، برطانیہ وفرانس کے چنگل میں جاچکا تھا، برطانوی حکومت کے سامراجی عزائم واقدامات کی زد میں نہ صرف عالم اسلام؛ بلکہ حرمین شریفین بھی آچکے تھے، خلافتِ عثمانیہ زوال وانحطاط کے آخری مرحلہ میں تھی، اس کے حصّے بخرے کرکے اسے ختم کرنے کے منصوبے ممالک یورپ بنا چکے تھے، ہندوستان برطانوی تسلط سے کراہ رہا تھا، اور ہندوستان میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی تحریکیں جنم لے رہی تھیں، حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ (جو درس وتدریس میں منہمک تھے) کو جب اپنے اس شاگرد کے ذریعہ خوفناک ملکی وعالمی حالات کا علم ہوا تو وہ تڑپ اٹھے، ان میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اپنے کو دینی وملی اور سیاسی کاموں کے لیے وقف کردیں، انھوں نے وحدتِ کلمہ کی بنیاد پر مسلمانوں کو متحد کرنے اور شرعی

احکام کے تحت اپنا اجتماعی نظام قائم کرنے کی کوشش شروع کردی۔

جمعیت کا قیام اور مولانا کی شمولیت:

اس وقت ہر مسلک وفکر کے علماء ومشائخ اور عمائدین میں ایک بے چینی اور فکرمندی پائی جاتی تھی اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے لیے ہر طرف سے آوازیں اٹھ رہی تھیں، ۱۹۱۹ء میں جمعۃ علماء ہند کی تشکیل ہوئی، مختلف مسالک اور مکاتب فکر کے علماء ومشائخ نے علماء کی ہندگیر تنظیم جمعیۃ علماء ہند قائم کی، جس کی سرپرستی اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ فرمارہے تھے۔

فکرۂ امارتِ شرعیہ اور اس کا قیام:

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ نے جمعیت علماء ہند کے پلیٹ فارم کو اپنے عزائم ومقاصد سے ہم آہنگ پایا؛ اس لیے بلاتاخیر اس کارواں میں شامل ہوگئے اور شرعی بنیادوں پر مسلمانوں کی اجتماعی تنظیم (امارتِ شرعیہ) کا جو نظریہ ان کے دل ودماغ میں بسا ہوا تھا، اُسے مرتب کرکے علماء کی خدمت میں پیش کیا، اس بات کی کوشش کی کہ جمعیت علماء ہند کے پلیٹ فارم سے امارتِ شرعیہ کے نظریے کو عملی شکل دی جائے اور پورے ہندوستان کے لیے مسلمانوں کا متحدہ امیر طے کردیا جائے۔

چنانچہ جمعیت علماء ہند کے بعض اجلاسوں کے ایجنڈے میں امارتِ شرعیہ کا موضوع شامل کیا گیا اور کل ہند امیر شریعت کے انتخاب کے لیے باہم گفتگو بھی ہوئی؛ لیکن بعض اسباب کی بنیاد پر اس میں کامیابی نہیں ملی، اور امیر الہند کا انتخاب نہ ہوسکا، اس کے بعد حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صوبۂ بہار کی سطح پر انتخاب امیر کی کوشش کی، تمام مکاتب فکر کے علماء اور مشائخ کو اس کام کے لیے جوڑا، اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص اور محنت کی وجہ سے کامیابی عطا فرمائی اور مولانا شاہ بدرالدین صاحب سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ شوال ۱۳۳۹ھ میں اتفاق رائے کے ساتھ صوبۂ بہار کے امیر منتخب کیے گئے اور حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ نے نائب امیر کی ذمہ داری قبول فرمائی۔

مولانا کی فقهی وقانونی بصیرت:

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ اپنے معاصر علماء میں فقہی قانونی بصیرت میں بہت ممتاز تھے، خاص طور سے اسلام کے دستوری قوانین اور اسلام کے سیاسی نظام کو دور حاضر میں کس طرح عملی شکل دی جائے، اس موضوع پر اللہ نے ان کو خصوصی مہارت وبصیرت عطا فرمائی تھی، ان کی اس خصوصیت کا ان کے معاصرین نے برملا اعتراف کیا ہے، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن

سیوہارویؒ جنھوں نے جمعیۃ کے کاموں میں اپنی شرکت کی وجہ سے حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب علیہ الرحمہ کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اوران کی خوبیوں کو پرکھا ہے۔انھوں نے اپنے مضمون میں تحریرفرمایا ہے:

’’جمعیۃ علماء میں جب کبھی علمی مسائل پر بحث ہوتی،تو مولانا سجاد صاحب کا اصل جوہراس وقت کھلتا تھا، ہماری جماعت میں مشہور ہے کہ زبردست دلائل کے ساتھ کسی بات کو مدلل کرکے بیان کرنا حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کا خاص حصّہ ہےاور یوں بھی مفتی صاحب کوفقہ اسلامی میں بڑا کمال حاصل ہے؛ لیکن جماعت کے ذمہ دار ارکان اور میں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب دلائل و براہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے ،تو حضرت مفتی صاحب بھی بے حدمتأثر ہوتے اوران کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان سے کلمات تحسین نکل جاتے ،حضرت مولانا سیّد محمد انورشاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مولانا سجاد ’’فقیہ النفس‘‘ عالم ہیں،یعنی اللہ تعالیٰ نے مسائل کی روح سمجھنے کاان کوفطری ملکہ عطافرمایا ہے۔

حضرت مولانا سیّد محمد انورشاہ نوراللہ مرقدہٗ جواس زمانہ میں علم حدیث کے مجدد گزرے ہیں، کا یہ فرمانا میرے نزدیک مولانا سجاد صاحب کے تبحر علمی کے لیے ایک بہترین سند ہے، بعینہٖ یہی بات میں نے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی زبانی بھی سنی ہے‘‘۔(۱)

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ان کی سیاسی بصیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

سیاسی بصیرت:

’’حضرت مولانا کوجس طرح علوم نقلی وعقلی میں کمال حاصل تھا،اسی طرح؛ بلکہ اس سے زیادہ سیاسی اجتماعی مسائل میں بھی ان کو یدطولیٰ حاصل تھا،ہندو مسلم یونیٹی کانفرنس لکھنؤ، الٰہ آباد میں انھوں نے جس بصیرت سیاسی کا ثبوت دیا ہے،اس کا اعتراف شرکاء کانفرنس ہندو مسلم دونوں نے کیا اور بعض سیاسی مبصرین نے خود مجھ سے یہ کہا کہ یہ شخص جب بات کرنا شروع کرتا ہےتو لکنت اور عجز گفتگو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ خواہ مخواہ ایسے اہم مسائل میں کیوں دخل دیتا ہے؛ لیکن جب بات پوری کرلیتا ہےتو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس شخص کا دماغ معاملات کی گہرائی تک بہت جلد پہنچ جاتا ہےاور تہ کی بات نکال کرلے آتا ہے۔

مرادآباد میں جب جمعیہ علماء ہند کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا، اور مولانا نے بحیثیت

صدر خطبۂ صدارت سنایا تو زمین دار، انقلاب اور دوسرے اسلامی اخبارات نے خطبۂ صدارت پر ریویو کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ مولانا سجاد کی صورت اور گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ایسا شخص بھی اسلامی سیاسیات؛ بلکہ سیاسیات حاضرہ کا اس قدر مبصر اور عمیق النظر ہوسکتا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ مولانا کا یہ خطبۂ صدارت سیاسیات اسلامی کی بہترین انسائیکلوپیڈیا ہے''۔(۲)

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ نہ صرف اسلام کے سیاسی نظام اور دستوری قوانین پر گہری نظر رکھتے تھے، بلکہ ان کے زمانہ میں مختلف ملکوں میں جو دستور رائج تھے اور ان میں جو خوبیاں اور خامیاں تھیں، ان سے بھی بخوبی آگاہ تھے، چنانچہ ان کے ایک معاصر مولانا شاہ سیّد حسن آرزو لکھتے ہیں:

عالمی سیاست پر گھری نظر:

''مولاناؒ کے سیاسی تبحر کا آپ کو اسی سے اندازہ ہوجائے گا کہ جب مولانا شفیع داؤدی اور ہمارے مولانا سجاد کے درمیان خاص حالات کی بنا پر اختلاف اور اختلاف نے جنگ کی صورت پیدا کردی، تو پٹنہ کے کچھ مخلص افراد نے باہمی مصالحت کی ایک اچھی صورت نکالنی چاہی اور دونوں کو ایک جگہ دعوت دی گئی، اور بات یہ طے پائی کہ دونوں باہمی اصولی گفتگو کرکے ایک متفقہ راہ مسلمانوں کے لیے نکال لیں، مجمع بہت ہی اچھا خاصہ، سمجھدار اور تعلیم یافتوں کا تھا، جس کے روح رواں ڈاکٹر سیّد عبدالحفیظ فردوسی تھے، ان کے درمیان ابتدائی گفتگو شروع ہوئی، جس کا سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ ساری رات ختم ہوگئی اور صبح کی نماز کے بعد مجمع منتشر ہو نہ سکا، پھر بھی بات ناتمام رہی۔ مولانا شفیع داؤدی کا پروگرام لاہور جانے کا تھا، اسی سلسلہ میں ممالک عالم کے سیاسی اور نظامی دستورات پر گفتگو نکل پڑی، مولانا شفیع داؤدی بول رہے تھے کہ مولانا نے ٹوکا اور اس کے بعد جو انھوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ انگلینڈ کا دستور حکومت یہ ہے، فرانس کا یہ ہے، جرمنی کا یہ ہے، اٹلی کا یہ ہے، روس کا یہ ہے، امریکہ کا یہ ہے، آئرلینڈ کا یہ ہے، ٹرکی وایران کا یہ ہے، تو سارا مجمع حیرت واستعجاب سے مولانا کو تک رہا تھا، اور وہ نہایت ہی جوش کے ساتھ کانسٹی ٹیوشن بیان کرتے چلے جارہے تھے، بالآخر مولانا شفیع داؤدی کو یہ تسلیم کرنا ہی پڑا کہ مولانا نہ صرف مذہبی عالم متبحر ہیں؛ بلکہ دنیا کی سیاست اور اس کے دستور ونظام حکومت کے بھی عالم متبحر ہیں، مولانا ہر اختلاف میں اصولی اختلاف کرنے کے عادی تھے، اور اختلاف کو اختلاف

ہی کی حد تک قائم رکھنا جانتے تھے، نہرو رپورٹ جب سامنے آئی تو مولانا نے اس سے اصولی اختلاف شروع کیا اور آخری وقت تک پوری قوت کے ساتھ اختلاف کرتے رہے، اسی طرح نئی اصلاحات ملکی سے انھوں نے پوری طاقت کے ساتھ اختلاف کیا، وہ جدید نظامِ حکومت میں بالخصوص مسلم مفاد کا سخت ترین گھاٹا اور نقصان سمجھتے تھے اور بارہا فرماتے رہے کہ اس سے تو بعض حیثیت سے نہرو رپورٹ ہی بہتر چیز تھی اور دھا اسکیم میں چوں کہ مذہبی تعلیم سے بے اعتنائی کا کافی پہلو نظر آتا تھا۔ مولاناؒ نے شروع ہی میں اس کی مخالفت کی، اسی طرح شاردھا ایکٹ جب سامنے آیا تو چوں کہ اس کا تعلق ٹھیک ہندوؤں کی طرح مسلمانوں سے بھی تھا؛ اسی لیے اس کی پوری کوشش شروع کردی کہ مسلمان بہرحال اس قانون سے الگ کردیئے جائیں؛ کیوں کہ یہ قانون شرعی قانون سے آگے چل کر یقینی متصادم ہوگا، میں اوپر بھی عرض کرچکا ہوں کہ مولانا آزادی ہند کی حیثیت سے کانگریس کے گرم جوشی سے مدد و معاون اور شریک کار تھے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مفاد اسلامی کے خطرہ کے موقع پر وہ کانگریس کے سخت ترین دشمن و مخالف بھی تھے، ہمارے صوبہ کی گذشتہ قومی حکومت سے اس لیے جنگ کرگئے کہ وہ جبریہ تعلیم کے اسکیم میں خصوصیت کے ساتھ مذہبی تعلیم کو کوئی جگہ دینا نہیں چاہتی تھی؛ لیکن اس شدید مخالفت کے باوجود ذمہ داران کانگریس مولاناؒ کو ایک بے غرض محبّ قوم و وطن سمجھتے ہوئے انتہائی عزت واحترام سے پیش آتے رہے''۔(۳)

معروضی نقطۂ نظر اور جرأتِ اظہار:

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی خاص مسلک کے علماء سے وابستہ نہیں تھے ان کے سوچنے کا انداز عام علماء سے الگ تھا کسی معاملہ پر ان کا نقطۂ نظر اور ان کی سوچ گروہ بندی اور عصبیت کا شکار نہیں تھی، معروضی انداز سے مسائل پر سوچتے اور بولتے تھے، کتاب وسنت کے نصوص اور شریعت کے مقاصد عامہ کی روشنی میں جو کچھ سمجھتے تھے اس کا بلاتکلف اظہار فرماتے تھے اور کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شخصیت اس زمانہ میں بہت ممتاز اور علماء فقہاء کا مرجع تھی اس زمانہ میں مظلوم مسلمان عورتوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ''الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ'' کے نام سے حکیم الامت نے جو کتاب مرتب فرمائی وہ ان کا ایک اجتہادی کارنامہ ہے، فقہ مالکی سے متعدد اسباب فسخ نکاح اختیار کرکے علماء ہند کو اس پر متفق کرنا

کوئی آسان کام نہیں تھا؛ لیکن حضرت تھانویؒ نے یہ کام کر دکھایا، اسی کتاب کی روشنی میں قانونِ انفساخِ نکاحِ مسلمات کا مسودہ تیار کیا گیا، جو ۱۹۳۹ء میں پارلیامنٹ سے منظور ہو کر قانون بن گیا، اس کتاب کا مسودہ جن علماء کو بھیجا گیا تھا ان میں حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ بھی شامل تھے، حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ کے اس اقدام کو سراہا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اپنے اس اختلاف کا اظہار فرمایا کہ جب حکومت مسلمہ کے نہ ہونے کی صورت میں مسلمان خود اپنے لیے قاضی مقرر کر سکتے ہیں اور فقہ حنفی میں اس کی گنجائش ہے، تو اس کی کیا ضرورت ہے کہ مسلم خواتین کے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے فقہ مالکی سے جماعۃ المسلمین کے نظریے کو لیا جائے ایسا کرنا بلا وجہ اپنے مسلک سے عدول ہے، نیز جماعت مسلمین کے ذریعہ مسائل کو حل کرنے میں پیچیدگی اور تاخیر کا بھی اندیشہ ہے، چنانچہ ''الحلیلۃ الناجزۃ'' میں حضرت مولانا ابوالمحاسن صاحبؒ کا یہ خط درج ہے:

از امارتِ شرعیہ بہار

محترم المقام جناب مولانا محمد اشرف علی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب کا مرسلہ رسالہ مجموعۂ رسائل ''الحیلۃ الناجزۃ'' میری غیبت میں پہنچا، میں سفر میں تھا؛ اس لیے آج تک دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، جناب کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس ناچیز کے پاس بھیج دیا۔

اس وقت جزء دوم کا مقدمہ سرسری طور پر دیکھا، دارالکفر میں قضاء بین المسلمین کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ نے جو صورت تجویز فرمائی ہیں وہ نہ معلوم کیوں اس رسالہ میں مذکور نہ ہوئی، یعنی:

''یصیر القاضي قاضیاً بتراض المسلمین، اور ان یتفقوا علی واحد یجعلونه والیاً فیولی قاضیاً، الخ''.

جب یہ صورت موجود ہے تو پنچایت کی صورت اختیار کرنا بلا ضرورت مسئلہ غیر کا اختیار کرنا ہوگا، اس مسئلہ کی بابت شامی، بحر، نہر، فتح القدیر وغیرہ میں جو عبارتیں ہیں وہ آپ سے پوشیدہ نہ ہوں گی؛ مگر سہولت کے لیے مولانا محمد علی صاحب مرحوم مونگیری کا خطبہ روانۂ خدمت کرتا ہوں، جس میں وہ تمام عبارتیں مذکور ہیں؛ تاکہ جناب آسانی سے ان سب پر پھر غور کر سکیں، افسوس ہے کہ آج ہی چند گھنٹے کے بعد پھر باہر سفر میں جا رہا ہوں، ان شاء اللہ تعالیٰ اچھی طرح مطالعہ کے

بعد جو کچھ عرض کرنا ہوگا، عرض کروں گا۔

اس وقت جو بات نہایت اہم معلوم ہوئی اس کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوا، اگر جناب کے متبرک قلم سے حنفیہ کے اس مسلک کا بیان بھی اب بطورِ ضمیمہ اس رسالہ میں شامل ہوجائے تو بہتر ہوگا، اس مسئلہ کی ضرورت واہمیت کے علاوہ پنچایت کی عملی دقتیں، بہت زیادہ ہیں اوران شرائط کی نگاہ داشت بھی بہت مشکل ہوگی۔

والسلام فقط

ابوالمحاسن محمد سجاد کان اللہ لہ

۲۵؍ربیع الأوّل ۱۳۵۳ھ

الحیلۃ الناجزۃ ص:۸۷-۲۷۷، ناشر مکتبہ معہد الشریعہ لکھنؤ ۱۴۳۸ھ

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا تأثر:

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مضمون میں حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد رحمۃ اللہ علیہ سے ٹرین کے ایک سفر میں دورانِ سفر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب کی باہمی گفتگو کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مجھے مرحوم سے ایسی ملاقات کا شرف (جس کو ملاقات کہا جاتا ہے) پہلی بار غالباً ۲۸ء میں حاصل ہوا، یہ وہ زمانہ تھا کہ جمعیۃ علماء نے اپنی راہ نہرو رپورٹ کے مسئلہ پر کانگریس سے الگ کرلی تھی، مرادآباد میں جمعیۃ مرکزیہ کی مجلس منتظمہ کا اجلاس تھا، اس سے فارغ ہوکر میں اپنے اس وقت کے اقامتی وطن امروہہ کے لیے مرادآباد سے دہلی کی ٹرین میں سوار ہوا۔ اسی گاڑی سے حضرت مفتی صاحب مدظلہ اور حضرت مولانا محمد سجاد مرحوم دہلی کے لیے روانہ ہوئے، مرادآباد سے امروہہ تک راستہ تقریباً صرف ایک گھنٹہ کا ہے، اتنے ہی وقت میں وقتی مسائل کے متعلق جو گفتگو رہی جس میں زیادہ حصّہ مولانا سجاد مرحوم ہی کے افادات کا تھا، اس سے میں نے پہلی بار یہ اندازہ کیا کہ یہ شخص اپنی شان کا نرالا "عالم" ہے۔

اسی دن میرے قلب پر ان کی عظمت کا سکّہ بیٹھ گیا اور میں ان کو دورِ حاضر میں کم از کم طبقۂ علماء میں اسلامی سیاست کا اعلیٰ ماہر سمجھنے لگا، میں صاف کہتا ہوں کہ پھر اس کے بعد سے آج تک اس باب میں حلقۂ علماء میں سے کسی کی بھی عظمت وجلالت کا اس درجہ میں قائل نہ ہوسکا، پھر اس پہلی صحبت کے بعد کی ہر صحبت اور ہر ملاقات ان کی عظمت کے اس احساس میں اضافہ ہی کرتی رہی، مجھے حضرت مرحوم کی جس خصوصیت نے سب سے زیادہ متأثر کیا

وہ یہ ہے کہ پارٹی فلنگ اور جماعتی مسلک سے بالاتر ہوکر وہ ہر مسئلہ پر غور کرتے تھے، پہلے کوئی رائے قائم کرکے یا کسی جماعت کے فیصلہ کو سامنے رکھ کر خواہ مخواہ اس کی تائید میں مواد فراہم کرنے کے وہ عادی نہ تھے، بلکہ پہلے ملّی ضروریات اور واقعات وحالات پر غور کرتے اور تہ میں ڈوب کر غور کرتے اور پھر جس نتیجہ پر پہنچتے اسی کو مسلک بنانے اور اپنے رفقاء سے منوانے کی کوشش کرتے تھے، ہندوستان کے سیاسی مسائل میں بھی بس اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی ضروریات ہی آپ کی غور وفکر کا مرکز اور محور تھے''۔(۴)

قانونی مسوّدہ کے بعض دفعات پر ان کا چشم کشا اور بصیرت افروز تجزیہ:

الحیلۃ الناجزۃ کی روشنی میں قانون انفساخ نکاح مسلمات کا جو مسودہ تیار کیا گیا، اس میں اصل کتاب کی طرح اس قول کو اختیار کیا گیا کہ اگر کوئی مسلمان خاتون اپنے شوہر سے چھٹکارہ کے لیے نعوذ باللہ مرتد ہوجائے؛ تاکہ شوہر سے اس کا نکاح ختم ہوجائے تو ارتداد کی بنیاد پر شوہر سے نکاح ختم نہیں ہوگا؛ بلکہ نکاح حسبِ سابق قائم رہے گا، فقہ حنفی میں یہ قول ظاہر روایت نہیں ہے، ظاہر روایت تو یہی ہے کہ ارتداد سے نکاح فسخ ہوجاتا ہے؛ لیکن حضرت تھانویؒ اور ان کے شرکاء تصنیف نے ظاہر روایت کو لینے کے بجائے ہندوستان کے اس وقت کے حالات میں حنفیہ میں سے فقہاء بلخ کے قول کو اختیار کیا، جن کے مطابق بیوی کے ارتداد سے نکاح فسخ نہیں ہوتا، مسودہ قانون میں بھی اسی قول کو اختیار کیا گیا تھا۔ حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ کو اس سے سخت اختلاف تھا، انھوں نے اس سلسلہ میں اپنی ایک مفصل تحریر روانہ فرمائی، جس سے ان کی فقہی اور قانونی بصیرت اور ملک جن حالات سے گزرنے والا ہے، ان پر گہری نظر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، تحریر فرماتے ہیں:(۵)

''اس مسودہ کی دفعہ(۶) میں عورت کے ارتداد کو عدم موجب فسخ نکاح قرار دیا گیا ہے۔

اس دفعہ کی ضرورت ہم سب کو معلوم ہے کہ بہت سی عورتیں اسی طریق سے آج تک ظالم شوہروں سے نجات حاصل کررہی ہیں، بعض عورتیں حصول نجات کے بعد دوبارہ اسلام کا اعلان کرکے دوسرے مسلم کے ساتھ وابستہ ہوگئیں اور بعض بدنصیب ارتداد پر قائم رہتے ہوئے کسی غیر مسلم کے ساتھ ہوگئیں۔

الغرض عورتوں کے ارتداد رسمی اور ارتداد حقیقی دونوں کو روکنے کے لیے یہ دفعہ رکھی گئی ہے اور بلاشبہ یہ دفعہ اپنے مفروضہ مقصد پر پورے طور پر حاوی ہے۔

بادی النظر میں یہ دفعہ لوگوں کو بہت مفید معلوم ہوتی ہے؛ لیکن میری ناقص رائے میں جب کہ

قانون انفساخ میں عورتوں کے واسطے ظالم شوہروں سے نجات حاصل کرنے کے لیے تمام دروازے کھل جاتے ہیں تو اس کے بعد اس دفعہ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے؛ بلکہ میرے نزدیک یہ دفعہ نہایت مضر اور خطرناک ہے اور کسی طرح مفید نہیں ہے، اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

(ا) اگر کوئی عورت مسلمہ مرتد (نعوذ باللہ منہ) ہوتی ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں:

(الف) اوّل یہ کہ وہ دل سے مسلمان رہتے ہوئے یہ اعلان اس مقصد سے کرتی ہے کہ بذریعہ عدالت مسلم ظالم شوہر سے اس کا قطع تعلق ہو جائے، بعدہ وہ پھر اعلانیہ مسلمان رہ کر زندگی گزارے، اسی کو میں نے ''رسمی ارتداد'' سے تعبیر کیا ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ وہ حقیقۃً دل سے بھی کفر اختیار کر لیتی ہے اور بذریعہ عدالت مسلم شوہر سے نجات حاصل کرنے کے بعد بھی کفر ہی پر قائم رہتی ہے۔

دفعہ (٦) کا منشاء یہ ہے کہ ان ہر دو صورتوں میں عدالت فسخ نکاح کا حکم نہیں دے؛ اس لیے مجبوراً ہر مرتدہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے گی اور آخر اسلام کا اقرار کرے گی اور یہ کہ جب قانوناً ارتداد موجب فسخ نہیں ہوگا تو اس قانون کی عام اشاعت کے بعد اس مقصد کے لیے کوئی مسلمہ ارتداد قبول نہیں کرے گی۔

مگر قانون انفساخ کی توسیع کے بعد ارتداد کی پہلی صورت کا وقوع نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اگر شوہر مثلاً حقوق زوجیہ ادا نہیں کرے گا، تو عورت اس قانون کے دفعہ (٤) و (٥) کی رو سے عدالت سے فسخ نکاح کرا لے گی، ارتداد رسمی کی اس کو کوئی ضرورت نہیں ہوگی؛ اس لیے یہ صورت تو خود بخود بند ہو جائے گی۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ جس عورت کو اس جدید قانون کی خبر نہ ہو اور وہ مشہور طریقۂ ارتداد کو اختیار کرے تو اس صورت میں یہ دفعہ مؤثر ہوگی، تو یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ کسی وکیل کے ذریعہ عدالت تک پہنچے گی، تو اس کو قانون فسخ نکاح معلوم ہو جائے گا، پھر اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ عدالت میں ارتداد جیسے ملعون فعل کا اظہار کرے، جو اس کے لیے غیر مفید ہو؛ بلکہ وہ دوسرے وجوہ پیش کر کے فسخ نکاح کی ڈگری حاصل کرے گی، نتیجہ یہ ہوا کہ رسمی ارتداد کا وقوع بھی نہیں ہوگا اور عورت خاوند کے قبضہ سے خارج بھی ہوگی اور دفعہ (٦) اس صورت کے لیے کسی حال میں مفید نہیں ہوئی۔

اسی طرح دوسری صورت کے لیے بھی یہ دفعہ کچھ مفید نہیں ہے؛ کیوں کہ اس قانون کے بعد جو عورت بھی عقیدۃً مرتد ہوگئی، وہ دوسرے وجوہ کی بنا پر بذریعۂ عدالت فسخ نکاح کی ڈگری

حاصل کرالے گی، اگر اور کوئی وجہ نہیں تو کم از کم یہ وجہ اس کے لیے کافی ہوگی کہ اس مرتدہ سے مسلم شوہر تعلق زن وشو نہیں رکھے گا، (اگر چہ نان نفقہ دیتا ہو) اور اسی ظلم وعدم ضبط نفس وخوف زنا کی بنا پر فسخ نکاح کرالے گی، جو اس مسودۂ قانون کی دفعہ (۵) ضمن (و) میں شامل ہے اور فقہ مالکی کے رو سے وہ فسخ کا مطالبہ کرسکتی ہے؛ اس لیے عدالت نکاح فسخ کردے گی، نتیجہ یہ ہوگا کہ ارتداد بھی قائم رہے گا، اور عورت شوہر کے قبضہ سے بھی نکل جائے گی اور اس صورت میں قانون کی دفعہ (۶) بالکل غیر مؤثر رہے گی، اور اگر مرد اسی مرتدہ (یعنی حقیقی مرتدہ) سے تعلق قائم رکھے گا تو وہ خود حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اور ان کے ہم خیالوں کے فتویٰ کی بنا پر بھی ہمیشہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا رہے گا۔

اسی کے ساتھ بے دینی کے اس دور کا بھی ذرا جائزہ لے لیجیے کہ آج اس قسم کے کتنے شوہر ہوں گے جو مرتدہ پر بحیثیت زوج قابض بھی ہوں گے اور نان نفقہ مدت العمر دیتے رہیں گے، مگر زن وشو کا تعلق نہ رکھیں گے، میں بظن غالب سمجھتا ہوں کہ شاید ایک بھی نہیں۔

پس اس دفعہ کا زیادہ سے زیادہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ اس قانون کی عام شہرت کے بعد جو عورتیں محض رسمی ارتداد کو قبول کرتی ہیں، وہ اس سے باز رہیں گی؛ مگر یہ فائدہ تو محض دفعہ (۴) و (۵) کی شہرت سے حاصل ہو جائے گا، دفعہ (۶) قانون میں رہے یا نہ رہے دونوں برابر ہے۔

(۲) اور اس دفعہ (۶) کا اسلامی نقطۂ نظر سے ایک دوسرا پہلو نہایت خطرناک یہ ہے کہ اگر یہ دفعہ آپ حضرات نے منظور کرایا یا منظور کرانے کی سعی کی، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری غیر مسلم اقوام بھی اسی قسم کا قانون بنوائیں گے اور آپ کو کوئی حق نہیں ہوگا کہ آپ اس کی مخالفت کریں، اور مخالفت کریں بھی تو نتیجہ معلوم ہے کہ وہ منظور ہو کر رہے گا، لہٰذا ہندو، سکھ یہ قانون بنوائیں گے کہ اگر ان کی کوئی عورت تبدیل مذہب کرلے، تو وہ اپنے شوہر سے کسی حال میں علاحدہ نہیں ہوسکتی ہے اور اسی طرح عیسائی اور پارسی بھی بنوا سکتے ہیں۔

اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ آج ہزاروں غیر مسلم شوہر دار عورتیں مسلمان ہو کر مسلمانوں میں شامل ہو رہی ہیں، اس کا دروازہ ہمیشہ کے لیے اب بند ہو جائے گا۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ بنگال میں ہندوؤں کی چند شوہر دار عورتوں نے اسلام قبول کر کے بذریعہ ہائی کورٹ کلکتہ اپنے سابق شوہروں سے علاحدگی کی ڈگری حاصل کی ہے اور ان نظائر کے بعد مشہور ہندو قانون معطل ہو چکا ہے؛ مگر آپ حضرات کے اس اقدام سے ان کی غلط رہنمائی ہوگی تو سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں کی شوہر دار عورتوں کے لیے اسلام کا دروازہ ہمیشہ کے لیے اس

قانون سے بند ہوجائے گا تو اس کی اصلاح کیوں کر ہوگی؟ اور یہ دروازہ پھر کس طرح کھل سکتا ہے؟ اس کے علاوہ جو عورتیں دل سے مسلمان ہونے کے بعد قانوناً اپنے غیر مسلم شوہروں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوں گی، اس کی دو ہی صورتیں ہوں گی:

(الف) وہ مسلمان رہیں، اور ان کے غیر مسلم شوہر ان سے متمتع ہوتے رہیں تو یہ دوامی گناہ عظیم جو اس غریب کے سر ہوگا، اس کا وبال کس کے سر ہوگا؟ کیا وہی غریب عنداللہ وعندالرسول جوابدہ ہوں گی، یا وہ حضرات بھی جو اس قسم کے قوانین سازی کے ذمہ دار ہوں گے اور آخر اس خالص مذہبی معصیت سے ان کی خلاصی کی صورت کیا ہوگی؟

(ب) یا یہ کہ وہ پھر مجبوراً مرتد ہوجائے اور حقیقی ارتداد قبول کرلے اور اپنے شوہر کے ساتھ زن وشو کا تعلق رکھے تو اس صورت میں ان عورتوں کے ارتداد کا وزر عظیم کن کن لوگوں کے حصّہ میں آئے گا؟ اور قانون میں جو دفعہ ارتداد کو روکنے کے لیے رکھی گئی ہے، وہ موجب ارتداد ہوکر رہے گی، اگر یہ خیال کیا جائے کہ غیر مسلموں کی بیویاں مسلمان ہوکر مجوزہ قانون کی دفعہ (۵) ضمن (و) کے ماتحت فسخ نکاح کراسکتی ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ جب تک قانون میں اس کی وضاحت نہ ہو، برطانوی حکام نومسلمہ کو جس کا شوہر کافر ہی ہو یہ حق دینے کو تیار نہ ہوں گے، علاوہ بریں آپ کے مجوزہ قانون اور ہندوؤں کے قانون کے مابین اس صورت میں مصادمت ہوگی اور بصورت مصادمت، برطانوی جج اپنے نظریات کے ماتحت فیصلہ کریں گے اور بہت ممکن؛ بلکہ اغلب ہے کہ ان کا فیصلہ اسلام کے خلاف ہوا کرے گا۔

(۳) اگر اسمبلی میں دفعہ (٦) کے ساتھ یہ مسودہ پیش ہوگیا، اور اس پر بحث ہوگی اور کسی نے دریافت کرلیا کہ کیوں صاحب؟ اسلام کا قانون تو یہ ہوا کہ عورت کے ارتداد سے نکاح فسخ نہیں ہوگا؛ یعنی عورت اس کی بیوی رہے گی تو سوال یہ ہے کہ زن وشو کا تعلق بھی رہے گا، یا نہیں؟ تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟

اگر اثبات میں جواب دیا گیا تو غلط ہوگا اور کلیۃً غلط ہوگا، اس کے علاوہ نتیجہ یہ ہوگا کہ بشرط وقوع اسی پر ہندوستان میں عمل درآمد بھی ہوگا اور یہ معلوم ہے کہ یہ شرعاً جائز نہیں ہے اور اگر نفی میں جواب دیا گیا تو یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہوگی کہ اسلام ایک عورت کو ایک مرد کے ماتحت رکھتا ہے؛ مگر عورت کے حقوق ازدواجی کو سلب کرتا ہے، کیا ہم اس طریقہ سے اسلام کی کوئی خدمت کریں گے؟ یا اس کو بدنام کریں گے اور اس حکم کے اظہار کے بعد ہمیں یقین ہے کہ یہ دفعہ قطعاً منظور نہیں ہوگی؛ مگر اسلام کی بدنامی ہوجائے گی، جس کا ازالہ مشکل ہوگا۔

(۴) اسی طرح بہت ممکن ہے کہ اسمبلی میں یا سلکٹ کمیٹی میں اس دفعہ پر بحث کرتے ہوئے یہ سوال پیش ہو جائے کہ مسلمان مرد تبدیل مذہب کرلے تو اس صورت میں اس کی عورت مسلمہ کو انفساخ نکاح کا حق ہوگا، یا نہیں؟

اگر نفی میں جواب دیا گیا تو نہایت غلط اور سراسر مضر ہوگا، علاوہ بریں عورت کو یہ حق اس قانون کے دفعہ (۵) ضمن (و) کی رو سے حاصل ہوسکتا ہے اور یہ ہونا چاہیے؛ مگر آپ حضرات کے اس جواب کے بعد دفعہ (۵) ضمن (و) سے یہ صورت خارج سمجھی جائے گی، حالاں کہ اس کا شمول ضروری ہے۔

اگر اثبات میں جواب دیا گیا تو آپ حضرات کو غیروں کو یہ سمجھانا نہایت مشکل ہوگا کہ مرد کے تبدیلِ مذہب کی صورت میں عورت کو حق فسخ نکاح ہو اور جب وہ خود مذہب تبدیل کرلے تو اس کو حق فسخ نکاح نہ ہو اور جب وہ فرق سمجھنے سے قاصر رہیں گے، تو بہت ممکن ہے کہ دفعہ (٦) میں یہ ترمیم پیش ہو جائے کہ عورت، یا مرد کسی کا مذہب اسلام چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب کا اختیار کرنا بذاتِ خود انفساخ نکاح کا باعث نہیں ہوگا اور خدانخواستہ یہ ترمیم تمام مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود پاس ہوگئی تو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کس قدر ناانصافی ہوگی، اس کو آپ حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

(۵و٦) پر یہ سب اعتراضات اس مفروضہ کی بنا پر ہیں کہ اسلام کا قانون یہ صحیح تسلیم کرلیا جائے کہ ارتداد مسلمہ موجب فسخ نکاح نہیں ہے، ورنہ یہ مسئلہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے، ائمہ اربعہ؛ بلکہ ائمہ مسلمین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ''ارتداد مسلمہ موجب فسخ نکاح ہے، اگر وہ بعد تفہیم ارتداد پر قائم رہے، فقہ حنفی میں ظاہر الروایہ یہی ہے، محققین فقہائے حنفیہ کا فتویٰ یہی ہے، بلاشبہ متأخرین علمائے بلخیین نے اسلامی حکومت کے اضمحلال کے زمانہ میں اس قسم کے فتاوے دیئے ہیں؛ مگر ان مفتیوں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ فتویٰ محض اس لیے ہے کہ جو عورتیں ارتداد کو حیلہ فسخ نکاح بناتی ہیں، اس کا انسداد ہو، چوں کہ عورت کا حبس، حکومت کے اضمحلال کی وجہ سے ناقابل عمل ہو چکا تھا؛ لیکن عدالتیں اسلامی تھیں، وہ اس فتویٰ کے احترام کی وجہ سے فسخ نکاح کا حکم نہیں دے سکتی تھیں؛ اس لیے عورتوں کا یہ حیلہ وہاں کارگر نہیں ہوسکتا تھا، علاوہ بریں ہندوستان جیسی وہاں مشکلات نہ تھیں، نہ یہ ماحول تھا؛ اس لیے یہ فتویٰ وہاں مفید ہوسکتا تھا، جو محض رعایت مصلحت پر مبنی تھا؛ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ یہ علما، عورتوں کو فسخ نکاح کے وہ تمام حقوق دے دیتے جو شریعت اسلامیہ نے دیئے ہیں تو ارتداد کا حیلہ خود بخود ختم ہو جاتا، علاوہ ازیں یہ فتویٰ اس

حیثیت سے بھی وہاں مفید ہوسکتا تھا کہ جب عورتیں مرتد ہوکر دوبارہ مسلمان ہوکر دوسرے مسلمان مرد سے عقد کرنا چاہتیں تو کوئی مرد اس فتویٰ کے بعد اس سے عقد نہیں کرسکتا تھا؛ کیوں کہ ان کو فتویٰ دیا گیا تھا کہ وہ عورت اپنے پہلے شوہر کی بیوی ہے اور اس وجہ سے عورت جب اپنے مقصد یعنی عقد ثانی میں ناکام ہوتی تو پھر اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوسکتی تھی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ زوج سے جدائی کے لیے وہ ارتداد کے طریقہ کو چھوڑنے پر مجبور تھی، مگر ہندوستان کی یہ حالت نہیں ہے، یہاں مردوں میں تقویٰ وتدین کا جو حال ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، یہاں یہ فتویٰ کسی حال میں عموماً مؤثر نہیں ہوسکتا ہے اور اگر اس فتویٰ کی بنا پر قانون بنوایا جائے، جب بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا، جیسا کہ میں قبل میں لکھ چکا ہوں۔

الغرض محض ایک مصلحت کو مدنظر رکھ کر عدم فسخ نکاح کا فتویٰ اگرچہ بلخیوں نے دیا تھا؛ مگر اسی کے ساتھ مخالطت کو حرام قرار دیا تھا، گویا عورت کو حکومت کے محبس میں محبوس رکھنے کے بجائے ایک شخص کے گھر میں اس طرح محبوس کیا جانا تجویز کیا گیا تھا، جو اس دور میں ایک حد تک مفید تصور کیا جاسکتا تھا، نہ یہ کہ حقیقۃً ارتداد مسلمہ سے عنداللہ وعندالرسول بھی اس کا نکاح فسخ نہیں ہوتا ہے؛ اس لیے میرے نزدیک نصوص اور اقوال ائمہ عظام واکابر فقہائے ملت کو پیش نظر رکھ کر و نیز بربنائے مصالح شرعیہ یہ فتویٰ اس قابل نہیں ہے کہ اس پر عمل کیا جائے چہ جائے کہ اس فتویٰ کی بنا پر قانون بنوایا جائے۔

اس لیے میری رائے ہے کہ اس مسودہ قانون سے دفعہ (۶) حذف کردیا جائے، قبل اس کے کہ اسمبلی میں اس کی پہلی خواندگی ہو؛ یعنی تمام مجوزین نوٹس دے کر خارج کرادیں۔

مصادر ومراجع

(۱) حیات سجاد ص: ۷۷ مرتبہ مولانا انیس الرحمٰن قاسمی

(۲) حیات سجاد ص: ۷۷

(۳) حیات سجاد ص: ۱۰۵-۱۰۷

(۴) حیات سجاد ص: ۱۳۰-۱۳۱

(۵) قانونی مسودہ ص: ۱۲-۲۱

حضرت مولانا محمد سجاد کا فقہی مقام ومرتبہ

مفتی اختر امام عادل قاسمی
مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور (بہار)

حضرت مولانا سجاد صاحب مختلف علوم وفنون کے جامع تھے، اور کسی بھی علم وفن میں ان کا پایہ اپنے کسی ہم عصر سے کمتر نہیں برتر ہی تھا۔

علمی جامعیت :

بقول حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ:

''ان کے علمی رسوخ، سیاسی شعور اور دینی اخلاص کے جو تجربات ہوتے تھے، وہ مجھے حیرت میں ڈال دیتے تھے، حالانکہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے علم ودین کی بڑی بڑی شخصیتوں تک پہونچنے کا مجھے موقعہ عطا فرمایا؛ لیکن ان تینوں شعبوں کی جامعیت اور وہ بھی اس پیمانہ پر، یہ واقعہ ہے کہ اپنے جاننے والوں میں کسی کے اندر نہیں پاتا، وہ جب منطق وفلسفہ کے نکات پر بحث کرتے تو پتہ کی ایسی بات کہتے کہ مسئلہ کی گرہ کھل جاتی تھی، پھر جب فقہی جزئیات کا ذکر آتا تو ایسے نوادر جزئیات کا پتہ دیتے کہ میں حیران رہ جاتا؛ لیکن جب کتاب کھلتی تو جو کچھ مولانا فرماتے، اس کی توثیق کرنی پڑتی تھی اور سیاسی مہارت جو ان کو حاصل تھی، اس کا تجربہ تو مجھ سے زیادہ ان لوگوں کو ہوتا رہا، جن کی عمر گذری تھی اسی دشت کی سیاحی میں''۔(۱)

اور مولانا عبدالحکیم اوگانویؒ کے الفاظ میں: ''مولانا جامع العلوم تھے''۔(۲)

یا جیسا کہ عصر حاضر کے مشہور عالم اور ناقد مورخ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شہادت ہے کہ:

''میرے محدود علم میں ان کا جیسا دقیق النظر اور عمیق النظر عالم دور دور نہ تھا، فقہ بالخصوص اصول فقہ پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، سیاست وتمدن اور تاریخ کا بھی انہوں نے

گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، خاص طور پر قانونی اور دستوری باریکیوں اور ہندوستان کے دستور اور سیاسی نظاموں سے وہ گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ان کا انہوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا تھا''۔(۳)

اردو اور عربی کے ممتاز ادیب اور مصنف مولانا مسعود عالم ندویؒ نے مولانا کی علمی اور شخصی جامعیت کے بارے اپنا ذاتی تجربہ تحریر کیا ہے کہ:

''اب تک جن لوگوں سے ملا، دو چار مستثنیات کو چھوڑ کر تعلقات کی زیادتی سے بدگمانی ہی بڑھی، بڑے بڑے عالموں کی مجلس میں جا کر بیٹھا، بعضوں کے نام سن کر دور دراز کے سفر بھی کیئے، پر نزدیک جا کر معلوم ہوا کہ ''ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی؛ لیکن مولانا کا حال اس سے بالکل جدا تھا، ان سے پہلی نظر میں بعد محسوس ہوتا تھا، دو چار ملاقاتوں میں جا کر ان کے ذہن و دماغ کی بلندی کا صحیح احساس ہو پاتا اور اگر کہیں انہوں نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا، پھر تو بے اختیار جی چاہتا کہ علما و زعما کی ساری جماعت اس فرد واحد پر نچھاور کر دی جائے''۔(۴)

سحبان الہند حضرت مولانا حافظ احمد سعید دہلویؒ نے حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی شان میں ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کی ہے:

''حضرت مولانا مرحوم کے فضائل اس قدر کثیر ہیں کہ ان کے تذکرے کے لیے دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہیں، ایک صحیح انسان میں جو خوبیاں اور کمالات ہونے چاہیئں، اللہ تعالیٰ نے مولانا کی ذات میں وہ سب جمع کر دیئے تھے''۔(۵)

مولانا کے سیاسی ناقد جناب راغب احسن صاحب باوجود اختلافات کے آپ کی ہمہ جہت شخصیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولانا سجاد غالباً علماء ہند میں واحد شخص تھے، جو ایک یورپین ڈپلومات کا تدبر، ایک ہندوستانی زمیندار کے کارپرداز کی ماہرانہ کارپردازی اور ایک عاشق صادق کی عقیدت و عزم راسخ اور ایک سالک راہ سلوک کی کمال یکسوئی اور استقلال کے اوصاف اپنی سیرت میں جمع رکھتے تھے''۔(۶)

فقہی امتیازات وخصوصیات:

لیکن آپ کا اصل میدان فقہ اسلامی اور قوانین عالم کا مطالعہ تھا، اس باب میں ان

کو جو خصوصی امتیاز حاصل تھا اور اسلامی قانون کی باریکیوں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے قوانین پر ان کی جیسی نظر تھی کہ شاید اس عصر میں ان کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ مولانا عبدالصمد رحمانیؒ لکھتے ہیں کہ:

''میرے خیال میں مولانا کی اصلی خصوصیت تفقہ فی الدین کی خدادادد ولت تھی، جس میں وہ فرید اور یگانہ تھے، مولانا جس وقت الٰہ آباد سے گیا کو مراجعت کر رہے تھے اور عمائدین کی جماعت مولانا کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر آئی تھی تو ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ الٰہ آباد سے فقہ رخصت ہو رہی ہے''۔(۷)

قانونی گتھیاں سلجھانا، معاملات کی تہ تک پہونچنا اور ان کو چٹکیوں میں حل کر دینا یہ مولانا سجاد کا کمال تھا، علامہ سید سلیمان ندویؒ مولانا کے فقہی اور قانونی ملکہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ اپنے وقت کے مشاق مدرس اور حاضر العلم عالم تھے، خصوصیت کے ساتھ معقولات اور فقہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، جزئیات فقہ اور خصوصاً ان کا وہ حصہ جو معاملات سے متعلق ہے، ان کی نظر میں تھا، امارت شرعیہ کے تعلق سے، یا اقتصادی و مالی و سیاسی مسائل پر ان کو عبور کامل تھا، زکوٰۃ و خراج و قضا و امامت و ولایت کے مسائل کی پوری تحقیق فرمائی تھی۔۔۔۔ معاملات کو خوب سمجھتے تھے، ان کو بارہا بڑے معاملات اور مقدمات میں ثالث بنتے ہوئے دیکھا ہے اور تعجب ہوا ہے کہ کیوں کر فریقین کو وہ اپنے فیصلہ پر راضی کر لیتے تھے اور اسی لیے لوگ اپنے بڑے بڑے کام بے تکلف ان کے ہاتھ میں دیتے تھے''۔(۸)

انہوں نے ہر مکتب فکر و نظر کے علماء اور ماہرین سے اپنی علمی، فقہی اور قانونی برتری کا لوہا منوایا، معروف مصنف مولانا امین احسن اصلاحی صاحب رقمطراز ہیں:

''مولاناؒ نے اسلامی قانون کا نہایت اچھا مطالعہ کیا تھا، تمام حاضر الوقت مسائل میں وہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ شرعی نقطۂ نظر متعین کر لیتے تھے، ان کی نظر نہایت گہری تھی، بسا اوقات پہلے وحلے میں ان کی رائے کمزور معلوم ہوتی؛ مگر ان کی تنقیحات کے بعد جب مسئلہ پوری روشنی میں آجاتا تو ہر شخص ان کی اصابت رائے کی داد دیتا، پھر وہ صرف جزئیات کے مفتی نہیں تھے؛ بلکہ اسلامی نظام کو اس کے تمام اشکال و صور میں جانتے اور سمجھتے تھے اور اس کے اصولی و فروعی مسائل کی پوری معرفت رکھتے تھے، ان معاملات میں بصیرت

رکھنے والے ہندوستان میں بہت کم ہیں''۔(۹)

حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ صاحب نے مولانا سجاد صاحبؒ کو بہت قریب سے برتا تھا، انہوں نے اپنا تجربہ تحریر کیا ہے کہ:

''جمعیۃ علماء میں جب کبھی علمی مسائل پر بحث ہوتی، تو مولانا سجاد صاحب کا اصل جوہر اس وقت کھلتا تھا، ہماری جماعت میں مشہور ہے کہ زبردست دلائل کے ساتھ کسی بات کو مدلل کر کے بیان کرنا حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا خاص حصہ ہے اور یوں بھی مفتی صاحب کو فقہ اسلامی میں بہت بڑا کمال حاصل ہے؛ لیکن جماعت کے ذمہ دار ارکان اور میں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب دلائل و براہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے تو حضرت مفتی صاحب بھی بے حد متاثر ہوتے اور ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان سے کلمات تحسین نکل جاتے''۔(۱۰)

فقیہ النفس عالم دین:

قرآن و حدیث اور مراجع فقہیہ کی مسلسل مزاولت اور عطاء ربانی کی وجہ سے اسلامی قانون ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا، تفقہ آپ کی فطرت کی گہرائیوں میں پیوست ہو گیا تھا، اور مآخذ کی طرف رجوع کئے بغیر بھی مسائل کی روح تک پہونچنے کا وہ بے پناہ ملکہ رکھتے تھے، بقول مولانا عبدالصمد رحمانیؒ:

''مولانا ان مسائل میں جو ارتقائی اسباب کی بنا پر آئے دن نئی نئی صورتوں میں رونما ہوا کرتے ہیں، بلا تکلف صائب رائے دیتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کو پہلے سے سوچے بیٹھے ہیں اور اس کے شواہد اور نظیر پر غور و فکر کے تمام مراحل کو طے فرما چکے ہیں''۔(۱۱)

اور مولانا امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں:

''وہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ شرعی نقطۂ نظر متعین کر لیتے تھے۔۔۔ بسا اوقات پہلے وحلے میں ان کی رائے کمزور معلوم ہوتی؛ مگر تنقیحات کے بعد جب مسئلہ پوری روشنی میں آتا تو ہر شخص ان کی اصابت رائے کی داد دیتا''۔(۱۲)

ایسے عالم کو علمی اصطلاح میں "فقیہ النفس" کہا جاتا ہے، اسلامی تاریخ میں ایسے

علماء انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، جو اس مقام بلند تک پہونچے ہوں۔حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ نے حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کے حوالے سے نقل فرمایا کہ:

''ہفتوں کتابوں کو دہراتے دہراتے ،جس نتیجہ تک ہم پہونچتے ،تحقیق وجستجو کی آخری سرحد کو پار کر کے وہاں مولانا سجادؒ سوال سن کر پہلے لمحے میں جواب دیتے تھے، یہ ان کے فقیہ النفس ہونے کی دلیل ہے، گویا ذہنی سانچہ ہی ان کا فقہ میں ڈھلا ہوا تھا، جواب آتا ہی تھا، وہ جو فکر صحیح کا نتیجہ ہوتا''۔(۱۳)

اسی بات کو انہوں نے ''قضایا سجاد'' میں اس طرح نقل فرمایا ہے:

''جب نازک فقہی سوالات ابھرتے تو مولانا برجستہ کتابوں کی طرف رجوع کئے بغیر جو جواب دیتے وہی جواب ہم سب کتب فقہ اور مراجع علمی کے مطالعہ اور غور وفکر کے بعد جس نتیجہ تک پہونچتے وہی ہوتا جو مولانا اول وہلہ میں فرمادیا کرتے تھے''۔(۱۴)

علامہ محمدانورشاہ کشمیریؒ کی شہادت :

امام العصر خاتم المحدثین حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ (ولادت ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء - وفات ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء) جو علم حدیث کے ساتھ فقہ پر بھی بہت گہری نظر رکھتے تھے، جو حافظ ابن حجرؒ جیسے محدث فقیہ کے بارے میں فرماتے تھے کہ:

''حافظ ابن حجرؒ حدیث کے پہاڑ ہیں، اگر کسی پر گریں تو ڈھادیں اور فقہ میں درک نہیں ہے''۔(۱۵)

اور جو علامہ ابن تیمیہؒ جیسے محدث، عالم، فقیہ اور معقولی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور فرماتے تھے کہ:

''میرا خیال ہے کہ ابن تیمیہ گو پہاڑ ہیں علم کے؛ مگر کتاب سیبویہ کو نہیں سمجھ سکے ہوں گے؛ کیوں کہ عربیت اونچی نہیں ہے، فلسفہ بھی اتنا جانتے ہیں کہ کم اتنا جاننے والے ہوں گے؛ مگر ناقل ہیں، حاذق نہیں ہیں''۔(۱۶)

علامہ کشمیریؒ علماء سلف میں امام رازیؒ، علامہ ابن نجیم مصریؒ صاحب البحرالرائق اور متأخرین میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (جو علامہ شامیؒ کے معاصر تھے) کے فقیہ النفس ہونے کے قائل تھے۔(۱۷)

اس تناظر میں یہ بات بہت زیادہ اہم ہے کہ علامہ کشمیریؒ اپنے ہی عہد کی جس دوسری بڑی

علمی شخصیت کے علم وفقاہت سے متأثر ہوئے اوران کو فقیہ النفس تسلیم کیا، وہ حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحبؒ تھے،اس بات کے راوی علامہؒ کے براہ راست شاگرد حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی علیہ الرحمہ ہیں۔

مولانا سیوہاروی تحریر فرماتے ہیں کہ!

''حضرت مولانا سید محمد انورشاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا سجاد''فقیہ النفس''عالم ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مسائل کی روح سمجھنے کا ان کو فطری ملکہ عطا فرمایا ہے۔حضرت مولانا سید محمد انورشاہ صاحب نوراللہ مرقدہ جواس زمانہ میں علم حدیث کے مجدد گذرے ہیں، کا یہ فرمانا میرے نزدیک مولانا سجاد صاحب کے تبحر علمی کے لئے ایک بہترین سند ہے''۔(۱۸)

حضرت سجادؒ سے علامہ کشمیریؒ کے گہرے تاثر اورعقیدت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "اکفار الملحدین "پر جن اکابر علماء سے تقریظات لکھوائیں، ان میں زبدۃ العلماء حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ،حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، اور مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ کے ساتھ مفکر اسلام حضرت علامہ مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد علیہ الرحمہ بھی شامل تھے اور انتہائی وقیع الفاظ میں آپ کا اسم گرامی کتاب میں شائع فرمایا:

''صورة ما كتبه العلامة الفقيه المحدث المفتى نائب أمير الشريعة لولاية بيهار مولانا أبوالمحاسن محمد سجاد أدام الله ظله ''.(۱۸)

شیخ الاسلام علامہ شبیراحمدعثمانیؒ کی شہادت:

اور یہی رائے حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کے بارے میں اسی عصر کے محدث اکبر شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی بھی تھی۔مولانا سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

''بعینہ یہی بات میں نے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی زبانی بھی سنی ہے''۔(۱۹)

مولاناکامسلک فقهی اوردیگر مکاتب فقهیه کے بارے میں نقطه نظر:

اکابر اور علماء وقت کی مذکورہ بالا شہادتوں اور بیانات سے مولانا محمد سجاد صاحب کے بلند علمی وفقہی مقام کا اندازہ ہوتا ہے،اور فقہی وقانونی بصیرت کے معاملے میں وہ اپنے عہد کے سب سے

بلند پایہ عالم دین نظر آتے ہیں، جن کی نگاہ شریعت اسلامی پر بھی تھی اور قوانین عالم پر بھی، ان کے یہاں دقت نظر بھی تھی اور اعتدال فکر بھی، وہ فقہ حنفی سے مسلکی انتساب کے باوجود تمام مکاتب فقہیہ کا احترام کرتے تھے، مذاہب فقہیہ بالخصوص امام اعظم ابوحنیفہؒ اور صاحبین کے اختلاف کو وہ اختلاف برہان سے زیادہ اختلاف زمان ومکان، اور اختلاف احوال یا اختلاف مدارج پر محمول فرماتے تھے، دیگر ائمہ کے اختلافات کو بھی خاص طور پر معاملات میں مقتضیات احوال یا اور دیگر اسباب پر مبنی قرار دیتے تھے، وہ احادیث کی طرح مسالک فقہیہ میں بھی تطبیقی فکر کے حامل تھے، وہ کہتے تھے کہ اسلام میں مصالح کی بڑی اہمیت ہے اور ائمہ کرام کے اختلافات کا بڑا منشا یہ مصلحتیں ہی ہیں، حکم کے مواقع اور مدارج کی یافت ہی اصل تفقہ ہے؛ اسی لیے وہ مفتیوں کو حضرت امام غزالیؒ کی کتاب اصول کے باب الاستصلاح کے مطالعہ کی ہدایت فرماتے تھے؛ تاکہ مختلف حالات میں وہ بصیرت کے ساتھ فتویٰ دے سکیں۔(۲۰)

آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد اصغر حسین بہاری صاحب رقمطراز ہیں:

> ''حضرت استاذ محترم مفکر اعظم مذہب وعمل میں حنفی تھے؛ لیکن تنگ نظروں کی طرح اہل سنت کے دوسرے فرقوں سے جنگ آزمانہ تھے؛ بلکہ فرماتے تھے کہ نماز کی مختلف صورتیں جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، ایک ایک مرتبہ بھی سب پر عمل کرلینا چاہیے؛ تاکہ کسی سنت کی برکات سے محرومی نہ رہ جائے''۔(۲۱)

راہ اور منزل کا فرق فراموش نہیں کیا:

مولانا کا یہ فکری توسع دراصل اصول وقواعد سے ان کی گہری واقفیت سے مترشح تھا، جس کی نگاہ کلیات پر جتنی گہری ہوتی ہے، وہ اتنا ہی وسیع النظر ہوتا ہے، جب کہ مولانا عملی طور پر حنفی؛ بلکہ خود ان کے لفظوں میں کٹر حنفی تھے؛ (۲۲) لیکن علمی طور پر وہ کسی کی تغلیط کے قائل نہیں تھے، وہ علمی اساس پر منشاء اختلاف کو سمجھتے تھے اور علامہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں:

> ''انہوں نے راہ اور منزل کے فرق کو کبھی فراموش نہیں کیا اور احکام مذہب کی پیروی میں التباس اور تصادم سے کبھی بے خبر نہیں رہے''۔(۲۳)

اختلافی مسائل میں نقطۂ اعتدال:

وہ فقہی اور نظری اختلافات کو علمی بنیادوں تک محدود رکھنے کے قائل تھے اور ان کو جنگ وجدل اور سب وشتم کا ذریعہ بنانے کے سخت خلاف تھے، حنفی اور شافعی کی جنگ ہو، یا دیوبندی،

بریلوی اور اہل حدیث کی، وہ اس کو قومی زوال کی علامت تصور کرتے تھے، فرماتے تھے:

''مسائل میں اختلاف ہو تو نہایت زوردار لفظوں کے ساتھ علمی اصول سے بحث کیجئے، جو علماء کے شایان شان ہے؛ بلکہ یہ ان کا فریضہ ہے، میں خود حنفی؛ بلکہ نہایت کٹر حنفی ہوں اور ہندوستان کے اہل حدیث جماعت کے خیالات ومسائل سے مجھ کو بھی اختلاف ہے اور سخت اختلاف؛ اس لیے ان کے ساتھ گفتگو اور بحث کی نوبت بھی آئی، مگر الحمد للہ آج تک جنگ وجدل اور سب وشتم کی نوبت نہیں آئی اور خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اہل حدیث احباب بھی اسی اصول کے پابند ہیں۔ قرآن کریم کی بھی یہی تعلیم ہے کہ:

﴿ فَإِنْ عَصَوْهُ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ ﴾(سورة شعراء: ۲۱۶)

(پس اگر لوگ تمہاری نافرمانی کریں تو اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے عمل سے بیزار ہوں۔)

پس اگر کوئی شخص ہمارا ہم خیال نہیں ہے اور ہمارا ہم مشرب نہیں ہے تو ہم اس سنت نبویہ کی اتباع میں اس کے عمل سے بیزاری تو کرسکتے ہیں؛ لیکن جنگ وجدل کرکے فتنہ برپا کرنا کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟ غور کیجئے عمل سے بیزاری کا حکم دیا گیا ہے، ذات سے نہیں، اس کے علاوہ: ''**سباب المسلم فسوق وقتاله كفر**''. (۲۴) ''**ولاتحاسدوا و لا تباغضوا**'' وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات موجود ہیں، ان سب کے ہوتے ہوئے مسلمان اور وہ بھی اہل علم مسلمانوں سے واہیاتِ خرافات اور شنیع حرکات کا ظہور سخت قابل افسوس ہے''۔ (۲۵)

دیوبندی بریلوی اختلاف میں بھی وہ نقطۂ عدل پر قائم تھے، وہ مدرسہ سبحانیہ الہ آباد سے فارغ تھے اور ان کے سب سے خاص استاذ جن کے علم وفکر کو بطور نمونہ انہوں نے قبول کیا تھا، حضرت مولانا عبدالکافی الہ آبادیؒ تھے، جو مدرسہ سبحانیہ کے بانی اور ناظم تھے، ان کا مسلک بھی اعتدال تھا، وہ کسی خاص مسلک کے داعی وحامی نہیں تھے، وہ دونوں سے محبت اور حسن عقیدہ رکھتے تھے، ان امور میں مولانا محمد سجاد صاحبؒ بھی اپنے استاذ کی روش اعتدال پر قائم؛ بلکہ اس کے وکیل اور ترجمان تھے، فتاویٰ امارت شرعیہ میں ان کا ایک فتویٰ موجود ہے، جس میں انہوں نے کسی سائل کے جواب میں اپنے استاذ حضرت مولانا عبدالکافی الہ آبادیؒ اور اپنے ''مدرسہ سبحانیہ'' کے مسلک اعتدال پر روشنی ڈالی ہے، اس کے پس منظر میں خود ان کا اپنا رجحان بھی واضح

طور پر جھلکتا ہے، اس فتویٰ کے بعض اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

''حضرت استاذی مولانا حافظ الحاج محمد عبدالکافی صاحب قدس سرہ عملاً وعقیدۃً حنفی المذہب اور صوفی المشرب تھے، تصوف میں سلسلہ علیہ نقشبندیہ مجددیہ کے پیرو تھے اور فقہ و عقائد میں محققین فقہاء حنفیہ، ومتکلمین ماتریدیہ کی تحقیقات وتنقیحات کی اتباع آپ کا مستحکم مسلک تھا، آپ کا طریق عمل اعتقاداً وعملاً صراط مستقیم اور افراط وتفریط سے خالی تھا؛ اس لیے آپ کے تعلقات علماء دیوبند واتباع حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ وحضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور علماء بریلی ومتبعین حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب مرحوم ومغفور کے ساتھ یکساں تھے؛ لیکن ان دونوں گروہوں میں سے کلیۃً کسی ایک کے بھی ہم خیال نہ تھے مثلاً وہ مجلس میلاد شریف وقیام کے جواز کے قائل تھے اور خود بھی اس کے عامل تھے جو عموماً علماء دیوبند کے مسلک کے خلاف ہے اور علماء دیوبند کی تکفیر وتضلیل کے قائل نہ تھے، جو عموماً اتباع حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کا مسلک ہے۔۔۔انہوں نے اپنی علمی تحقیقات اور کثرت افتاء کے دور میں جو تقریباً ۱۳۴۰ھ تک قائم رہا، علماء دیوبند کے خلاف نہ علی الاطلاق فتویٰ تکفیر دیا اور نہ نام بنام صراحت اسم کے ساتھ، وہ تو علماء اہل حدیث اور غیر مقلدین زمانہ کو بھی کافر نہیں سمجھتے تھے چہ جائیکہ علماء دیوبند کی تکفیر کو بنظر استحسان دیکھنا، یہ تو ان کی شان علمی اور استقامت فی الدین سے کوسوں دور تھا ہمیں خوب یاد ہے کہ حضرت استاذ ایک مرتبہ ایک خاص تقریب کے سلسلہ میں بدایوں تشریف لے گئے تھے اور اسی تقریب میں حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بھی تشریف لائے تھے، وہیں ان دونوں بزرگوں میں مخصوص صحبت وملاقات میں علماء دیوبند کی تکفیر کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی، چونکہ گفتگو مناظرانہ نہیں تھی، اس لیے نہایت سادگی کے ساتھ بہت جلد معاملہ ختم ہوگیا، حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ آپ علماء دیوبند کی جن عبارتوں پر گرفت کر کے کفر کا حکم لگاتے ہیں، کیا ان عبارتوں کا کوئی صحیح محمل نہیں ہوسکتا ہے، ہمارے امام ابوحنیفہؒ کا اصول ہے کہ عاقل بالغ کے قول کو جہاں تک ممکن ہو کسی صحیح محمل پر محمول کرنا چاہیے، اسی کے ساتھ اصول ومعانی وبلاغت میں بھی یہ امر متحقق ہے کہ کسی متکلم کے کلام کی مراد کو سمجھنے کے لیے اس کے معتقدات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، اب یہ دونوں اصول ایسے ہیں، جو اپنی جگہ محقق اور منصوص علیہ ہیں؛ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کسی پر حکم لگاتے وقت اس کو بھی پیش نظر رکھیں، تو بہتر ہے۔ اس مختصر سی

تقریر محبت آمیز؛ لیکن پر از حقیقت کو سن کر حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب نے فرمایا: بلاشبہ جناب نے ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور بلاشبہ ان اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے اگر ہم ان عبارتوں کے لکھنے والوں کو کافر نہیں کہیں تو خاطی ضرور کہہ سکتے ہیں۔ یہ واقعہ حضرت استاذ نے خود مجھ سے تفصیل سے بیان فرمایا تھا۔۔۔ مجھے یہ بھی خوب یاد ہے کہ جب حضرت استاذ قدس سرہ نے اس حکایت کو ختم فرمایا تو میں نے کہا کہ یہ آپ کی صداقت اور اخلاص کا تصرف ہے اور یہ کہ آپ نے ان سے مناظرانہ انداز میں گفتگو نہیں فرمائی، میرے اس کہنے پر حضرت استاذ قدس سرہ حسب عادت شریفہ مسکرا دیئے، اس حکایت کی نقل سے مقصود یہ ہے کہ اس قصہ میں بھی حضرت استاذ کی حق گوئی، حق پسندی اور میانہ روی کی ایک روشن حقیقت موجود ہے، اسی کے ساتھ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کے اصلی خیال پر ایک روشنی پڑتی ہے۔۔۔ اس سے ظاہر ہے کہ مدرسہ سبحانیہ جس کے حضرت ہی مہتمم اور نگراں کار تھے، یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس مدرسہ کے دارالافتاء سے علماء دیوبند جیسے متبعین سنت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر فتویٰ کفر جاری ہوتا۔۔۔ مدرسہ سبحانیہ کا اصلی مسلک اور حقیقی طریق کار وہی ہے جو ہم لوگوں کے زمانہ میں تھا۔۔۔ مدرسہ سبحانیہ کی تعلیم وتربیت اور فتویٰ نویسی میں طریق کار رضائی اور دیوبندی سے بالاتر ہے''۔(۲۶)

اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مولانا سجاد صاحب علماء دیوبند کی عظمت کے قائل اور ان کی اتباع سنت کے معترف تھے اور اس معاملے میں خود مولانا احمد رضا خان صاحب کا چہرہ ان کے اصل چہرہ سے مختلف تھا، حضرت مولانا عبد الکافی صاحب کی صحبت بابرکت سے جماعتی عصبیتوں اور بے اعتدالیوں کے بہت سے راز ان پر منکشف ہوگئے تھے اور اس سے نقطۂ اعتدال تک پہونچنے میں ان کو کافی مدد ملی تھی، مولانا سجاد صاحبؒ کو گوکہ اکابر دیوبند سے باضابطہ استفادہ کا موقعہ نہیں ملا؛ لیکن ان کا قلبی رجحان علمی، دینی اور فکری ہر لحاظ سے ان سے قریب تر تھا؛ اسی لیے طالب علمی کے زمانے میں وہ خود بھی دیوبند پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تھے، اس کے بعد اپنے اکلوتے صاحبزادے ''حسن سجادؒ'' کی تعلیم کے لیے بھی انہوں نے دارالعلوم دیوبند کا انتخاب فرمایا اور صاحبزادہ نے دیوبند ہی سے فراغت حاصل کی، اس بات کا ذکر دیوبند میں ''مولانا حسن سجاد صاحب'' کے رفیق درس حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے کیا ہے۔(۲۷)

احوال زمانہ اورمدارج احکام پرنظر:

ایک فقیہ کیلئے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ وہ احکام فقہی کے مدارج کو سمجھے، احوال زمانہ سے واقف ہو، وسائل اور مقاصد کا فرق اس کی نگاہ میں ہو، کون سا دور کس حکم کا متقاضی ہے، اس سے پوری طرح باخبر ہو، بعض احکام حالات کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں، اس ضابطہ کا منشا کیا ہے؟ اوراس کا غلط استعمال کہاں ہوسکتا ہے؟ ان چیزوں پر اس کی عمیق نگاہ ہو، حضرت مولانا سجاد صاحب کی فقہ ان محاسن سے پوری طرح متصف تھی۔

تبدل احوال سے تبدل احکام کی حقیقت:

بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ دینی احکام تو ہمیشہ کے لئے نازل ہوئے ہیں، پھر تبدیلی کے کیا معنیٰ؟ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے اس کی تشریح کی کہ دراصل حکم شرعی کا محل بدل جاتا ہے اور جب وہ محل باقی نہ رہا تو جو حکم تھا وہ بھی باقی نہ رہا، اس کی مثال یہ ہے کہ دھوبی کے یہاں سے ایک کپڑا آیا جس پر کوئی نجاست نہیں ہے تو اس کے پاک ہونے کا حکم لگایا جائے گا؛ لیکن اگر اس میں نجاست لگ جائے تو ناپاک قرار دیا جائے گا تو حقیقتاً حکم شرعی نہیں بدلا بلکہ وہ چیز باقی نہ رہی، جس پر حکم لگایا گیا تھا اس لئے حکم بھی باقی نہ رہا، اگر کپڑے کی نجاست صاف کردی جائے تو پھر وہی حکم طہارت لوٹ آئے گا تو ہر محل کے لیے ایک حکم مقرر ہے، محل بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ محل واحد پر کئی احکام بدلتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ اگر حالات کی تبدیلی سے محل نہ بدلے تو حکم بھی تبدیل نہ ہوگا، مثلاً کسی کا قتل ناحق حرام ہے، عام حالات میں یہی حکم ہے؛ لیکن اگر اکراہ کی صورت پیدا ہوجائے اور اپنی جان کا اندیشہ ہو، اس کے باوجود حرمت قتل کا حکم برقرار رہے گا اور اس کا قتل جائز نہ ہوگا، حالانکہ حالات بدل چکے ہیں؛ لیکن چونکہ محل حکم نہیں بدلا؛ اس لیے حکم بھی تبدیل نہیں ہوگا۔

یہ وہ گہری حقیقت جسے ہر شخص نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ بتا سکتا ہے، اس اصولی فرق تک رسائی کے لیے ملکۂ فقہی کی ضرورت ہے، خود مولانا محمد سجادؒ کے الفاظ میں:

''اس تبدل حکم کا بتانا بھی ہر شخص کا کام نہیں ہے''۔(۲۸)

مصالح شریعت پرنظر:

اسی لیے مولانا سجاد صاحب علماء اوراصحاب افتا کو تاکید فرماتے تھے کہ مصالح شریعت پر نگاہ رکھیں اوراس کے لیے امام غزالیؒ کی کتاب کے ''باب استصلاح'' کا مطالعہ کریں۔(حیات

سجاد ص:۲۴،مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ)

بلکہ مولانا اس موضوع پر باقاعدہ ''رسالہ استصلاح'' لکھنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے:

''جس میں بتایا جائے کہ مصلحت کی حقیقت کیا ہے اور اس کے کتنے معانی ہیں؟ شریعت اسلامیہ مصلحت کے کس معنیٰ کو اختیار کرتی ہے اور پھر مصلحت کے کتنے مدارج ہیں؟ اور بہ اعتبار مدارج مصالح کسی مصلحت کی رعایت کا کیا حکم ہے، اس رسالہ سے یہ مقصود ہے کہ رعایت مصلحت کے باب میں جتنی غلط فہمیاں ہیں دور ہوجائیں گی اور یہی وہ حقیقت ہے کہ جس کے عدم انکشاف کے باعث علماء اور جدید تعلیم یافتہ افراد کا ایک مرکز پر پورے اخلاص کے ساتھ اجتماع نہیں ہورہا ہے؛ بلکہ روز بروز دونوں کے درمیان تفریق کی خلیج وسیع ہورہی ہے (انا للہ وانا الیہ راجعون) اس رسالہ کو بھی تینوں زبانوں (اردو، عربی، انگریزی) میں شائع کیا جائے''۔(۲۹)

گوکہ عمر عزیز کے مصروف ترین لمحات میں مولانا اس اہم ترین اصولی کتاب کے لیے وقت نہ نکال سکے، کاش ان کے قلم سے، یا ان کی نگرانی میں ایسی کوئی کتاب تیار ہوجاتی تو بالیقین وہ فقہ اسلامی کا قابل افتخار سرمایہ ہوتی، قدر اللہ ماشاء۔

مصالح کی رعایت کے حدود:

مدارج احکام اور مصالح احکام میں توازن کو برقرار رکھنا اور افراط وتفریط سے محفوظ رہ جانا ہر فقیہ کے بس کی بات نہیں، حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کو یہ کمال حاصل تھا، مولانا کے یہاں مصلحت کا خانہ تھا؛ مگر مداہنت کی گنجائش نہیں تھی، وہ ہندوستان کے حالات میں مصلحتاً ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے؛ مگر غیر مسلموں کی رعایت میں کسی حکم اسلامی یا قومی خصوصیت کے ترک کے روادار نہ تھے۔

مذہبی رواداری کی اجازت ہے مداہنت کی نہیں:

۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ نے کل ہند اجلاس امرتسر کے موقعہ پر قربانی کے ترک پر تجویز پاس کردی، جس کے الفاظ یہ تھے:

''آل انڈیا مسلم لیگ کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اہل ہنود نے جس نیک رویہ کا اظہار کیا ہے، اس کے اعتراف اور ہندوؤں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اتحاد کو زیادہ مضبوط کرنے کی غرض سے بقرعید کے موقعہ پر جہاں تک ممکن ہوسکے گائے

کی قربانی کے بجائے دوسرے جانوروں کی قربانی کی جائے''۔(۳۰)

مولانا کو اس تجویز کا علم ہوا تو وہ اس کے مضمرات کا تصور کر کے کانپ اٹھے، آپ نے پہلی فرصت میں اخبارات میں اس تجویز کے خلاف اعلان شائع کرایا کہ:

''غیر مسلموں سے مصالحت ومواد عت کا منشا کیا ہے، احکام مذہب، شعار ملت، خصائص قومی کی حفاظت اور اپنے مخصوص اخلاق حسنہ کے ذریعہ سے ان قوموں میں تبلیغ ودعوت؛ اس لیے اگر ضرورت ہو تو دنیا کی بہتر سے بہتر اور قیمتی سے قیمتی چیز غیر مسلموں کی مصالحت پر قربان کر دی جاسکتی ہے، ان کے دلوں میں گھر کرنے کے لیے اپنے گھر کی ساری دولت لٹادی جاسکتی ہے؛ مگر احکام اسلام، شعائر ملت، حقوق وخصائص قومی میں سے چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہیں چھوڑی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ یہ دنائت فی الدین ہے اور نہ غیر مسلموں کے مخصوص مراسم کو اختیار کیا جاسکتا ہے؛ کیونکہ یہ شرک فی الاسلام اور فنائے قومیت اور تفویت مقاصد اسلام ہے''۔(۳۱)

اسی کے ساتھ مولانا نے ایک فتویٰ مرتب فرمایا اور جمعیۃ علماء بہار کے اجلاس دربھنگہ ۱۳۳۹ھ میں پیش کیا، جو متفقہ طور پر منظور کیا گیا اور تمام علماء کرام نے اس پر دستخط فرمائے، اس تاریخی فتویٰ کو بروقت رسالہ کی شکل میں ''علماء بہار کا متفقہ فتویٰ'' کے نام سے دو ہزار کی تعداد میں مولانا نے شائع فرمایا، یہ پورا فتویٰ ''حیات سجادؒ'' میں موجود ہے اور فتاویٰ امارت شرعیہ میں بھی وہیں سے نقل کیا گیا ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''ان جمیع وجوہ کی بنا پر ذبح گاؤ سے پرہیز کرنا ناجائز ہے، ہندو کے خیال سے کہ ان کا دل دکھتا ہے، ذبح گاؤ کو ترک کرنا قطعاً حرام ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں تائید علی الشرک ہوتی ہے،۔۔۔ جب تک ہندؤں کے اندر جذبہ گاؤ پرستی موجود ہے، اس وقت تک ذبح گاؤ سرزمین ہند میں ایک شعار توحید اور شعار اسلام ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ:

لئن اتبعت اهوائهم من بعدما جاءك من العلم انك اذا لمن الظالمين''. (۳۲)

نظریہ امارت مولانا کے فقہی شعور اور زمانہ شناسی کا آئینہ دار:

اسلام کے فقہی ذخیرہ میں کون سا نظریہ کن حالات پر منطبق ہوگا؟ اس کو سمجھنے کے لیے بھی بے پناہ قوت ادراک کی ضرورت ہے، مثلاً حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے جب پہلی بار نظریۂ

امارت شرعیہ پیش فرمایا تو بعض حضرات کو یہ خلجان ہوا کہ غیر مسلم حکومت میں امارت شرعیہ کا نظریہ خالص اسلامی حکومت کے نظریہ سے دستبردار ہونے کے مترادف ہے، جب کہ خلافت، جمعیۃ، مسلم لیگ اور کانگریس سب کا متحدہ نصب العین ملک کی مکمل آزادی کا حصول تھا، اس مشترکہ نصب العین کے بالمقابل برطانوی ہندوستان میں امارت کا نظریہ غیر مسلم اسٹیٹ کو جواز فراہم کرتا ہے اور مکمل آزادی کے منشور کے بجائے جزوی آزادی پر قناعت کے ہم معنیٰ ہے۔۔۔ جو حضرات دین کے اصول ولمیات سے واقف تھے، ان کو تو زیادہ دقت نہیں ہوئی؛ لیکن جن کی نظر صرف ظواہر شریعت، یا محض فقہی جزئیات وفروع پر تھی، انہوں نے مولانا کے خلاف ایک محاذ کھڑا کردیا، جب کہ حقیقت یہ تھی کہ مولانا کلی آزادی کے خلاف نہ تھے؛ بلکہ اسلامی حکومت کا حصول ان کا بھی نصب العین تھا؛ لیکن مولانا کا کہنا تھا کہ جب تک وہ نصب العین حاصل نہیں ہوجاتا، مسلمانوں کی اجتماعیت اور دینی وملی تشخصات کی حفاظت کا امارت شرعیہ سے بہتر اور قابل عمل کوئی راستہ نہیں ہے اور اسی لیے انہوں نے امارت شرعیہ کی زیر نگرانی سیاسی انتخابات میں حصہ داری کو بھی قبول فرمایا۔

مولانا اس فرق سے واقف تھے کہ اسلامی ہند میں مسلمانوں کا فریضہ کیا ہے؟ اور غیر مسلم ہندوستان میں ان کی شرعی ذمہ داری کیا ہے؟ اسی فرق کو نہ سمجھ پانے کی بنا پر مولانا کے خلاف غلط فہمیوں کا طومار کھڑا کیا گیا، اوران کے نظریہ امارت کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، جب کہ مولانا نے اپنا نظریہ اپنے رفقا کے سامنے واضح کردیا تھا، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ اول ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند جو مولانا سے بزرگانہ عقیدت رکھتے تھے اور والد کی طرح ان کا احترام کرتے تھے، سفر وحضر میں مولانا کے ساتھ رہنے اوران کے خیالات سے مستفید ہونے کا انہیں موقع ملا تھا، وہ اس معاملے میں خود مولانا کے بیانات کی روشنی میں ان کا نظریہ نقل فرماتے ہیں:

> ’’وہ فرمایا کرتے تھے کہ اسلام ایک تنظیمی مذہب ہے، اس مذہب کی روح ڈسپلن اور نظم چاہتا ہے، اگر مسلمان منتشر رہیں، اور کسی ایک شخص کی اطاعت نہ کریں اور اپنا کوئی امیر منتخب نہ کریں تو یہ زندگی غیر شرعی زندگی ہوگی۔۔۔ان کا نظریہ یہی تھا، کہ جب تک حکومت کافرہ کا مسلمانوں پر تسلط ہے اور جب تک مسلمان اس ابتلاء میں مبتلا ہیں اور جس وقت تک مسلمان سیاسی اقتدار کے مالک نہیں بنتے، اس وقت تک اپنے اقتصادی اور معاشرتی کاموں کے لیے اپنا ایک امیر منتخب کریں اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری

پر بیعت کریں؛ تاکہ اس کفرستان میں جس قدر ممکن ہوسکے مسلمان اپنی زندگی کو شرعی بناسکیں، وہ اس مسئلہ پر فقہاء حنفیہ کی تصریحات پیش کرتے تھے، اس پر انہوں نے ایک مفصل فتویٰ بھی مرتب کیا تھا اور جمعیۃ علماء نے جو تجویز امارت شرعیہ کے سلسلے میں پاس کی تھی، وہ بھی انہی کی سعی کا نتیجہ تھا''۔(۳۳)

چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے متعدد جلسوں میں اس نظریہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے، اور امارت شرعیہ بہار کو پورے ملک کیلئے ایک معیاری اور قابل تقلید نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے، مثلاً گیا (جو مولانا کا اصل علمی وفکری صدر دفتر تھا) کے اجلاس (۱۹۲۲ء) میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ (متوفیٰ ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۳۰ء) سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے خطبۂ صدارت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''ایسی حالت میں کہ مسلمان ایک غیر مسلم طاقت کے زیر حکومت ہیں اور ان کو اپنے معاملات میں مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے، ضروری ہے کہ مسلمان اپنے لئے والی اور امیر مقرر کریں، دارالقضا قائم کرکے قضاۃ اور مفتین کا تقرر کریں، جمعیۃ علماء میں یہ تجویز منظور ہوچکی ہے اور جمعیۃ العلماء کے اجلاس لاہور میں یہ طے ہوا تھا کہ ایک سب کمیٹی کا اجلاس بدایوں میں منعقد کیا جائے، جس میں امیر شریعت کی شرائط وفرائض واختیارات وغیرہ مسائل کو طے کرلیا جائے اور اس کے بعد انتخاب امیر کا مسئلہ پیش کیا جائے۔۔۔۔علماء ومشائخ اور کبراء صوبہ بہار کا مسلمانوں پر بھاری احسان ہے کہ انہوں نے اپنے صوبہ میں امارت شرعیہ قائم کرکے مسلمانوں کے لیے ایک سڑک تیار کردی ہے،۔۔۔ہم ان حضرات کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ دوسرے صوبوں کے علماء بھی جلد از جلد صوبہ بہار کی تقلید کریں گے''۔(۳۴)

اسی طرح جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس ہشتم پشاور (۶ تا ۸ر جمادی الثانیہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۲ تا ۴ر دسمبر ۱۹۲۷ء) میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ (متوفیٰ ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء) نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:

''مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ خود اتفاق، یا کثرت رائے سے امیر شریعت منتخب کریں، ایسے ہی امراء صوبہ وار ہونے چاہئیں اور امراء کے اتفاق رائے سے تمام ہندوستان کے لیے ایک امیر اعظم ہوگا، اگرچہ کہ حکومت برطانیہ کے قیام اور تسلط کی وجہ

سے ان صوبہ واراور امیراعظم کی کوئی حیثیت نہ ہوگی، مگر مذہبی ضروریات ان کے فیصلوں اوران کے احکام سے صحیح طور پر واقع اور نافذ ہوسکیں گے اور مسلمانوں کا ایک بڑا مذہبی فرض نصب امارت ادا ہو جائے گا، جس میں وہ آج کل مبتلا ہیں"۔(۳۵)

مولانا کے مشن کے رازداں مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ جو مولانا کے کاروان امارت میں بھی شریک تھے اور سیاسی پارٹی میں بھی شامل رہے، مولانا کی فکر اور موقف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا مسلمانوں اور ہندوستان کے تمام مسائل پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے غور فرمایا کرتے تھے، مولانا کا ایمان تھا کہ اسلامی نظام حکومت وزندگی ہی بنی نوع انسان کے دینی اور دنیاوی فلاح کا ضامن ہوسکتا ہے، چنانچہ وہ ہر مسئلہ کو اسی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، وہ ہندوستان کی آزادی کے اس لئے خواہاں تھے کہ اسلام غلامی کا سب سے بڑا دشمن ہے، وہ سرمایہ پرستی کے اس لیے مخالف اور کمزوروں اور غریبوں کے حامی تھے کہ اسلام کے مقرر کردہ معاشی نظام کے ذریعہ غربت کو خوش حالی اور کمزوری کو قوت سے بدلا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں مولانا کا یہ نظریہ ہی ان کی بڑی خصوصیت تھی، جس میں وہ شاید منفرد تھے۔۔۔مولاناؒ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا اصل مقصد تو ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام ہے؛ اس لیے کہ موجودہ تمام طریق حکومت میں اسلامی حکومت ہی کا نظام مکمل ہے؛ لیکن چونکہ بحالات موجودہ براہ راست اسلامی حکومت کے قیام کی راہ میں مشکلات ہیں؛ اس لیے سردست کم ازکم ایک ایسی مشترکہ حکومت کے قیام کی کوشش کی جائے، جہاں مسلمانوں کے لیے مخصوص نظام ہو"۔(۳۶)

مولانا کی نگاہ صرف آج پر نہیں زمانہ مابعد پر بھی تھی، اجلاس مرادآباد کے خطبہ صدارت میں مولانا سجاد صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

"مسلمانوں کے لیے جس چیز کی آج ضرورت ہے اور حصول سوراج کے بعد بھی ضرورت ہوگی؛ بلکہ ہندوستان کی آزادی کی منزل کو قریب کرنے کے لیے، جو چیز سب سے زائد مفید ہوگی، یہی نظام اسلام؛ یعنی امارت شرعیہ ہے"۔(خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند مرادآباد ص۱۳۵)

اس لیے یہ خیال قطعی طور پر غلط اور مولانا پر سراسر الزام تھا کہ وہ خالص اسلامی حکومت کے

نظریہ سے دستبردار اور کافرانہ قیادت پر راضی ہو گئے تھے، ہندوستان کے غیر جانبدار طبقہ نے کبھی اس قسم کی بے سرو پا باتوں کو قبول نہیں کیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''مولانا جس انقلاب کے داعی تھے، اس کا پروگرام بالکل شرعی اور مذہبی تھا، ان کو پورا اعتماد تھا کہ اگر مسلمانوں کی تنظیم جمعیۃ علماء کی قیادت میں ہو جائے تو مسلمان ہندوستان کے اندر ایک ایسا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ہندوستانی قومیت میں شامل ہونے کے باوجود ان کی حفاظت کر سکے گا، وہ اس کو مسلمانوں کے لئے آئیڈیل نہیں سمجھتے تھے؛ مگر اس سے زیادہ کے لیے حالات سازگار نہیں پاتے تھے، وہ سیاسی نظریات میں عملی و مادی پہلو (Material Form) پر نظر رکھنے کے زیادہ عادی تھے اور نری تصوریت (Abstract Ideology) کے قسم کی کوئی چیز ان کو بہت کم اپیل کرتی تھی''۔ (۳۷)

مولانا کے کردار کی شفافیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے ''مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی'' کے نام سے جو سیاسی جماعت بنائی تھی، اس کے بنیادی مقاصد دو (۲) تھے:

☆ ایک ملک کی مکمل آزادی کی حمایت کرنا۔

☆ دوسرے دینی امور میں امارت شرعیہ کی اطاعت کرنا۔

انہوں نے بیرسٹر عبدالعزیز صاحب سے صرف اس لیے مصالحت نہیں کی کہ وہ ملک کی مکمل آزادی کے حامی نہیں تھے، حالانکہ امارت شرعیہ کی دینی قیادت قبول کرنے کے لیے وہ تیار تھے۔

خود آپ کے مخالفین اور سخت جارحین نے بھی آپ کے اس پاکیزہ کردار کی شہادت دی ہے، آپ کے ناقدین میں جناب راغب احسن صاحب جنرل سکریٹری مسلم لیگ کلکتہ کو مولاناؒ پر ان کی تنقیدات کی بنا پر خصوصی شہرت حاصل ہوئی، وہ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا کا اصلی عقیدہ تھا کہ اس ملک کی نجات نہ تو پراچین بھارت کے دھرم راشٹر میں ہے اور نہ نوین بھارت کی گاندھیت اور رام راجیہ میں ہے اور نہ افرنگی سیاست کی پارلیامنٹری جمہوریت یا اشتراکیت، نازیت و فسطائیت میں ہے، بلکہ اس کی حقیقی حریت صرف سلطنت اسلامی کی تعمیر اور نظام تمدن اسلامی کی تاسیس میں ہے''۔ (۳۸)

جہاں تک مسئلہ امارت شرعیہ کی فقہی حیثیت کا تعلق ہے تو خود حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے نام اپنے ایک تفصیلی خط میں اس پر روشنی ڈالی ہے، جو ''امارت شرعیہ ۔ شبہات و جوابات'' کے نام سے مستقل کتابچہ کی صورت میں شائع ہو چکا ہے، جس کا خلاصہ مولانا کے افکار و نظریات والے باب میں پیش کیا جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

مسائل کی روح تک رسائی:

مولانا کا ذہن ہر مسئلہ کی شرعی بنیاد تک جس سرعت اور صحت کے ساتھ منتقل ہوتا تھا کہ گویا وہ پہلے ہی اس مسئلہ کو سوچ کر اور حل کر کے بیٹھے ہوں، یہ آپ کا وہ امتیازی وصف تھا، جس میں بہت کم لوگ آپ کی ہم سری کر سکتے تھے، ممتاز محدث ومصنف حضرت مولانا منظور نعمانیؒ صاحب نے لکھنؤ میں مدح صحابہ ایجی ٹیشن کے موقعہ کا خود اپنا آنکھوں دیکھا ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے مولانا سجاد کی دقت نظر اور فقہی انفرادیت صاف طور پر نمایاں ہوتی ہے، مولانا نعمانی صاحبؒ لکھتے ہیں:

”لکھنؤ میں مدح صحابہ ایجی ٹیشن تھا حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ اور مولانا مرحوم اس کی قیادت فرمارہے تھے، جمعہ کا دن تھا، جس دن کہ قانون امتناع مدح صحابہ کی خلاف ورزی کر کے اجتماعی سول نافرمانی کی جاتی تھی، ٹیلے کی مسجد اس جنگ کا محاذ تھا، نماز جمعہ کے بعد وہیں پر پہلے جلسہ ہوتا تھا، اس کے بعد سول نافرمانی کی جاتی تھی، مردوں کے علاوہ عورتوں کا بھی بڑا مجمع ہوجاتا تھا اور ان کے لئے قناتوں کے ذریعہ پردہ کا انتظام کیا جاتا تھا، جب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پردہ نشیں عورتوں کے مجمع میں سے ایک خط ایک بچہ کے ذریعہ صدر جلسہ کے نام پہونچا، اس میں ایک عورت نے اپنے دینی ولولہ کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ ”اس ایجی ٹیشن میں عملی حصہ لینے کا موقعہ مجھ کو اور میری اور بہنوں کو بھی دیا جائے“ اس کے لیے اس خط میں صحابیات کی شرکت غزوات کا حوالہ بھی دیا گیا تھا، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ نے جو اس دن جلسہ کے صدر تھے، راقم الحروف سے فرمایا کہ لاؤڈ اسپیکر کے پاس جا کر تم اس خط کا میری طرف سے زبانی جواب دے دو اور ان بہنوں کو بتلادو کہ ابھی تو ہم لوگ باقی ہیں، جب تک ہم میں سے ایک بھی موجود ہے یہ گوارا نہیں ہوسکتا کہ آپ اس راہ میں کوئی تکلیف اٹھائیں، میں چلنے لگا تو حضرت امیر صاحب مرحوم نے فرمایا کہ اس کے علاوہ مستورات کو یہ بھی سمجھا دینا کہ ”حرب سلمی“ (یعنی آئینی جنگ، یا سول نافرمانی) اور تلوار کی جنگ کے احکام شریعت میں جداگانہ ہیں، تلوار کی لڑائی میں تو خاص حالات میں عورتوں کے لیے بھی شرکت کا موقعہ ہوجاتا ہے؛ مگر یہ آئینی جنگ جس میں اپنے آپ کو گرفتار ہی کرایا جاتا ہے اس میں شرکت کا عورتوں کے لیے کوئی موقع نہیں ہوتا، بلکہ شرعاً ان کے لئے یہ ناجائز ہے کہ وہ اپنے کو غیر آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار کرا کے قید میں جائیں، لہٰذا ان بہنوں کا جذبۂ قربانی تو قابل قدر ہے؛ لیکن سول نافرمانی میں عملی شرکت کے خیال کو وہ قطعی طور پر دل سے نکال

دیں کہ ان کے حق میں یہ معصیت اور خدا کی نافرمانی ہے''۔(۳۹)

یہ تھی حضرت مولانا سجادؒ کی نظر کہ فوراً مسئلہ کی شرعی بنیاد تک پہونچ گئے، جہاں عام حالات میں علماء کا ذہن بھی نہیں جا سکتا تھا، نیز اس واقعہ میں مدارج احکام پر مولانا کی جو نگاہ تھی، اس کی طرف بھی رہنمائی ملتی ہے۔

مجالس میں کثرت رائے پرفیصلہ کی بنیاد:

اسی کی ایک مثال وہ واقعہ بھی ہے جسے مولانا عبدالصمد رحمانی صاحبؒ نے نقل فرمایا ہے کہ:

''جمعیۃ علماء ہند اور اس طرح کی دوسری کمیٹیوں کی مجلس منتظمہ اور مجلس عاملہ پر ایک مرتبہ گفتگو آئی اور اس سلسلہ میں یہ مسئلہ بھی سامنے آیا کہ موجودہ طریقہ پر انتظامی امور میں کثرت رائے سے جو فیصلہ کیا جاتا ہے، یا صدر کی رائے کو ترجیحی حیثیت دی جاتی ہے، اس کی کوئی نظیر عہد رسالت یا خلافت راشدہ میں ہے؟ تو مولانا نے فوراً جواب دیا کہ ہاں اس کی نظیر وہ کمیٹی ہے جس کو حضرت عمرؓ نے انتخاب خلیفہ سوئم کے لئے مقرر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اگر چھ(٦) آدمیوں کی کمیٹی میں سے تین تین دونوں طرف ہو جائیں تو عبدالرحمٰن جس طرف ہوں ان کو خلیفہ مقرر کرو، ورنہ اکثریت کی رائے پر عمل کرو''۔(۴۰)

یہ واقعہ متعدد کتب حدیث و تاریخ میں موجود ہے:

☆ **عن أبي جعفر قال: قال عمر بن الخطاب لأصحاب الشورى: تشاوروا فى أمركم؛ فإن كان اثنان واثنان فارجعوا فى الشورى وإن كان أربعة وإثنان فخذوا صنف الأكثر.، ابن سعد''.**

☆ **عن أسلم عن عمر قال: وإن اجتمع رأي ثلاثة وثلاثة فاتبعوا صنف عبد الرحمن بن عوف واسمعوا وأطيعوا.، ابن سعد''.** (۴۱)

اس سے حضرت مولانا سجادؒ کی وسعت مطالعہ اور مآخذ تک تیز رسائی کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وقف علی الاولاد کا مسئلہ:

کئی بار ایسا ہوا کہ بڑے بڑے علماء کا ذہن مسئلہ کی اصل بنیاد تک پہونچنے سے عاجز رہا اور اس کی وجہ سے حکم شرعی کی تطبیق میں ان سے غلطیاں ہوئیں؛ لیکن مولانا سجاد صاحب عموماً ایسی غلطیوں سے محفوظ رہے، وہ راست مسئلہ کی اسی بنیاد تک پہونچتے تھے جس سے حکم شرعی منقح ہو جاتا اور دوسرے حضرات سے کہاں چوک ہو رہی ہے سامنے آجاتی، اس کی ایک مثال

وقف علی الاولاد کا مسئلہ ہے، جس کے چشم دید راوی رئیس القلم علامہ مناظر احسن گیلانیؒ ہیں، تحریر فرماتے ہیں کہ:

''دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مرکز سے مولانا شبلی مرحوم نے وقف علی الاولاد کا مسئلہ اٹھایا، ٹونک کے علماء اور محکمہ شریعت وغیرہ سے دستخط حاصل کرنے کا کام میرے سپرد ہوا، بڑے جوش وخروش سے اس کام کو انجام دیا، تعطیل میں گھر (گیلانی بہار) آیا، استھانواں جو میری نانیہال تھی وہاں بھی گیا، وہاں الفلاح نامی انجمن تھی، جس کے سیکریٹری میرے مرحوم ماموں مولانا فضل الرحمٰن صاحب (علیگ) تھے، جو کچھ دن علی گڑھ کالج میں تاریخ کے پروفیسر بھی رہے تھے، انجمن الفلاح کا سالانہ جلسہ تھا مجمع اچھا خاصا تھا، منجملہ اور مسائل کے وقف علی الاولاد کی تجویز پاس ہونے کے لئے پیش ہوئی، ماموں مرحوم نے مسلمانوں کی جائیداد کی حفاظت کی اس قانون کو واحد شکل قرار دے کر ایک مبسوط تقریر کی، تقریر میں ان کو کمال تھا، پھول برستے ہوئے کم از کم ان کی تقریر کے سوا اب تک کسی دوسرے مقرر کی زبان سے ان آنکھوں نے نہیں دیکھا ہے، ـــ بہرحال تقریر جب ختم ہو چکی اور میں سمجھے تھا کہ بحث بھی ختم ہو چکی، اور مسئلہ بلا اختلاف پاس ہو جائے گا کہ اچانک ایک دراز قد، چھریرے بدن، سانولے رنگ کے آدمی کو دیکھا کہ تقریر کی میز کے سامنے کھڑا ہے، اور ہکلا ہکلا کر چند باتیں کہہ رہا ہے، پہلے تو توجہ نہ ہوئی، لیکن جب بحث کے نکات سمجھ میں آنے لگے تو ذرا سنبھلا کہ یہ تو کوئی غیر معمولی گفتگو ہے، غور سے سننے لگا، (فرما رہے تھے) کہ:

''شرعی وارثوں کے حرمان سے مسلمانوں کی جائیداد کی حفاظت کا کام لینا شریعت کے حکم سے انحراف ہے، اس قانون (وقف علی الاولاد) کو پاس کرنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ خدا نے جن لوگوں کو وارث ٹھہرایا ہے مورث چاہیں گے تو ان کو ان کے شرعی حق سے محروم کر دیں گے، یہ خدائی قانون میں دست اندازی ہے؛ اس لیے اس کو پاس نہ ہونا چاہیے''۔(۴۲)

بالآخر یہ قانون ترمیم کے مراحل سے گذر کر پاس ہوا۔(۴۳)

یہ حضرت مولانا سجاد صاحبؒ تھے، مولانا گیلانیؒ نے اس وقت تک مولانا سجاد صاحبؒ کا صرف نام ہی سنا تھا، کبھی زیارت کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ــ یہ پہلا موقعہ تھا جب وہ مولانا محمد سجاد صاحبؒ کی تقریر سن کر متاثر ہوئے اور وہ بھی ایسی تجویز کے خلاف جس کو ندوۃ العلماء سے لے کر ملک کے مختلف حصوں کے ممتاز علماء نے پاس کر دیا تھا اور خود ان کا بھی خیال

یہی تھا کہ گویا یہ تجویز باتفاق رائے منظور ہوچکی؛ لیکن مولانا سجادؒ اس مسئلہ میں چھپی اس کمزوری تک پہونچ گئے جہاں کسی عالم وفقیہ کا دماغ اب تک نہیں پہونچ سکا تھا، یہ تھی مولانا سجاد کی علمی عبقریت، فقہ النفس اور معاصر علماء میں ان کا امتیاز، جس کے ناقل خود ایک بڑے علامۂ زمانہ ہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

غیر مسلم ملکوں میں نظام قضا یا شرعی پنچایت؟

اس کا ایک اور نمونہ غیر اسلامی ہندوستان میں نظام قضاء کا مسئلہ ہے، ہندوستان سے اسلامی حکومت کے خاتمے کے بعد ۱۸۶۴ء میں انگریزوں نے اسلامی قاضیوں اور مفتیوں کے تقرر پر پابندی لگادی جو صدیوں سے اس ملک میں چلا آرہا تھا، (قانونی مسودے ص ۳۵ تالیف حضرت علامہ سید ابوالمحاسن محمد سجادؒ، ترتیب مولانا ضمان اللہ ندیمؒ شائع کردہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، ۱۹۹۹ھ) اور جن پر مسلمانوں کے ملی اور سیاسی مسائل ہی نہیں؛ بلکہ ان کے بہت سے عائلی اور مذہبی مسائل کا بھی مدار تھا، مثلاً فسخ وتفریق کی کئی صورتوں میں قضائے قاضی کی ضرورت پڑتی ہے، یہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے انتہائی مشکل وقت تھا، مسلمانوں کی دینی زندگی کا تحفظ خطرہ میں پڑ گیا تھا، عورتوں کے ارتداد تک کے واقعات پیش آنے لگے تھے، پورے ملک کے علماء اور ملی رہنما اس صورت حال سے بے حد پریشان اور فکرمند تھے اور اپنے اپنے حدود میں ان مشکلات کے حل کی تدابیر پر غور کر رہے تھے، بلاشبہ اس دور کے علماء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے علماء ہند وحجاز کے مشورہ سے "الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ" جیسی وقیع اور دستاویزی کتاب لکھی، حضرت تھانویؒ کے اس انقلابی قدم کی ہر طرف سے تحسین کی گئی، حضرت تھانویؒ نے اس کتاب میں ملک کے موجودہ حالات میں نظام قضاء کے متبادل کے طور پر مسلک مالکی سے ''جماعۃ المسلمین العدول'' (شرعی پنچایت) کی تجویز پیش فرمائی تھی، کتاب تیار ہونے کے بعد حضرت تھانویؒ نے اپنی یہ کتاب استصواب رائے کے لیے ملک کے تمام ممتاز علماء ومفتیان کرام کو ارسال فرمائی، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کو بھی اس کا ایک نسخہ موصول ہوا، مولانا سجاد صاحبؒ نے کتاب کے بنیادی مندرجات سے اتفاق کرتے ہوئے حضرت تھانویؒ کے ''جماعۃ المسلمین'' والے نظریہ سے اختلاف کیا، مولانا محمد سجادؒ کا خط الحیلۃ الناجزۃ میں شائع شدہ ہے، مولاناؒ کا مکتوب گو کہ بہت مختصر ہے؛ لیکن یہ ان کے فقہی شعور اور بالغ نظری کا عکاس ہے، انہوں نے چند جملوں میں جن

بنیادی نکات کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ بے حد اہم ہیں، خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ماضی، حال اور مستقبل پر ان کی گہری نگاہ تھی، اور وہ مسئلہ کی روح تک پہونچ گئے تھے، مکتوب کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''اس وقت جزو دوم کا مقدمہ سرسری طور پر دیکھا، دارالکفر میں قضا بین المسلمین کی ضرورت کو پوری کرنے کے لئے فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ نے جو صورت تجویز فرمائی ہیں وہ نہ معلوم کیوں اس رسالہ میں مذکور نہ ہوئیں، یعنی:

یصیر القاضی قاضیاً بتراضی المسلمین اوران یتفقوا علیٰ واحدیجعلونه والیاً فیولی قاضیاً، الخ.

اور جب یہ صورت موجود ہے تو پنچایت کی صورت اختیار کرنا بلاضرورت مسئلہ غیر کا اختیار کرنا ہوگا۔

☆ اس مسئلہ کی ضرورت واہمیت کے علاوہ پنچایت کی عملی دقتیں بہت زیادہ ہیں اور ان شرائط کی نگہداشت بھی بہت مشکل ہوگی''۔ (۴۴)

حضرت مولانا سجاد صاحبؒ نے جن نکات کی نشاندہی فرمائی ہے، وہ ان کے گہرے تفقہ اور بلند علمی مقام کی علامت ہے، اس زمانہ میں مولانا کے نظریہ کو گو خاطرخواہ التفات نہ حاصل ہوسکا ہو (حالانکہ یہ خروج عن المذہب سے محفوظ شکل تھی) لیکن زمانۂ مابعد میں جس طرح ان کے نظریۂ امارت وقضا کو قبولیت عامہ حاصل ہوئی اور علماء محققین کی بڑی تعداد اس نظام کو امت میں جاری کرنے کے لئے سرگرم عمل ہوئی، یہاں تک کہ فقہ مالکی کے شرعی پنچایت کا نظریہ نظام قضا کے بالمقابل اس ملک میں اجنبی سا بن کر رہ گیا، اس سے مولانا سجادؒ کی بے نظیر فقہی بصیرت اور زمانہ آگہی کا اندازہ ہوتا ہے، ان کے دیگر افکار ونظریات کی طرح نظریہ امارت شرعیہ اور نظریہ قضا کو جو غیر معمولی قبولیت حاصل ہوئی اور جس کامیابی کے ساتھ ان کے تجربات کئے گئے، غیر مسلم ہندوستان میں اس کی دوسری نظیر نہیں ملتی، خود حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ ارشاد اور اس ملک میں علم وحکمت کے بے تاج بادشاہ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند وصدر اول آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ارشاد فرمایا کہ:

''حضرت تھانویؒ نے شرعی کمیٹی کے نام سے فقہ مالکی کی رو سے جو حل پیش فرمایا ہے، وہ اپنے زمانے کے اعتبار سے اہم اقدام ہے؛ لیکن اس میں بڑی دشواری یہ ہے کہ فقہ مالکی کی رو سے تمام ارکان کمیٹی کا اتفاق فیصلہ میں ضروری ہے، اگر یہ اتفاق حاصل نہ ہوسکے تو

دعویٰ خارج کر دیا جائے گا''۔(۴۵)

☆ علاوہ ازیں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ خود فقہ مالکی میں جماعت المسلمین کے اختیارات بہت محدود ہیں؛ بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں یہ محض عارضی حل ہے، ان کے نزدیک بھی حقیقی حل نظام قضا ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی مقام پر قاضی موجود ہو تو جماعۃ المسلمین کو حق تفریق حاصل نہیں ہوتا، فقہ مالکی میں اس کی تصریحات موجود ہیں:

''والنقل أنها إن أرادت الرفع ووجدت الثلاثة وجب للقاضي، فإن رفعت لغيره حرم عليها وصح، وإن رفعت لجماعة المسلمين مع وجود القاضي بطل، فإن لم يوجد قاض فتخير فيهما''.(۴۶)

مولانا محمد سجاد صاحب عارضی حل کے بجائے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے خود کفیل اور پائیدار نظام کے خواہاں تھے اور اس کے لیے امارت وقضا کے علاوہ کوئی صورت موجود نہ تھی، ان کی نگاہ وقتی اور عارضی انتظامات سے بہت آگے تھی۔

ترک موالات کے مسئلہ پر جامع فتویٰ:

جب ملک میں انگریزی اقتدار کے خلاف جنگی کوششوں کے حصہ کے طور پر مختلف سیاسی اور ملی تنظیموں کی جانب سے حکومت کے ساتھ عدم تعاون اور ان کے اداروں اور اشیاء کا بائیکاٹ کرنے کی تحریک چلی، جن کے پس پشت بھی خود علماء ہی کی جماعت تھی تو ملک کے مختلف اداروں اور علمی شخصیات سے اس موضوع پر سوالات کئے گئے اور تقریباً تمام ہی قابل ذکر علماء -علماء دیوبند، علماء دہلی، علماء فرنگی محل، علماء سہارن پور، علماء بدایوں، علماء کان پور، علماء بہار اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ تک سب- نے حکومت سے عدم تعاون اور ترک موالات کے فتاویٰ جاری کئے، اس موقعہ پر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ سے بھی استفسار کیا گیا، آپ اس وقت جمعیۃ علماء بہار کے ناظم تھے، آپ نے تفصیلی فتویٰ جاری فرمایا، بلا شبہ یہ تمام فتاویٰ اس موضوع پر ایک قیمتی علمی ذخیرہ اور دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں، بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ کے فتاویٰ میں جو گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے اور مسئلہ کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ انتہائی قابل قدر اور ان بزرگوں کی عظمت شان کے مطابق ہے؛ لیکن ان تمام فتاویٰ کے درمیان حضرت مولانا سجاد کے فتویٰ کا امتیاز یہ ہے کہ:

☆ انہوں نے اس فتویٰ کا سر رشتہ استاذ الکل اور مسند الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث

دہلویؒ سے جوڑ دیا ہے اور اپنے فتویٰ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے تفصیلی فتویٰ کے فارسی متن کے اقتباسات نقل فرمائے ہیں، ہندوستان پر انگریزی تسلط کے خلاف سب سے پہلی معتبر آواز حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف سے اٹھی تھی اور ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۳ء میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ جاری کیا تھا، اس کے بعد جنگ آزادی کی جتنی تحریکیں اٹھیں، ان سب کے پیچھے شاہ صاحبؒ کے اسی فتویٰ کی بازگشت کام کر رہی تھی، مولانا سجاد صاحب نے اس فتویٰ کا رشتہ شاہ صاحبؒ سے قائم کرکے ایک طرف فتویٰ کے اندر استناد اور قبولیت کی شان پیدا کی، دوسری طرف اس کو تاریخی تسلسل کا حصہ بتا کر تحریکی رنگ عطا کیا، اس سے فتویٰ میں جو قوت وزندگی پیدا ہوتی ہے، وہ اصحاب ادراک سے مخفی نہیں۔

☆ اس فتویٰ کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر ہندوستان کے تمام ہی مکتب فکر کے معتبر علماء اور مفتیان کے دستخط موجود ہیں، اس طرح اس میں اجتماعی رنگ پیدا ہوگیا اور یہ فتویٰ پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کی مشترکہ آواز اور انگریزی سامراج کے خلاف متحدہ طاقت میں تبدیل ہوگیا ہے۔

☆ اس کے علاوہ اس میں مسئلہ ترک موالات کے ایک ایک جزو پر قرآن وحدیث کے نصوص اور فقہی عبارات کی روشنی میں جس بصیرت اور حسن ترتیب کے ساتھ کلام کیا گیا ہے اور ہر ہر جزو پر دلائل کا جو اہتمام کیا گیا ہے، اس سے ان کا تبحر علمی اور کمال تفقہ صاف متبادر ہوتا ہے، بطور نمونہ موالات کے تشریحی حصہ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں اور تفہیم مسئلہ کا اسلوب کتنا واضح اور بلیغ ہے، اس پر غور فرمائیں:

''موالات کے دو معنی ہیں: ایک معنی محبت ومودت اور پھر محبت کی دو جہتیں ہیں، ایک دینی و مذہبی، دوسری دنیاوی اور محبت دنیاوی کی بھی دو صورتیں ہیں، اختیاری و اضطراری، الغرض کافر کے ساتھ محبت کی تین صورتیں ہیں: نمبر ایک: دینی محبت من جہۃ الدین؛ یعنی کسی کافر کی دوستی اس طرح پر ہو کہ اس کے دین و مذہب کو پسند کیا جائے تو یہ عین کفر ہے، ☆ نمبر۲: -محبت من جہۃ الدنیا ہو اور اختیاراً ہو؛ یعنی کسی کافر کے ساتھ دلی محبت ہو؛ مگر نہ اس جہت سے کہ اس کے دین کو اچھا سمجھتا ہو؛ بلکہ کسی دنیاوی وجہ سے محبت ہو؛ مگر یہ دنیاوی اختیار کی ہوئی محبت؛ یعنی اپنی خواہش واعتبار سے کسی کافر سے کوئی دنیاوی مقصد اور غرض کے حصول کے لیے محبت کرتا ہو اور فطری اسباب اس محبت کے پیدا ہونے کے لئے موجود نہ ہوں تو یہ محبت بھی حرام ہے؛ مگر کفر نہیں۔ ☆ نمبر۳: -محبت من جہۃ الدنیا

مگر اضطراراً ہو اور اس محبت کا سبب غیر اختیاری ہو، جیسے کسی مسلمان کا باپ، یا بھائی کافر ہو اور بسبب رشتہ داری اور قرابت کے مسلمان کے دل میں کافر باپ بھائی کی محبت ہو تو یہ محبت جائز ہے بشرطیکہ اس دلی محبت کا اثر مسلمان کے ایمان پر نہ پڑے۔ محبت کی پہلی صورت یعنی من جہۃ الدین اور دوسری صورت یعنی من جہۃ الدنیا اختیاراً کا جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ ہر کافر کے ساتھ یکساں اور برابر ہے، عام ازیں کہ کافر محارب ہو، یا غیر محارب اور یہ حکم دوامی اور بہر حال ہے؛ لیکن محبت کی تیسری قسم؛ یعنی محبت من جہۃ الدنیا اضطراراً اس میں محارب اور غیر محارب میں فرق ہے وہ یہ کہ غیر محارب کے ساتھ تو یہ محبت جائز ہے؛ لیکن محارب کے ساتھ یہ محبت بھی حرام ہے، بقولہ تعالیٰ (مجادلہ: ۲۸)۔۔۔۔ اور موالات کے دوسرے معنی نصرت اور مدد کے ہیں، جس کا تعلق افعال و جوارح سے ہے، دل سے اس کو کوئی سروکار نہیں، اس معنی کے اعتبار سے کافروں کے ساتھ موالات کرنے کے متعلق شرعی احکام مختلف احوال اور مختلف اسباب اور مختلف مقتضیات کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں''۔ (۴۷)

حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کا یہ فتویٰ ''متفقہ فتویٰ علماء ہند'' کے نام سے ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوا، اب یہ فتویٰ ''فتاویٰ امارت شرعیہ'' ج: ۱/ ص: ۲۷۲ تا ۲۸۳ میں شامل ہے، ترک موالات کے مسئلہ پر باقی دیگر اکابر علماء اور مفتیان عظام کے فتاویٰ بھی فتاویٰ امارت شرعیہ میں شائع کردیئے گئے ہیں۔ (۴۸)

تعلیق طلاق کے مسئلہ پر مولانا محمد سجادؒ کا محاکمہ:

۱۹۲۴ء میں تعلیق طلاق کی ایک صورت موضوع بحث بن گئی اور ہندوستان کے مشاہیر علماء و مفتیان کرام اس معرکہ میں شامل ہوگئے، علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ تھی کہ اس صورت میں شرط پوری ہوجانے کی وجہ سے طلاق واقع ہوگئی، اس جماعت میں مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ مفتی مدرسہ امینیہ دہلی بھی شامل تھے، اس کے بالمقابل زیادہ تر علماء کی رائے یہ تھی کہ جس شرط پر طلاق معلق تھی، اس کے دو جزو ہیں، جب تک دونوں جزو پائے نہیں جائیں گے شرط پوری نہیں ہوگی اور زیر بحث واقعہ میں صرف ایک جزو پایا گیا ہے دوسرا جزو مفقود ہے؛ اس لیے طلاق واقع نہیں ہوئی، اس رائے کے حاملین میں بھی بڑی بڑی شخصیتوں کے نام شامل ہیں، مثلاً: مولانا ابوالعلیٰ محمد امجد علی صدر مدرس دارالعلوم معینیہ اجمیر شریف، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ بانی جماعت تبلیغ، مولانا محمد شفیع صاحب مدرسہ عبدالرب دہلی، مولانا احمد علی صاحب صدر مدرس مدرسہ فتحپوری و علماء مدرسہ فتحپوری، مولانا مفتی مظہر اللہ صاحب امام مسجد فتحپوری دہلی،

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ وعلماء کلکتہ، مولانا محمد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ رمضانیہ کلکتہ، صاحب اصح السیر مولانا عبدالرؤف داناپوری وغیرہ۔

حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے پاس جب یہ سوال اور اس کے مختلف جوابات موصول ہوئے تو آپ نے صاحب واقعہ کو بلاکر اس سے زبانی طور پر بھی بیانات لئے، اور سوال کے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کی، پھر تمام جوابات کو سامنے رکھ کر ایک تفصیلی محاکمہ تحریر فرمایا، آپ نے مسئلہ کا انتہائی متوازن تجزیہ کرنے کے بعد اس کے ایک ایک جزو پر فقہی لحاظ سے روشنی ڈالی، یہ محاکمہ آپ کی فقہی بالغ نظری کا نقطۂ عروج ہے، آپ نے جلیل القدر علماء کی آراء کے درمیان جس توازن اور علمی شعور کے ساتھ فیصلہ کن گفتگو کی ہے، وہ آپ کی علمی تحریرات میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، بطور نمونہ آپ کے جواب کی آخری چند سطریں ملاحظہ فرمائیں:

''پس اس امر کو پیش نظر رکھ کر صورت مسئولہ میں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ یہاں بھی تعلیق میں نفس بہتر طرز عمل وحق معاشرت شرط نہیں ہے؛ بلکہ ایسا طرز عمل کہ جس سے بیوی کو خوش رکھنے اور تعلقات خوش گوار رہنے کا اطمینان ہوجائے اور بیوی کا اطمینان ایک قلبی فعل ہے؛ اس لیے اس امر میں اس کے قول کا اعتبار ہونا چاہیے، بشرطیکہ اس کے قول کے جھوٹ ہونے کا یقین نہ ہو، لہٰذا اگر واقعات وقرائن سے اس کا جھوٹ ثابت ہوجائے تو اس صورت میں طلاق واقع نہ ہوگی۔ الغرض محض عبدالمجید کی بیوی کے بیان پر وجود شرط طلاق کا یقین کرکے حکم طلاق نہیں دیا جاسکتا ہے؛ بلکہ تحقیق واقعات وحالات کے بعد۔ فقط واللہ اعلم بالصواب وعندہ ام الکتاب''۔(۴۹)

تفصیلی فتویٰ اور دیگر علماء امت کے فتاویٰ ''فتاویٰ امارت شرعیہ'' میں موجود ہیں۔(۵۰)

مسجد کی منتقلی کا مسئلہ:

ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسجد کی منتقلی کے مسئلے پر بھی مولانا محمد سجاد صاحبؒ کا فتویٰ بے حد اہم ہے، انہوں نے دوٹوک الفاظ میں مسجد کی جزوی، یا کلی ہر طرح کی منتقلی کو شرعی طور پر ناممکن قرار دیا ہے؛ اس لیے کہ:

''جس زمین پر مسجد بنی وہ زمین سے لے کر آسمان تک اور زمین کے نیچے تحت الثریٰ تک قیامت تک کے لیے مسجد ہے، مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس ویران مسجد کو آباد کریں اور جس شخص نے قبضہ کرلیا ہے، اس سے مسجد کو واپس لیں، پہلے اہل محلّہ پر واجب ہے، اگر ان سے انجام نہ پائے تو جو لوگ ان سے قریب ہوں، وہ اس میں حصہ

پس، اسی ترتیب سے تمام اہل شہر پھر پورے ضلع الٰہ آباد کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان مسجدوں کو واپس لے کر آباد کریں، ورنہ سخت گنہ گار رہوں گے"۔(۵۱)

دیہات میں جمعہ کا مسئلہ:

اسلامی ہند کے سقوط کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جمعہ کے جواز کا مسئلہ بہت نازک بن گیا تھا، اس لیے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت حنفی ہے اور حنفیہ کے نزدیک جواز جمعہ کے لیے مصر بھی شرط ہے اور مسلمان حاکم کی موجودگی بھی شرط ہے، حاکم جمعہ میں حاضر ہو، یا اس کی اجازت سے کوئی اس کا نائب جمعہ قائم کرے، ---۔ ہندوستان پر غیر اسلامی تسلط کے بعد کسی مسلم حاکم کا تصور بھی باقی نہ رہا، حنفیہ کے نزدیک مصر یا قریہ کبیرہ کی شرط بھی دراصل حاکم کی شرط کی تقویت کے لیے ہے؛ اس لئے کہ عموماً سرکاری حکام بڑے مقامات پر ہی ہوتے ہیں،(۵۲) اس طرح دیہات تو دیہات شہر میں بھی جمعہ کا جواز مشکل ہو گیا، یہ اس ملک میں بالکل نئی صورت حال تھی، صدیوں سے مسلمان شہر شہر اور قریہ قریہ جمعہ پڑھتے آئے تھے، وہ کسی بھی حال میں جمعہ سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے، اس دور کے دیگر علماء وفقہاء کی طرح مولانا سجاد بھی اس مسئلہ کے حل کے لیے فکرمند تھے، جمعہ کا ترک دین اور نصح وخیر کے بہت سے دروازوں کو بند کر سکتا تھا، مسجدیں ویران ہو سکتی تھیں، علماء سے عوام کا رابطہ کٹ سکتا تھا، چنانچہ انہوں نے ایک طرف مذہب کی ان روایات اور علماء مذہب کے ان اقوال کو لائحہ عمل بنانے کا فیصلہ کیا، جو قبل سے معمول بہ کا درجہ نہ رکھتے تھے؛ لیکن خروج عن المذہب کے مقابلے میں یہ محفوظ راستہ تھا، اسی پس منظر میں انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے کے مطابق ہر ایسے مقام پر جمعہ کے جواز کا فتویٰ دیا جہاں تھوڑا سا بھی تمدن پایا جاتا ہو اور چالیس (۴۰) یا پچاس (۵۰) گھر کی آبادی ہو۔(۵۳)

اس طرح مصر اور حاکم دونوں شرطوں کے معروف تصورات کی لازمیت ختم کر دی گئی؛ اس لیے کہ غیر مسلم ہندوستان کے حالات مسلم ہندوستان سے مختلف تھے، مولانا سجاد صاحب اپنے ایک فتویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

"دیہاتوں میں نماز جمعہ کے جواز وفرضیت میں علماء ہند صدیوں سے مختلف الخیال ہیں، عالمگیرؒ سلطان ہند کے زمانے میں بھی اس مسئلہ میں اختلاف رہا، ملاجیون صاحبؒ نے تفسیرات احمدیہ میں لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ کے علماء کے تین (۳) گروہ ہیں:

☆ ایک یہ ہے کہ ہر گاؤں میں نماز جمعہ کو جائز سمجھتے ہیں اور پڑھتے ہیں اور لوگوں کو پڑھنے کا حکم دیتے ہیں۔

☆ دوسرا گروہ وہ جو دیہاتوں میں جمعہ اگر ہو تو خود پڑھتے ہیں؛ لیکن دیہاتوں میں پڑھنے کا عام حکم نہیں دیتے۔

☆ اور تیسرا گروہ وہ ہے، جو دیہاتوں میں نماز جمعہ کو حرام کہتا ہے اور لوگوں کو منع کرتا ہے اور یہ تمام گروہ علماء احناف ہی کے ہیں۔(۵۴)

ہمارے نزدیک جس گاؤں میں مسلمانوں کی مستقل آبادی ہو اور جماعت کے لیے بالغ مرد کافی ہوں، وہاں نماز جمعہ ہوسکتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ بھی اس کے قائل ہیں، صرف وہ یہ فرماتے ہیں کہ چالیس (۴۰) مسلمان وہاں موجود ہوں، (۵۵) حجۃ اللہ البالغۃ وغیرہ میں انہوں نے بوضاحت لکھا ہے"۔(۵۶)

☆ دوسری جانب فقہ حنفی کی تصریحات کی روشنی میں امارت شرعیہ کے ذریعہ آپ نے اس مسئلہ کو حل فرمایا، فقہاء نے صراحت کی ہے کہ:

☆ مجتہد فیہ مسائل میں حکم حاکم رافع اختلاف ہوتا ہے:

(قوله: وإذا اتصل به الحكم، إلخ) قد علمت أن عبارة القهستانى صريحة فى أن مجرد الأمر رافع للخلاف بناء على أن مجرد أمره حكم. (۵۶)

☆ اسی طرح اگر امیر کسی دیہات یا چھوٹے مقام پر بھی جمعہ قائم کرنے کی اجازت دیدے تو وہ مقام حنفی نقطۂ نظر سے بھی محل جمعہ بن جاتا ہے:

قال أبو القاسم هذا بلا خلاف إذا أذن الوالى أو القاضى ببناء المسجد الجامع وأداء الجمعة لأن هذا مجتهد فيه فإذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه وفيماذكرناإشارة إلى أنه لاتجوز فى الصغيرة التى ليس فيها قاض ومنبر و خطيب كمافى المضمرات والظاهرأنه أريد به الكراهة لكراهة النفل بالجماعة ألا ترى أن فى الجواهرلوصلوافى القرى لزمهم أداء الظهر وكذا إذا لم يتصل به حكم فإن فى فتاوى الدينارى إذا بنى مسجد فى الرستاق بأمر الإمام فهوأمر بالجمعة اتفاقاعلى ماقال السرخسى، اه، فافهم والرستاق القريةمافى القاموس. (۵۷)

مولانا محمد سجاد صاحبؒ امارت شرعیہ کو بہت سے دینی، ملی اور عائلی مسائل کا حل قرار دیتے تھے اور بحیثیت فقیہ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں وہ اس کی پوری اہمیت سمجھتے تھے، چنانچہ آپ نے بحیثیت نائب امیر شریعت کئی بستیوں میں اجراء جمعہ کا فرمان صادر کیا اور اس

طرح بڑے بڑے فتنے ٹل گئے اور جمعہ کی نماز فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق جاری ہوگئی، یہ مولانا محمد سجاد کی وہ انفرادیت ہے، جو ان کے فقیہ النفس ہونے کا مظہر ہے۔ فتاویٰ امارت شرعیہ میں اس نوع کے کئی فتاویٰ موجود ہیں، ایک فتویٰ کی عبارت ہے:

''الجواب: صورت مذکورۃ الصدر میں بمقام قاسمہ (ضلع گیا علاقہ رفیع گنج کی ایک بستی) مسجد میں نماز جمعہ محققین حنفیہ کے نزدیک بھی جائز ہے اور میں بحیثیت قائم مقام امیر شریعت اجازت دیتا ہوں کہ مسلمانان قاسمہ و مسلمانان اطراف قاسمہ وہاں نماز جمعہ پڑھا کریں۔۔۔۔۔ہماری اس تحریری اجازت کے بعد اب کوئی ذی علم اختلاف نہیں کرے گا، کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ مسئلہ مجتہد فیہا میں حکم حاکم اختلاف کو رفع کر دیتا ہے، جو حکم حاکم دیتا ہے، وہی سب کے لیے قابل عمل ہوتا ہے اور نماز جمعہ کی بابت تو خاص تصریح ہے کہ جب امیر کسی چھوٹے گاؤں میں بھی جمعہ قائم کردے تو سب کو پڑھنا چاہیے''۔(۵۸)

امارت شرعیہ کے ذریعہ اجراء جمعہ کے حل کو اہل علم کے حلقہ میں کافی پذیرائی ملی اور دیگر مفتیان کرام بھی چھوٹی بستیوں میں جمعہ کے جواز کے لیے مسلمانوں کو امارت شرعیہ سے رجوع کرنے کا مشورہ دینے لگے، فتاویٰ امارت شرعیہ میں ایک فتویٰ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا ہے، جس پر مفتی ابراہیم احمد آبادیؒ، مفتی سہول احمد بھاگلپوریؒ سابق پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ و سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند اور مولانا اصغر حسین بہاریؒ صاحبان کے دستخط ہیں، استفتاء میں ایک چالیس (۴۰) گھر کی آبادی والے گاؤں (اکٹیر) میں جمعہ کے جواز کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے، مذکورہ بالا علماء نے مسلک حنفی کے مطابق یہ جواب تحریر فرمایا:

''مذکورہ دیہات میں جمعہ جائز نہیں ہے، اٹھا دینا چاہیے، ہاں اگر اہل دیہات جمعہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ امیر شریعت صوبہ بہار کی خدمت میں دیہات کی آبادی وغیرہ بیان کر کے درخواست کریں، اگر وہ جمعہ قائم کرنے کا حکم دیں تو جمعہ جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔۔(آگے حوالے کی عبارت ہے) چنانچہ حضرت سجاد نے اس گاؤں میں جمعہ کی اجازت مرحمت فرماتے ہوئے تحریر فرمایا: "موضع اکٹیر مذکور الصدور میں مشائخ وائمہ حنفیہ کے اصول وفروع ومصالح امت کو پیش نظر رکھ کر اقامت جمعہ کی میں بحیثیت نائب امیر شریعت کے اجازت دیتا ہوں۔ فقط ابوالمحاسن محمد سجاد ۲۱ رصفر ۱۳۴۷ھ''۔(۵۹)

مسئلہ رویت ہلال:

رویت ہلال کا مسئلہ بھی ہر دور میں انتہائی حساس اور معرکۃ الآراء رہا ہے، شبہ ہمیشہ یہاں

سے کھڑا ہوتا ہے کہ رویت ہلال کی شہادتوں کی تحقیق میں وہ معیار کیوں اختیار نہیں کیا جاتا، جو عام عدالتی معاملات ومقدمات کی شہادتوں میں اختیار کیا جاتا ہے؟ بلکہ بعض مواقع پر تو محض خبر کی بنیاد پر بھی رویت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے، یہی شبہ اکثر رویت ہلال کی خبروں اور فیصلوں کے رد وقبول میں اختلافات کا باعث بنتا ہے۔

حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے سامنے جب یہ سوال آیا تو انہوں نے جزئی مباحث میں جانے کے بجائے ایک ایسی اصولی بات تحریر فرمائی، جس سے اس قسم کے تمام شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے، آپ کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ رویت ہلال کا مسئلہ فریقین کے خصومات ومقدمات کی طرح نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک دینی معاملہ بھی ہے، اس سے نماز، روزہ، عیدین، فطرہ، قربانی وغیرہ متعدد مسائل وابستہ ہیں اور دینی معاملات میں شریعت کے نزدیک شہادت کی وہ شرطیں مطلوب نہیں ہیں، جو عام انسانی مقدمات میں ہوتی ہیں؛ بلکہ یہاں شہادت محض خبر موجب کے معنیٰ میں ہے؛ یعنی ایسی خبر جس سے علم اور غلبۂ گمان حاصل ہو جائے، اسی لیے دینی معاملات میں اخبار آحاد بھی مقبول ہوتی ہیں، بشرطیکہ غلطی اور کذب کا غالب گمان نہ ہو، جس طرح کہ طلوع وغروب، زوال یا مثلین وغیرہ سے نماز پنجگانہ کا تعلق ہے، ان کے وجوب کے لیے کسی بھی خبر سے ان کا علم ہو جانا کافی ہے، خبر دینے والے سے شہادت کی شرطیں نہیں مانگی جاتیں، یہی حال رویت ہلال کی خبر کا بھی ہے، اس کو اصطلاحی شہادت کے معیار پر پرکھنا غلط ہے، حضرت سجادؒ کا یہ فتویٰ مختصر ہے؛ لیکن بہت سی اصولی باتوں، علمی نکات اور حوالہ جات کتب پر مشتمل ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''مختصراً جواب یہ ہے کہ رویت ہلال کی شہادت بمعنیٰ شہادت عند مجلس القضاء فی الخصومات نہیں ہے، باتفاق ائمہ حنفیہ وغیرہم؛ اس لئے شہادت ہلال میں شہادت کے تمام شروط ہی مشروط نہیں ہیں، حالانکہ شہادت کے شروط نصوص سے ثابت ہیں جو غیر منسوخ ہیں اور فقط شہادت ہی شرط نہیں ہے خلافاً للشافعی، پس تحقیق عند الاحناف یہ ہے کہ اس باب میں شہادت بمعنیٰ خبر موجب للعلم وغلبۃ الظن ہے، اگرچہ خبر آحاد ہو، صرف شرط یہ ہے کہ غلط اور کذب کا گمان غالب نہ ہو درایۃ یا بدلالۃ المحل، اور مناط یہ ہے کہ ثبوت ہلال سے متعلقہ احکام محض امور دینیہ محضہ ہیں، مثلاً صوم، صلوٰۃ، وعیدین، فطرہ، قربانی، جس طرح اوقات طلوع، غروب، زوال، غیوبت شمس ومثلین سے نماز پنجگانہ متعلق ہے، ان تمام احکام کی تکلیف اسی وقت ہو جاتی ہے، جس وقت اس کے اوقات کا علم ہو، اگرچہ

خبر واحد سے ہو، جس طرح احکام طہارت ونجاست الماء کی تکلیف عائد ہوتی ہے، ہاں شرط یہ ہے کہ مخبر مسلم عادل یا مستور الحال ہو اور خبر مظنہ غلط وکذب سے بعید ہو، ائمہ حنفیہ وفقہاء حنفیہ کی کتب سے مع لحاظ اصول مسلمہ حنفیہ یہ ہی امر ثابت ہے اور یہ ہی ظاہر الروایۃ ہے، مبسوط سرخسی، زیلعی، شامی، رحمتی، بدائع وغیرہ کا مطالعہ بنظر امعان فرمایئے اس میں سب کچھ ہے، ان میں سے بعض کتابوں میں بعض تصریحات اس تمہید کے خلاف معلوم ہوں گی؛ بلکہ خود ان کے اقوال میں تعارض معلوم ہوگا؛ لیکن باصول جمع وتطبیق وہ مؤول ہیں، یا مردود ومرجوح ہیں،۔۔۔ چونکہ آپ لکھتے ہیں کہ اہل علموں کا اختلاف ہے؛ اس لیے میں لکھتا ہوں، ''ارشاد اہل الملۃ الیٰ اثبات الاہلۃ'' کا صرف مطالعہ کافی ہوگا، اس کتاب میں ائمہ اربعہ کے مسلک کو مع نقل عبارات فقہیہ واضح طور پر لکھا گیا ہے اور جامعیت کے ساتھ، مصر میں چھپی ہے''۔(۶۰)

قطرہ ازدریا:

یہ صرف چند مثالیں ہیں جن سے مولانا سجاد صاحب کے علمی وفقہی کمالات کا اجمالاً اندازہ کیا جا سکتا ہے، ورنہ آپ کا مقام اس سے کہیں زیادہ بلند ہے؛ کیوں کہ آپ کے علم کا بہت مختصر حصہ زیب قرطاس وقلم ہو سکا، ایک تو ملی اور قومی مسائل کے ہجوم میں لکھنے کی فرصت آپ کو کم ملی، دوسرے جو کچھ لکھا، وہ پورے طور پر محفوظ نہ رہ سکا، بڑا حصہ ضائع ہو گیا، مثلاً آپ کے فتاویٰ کی جو ایک جلد ہمارے سامنے ہے، یہ صرف وہ فتاویٰ ہیں، جو امارت شرعیہ کے رجسٹر میں محفوظ تھے، جن کی تعداد ان پر ڈالے گئے نمبرات کے مطابق محض ایک سو اٹھانوے (۱۹۸) ہے۔

مدرسہ انوار العلوم گیا کے شعبہ افتا سے آپ نے جو فتاویٰ تحریر فرمائے تھے، ان کی تعداد بھی بقول حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ قریب اتنی ہی تھی؛ مگر وہ ضائع ہو گئی۔(۶۱)

علاوہ الٰہ آباد مدرسہ سبحانیہ کے دار الافتاء سے بھی آپ نے بے شمار فتاویٰ لکھے تھے، جن کی بنا پر آپ وہاں ''فقیہ شہر'' کہلاتے تھے، اگر یہ تمام فتاویٰ میسر آ جاتے تو فقہ وفتاویٰ کی ایک پوری لائبریری تیار ہو جاتی۔

اس لئے مولانا سجاد صاحب کی فقہیات کے تحت یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا، مجھے پورا احساس ہے کہ یہ محض آپ کے علم وکمال کا محض ایک شمہ ہے ''قطرہ از دریا'' یا ''مشتے نمونہ از خروارے'' بلکہ اس سے بھی کمتر۔

میری تو ہستی ہی کیا، بڑے بڑے اصحاب علم وکمال بھی مولانا کی عظمت علم کے آگے

عاجز و درماندہ نظر آتے ہیں، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ کے الفاظ میں:

''جو کچھ لکھا گیا سچ جانئے کہ سمندر میں سے ایک قطرہ کی حیثیت بھی نہیں ہے۔ان کا علم، ان کی ذہانت، ان کا تقویٰ، ان کی سمجھ اور سوجھ بوجھ، ان کی مستعدی اور کام کرنے کی قوت، ان کی غربت اور افلاس، ان کا صبر اور ان کا عزم، ان کے اخلاق کی بلندی اور ان کا کیرکٹر، خدا کا خوف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، مسلمانوں کی اصلاح کا شوق، ممالک اسلامیہ کی آزادی اور ان کی بقا کا خیال، یہ سب باتیں وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، جنہوں نے مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ کو قریب سے دیکھا ہے''۔(۶۲)

مصادر ومراجع

(۱) حیات سجاد ص ۵۷، ۵۸ ارتسامات گیلانیہ

(۲) محاسن سجاد ص: ۵

(۳) امارت شرعیہ دینی جدوجہد کا روشن باب ص ۲۳ مصنفہ مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی

(۴) محاسن سجاد ص ۳۷ مضمون مولانا مسعود عالم ندویؒ

(۵) حیات سجاد ص: ۱۰۱، مضمون سحبان الہندؒ

(۶) محاسن سجاد ص: ۱۱۰

(۷) حیات سجاد: ۳۵

(۸) محاسن سجاد ص: ۴۰

(۹) محاسن سجاد ص: ۵۴

(۱۰) حیات سجاد ص: ۱۴۷، ۱۴۸

(۱۱) حیات سجاد ص: ۳۵

(۱۲) محاسن سجاد ص: ۵۴

(۱۳) مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ-حیات وخدمات ص: ۲۶، مضمون حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، ناشر مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، ۲۰۰۳ء

(۱۴) قضایا سجاد ص ۵ مقدمہ بقلم حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، شائع کردہ: امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، ۱۹۹۹ء

(۱۵) ملفوظات محدث کشمیریؒ ص ۲۳۷ مرتبہ حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ، ناشر ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان، ۱۴۳۱ھ

(۱۶) ملفوظات محدث کشمیریؒ ص: ۲۳۶

(۱۷) ملفوظات محدث کشمیریؒ ص ۲۳۶ پر امام رازیؒ کے بارے میں ان کا جملہ ہے:

''امام رازی کو فقہ فی النفس حاصل ہے''۔
اور علامہ ابن نجیمؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے بارے میں فیض الباری شرح البخاری کی یہ عبارت ہے:
واعلم أن ابن نُجَيم أفقه عندی من الشَّای لِمَا أراه فيه أن أمارات التفقُّه تَلُوح، والشَّامي مُعَاصِرٌ للشاه عبدالعزيز رحمه الله تعالی، وأوأفقه أيضًا عندی من الشَّامی رحمه اللّٰه تعالی. (فیض الباری شرح صحیح البخاری:۴۹۳/۲)
علامہ فرماتے تھے کہ تین صدیوں سے تفقہ مفقود ہے، وہ درمختار اور ردالمحتار جیسی عظیم فقہی کتابوں کے مصنفین علامہ حصکفیؒ اور علامہ ابن عابدین شامیؒ کو محض ناقل فقہ قرار دیتے تھے اور ان کی فقہ فی النفس کے قائل نہیں تھے، ان کے مقابلے میں عہد اخیر کے عالم وفقیہ شیخ المشائخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو زیادہ بڑا فقیہ (یعنی فقیہ النفس) سمجھتے تھے۔(فیض الباری شرح صحیح البخاری ج۲ص ۳۹۳)
نیز ملفوظات محدث کشمیریؒ ص ۲۳۶ پر علامہ کشمیریؒ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے:
''فرمایا صاحب درمختار اور شامی وغیرہ محض ناقل ہیں اور فقہ سے (جو کہ صفت نفس ہوتی ہے) مناسبت بھی نہیں ہے محض حضرت گنگوہیؒ کو دیکھ کر ان کو کچھ مناسبت تھی اور گمان یہ ہے کہ تین صدی سے تفقہ مفقود ہے''۔

(۱۸) اکفار الملحدین فی ضروریات الدین ص ۱۶۳ مصنفہ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ مطبوعہ مجلس علمی سملک ڈابھیل گجرات طبع ثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء
(۱۹) حیات سجاد: ۱۴۸
(۲۰) حیات سجاد ص: ۳۴ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانی (مفہوم)
(۲۱) محاسن سجاد ص ۲۶ مضمون مولانا اصغر حسین بہاریؒ
(۲۲) خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند مراد آباد ص: ۷۷، ناشر امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ ۱۴۱۹ھ
(۲۳) محاسن سجاد ص: ۳۶
(۲۴) **الجامع الصحيح المختصر: ۲۷/۱، رقم الحديث: ۴۸، المؤلف: محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاری الجعفی الناشر: دار ابن كثير، الهمامة - بيروت الطبعة الثالثة، 1407 – 1987. تحقيق: د. مصطفى ديب البغا أستاذ الحديث وعلومه فی كلية الشريعة – جامعة دمشق عدد الأجزاء: 6 مع الكتاب: تعليق د. مصطفى ديب البغا**
(۲۵) خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند مراد آباد ص ۷۷، ۷۸ ناشر امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ ۱۴۱۹ھ
(۲۶) فتاویٰ امارت شرعیہ – فتاویٰ حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ – ج ا ص ۲۶ تا ۳۰ مرتبہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، شائع کردہ: امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، ۱۹۹۸ء
(۲۷) حیات سجاد ص ۱۴ مضمون مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ
(۲۸) خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند مراد آباد ص ۸۷ تا ۹۰ شائع کردہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، ۱۹۹۹ء
(۲۹) خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند مراد آباد ص ۶۲

(۳۰) روئیداد آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس امرتسر ص ۲۱ بحوالہ حیات سجاد ص ۴۲ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ

(۳۱) حیات سجاد ص ۴۳ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ

(۳۲) حیات سجاد ص ۴۴، ۴۵ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ۔ فتاویٰ امارت شرعیہ ج ا ص ۲۸۷، ۲۸۸

(۳۳) حیات سجاد ص: ۱۰۵

(۳۴) خطبہ صدارت جمعیۃ علماء ہند گیا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ ص ۴۴، ۴۵ مطبع قاسمی دیوبند

(۳۵) خطبہ صدارت جمعیۃ علماء ہند پشاور، حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری ص ۵۵ جید برقی پریس بلی ماران دہلی

(۳۶) محاسن سجاد ص ۱۶۳، ۱۶۴

(۳۷) محاسن سجاد ص ۵۵

(۳۸) حیات سجاد ص ۴۹ تا ۵۰، ارتسامات گیلانیہ

(۳۹) حیات سجاد ص ۵۰ حاشیہ مولانا عبدالصمد رحمانیؒ

(۴۰) حیات سجاد، ص: ۳۵

(۴۱) **كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال** ج ٥ ص ٧٣٣ **رقم الحديث:** ١٤٢٥٠، ١٤٢٥١، **المؤلف: علاء الدين على بن حسام الدين المتقي الهندى البرهان فورى (المتوفى: 975)المحقق: بكرى حيانى – صفوة السقاالناشر: مؤسسة الرسالة الطبعة: الطبعة الخامسة 1401 /1981م مصدر الكتاب: موقع مكتبة المدينة الرقمية.** ☆**جامع الأحاديث** ج ٢٩ ص ١ **رقم الحديث:** ٣١٥٧٦، **المؤلف: جلال الدين السيوطى**

(۴۲) حیات سجاد ص ۴۹ تا ۵۰، ارتسامات گیلانیہ

(۴۳) حیات سجاد ص ۵۰ حاشیہ مولانا عبدالصمد رحمانیؒ

(۴۴) الحیلۃ الناجزۃ ص ۳۷۷ تا ۳۷۹ مطبوعہ مکتبہ رضی دیوبند، سن طباعت ۱۹۹۳ء، مکاتیب سجاد ص ۱۷۔۱۸، شائع کردہ: مکتبہ امارت شرعیہ پٹنہ، سن اشاعت ۱۹۹۹ء

(۴۵) نظام قضاء کا قیام ص ۱۵، ۱۶، شائع کردہ آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ

(۴۶) **الشرح الكبير:** ٤٧٩/٢، **المؤلف: أبو البركات أحمد بن محمد العدوى، الشهير بالدردير (المتوفى: 1201)وكذا فى حاشية الدسوقى على الشرح الكبير:** ١٢١/١٠، **المؤلف: محمد بن أحمد الدسوقى(المتوفى: 1230) وكذا فى منح الجليل شرح على مختصر سيد خليل:** ٣١٧/٤، **محمد عليش .الناشر دار الفكرسنة النشر 1409 –1989م، بيروت**

(۴۷) خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند مرادآباد ص ۸۵ تا ۸۷

(۴۸) دیکھئے ص ۲۶۱ تا ۲۷۳

(۴۹) فتاویٰ امارت شرعیہ ج ا ص ۱۶۲ مرتبہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، شائع کردہ: امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۹۹۸ء

(۵۰) فتاویٰ امارت شرعیہ ج۱ص۱۴۳تا۱۶۲

(۵۱) فتاویٰ امارت شرعیہ ج۱ص۲۰۹

(۵۲) جیسا کہ فقہاء کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے، دیکھئے یہ عبارت: وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض ومنبر و خطيب كما في المضمرات. (حاشية رد المختار على الدر المختار شرح تنوير الأبصار فقه أبو حنيفة ج ٢ ص ١٣٨، ابن عابدين. الناشر دار الفكر للطباعة والنشر. سنة النشر 1421 – 2000م. مكان النشر بيروت. عدد الأجزاء8

(۵۳) حضرت شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغۃ میں تحریر فرماتے ہیں: وذلک لانه كما كان حقيقة الجمعة اشاعة الدين فى البلد، وجب ان ينظر الىٰ تمدن وجماعة والاصح عندى انه يكفى اقل مايقال فيه قرية لماروى من طرق شتى يقوى بعضهابعضاً، خمسة لاجمعة عليهم وعدمنهم اهل البادية، قال صلى الله عليه وسلم: :الجمعة على الخمسين رجلاً. (حجۃ اللہ البالغۃ، ج:۲،ص:۳۰)

(۵۴) اس کے حاشیہ میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے تفسیرات احمدیہ کی اس عبارت کی نشاندہی کی ہے جس میں یہ مسئلہ ذکر کیا گیا ہے: كذلک يشترط لصحة ادائهاستة اخرىٰ المصر اوفناؤه والسلطان أو نائبه....وقدطال الكلام فى زماننابين ايدى الانام فى وجدان الشرطين الاولين لان فى معنى المصر اختلافا فقيل فيه اميروفيه قاض ينفذالاحكام ويقيم الحدودوقيل مالايسع اكبرمساجده اهله والمعنى الاول لايوجدالانادراوان كان المعنى الثانى المختار منهما يوجدفى اكثر المواضع.وفى السلطان اونائبه لاندرى شرط الحضورام يكفى، الاذن وان كان كلام صاحب الكشاف يشيرالىٰ انه يجب الاذن عندعدم الحضور ولهٰذاافترقوافرقاًمختلفاً، فقليل منهم من تركوا الجمعة اصلاً وطائفة اكتفوابهافقط وبعضهم ادوالظهر فى منزلهم ثم سعواالى الجمعة.واكثرهم داموا علىٰ ادائهااولاً علماً منهم بانهامن اكبرشعائرالاسلام والتزموابعدهااداء الظهر لكثرة الشكوک فى شانها وغلبة الاوهام وان كان لايجوز الجمع بين الفرضين عنداهل الاسلام. (تفسیرات احمدیہ ص۲۰۷ حاشیہ فتاویٰ امارت شرعیہ ج۱ص۵۲،۵۳)

(۵۵) حجۃ اللہ البالغۃ کی عبارت درج ذیل ہے: وكان النبى صلى الله عليه وسلم وخلفاؤه رضى الله عنهم والأئمة المجتهدون رحمهم الله تعالى يجمعون في البلدان، ولا يؤاخذون أهل البدو، بل ولا يقام فى عهدهم في البدو، ففهموا من ذلک قرنا بعد قرن وعصرا بعد عصر أنه يشترط لها الجماعة والتمدن أقول وذلک لأنه لما كان حقيقة الجمعة إشاعة الدين في البلد وجب أن ينظر إلى تمدن وجماعة، والأصح عندى أنه يكفي اقل ما يقال فيه قرية، لما روي من طرق شتى يقوي بعضها بعضا، خمسة لا جمعة عليهم ' وعد منهم

أهل البادية قال صلى الله عليه وسلم: الجمعة على الخمسين رجلا، أقول: الخمسون يتقرى بهم قرية، وقال: الجمعة واجبة على أهل قرية ' وأقل ما يقال فيه: جماعة، لحديث الانفضاض، والظاهر أنهم لم يرجعوا والله أعلم، فإذا حصل ذلك وجبت الجمعة ومن تخلف عنها فهو الآثم، ولا يشترط أربعون، وأن الأمراء أحق بإقامة الصلاة وهو قول علي كرم الله وجهه: أربع إلى الإمام، الخ، وليس وجود الإمام شرطا والله أعلم بالصواب. (حجة الله البالغة للإمام أحمد المعروف بشاه ولي الله ابن عبد الرحيم الدهلوي ج: ۱/ص: ۴۷۸، تحقيق سيد سابق الناشر دار الكتب الحديثة – مكتبة المثنة مكان النشر القاهرة– بغداد عدد الأجزاء 1)

(۵۶) حاشية رد المختار على الدر المختار شرح تنوير الأبصار: ۱۳۸/۲، ابن عابدين .الناشر دار الفكر للطباعة والنشر، سنة النشر 1421 – 2000م.مكان النشر بيروت .عدد الأجزاء 8

(۵۷) حاشية رد المختار على الدر المختار شرح تنوير الأبصار فقه أبو حنيفة: ۱۳۸/۲، ابن عابدين، الناشر دار الفكر، سنة النشر 1421 – 2000م.مكان النشر بيروت .عدد الأجزاء 8

(۵۸) فتاویٰ امارت شرعیہ ج اص ۵۵،۵۶

(۵۹) فتاویٰ امارت شرعیہ ج اص ۵۷،۵۸۔امارت شرعیہ میں یہ خوبصورت تسلسل بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا، خود اس حقیر راقم الحروف نے بھی ٹکواز پور نامی بستی (ضلع سمستی پور) میں جہاں ایک سو (۱۰۰) گھروں سے زائد کی آبادی ہے اور وہاں جمعہ پہلے سے قائم نہیں تھا، گاؤں والوں کے رجوع کرنے پر میں نے حالات کا جائزہ لیا اور ان کی خواہش پر میرے جواب اور سفارشی تحریر کے ساتھ وہ حضرات امارت شرعیہ حاضر ہوئے، حضرت امیر شریعت سادس مولانا سید نظام الدین صاحبؒ نے سوال وجواب کو ملاحظہ کرنے اور ساری صورت حال جاننے کے بعد تحریری طور پر اس گاؤں میں جمعہ کی اجازت مرحمت فرمائی، الحمدللہ اس وقت سے آج تک وہاں جمعہ قائم ہے۔

(۶۰) فتاویٰ امارت شرعیہ ج اص ۴۷،۵۷۔حضرت سجادؒ کی نظر جدید وقدیم ہر طرح کی مطبوعات پر رہتی تھی، علم کے میدان میں ان کے یہاں ٹھہراؤ اور قناعت نام کی کوئی چیز نہیں تھی

(۶۱) فتاویٰ امارت شرعیہ ج اص ۲۰ مقدمہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

(۶۲) حیات سجاد ص:۱۰۹

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ
کی فقہی بصیرت

مفتی محمد سعید الرحمٰن قاسمی
مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

بانی امارت شرعیہ ونائب امیر شریعت، مفکر اسلام، عالم ربانی، علم وعمل، زہد وتقوی میں ممتاز، عزم واستقامت کے پہاڑ، خودداری اور غیرت دینی میں بے مثال شریعت وطریقت، شرافت ونجابت کے نیر تاباں، بالغ النظر عالم دین، مجاہد ملت، داعی حق، مرشد کامل یہ تھے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ۔ حضرت مولاناؒ ذہانت وفطانت میں فائق، دینی بصیرت، سیاسی شعور وآگہی، اجتماعی بیدار مغزی، تدبر وتدبیر کی بے پناہ صلاحیت، افراد سازی اور شرعی احکام کی تنفیذ میں مہارت تامہ رکھنے والے بے پناہ خوبیوں اور صلاحیتیوں کے حامل، کتاب اللہ، احادیث نبویہ اور آثار صحابہ پر گہری نظر رکھنے والے، شریعت کے مزاج ومذاق سے پوری طرح واقف، اتباع سنت نبوی میں سرشار، اور امت مسلمہ کی صلاح وفلاح کے لئے ہمہ وقت فکر مند رہنے والی ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے، حضرت مولانا قرآن وحدیث کے رمز شناس تھے، آپ براہ راست قرآن کریم سے مسائل کے استخراج واستنباط پر قدرت رکھتے تھے،، اور فقہ کا کونسا مسئلہ کس آیت یا کسی حدیث سے مستنبط ہے، فوراً اس کی نشاندہی فرماتے۔ چنانچہ آپ کے شاگرد رشید، محقق عالم دین حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ فرمایا کرتے تھے کہ ”جب مسموم ہوا چلنے لگی کہ ہر مسئلہ کا ثبوت قرآن سے طلب کیا جانے لگا، تو اس زمانہ میں تلاوت کے وقت جزئیات فقہ اور فروعات اسلامی کے مآخذ کے اخذ کی طرف ذہن کا امالہ ہوگیا تو کچھ دنوں کے مطالعہ کے بعد خدا کی جانب سے یہ نوازش ہوئی کہ جب میں فقہ کے کسی بات کے فروعی مسائل کے ثبوت کی طرف توجہ کرتا تو آسانی سے ماخذ کی طرف رہنمائی ہوجاتی، **ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم**(۱)

فقہ اسلامی پر آپ کی بڑی عمیق نگاہ تھی، عرف وعادت اور زمانہ کے احوال وکوائف سے بھی

اچھی طرح آشنا تھے، نکتہ سنج اور معاملہ فہم انسان تھے، دقیق سے دقیق مسائل کو چٹکیوں میں حل کرنے کا ملکہ تھا، جو ایک ماہر فقیہ کی شان ہوتی ہے، یہ خداداد صفت تھی جس سے اللہ رب العزت نے آپ کو نوازا تھا، انہیں خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے رئیس المحد ثین امیر المومنین فی الحدیث علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے آپ کو فقیہ النفس عالم کہا ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا محمد سجاد فقیہ النفس عالم ہیں؛ یعنی اللہ تعالیٰ نے مسائل کی روح سمجھنے کا ان کو فطری ملکہ عطا فرمایا ہے''۔(۲)

حضرت والا کو قرآن کریم سے بہت زیادہ شغف ورغبت تھی، قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت اور اس سے مستنبط ہونے والے احکام ومسائل پر بڑی گہری نظر تھی، آپ کا ذہن ودماغ فقہ اسلامی کے سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا، جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا آپ کا ذہن ودماغ فوراً اس آیت کی جانب مبذول ہوجاتا جس سے وہ مسئلہ مستنبط ہوا ہے، آپ کے تلمیذ خاص حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ آپ کے ان علمی کمالات کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''زرعی بل کے موقع پر جب اسمبلی میں یہ مسئلہ پیش آیا کہ اوقاف پر شرعاً زرعی ٹیکس عائد نہیں کیا جاسکتا ہے تو میں نے پوچھا کہ حضرت اس کے لیے قرآن مجید میں کیا مأ خذ ہے، حضرت نے برجستہ فرمایا:

﴿فمن بدله بعد ماسمعه فإنما إثمه على الذين يبدلونه إن الله سميع عليم﴾(۳)

(جس نے سننے کے بعد اس کو بدلا تو اس کا گناہ بس اس بدلنے والے پر ہے، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والے دیکھنے والے ہیں۔)

کیوں کہ کسی طرح کی تبدیلی جب وصیت میں جائز نہیں جو مرض الوفات کی حالت میں لوجہ اللہ کرتا ہے تو پھر وقف میں بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگی، جو صحت وطمانیت کی حالت میں خدا کی راہ میں وقف کرتا ہے، اسی اصول پر شرط الواقف کالنص کا ضابطہ ہے''۔(۴)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تفقہ فی الدین کی عظیم نعمت عطا فرمائی تھی، اصول وفروع پر آپ کی گہری نگاہ تھی، اپنی بات کو بڑی قوت اور مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کرنے میں مہارت رکھتے تھے، آپ کے ایمانی فراست اور فقیہانہ بصیرت کی شہادت ہم عصروں نے دی ہے، آپ کے بارے میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی تحریر فرماتے ہیں:

’’ہماری جماعت میں مشہور ہے کہ زبردست دلائل کے ساتھ کسی بات کو مدلل کر کے بیان کرنا حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا خاص حصہ ہے، اور یوں بھی مفتی صاحب کو فقہ اسلامی میں بہت بڑا کمال حاصل ہے؛ لیکن جماعت کے ذمہ دار ارکان اور میں نے بارہا دیکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا محمد سجادؒ دلائل و براہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے تو حضرت مفتی صاحب بے حد متاثر ہوتے، ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان سے کلمات تحسین نکل جاتے حضرت مولانا کا علم کتابی نہیں؛ بلکہ آفاقی تھا‘‘۔(۵)

مشہور و ممتاز عالم دین حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ آپ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

’’اپنے وقت کے بڑے مشاق مدرس اور حاضر العلم عالم تھے، خصوصیت کے ساتھ معقولات اور فقہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، جزئیات فقہ اور خصوصا ان کا وہ حصہ جو معاملات سے متعلق ہے نظر میں تھا، زکوٰۃ وخراج قضا، امامت ولایت کے مسائل کی پوری تحقیق فرمائی تھی، ان کا علم محض کتابی نہیں بلکہ آفاقی تھا، وہ معاملات خوب سمجھتے تھے، ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا حصہ فکر رسا اور رائے صائب تھی، مسائل وحوادث میں ان کی نظر بہت دور تک پہونچ جاتی تھی، وہ ہر گتھی کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتے تھے‘‘۔(۶)

حضرت مولانا محمد سجادؒ کا علم بڑا گہرا تھا، فقہ وحدیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے، حاضر دماغ اور وسیع النظر عالم دین تھے، حافظ سعید احمد صاحب سابق نائب صدر جمعیۃ علماء دہلی تحریر فرماتے ہیں:

’’فقہ، حدیث، قرآن تینوں چیزوں میں میں نے ان کی نظر وسیع اور ان کے علم کو مستحضر پایا‘‘۔(۷)

حضرت مولانا کے علم وفضل، تبحر علمی اور فقہی مہارت کا شہرہ دور دور تک تھا، یہی وجہ ہے کہ حضرت جب الہ آباد سے واپس تشریف لانے لگے تو ہر شخص کی زبان پر یہ جملہ تھا کہ آج الہ آباد سے فقہ رخصت ہو رہا ہے، جس کا ذکر آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا عبد الصمد رحمانیؒ نے اپنے مضمون میں کیا ہے:

’’مولانا جس وقت الہ آباد سے گیا تو مراجعت فرما رہے تھے اور عمائدین کی جماعت مولانا کو رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن پر آئی تھی تو ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ الہ آباد سے فقہ رخصت ہو رہا ہے‘‘۔(۸)

عظیم اسکالر، سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، دار العلوم ندوۃ العلماء کے سابق ناظم اعلیٰ اور ماہر ادیب حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ حضرت مولانا کے فقہی کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میرے محدود عالم میں مولانا محمد سجاد جیسا کہ دقیق النظر و عمیق العلم عالم دور دور میں نہ تھا، فقہ بالخصوص اصول فقہ پر ان کی گہری نظر تھی''۔(۹)

حضرت مولانا علم بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق وفلسفہ ان تمام علوم وفنون میں یدطولیٰ رکھتے تھے، جب آپ منطق وفلسفہ کے موضوع پر بات کرتے تو ایسے ایسے نکات بیان کرتے کہ عقل حیران رہ جاتی اور جب فقہی جزئیات بیان کرنا روع کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ کتب فقہ بالکل حفظ ہے۔

حضرت مولانا مناظر حسن گیلانیؒ ان چیزوں کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''جب منطق وفلسفہ کے نکات پر بحث کرتے تو پتہ کی ایسی بات کہتے کہ مسئلہ کی گرہ کھل جاتی تھی، پھر جب فقہی جزئیات کا ذکر کرتے تو ایسے نوادر جزئیات کا پتہ دیتے کہ میں حیران ہوجاتا؛ لیکن کتاب جب کھلتی تو جو کچھ مولانا فرماتے اس کی توثیق کرنی پڑتی تھی''۔(۱۰)

حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بات کے رکھنے کا عمدہ سلیقہ عطا فرمایا تھا، آپ اپنی بات کو دلائل نقلیہ سے بھی مدلل فرماتے اور دلائل عقلیہ سے بھی مزین فرماتے کہ موافق، مخالف سب اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتے، چنانچہ آپ نے اپنے مقالہ میں جہاں نشہ خوری کی حرمت کو دلائل نقلیہ سے ثابت کیا وہیں ایسی عقلی دلیل پیش کی کہ ایمان والے تو ایمان والے غیر ایمان والے کے لیے بھی اس کو قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

''اس ناپاک چیز سے اپنی پاک روح اور پاک آتما کو نجس نہ کریں اور اس دل کو جو مسلمانوں کے نزدیک خدا کا نشیمن ہے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک پرماتما کا مندر ہے، اس کو بدترین نجس چیز سے گھناؤنا نہ بنائیں''۔(۱۱)

حضرت مولانا دینی غیرت وحمیت، ایمانی بصیرت رکھنے والے مخلص مدبر اور جری قائد تھے، انہوں نے اسلامی اصولوں سے انحراف کرکے کبھی کوئی سمجھوتا نہیں کیا، وہ ایسے مواقع پر بھی ایسے اصول بیان کرتے جو دونوں فرقوں کے لئے قابل قبول اور لائق عمل ہو اور اسلامی

اصول اور شریعت مطہرہ سے سے متصادم بھی نہ ہو اور دوسرے مذاہب والوں کی انا کو بھی ٹھیس نہ پہونچے، چنانچہ جن ممالک میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہوں ان کے درمیان مذہبی اور شہری حقوق کا فیصلہ، یا باہمی مصالحت مفاہمت کے لیے کون سا اصول ہو تو حضرت لکھتے ہیں:

''اہل اسلام اور تمام عقلاء دہر متفق ہیں کہ ہر فرقہ وگروہ کو اپنے عقیدہ کے اظہار اور اس پر عمل کی آزادی دو شرطوں سے مشروط ہے۔

اول: یہ کہ عقیدہ ایسا نہ ہو، جس کا پبلک مقامات میں اعلان اظہار اور عمل سے انسانی تہذیب وشائستگی کو نقصان پہونچے۔

دوسرا: یہ کہ اس عقیدہ وعمل کا اعلان یا طریق اظہار دوسروں کے لئے اشتعال انگیز نہ ہو۔

آگے لکھتے ہیں کہ!

''مثلاً گائے ذبح کرنا مسلمانوں کا اور ہر اس شخص کا جو گائے کا گوشت کھاتا ہے ایک حق ہے، جس کا انہیں پوری آزادی ہونی چاہئے، لیکن پردہ کے ساتھ، اور اپنے گھروں میں، کیوں کہ اس طرح پر عمل کرنے سے نہ کسی کی دل آزاری ہوسکتی ہے اور نہ کسی کے مشتعل ہونے کوئی وجہ، ہاں اگر کوئی مندر کے سامنے یا پبلک مقامات پر اعلانیہ گائے ذبح کرنا چاہے گا تو آزادی کے حدود کو توڑے گا، کیونکہ اس نے دوسروں کی دل آزاری اور اشتعال کا خطرہ ہے، اسی طرح ہندوؤں کو اپنے مذہبی پیشواؤں اور بتوں کے جلوس نکالنے کی اجازت اسی وقت مل سکتی ہے، جب یہ جلوس کسی پبلک جگہ پر کوئی ایسی حرکت نہ کرے، جس سے عام پبلک یا مسلمانوں کو اشتعال پیدا ہو اور یہ جلوس ایسی چیزوں پر مشتمل نہ ہو جو منافی اخلاق ہو''۔(۱۲)

آپ کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی، آپ کی زندگی کا سب سے عظیم اور تاریخی کارنامہ امارت شرعیہ بہار، اڈیشہ وجھارکھنڈ کا قیام ہے، یہ آپ کی زندہ و جاوید کرامت ہے، حضرت نے قیام امارت کے ساتھ دارالقضاء اور دارالافتاء کی بنیاد ڈالی کہ دارالقضاء کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان ہونے والے نزاعی اور اختلافی مسائل کا شرعی طریقہ پر تصفیہ کیا جاسکے اور دارالافتاء کے ذریعہ روزمرہ کے مسائل اور موجودہ دور میں پیدا ہونے والے نت نئے مسائل کا شرعی حل بتایا جاسکے۔آپ نے مقدمات کا بذات خود فیصلہ بھی کیا اور استفتاء کا جواب بھی تحریر

فرمایا، آپ کے فتاوے فقیہ العصر سابق قاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی تحقیق وترتیب کے بعد شائع ہو چکے ہیں، جو فتاوی امارت شرعیہ کے نام سے موسوم ہے، جس کی پہلی جلد صرف حضرتؒ کے فتاوی پر مشتمل ہے، جوامت مسلمہ بالخصوص اہل علم کے لئے بیش قیمتی علمی تحفہ ہے۔ آپ کے فتاوی کے مطالعہ سے بھی آپ کے تبحر علمی، تفقہ فی الدین اور علوم شریعت اور اس کے احکام ومصالح پر دس ترس ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ کے فتاوی کی زبان سلیس، آسان، عام فہم؛ لیکن واضح اور دوٹوک ہوتی تھی، چنانچہ جب آپ سے ذبیحہ کا پیشہ اختیار کرنے کے سلسلہ میں استفسار کیا گیا کہ اس سے جانور پر ظلم کرنے کا اطلاق آئے گا، یانہیں؟ تو آپ نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں جواب تحریر فرمایا:

''ظلم نہیں ہے؛ بلکہ اس کو ظلم کہنا ظلم ہے؛ کیوں کہ یہ خلاف حکم الٰہی ہے''۔ (۱۳)

حضرت مولانا کے فتاوی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جب آپ سے کوئی مختلف فیہ ومجتہد فیہ مسئلہ دریافت کیا جاتا تو آپ اس کے جواب میں ایسی راہ اختیار فرماتے کہ وہ مجتہد فیہ مسئلہ مجمع علیہ ہو جائے اور اس پر بلا چون وچرا ہر شخص کے لئے عمل آسان اور قابل قبول ہو، چنانچہ جب آپ سے جمعہ فی القریٰ کے بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

''صورت مذکورۃ الصدر میں بمقام قاسمہ مسجد میں نماز جمعہ محققین حنفیہ کے نزدیک بھی جائز ہے اور میں بھی بحیثیت قائم مقام امیر شریعت اجازت دیتا ہوں کہ مسلمانان قاسمہ ومسلمانان اطراف قاسمہ وہاں نماز جمعہ پڑھا کریں۔ ہماری اس تحریر کے بعد اب کوئی ذی علم اختلاف نہیں کرے گا، کیوں کہ ان کو معلوم ہے کہ مسئلہ مجتہد فیہ میں حکم حاکم اختلاف کو رفع کر دیتا ہے''۔ (۱۴)

فقیہ العصر قاضی القضاۃ وسابق نائب امیر شریعت حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ مقدمہ فتاویٰ امارت شرعیہ جلد اول میں حضرت کے فتاوی کو خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ!

''فتاوی ابوالمحاسن محمد سجاد کی خصوصیت وہ فتاوی ہیں، جو اجتماعی، دستوری اور اہم ترین ملی مسائل سے متعلق ہیں، استبدال وقف کا مسئلہ ہو، یا ترک موالات، یا مدارس اسلامیہ کے لئے سرکاری امداد کا، ایک فقیہ النفس عالم جس کے پاس فراست ایمان کی دولت بھی موجود تھی، اس نے آنے والے فتنوں کو کس طرح دیکھا اور فتاوی میں اس کا کیسے سدباب کیا، یہ علماء اور اصحاب نظر کی خاص توجہ کے محتاج ہیں''۔ (۱۵)

حضرت مولانا اپنے معاملہ میں رحم دل، رقیق القلب اور عفو و درگذر کرنے والے انسان تھے؛ لیکن شریعت کے معاملہ میں بے انتہا سخت کہ اس میں تساہل اور تلطف کو بھی قطعی برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس کو آپ مداہنت فی الدین سے تعبیر کرتے تھے، چنانچہ دین وشریعت کے معاملہ میں جو بات حق ہوتی بلا خوف لومۃ لائم اس کا برملا اظہار فرماتے اور اس کا واضح اور زندہ ثبوت آپ کے فتاویٰ میں ملتا ہے۔

جب ذبیحہ گاؤ کے سلسلہ میں آپ سے استفسار کیا گیا کہ ہندوؤں کے جذبۂ گاؤ پرستی کے لحاظ وخیال کی بنا پر ذبح گاؤں سے پرہیز کرنا اور دوسروں کو بھی اس سے بچنے کی تاکید کرنا، یا ہندوؤں کے جبر ود باؤ سے ذبح گاؤں سے احتراز کرنا کیسا ہے؟ تو آپ اس کا جواب واضح اور دوٹوک انداز میں تحریر فرماتے ہیں:

''ان جمیع وجوہ کی بنا پر ذبیحہ گاؤ سے پرہیز کرنا ناجائز ہے، ہندو کے خیال سے کہ ان کا دل دکھتا ہے، ذبیحہ گاؤ کو ترک کرنا قطعا حرام ہے، کیوں کہ اس صورت میں تائید علی الشرک ہوتی ہے اور مشرکین کی ہوا پرستی کی باتوں کو تسلیم کرنا اور ماننا بالکل ناجائز ہے، گئو رکھشا اور گئو کے بچانے کا مسئلہ ہندوؤں کی ہوا پرستی پر مبنی ہے یعنی گاؤ کے اندر ایک خاص عظمت سمجھ کر قابل پرستش سمجھتے ہیں، پس جب تک ہندوؤں کے اندر جذبۂ گاؤ پرستی موجود ہے، اس وقت تک ذبیحہ گاؤ سرزمین ہند میں ایک شعار اور شعائر اسلام ہے''۔(۱۶)

اسی طرح انگریزی حکومت کے دور میں آپ سے دریافت کیا گیا کہ سرکاری کونسل میں شرکت کی اجازت ہے یا نہیں؟ تو آپ نے اس کے جوابا تحریر فرمایا:

''کونسل میں جانا اس وقت بھی حرام ہے؛ مگر اس شخص کے لئے رخصت ہے، جو یہ سمجھتا ہو کہ بغیر کونسل میں گئے ہوئے مسلمان کی زندگی خطرہ میں ہے، گویا رخصت اس طرح ہے، جس طرح حالت اضطرار میں مضطر کے لیے سور کا گوشت کھانے کی رخصت ہے''۔(۱۷)

آپ جہاں کتاب وسنت، فقہ اصول فقہ کے رمز شناس تھے وہیں زمانہ کے احوال، عرف وعادت سے بھی اچھی طرح واقف تھے، آپ کی نگاہ دوربیں اور دوررس تھی، آپ معاشرہ کی صلاح وفلاح اور اس میں پھیلی برائی کی روک تھام کے لئے فکر مند رہا کرتے تھے اور شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے اس کے سدباب کی ہر ممکن تدابیر اختیار کرتے جیسا کہ یہ چیز آپ کے فتاوی سے بھی واضح ہے، چنانچہ تعزیر مالی کے سلسلہ میں احناف کا صحیح اور مفتی بہ قول یہ ہے کہ یہ

جائزنہیں ہے؛ لیکن آپ نے اس کے برخلاف امام ابو یوسف کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے مالی جرمانہ کے جواز کا فتوی دیا، کہ لوگوں کو منکرات وفواحش سے روکنے کا اس کے علاوہ کوئی موثر طریقہ نہیں ہوسکتا ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

''باقی رہا جرمانہ نقد وکھانا بمنزلہ صدقہ نافلہ ہوگا تاکہ نقصان مالی کے خیال سے نفس امارہ آئندہ گناہ پر جرأت نہ کرے''۔(۱۸)

اسی طرح حضرت مولانا سے مسلمانوں کو گھر سے باہر کسی خاص مقام پر قربانی کرنے کا پابند بنانے کے سلسلہ میں سوال کیا گیا تو کیا ہی فقیہانہ، مدبرانہ اور حکیمانہ جواب عنایت فرمایا ہے۔آپ لکھتے ہیں:

''لیکن حسن تدبیر کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہئے اور ضرر ونفع اور جلب منفعت میں توازن کا لحاظ کر کے کام کرنا چاہیئے''۔(۱۹)

حضرت مولانا جیسی بے باک، بے پناہ جرأت وہمت، ایمانی غیرت وحمیت، سیاسی شعور اور فقہی بصیرت رکھنے والی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔

شاعر نے بجا فرمایا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدور پیدا

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا پر اپنی رحمت کاملہ نازل فرمائے، ان کے قائم کردہ ادارہ امارت شرعیہ کو روز افزوں ترقیات سے نوازے اور ہر قسم کے شرور وفتن سے حفاظت فرمائے۔(آمین)

مصادرومراجع

(۱) حیات سجاد ص۳۲
(۲) سجاد نمبر نقیب ۲۸/اگست ۱۹۷۸ء
(۳) سورۃ البقرۃ:۱۸۱
(۴) حیات سجاد:ص:۳۳
(۵) حیات سجاد:۷۵
(۶) حیات سجاد:۵۸
(۷) حیات سجاد:۹۱

(۸) حیات سجاد:۳۷
(۹) ماخوداز سجاد نمبر نقیب ۲۸/اگست ۱۹۷۸
(۱۰) سجاد نمبر نقیب ۲۸/اگست ۱۹۷۸
(۱۱) مقالات سجاد:۱۱۹
(۱۲) مقالات سجاد:ص۵۲۔۵۳
(۱۳) فتاوی امارت شرعیہ ج ا ص ۲۴۳
(۱۴) فتاوی امارت شرعیہ ج ا ص ۵۵۔۵۶
(۱۵) فتاوی امارت شرعیہ ج ا ص ۲۲
(۱۶) فتاوی امارت شرعیہ ج ا ص ۲۸۸
(۱۷) فتاوی امارت شرعیہ ج ا ص ۲۸۴
(۱۸) فتاوی امارت شرعیہ ج ا ص ۲۹۰
(۱۹) فتاوی امارت شرعیہ، ج:ا/ص:۲۸۶

مفکر اعظم حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب بہاریؒ

بیسویں صدی میں اسلامی قیادت کا شہ دماغ

مولانا محمد نوشاد نوری قاسمی
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد امت مسلمہ عجیب وغریب صورت حال کا شکار تھی، انگریزی سامراج نے ظلم وزیادتی کی ساری حدیں پار کردی تھیں، مدارس اور تعلیمی مراکز بند کردیے گئے تھے، علما اور مجاہدین پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا تھا، ہندوستان کی فضا میں مذہبی اور قبائلی تعصب کا زہر گھول دیا گیا تھا، ماحول کچھ ایسا بنایا گیا کہ عہد رفتہ کی عظمتوں کی بازیابی ایک خواب بن کر رہ گئی، جہاد آزادی کی ناکامیوں نے بیدار مغز قائدین کو فکر وعمل کے نئے زاویہ کی تلاش پر مجبور کردیا، انہی مایوسیوں کے درمیان عزم واستقلال کے کچھ ایسے قافلے وجود میں آئے، جنہوں نے امید کی شمعیں جلائیں، تاریکیوں میں عمل کے راستے متعین کیے، مستقبل کے دوررس منصوبے تیار کیے، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، دعوت وعزیمت کے اس قافلہ کے ہراول دستہ میں تھے، وہ بیسویں صدی میں امید کی نئی کرن، عزم واستقلال کا ایک نیا باب، امت مسلمہ کی نشأۃ ثانیہ کے ایک محوری قطب، اور برصغیر میں ملک وقوم کی بے نظیر تہذیبی وثقافتی سرمایہ کے نگہبان بن کر سامنے آئے۔

اہل علم کا وہ حلقہ جنہیں حضرتؒ کی زندگی اور کارناموں سے صحیح واقفیت نہیں ہے، وہ ان باتوں کو ذرا خوش فہمی، یا خوش عقیدگی پر محمول کرے گا؛ لیکن حقیقی صورت حال یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کے شہ دماغ تھے، ان کی زندگی میں ہندوستان کے جس قابل قدر ملی کارنامے کو دیکھیے تو اس میں ان کی گہری چھاپ نظر آئے گی؛ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ آج ہندوستان کی مسلم قیادت جن لکیروں پر گامزن ہے، وہ لکیریں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی کھینچی ہوئی ہیں۔

جمعیۃ علماء بہار، جمعیۃ علماء ہند، امارت شرعیہ پٹنہ، مسلم اینڈیپنڈنٹ پارٹی بہار، تحریک آزادی، تحریک خلافت، بہار اسمبلی میں اردو زبان کی قومی حیثیت، مختلف مسائل میں مسلم مخالف قوانین میں ترمیم اور مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی دوررس منصوبہ سازی؛ ایسے اہم اور تاریخی خطوط ہیں، جن پر قوم

مسلم کی اجتماعیت اور ملی زندگی کا مدار ہے اور یہ سب مفکر اعظم حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی غیر معمولی عبقریت اور دوراندیشی کا نتیجہ ہیں۔ظاہر ہے مولاناؒ کی زندگی کے بہت سے ایسے گوشے ہیں، جن پر بہت تفصیل سے لکھا جاسکتا ہے؛ لیکن ان کی زندگی کے کچھ ابواب ایسے ہیں جن میں وہ بالکل منفرد نظر آتے ہیں اور وہ ہے ان کی سیاسی بصیرت اور مسلمانوں کے سیاسی وجود کے لیے عملی جدوجہد۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریزی حکومت میں انہوں نے بھانپ لیا کہ اب مسلمانوں کی بازیابی کا خواب بغیر سیاسی شرکت کے ممکن نہیں، وہ غلام ہندوستان میں، مسلمانوں کی ترقی کا مکمل اور دوررس نصاب رکھتے تھے اور یہ وہ راستہ ہے، جسے بعد کے علما نے شجرۂ ممنوعہ قرار دے دیا، اور نتیجہ ہمارے سامنے ہے؛ اس لیے بہت مناسب ہے کہ حضرت مفکر اعظمؒ کی سیاسی بصیرت کا مختصر نقشہ پیش کیا جائے۔

سیاسی شعور کی ابتدا:

۱۹۰۵ء میں مدرسہ سبحانیہ الہ آباد سے فراغت کے بعد تقریباً بیس سال تک، آپ بڑی یکسوئی کے ساتھ، درس وتدریس میں مشغول رہے، اس زمانے میں آپ کے درس کا بڑا اشہرہ رہا، اور کم عمری میں ہی ماہرین فن اساتذہ اور علمانے آپ کی فنی مہارت اور علمی پختگی کی گواہی دینی شروع کردی؛ لیکن اس پورے عرصہ میں وہ امت کے حالات سے غافل نہیں رہے؛ ان کی سیاسی شعور کی ابتدا بھی ایک قابل ذکر واقعہ ہے، جسے ان کے سوانح نگاروں نے بڑی دلچسپی سے لکھا ہے، حضرت امیر شریعت رابعؒ کے الفاظ میں:

> ''واقعہ اس طرح ہے کہ جب مولانا الہ آباد میں پڑھایا کرتے تھے، تو ایک شخص زاہد حسین خان دریا آبادی مولانا سے پڑھنے آیا کرتے تھے، زاہد صاحب انگریزی پڑھے ہوئے تھے، انگریزی اخبارات برابر لاکر مولانا کو سنایا کرتے تھے، جس میں ممالک اسلامیہ کے بارے میں بہت ہی تشویشناک خبریں ہوا کرتی تھیں، جن سے مولانا کے دل ودماغ بہت زیادہ متاثر ہوا کرتے تھے، اسی تاثر نے مولانا کے غور وفکر کے موضوع کو بدلا، وہ دماغ جواب تک برابر مختلف علوم وفنون کی باریکیوں پر صرف ہوا کرتا تھا اور وہ فکر رسا جواب تک مشکل سے مشکل علمی مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں کام آیا کرتی تھی، وہ مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے اہم مسائل تک بھی پہونچنے لگی اور درس وتدریس کے ساتھ ساتھ، مسلمانوں کے دوسرے مسائل پر غور وفکر میں بھی وقت صرف ہونے لگا، ایک مصلح کی تمام خوبیاں پہلے سے موجود تھیں،

خداداد صلاحیت، ذکاوت، تدبر اور فکر رسا کی کمی نہ تھی، ان سب چیزوں میں قدرت نے کم از کم مولانا کے ساتھ بخل نہیں کیا؛ بلکہ وافر عطا کی تھی''۔(۱)

آج کون ہے جو مسلمانوں کی صورت حال سے واقف نہیں ہے؟ اور کسے دشمنوں کی سازشوں کا علم نہیں ہے؟ اور کون ہے جو امت مسلمہ کو درپیش مسائل اور چیلنج سے غافل ہے؟ لیکن کتنے ہیں جن کے سینے میں مولانا ابوالمحاسن صاحبؒ کے جیسا درد، ان کی سی تڑپ، اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کی سی لگن اور انتھک کوششیں اور قربانیاں پیش کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں؟ اخبار میں چھپی ہوئی خبروں اور حالات نے ان کی آنکھیں کھول دیں، انہوں نے نہ قلت وسائل کا شکوہ کیا، نہ حقائق سے چشم پوشی کی، اور نہ ہی صلہ وستائش کی پرواہ کی؛ بلکہ قلندرانہ انداز میں حالات کی بازیابی کا خواب آنکھوں میں سجایا اور اسے شرمندۂ تعبیر کرنے تک چین سے نہیں سوئے۔

سیاست وقیادت کا عملی آغاز:

حالات وواقعات کے صحیح ادراک کے بعد مدرسہ کی چہار دیواری مولانا کو تنگ محسوس ہونے لگی، انہیں لگ رہا تھا کہ اس حصار میں قید رہنا ان کے لیے مناسب نہیں، شاید انہیں وہ سرا ہاتھ لگ گیا تھا، جس کی ملک وقوم کی ضرورت تھی اور انہوں نے الہ آباد کے مدرسے سے استعفی دے کر، گیا پہونچے اور وہاں مدرسہ قائم کیا؛ تاکہ علم کے ساتھ لوگوں میں تعارف ہو اور بعد کے مراحل کے لیے کام کرنا آسان ہو جائے۔ حضرت امیر شریعت رقم طراز ہیں:

''ایسے دل ودماغ کے لیے مدرسہ کی چہار دیواری کافی نہیں ہوسکتی، اور نہ ایک ہی کتاب کا ہر سال پڑھتے پڑھاتے رہنا دلچسپی کا باعث ہوسکتا ہے، اسے وسعت کی ضرورت تھی، جب دوسرے مسائل سامنے آ گئے تو وسعت مل گئی، پہلے مولانا کے سامنے صرف مدرسہ کے مدرسین، طلبا یا اس کے ہمدرد و متعلقین تھے، اب ان کی نگاہ کے سامنے دنیا میں بسنے والا ہر ایک مسلمان اور ہندوستان میں رہنے والا ہر ایک انسان تھا، پہلے ان کے دماغ کی خوراک علمی مسائل تھے، اب دنیا سے اسلام میں عموما اور ہندوستان میں خصوصا روزانہ پیدا ہونے والے نئے نئے معاملات تھے، بس اب کیا تھا؟ مولانا نے وہ چیز پالی جس کی انہیں ضرورت تھی، ضرورت ہی نہیں؛ جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے تھے، چند ہی روز کے غور وفکر کے بعد دماغ نے فیصلہ کیا اور صمیم فیصلہ کیا کہ درس وتدریس سے بھی زیادہ اہم ملک وملت کے دوسرے کام ہیں، ان ہی حالات میں گیا آئے اور مدرسہ کھولا''۔(۲)

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کی سوانحی کتابوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قیام گیا ان کی زندگی کا تاریخی موڑ ہے، یہیں سے انہون نے مدرسہ قائم کر کے جہالت وناخواندگی کا خاتمہ کرنے کے ساتھ، عوام پر اپنا اعتماد قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور اپنے مشن کو آگے بڑھانا ان کے لیے آسان ہوگیا۔

گیا میں بنیادی طور پر انھوں نے دو اہم کام کیے: ایک تو انہوں نے مدرسہ قائم کیا، اور دوسرا اہم کام یہ ہے کہ انھوں نے اہم ملی مسائل واداروں کے قیام کا منصوبہ بنایا، حضرت امیر شریعت رابعؒ لکھتے ہیں: ''مدرسہ کھولنے کے دو مقصد تھے، ایک تو یہ کہ اپنی زندگی کے اس دور کی یادگار ہمیشہ کے لیے باقی رہ جائے اور صحیح معنوں میں تعلیمی سلسلہ جاری رہے، دوسرے یہ کہ لوگوں میں تعارف ہوجائے، لوگوں کو اس کا موقع ملے کہ مولانا کو جانچیں اور پرکھیں، اور مولانا قومی سیاسی کاموں کے لیے فضا کو ہموار اور راستہ کو صاف کرسکیں، چناں چہ مولانا نے گیا پہونچ کر قومی اور ملکی کاموں میں حصہ لینا شروع کردیا، علما کی تنظیم، جمعیۃ علما کا قیام، تمام مدارس عربی میں ایک اصلاحی نصاب کا اجراء، امارت شرعیہ کی اسکیم وغیرہ، یہ سب چیزیں مولانا کے دماغ نے گیا ہی میں پیدا کیں''۔(۳)

حضرت مفکراعظمؒ کے اہم سیاسی کارنامے:

جیسا کہ ذکر ہوا، حضرت نے گیا سے ہی اپنے مشن اور اسکیموں کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا اور اس سلسلے میں سب سے اہم اور پہلا کام انجمن علماء بہار کا قیام ہے۔

(الف) جمعیة علماء بہار: تاسیس ومقاصد:

کسی بھی اجتماعی اور ملی کام کے لیے رجال کار کا ہونا ضروری ہے، اس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت اس زخمی پرندہ کی تھی، جس کے پر نوچ لیے گئے ہوں، جس کا نشیمن اجاڑ دیا گیا ہو اور جس کے قبیلہ کا شیرازہ منتشر کردیا گیا ہو؛ اس لیے کسی بھی ملی ضرورت کا پہلا تقاضہ امت مسلمہ کے باشعور افراد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا، تاکہ اس پلیٹ فارم سے متحدہ آواز بلند کی جاسکے، متحدہ موقف اختیار کیا جاسکے، اپنی قومی طاقت کا مظاہرہ کیا جاسکے، اپنی ملی بیداری کا ثبوت دیا جاسکے، ایک زندہ قوم کی طرح باعزت زندگی جینے کا عزم کیا جاسکے اور قوم کے تن میں نئی روح پھونکی جاسکے۔ اس لیے امت مسلمہ کے باشعور بالخصوص علما کا اتحاد خواہ وہ کسی بھی پیمانے پر ہو، ایک خواب تھا، ایک ضرورت تھی، جس کی تکمیل کے لیے غلام ہندوستان میں سب

سے پہلے حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ نے منظّم انداز میں کوشش کی اور اس کے لیے ۱۹۱۷ء میں جمعیۃ علماء بہار قائم کی اور علماء بہار کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا اور ان میں ملی مسائل کے تعلق سے ایک ذمہ دار افراد کی طرح کام کرنے کی جرأت بخشی، یہ انجمن درحقیقت ان مقاصد کو بروئے کار لانے کا عظیم اور کامیاب مقدمہ تھی، جن کے لیے حضرت مولانا سجادؒ صاحب کوشاں تھے، یہ انجمن کامیاب رہی اور ایک متحدہ محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی، اس غیر معمولی تاریخی سبقت نے دیگر صوبوں کے علماء کو مہمیز لگائی، اور ان میں ملی اتحاد کی ضرورت اور اس کی واقعیت کا احساس دلایا، چنانچہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب جیسے دسیوں افراد نے جمعیۃ علماء بہار کی توسیع کا مطالبہ کیا اور اسی جمعیۃ کو توسیع کرتے ہوئے ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد رکھی گئی، انجمن علماء بہار یا جمعیۃ علماء بہار کا پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اسی کے بطن سے جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا۔

(ب) جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس سن ۱۹۱۹ء:

جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا، جمعیۃ علماء ہند درحقیقت جمعیۃ علماء بہار کی توسیعی شکل ہے اور مقصد یہ تھا کہ ملی جد وجہد کا آغاز ملی اتحاد سے ہونا چاہیے، جمعیۃ علماء کی تاسیس اور اس سے وابستہ حقائق تاریخی کتابوں میں مذکور ہیں؛ لیکن مختصراً اس کی تاسیس اور حضرت مولانا محمد سجادؒ کی حصہ داری کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

اس زمانے کی مختلف تحریکات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے حضرت مولانا محمد سجادؒ کی شخصیت صرف علاقہ بہار کے لیے محدود نہیں رہ گئی تھی؛ بلکہ وہ ملک گیر شخصیت تھے؛ اس لیے بعد کی تمام تر تنظیموں کے قیام اور ارتقاء میں ان کا دور بڑا کلیدی رہا، وہ اپنے زمانے کی بیشتر تنظیموں کا دماغ تھے، جمعیۃ علماء ہند کی تاسیسی نشست مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی دعوت پر امرتسر میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے زیر صدارت منعقد ہوئی، مولانا سجاد صاحبؒ اس کے محرکین اور داعیان میں تھے؛ لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے اس نشست میں شریک نہیں ہو سکے، البتہ اپنا نمائندہ بھیجا، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ مولانا احمد سعید دہلوی اور مولانا آزاد سبحانی، نیز دوسرے رفقاء نے شرکت فرمائی اور اس پہلی نشست کے تمام شرکاء بنیادی ارکان تسلیم کیے گئے، پس بظاہر جمعیۃ کے قیام کے محرک بھی مولانا ہی تھے، اس لیے کہ آپ اس سے پہلے بہار کی سطح پر ایسی ہی تنظیم قائم کر چکے تھے اور اس کی حیثیت ایک عملی نمونہ کی تھی۔

مولانا کا جمعیۃ علماء سے لگاؤ جذباتی تھا، اس لیے کہ وہ ان کے خوابوں کی حسین تعبیر اور ان کی

آرزو کی تکمیل تھی، اس لیے وہ جمعیۃ کے ہر پروگرام اور اجلاس میں شرکت فرماتے، اور مستقل عاملہ کے رکن رہے، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم رقم طراز ہیں:

''اس کے بعد سال بہ سال جمعیۃ کے اجلاس میں شریک ہوتے رہے، جن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اس زمانے میں جمعیۃ علماء کی حیثیت وہی تھی، جو اس وقت ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کی ہے، مولانا برابر جلسوں میں شرکت فرماتے رہے اور شروع سے عاملہ کے رکن رکین رہے، ہمیشہ آپ کی قانونی بصیرت اور سیاسی دور اندیشی کا لوہا مانا جاتا رہا، مختلف مواقع پر حکومت کے منظور کردہ یا مجوزہ کسی ایکٹ میں ترمیم، یا اس کا کوئی متبادل فارمولہ پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو یہ اہم کام آپ ہی کو سونپا جاتا، آپ بولتے کم تھے، زبان میں لکنت تھی، اس لیے عام جلسوں میں آپ تقریر کم کرتے تھے؛ لیکن جمعیۃ کے انتظامی اور تحریکی معاملات میں آپ کی حیثیت روح کی تھی، چناں چہ مولانا محمد میاں دہلویؒ فرماتے ہیں: ''جمعیۃ علماء ہند کے صدر مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ اور ناظم اعلی سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید تھے؛ مگر وہ ڈاکٹر جس کو بہت سے انجکشن دے دیے گئے تھے، ابو المحاسن حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت تھے''۔(۴)

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

''جب جمعیۃ علماء کی بنیاد پڑی تو موصوف اس کے لبیک کہنے والوں میں سب سے اول تھے، اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے کتنے رفیق سفر تھک تھک کر اپنی جگہ پر بیٹھ رہے تھے؛ مگر انہی کی ایک ہستی تھی، جو آخر تک جمعیۃ کے ساتھ لگی رہی؛ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انہی کی روح تھی، جو اس کے (جمعیۃ) قالب میں جلوہ گر ہوتی رہی''۔(۵)

(ج) امارت شرعیہ کا قیام:

ہند میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد، مسلمانوں کے مسائل کا شرعی حل ممکن نہیں رہ گیا تھا؛ اس لیے عدالتوں میں مسلم جج نہیں رہ گئے تھے اور جو تھے وہ شرعی نظام کو پیش نظر نہیں رکھتے تھے: اس لیے شرعی دار القضاء کا قیام ایک ناگزیر ضرورت تھا، یہ بھی اللہ کی خاص توفیق کہ اس سلسلے میں اجتماعی وانفرادی طور پر، حضرت مولانا محمد سجادؒ کو ہی سبقت اور اولیت حاصل تھی، انہوں نے سب سے پہلے بہار میں دار القضاء قائم فرمایا، پھر جمعیۃ کے اجلاس ۱۹۔۲۰ نومبر ۱۹۲۰ء میں ''امارت شرعیہ ہند'' کے قیام کی تجویز پیش کی، جو حضرت شیخ الہندؒ کی تائید سے منظور ہوئی؛ لیکن امیر الہند کے مسئلے میں اختلاف ہوگیا جس

کی وجہ سے یہ نظام جمعیۃ علماء کے زیر اہتمام چل نہیں پایا؛ لیکن حضرت مولانا سجاد صاحبؒ نے بہار کی سطح پر اس مشن کو کامیاب کرنے کی کوشش شروع کی اور اس تخیل کو سچ کر دکھانے کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کرڈالیں، چناں چہ ۲۳و۲۴ شعبان ۱۳۲۹ھ کو جمعیۃ علماء بہار کے اجلاس میں قیام امارت کی تجویز منظور ہوگئی اور انتخاب کے لیے ایک خصوصی اجلاس منعقد کرنا طے پا گیا، مولانا نے بہار واڑیسہ کے تمام ممتاز علماء اور ذمہ داران کے نام ایک مفصل خط لکھا، جس میں امارت کی اہمیت، شرعی حیثیت اور امیر کے اوصاف بیان کرتے ہوئے جلسہ مین شرکت کی دعوت دی گئی اور ۱۸و۱۹ شوال ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۵و۲۶ جون ۱۹۲۱ء کو پتھر کی مسجد پٹنہ میں زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزادؒ یہ اجلاس منعقد ہوا، صدر مجلس استقبالیہ مولانا شاہ حبیب الحق عمادی (۱۲۶۸ھ۔۱۳۴۳ھ) تھے، شاہ بدر الدین پھلوارویؒ سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کو امیر شریعت اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم امارت شرعیہ میں حضرت کی خدمات کا ایک نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دارالقضاء کا شعبہ جو پہلے ہی سے قائم تھا، مولانا نے اس کو امارت کے تحت کر دیا، جس کے ذریعہ بے شمار خواتین اور مظلوموں کو انصاف ملا، بعض حالات میں آپ نے خود بھی مقدمات کی سماعت فرمائی اور فیصلے لکھے، جس میں سے بعض شائع ہو چکے ہیں، امارت آنے والے فقہی سوالات کے جواب بھی مولانا دیتے تھے (جن کا مجموعہ فتاوی امارت شرعیہ، جلد اول کے نام سے شائع ہو چکا ہے)، بیت المال اور اس کے تحت زکوۃ وصدقات کے لیے اجتماعی نظام قائم کیا، مسلمانوں کے درمیان ارتباط کے لیے ایک شعبہ ''تنظیم'' کا قائم کیا گیا، مولانا نے تنظیم کا جو خاکہ پیش کیا تھا، وہ یہ ہے کہ ہر گاؤں میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی کر کے عہد اول کی اصطلاح کے مطابق نقیب کا تقرر ہو، پھر چند نقباء پر رئیس النقباء اور ضلع کی سطح پر چند تک مربوط ہو جائیں گے، مولانا سجاد صاحبؒ کے بنائے ہوئے اس نقشہ پر (جس میں خود انہوں نے رنگ بھر کر دیکھایا تھا) غور کیجیے تو یہ بالکل خلافت اسلامیہ کا نمونہ محسوس ہوگی''۔(۶)

(د) بہار مسلم اینڈیپینڈنٹ پارٹی کا قیام:

حضرت مولانا محمد سجادؒ، ہندوستان میں مسلمانوں کی نشأت ثانیہ کا جو نقشہ رکھتے تھے، سیاست اس کا لازمی تھی، وہ نظام حکومت کے بغیر کسی قوم کی ترقی کو ناقص سمجھتے تھے، ان کا یہی انداز فکر اس دور کے تمام مفکرین اور علماء سے انہیں ممتاز کرتا تھا، وہ بہت دنوں سے مسلمانوں کے سیاسی وجود کے لیے

کوشاں تھے اور موقع موقع سے اس کا برملا اظہار کرتے تھے؛ لیکن صحیح موقع کی تلاش رہی، اور جب وہ وقت آپہونچا تو اس کے لیے ایک سیاسی پارٹی بنائی، یہ کام اپنے میں ایک چیلنج تھا، مگر لوگوں کی پرواہ کے بغیر انہوں نے ''بہار مسلم اینڈ پینڈنٹ'' کے نام سے ایک پارٹی بنائی، اور اس کی تاریخ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء میں بہار مجلس قانون ساز کے عام انتخابات کی تیاریاں شروع ہوگئیں، حضرت اس بار سیاسی میدان میں پوری تیاری کے ساتھ اترنا چاہتے تھے، سیاسی قوت کے ذریعہ آپ کئی مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے، جیسے:

۱۔ ایوان میں ملک کی آزادی کا مطالبہ پوری قوت اور کسی کی پرواہ کے بغیر اٹھانا چاہتے تھے، وہ پورے ملک کی آزادی کا خواب سجائے ہوئے تھے اور اس کو مجاہدین آزادی کی سرفروشانہ کارناموں کے لیے بہترین خراج عقیدت سمجھتے تھے، اور اس میں وہ کسی طرح کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔

۲۔ سیاسی سطح پر امارت شرعیہ کے فیصلوں کی پابندی؛ تاکہ حکومت اگر کبھی بھی ایسا قانون بنائے، جو اسلامی شریعت سے متصادم ہوں تو بروقت آواز اٹھائی جائے اور اس کا مناسب سد باب کیا جائے؛ تاکہ مسلمان باعزت زندگی گزار سکیں اور قومی سطح پر اپنے وجود کا احساس کرا سکیں۔

امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے حضرت کے سیاسی نقطہ نظر کی بڑی خوب صورتی سے وضاحت کی ہے، حضرت فرماتے ہیں:

> ''پارٹی کے قیام کے دوران میں، مولاناؒ سے تفصیلی گفتگو کے مواقع آئے، اس وقت میں نے محسوس کیا کہ مولاناؒ مسلمانوں اور ہندوستان کے تمام مسائل پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے غور فرمایا کرتے ہیں، مولاناؒ کا ایمان تھا کہ اسلامی نظامِ حکومت وزندگی ہی بنی نوع انسان کے دینی اور دنیاوی فلاح کا ضامن ہوسکتا ہے، چناں چہ وہ ہر مسئلہ کو اسی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، وہ ہندوستان کی آزادی کے اس لیے خواہاں تھے کہ اسلام، غلامی کا سب سے بڑا دشمن ہے، وہ سرمایہ پرستی کے اس لیے مخالف اور کمزوروں اور غریبوں کے حامی تھے کہ اسلام کے مقرر کردہ معاشی نظام کے ذریعہ غربت کو خوش حالی اور کمزوری کو قوت سے بدلا جاسکتا ہے، میرے خیال میں مولاناؒ کا یہ نظریہ ہی ان کی بڑی خصوصیت تھی، جس میں وہ شاید منفرد تھے۔
>
> الیکشن میں حصہ لینے کے سوال پر مولانا علیہ الرحمۃ نے مجھ کو بتلایا کہ ہر قوم یا جماعت کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سیاسی اور آئینی طاقت حاصل کرے، خصوصا اس آئینی دور میں تو اس کے بغیر کسی سیاسی جماعت کا زندہ رہنا ہی مشکل ہے، مولانا علیہ الرحمۃ کا خیال

تھا کہ مسلمانوں کا اصل مقصد تو ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام ہے؛ اس لیے کہ موجودہ تمام طریق حکومت میں اسلامی حکومت ہی کا نظام مکمل ہے؛ لیکن چوں کہ بحالات موجودہ براہ راست اسلامی حکومت کے قیام کی راہ میں مشکلات ہیں؛ اس لیے سر دست کم از کم ایک ایسی مشترکہ حکومت کے قیام کی کوشش کی جائے، جہاں مسلمانوں کے لیے مخصوص نظام ہو، مولاناؒ کا خیال تھا کہ جس حکومت میں یہ بھی نہ ہو وہ آزاد حکومت نہیں کہی جاسکتی"۔(۷)

بہار مسلم اینڈیپنڈنٹ پارٹی کے عملی خطوط:

حضرتؒ اس بات کا خوب ادراک رکھتے تھے کہ ان کی سیاسی پارٹی ہندوستان میں آئینی اعتبار سے کیا کردار ادا کرے گی اور ملک کے سیاسی ماحول میں اس کا نقشہ کیا ہوگا، حضرت امیر شریعت نے اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے، حضرت فرماتے ہیں:

"مولانا علیہ الرحمۃ نے آزاد حکومت میں مسلمانوں کے مخصوص نظام کی جو تفصیلات پیش کی تھیں، ان کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ تو وہ ہے، جس میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں اور جو اسلامی حکومت کے اندر بلا امتیاز مذہب وملت نافذ کیے جائیں گے، ان احکام کا تعلق جان، مال، عزت اور امن عامہ سے ہوگا، دوسرا حصہ وہ ہے جسے آج کل کی زبان میں پرسنل لا' کہہ سکتے ہیں، (موجودہ اصطلاح میں پرسنل لا کے معنی بہت محدود ہیں اور مولاناؒ کے نظریہ پر حاوی نہیں) اس سے مراد وہ مسائل ہیں، جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے اور جو اسلامی حکومت میں بھی صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص ہوں گے، مولاناؒ فرمایا کرتے تھے کہ ملکی آزادی کی جدوجہد میں ہمارا ایک مذہبی مقصد یہ بھی ہے کہ آزاد جمہوری حکومت مین مسلمانوں پر کم از کم اسلامی نظام حکومت کا وہ حصہ تو پوری طرح نافذ ہو سکے، جس کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے، چناں چہ انتخابات میں حصہ لینے سے مولاناؒ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ رفتہ رفتہ آئینی طریقہ پر مذکورۂ بالا مقاصد کی طرف قدم بڑھایا جائے اور مرکزی وصوبائی مجالس قانون ساز سے ایسے قوانین مرتب کرائے جائیں، جو صحیح اسلامی اصول پر مرتب کیے گئے ہوں اور جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہو، چناں چہ مولاناؒ نے اسی مخصوص نظریہ کے ساتھ بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی قائم کی"۔(۸)

پارٹی کے قیام سے لے کر حکومت سازی تک بہت سے مسائل پیش آئے، نمائندے کا انتخاب، پارٹی کے منشور کی صحیح طرح اشاعت، عوامی توجہات کا حصول، مختلف علاقوں کا دورہ، سرمایہ کی کمی،

اختلاف آراء ونظریات وسعت قلبی کے ساتھ قبول کرنا اور اس کو حکیمانہ انداز میں حل کرنے کی کوشش، حکومت سازی کے مرحلہ میں کانگریس کے ساتھ مصالحت اور بھی متعدد ملی مسائل تھے، جن کے حل کے لیے ایک عبقری دماغ اور مدبر انسان کی ضرورت تھی اور وہ سب کچھ حضرت مولانا محمد سجادؒ کی ذات میں موجود تھے، مولانا نے کسی بھی معاملہ میں شریعت کو نظر انداز کر کے فیصلہ نہیں کیا؛ بلکہ وہ تحفظ شریعت کے لیے میدان عمل میں آئے تھے، اور اس کی دسیوں مثالیں حضرت کے تذکرہ نگاروں نے لکھ رکھی ہیں۔

بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے مثبت نتائج:

اس پارٹی نے بہار میں اپنے دور اقتدار میں، کئی اہم فیصلے کیے، جن کے دوررس اثرات ملک وملت پر پڑے، اس طرح اس پارٹی نے مذہبی سیاست کا عملی نمونہ پیش کر دکھایا، جسے اب بھی ہمارے بہت سے بڑے شجرہ ممنوعہ سمجھ رہے ہیں، اس پارٹی کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ رقم طراز ہیں:

''یہ ایک حقیقت ہے کہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وزارت نے بعض ایسے کام کیے، جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، اس سلسلہ میں اس کی پہلی خدمت سرکاری دفاتر میں اردو زبان کا اجرا ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں مولاناؒ کی کن کن کوششوں کو دخل تھا، بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر مولاناؒ مرحوم اس کے لیے کوشاں نہ ہوتے تو آج بھی یہاں اردو کے ساتھ اچھوت ہی جیسا سلوک ہوتا۔

پارٹی کی دوسری اہم ترین خدمت جس سے صوبہ کے تمام کسان آج تک مستفید ہو رہے ہیں، وہ دفعہ نمبر ۱۱۲ کی ترمیم ہے، جس سے کسانوں کو کئی طرح پر تخفیف لگان کا فائدہ پہونچا، حقیقتاً یہ کارنامہ ہے انڈیپنڈنٹ پارٹی کا اور یہ سب کچھ مولاناؒ ہی کے اشارہ پر ہوا تھا، کانگریس کے قبول وزارت کے بعد ہم لوگوں کو مولاناؒ کے اس عقیدہ کی صحت کا کافی ثبوت ملا کہ مکمل سمجھوتہ کے بغیر، مسلمانوں کو کانگریس ٹکٹ پر اسمبلی نہ جانا چاہیے''۔(۹)

سیاسی شعور کی روشن مثالیں:

عرض کیا جا چکا ہے کہ انجمن علماء بہار ہو، یا جمعیۃ علماء ہند، تحریک خلافت ہو، یا بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا قیام، یہ سب حضرت کی گرہ کشا عقل کی کرامات اور ان کے خون جگر کی نمود تھے، ان سب مرکزی اداروں میں حضرت نے اپنی دینی اور سیاسی بصیرت کے جو انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، ان کو حیطۂ تحریر میں لانا ممکن نہیں؛ لیکن کچھ ایسی روشن مثالیں پیش کرنا ضروری ہے، جن سے حضرتؒ کے فضل وکمال کا

رخ متعین کیا جاسکے اور معاصرین میں ان کی عظمت کا سراغ لگایا جاسکے۔

ہوتا یہ ہے کہ ایک ہی ادارہ اور بزم کی کچھ ایسی شخصیات جو کچھ خدائی اسباب کی وجہ سے زیادہ معروف ہوجاتی ہیں، لوگ تمام کامیابیوں کا سہرا ان ہی کے سر منڈھ دیتے ہیں اور ان کے بنسبت دیگر کم مشہور شخصیات کے کارنامے رفتہ رفتہ نظر سے اوجھل ہوجاتے ہیں؛ چاہے اس ادارہ کی تاسیس اور ہمہ جہت ترقی میں ان دیگر شخصیات کی قربانیاں اور مخلصانہ مساعی کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں؟ جمعیات اور اداروں میں کریڈٹ لینے کی جو ہوڑ لگی ہے اس کی روشنی میں اس فلسفہ کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں، خیر ذیل میں چند ایسی مثالیں درج ہیں، جو حضرت مولانا محمد سجادؒ صاحب کی عبقریت، جلالت شان اور سیاسی بصیرت پر، بطور دلیل پیش کی جاسکتی ہیں:

پہلی مثال: تنظیم برائے شریعت نہ کہ سیاست:

حضرتؒ کے تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مولانا ابو الکلام آزادؒ جب گرفتار ہوکر رانچی پہونچے تو ان کے ذہن میں بھی ایک تنظیم قائم کرنے کا تصور تھا اور اسی زمانے میں حضرت مولانا محمد سجاد بھیؒ ایک تنظیم کے لیے کوشاں تھے، مگر مولانا آزاد ملک کی آزادی کے لیے عسکری جدوجہد کرنے والی تنظیم قائم کرنا چاہتے تھے، جس کا نام وہ حزب اللہ رکھنا چاہتے تھے، اور مولانا محمد سجادؒ ایک مثبت پروگرام رکھتے تھے، اور وہ امارت شرعیہ کا قیام چاہتے تھے؛ تاکہ مسلمان قانونی حدود میں رہ کر، اپنی دینی اقدار کی حفاظت کرسکیں اور آزادی کے بعد بھی مذہبی تشخص کو ان کا دستوری حق تسلیم کیا جائے، نیز اسی متحدہ پلیٹ فارم سے مجاہدین آزادی کے جیالے بھی پیدا کیے جاسکیں۔(۱۰)

اسی واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر دوررسی رکھتے تھے، وہ وقتی حالات اور جذباتی نعروں سے متأثر ہوئے بغیر، مستقبل کے حالات اور واقعات کو سامنے رکھ کر اپنا اسکیم تیار کرتے تھے؛ اس لیے ان کی تنظیمیں آزادی کے بعد بھی، اپنی ڈگر پر رواں دواں ہے، جو ان کی دوررسی اور بصیرت کا واضح ثبوت ہے۔

دوسری مثال: سیاست، شریعت سے اوپر نہیں:

مولانا کی سیاسی بصیرت اور فکری اعتدال کا نتیجہ تھا کہ وہ سیاسی وابستگی کو مداہنت اور شرعی تساہل کا ذریعہ نہیں بناتے تھے، ان کے نزدیک ملی مسائل کو، ملکی مسائل پر فوقیت اور ترجیح حاصل تھی، مداہنت اور بے جا رعایت کا دروازہ ان کے نزدیک بالکل بند تھا، سیاسی اتار چڑھاؤ کے بعض مرحلے میں انہیں کانگریس کی شرکت کو تسلیم کیا؛ لیکن مشروط شرکت کے قائل رہے اور جہاں

بھی کانگریس کی پالیسی، دین ومذہب کے خلاف ہوئے، یا مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی اور جانبداری پر قائم ہوئے تو حضرت نے ببانگ دہل کانگریس کی مخالفت کی اور اس میں کسی کی پرواہ نہ کی۔اس کی دسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں، چندایک پیش ہیں:

۱۹۳۷ء میں حکومت بہار نے زرعی انکم ٹیکس کا قانون پاس کیا اور مسلمانوں کی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، مولانا نے اس کی مخالفت کی، مسلم ممبران اسمبلی کے ذریعہ اس کے خلاف اسمبلی میں آواز اٹھوائی، فضا ہموار کی، بالآخر ۲۹/اپریل ۱۹۳۸ء کو اسمبلی میں حکومت بہار نے مولانا کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا اور وقف کی جائیداد کو ٹیکس سے مستثنیٰ کردیا، پھر آپ نے مسلم اوقاف کا ایک بل مرتب فرمایا اور اسے بہار اسمبلی میں پیش کرایا، جو منظور ہوا۔(۱۱)

جب بہار میں گاؤکشی کا مسئلہ اٹھا، تو کانگریس پارٹی کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو رضا کارانہ طور پر اسے تسلیم کرلینا چاہیے اور گائے کی قربانی نہیں کرنی چاہیے، مولانا نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی اور اس پر اپنا ایک تفصیلی فتویٰ تحریر فرمایا، جو مولانا کی فقہی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔(۱۲)

۱۹۳۹ء میں ایک قانون پاس ہوا، جس کی رو سے دین مہر، اور جہیز کو قانونی جرم قرار دیا گیا، مولانا نے اس کی مخالفت کی اور امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ جو اس وقت رکن اسمبلی تھے، کے ذریعہ بہار اسمبلی میں اپنے موقف کی ترجمانی کرائی، بالآخر مسلمان اس سے مستثنیٰ کردیے گئے۔(۱۳)

تیسری مثال: دائرۂ حربیہ کے ناظم:

۱۹۳۰ء میں کانگریس نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا اور اسی سال باضابطہ جنگ آزادی نے ایک نیا موڑ لیا، ضرورت تھی کہ مسلمانوں کی طرف سے بھی، اس مشن کو تقویت پہونچائی جائے، اس کے لیے جمعیۃ علماء ہند نے امروہہ اجلاس میں اس تجویز کو منظور کیا گیا، البتہ حکومت کی سخت نگرانی کی وجہ سے ضرورت تھی کہ خفیہ انداز میں سول نافرمانی کی تحریک چلائی جائے، اس نظام کے لیے دائرہ حربیہ کا قیام عمل میں آیا، یہ دائرہ ایسے سرفروشوں کی رضا کار جماعت تیار کرتا تھا جو ملکی برٹش قوانین کی مخالفت کرکے، زندان بلاخیز کے ظلم وستم برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے، کام بڑا نازک تھا، جمعیۃ میں افراد کی کوئی کمی نہ تھی، لیکن اسی نازک اور اہم کام کی نظامت کے لیے جمعیۃ علماء کی طرف سے جس مدبر اور ذی ہوش قائد کا انتخاب کیا گیا، وہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ ہی تھے۔

چوتھی مثال: ترک موالات کا فتوی:

۱۹۱۶ء میں جب خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی، تو کانگریس نے عدم تشدد کی پالیسی اپناتے ہوئے، انگریزی سامان تجارت کا بائیکاٹ کیا، اس معاملہ میں خلافت کمیٹی بھی کانگریس کی ہم نوا تھی؛ لیکن عام مسلمان اس مسئلہ کو خالص سیاسی سمجھ رہے تھے اور اس تحریک سے زیادہ قریب نہیں تھے، ضرورت تھی کہ مسلمان اس سے وابستہ ہوکر، حکومت پر دباؤ بنائیں، اس موقع پر جمعیۃ علما کی طرف سے ترک موالات کی تجویز پاس کی اور اس کی شرعی حیثیت پر ایک تفصیلی فتوی مرتب کیا، جس میں مسلمانوں سے ترک موالات کا مطالبہ کیا گیا تھا اور اس پر مختلف مکاتب فکر کے پانچ سو علماء نے توثیقی دستخط بھی کیے تھے، یہ فاضلانہ فتوی تیر بہدف ثابت ہوا، اور مسلمان پورے جوش وخروش کے ساتھ، اس تحریک سے وابستہ ہوگئے، یہ فتوی حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے قلم کا شاہکار تھا، حکومت نے فتوی کے غیر معمولی اثرات کو محسوس کرتے ہوئے اسے ضبط کرلیا۔(۱۴)

پانچویں مثال: شعبۂ تبلیغ اسلام کے زیر انتظام ہمہ جہت خدمات:

۱۹۲۲ء میں شدھی تحریک کا آغاز ہوا اور مسلمانوں کے ایمان کو عیسائی مشنریز کے علاوہ برادران وطن کی جانب سے بھی خطرہ لاحق ہوگیا، جس کے نتیجہ میں بڑی تعداد میں، ناخواندہ اور مفلس مسلمان مرتد ہوگئے، اس دعوت ارتداد کی روک تھام کے لیے، جمعیۃ علماء ہند نے مؤثر قدم اٹھایا اور اسی مقصد کے لیے شعبۂ تبلیغ قائم کیا۔

اس شعبہ کی انتظامیہ کمیٹی میں آپ بھی تھے، آپ کو اس شعبہ سے خاص دلچسپی تھی، آپ اس شعبہ کی ترقی اور فعالیت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے، آپ ہی کی تجویز پر الداعی کے نام سے اس شعبہ کا ہفتہ وار ''آرگن'' نکلنا شروع ہوا۔

چھٹی مثال: سائمن کمیشن کی مخالفت:

''ہندوستان کو محدود اختیارات اور آزادی'' کے لیے سائمن کمیشن نام سے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا، اس سلسلے میں اس سے پہلے ''نہرو رپورٹ'' بھی آچکے تھے، جسے مسلمانوں نے مسترد کردیا تھا، سائمن کمیشن کی سفارشات میں بھی مسلم مفاد کی رعایت نہیں کی گئی تھی، قانون ساز اسمبلی کے لیے مسلمانوں کا تناسب کم رکھا گیا تھا، پرسنل لا کے تحفظ اور اردو زبان کا کوئی ذکر نہ تھا، سندھ کو علاحدہ ریاست قرار دینے کے مطالبے کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا، اور متعدد دوسری خامیاں تھیں، جس کی وجہ سے یہ رپورٹ ''نہرو رپورٹ'' سے بھی زیادہ مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول تھی۔

سب سے پہلے جمعیۃ علماء ہند نے لاہور کے اجلاس میں جو ''مولانا انورشاہ کشمیریؒ'' کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا، اس سے اختلاف کیا، مولانا محمد سجاد صاحبؒ اس کی مخالفت کرنے والوں میں پیش پیش تھے اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ آپ کے رفقاء میں قانونی باریکیوں پر آپ سے زیادہ گہری نگاہ رکھنے والا اور کوئی نہ تھا، جریدۂ امارت میں بھی آپ نے اس کے خلاف مضامین لکھائے اور خود ۳۔ جولائی ۱۹۳۰ء کو جمعیۃ علماء صوبہ بہار اور امارت شرعیہ کے زیر اہتمام ''نیشنلسٹ مسلم کانفرنس بہار واڑیسہ'' بلائی، جس کے صدر مجلس استقبالیہ خود مولانا تھے، اس کانفرنس میں سات تجاویز منظور ہوئیں، جن میں سے ایک سائمن کمیشن سے متعلق تھی، پھر ۱۲ و ۱۳ جولائی کو مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے اس کمیشن کے خلاف تفصیلی تجاویز پاس کیں، جس میں رپورٹ کے تمام گوشوں اور مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصانات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ (۱۵)

ساتویں مثال: کمیونل ایوارڈ کی مخالفت:

سندھ اور ممبئی پہلے ایک ہی ریاست تھے، اور مجموعی طور پر یہ ہندو اکثریت والی ریاست تھی، مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ سندھ کو علاحدہ صوبہ تسلیم کرلیا جائے؛ تاکہ اس ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہوجائے؛ مگر ہندو لیڈران اس کے مخالف تھے، ۱۹۳۲ء میں حکومت برطانیہ نے کمیونل ایوارڈ نام سے ایک فارمولہ پیش کیا تھا؛ تاکہ ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسائل کی گتھی سلجھائی جاسکے، اس میں دو تجویزیں مسلمانوں کے خلاف تھیں، ایک تو یہ کہ سندھ کو علاحدہ صوبہ تسلیم نہیں کیا گیا، دوسرے یہ کہ پنجاب میں مسلمانوں کی ۵۶ فی صد آبادی ہونے کے باوجود، سکھوں کو حکومت میں ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی دی گئی جب کہ مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے بہت کم تھی، گویا مسلمانوں کو آئینی اعتبار سے اکثریت تسلیم نہیں کیا گیا۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''سیاسی اعتبار سے یہ بڑا نازک موقع تھا، قوم پرست لیڈران کی زبانیں، مروت میں بند ہو رہی تھیں، مگر جمعیۃ علماء ہند نے اس کی سخت مخالفت کی، مولانا محمد سجاد صاحبؒ اس کی مخالفت کرنے والوں اور اس کے خلاف تحریک چلانے والوں میں سرفہرست تھے، آپ نے اس کے خلاف ایک تفصیلی بیان بھی دیا اور اس کے نقصانات پر بھی روشنی ڈالی''۔ (۱۶)

جمعیۃ علماء کے اجلاس منعقدہ ۲۷ و ۲۸ مارچ ۱۹۳۶ء بمقام دہلی میں، یہ مسئلہ زیر بحث آیا، مولانا بھی اس میں شریک رہے اور اس لڑائی کے روح رواں رہے، بالآخر الہ آباد کی

یونٹی کانفرنس میں کانگریس نے متفقہ طور پر سندھ کو بھی علاحدہ ریاست تسلیم کرلیا گیا اور پنجاب میں ۵۱ فی صد قطعی اکثریت مسلمانوں کی مان لی گئی، افسوس کہ ہندو پاک کی تقسیم نے ان تمام کاوشوں پر پانی پھیر دیا۔(۱۷)

آٹھویں مثال: فرقہ وارانہ مسائل سے متعلق جامع ترین دستور:

فرقہ واریت ملک عزیز کو گھن کی طرح کھاتی رہی ہے، جس سے ہر طبقہ کے مخلص اور ایماندار لوگ پریشان رہے ہیں، اوران کے دستوری حل کے لیے بھی کئی سنجیدہ کوششیں کی گئی ہیں، ۱۹۳۱ء میں فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لیے کانگریس نے قانونی تجاویز مرتب کیں اور ساتھ میں یہ بھی اعلان کیا کہ اگر کوئی اس سے اچھا دستور مرتب کر کے پیش کرسکتا ہے تو پیش کرے، اس موقع پر جمعیۃ علماء ہند نے ایک انتہائی جامع اور متبادل دستور پیش کیا، جس میں پرامن بقائے باہم کے اصول پر عمل کرتے ہوئے، تمام فرقوں کے حقوق کی مکمل رعایت کی گئی تھی، وہ دستور حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ ہی کے اشہب قلم سے تیار ہوا تھا، جسے جمعیۃ کی عاملہ نے منظور کیا تھا۔

نویں مثال: شاردا بل اور مجلس تحفظ ناموس شریعت:

۲۳ستمبر ۱۹۲۹ء کو اسمبلی میں ایک بل پیش ہوا، جس کا مدعا تھا کہ ۱۸سال سے کم عمر میں لڑکے کی اور ۱۶سال سے کم میں لڑکی کی شادی نہیں کی جاسکتی اور جو شخص اس کا مرتکب ہوگا یا اس میں واسطہ بنے گا یا اس کے گارجین جو اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کریں کے ان سب پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ عائد کیا جائے گا، اس قانون سے مسلمانوں کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا، حالاں کہ یہ اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف ہے، مسلمان اس قانون سے چراغ پا ہوگئے اور پورا ہندوستان سراپا احتجاج بن گیا، لیکن اس کے پیچھے جمعیۃ علماء ہند کے اسی شیر کی دہاڑیں اور شبانہ روز کی محنتیں کارفرما تھیں، اس موقع پر جمعیۃ علماء ہند نے مجلس تحفظ ناموس شریعت قائم کی اور حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ اس کے ناظم اور ذمہ دار قرار پائے، اس موقع پر مولانا نے اس مسئلہ کی فقہی، قانونی اور سماجی حیثیت پر مضامین قلم بند فرمائے اور مسلمان کو مشورہ دیا کہ حکومت ان کے مطالبہ کو تسلیم نہ کرے تو وہ سول نافرمانی کی تحریک چلائیں، امارت شرعیہ کے زیر سرپرستی بہار واڑیسہ میں بھی اس کے خلاف زبردست احتجاج ہوا، مولانا نے جابجا اس قانون کی خلاف ورزی کرائی اور کم عمری میں شادیاں کرائیں، مولانا ہی کے ایما پر اس سلسلے میں متحدہ کانفرنس منعقد ہوئی، جو مسلمانوں کے مختلف گروہوں اور مختلف مکاتب فکر کے لوگوں پر مشتمل تھی۔(۱۸)

امر واقعہ یہ کہ حضرت مولانا محمد سجادؒ کی سیاسی بصیرت کے لیے یہ تحریر انتہائی ناکافی ہے اور مولانا

کے فضل وکمال کے احاطہ سے بالکل عاجز ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے ان کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ؎

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

حضرت سید سلیمان ندویؒ سے ان کے انتقال (۱۷/شوال/ ۱۳۵۹ھ، مطابق ۱۸/نومبر ۱۹۴۰ء) کے تعلق سے بالکل صحیح لکھا ہے:

''ان کا وجود گو سارے ملک کے لیے پیام رحمت تھا؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ صوبہ بہار کی تنہا دولت وہی تھے، اس صوبہ میں جو کچھ تبلیغی، تنظیمی، سیاسی و مذہبی تحریکات کی چھل پہل تھی، وہ کل انہی کی ذات سے تھی، وہی ایک چراغ تھا، جس سے یہ سارا گھر روشن تھا، وہ وطن کی جان اور بہار کی روح تھے، وہ کیا مرے کہ بہار مر گیا ؎

مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا

مصادر و مراجع

(۱) مختصر سوانح حیات از حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ، ص۱۲، ۱۳

(۲) مختصر سوانح حیات از حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، ص۱۳

(۳) ایضاً، ص۱۳ و ۱۴

(۴) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، ص۱۲۲ و ۱۲۳

(۵) سید سلیمان ندویؒ، یادِ رفتگاں، ص۲۱۹

(۶) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، ص۱۳۱

(۷-۸) مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، مختصر سوانح حیات، ص۱۹

(۹) مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، مختصر سوانح حیات مولانا محمد سجادؒ، ص۲۶

(۱۰) دیکھیے: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، ص۱۱۶

(۱۱-۱۲) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، ص۱۱۷

(۱۳) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، ص۱۱۸

(۱۴) دیکھیے: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، ص۱۲۴

(۱۵) دیکھیے: وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، ص۱۲۵

(۱۶) دیکھیے: جریدہ امارت، ۲۰۔ جمادی الأولی، ۵۱ھ

(۱۷) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، ص۱۲۶

(۱۸) دیکھیے: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، ص۱۲۷

مفکر اسلام، فقیہ زمانہ
حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ

مفتی رشید احمد فریدی
مدرسہ مفتاح العلوم، تراج، ضلع: سورت (گجرات)

تمهید

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد

کسی فرد انسان کے عبقری شخصیت بننے میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر و توفیق کے بعد اسباب کے درجہ میں یہی نہیں کہ والدین، یا خاندان کی شرافت ونجابت اور دیانت و پاکیزگی کا خاص اثر ہوتا ہے اور بچپن سے اس کا ستارۂ اقبال روشن ہونے لگتا ہے؛ بلکہ میرے خیال میں عبقری شخصیت کی خمیر میں زمینی سعادت اور سعید ارواح کے فیوض بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

اگر یہ بات صحیح ہے اور اہل تاریخ تصدیق کریں گے تو میں بلا تردد کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی باکمال جامع العلوم ومحقق عالم ربانی شخصیت کے ظہور میں سرزمین بہار شریف کی آغوش میں لیٹے ہوئے سلطان المحققین شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کی روحانی توجہ کا ضرور اثر رہا ہے۔

حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی ذات ستودہ صفات کچھ ایسی مقبول واقع ہوئی ہے کہ ہر زمانہ میں آپ کے باطنی اثرات سے قرب وجوار میں مختلف النوع محققین اہل فضل وکمال پیدا ہوتے رہے ہیں؛ اس لیے سب سے پہلے وطن عزیز اور اس کے مضافات پر، نیز یہاں کے مشہور زمانہ چند شخصیات پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے چلیں۔

صوبۂ بہار کا دارالسلطنت (عظیم آباد، پٹنہ) سے جنوب مشرق میں ساٹھ کیلومیٹر کی مسافت پر ایک مردم خیز زمین ''بہار شریف'' کے نام سے مشہور ہے جہاں مسلمان تناسب میں غیر مسلموں سے کم نہیں اس شہر کو معروف مجاہد، فاتح بہار سید ابراہیم غازی شہید عرف ''مَلِک بَیا'' اور مشہور بزرگ معرفت وولایت کے آفتاب اور علم ودانش کے ماہتاب سلطان المحققین حضرت مخدوم الملک

شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے مسکن و مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے، جن کی ذات قدسی صفات سے ولایت کی قندلیں روشن اور علم و تحقیق کے چراغ ہر زمانہ میں ضوفشاں رہتے ہیں۔

بہار کی وجہ تسمیہ اور علم و دانش کی مرکزیت:

''بہار'' بائے موحدہ کے کسرہ اور الف سے پہلے ہائے ہوّ ز اور آخر میں رائے مہملہ ہے، بہار لفظ ''ویہار'' کا تلفظ ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی رقمطراز ہیں: یہ بودھ مذہب کی تعلیمی خانقاہوں کا نام تھا، اس صوبہ میں چونکہ اس مذہب کی تعلیم گاہوں کی کثرت تھی، حتی کہ اس میں قدیم ہندستان کا سب سے بڑا مرکز نالندہ (NALANDA) بھی موجود تھا، جس میں اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد کہتے ہیں کہ بارہ ہزار تک پہنچ جاتی تھی اس مدرسہ، یا اس کے ذیلی مدارس کی وجہ سے بہار کا نام (ویہار) سے بہار ہوگیا، آئین اکبری مولفہ ابوالفضل بن میر مبارک ناگوری میں لکھا ہے ''بہار ہندی دانش (فلسفۂ ہند) کا مرکز رہا ہے؛ بلکہ مآثر الکرام مولّفہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سے معلوم ہوتا ہے کہ بہار کو اسلامی عہد میں اسلامی علوم کی مرکزیت کا مقام حاصل تھا۔''**فسیرو فی الارض فانظروا**''.

بہار شریف اور اس کے مضافات:

اور شہر سے چھ میل کے فاصلہ پر سمت جنوب میں مخدوم الملک حضرت احمد یحیی منیرؒ کی ریاضت گاہ؛ یعنی راجگیر جاتے ہوئے ایک گاؤں ''پنہسہ'' (PANHASA) ہے، جو واقف قوانین شریعت، ماہر اسرار سیاست، محرک جمعیۃ علمائے ہند اور بانیٔ امارت شرعیہ، فقیہ النفس حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی جائے پیدائش اور وطن مالوف ہے اور اسی سمت میں ''کڑا'' نامی ایک بستی ہے، جسے برصغیر ہند و پاک؛ بلکہ علم کی دنیا میں مشہور و مقبول قد آور شخصیت قاضی محبّ اللہ بہاری ''سلم العلوم'' اور مسلم الثبوت'' کے عظیم مصنف کی جائے ولادت ہونے کا فخر ہے اور بہار شریف اسٹیشن کے قریب محلّہ ''چاند پورا'' کے قبرستان میں محوخواب ہیں۔ (مخزن الانساب: ۲۰۰)

اسٹیشن سے بالکل متصل پورب کی طرف جانے والی راہ سے بہار شریف سے تین کوس پر ایک آبادی ''اَستھاواں'' ہے، حضرت مولانا وحید الحق صاحب اسی بستی کے مشہور و مقبول سپوت تھے، جنھوں نے درس نظامی کی تعلیم کے لیے اور تعلیم پانے والوں میں بالخصوص عربی ادب پر مہارت پیدا کرنے کے لیے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے قیام سے قبل ایک ادارہ ''مدرسہ اسلامیہ'' کے نام سے بہار شریف میں قائم کیا، جس کے ایک معلم مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ بھی رہ چکے ہیں۔

اس کے بعد ایک مشہور قریہ ''دسنہ'' (DISNA) ہے، جس کی کوکھ سے یگانۂ روزگار علم و ادب کے شہسوار اور تاریخ ساز عبقری شخصیت سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور ''ارض القرآن'' کے عظیم مصنف حضرت مولانا سید سلیمان ندوی پیدا ہوئے، پلے، بڑھے اور رہے اور آخر میں پاکستان جا کر ابدی نیند سو گئے۔

یہاں سے قدم جب آگے بڑھائیں گے تو کچھ فاصلہ پر سیرت نبوی کی البیلی کتاب ''النبی الخاتم'' اور تدوین حدیث'' کے مصنف، عاشق رسول سلطان القلم حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا وطن عزیز ''گیلانی'' آپ کا استقبال کرے گا، جہاں حضرت اپنے حقیقی بھائی مکارم احسن کے ساتھ اپنے باغ میں تا صبح قیامت آرام فرما ہیں۔ ''گیلانی'' کا مشاہدہ کر کے اسی مشرق کی سمت میں چلیں گے تو علمائے ہند کے ایک مشہور محدث صاحب ''آثار السنن'' علامہ ظہیر الدین شوق نیموی کے مسکن و مدفن پر پہنچ جائیں گے، صاحب آثار کی تحقیقات انیقہ پر وادئ لولاب کا گل لالہ بھی پھڑک اٹھا؛ یعنی علم وتقوی کے کوہ طور اور حدیث وتفسیر کے خاتم المحققین پیکر ادب وسنت علامہ انوار شاہ کشمیری نے علاّمہ ''شوق'' کی مدح میں قصیدہ رقم کر دیا۔

اور بہار شریف سے شمال مغرب میں ۶۰ ر کلومیٹر کے فاصلے پر مردم خیز علاقہ عظیم آباد (پٹنہ) ہے صادق پور اسی کا ایک حصہ ہے، جہاں کے باوقار علماء نے جہاد آزادی میں سب سے زیادہ خون جگر کا نذرانہ پیش کر کے ملتِ اسلامیہ کے لئے آزادی میں پہنچنے کا راستہ ہموار کیا اور اسی عظیم آباد کی سرزمین نے سید شاہ عطاء اللہ بخاری کو وجود بخشا، جن کی شیریں خطابت سے خطبائے زمانہ بھی مسحور ہیں اور دانا پور بھی پٹنہ سے زیادہ دور نہیں، جہاں کی ایک مقبول شخصیت سیرت نبوی کے محقق مولانا عبد الرؤف دانا پوری ہیں، جن کی ''اصح السیر'' سیرت و مغازی کا درس دینے والوں اور طلبۂ حدیث کے لیے اردو میں ماخذ کا درجہ رکھتی ہے، غرض یہ کہ علم وتحقیق کی لہریں اور ولایت ومعرفت کی روشنی جو مخدوم الملک حضرت منیریؒ کے فیوض سے پھوٹ رہی ہے، اس سے اطراف ومضافات میں رہنے والے بتائید الٰہی اپنے ظرف کے حوصلوں کے مطابق فائز المرام ہوتے ہیں۔

مولانا ابو المحاسنؒ کے کمالات کا اجمالی ذکر:

علمائے بہار ہی نہیں بلکہ مشاہیر علمائے ہند میں ایک بلند نام و بالا مقام حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب کا ہے، یہ تو اہل علم جانتے ہیں کہ حجۃ الاسلام سے حضرت مولانا محمد قاسم

نانوتویؒ، شیخ الھند سے حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حکیم الامت سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام سے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الحدیث سے حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، فقیہ الامت سے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، اور ابوالمآثر سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی محدث کبیرؒ مراد ہوا کرتے ہیں، اسی طرح ابوالمحاسن سے حضرت مولانا محمد سجاد بہاری بانی امارت شرعیہ مراد ہوتے ہیں۔

زبان خلق نقارئہ خدا :اصحاب علم وفضل کی زبان پر حضرت بانی امارت شرعیہ کے لیے ''ابوالمحاسن'' کا ذکر اللہ کی طرف سے عنایت کردہ متعدد اوصاف وکمالات کا اجمالی اعترف واظہار ہے، اس لفظ کا مفہوم صاحب الکمالات یعنی اوصاف وخوبیوں والا ہے۔قرآنی تعبیر میں اگر کہا جائے تو آپ ''راسخین فی العلم'' میں سے تھے، چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ لکھتے ہیں کہ ''مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے لئے یہی لقب یعنی ''عالم راسخ'' زیب دیتا ہے؛ کیوں نکہ رسوخ فی العلم کے مدحی ووصفی لفظ میں کمیت وکیفیت دونوں کا اظہار ہے، توسع کے ساتھ تعمق بھی ہے، معرفت کے ساتھ اتقان بھی ہے، حقیقت کے علم واظہار کے ساتھ احتیاط وحکمت بھی اور حدیث شریف کی تعبیر میں آپ ''فقہاء العابدین'' میں سے تھے اور ''فقیہ عابد'' وہی ہوسکتا ہے، جو جمیع علوم کا ماہر اور عبدیت میں کامل ہو، جیسا کہ مولانا ابوالمحاسن جامع العلوم بھی تھے؛ بلکہ شروع میں اہل علم کے درمیان اسی لقب سے معروف تھے اور صفات عبدیت سے بھی اللہ نے متصف فرمایا تھا۔

رسوخ فی العلم اور فقھی بصیرت:

اور اسمیں کوئی شک نہیں اور نہ کسی کو اس میں اختلاف ہے کہ آپ کو علوم شرعیہ وعقلیہ میں درک وبصیرت، گہرائی وگیرائی حاصل تھی، بالخصوص آپ کی فقہی بصیرت اس درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی، جو کسی مجتہد کو حاصل ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ خاتمۃ المحققین علامہ زمانہ انور شاہ کشمیریؒ فقہائے متأخرین میں سے علامہ کا سانی، صاحب البدائع کو''فقیہ النفس'' کہتے تھے اور اکابر علماء دیوبند میں سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے متعلق فرماتے تھے کہ وہ فقیہ النفس تھے اور پھر اپنے معاصر حضرت مولانا ابوالمحاسن کے متعلق متعدد بار فرمایا کہ وہ فقیہ النفس ہیں؛ یعنی فقہ کی روح تک ان کی رسائی ہے، چنانچہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی فرماتے ہیں کہ ہفتوں کتابوں کو دہراتے دہراتے جس نتیجے تک ہم پہونچتے، تحقیق وجستجو کی آخری حد پار کرکے وہاں مولانا محمد سجاد

سوال سن کر پہلے لمحے میں جواب دیدیتے تھے۔ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ مذکورہ جملہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ابوالمحاسن کے فقیہ النفس ہونے کی دلیل ہے، گویا ذہنی سانچہ ہی انکا فقہ میں ڈھلا ہوا تھا، چنانچہ وقت کے سارے ہی اکابر نے آپ کے اس کمال کا اعترف کیا ہے۔

فقہی بصیرت کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کم از کم خطبۂ صدارت مراد آباد کا مطالعہ اہل علم کے لیے ذہن کشا اور روح افزا ثابت ہوگا، یہاں صرف ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

''موالات کے دو معنی ہیں: ایک معنی محبت ومودت اور پھر محبت کی دو جہتیں ہیں: ایک دینی و مذہبی، دوسری دنیاوی اور محبت دنیاوی کی بھی دو صورتیں ہیں: اختیاری واضطراری، الغرض کافر کے ساتھ محبت کی تین صورتیں ہیں: نمبر ایک دینی محبت من جہۃ الدین؛ یعنی کسی کافر کی دوستی اس طرح پر ہو کہ اس کے دین و مذہب کو پسند کیا جائے تو یہ عین کفر ہے۔ نمبر۲: محبت من جہۃ الدنیا ہو اور اختیاراً ہو؛ یعنی کسی کافر کے ساتھ دلی محبت ہو؛ مگر نہ اس جہت سے کہ اس کے دین کو اچھا سمجھتا ہو؛ بلکہ کسی دنیاوی وجہ سے محبت ہو؛ مگر یہ دنیاوی اختیار کی ہوئی محبت؛ یعنی اپنی خواہش واعتبار سے کسی کافر سے کوئی دنیاوی مقصد اور غرض کے حصول کے لئے محبت کرتا ہو اور فطری اسباب اس محبت کے پیدا ہونے کے لیے موجود نہ ہوں تو یہ محبت بھی حرام ہے؛ مگر کفر نہیں۔ نمبر۳: محبت من جہۃ الدنیا؛ مگر اضطراراً ہو اور اس محبت کا سبب غیر اختیاری ہو، جیسے کسی مسلمان کا باپ، یا بھائی کافر ہو اور بسبب رشتہ داری اور قرابت کے مسلمان کے دل میں کافر باپ بھائی کی محبت ہو تو یہ محبت جائز ہے، بشرطیکہ اس دلی محبت کا اثر مسلمان کے ایمان پر نہ پڑے۔

محبت کی پہلی صورت؛ یعنی من جہۃ الدین اور دوسری صورت؛ یعنی من جہۃ الدنیا اختیاراً کا جو حکم بیان کیا گیا ہے، وہ کافر کے ساتھ یکساں اور برابر ہے، عام ازیں کہ کافر محارب ہو، یا غیر محارب اور یہ حکم دوامی اور بہر حال ہے؛ لیکن محبت کی تیسری قسم؛ یعنی محبت من جہۃ الدنیا اضطراراً اس میں محارب اور غیر محارب میں فرق ہے، وہ یہ کہ غیر محارب کے ساتھ تو یہ محبت جائز ہے؛ لیکن محارب کے ساتھ یہ محبت بھی حرام ہے۔ (مجادلہ:۲۸)

اور موالات کے دوسرے معنی نصرت اور مدد کے ہیں، جس کا تعلق افعال و جوارح سے ہے، دل سے اس کو کوئی سروکار نہیں، اس معنی کے اعتبار سے کافروں کے ساتھ موالات کرنے کے متعلق شرعی احکام مختلف احوال اور مختلف اسباب اور مختلف مقتضیات کی وجہ سے مختلف ہوتے

ہیں۔(خطبہ صدارت ۴۹)

مولانا ابو المحاسن کے صفات عالیہ:

بے مثال تدریس، ملکہ افراد سازی، کمال استحضار، ذہانت و ذکاوت، زہد وقناعت کمال استدلال، جذبۂ خدمتِ خلق، اولوالعزمی، تبحر علمی، سیاسی بصیرت، ایمانی فراست، جرأت وحق گوئی، دینی حمیت وغیرت، سادگی و جفاکشی، ایثار و وفاداری، خلوص وللّہیت، ہمدردی وغمگساری، تواضع وانکساری، اور فلاح امت کی فکر، اصابت رائے اور اتباع شریعت، انابت الی اللہ، مجتہدانہ دماغ، مفکرانہ قلب، حکیمانہ زبان، مجاہدانہ قدم، مشفقانہ ہاتھ، مربیانہ مزاج، غرضیکہ قائدانہ تمام صلاحیتوں سے اللہ نے آپ کو متصف فرمایا تھا۔ان صفات میں سے کون سی صفت ہے، جس میں حضرت مولانا ابوالمحاسنؒ کا جوہر کمال علمائے ہند نے نہ دیکھا ہو، یا نہ سنا ہو۔

ولیس علی اللّٰہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد.

حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی دامت برکاتہم نے تقریبا ۲۰ رسال قبل ملک کے بہت سے اہل علم کے مجمع میں فرمایا تھا: راقم ہی نہیں، ہر شریک مجلس کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ حضرت مولانا محمد سجاد (کہ جنہیں بے شمار محاسن وکمالات کے جامع ہونے کی وجہ سے ابوالمحاسن کا لقب سب سے زیادہ زیب دیتا ہے) کے حسن وجمال کے کس پہلو کو ذکر کے لئے منتخب کیا جائے ؟ کیوں کہ ’’دامن نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار‘‘ والی صورت پیش آتی ہے۔

تدریس کی خلوت سے سیاست کی جلوت تک:

غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کی طرف سے اسلام کو نقصان پہونچانے والے واقعات مسلسل پیش آرہے تھے مثلاً قادیانیوں کی فتنہ انگیزی، پادریوں کی عیسائی تبلیغ، آریہ سماجیوں کی تنقید اور حکومت کے خیرخواہ نادان مسلمانوں کی افتراء پردازی اور دنیا وی اعتبار سے معاشی واقتصادی زبوں حالی سے مسلمان مذہبی اور ذہنی انتشار کا شکار تھے۔ان حالات کا علم آپ کو براہ راست اور بالواسطہ زمانۂ تدریس میں ہوتا رہتا تھا انہی حالات نے مولانا کے دل ودماغ کو مہمیز لگایا اور آپ کی روح ایمانی کو جھنجھوڑ دیا بالآخر آپ نے تدریس کی خلوت و عافیت پر امت کی شیرازہ بندی اسلام اور احکام اسلام کے تحفظ کے لیے سیاست شرعیہ کے میدان میں سرگرداں رہنے اور خدمت خلق کے لئے بامشقت زندگی گذارنے کو ترجیح دی۔

تحریک سید احمد شہید سے قیام دار العلوم دیوبند تک :

ہند کی سرزمین عہد اسلامی میں جتنی شاداں وفرحاں تھی انگریزوں کے ناپاک قدم کے آنے اوران کے تسلط کے بعد گریاں اور نالاں ہوگئی اس کے آنسوؤں کو پونچھنے اور سسکیوں کو روکنے کے لیے ہند کے متعدد سپوتوں اور جیالوں نے بےانتہا قربانیاں پیش کی ہیں جیسے: سید احمد شہید، مولانا اسماعیل شہید، سلطان ٹیپو شہید اور شاملی کے جانباز سپاہی حضرت حافظ ضامن شہید کے علاوہ حضرت نانوتوی وگنگوہی اور سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی اعلائے کلمۃ اللہ کی قربانیاں؛ مگر تقدیر الٰہی سے اسلام کو سلطنت کے تخت تک پہونچنے کی تدابیر ناکام ہوئی تو پھر اسلام وشریعت کے تحفظ کے لیے ساکت وناطق تحریک ''دارالعلوم دیوبند'' بتائید خداوندی قائم ہوئی جس سے اسلام کو بقا اور استحکام نصیب ہوا؛ مگر اعدائے اسلام نے مسلمانوں کی اجتماعیت اور اتحادی طاقت کو توڑنے کے لیے مختلف سنگین منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا؛ تاکہ مسلمانوں کے ذہنوں سے سلطنت وامارت کا نشہ بالکل اتر جائے اوران کا شیرازہ اس قدر بکھر جائے کہ باہم دست وگریباں ہوکر اسلام کے احکام پر عمل پیرا رہنے کا جذبہ سرد پڑ جائے۔

اسلامی سلطنت کے قیام کی تدابیر:

ان حالات کے پیش نظر اپنی عظمت رفتہ کو واپس لوٹانے، یا کم از کم اپنے تشخص کو محفوظ رکھنے کے لیے کبار علمائے ہند مختلف تدابیر اختیار کر رہے تھے، ان میں سب سے اہم شیخ العرب والعجم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ کی ''تحریک ریشمی رومال'' تھی، جو تقدیر الٰہی سے حضرت شیخ الہند کی اسارت مالٹا پر ختم ہوگئی۔ اگرچہ تحریک آزادی کے لئے علمائے ہند کا نشہ وہ نہیں تھا، جسے ترشی اتار دے تو دوسری تحریک جس سے مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہوسکے اور اختلاف مذاق کے باوجود تمام مسلک کے مسلمان اسلام کے نقطۂ وحدت پر مجتمع ہوسکیں، اس کے لیے ''تحریک خلافت'' شروع کی گئی، جس کے اصل محرک حمیت دینی سے سرشار اور غیرت ایمانی سے لبریز حضرت مولانا ابوالمحاسنؒ تھے، آپ نے سب سے پہلے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں لکھنؤ میں خلافت کمیٹی قائم فرمائی، اس کے بعد دہلی میں پھر تو ملک کے طول وعرض میں بہت تیزی سے خلافت کمیٹی قائم ہونے لگی؛ مگر ایک مدت کے بعد اس تحریک کو بھی اعدائے اسلام نے نیم مردہ کردیا، جس سے علمائے ہند کا مقصود حاصل نہ ہوسکا تو اب علمائے ہند کی پوری توجہ تحریک آزادی پر مرکوز ہوگئی کہ آزادی کے بعد اسلام محفوظ ہوسکے گا۔ (ان شاء اللہ)

تحریک آزادی میں اتحاد کی تجویز:

مگر انگریزی حکومت کی جڑ اتنی مضبوط ہوچکی تھی کہ جس کا اکھاڑ پھینکنا صرف مسلمانوں کے بس میں نہ تھا، چنانچہ اتحاد بین المسلمین والمشرکین کی تجویز پیش ہوئی، اتحاد کی اس تجویز اور اس کے حدود شرعی کی تعیین کرنے والوں میں دراصل حضرت مولانا ابوالمحاسن ہی پیش پیش تھے، چنانچہ کانگریس کے ساتھ اتحاد کی لہر پورے ملک میں تیزی سے پھیل گئی اور اب آزادیٔ ہند کی تحریک میں ایک نئی زندگی اور حرارت پیدا ہوگئی اور روز افزوں آزادی کے متوالوں کا کارواں عزم و ہمت کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔

قائدانہ شخصیتیں:

عمومی ماحول میں کچھ ایسے باتوفیق بندگان خدا بھی ملک میں تھے، جو اپنی ذات سے بلند ہو کر اپنی برادری اور قوم کے لئے اقتصادی و دینی اصلاح و ترقی کا فکر لے کر کھڑے ہو گئے اور آزادیٔ ھند کی جد و جہد کے ساتھ اپنی اصلاحی تحریک میں آگے بڑھتے رہے اور کچھ مخصوص اللہ کے بندے ایسے تھے جو اپنے علاقے اور برادری کی صلاح و فلاح کی سطح سے بلند ہوکر پورے ملک کے مسلمانوں کی دنیوی و اخروی کامیابی کے لیے ملک گیر پیمانہ پہ غور وفکر اور اعدائے اسلام کے نرغہ میں ہوتے ہوئے تدابیر و مساعی کی راہ سے قوم مسلم کی قیادت کررہے تھے، انہیں باتوفیق قائدین ملت میں ایک عبقری شخصیت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی تھی۔

مولانا ابو المحاسن کا تصور اتحاد:

حضرت مولانا کے نزدیک مسئلہ صرف اعتاق رقبہ (یعنی آزادیٔ ہند) کا نہ تھا؛ بلکہ حصول آزادی کے بعد اسلام اور احکام اسلام کا تحفظ اور مسلمانوں کے اسلامی تشخص کی بقا کا تھا، مسلمانوں کے دینی افتراق و انتشار اور دنیاوی اقتصادی زبوں حالی کے پیش نظر حضرت مولانا ابوالمحاسنؒ اپنی خداداد صلاحیتوں؛ یعنی دینی غیرت و حمیت، ایمانی فراست، علمی و فقہی بصیرت، ملکی اور عالمی سیاست پر عمیق نظر اور فلاح امت کے لیے غور وفکر سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسلام اور احکام شریعت کے تحفظ کا واحد راستہ اتحاد مسلمین ہے اور اتحاد کا راز دلائل شرعیہ کی روشنی میں ''امارت وخلافت'' میں مضمر ہے، مولانا کے اس تصور اتحادِ امت کو سمجھنے کے لیے اسلام کا تصور اجتماعیت ملاحظہ فرمایئے۔

اسلام کا نظریۂ اجتماع و اتحاد:

کسی کام کو انجام دینے کی عقلاً وفطرةً دو صورتیں ہیں: (۱) انفراداً کیا جائے (۲) یا اجتماعاً؛

یعنی چند افراد مل کر کریں۔

دوسری صورت میں تعاون اور سہولت ہوتی ہے، انسانی زندگی کے تمام کاموں میں اسی طریقہ کار کے دونوں پہلوؤں کا مشاہدہ روزمرہ ہوتا رہتا ہے اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اور انسانی فطرت کی اس میں پوری رعایت رکھی گئی ہے؛ اس لیے اسلام نے اپنے احکام واعمال میں مذکورہ دونوں پہلوؤں کو اختیار کیا ہے، البتہ متعدد آیات وروایات سے یہ حقیقت واضح ہے کہ عبادات ومعاشرت اور معاملات وغیرہ میں اجتماعی حیثیت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، چنانچہ نماز میں جماعت کی فضیلت وتاکید، جمعہ وعیدین میں جمعیت کی خاص رعایت، افعال حج میں اجتماع کا مظاہرہ، جہاد میں اجتماع واتحاد کی ضرورت، سفر میں جماعت کے فوائد اور امارت کی تاکید، ذکر وتلاوت میں اجتماع کی فضیلت، استسقا میں جم غفیر کو مجتمع کرنا؛ بلکہ دین کے اکثر ہی شعبوں میں اسے فوقیت دی گئی ہے، معاشرت بالخصوص نکاح سراسر اجتماع پر مبنی ہے اور معاملات میں بھی یہ روح کارفرما ہے۔غرض دین کے تحفظ وبقا اور تبلیغ واشاعت میں اجتماعی شکل بطور خاص ملحوظ ومطلوب ہے، حتیٰ کہ جماعت واجتماع کی بعض خرابیوں کو انفرادی اچھائیوں کے مقابلہ میں نظر انداز کرنے کی فہمایش کی جاتی ہے؛ تاکہ روح اتحاد میں فرق نہ آئے۔مزید اس پر غور فرمایئے کہ ان احکام کی انجام دہی کی شکلوں کو کہیں امامت کے ماتحت کیا تو کہیں امارت سے وابستہ کیا ہے، کہیں ذمہ دار کو راعی سے تعبیر کیا تو کہیں عریف سے اور کہیں دوسرے القاب سے۔

حاصل یہ ہے کہ دین اسلام کا مزاج ترتیب وتنظیم ہے؛ یعنی اسلام اپنے ماننے والوں کو مرتب ومہذب اور منظّم رکھنا چاہتا ہے، چنانچہ تدبیر منزل سے لے کر سیاست مدنیہ تک کے شرعی اصول کو پیش نظر رکھئے اور عبادات ومعاشرت کی مشروعی ہیئت اور اس کی ہدایات پر غور فرمایئے، ہر جگہ جمع واجتماعیت اور اتحاد کی روح امامت وامارت کے ماتحت حرکت کرتی نظر آئے گی اور اسی وجہ سے شرعِ متین نے ''اجماع'' کو ایک مستقل دلیل اور حجت تسلیم کیا ہے، ''**لن یجتمع امتی علی ضلا لۃ**'' اور سوادِ اعظم یعنی اہل السنّت والجماعۃ کی اتباع کو لازم قرار دیا۔

خلاصہ یہ کہ اسلام اپنے احکام میں اجتماع کا اسلئے داعی ہے؛ تاکہ مسلمانوں کا باہمی اتفاق واتحاد قائم رہے اور قوت اتحاد سے اسلام کا تحفظ ہوا کرے اور یہی اجتماع واتحاد اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کو کھینچنے والی ہے۔قرآن پاک میں ہے: **ید اللّٰہ فوق ایدیھم** اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''**یداللّٰہ علی الجماعۃ**'' جیسے الفاظ سے اسی مقصود کا اظہار فرمایا ہے۔

مولانا ابو المحاسن اور امارت کی ضرورت:

شریعتِ اسلام کے اس منشا کو پورا کرنے کے لیے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ''امارت'' علی حسب الشرع کی ضرورت ہے؛ مگر مسلمانوں کو وہاں قدرت نہیں ہے، جہاں وہ اپنی سلطنت کھو چکے ہیں، یا قبائے خلافت چاک کر چکے ہیں اور اعدائے اسلام کا غلبہ وتسلط براہ راست یا بالواسطہ قائم ہو چکا ہے۔ حالات کے تناظر اور آئندہ قائم ہونے والی جمہوری حکومت کے مزاج اور طریقۂ کار سے حضرت مولانا ابوالمحاسنؒ نے ایمانی فراست، سیاسی بصیرت، خداداد ذکاوت سے شرعی احکام کی حیثیت خاصہ اور ہیئت عامہ کے حق میں مستقبل کے خطرات کو جتنا سمجھا اوراس کے تحفظ کے لیے جتنا کر سکتے تھے، وہ کرگذرے، جب کہ دوسرے حضرات علماء نے قیام دار العلوم دیوبند کے بعد ملی اعتبار سے جمعیۃ علماء کی تحریک پر اکتفا کر لیا اور حضرت موالانا ابو المحاسن نے علماء کے اتحاد کو ایک راہ اور وسیلہ سمجھا اور اس سے آگے کی منزل کی تلاش اور جدوجہد جاری رکھی۔

چنانچہ ''امارت''، جس منزل کا نام ہے اس تک پہونچنے کے لیے ''جمعیۃ علماء'' کی تنظیم ضروری ہے، جس کا پہلا زینہ ''انجمن علمائے بہار'' اور دوسرا زینہ جمعیۃ علمائے ہند ہے، اگر چہ یہ بھی تحریک اتحاد کا ایک باوقار مضبوط حصہ ہے؛ مگر حقیقت میں ہم ابھی راہ میں ہیں، منزل کی یافت نہ ہوسکی ہے اور جو مقاصد شرعیہ ''امارت'' کے وجود سے انجام پاتے ہیں، ہنوز تکمیل کے منتظر ہیں، **لعل اللّٰہ یحدث بعد ذلک امرا.**

امارت شرعیہ حقیقہ اور صوریہ کا فرق:

امارت علی حسب الشرع جس میں امیر کو قوت حاکمہ اور قاضی کو قوت نافذہ ملزمہ حاصل ہوتی ہے، یہاں انگریزی حکومت میں یا آئندہ جمہوری حکومت میں قائم نہیں ہوسکتی؛ اس لیے کہ مسلمانوں کو اس پر قدرت نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ امارت علی حسب الشرع حکومت وقت کے متوازی حکومت کی طرح ہے اور ایک ملک میں دو متوازی (متقابل) حکومت جمع نہیں ہوسکتی؛ لیکن بتقاضائے عقل **ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ** کچھ یافت کی شکل ہونی چاہیے اور ﴿**لا یکلف اللّٰہ نفسا الا وسعھا**﴾ کے پیش نظر مسلمان اپنے دین واحکام کے تحفظ وبقا کے اپنی استطاعت کے بقدر مکلّف ہیں؛ اس لیے امارت علی حسب الوسع جس میں ''امیر'' قرآن وحدیث کے بموجب مطاع تو ضرور ہوگا، البتہ اس کے خلاف کرنے والے کو شرعاً باغی نہیں کہا جائے گا اور قاضی کا فیصلہ

شرعاً نافذ العمل ہوگا اگر چہ قاضی کو قوت ملزمہ حاصل نہیں ہے؛ لیکن فیصلہ پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے یقیناً گنہگار رہوگا۔ بہر حال ''امارت شرعیہ'' حقیقیہ نہ سہی بطور بدل امارت شرعیہ صوریہ کے قیام سے بہت سے فوائد وابستہ اور خطرات سے حفاظت کا ظن غالب ہے، سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق واتحاد کی فضا باقی رہے گی اور یہی قوت اتحاد اسلام وشریعت کے تحفظ کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوگا اور وہ خطرات جواب رونما ہورہے ہیں جسے مولانا ابوالمحاسنؒ آزادیٔ ہند سے بہت پہلے محسوس فرمارہے تھے، اس سے حفاظت کا سب بڑا سامان یہی قوت اتحاد ہے، جو امارت کے ذریعہ قائم رہتی ہے اور موجودہ زمانہ میں متعدد مسلم تنظیمیں ہیں اور ہر ایک کے صدور ونظما ہیں اور ضرورت پر ہر تنظیم اپنے مختلف انداز میں حفاظت اسلام کے لیے کوشاں بھی ہوتی ہے؛ مگر ان **سعیکم لشتیٰ** کا مصداق ہوکر کما ینبغی کامیابی سے سرفرازی نہیں ہوتی، نیز سعی ومحنت میں اپنی تنظیم کی اقبال مندی اور عندالناس پذیرائی کا تصور بھی شامل ہوتا ہے، جب کہ قیام امارت کی صورت میں تحفظ کی تمام جدوجہد محض دین کے لیے ہوتی۔ خیر

اجتماعی نظام کی شکل امارت شرعیہ ہے:

حضرت مولانا ابوالمحاسن کے بہت سے کارناموں میں دو اہم کارنامہ ہے، جوان شاء اللہ حقیقی امارت قائم ہونے تک امت مسلمہ کے لیے نافع اور آپ کے لیے صدقۂ جاریہ رہے گا۔ (۱) جمعیت علماء کا قیام (۲) امارت شرعیہ کی بنیاد؛ لیکن امارت کی ضرورت کو سمجھنے کے لیے پہلے اسلام کے مزاج اور احکام شرعیہ کی روح کو سمجھنا ہوگا، جس کی ایک ادنیٰ جھلک اوپر ''اسلام کا نظریۂ اجتماع واتحاد'' میں بتائی ہے، حضرت مولانا سید نظام الدینؒ فرماتے ہیں: مسلمانون کے سارے مسائل اور مشکلات کا حل یہی ہے کہ وہ کلمہ واحدہ کی بنیاد پر ایک امیر شریعت کے گرد جمع ہوجائیں اور ایسا مضبوط اجتماعی نظام قائم کریں، جس سے ان کی آواز کو طاقت حاصل ہو اور وہ اپنے مسائل ومشکلات کو اپنی ایمانی صلاحیت اور طاقت سے خود حل کرسکیں۔

حضرت مولانا ابوالمحاسنؒ فرماتے تھے: ''آج جب کہ انگریز کا دور ہے، امارت شرعیہ کی ضرورت واہمیت لوگوں کو سمجھ میں نہیں آرہی ہے؛ لیکن جب ملک آزاد ہوگا اور یہاں جمہوری نظام قائم ہوگا تو اس وقت مسلمانوں کو اپنے اجتماعی نظام کی ضرورت سمجھ میں آئے گی''۔

کل ہند امارت پر علماء کا اتفاق:

بہر حال انجمن (جمعیت) علماء بہار سے لے کر جمعیۃ علماء ہند کے مراحل سے گذر کر امارت

شرعیہ فی الہند یعنی کل ہند امارت کے بنا وقیام کے لیے حضرت مولانا ابوالمحاسن نے اپنے خداداد علم وحکمت سے مختلف مکتب فکر کے اہل علم کو تیار کرلیا۔ متبحرین علماء میں سے ایک مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ مولانا آزاد اس زمانہ میں ''حزب اللہ'' کی تنظیم بنانا چاہتے تھے، اتفاق سے آپ اس زمانہ میں رانچی جیل میں نظر بند تھے، جناب قاضی سید احمد حسین گیاویؒ نے مولانا آزاد کے ''حزب اللہ'' کا تذکرہ مولانا ابوالمحاسن سے کیا تو مولانا ابوالمحاسن نے فرمایا کہ ''شریعت میں تنظیم اسلامی کا اصول ''امارت'' ہے، اس بنیاد پر نظم کرنا بہتر ہے، قاضی صاحب نے یہ بات مولانا آزاد تک پہونچائی تو مولانا آزاد نے مولانا ابوالمحاسنؒ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، جب آپ کو مولانا آزاد کی خواہش کا پتہ چلا تو خود ہی رانچی جیل حضرت مولانا ابوالکلام سے ملاقات کے لئے پہنچ گئے اور آپس میں جو بھی علمی مذاکرہ ہوا، بہرحال مولانا ابوالکلام بھی امارت کے قائل ہوگئے اور پرچہ ''الہلال'' کے ذریعہ ''امارت'' کے مبلغ بن گئے۔ متبحرین علماء میں سے ایک حضرت شیخ الہندؒ تھے، چنانچہ جب شیخ الہند مالٹا سے رہا ہوکر تشریف لائے تو مولانا ابوالمحاسن نے حضرت شیخ الہند کے سامنے امارت شرعیہ کے قیام کی تجویز پیش کی تو حضرت شیخ الہندؒ نے اس تجویز کو پسند فرمایا اتنا ہی نہیں ؛ بلکہ اہل حدیث کے بڑے عالم مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی بھی امارت کے قائل ہوکر مولانا محمد سجاد کے ہم نوا ہوگئے، اسی طرح بریلوی مکتب فکر کے بڑے عالم مولانا ظفیر الدین نے بھی اپنی حمایت پیش کی۔

غرض یہ کہ مولانا ابوالمحاسن نے پورے ملک کے تمام کبار علماء سے گفتگو، یا خطوط کے ذریعہ کل ہند امارت کے قیام کی ضرورت، اس کے اغراض ونتائج وغیرہ پیش فرمائے اور سب نے شریعت کی روشنی، حالات کے تقاضے اور مستقبل کے خطرات کے پیش نظر اتفاق رائے کا اظہار فرمایا، جب پورا میدان ہموار ہوگیا تو اب صرف امیر کے انتخاب کا اہم مرحلہ تھا، چنانچہ حضرت شیخ الہند کی رہائی کے بعد جمعیت علماء ہند کا دوسرا اجلاس دارالسلطنت دہلی میں ہونا طے پایا تھا، جمعیت کے روح رواں اور جمعیت کے دماغ خود حضرت مولانا ابوالمحاسن ہی تھے، اس اجلاس میں ''امیر'' کا مسئلہ طے ہونے والا تھا اور اجلاس سے قبل حضرت شیخ الہند نے یہاں تک فرمایا تھا کہ اس اجلاس میں ملک کے ذمہ دار علماء اور ارباب حل وعقد جمع ہیں امیر الہند کا انتخاب کرلیا جائے، پہلا شخص میں ہوں گا، جو اس امیر کے ہاتھ پر بیعت کرے گا؛ مگر سوئے اتفاق حضرت شیخ الہند کی طبیعت بہت زیادہ علیل تھی، آپ صاحب فراش ہوگئے تھے، جس کی وجہ آپ شریک اجلاس نہ ہوسکے؛ اس لیے اجلاس تو ہوگیا؛

مگر امیر کا انتخاب اختلاف کی وجہ سے نہ ہوسکا۔

امارت شرعیہ بہار کا قیام ایک مجددانہ کارنامہ:

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے جب دیکھا کہ کل ہند طریقہ پر امارت کے قیام پر سب متفق ہیں؛ مگر امیر کا انتخاب مشکل ہے تو پھر آخری درجہ میں مولانا آزاد کی صدارت میں امارت شرعیہ بہار قائم فرما کر امت مسلمہ کے سامنے ایک بے مثال نمونہ قائم فرما دیا۔ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ لکھتے ہیں: ان کا سب سے روشن کارنامہ اور ایک مجتہدانہ و مجاہدانہ اقدام بہار میں امارت شرعیہ کا قیام تھا، اس دور میں جس میں انگریز قانون کا کابوس قائم کر چکا تھا، یہ مجتہدانہ بصیرت اور ضرورت شناسی کا کارنامہ ہے۔

سمینار کا مقصد:

مفکر اسلام، حضرت مولانا ابوالمحاسن صاحبؒ کی قائم کردہ جمعیۃ علماء ہند پر شمسی اور قمری اعتبار سے اور امارت شرعیہ کے قیام پر اسلامی اعتبار سے ایک صدی پوری ہو رہی ہے، سو سال کے بعد جمعیۃ علماء ہند اپنے ایک بانی و مؤسس کے کارناموں پر سمینار منعقد کر رہی ہے، اللہ تعالیٰ جمعیۃ علماء کی تحریک کو پائندہ اور تابندہ رکھے، یہ وقت اور حالات کے تقاضے پر اٹھایا گیا، ایک مبارک قدم ہے، اللہ تعالیٰ جمیع اکابر اور اراکین کو قبولیت سے نوازے، البتہ سمینار منعقد کرنے کا منشا میں نہیں سمجھتا کہ فقط ان کے کارناموں کا ذکر کر کے انہیں خراج عقیدت پیش کرنا ہے؛ بلکہ میرے خیال میں یہ مقصد بھی نہیں ہے کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن جن اعلی صفات کے حامل اور قائدانہ کردار کے مالک تھے ان صفات و کارناموں کے ذکر سے اپنے قلب و دماغ کو قوت پہونچائیں اور امت کے لیے کچھ کرنے کے جذبہ کو مہمیز لگائیں؛ بلکہ درحقیقت اس سے بھی اعلیٰ مقصد یہ ہو کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن جس مجتہدانہ بصیرت، قائدانہ صلاحیت کے ذریعہ مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی کی راہیں ہموار کر کے مختلف جماعتی اکائیوں کو امارت کی ''وحدت'' میں پرو کر اتحاد بین المسلمین کی قوت کو پروان چڑھانا اور اسلام و احکام شرع کا تحفظ اور عملا اس کے نفاذ کی بنیاد قائم کرنا چاہتے تھے؛ مگر تقدیر الٰہی سے آپ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا؛ لیکن جتنی ضرورت اس وقت تھی موجودہ حالات میں ضرورت کم نہیں ہوئی بلکہ شاید بڑھ گئی ہے میں سمجھتا ہوں کہ ارباب و اکابر جمعیت کے پاکیزہ قلوب میں ملت اسلامیہ کے تحفظ کے تعلق سے جو عزائم گردش کرتے ہونگے جمعیت علمائے ہند کے دماغ یعنی حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی قائدانہ کردار

کی روشنی میں پھر کوئی متحدہ محاذ کی تلاش ہو جس میں تمام مسلم تنظیمیں بشاشت ومطاوعت کے ساتھ شامل ہوں اور ابوالمحاسن جیسا نہ سہی مگر زمانہ کے اعتبار سے مفکر ومدبر ہو، ماہر سیاست ہو جری و مخلص ہو، تاریخ قوانین عالَم سے واقف ہو حکم ومصالح سے باخبر ہو، احکام فقہیہ پر عبور ہو، دینی حمیت وغیرت سے سرشار ہو، ایسے فرد کو تلاش کر کے پیشوائی کا قلادہ اس کے گلے میں ڈال دیا جائے؛ تاکہ عامۃ المسلمین کے اتحاد سے مسلمانوں کے جمیع مسائل کا تحفظ ہو سکے۔

اگر یہ مقصد عظیم ہے تو بہت مبارک قدم ہے اور حزم وجزم وعزم کے ساتھ پیش قدمی کی ضرورت ہے، تا آنکہ مختلف تنظیموں کے اجتماع سے قوت اتحاد اس قدر حاصل ہو جائے کہ اعدائے اسلام کسی قسم کا رخنہ یا دخل اندازی نہ کر سکیں، پھر اللہ کی ذات سے امید ہے کہ کم نہیں تو چالیس سال اور زیادہ سے زیادہ ستر سال گذرتے گذرتے ضرور اس محنت کا ثمرہ آئے گا اور مسلمان اسلام کے شجر طوبی کے سائے تلے ٹھنڈی سانس لیں گے، ان شاء اللہ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ فقط

حضرت ابوالمحاسن کے محاسن تحریری

مفتی محمد شاہد قاسمی

استاذ حدیث: دارالعلوم سعادت دارین سٹپون، بھروچ (گجرات)

سروقامت، چھ فٹ تقریباً لمبا قد، دبلا پتلا جسم، لمبا چہرہ، کشادہ جبیں، چوڑا دہانہ، لمبی اور کچھ اونچی ناک، زبان بے باک، محبت سے بھری متوسط آنکھیں، ریشمی بال، پیشانی کے بال ندارد، گھنی مونچھیں، خشخشی داڑھی، رخساروں سے زیادہ ٹھڈی کو سمائے ہوئے، بہت ہی سادہ اور پُرانی وضع کا کھدر کا کرتا زیب تن، گریبان کے دونوں طرف بڑی بڑی جیبیں، جو کاغذات سے پُر، بنیان کا بطانہ، سر پر کھدر کا بڑا عمامہ، جو بے ہنگم بندھا ہوا، داہنے ہاتھ میں بھاری بھرکم موٹی سی عصائے موسوی، جس کے نیچے وزنی لوہا لگا ہوا، بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی سے اٹیچی، جو ضروری کاغذات اور قلم وروشنائی سے بھری ہوئی؛ یہ تھی ایک تصویری جھلک اس جامع کمالات شخصیت کی جن کو دنیا رہبر شریعت وطریقت، بطل جہاد وحریت، بانی امارت شرعیہ، قائد تحریک خلافت، روح روانِ جمعیت علماء ہند، فقیہ النفس علوم قرآن وحدیث کے بحر ناپیدہ کنار، تواضع وانکساری کے پیکر مجسم، اسکیم سازی میں اپنی مثال آپ، عملی میدان میں سب سے برق رفتار، علمی میدان کے شہ سوار، مفکر اسلام، مفکر اعظم حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ والرضوان کے نام نامی اور اسم گرامی سے جانتی اور پہچانتی ہے۔(۱)

حضرت کی علمی خدمات اور تحریری کاوشوں کا ایک معروضی جائزہ پیش خدمت ہے، جو آپ کی عبقریت کے لازوال نقوش ہیں۔

فتاوی امارت شرعیہ جلداول:

فقہ وفتاوی حضرت مفکر اسلام کا خصوصی فن تھا، اس میں انہیں ید طولی اور کامل دستگاہ حاصل تھی، اس فن کی جزئیات سے زیادہ اصول وقواعد پر گرفت تھی، مقاصد شریعت سے مکمل آگاہی تھی؛ اسی لیے وہ ہر مسئلے میں محض جزئیات پر اکتفاء کرنے کے بجائے قواعد وکلیات سے استدلال کرتے تھے، دوسری طرف احوال زمانہ کی معرفت بھی کامل تھی، وہ گوشہ نشیں مفتی سے زیادہ

متحرک وفعال قائداورفقیہ تھے، یہی وجہ ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی پیچیدہ مسئلہ آتا تو وہ اس کی تہہ تک پہنچ کراس کی روح پر گرفت حاصل کر لیتے اور بڑی زرف نگاہی اوردوراندیشی کے ساتھ گرہ کشائی کرتے، اس کی شہادت چھوٹوں نے نہیں، بڑے بڑوں نے دی ہے، صرف اصاغرنہیں؛ بلکہ اکابربھی ان کی حذاقتِ تفقہ پرثناخواں نظرآتے ہیں اوران کے تلامذہ سے بڑھ کرمعاصرین؛ بلکہ اساتذہ بھی ان کےاس وصف خصوصی پررطب اللسان ہیں،ہم دوچند شہادتیں ہدیۂ قارئین کئے دیتے ہیں:

(۱) علامہ سیدسلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں:وہ اپنے وقت کے مشاق مدرس اورحاضرالعلم عالم تھے،خصوصیت کےساتھ معقولات اورفقہ پران کی نظربہت وسیع تھی، جزئیات فقہ اورخصوصاً ان کاوہ حصہ جومعاملات سے متعلق ہے،نظرمیں تھا،امارت شرعیہ کےتعلق سےاقتصادی ومالی وسیاسی مسائل پر ان کوعبورکامل تھا،زکوۃ،خراج،قضاء،امامت،ولایت کےمسائل کی پوری تحقیق فرمائی تھی۔(۲)

(۲-۳) مجاہدملت حضرت مولاناحفظ الرحمٰن سیوہارویؒ راوی ہیں کہ حضرت علامہ سید محمدانورشاہ صاحب کشمیری فرمایا کرتے تھے کہ مولاناسجاد''فقیہ النفس'' عالم تھےاوربعینہ یہی بات میں نے حضرت مولاناشبیراحمدعثمانی کی زبانی بھی سنی ہے۔(۳)

(۴) حضرت مجاہدملت اپنے استاذ گرامی قدر علامہ انورشاہ کےقول کی توضیح کرتے ہوئےتحریرکرتے ہیں:یعنی اللہ تعالیٰ نے مسائل کی روح سمجھنے کاان کوفطری ملکہ عطافرمایاہے، نیز اس پربایں الفاظ تبصرہ فرماتے ہیں: حضرت مولاناسیدمحمدانورشاہ نوراللہ مرقدہٗ-جواس زمانے میں علم حدیث کےمجددگذرے ہیں-کایہ فرمانا میرے نزدیک مولاناسجادصاحب کےتبحرعلمی کے لئے ایک بہترین سند ہے۔(۴)

(۵) اس سلسلے کی سب سے اہم اورانتہائی وقیع شہادت وہ ہے جوان کے استاذ گرامی قدرحضرت مولاناعبدالکافی صاحبؒ نے دی ہے،جن سےانہوں نےسندفراغت حاصل کی ہے، اس کےراوی خودحضرت مفکراسلام ہے،آپ کااثرخامہ ہے:جب میں نے ۱۳۲۹ھ میں الہ آباد کاقیام حضرت استاذ قدس سرہٗ کی اجازت حاصل کرنے کے بعدترک کیااور''گیا'' میں اقامت اختیارکی تو خودمیری اورحضرت استاذ کی آمدورفت اکثرقائم رہی اوراس دوران میں آپ کی عادت شریفہ ازراہ حوصلہ افزائی، یاذرہ نوازی یہ تھی کہ آپ کے پاس جواہم استفتاء جاتے تھےتو اس کے جواب اس وقت تک نہ دیتے تھے، جب تک مجھ سےاورجناب مولانافرخندعلی صاحب

سے ملاقات نہ ہوا اور اس کے متعلق مشورہ نہ فرمالیں۔(۵)

حضرت مولانا سجادؒ کے جو فتاوی ہمارے درمیان مطبوعہ شکل میں ''فتاوی امارت شرعیہ جلد اول'' کے نام سے موجود ہیں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ وہ فتاوی ہیں، جو حضرت کے قلم سے بزمانۂ قیام امارت شرعیہ پھلواری شریف صادر ہوئے ہیں، ان کے علاوہ حضرت نے الٰہ آباد، بہار شریف اور ''گیا'' میں قیام کے دروان بھی بہت سے فتاوی سپرد قلم کئے ؛ مگر افسوس کہ ان کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں کہ اس کی اشاعت کی جا سکے۔

بہر حال ''فتاوی امارت شرعیہ جلد اول''، جس کو حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی علیہ الرحمہ نے اپنی ترتیب وتحقیق سے شائع کیا ہے اور اسے ''محاسن الفتاوی'' کا نام بھی دیا ہے، یہ حضرت فقیہ النفس مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب کی علمی وفقہی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ یہ (۳۲۹) صفحات کی ضخامت میں بڑے سائز کے اندر پھیلا ہوا ہے، جس میں دیباچہ اور پیش لفظ کے علاوہ ایک بسیط مقدمہ بھی ہے، جو اپنے وقت کے بڑے پایہ فقیہ قاضی القضاۃ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی علیہ الرحمہ کے شیریں وشگفتہ قلم سے ہے، جس میں فقہ وفتاوی کی تاریخ، اس کی اہمیت وعظمت اور اس سلسلے میں سلف صالحین کے طریقۂ کار کے علاوہ حضرت مولانا ابو المحاسن کے فتاوی نویسی کی مختصر روداد سپرد قرطاس کی گئی ہے، اس کے بعد صفحہ: ۲۷ سے سوال وجواب شروع ہو کر (۳۲۶) پر ختم ہوتا ہے، آخر میں مراجع کی فہرست ہے، گویا (۳۰۰) تین سو صفحات میں حضرت کے فتاوی ہیں، ان میں ایمان وعقائد، شرک وبدعت، نماز، امامت، جمعہ، زکوۃ، وعشر واضحیہ، روزہ، حج، نکاح، محرمات، رضاعت، ولایت نکاح، حقوق زوجین، طلاق، ایلاء، لعان، فسخ وتفریق، ثبوت نسب، نفقہ، شرکت، وقف، احکام مساجد ومدارس ومقابر، بیوع، سود، رہن، ہبہ، حظر واباحت، امارت وخلافت، سیاست، حدود وتعزیرات، وصایا اور فرائض کے کتب اور ابواب ہیں۔ ان میں کسی ایک طریق کی پیروی نہیں کی گئی ہے ؛ بلکہ وقت، تقاضہ اور ضرورت ومصلحت کی رعایت کی گئی ہے، سوال کرنے والے کی حیثیت اور اس کے منشا کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے ؛ اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ بعض فتاوی بہت ہی مختصر ہیں، بعض متوسط اور بعض انتہائی مفصل، اسی طرح بعض میں صرف حکم شرعی کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے، جبکہ بعض میں دلائل سے بھی تعرض کیا گیا، پھر دلائل میں خشک فقہی جزئیات کے نقل پر کامل بھروسہ کرنے کے بجائے قرآن وحدیث سے بھی براہِ راست استدلال کیا گیا ہے، اسی کو کہتے ہیں شانِ تفقہ اور ایسا

وہی شخص کرسکتا ہے، جو واقعی فقیہ النفس ہو۔حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اگر آپ کوفقیہ النفس کا خطاب دیا ہے تو یوں ہی نہیں دے دیا ہے، جبکہ علامہ کشمیری یہ لقب عمدۃ المتأ خرین علامہ ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ کو دینے میں تأ مل فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا رضوان قاسمی صاحبؒ بانی وسابق ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد، حضرت کے ان فتاوی پر تبصرہ کرتے ہوئے سپردخامہ کرتے ہیں:

اہم اور قیمتی کتب فتاوی میں بلاشبہ یہ قابل قدر اضافہ ہے، جدید وقدیم مسائل میں مولانا نے جس بصیرت، ژرف نگاہی، احتیاط، اعتدال وتوازن اور مواقع کے لحاظ سے جرأت وہمت کے ساتھ فتاوی لکھے ہیں، وہ اصحاب فتاوی اور اہل افتاء کے لئے نئی راہ کھولنے والے ہیں، مولانا کے ان فتاوی کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اختلافی مسائل میں اپنے فتاوی سے فتنہ کے دروازہ کو کھلنے کا موقع نہیں دیا ہے، ایسے ہر مسئلہ میں جس سے ملت کے درمیان نزاعی صورت ابھر کرسکتی ہو، مولانا نے اپنے اصلاحی اور داعیانہ کردار سے ابھرنے والے جذبات کو دبایا ہے اور بتایا ہے کہ ایک مفتی کو کتنا چوکنا رہنا چاہیے اور سماجی نفسیات کا کس قدر خیال رکھنا چاہیے۔

فتاوی امارت شرعیہ کے مطالعہ سے واضح ہے کہ گاؤں اور بستی میں جہاں جمعہ کا نظام جاری ہے، اسے روکنا مختلف مصلحتوں کے پیش نظر ٹھیک نہیں ہے، مولانا کے نزدیک خطبہ عربی زبان میں ضروری ہے، تاہم ممبر کے عربی خطبہ سے الگ ہٹ کر مقامی زبان میں دینی واصلاحی باتوں کو بیان کرنے کی بھی ترغیب دیتے ہیں۔میرے خیال میں مولانا کے اس رجحان کے پیش نظر ماضی قریب میں امارت شرعیہ کے اعلیٰ ذمہ داروں نے ایسی مساجد کے لیے جہاں جمعہ کے دن خطیب تقریر نہ کرسکتے ہوں، ان کے لیے کتابی شکل میں خطبات کی اشاعت کا پروگرام بنایا تھا، مسلم معاشرہ میں پھیلی ہوئی جہالت اور غیر دینی مزاج کی عمومیت کا تقاضہ ہے کہ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جائے۔(٦)

حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کسی تعارف وتوصیف کے محتاج نہیں، ان کی رجال سازی اور جوہر شناسی اظہر من الشمس ہے، حضرت نے موصوف کے فتاوی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک بہت بڑے حلقے کے لئے علمی سند کی حیثیت رکھتا ہے، حضرت ارقام فرماتے ہیں: ’’انہوں نے بہت سی سماجی وملی خدمات کے ساتھ فتاوی نویسی کی اہم خدمت انجام دی،

مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد اور مدرسہ انوارالعلوم گیا کے زمانۂ قیام میں بھی انہوں نے ایک مدت تک فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دی، لیکن افسوس کہ ان دونوں جگہوں کے فتاویٰ محفوظ نہ رہ سکے، البتہ امارت شرعیہ کے زمانۂ قیام میں جو فتاویٰ لکھے ان کا بڑا حصہ محفوظ ہے، ان کا ایک منتخب مجموعہ چند ماہ قبل الحمدللہ امارت شرعیہ کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، یہ ایک قیمتی علمی وفقہی دستاویز ہے، جو عوام وخواص سب کے لیے مفید ہے، خصوصاً افتاء کا کام کرنے والوں کے لیے ایک قیمتی مرجع کی حیثیت رکھتا ہے، حضرت قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمیؒ نے اس کی ترتیب کی خدمت انجام دی ہے، اوراس پر مفید نوٹ چھڑھائے ہیں، جس کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔(۷)

حضرت مولانا خالدسیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی نے حضرت کے فتاویٰ کو بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اور بہت سے اہم فتاویٰ پر حوالے کے ساتھ گرانقدر تبصرہ فرمایا ہے، یہ تبصرہ ہر چند کہ کافی طویل ہے؛ مگر ان کی جلالت قدر اور فتاویٰ کے تفصیلی تعارف کے لئے اسے بلفظہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے، حضرت سپرد قرطاس کرتے ہیں: اس مجموعہ میں (۱۹۸) فتاویٰ ہیں، جو زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہیں، ان میں بعض فتاویٰ نہایت معرکۃ الآراء ہیں، علماء دیوبند کی تکفیر پر مولانا عبدالکافی الٰہ آبادی کے نقطۂ نظر سے متعلق فتویٰ جو اس کتاب کے شروع ہی میں ہے، بہت اہم ہے، اجتماعی مسائل نیز امارت وقضاء سے متعلق موضوعات کی بابت جو فتاویٰ اس مجموعہ میں شامل ہیں، وہ علماء وارباب افتاء کے لئے بہت ہی چشم کشاں ہیں، ہندوستان میں ایک زمانہ میں انگریزوں کے خلاف ''ترک موالات'' کی تحریک شروع ہوئی تھی، اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد قادری نے ایک استفتاء مرتب کیا ہے، حضرت شیخ الہند مولانا محمودالحسن صاحب، علمائے فرنگی محل، علمائے سہارنپور، علمائے بدایوں، علمائے کانپور، اور علمائے دہلی نے اس کے جوابات لکھے ہیں، حضرت مولانا سجاد صاحب نے اس کا تفصیلی اور نہایت بصیرت افروز جواب لکھا ہے، جو ایک طرف آپ کی فقہی بصیرت اور دوسری طرف احوال زمانہ سے آگہی کی شاہد عدل ہے، چنانچہ آپ کے اس جواب پر ہندوستان کے طول وعرض کے تمام مسالک کے علماء نے تحسین بھی کی ہے اور اس کی تصویب بھی۔ طلاق معلق کی ایک صورت کے بارے میں قاضی عبدالحمید صاحب نے ایک استفتاء کیا ہے، جس کا ہندوستان کے مختلف ممتاز علماء بشمول مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد نے جواب دیا ہے، جوابات میں تعارض ہے، چنانچہ استفتاء اور جوابات مولانا کے سامنے

محاکمہ کے لئے پیش کیا گیا، مولانا نے اس پر اپنی زبردست قوتِ فیصلہ کے ساتھ محاکمہ فرمایا ہے، یہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔

مولانا کے فتاوی کا جو امتیازی پہلو ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ آپ نے درسگاہ کے حصار میں محدود مفتی کے بجائے سماج وماحول کے حالات سے واقف صاحب بصیرت فقیہ کی حیثیت سے فتاوی دیئے ہیں اور بحیثیت مجموعی امت کے مصالح کو ملحوظ رکھا ہے، مدارس اسلامیہ میں سرکاری اوقاف سے مدد لینے کے بارے میں آپ نے فتوی دیا ہے کہ اگر اندیشہ ہو کہ ارباب حکومت خواہ مخواہ دخل دیں گے، اس کی وجہ سے تعلیم میں نقص اور اظہار حق میں کوتاہی کرنی پڑے گی تو ایسی صورت میں مدد لینی جائز نہیں ہوگی۔(۸)

آج بہار اکزامیشن بورڈ کے نصاب تعلیم اور معیار تعلیم کو سامنے رکھا جائے تو مولانا کا یہ فتوی نوشتۂ دیوار معلوم ہوتا ہے۔ غیر مسلموں سے تعمیر مساجد میں مالی تعاون لینے کی بابت مولانا کی رائے عدم جواز کی ہے، ہاں یہ صورت آپ کے نزدیک جائز ہے کہ غیر مسلم نے مسلمان کو کوئی چیز ذاتی طور پر ہبہ کی ہو اور مسلمان اسے تعمیر مسجد میں صرف کردے،(۹) وجہ اس کی ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کے چندہ میں احتیاط نہ برتی جائے تو اندیشہ ہے کہ کل ہو کر وہ بھی اپنی عبادت گاہوں کے لیے مسلمانوں کو تعاون پر مجبور کریں۔

مسجد کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کے بارے میں بھی مولانا کا فتوی بہت واضح اور بے لچک ہے؛(۱۰) کیوں کہ اس مسئلہ میں ذرا بھی نرم روی بہت بڑے فتنہ اور شعائر اسلام کی بے حرمتی کا پیش خیمہ ہے۔ بہت سے دیہات اور قریہ جات وہ ہیں جہاں نماز جمعہ ہی لوگوں کے لئے اسلام سے وابستگی اور تعلق کا اثاثہ ہے اور اسی سے ان کی پہچان باقی ہے، اس لئے فقہی موشگافیوں سے قطع نظر ایک دردمند داعی کی نگاہ سے مولانا اس مسئلہ کو دیکھتے تھے، اور ایسے گاؤں میں نماز جمعہ کے جواز کا فتوی دیتے تھے، جہاں مسلمانوں کی مستقل آبادی ہو اور جماعت کے لئے مطلوب بالغ مرد موجود ہوں،(۱۱) مسلمانوں کو اسلام پر باقی رہنے کے لیے موجودہ حالات میں یہ فتوی کتنی اہمیت رکھتا ہے، وہ محتاج اظہار نہیں۔

مولانا غیر عربی زبان میں خطبہ کے جواز کے قائل نہیں تھے؛ اس لیے فقہی دلائل تو پیش کرتے ہی تھے؛ لیکن نگاہ دوررس کے سامنے یہ حقیقت بھی تھی کہ جن وجوہ کی بنیاد پر لوگ خطبہ کو اردو میں پسند کرتے ہیں، انہیں وجوہ کی بنا پر ترکوں نے نماز میں قرآن مجید بزبان ترکی پڑھنا چاہا

اور روک دیئے گئے، شاید اگر یہی لیل ونہار رہے تو ہندوستان میں بھی کم از کم نماز جہری میں تو ضرور امام سے اردو میں قرآن مجید پڑھنے کی خواہش ہوگی، (۱۲) سماجی اصلاح کا ایک مؤثر ذریعہ مالی جرمانہ ہے اور ہندوستان جیسے حالات میں جہاں جرم وسزا کا قانون مسلمانوں کے دائرہ اختیار میں نہیں آسکتا، سماجی اصلاح اور مفاہمت بین الناس کا یہ ایک مؤثر ذریعہ ہے، چنانچہ مولانا نے اس کی اجازت دی ہے؛ البتہ چونکہ فقہاء نے اس کو منع کیا ہے؛ اس لیے یہ پیرایہ اختیار کیا ہے کہ جرمانہ بطور صدقہ نافلہ وصول کیا جائے؛ تا کہ نقصان مالی کے خیال سے نفس امارہ آئندہ گناہِ جرأت نہ کرے۔ (۱۳)

مولانا کے فتاوی میں ان کا داعیانہ رنگ ہر جگہ نمایاں ہے کہ محض مسائل کی رہنمائی پر اکتفاء نہیں کرتے؛ بلکہ مناسب حال تذکیر بھی کرتے ہیں اور اصلاح کے وسائل کی بھی رہنمائی کرتے ہیں، خلع کے ایک مسئلہ میں مولانا نے برادری کے لوگوں کو متوجہ کیا ہے کہ وہ شوہر کو طلاق دینے پر مجبور کریں، تا کہ عورت کی دادرسی ہو سکے، زنا اور اس سے ثبوت نسب کے متعلق ایک سوال کے جواب میں مولانا نے لکھا ہے کہ پنچایت کو چاہیے کہ بکر اور اس کی عورت کو ایسی تنبیہ کریں کہ جس سے آئندہ کے لئے بھی ڈرتے رہیں، اور ان کی برادری کے دوسرے لوگوں کو بھی عبرت ہو۔ (۱۴)

ایک سوال عصمت فروش عورتوں کے یہاں میلاد میں جانے سے متعلق ہے، مولانا نے اس کی کمائی اور شیرینی وغیرہ کو تو ناجائز قرار دیا ہے، لیکن یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اگر کوئی حافظ اور مولوی اس کے یہاں محفل میلاد میں محض اس وجہ سے جائے کہ اس بدکار عورت کو خدا اور رسول کا خوف دلائے اور توبہ کرنے کی ترغیب دے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ (دیکھئے: ۲۴۵) بیوی کو ماں اور بہن کہنے کا کیا حکم ہے؟ اس کا فقہی جواب دینے کے بعد فرماتے ہیں: زید اپنی تنبیہ کے لیے اپنے نفس پر کوئی ایسا صدقہ دینا لازم کرلے، جو اس کے نفس پر کسی قدر بار ہو؛ تا کہ اس کے ذریعہ ہمیشہ اس اثر کو یاد رکھے کہ ایسے کلمات کہنا خلاف شریعت ہے اور ہمیشہ اس سے بچتا رہے۔ (۱۵)

مولانا کے فتاوی کا ایک امتیازی پہلو مسلمانوں کو فتنہ وانتشار سے بچانے کی کوشش بھی ہے، بعض مواقع پر محض حق کا اظہار اور مسائل کو بیان کردینا کافی نہیں ہوتا کہ کبھی اس سے نزاع وانتشار کی صورت بھی پیدا ہوجاتی ہے، مولانا اپنے فتاویٰ میں اس بات کا خوب لحاظ رکھتے ہیں، انگریزوں کے زمانے میں انگریزی اخبارات کے ذریعہ یہ بات پھیلائی گئی تھی کہ والیٔ کابل کی بیوی نے صدر فرانس سے ہاتھ ملایا، اس خبر اور تصویر کی اشاعت کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں

کوامان اللہ خان سے بدگمان کرنا تھا، مولانا نے اس سلسلہ میں استفتاء کا جواب لکھتے ہوئے پہلے تو غیرمحرم مرد سے ہاتھ ملانے کا شرعی حکم بیان کیا، پھر تحریر کیا: ''لیکن اہلیہ غازی امان اللہ خان بادشاہ کابل کے متعلق جو واقعہ آپ نے لکھا ہے یہ تصدیق طلب ہے، بغیر کامل تصدیق کے اخباری خبروں وتصویروں پر اعتماد کرکے کوئی رائے قائم کرنا شرعاً درست نہیں ہے''۔(۱۶)

ایک جگہ پنچ نے چھوٹی بہن سے بڑی بہت کو سود دلوایا، اس کے جواب میں امیر شریعت ثانی نے اس کی مذمت وشناعت پر مبنی جواب دیا، مولانا نے اس جواب پر ایک تحریر کا اضافہ کیا، جس میں اس کی مزید تاکید کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ اگر خدانخواستہ پنچ اور بڑی بہن راضی نہ ہوا اور سود کا روپیہ واپس نہ ہو تو اس کی وجہ سے کوئی جدید فتنہ برپا نہیں کرنا چاہیے۔(۱۷)

اسی طرح ایک مقام پر ایک مسجد سے قریب ہی دوسری مسجد کی تعمیر کے بارے میں دریافت کیا گیا تو مولانا نے اپنے فتوی میں بلاضرورت دوسری مسجد کی تعمیر سے منع کیا؛ لیکن یہ بھی فرمایا کہ اگر وہ لوگ اس پر مصر ہوں تو اختلاف نہ بڑھایا جائے، جس سے جو مسجد قریب ہو، وہ وہاں نماز ادا کیا کریں۔

غیرت ایمانی اور حمیت اسلامی مولانا کا سب سے بڑا امتیاز تھا اور وہ اس کو تمام علائق سے بالاتر رکھتے تھے، فتاوی میں بھی مولانا کا یہ رنگ پوری طرح عیاں ہے، اس معاملہ میں آپ کے یہاں کوئی لچک نہیں، ذبح گاؤ کے مسئلے میں بعض اہل علم نرم رویہ رکھتے تھے اور آزادی سے پہلے مسلم لیگ نے تو ایک تجویز ہی پاس کردی تھی کہ مسلمان ذبح گاؤ سے رک کر ہندو بھائیوں کے جذبات کا احترام کریں؛ لیکن مولانا اس مسئلہ میں کسی مداہنت کے روادار نہیں تھے، چنانچہ جمعیۃ علماء بہار کے اجلاس دربھنگہ ۱۳۳۹ھ میں مولانا نے ایک فتوی مرتب فرمایا، جس میں بہار کے سربرآوردہ علماء کرام نے اپنے دستخط ثبت فرمائے اور مولانا نے اس کو علماء بہار کا متفقہ فتوی کے نام سے شائع فرمایا، اس فتوی میں آپ نے قشقہ لگانے ہندؤوں کے مراسم مذہبی میں شریک ہونے، کنٹھا باندھنے اور ہندؤوں کے جذبۂ گاؤپرستی کی رعایت کرتے ہوئے ذبح گاؤ سے پرہیز کرنے کو باعث کفر قرار دیا ہے۔(۱۸) گورمنٹ کی جانب سے اس طرح کی پابندی عائد کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ ایک مخصوص مقام پر ہی قربانی کرسکتے ہیں، دوسری جگہوں پر قربانی کرنے کی اجازت نہیں، مولانا نے اپنے فتوی میں ہدایت فرمائی کہ مسلمان ایسی قیود کو ہرگز قبول نہ کریں؛ لیکن حسن تدبیر کو ملحوظ رکھیں اور مولانا کے الفاظ میں ''دفع ضرر، اور جلب منفعت کا لحاظ

کر کے کام کرنا چاہیے''۔ غیر مسلموں کے مشرکانہ میلے، جیسے دسہرہ وغیرہ میں شرکت سے بھی مولانا نے سختی سے منع فرمایا ہے اور مستفتیوں سے خواہش کی ہے کہ مسلمان خود اپنے انتظام سے کوئی بازار لگائیں، جس میں کوئی ناجائز کام نہ ہو۔(۱۹)

انگریزوں کا عہد استبداد ہے؛ لیکن مولانا کا فتوی بالکل واضح ہے کہ جو لوگ برضاء ورغبت حکومت کے ملازم ہیں اور حکم شریعت کا پرواہ کئے بغیر حکومت کا ہر حکم بجالاتے ہیں ان کو امام نہیں بنانا چاہیے؛ البتہ اگر ان کے پیچھے نماز پڑھ لی جائے تو نماز ادا ہوجائے گی۔ ویران مساجد کے بارے میں بھی آپ کی رائے بالکل واضح اور بے لچک ہے کہ وہ قیامت تک کے لئے مسجد ہے اور حسب طاقت واستطاعت مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان مسجدوں کو واپس لے کر آباد کریں، ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔ مولانا نے اپنے بعض فتاوی میں انگریزی عدالتوں کے فیصلوں کو غیر معتبر کہنے میں کسی حیلہ وتعریض سے کام نہیں لیا ہے، (۲۰) اور متعدد مواقع پر متنبہ کیا ہے کہ انگریزی عدالتوں میں اپنے مقدمات کا لے جانا سخت معیوب ہے۔(۲۱)

جو مسائل حلال وحرام سے متعلق ہیں، ان میں مولانا کے یہاں بڑی احتیاط ہے، بیع بالوفاء کا مسئلہ جس میں بعض فقہا نے تعامل کی بنا پر کسی قدر نرمی برتی ہے، مولانا نے اس کو معاملۂ فاسدہ ہی قرار دیا ہے، (۲۲) عیدگاہ کی زمین پر مدرسہ یا دارالطلبہ بنانے کی اجازت آپ نے نہیں دی ہے؛ کیوں کہ منشأ واقف کی خلاف ورزی ہے، مسجد کے صحن میں انگریزی تعلیم سے آپ نے ماحول کے پس منظر میں منع فرمایا؛ کیوں کہ بقول مولانا: انگریزی تعلیم محض دنیا طلبی کے لئے ہے؛ اس لیے مسجد کے صحن میں تو قطعاً نہیں پڑھانا چاہیے۔(۲۳)

مولانا نے عام حالات میں بینک میں روپیہ رکھنے سے منع کیا ہے اور کاروبار یا دیگر ضرورتوں سے بھی قرض لینے سے منع کیا ہے، بینک کے سود کے بارے میں مولانا کے فتاوی متعارض ہیں، بعض فتاوی میں آپ نے بینک کے سود کو جائز قرار دیا ہے اور مولانا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ رقم چونکہ کافر سے ایک معاہدہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اس لئے یہ فئے کے حکم میں ہے اور مسلمانوں کے لیے جائز ہے، (۲۴) لیکن ایک فتوی میں آپ نے دارالحرب میں بھی سود کو حرام قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ قول احوط ہے؛ (۲۵) لیکن ظاہر ہے کہ یہ فتوی برطانوی عہد سے متعلق ہے، نہ کہ موجودہ جمہوری دور سے، چنانچہ مولانا ایک فتوی میں رقم طراز ہیں: ''ہندوستان ہمارے نزدیک حکومت انگلشیہ کے تسلط کے وقت سے دارالحرب ہے''۔

اس احتیاط کے باوجود ایسا تشدد بھی نہ تھا کہ زمانہ کے واقعی ضروریات کو بھی نظر انداز کردیں، آپ کے فتاوی میں احوال زمانہ کی حسب موقع رعایت بھی ہے، استبدال وقف کے مسئلہ میں قاضی شریعت کے اذن سے جواز کا رجحان ہے۔(۲۶) اگر مسجد کے سامنے قبر ہو اور اس کے کچھ اوپر سے چھپٹ ڈال دی جائے تو مولانا نے اس صورت کو متولی یا وارث کی اجازت سے درست قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں نماز ادا کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔(دیکھئے ۲۱۵) تجارت میں آج کل کمیشن ایجنٹ کی صورت بہت شائع ذائع ہے، مولانا کا رجحان اس کے جواز کی طرف ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اصول وقواعد پر جتنی نظر ہوگی نگاہ میں اتنی ہی وسعت پیدا ہوگی اور رائے میں توازن ہوگا اور جزئیات پر انحصار وقناعت سے تشنگیٔ فکر بھی پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات آدمی کی رائے غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ مولانا کے فتاوی اور دوسری تحریروں سے یہ بات عیاں ہے کہ آپ مسائل کے حل میں زیادہ تر اصول وقواعد کو پیش نظر رکھتے ہیں، آپ کے فتاوی میں بھی جا بجا یہ رنگ موجود ہے، مثلاً: ایک جگہ فرماتے ہیں: عبادات میں وہی کام کرنا چاہئے جو حدیث وفقہ سے ثابت ہو، (۲۷) ایک فتوی میں رقمطراز ہیں کہ قرض میں سود کی شرط، شرط فاسد ہے، (۲۸) ایک اور فتوی میں فرماتے ہیں کہ تبدیلیٔ اسم سے مسمیٰ کی حقیقت نہیں بدلتی ۔(۲۹)

قضایا سجاد:

اسلام کے اجتماعی نظام کی اساس اور روح، شعبۂ قضاء ہے، یہی وہ محکمہ ہے، جس کے ذریعہ خالق کی شریعت مخلوق پر نافذ ہوتی ہے، یہ مصالح مسلمین کا ایک ایسا اہم شعبہ ہے کہ اس سے مسلم آبادی کبھی بھی بے نیاز نہیں ہوسکتی ہے؛ کیوں کہ اقامت عدل اور رفع خصومات کی یہ کلید ہے۔

حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے امارت شرعیہ کے قیام کے بعد فوراً ہی جن مختلف شعبوں کا اجراء امارت کے ماتحت کیا، ان میں انتہائی اہم، شعبہ قضاء ہے اور اس کے لیے قاضی نور الحسن بن مولانا محی الدین پھلواروی متوفی ۱۹۵۶ء کو سب سے پہلا قاضی شریعت منتخب کیا، موصوف ایک جید عالم دین، صاحب تقوی وطہارت بزرگ اور تجربہ کار قاضی تھے، مطالعہ بہت وسیع اور حافظہ انتہائی قوی تھا، اور زندگی کے آخری لمحات تک دار القضاء امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے کار قضاء انجام دیتے رہے اور اپنی خداداد قابلیت، معاملہ فہمی اور بے لاگ وصحیح

فیصلوں سے دار القضاء کا اعتماد بحال رکھا، یہاں تک کہ غیر مسلم بھی آپ سے فیصلہ کراتے۔

مگر آپ کے بعض فیصلوں پر دونوں فریق، یا کسی ایک فریق کی طرف سے بعض دفعہ مرافعہ کیا گیا اوران کے فیصلے کو چیلنج کر کے امارت شرعیہ کے روح رواں حضرت مولانا سجاد کی خدمت میں پیش کیا گیا، آپ نے بہ حیثیت نائب امیر شریعت ان مقدمات کی سماعت فرمائی اور اپنی خداداد صلاحیت، اصابت فکر، تبحر علمی، دوراندیشی اور بے پناہ مہارت سے ان کے فیصلے کئے، یہ اور اس طرح کے چند مقدمات کے فیصلے امارت شرعیہ کے دفتر میں بطور ریکارڈ محفوظ تھے، جن میں سے بعض فیصلوں کو سب سے پہلے قاضی شریعت قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ نے اپنے سہ ماہی فقہی مجلّہ ''بحث ونظر'' کے بعض شمارے میں شائع کیا تھا، جو بہ نظر استحسان دیکھا گیا اور فقہ وقضا سے تعلق رکھنے والے اہل علم نے خوب پذیرائی کی، اس سے متأثر ہوکر حضرت قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ نے حضرت مفکراسلام کے تمام فیصلوں کو ریکارڈ سے نکال کر اپنے معاون کار مولانا فہیم اختر ندوی کے ذریعہ مرتب کرایا اور اپنی تصحیح وتقدیم سے اسے مزین کیا اور ۱۹۹۹ء میں مکتبۂ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ سے شائع کیا ہے۔

یہ فیصلے: ''قضایا سجاد'' سے موسوم ہیں، یہ چھوٹی سائز میں ۱۶۸ر صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے، جس میں کل فیصلے چھ ہیں، آغاز میں صاحب تقدیم وتصحیح کا دوصفحہ پر ایک مقدمہ ہے، جو کہ صاحب قضایا کی شخصیت، ان کے تفقہ فی الدین اور فیصلوں کے تعارف پر مشتمل ہے، ان قضایا کے موضوعات، ثبوت نسب، فسخ نکاح، خلع، تنازع امامت مسجد مابین احناف واہل حدیث اور مالی وکاروباری لین دین ہیں، ان فیصلوں سے حضرت کا شان تفقہ، نصوص پر گہری واقفیت، ان سے مسائل حاضرہ وماضیہ کا اخذ واستنباط کی بھرپور صلاحیت، قوت فیصلہ، دوراندیشی، غیر جانب داری، انصاف پروری، خشیت الٰہی وتقوی وپاکیزگی جیسے اوصاف صاف جھلکتے ہیں، مثلاً: اس کا پہلا مقدمہ یہ ہے کہ ایک عورت کا شوہر جو کہ مدت دراز سے غائب تھا، اس کے متعلق عورت کو خبر ملی کہ وہ فوت ہوگیا ہے، ایک عرصہ گذرنے پر اس نے دوسرے شخص سے نکاح کرلیا؛ لیکن کچھ مدت کے بعد شوہر اول واپس آ گیا؛ مگر اس عورت کو طلب کئے بغیر پھر غائب ہوگیا تو عورت نے فسخ نکاح کا مطالبہ کیا، جبکہ حال یہ ہے کہ شوہر ثانی سے اسے چند اولاد بھی ہوئی، اس مقدمہ میں تحقیق طلب یہ امور ہیں کہ عورت کا دوسرے شوہر سے بحالت مذکورہ نکاح صحیح ہوا، یا نہیں؟ جو اولاد شوہر ثانی سے پیدا ہوئی ثابت النسب ہے، یا نہیں؟ شوہر اول کے آجانے کے بعد عورت کس

شوہر کودی جائے گی اور عورت کا شوہراول سے فسخ نکاح کا مطالبہ کرنا کیسا ہے؟

حضرت نے اس مقدمہ کو کتب فقہیہ : درمختار، ردالمحتار، البحرالرائق، فتح القدیر، مبسوط سرخسی اور آثار صحابہ نیز آیات قرآنی کی روشنی میں فیصل فرمایا ہے، چنانچہ ارقام فرماتے ہیں: تمام مباحث متذکرہ کو پیش نظر رکھ کر مقدمہ ہذا میں، میں حسب ذیل احکام ثابت کرتا ہوں: (۱) مدعیہ سلیمن کے تمام اولاد جو عقد ثانی کے بعد ہوئے ثابت النسب ہیں اور ان کو اولادالزنا خیال کرنا درست نہیں ہے۔ (۲) سلیمن نے جو عقد ثانی کیا تھا، وہ فاسد ہے، اس کو میں فسخ کرتا ہوں اور چونکہ موطوۂ زوج ثانی ہے؛ اس لیے وہ تین حیض عدت گذارے، اگر زوج ثانی سے حاملہ نہ ہو، ورنہ بصورت حمل ولادت تک عدت گذارے اور اگر حمل نہ ہو اور حیض (بھی) نہ آتا ہو، تو تین ماہ تک عدت گذارے اور شوہر ثانی سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ (۳) سلیمن کے نکاح اول کو (جو نکاح زوج اول سے ہوا تھا، بربنائے عدم حصول نفقہ من مال الزوج الاول ونیز بربنائے خوف ارتکاب معاصی) فسخ کرتا ہوں اور حکم دیتا ہوں کہ سلیمن یوم ہذا سے عدت گذارے۔

اسی طرح اس کتاب کا آخری فیصلہ کاروباری معاملات سے متعلق ہے، آپ نے مدعی کے حق میں فیصلہ صادر فرمانے کے بعد اس حدیث شریف کا حوالہ دے کر مدعی کو ڈرایا اور متنبہ کیا ہے کہ جس میں آپ علیہ السلام نے ایک مقدمہ میں ایک مدعی کے حق میں اس کی حجت ودلیل کے قوی ہونے سے فیصلہ فرما کر ارشاد فرمایا تھا کہ اگر وہ ناحق ہے تو میں نے جہنم کی آگ کا ٹکڑا دلایا ہے۔

خطبۂ صدارت :

۱-۳/جنوری ۱۹۲۵ء بہ مطابق ۱۵-۱۷/جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ میں مرادآباد کے اندر جمعیت علماء ہند کا اجلاس ششم منعقد ہوا تھا، اس کی صدارت اکابر کے اصرار پر حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد نے کی تھی، آپ نے بہت ہی عجلت کے ساتھ ایک تحریر مرتب کی تھی، جو تاریخ اجلاس سے صرف تین دن پہلے ۱۲/جمادی الثانیہ بروز جمعرات پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی، آپ نے بحیثیت صدر اجلاس وہی تحریر پڑھ کر سنائی جو ''خطبۂ صدارت'' کے نام سے چھپی ہوئی ہے، یہ متوسط سائز کی ۱۴۳/صفحات پر مشتمل ہے، اس کے مطالعہ سے اس بات کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ اپنے معاصر علماء میں مولانا اپنی سیاسی بصیرت کے لحاظ سے منفرد تھے، یہ نہایت عالمانہ، بصیرت افروز اور مؤثر خطبہ ہے، جس سے ایک طرف آپ کے مطالعہ کی وسعت اور علمی گہرائیوں کا ثبوت

فراہم ہوتا ہے تو دوسری طرف اپنے عہد اور حالات پر آپ کی گہری نگاہ کا ثبوت، نیز امت کی مصیبت پر تڑپ اور درد واضطراب کا پتہ دیتا ہے، یہ حسن کلام اور صراحت بیان کا ایک اعلی درجہ کا شاہکار ہونے کے ساتھ ایک روشن ضمیر مفکر کی انقلابی فکر کا بہترین ترجمان ہے اور وقت کے مہتم بالشان سوالات کا جواب اس میں پنہاں ہے، اس وقت کے ممتاز اردو اخبارات مثلاً: زمین دار اور انقلاب وغیرہ نے اس پر بہت ہی وقیع انداز سے تبصرہ کیا تھا، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے اس کو سیاسیات اسلامی کا بہترین انسائیکلو پیڈیا قرار دیا تھا۔ (۳۰)

اس کتاب میں شروع کے چند صفحات تمہیدی ہیں، جن میں ہندوستان کے سنگین حالات میں جمعیۃ علماء ہند کے قیام اور اس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے تئیں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا تذکرہ ہے، اس کے بعد خلافت اسلامیہ کے مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، یورپ کے اس زعم کو غلط قرار دیا ہے، کہ خدانخواستہ خلافت کے خاتمہ سے اسلام کا خاتمہ نہیں ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ ۶۵۶ھ تا ۶۵۹ھ کے عرصہ میں بھی خلافت کا وجود نہیں تھا، اس کے باوجود اسلام اپنی شان وشوکت کے ساتھ باقی رہا، پھر الغائے خلافت کے سلسلے میں اہل ترک جو پانچ اعذار بیان کرتے تھے، حضرت نے ان کا نمبروار ذکر کر کے رد کیا ہے، پھر یہ واضح کیا ہے کہ اصل میں الغائے خلافت کے بنیادی اسباب تین ہیں: (۱) اسلامی حریت کو اہل یورپ کی حریت اور آزادئ فکر کے مرادف تصور کرنا، (۲) اسلامی شورائی نظام کو مروجہ جمہوریت باور کرنا، (۳) وطنیت کی بنیاد پر قومیت کی تعمیر وتشکیل کرنا۔

اس کے بعد ان تینوں جراثیم کے لوگوں کے درمیان پھیلنے کی سب سے بڑی وجہ حضرت نے یہ بتائی ہے کہ علما نے علمی طور پر عبادات وغیرہ کے پہلو پر جس قدر توجہ دی ہے اس کا عشر عشیر بھی سیاست ملکی پر توجہ نہیں دی ہے، چنانچہ عبادات پر کتابوں کا انبار لگا ہوا ہے؛ مگر اسلامی سیاست پر معدودے چند کتب کے سوا کوئی ذخیرہ نہیں ہے، اسی طرح عملی حیثیت سے بھی علما نے دوری اختیار کی اور خلفائے راشدین کے بعد سے ہمیشہ اس میں تنزلی ہی آتی رہی ہے۔

پھر حضرت نے احادیث سے ثابت کیا ہے کہ علما اور ماہرین شریعت کا سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے؛ کیوں کہ سیاست عین دین ہے، اس سلسلے میں متعدد نامی گرامی علما کے اسما سپرد قرطاس کئے ہیں، جنھوں نے اسلامی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دین کے دوسرے شعبوں سے بھی وابستہ رہے، اس کے بعد دوبارہ خلافت اسلامیہ کے قیام کے سلسلہ میں علماء

ودانشوران ہند سے ان کے فرائض کا تذکرہ کر کے نمبر وار سات اہم فرائض کی نشاندہی فرمائی ہے، اس ضمن میں حضرت نے نظام اسلام پر ایک مکمل و جامع کتاب کی ترتیب کا مشورہ دیا ہے، جو صرف فقہا، محدثین اور متکلمین کے اقوال پر مبنی نہ ہو؛ بلکہ مدارک حکم اور اصول استصلاح کو ملحوظ رکھ کر مرتب کیا جائے اور اس کی شرح بھی تیار کی جائے اور دنیا کے مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کر کے ہر ملک میں پھیلا جائے اور علماء زبانی طور سے بھی اس کی تشریح کر کے لوگوں کو اسکا قائل بنائیں، نیز حسب مدارج نصاب تعلیم میں بھی اس کو شامل کیا جائے۔

اس کے بعد انھوں نے حجاز، جزیرۂ عرب اور حرمین شریفین سے متعلق حالات کا تذکرہ کیا ہے، پھر اندرونِ ملک کے مسائل کا تذکرہ کیا ہے اور سب سے پہلے ترکِ موالات کا لائحۂ عمل اور جمعیۃ علماء ہند کے فتوی کا تذکرہ کیا ہے، جو دراصل آپ ہی کا مرتب کردہ ہے اور ترک موالات کا شرعی حکم بیان کیا ہے، پھر حالات و زمانہ کی تبدیلی سے احکام شرع میں تبدیلی، ہندو مسلم اتحاد اور اس کی حدود، نیز خود مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ حضرت نے اس کے اخیر میں امارت شرعیہ فی الہند کے قیام کی اپنی دیرینہ آرزوں کو دہرایا ہے، پھر نظام امارت کا پورہ خاکہ سپرد قلم کیا ہے، پھر جمعیۃ علماء ہند کے استحکام پر زور دیا ہے، آخر میں علماء کرام سے عربی میں چار صفحات پر ایک قیمتی خطاب ہے، جس میں علما کو ان کا بھولا ہوا مقام یاد دلایا ہے۔(۳۱)

اخیر میں اس خطبۂ صدارت کے تعلق سے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کا جامع تبصرہ نذر قارئین کرنا ضروری سمجھتا ہوں، حضرت زیب قرطاس کرتے ہیں: حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا یہ خطبہ نہایت عظیم الشان، بصیرت افروز اور چشم کشاں خطبہ ہے اور اس لائق ہے کہ تمام مسلمان اور خاص کر کے علماء اور قائدین ضرور اس کا مطالعہ کریں کہ شکوک وشبہات کی کتنی ہی گرہیں ہیں، جو اس خطبہ سے کھلتی ہیں اور فکر ونظر کی کتنی سمتیں ہیں، جو اس خطبہ سے وا ہوتی ہے۔(۳۲)

حکومتِ الٰهی:

یہ متوسط سائز میں ۱۳۶ ؍صفحات کا رسالہ ہے، جس کو سب سے پہلے امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے ۱۹۴۰ء میں مونگیر سے شائع کیا تھا، پھر امارت شرعیہ بہار واڑیسہ نے ''سجاد سیمینار'' کے موقع پر اسے دوبارہ طباعت کے مرحلہ سے گذارا ہے، اس کے آغاز میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا بیش قیمت مقدمہ ہے، جس میں حضرت مولانا

کی شخصیت، ان کی فکر سلیم، اسلام اور امت کے لیے دردبیکراں اور مولانا کی فکر ونظر کی گہرائی وگیرائی، نیز کتاب کی اہمیت کا دل کھول کر اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مختصر؛ مگر چشم کشاں کتاب ہے اور صحیح معنوں میں ''بہ قامت کہتر، بہ قیمت بہتر'' کا مصداق ہے۔

یہ کتاب دراصل اس جامع اور مفصل کتاب کی تمہید ہے، جس کی ضرورت کا اظہار حضرت مفکر اسلام نے خطبۂ صدارت اجلاس مرادآباد میں کیا تھا، نظام اسلام پر مفصل کتاب کا خاکہ آپ نے اپنے ذہن میں تیار فرمایا تھا؛ بلکہ بہ قول امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانی اس کے لئے نوٹس بھی تیار کر لیے تھے؛ لیکن ابھی ایک ہی باب مرتب کر سکے تھے کہ داعیٔ اجل آپہنچا اور یہ امانت سینہ سے سفینہ میں مفصل منتقل نہ ہوسکی؛ مگر جس حالت میں بھی موجود ہے، مصنف کی عبقریت اور نظام اسلامی پر مجتہدانہ بصیرت کی روشن برہان ہے۔

یہ کتاب دس فصلوں پر مشتمل ہے، اس سے پہلے گیارہ صفحات پر نہایت ہی فاضلانہ تمہید ہے، جس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ رب کائنات نے تمام حیوانات میں جماعتی، اور اجتماعی اصول پر زندگی بسر کرنے کا جذبہ ودیعت فرمایا ہے، پھر انسان جو اشرف المخلوقات ہے، وہ اس سے کیوں کر محروم رہ سکتا ہے؟ خدا کی ربوبیت کا تقاضہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ ضروریات زندگی کا سامان کردے؛ بلکہ اس نے انسان کے لئے دستور العمل بھی دیا ہے، جس پر عمل کرنا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔

پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے، جس کا مقصد جماعتی نظام کی ضرورت کو بتلانا ہے، پھر چار فصلوں میں انسان کی چار اہم حاجتوں: تحفظ نسل، تحفظ مال، تحفظ عزت وعصمت اور تحفظ جان کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ بغیر اجتماعی نظام کے ان مقاصد کا صحیح طریقہ پر حاصل ہونا ممکن نہیں، پانچویں فصل میں واضح کیا گیا ہے کہ جماعتی نظام کے برقرار رکھنے کے لیے انسانی حکومت ضروری ہے، پھر انسانی حکومت کی دو صورتیں مروج ہیں: ایک شخصی حکومت، دوسری جمہوری حکومت؛ مگر عام طور پر عقلائے دہر نے شخصی حکومت کے مقابلے میں جمہوری حکومت کو پسند کیا ہے، مگر مولانا کی نگاہ میں یہ بھی مفاسد در مفاسد کا مجموعہ ہے، جس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس کا یہ مفسدہ ہی کیا کم ہے کہ جس کو لوگ اکثریت کا فیصلہ باور کرتے ہیں، درحقیقت وہ اقلیت کا فیصلہ ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ ایک حلقہ کے چند لوگوں کا فیصلہ ہوتا ہے، جو پوری امت کے تمام افراد کے مقابلے میں اقل قلیل ہی تو ہوتے ہیں؟

چھٹی فصل میں ان اسباب پر گفتگو کی گئی ہے، جو انسانی نظام حکومت کی ناکامی کا باعث ہوتی ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ چند انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے تئیں عام انسانوں کے قلوب میں جذبۂ وفاداری اور احترام بچند وجوہ پیدا نہیں ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ یہ قانون ہمارے جیسے انسان کا بنایا ہوا ہے، جو خواہشات اور عصبیتوں سے پاک نہیں ہو سکتے، دوسری یہ کہ اگر وہ امراض سے پاک بھی ہوں، پھر بھی تمام انسانی ضرورتوں کا انہیں علم نہیں ہے کہ ان کا وضع کردہ قانون ہر ایک کے لئے نافع ہو، تیسری بات یہ کہ کوئی بھی قانون ہو، وہ انسان کی مطلق آزادی کو محدود کرتا ہے؛ اس لیے اس کو ماننا انسان کے لیے بار خاطر ہوتا ہے۔

ساتویں فصل میں اس نکتہ پر بحث کی گئی ہے کہ قانون ساز کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیے اور ان صفات کا حامل بجز خدا کے کوئی اور نہیں ہے؛ کیوں نکہ وہ علم، ربوبیت، سماعت، کلام، تدبیر، ارادہ، انعام، تعذیب اور وحدانیت کے اوصاف کا حامل ہے، جو انسان میں بدرجۂ نقصان پائے جاتے ہیں، مضمون کی نزاکت اور اہمیت کے پیش نظر آٹھویں فصل میں بھی اسی کا بدرجۂ اتم خلاصہ ذکر کیا گیا ہے۔

نویں فصل میں ان انبیاء کرام کی خصوصیات وامتیازات پر روشنی دالی گئی، جو قوانین الٰہی کو حق تعالی سے لے کر اس کے بندوں تک پہنچاتے ہیں؛ کیوں کہ ہر شخص براہ راست اللہ کے بنائے ہوئے قانون سے واقف ہو جائے، یہ انتہائی مشکل ہے۔ دسویں اور آخری فصل میں پوری کتاب کا مقصد اور نتیجہ سپرد خامہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسانیت کی فلاح و بہبودگی کا ذریعہ صرف اور صرف ''حکومت الٰہی'' ہے، پھر اس کی خصوصیات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ (۳۳)

امارت شرعیہ شبہات و جوابات:

امارت شرعیہ کا قیام حضرت مولانا کی دیرینہ آرزو تھی، اس کے لیے وہ ہر وقت سوچتے رہتے اور جو بھی صاحب الرائے انہیں نظر آتا، اس سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال فرماتے، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اسی دور میں حزب اللہ کے نام سے نوجوانوں کی جماعت بنانا چاہتے تھے، مولانا نے اس موضوع پر ان سے بھی گفتگو کی، بلکہ مولانا آزاد کے اسارت رانچی کے زمانے میں بعض احباب کی معیت میں ان سے خصوصی اور خفیہ ملاقات کی اور انہیں نصوص شرعیہ کے ذریعے یہ باور کرایا کہ قیام امارت مسلمانوں کا ایک دینی وشرعی فریضہ ہے اور یہ کہ نصب امیر کے بغیر کوئی بھی تحریک پائیدار اور مفید نہیں ہوسکتی ہے، بالآخر مولانا ابوالکلام اپنی اسکیم چھوڑ کر حضرت مفکر اسلام

کے ہم خیال ہو گئے۔اسی طرح جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیو بندی علیہ الرحمہ اسارت مالٹا سے رہا ہو کر دیو بند تشریف لائے، تو حضرت سجاد نے دیو بند حاضر ہو کر ان سے اس مسئلے پر گفت وشنید کی، حضرت شیخ الہندؒ نے ان کے خیال سے صدفی صد اتفاق کیا، نیز حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی اور اس وقت کے اکابر سے مشورہ کر کے امارت شرعیہ کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تگ ودو کا آغاز کیا، چنانچہ سب سے پہلے جمعیۃ علماء ہند (جس کے وہ بانیوں میں سے تھے) کے اجلاس منعقدہ ۱۹۲۱ء میں اس کو ایک تجویز کی حیثیت سے پیش کیا اور ارکان کمیٹی سے پاس کرایا۔(۳۴)

لیکن سوءِ اتفاق یہ اسکیم عملی طریقے سے کل ہند سطح پر وجود پذیر نہ ہو سکی، جس کی متعدد وجو ہات ہیں، پھر حضرت نے اس کو صوبائی سطح پر کم از کم قائم کرنے کی تجویز دی اور اس کے لیے سب سے پہلے اقدام خود حضرت مفکر اسلام نے صوبۂ بہار واڑیسہ میں کیا اور ۱۹ شوال ۱۳۳۹ھ میں اس کو منصۂ شہود پر لا کر ہی دم لیا، جس کی تفصیل تاریخ امارت اور حضرت پر لکھی جانے والی اکثر تحریروں میں موجود ہے۔

مگر مسلمانوں کی بدقسمتی دیکھئے کہ غیروں کے ساتھ وہ بھی اس کی مخالفت کے لیے کمربستہ ہو گئے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روداد آپ سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ کے قلم سے پڑھیں، حضرت کا اثر خامہ ہے: ’’مولانا سجاد کی اس خالص مذہبی اور شرعی تحریک کی پوری قوت کے ساتھ اپنوں اور پرایوں نے مخالفت کی۔ایک طرف حکومت متسلط اور دوسری طرف اس ملک کی بدقسمت اکثریت نے اس کو خطرے کی نگاہ سے دیکھا، سب سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ ملک کی اس تعلیم یافتہ جماعت نے جس کو آج کل سب سے زیادہ مسلمانون کی نمائندگی کا شوق ہے اور جو مسلمانوں کی تہذیب اور کلچر کی حفاظت کی مدعی ہے، اس نے بھی اس مذہبی تحریک کو اپنے اقتدار اور اپنی مزعومہ لیڈری کے خلاف سمجھا، جو حضرات غیر شرعی قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور صرف نام کے مسلمان بن کر اسلامی قومیت کے حقوق کا بٹوارہ کرانا جن کا مقصد زندگی ہو چکا تھا اور جو اسلامی احکام کی پابندی کو اپنی آزادیٔ ضمیر کے مخالف سمجھے ہوئے تھے، انھوں نے اس تحریک کو دقیانوسی اور تیرہ سوسال پرانی تحریک کہنا شروع کیا، ان سب مخالفتوں سے زیادہ ان علماء کی مخالفت تھی، جن کا یہ فریضہ تھا اور قیام امارت جن کا شرعی اور قانونی فرض تھا۔(۳۵)

جن لوگوں نے اس سلسلے میں اپنے اختلاف کا اظہار کیا اور جنہیں اس نظام پر شرح صدر نہیں تھا، ان میں ایک نام مولانا عبد الباری فرنگی محلی رحمہ اللہ کا ہے، مولانا فرنگی محلی تحریک خلافت کے نمائندہ اور امت مسلمہ کے درد میں گھلنے والے انتہائی جری رہنما تھے، اخلاص ان کا شیوۂ زندگی تھا؛ اسی لیے ان کا یہ اختلاف بر سبیل عناد نہیں تھا؛ بلکہ دلائل کی بنیاد پر تھا، چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں تین مکتوب بہ طور شبہات کے ارقام کیے ہیں اور دفتر امارت شرعیہ بہار انہیں بھیجا ہے، جن میں سے دو کے جواب حضرت امیر شریعت اول شاہ بدرالدین پھلواروی نے دیا ہے اور ایک کا جواب بعد مفاہمت حضرت مفکر اسلام کے قلم سے ہے اور چوتھا خط رفع اختلاف کی شہادت کے طور پر مولانا عبد الباریؒ نے سپرد قلم کیا ہے۔

ان ہی شبہات و جوابات کا مجموعہ ''امارت شرعیہ شبہات و جوابات'' کے نام سے محمد ضمان اللہ ندیم صاحب نے جمع فرمایا ہے اور حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے اس کی ترتیب و تحقیق کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ ۸۷ر صفحات پر محیط ہے، جن میں سے نصف سے زیادہ حصہ حضرت مفکر اسلام کے رشحات قلم ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کی تحریری جوابات کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کی عام اجتماعی قانون کے تحت مسلمانوں پر نصب امیر واجب ہے، چاہے وہ جہاں بھی ہوں اور جس حال میں بھی ہوں، عقبہ اولی اور عقبہ ثانیہ کی بیعت مکی دور میں ہوئی، جس میں کفار کا قہر اور غلبہ تھا اور اس وقت مکہ ہو، یا مدینہ، دونوں ہی دارالحرب تھے اور یہ بیعتیں دارالحرب میں رہتے ہوئے مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر سمع و طاعت کی کی ہیں اور ہر اسود واحمر کے مقابلے میں جنگ پر یہ بیعت تھی، اسی طرح یمن کے علاقہ میں اسود عنسی کا بغاوت کر کے غلبہ واقتدار حاصل کر لینا دارالاسلام میں استیلاء کی نظیر ہے اور اس موقع پر صنعاء یمن میں بہ وقت صبح صادق مسلمانوں کا حضرت معاذ بن جبل کی امارت پر اتفاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اذن حاصل کیے بغیر مرکز اقتدار سے دور مسلمانوں پر استیلاء کفار کی صورت میں نصب امیر کی دلیل ہے۔

پھر اس شبہ کا جواب تحریر کیا ہے کہ کہیں وہ امیر حکومت وقت سے مغلوب ہو کر، یا کسی طرح کی طمع میں آ کر امت کا سودہ نہ کر لے، حضرت نے دوٹوک انداز میں ارقام فرمایا کہ اگر اس طرح کے شبہات کو راہ دی جائے گی تو اسلام کا مسئلۂ خلافت ہی خطرہ میں پڑ جائے گا، مثلاً: خلیفہ عبدالمجید، جس وقت سریر آرائے سلطنت ہوئے ہیں، وہ مسلمانوں کی مقہوریت ہی کا وقت تھا تو

کیاارباب حل وعقد نے نصب خلیفہ کو بے کار محض جان کر ترک کر دیا؟

امیر شریعت کی حیثیت کے سلسلے میں جو شبہ تھا، اس کی وضاحت کی ہے کہ اس کی حیثیت والی یعنی امیر ناحیہ کی ہوگی، نہ کہ امام اعظم اور خلیفہ المسلمین کی۔اسی طرح امیر شریعت کے ہاتھ پر سمع وطاعت کی بیعت کے لزوم پر انہیں اشکال تھا، حضرت نے اس حوالہ سے جس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ واقعۃً پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، چنانچہ ارقام فرماتے ہیں، ''مقاصدِ شریعت کی تحصیل تمام امت مسلمہ پر فرض ہے؛ لیکن تمام مقاصد کا انصرام آحاد امت سے فرداً فرداً ناممکن ہے؛ اس لیے آحاد امت جماعت کی شکل اختیار کر کے اس فرض سے سبکدوش ہو سکتے ہیں، اس لیے شریعت نے تحصیل مقاصد کے لئے اس اصول کی تعلیم دی ہے، کہ امت مسلمہ اپنے میں سے ایک فرد کو قائم مقام بنائے، جو آحاد امت پر احکام نافذ کر کے تمام کاموں کو انجام دینے کی سعی کرے، پس حقیقت میں جمہور امت حاکم و آمر و ناہی ہوتی ہے اور اس کا قائم کردہ امام اعظم یا والی اس اعتبار سے امت کا نائب ہوتا ہے؛ اسی لیے امت ہی کو عزل ونصب کا اختیار رہے، پس جو کچھ امام اعظم، یا والی آحاد امت میں تصرفات، قوانین شرع کے ماتحت کرتا ہے، وہ محض اس وجہ سے ہے کہ امت نے یہ کام اس کے سپرد کیا ہے اور اسی تفویض کے تحقق وثبوت کے لیے امت کے تمام افراد، یا اکثر کو اس شخص کی بیعت کرنی لازم ہے، جس کے ذمہ کارہائے امت تفویض ہوں۔

لزوم بیعت اور مبایعہ اس لیے ہے کہ امت اور شخص مفوّض ومولّٰی کے مابین یہ معاہدہ ہونا ضروری ہے اور اسی معاہدہ کا نام مبایعت ہے۔(۳۶)

مکاتیب سجاد:

یہ ۱۰۷ صفحہ کا رسالہ ہے، جو امارت شرعیہ بہار واڑیسہ سے شائع شدہ ہے، اس کو جمع اور مرتب کرنے کا کام محمد ضمان اللہ ندیم صاحب نے انجام دیا ہے، جبکہ حضرت قاضی شریعت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے اس کی تصحیح اور اس پر پیش لفظ تحریر کیا ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ حضرت کے خطوط کا مجموعہ ہے؛ مگر کوئی بھی خط ذاتی اور شخصی حیثیت سے نہیں لکھا گیا ہے؛ بلکہ امت کے اجتماعی مسائل ہی کو اپنے خون جگر سے لکھا ہے، اس میں جن افراد وشخصیات کو مخاطب بنایا گیا ہے، ان میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ، ڈاکٹر محمود وزیر تعلیم بہار، جناب وائسرائے ہند، مولانا حکیم محمد یعسوب ندوی اور علماء بہار اور نقبائے امارت شرعیہ ہیں۔

پہلا مکتوب جو بہار کے علماء کرام اور مشائخ عظام کے نام ہے، یہ درحقیقت امارت شرعیہ

بہار واڑیسہ کے قیام کے سلسلے میں ہونے والے اجلاس کا دعوت نامہ ہے، جس میں امارت شرعیہ کی اہمیت، اس کی شرعی ضرورت اور امیر شریعت کے انتخاب میں ملحوظہ شرائط وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے؛ بلکہ حضرت نے یہ بھی زیب قرطاس کیا ہے کہ ان ملحوظہ شرائط کے حامل علماء جو آپ کی نگاہ میں ہوں، ان سے مشاورت کے بعد ان کے اسمائے گرامی کی نشاندہی کریں، اور اگر میری تحریر کردہ شرائط اور معیار سے بہتر کوئی معیار، بہ حالت حاضرہ باصول شریعت جناب کے خیال میں آئے تو مجھ کو مطلع فرمائیں۔(۳۷)

دوسرا مکتوب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کے نام ہے، حضرت تھانوی نے اپنی تصنیف ''الحیلتہ الناجزۃ'' اور بعض دیگر رسائل حضرت مفکر اسلام کی خدمت میں ارسال کیا تھا، حضرت اس وقت سفر میں تھے جب وہ وارد ہوئے تو آنے کے بعد اس کا شکریہ ادا کیا ہے اور ایک اہم بات کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت تھانویؒ نے پریشان حال اور اپنے شوہروں کے مظالم سے تنگ عورتوں کے فسخ نکاح کے لئے پنچایت کی راہ اختیار کی ہے، جو کہ فقہ مالکی سے لیا گیا ہے، حضرت مفکر اسلام نے اس پر تحریر کیا ہے کہ یہ بلا ضرورت مسئلہ غیر کا اختیار کرنا ہے؛ کیونکہ فقہ حنفی میں اس کے لئے راستہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں بھی لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا کوئی والی مقرر کرے اور وہ والی، قاضیٔ شریعت کا تقرر کرے، یا خود مسلمان براہ راست اپنی تمام، یا اکثریت کی رضامندی سے کسی کو قاضی بنالے اور وہ مسلمانوں کے عائلی مسائل میں شریعت اسلامی کے موافق فیصلہ کرے، نیز حضرت تھانوی سے یہ فرمائش کی ہے کہ!

> ''اگر جناب کے متبرک قلم سے حنفیہ کے اس مسلک کا بیان بھی اب بطور ضمیمہ اس رسالہ میں شامل ہوجائے تو بہتر ہوگا''۔

دوسرا اور تیسرا خط مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کے نام بہ حیثیت ان کے صدر کے ہے، اس کی تقریب یہ ہوئی کہ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس پٹنہ میں منعقد ہونا تھا، جب مسٹر جناح پٹنہ حاضر ہوگئے، تو حضرت مفکر اسلام نے ''اسلامی مفاد کے تحفظ اور مشکلات کے واحد حل'' کے عنوان سے ان کے پاس ایک رقعہ بھیجا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس اجلاس سے مسلمانوں کے مفاد اور ان کی مشکلات کے حل کی تجویز پاس ہونی چاہیے، جس کے لیے حضرت نے حرب سلمی (سول نافرمانی) کی راہ سجھائی؛ مگر اجلاس ختم ہوا اور اس طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی تو حضرت نے یہ دوسرا خط ارقام کیا جس کو حضرت کے تلمیذ رشید مولانا عبد الصمد رحمانی رحمہ اللہ نے

اپنے تعارف اور حواشی کے ساتھ ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں حقوق اسلامی اور مسلم لیگ کے عنوان سے شائع کر دیا تھا، یہ خط اس کتاب کے ۳۱ سے شروع ہو کر ص:۸۱ پر ختم ہوتا ہے، جس کے بغلی عناوین کچھ اس طرح ہیں: مسلم لیگ انگریزوں سے جنگ کرنا نہیں چاہتی (جس کی شہادت خود ایک مرکزی لیگی لیڈر کے بیان سے پیش کی گئی ہے) مسلم لیگ کی مذہبی بے اعتنائی کی چند مثالیں، احکام وراثت میں تبدیلی، محکمہ دار القضا کی بربادی، سادرا ایکٹ، شریعت بل اور اس میں ترمیم، نص قرآنی کی تنسیخ، مسودۂ فسخ نکاح کا مرکزی اسمبلی میں حشر، مسودۂ فسخ نکاح میں ترمیم کے مفاسد، کرسچن میرج ایکٹ کے ذریعہ اسلامی قانون میں مداخلت بیجا، اجتماع بین الاختین اور الہ آباد ہائی کورٹ، ہندوانہ رسم ورواج اور انگریزی رسم ورواج مسلم لیگ کی نگاہ میں، ترنگا جھنڈا اور یونین جیک، پردہ اور اجلاسِ مسلم لیگ پٹنہ، کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس کے تاثرات کا فرق، مسلم لیگ کے کرنے کے آئینی کام، پرسنل لا اور مسلم لیگ، مسلم لیگ اور صوبائی مسائل، سیاسی مسائل اور مسلم لیگ، سول نافرمانی اور مسلم لیگ، مسلم لیگ کی اصلاحی تجویز، مسلم لیگ کا پس منظر، مسلم لیگ کو ایک خیر خواہانہ مشورہ، ایک اہم دینی مسئلہ اور اسلام کامل ومکمل دستور ہے۔

چوتھے خط میں حکومت بہار کی ایک اسکیم پر اعتراض کیا گیا ہے۔ پانچویں خط میں ساردا ایکٹ کے متعلق وائسرائے ہند کی غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے، چھٹے خط میں ایک لیگی شخص شاہ رشید احمد کی فرمائش پر مولانا حکیم یعسوب ندوی کے لکھے ہوئے خط کا جواب دیا گیا ہے، جس میں مسلم لیگ کی غلط پالیسیوں اور ان کے علماء سے بدظنی پر متنبہ کیا گیا ہے اور ان کے دعوت مباہلہ دینے پر مباہلہ کی حقیقت اور اس کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، ساتویں اور آخری خط میں امارت شرعیہ کے نقباء کو خطاب کیا گیا ہے، ان کو مفوضہ ذمہ داری کی انجام دہی پر ابھارا گیا ہے اور حرکت وعمل کی تلقین کی گئی ہے اور اپنے فرائض منصبی میں کوتاہی سے ڈرایا گیا ہے اور ان کے کرنے کے کام پر بالخصوص برانگیختہ کیا گیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے اس کتاب میں خشک فقہی بحثیں بھی ہیں، حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی ہے، مسلم لیگ اور حکومت وقت کی غلط پالیسیوں پر خیر خواہی کے جذبہ سے تنقید بھی ہے، کارکنان امارت کو احساس ذمہ داری کی تاکید بھی ہے اور علماء کرام کو تنظیم شرعی کے قیام کی تلقین بھی ہے۔

قانونی مسودے:

یہ صرف ۶۳ رصفحات کا ایک رسالہ ہے، جو حضرت مفکر اسلام کی قانونی تحریروں پر مشتمل

ہے، جمع وترتیب کا عمل ضمان اللہ ندیم صاحب نے انجام دیا ہے، جب کہ تصحیح وتقدیم حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی علیہ الرحمہ کے قلم سے ہیں، یہ رسالہ حضرت کی قانونی مہارت کا آئینہ دار ہے، اس میں سب سے پہلے مولوی غلام بھیک نیرنگ اور مولوی محمد احمد کاظمی مرحوم کا وہ مسودۂ قانون ذکر کیا گیا ہے، جس کو انہوں نے مسلم قانون فسخ نکاح کے نام سے مرتب کر کے حکومت وقت سے منظور کرانا چاہا تھا، اس کی چھ دفعات ہیں جن میں سے دفعہ تین کی ۲ر شقیں ہیں، اور دفعہ پانچ کی ٦ر شقیں ہیں، جب یہ مسودہ حضرت مفکر اسلام کے سامنے آیا تو حضرت نے اس کے مضمرات اور تناقضات پر مشتمل ایک تحریر ان حضرات کی خدمت میں پیش کی، بالخصوص دفعہ ٦ کہ جس میں عورت کے ارتداد کو عدم موجب فسخ نکاح قرار دیا گیا تھا، اس کو انتہائی مضر اور خطرناک بتایا ہے اور اس کی وجوہ کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

پھر حضرت نے اپنے قلم سے از سر نو ''مسلم قانون انفساخ نکاح'' کے نام سے اس کا مسودہ تیار کیا ہے، جو کہ ایک تمہید اور نو دفعات پر مشتمل ہے، جن میں ابتدائی پانچ دفعات مبادیات کے قبیل سے ہیں، جب کہ بقیہ ۴ر دفعات اختیارات سے تعلق رکھتی ہیں، اس کے بعد ایک مقالہ میں ان دفعات کی وجوہات شرع اسلامی کی روشنی میں سپرد قلم کیا ہے، آج کے مدارس کی اصطلاح میں اپنے مسودہ قانون بابت انفساخ نکاح مسلم کی اپنے ہی قلم سے شرح بھی کر دی ہے، تا کہ شرع اسلامی سے واقف ہر شخص اس کی خوبیوں اور باریکیوں پر مطلع ہو سکے اور اس کو اس پر شرح صدر ہو سکے۔

اس کے بعد ''مسودۂ نظارت امور شرعیہ'' کے عنوان سے حضرت کی ایک تحریر ہے، جس میں اس وقت کی آزاد اور جمہوری حکومت سے اس بات کے مطالبہ کا اعادہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک با اختیار والی امور شرعیہ کی انجام دہی کے لئے مقرر کیا جائے، جو کہ قاضی کا تقرر کرے اور مسلمانوں کے تمام مذہبی قوانین اور امور مذہبی (جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہو) کا نگراں رہے اور خصوصیت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم وتربیت کا محافظ ہو، اس کے لئے حضرت نے نظام شرعی کا ایک خاکہ اور اسکیم ترتیب دیا ہے، جو ۴ر دفعات کی حامل ہے، جن میں سے پہلی دفعہ پانچ شقوں پر مشتمل ہے، جبکہ چوتھی دفعہ تین شقوں کو محیط ہے، اس کے بعد اوقاف پر زرعی ٹیکس مذہب میں مداخلت، کے عنوان سے ایک تحریر ہے، جس کا پس منظر حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے الفاظ میں یہ ہے کہ ''بہار اسمبلی میں کانگریس کی طرف سے زراعتی آمدنی پر ٹیکس کا مسودۂ قانون

پیش ہوا، مولانا کو شبہ ہوا کہ کہیں اس قانون کے تحت میں اوقاف بھی نہ آجائیں، چنانچہ انہوں نے پورا مسودہ پڑھوا کر سنا، سننے پر مولانا کا خدشہ صحیح نکلا، ابتداءً مولانا کی یہ کوشش رہی کہ ارباب حکومت سے مل کر اس مسئلہ کو باہمی طور پر طے کیا جائے؛ لیکن جب وہ اس پر راضی نظر نہ آئے تو مولانا کو اخبارات میں بیانات اور پھر سول نافرمانی کی دھمکی دینا پڑی''۔(۳۸)

یہ تحریر حضرت نے اسی وقت قلم بند فرمائی، جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ زرعی ٹیکس سے مسلم اوقاف کو علاحدہ رکھا جائے، اسی کے ساتھ حضرت مولانا نے مولانا ابوالکلام آزاد کو مسئلہ سلجھانے کے لئے پٹنہ آنے کی دعوت دی، چنانچہ مولانا آزاد کی وساطت سے حکومت بہار نے ترمیم منظور کی، اور زراعتی آمدنی پر ٹیکس کا قانون اوقاف پر عائد نہ ہوسکا۔

سب سے آخر میں حضرت مولانا کی تحریر تحفظ مویشیان کا بل، پر اعتراض ہے جو کہ اسمبلی اور کونسل بہار میں پیش ہوا تھا، مولانا نے اس بل کے مضمرات اور نقصانات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے مسلمانوں سے مطالبہ کیا ہے کہ ہر قصبہ، ہر شہر؛ بلکہ ہر گاؤں میں جلسے کر کے مندرجۂ ذیل صرف ایک تجویز پاس کر کے اس بل کی مخالفت کریں اور ان کی نقلیں سکریٹری اسمبلی اور سکریٹری کونسل بہار کے نام بذریعہ ڈاک روانہ کرے اور اخبارات کے نام بھی اشاعت کے لئے بھیج دیں۔ تجویز کا متن حسب ذیل ہے:

یہ جلسہ، تحفظ مویشیان کے بل کو جو اسمبلی اور کونسل بہار میں پیش ہوا ہے، نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کو ملک اور وطن کے لیے ایک خطرہ عظیم خیال کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے حق میں سم قاتل تصور کرتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اس بل کا حقیقی منشا یہ ہے کہ ذبیحہ وقربانی کو قانونا بند کر کے مسلمانوں کے مذہبی وذاتی حقوق کو پامال کیا جائے، جس کو کوئی مسلمان ایک لمحہ کے لیے گوارہ نہیں کرسکتا ہے، اس جلسہ کا پختہ خیال ہے کہ اگر گورمینٹ ہندو گورمینٹ بہار نے ان بلوں کو رد نہیں کیا اور کسی شکل میں بھی قانون بننے کا موقع دیا تو اس کے بعد ملک کے اندر جو حالت رونما ہوگی، اس کی ذمہ داری تمام خود حکومت پر عائد ہوگی۔

مقالات سجاد:

یہ ۱۶۵ر صفحات کا کتابچہ ہے، جس میں مختلف موضوعات پر تحریر کئے ہوئے حضرت مولانا سجاد کے علمی مقالات ہیں، جن کو مولانا ضمان اللہ ندیم صاحب نے جمع کر کے مرتب کیا ہے اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام علیہ الرحمہ نے انکی تصحیح فرما کر پیش لفظ سپرد قرطاس کیا ہے۔ کل

مقالات کی تعداد جو اس مجموعہ میں شامل ہے ۱۲؍ ہیں اور آخر میں حضرت کا ایک خطاب بھی ہے، جو آپ نے بہ حیثیت صدر اجلاس جمعیۃ علماء ہند ضلع رانچی، منعقدہ ۷؍ جولائی ۱۹۳۹ء میں زبانی ارشاد فرمایا تھا، بعض حضرات نے اسکا خلاصہ قلمبند کیا تھا، اسی کو یہاں شاملِ اشاعت کیا گیا۔ اس خطاب میں آپ نے سورۂ فاتحہ کی آخری تین آیتوں کی روشنی میں مسلمانوں کا نصب العین متعین کیا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کا نصب العین اور لائحہ عمل وہی ہے، جو انبیاء کرام، صدیقین، شہداء، اور صالحین کا لائحۂ عمل اور عملی زندگی کے پروگرام ہیں اور ان حضرات کا لائحہ ٔعمل، حکومت الٰہیہ، کا قیام ہے؛ اس لیے مسلمانون کو اپنے نصب العین ''حکومت الٰہیہ'' کے قیام سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔

مقالات کو مرتب نے دو باب پر تقسیم کیا ہے: پہلا باب سیاسی مقالات کا ہے اور دوسرا باب اصلاحی مقالات کا ہے، اول باب میں ۵؍ مقالات شامل ہیں، جبکہ باب ثانی میں ۷؍ مقالات مندرج ہیں، ان کے عناوین ہیں: ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی، اسلام اور مسلم قومیت کے کیا معنی ہیں، گاندھی جی اور کانگریس، فرقہ وارانہ معاملات کا فیصلہ کن اصولوں پر ہونا چاہیے، مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا اسکیم کا جائزہ، اصلاح تعلیم ونظام مدارس عربیہ، پورنیہ کے مسلمان اور ان کی معاشرت، نشہ خوری سے اجتناب فرض ہے، تحریک تبرا، غزوۂ احد کی بصیرتیں، تحدیث نعمت، زلزلے اور حادثے ایک تاریخی جائزہ۔

ان تحریروں میں بہ قول قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، عظیم مفکر کی جولانی طبع، وسعت فکر، تدبر، گہرائی وگیرائی اور اجتہادی روح کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے، جو مولانا سجاد کی امت کی اصلاح وتعمیر، شوکت وقوت کے لیے بے قراری وبے چینی کا مظہر ہے۔ (۳۹)

دستور امارت شرعیہ:

یہ صرف ۲۸؍ صفحات کا کتابچہ ہے، جو کہ امارت شرعیہ سے شائع ہوا ہے، اس میں حضرت مفکر اسلام نے امارت شرعیہ کا دستوری خاکہ مرتب کیا ہے، جو کہ آپ کی قانون دانی اور اسکیم سازی کا شاہد عدل ہے۔

متفقہ فتوی جمعیۃ علماء ہند:

یہ بھی ۱۶؍ صفحات کا ایک رسالہ ہے، جو کہ جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے آپ نے انگریزوں سے ترک موالات کے سلسلے میں سپرد قلم کیا ہے، اس پر اس وقت کے تقریباً ۵۰۰؍ علماء

ذی وقار کے تائیدی دستخط ثبت ہیں، اس فتوی کی اشاعت اسی زمانہ میں مفتی مشتاق احمد نے شہر میرٹھ محلّہ کوٹلہ سے باہتمام حافظ محمد سعید ہاشمی تاجر کتب و مالک مطبع ہاشمی میرٹھ، کی تھی، اس فتوی کا جو اثر عوام وخواص پر ہوا تھا، وہ اب محتاج بیان نہیں ۔(۴۰)

تذکرۂ جمعیۃ علماء ھند:

یہ حضرت مفکر اسلام کی بہت ہی اہم اور وقیع تالیف ہے، جسے آپ نے ۱۹۴۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کے ناظم عمومی بننے کے بعد تالیف کیا تھا، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اس کے متعلق تحریر کرتے ہیں: ''جونپور کے اجلاس کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے جدید دستور العمل کے پیش نظر جب حضرت مولانا کا انتخاب ناظم اعلیٰ کے عہدے کے لئے کیا گیا، تو اگر چہ مولائے موصوف نے امارت شرعیہ بہار اور جمعیۃ علماء بہار کے مشاغل ومصروفیتوں کی وجہ سے ان کو قبول کرنے میں بہت زیادہ پس وپیش کیا؛ مگر ورکینگ کمیٹی کے اصرار پر جب قبول فرمایا لیا تو اس وقت سے وفات کے وقت تک زندگی کے اس تھوڑے وقفہ میں اندرونی تنظیم اور بیرونی نشرواشاعت کے علاوہ جمعیۃ علماء کی یہ نمایاں خدمت انجام دی کہ جمعیۃ علماء کی بیس سالہ تبلیغی، دینی، سیاسی، اجتماعی، خدمات اور عملی جدوجہد کا ایک مرقع تالیف فرمایا، جو ''تذکرۂ جمعیۃ علماء ہند'' کے نام سے معنون کیا گیا، اور عجیب بات یہ پیش آئی کہ باوجود اس امر کے کہ اس تذکرہ میں جمعیۃ علماء ہند کی گذشتہ خدمات کی فہرست مرتب کرنے اور مسلمانانِ ہند کے سامنے ان کی خدمات کی تفصیل کو یکجا کر کے ان کی توجہ کو جمعیۃ علماء ہند کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے سوا کچھ نہ تھا؛ مگر حکومت دہلی اس کو بھی برداشت نہ کرسکی اور فوراً اس کو ضبط کرلیا اور دفتر کی تلاشی لے کر اس کی تمام کاپیاں حاصل کرلیں ۔(۴۱)

حضرت مولانا احمد سعید رقم طراز ہیں: آخری زمانے میں جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے اور صرف دو دن میں انہوں نے جمعیۃ علماء ہند کی بیس سالہ زندگی کی ایک مختصر تاریخ لکھ دی ۔(۴۲)

استاد محترم حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی سابق مفتی دارالعلوم دیوبند ارقام فرماتے ہیں: مولانا کا دماغ سیاسی کاموں میں بہت بیدار تھا اور ساری اہم تجاویز مولانا ہی مرتب کیا کرتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کو باضابطہ طور پر جمعیۃ علماء ہند کا ناظم اعلی بنایا گیا اور مولانا محمد سجاد کو اس عہدہ کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، آپ نے

''تذکرۂ جمعیۃ علماء ہند'' کے نام سے اس زمانہ میں جو مقالہ شائع فرمایا، اس کو پڑھا جائے، پھر اندازہ ہوگا کہ جمعیۃ علماء ہند سے کس قدر گہرا تعلق تھا۔ (۴۳)

علماء بہار کا متفقہ فتوی:

۱۹۱۹-۲۰ء بمطابق ۴۰-۱۳۳۹ھ ہندو مسلم اتحاد کا بہت ہی پُر زور دور تھا، مسلم قیادت نے اپنی رائے یہ بنائی تھی کہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لئے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے، چنانچہ اس وقت اس اتحاد کے بہت سے ایسے مظاہر سامنے آئے، جو شرعی نقطۂ نگاہ سے اعتدال سے گذر کر افراط وتفریط کی حد تک پہنچ گئے، یہاں تک کہ ایک طرف انفرادی طور پر بعض مسلمان لیڈروں نے جوش اتحاد میں پیشانیوں پر قشقہ لگالیا اور کاندھوں پر ارتھی اٹھالیا اور دوسری طرف جماعتی حیثیت سے مسلم لیگ نے اپنے آل انڈیا اجلاس امرتسر منعقدہ ۱۹۱۹ء میں ''ترک قربانی گاؤ'' پر تجویز پاس کردی، جس کا متن حسب ذیل ہے:

آل انڈیا مسلم لیگ کی رائے ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اہل ہنود نے جس نیک رویہ کا اظہار کیا ہے، اس کے اعتراف اور ہندوؤں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اتحاد کو زیادہ مضبوط کرنے کی غرض سے بقرعید کے موقع پر جہاں تک ممکن ہوسکے گائے کی قربانی کے بجائے دوسرے جانوروں کی قربانی کی جائے۔ (۴۴)

حضرت مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے جب اس صورت حال کا مشاہدہ کیا تو ان کی دینی غیرت وحمیت بھڑک اٹھی، اور اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ اس پر روک لگانا ضروری خیال کیا، اس سلسلہ میں حضرت نے ایک فتوی مرتب کیا، اور اس کو جمعیۃ علماء بہار کے اجلاس دربھنگہ منعقدہ ۱۳۳۹ھ میں پیش کیا، جو متفقہ طور پر منظور کیا گیا اور اس پر تمام علماء بہار سے دستخط کروا کر اسی وقت ایک رسالہ کی شکل میں ''علماء بہار کا متفقہ فتوی'' کے نام سے دو ہزار (۲۰۰۰) کی تعداد میں شائع کیا۔

اس رسالہ میں قشقہ لگانے، ہندوؤں کے مذہبی مراسم اور میلوں میں شریک ہونے، کنٹھا باندھنے (جو بھگت ہونے یعنی التزام ترک گوشت خوری کی علامت سمجھی جاتی ہے) اور ہندوؤں کے گاؤ پرستی کے جذبے کا پاس ولحاظ یا ان کے جبرودباؤ کی بنا پر ''ذبح گائے'' سے خود پرہیز کرنے اور دوسروں کو اس کی تلقین کرنے کے سلسلہ میں سوال کیا گیا ہے اور حضرت سجادؒ نے اس کا مفصل اور مدلل جواب سپرد قرطاس کیا، جس کا خلاصہ حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے

اپنے مضمون میں ذکر کر دیا ہے اور وہیں سے لے کر حضرت کے فتاوی ''فتاوی امارت شرعیہ'' میں شامل اشاعت کیا گیا ہے۔(۴۵)

اصل رسالہ راقم کے نظر نواز نہیں ہوسکا کہ اس کی ضخامت اور اس کے تمام مندرجات پر تبصرہ کیا جائے، اس کا جو حصہ مذکورہ بالا دونوں مصادر میں نقل کیا گیا ہے، اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن، حدیث، فقہ اور اقوال سلف کی روشنی میں مذکورہ سوالوں کا جواب آپ نے تحریر کیا ہے، جس میں ان اشیاء کی حرمت کا اثبات کر کے اپنی دینی غیرت وحمیت کا واضح ثبوت فراہم کیا ہے۔

اخیر میں حق تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس مقالہ کو شرف قبولیت عطا کرے اور امت مسلمہ کو حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کے افکار وخیالات سے استفادہ کی توفیق مرحمت فرمائے اور حضرت مفکر اسلام کے جنت الفردوس میں درجات بلند فرمائے۔(آمین)

مصادر ومراجع

(۱) دیکھئے: حیات سجاد:۲۳
(۲) حیات سجاد:۵۷
(۳۔۴) حیات سجاد:۵۷
(۵) فتاوی امارت شرعیہ:۱/۳۱
(۶) حیات وخدمات:۴۲۶
(۷) حیات وخدمات:۱۵۹
(۸) دیکھئے فتاویٰ امارت شرعیہ:۲۲۱
(۹) دیکھئے فتاویٰ امارت شرعیہ:۲۱۱
(۱۰) دیکھئے فتاویٰ امارت شرعیہ:۲۰۸-۲۰۹
(۱۱) دیکھئے:۵۱-۵۹
(۱۲) دیکھئے:۶۱
(۱۳) دیکھئے:۲۵۸-۲۹۰
(۱۴) دیکھئے:۲۹۰
(۱۵) دیکھئے:۱۶۸
(۱۶) دیکھئے:۲۴

(۱۷) دیکھئے:۲۱۱

(۱۸) دیکھئے:۲۸۷-۲۸۸

(۱۹) دیکھئے:۱۳۶

(۲۰) دیکھئے:۱۹۴

(۲۱) دیکھئے:۲۰۰

(۲۲) دیکھئے:۲۳۰

(۲۳) دیکھئے۲۱۹

(۲۴) دیکھئے:۲۳۳-۲۳۴

(۲۵) دیکھئے:۲۳۲

(۲۶) دیکھئے:۲۰۲

(۲۷) دیکھئے:۴۲

(۲۸) دیکھئے:۲۳۲

(۲۹) حیات وخدمات:۱۶۵-۱۷۱

(۳۰) حیات سجاد:۷۷نیز حیات وخدمات:۲۹۵

(۳۱) دیکھے حیات وخدمات:۸۸-۹۴نیز صفحہ:۱۷۱-۱۵

(۳۲) حیات وخدمات:۱۷۵

(۳۳) دیکھئے حیات وخدمات:۱۷۵-۱۷۸

(۳۴) دیکھئے: حیات سجاد ص:۱۱۰-۱۱۱، نیز ۱۲۷-۱۲۸اورخطبۂ صدارت ص:۱۲۶-۱۲۷

(۳۵) حیات سجاد:۹۴

(۳۶) دیکھئے:۴۹-۵۰

(۳۷) دیکھئے صفحہ نمبر ۱۶

(۳۸) حیات سجاد۱۴۹

(۳۹) دیکھئے: کتاب ہذا کا پیش لفظ

(۴۰) دیکھئے: حیات سجاد ص:۹۰-۹۱

(۴۱) حیات سجاد ص:۷۹

(۴۲) حیات سجاد ص،۹۸

(۴۳) حیات وخدمات ص،۳۹۰

(۴۴) روداد آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس امرتسر ص:۱۲۱

(۴۵) دیکھئے: حیات سجاد ص:۴۵-۴۷ نیز فتاوی امارت شرعیہ ۱/۳۰۵-۳۰۶

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے علوم ومعارف

خطبات ومکاتیب کا ایک مطالعہ

امتیاز احمد واعظ قاسمی
استاذ تفسیر وفقہ جامعہ ربانی منوروا شریف سمستی پور

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم اور ممتاز شخصیت دنیا میں کم پیدا ہوتی ہے، جنہوں نے ہر میدان میں انسانیت کی رہنمائی کی، ہر مشکل وقت میں قوم وملت کے کام آئے اور جو ہر لمحہ اپنے اندر قوم کی فکر اور کڑھن محسوس کرتے تھے، آپ کے خطبات ومکاتیب میں بھی آپ کے سوز جگر کی تپش موجود ہے، آپ کی فکرمندی کے جلوے وہاں بھی محسوس ہوتے ہیں، آپ کے افکار کا بڑا حصہ ان میں پوشیدہ ہے، آیئے آج فکر وخیال کے ان تراشوں سے ایک گلدستہ تیار کریں، جو اس زوال پذیر دور میں رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں ماضی کی جھلکیاں بھی ہیں، حال کا آئینہ بھی اور مستقبل کی پیش بندیاں بھی۔

جمیعت علماء کے قیام کا پس منظر:

مسلمانوں پر ہونے والے مصائب وآلام کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے علمائے کرام کو اجتماعی غور وفکر کے ذریعہ اس کو دور کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے، اسی حقیقت کو حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے اجلاس جمیعۃ علماء ہند منعقدہ مرادآباد کے اپنے خطبۂ صدارت میں اس طرح بیان فرمایا:

> ’’یوں تو مسلمانوں کے ادبار وتنزل وہلاکت کا دور تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اور اس وقت سے مسلمانوں پر پیہم مصیبتیں نازل ہورہی ہیں، جس سے تمام تاریخ کے صفحات لبریز ہیں اور گذشتہ چند سالوں میں ایک سے زائد مرتبہ اس کا آموختہ بھی پڑھا گیا؛ کیونکہ موجودہ مسلمانوں کے تازہ زخموں کو ہرا کرنے کے لئے پرانے نمک دانوں سے نمک پاشی کی ضرورت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور کے اندر ایسے ایسے مہالک اور خطرات سامنے آئے ہیں کہ جن کی نظیر تاریخ کے صفحات میں ملنی مشکل ہے اور یہ مہالک غافل سے غافل مسلمانوں کو متنبہ وہوشیار کرنے کے لئے کافی ہیں۔

ایسی سراسیمگی وپریشانی کی حالت میں اللہ تعالی نے آخر مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی

کہ وہ غور وفکر کریں کہ ان پر مصیبتیں کیوں نازل ہو رہی ہیں، ہلاکت و بربادی کے اسباب وعلل کیا ہیں؛ کیوں کہ قانون الٰہی یہ ہے:﴿ما اصاب من مصیبة الا باذن اللّٰہ و من یؤمن باللّٰہ یھد قلبه واللّٰہ بکل شیء علیم﴾(۱)

(جو کچھ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں سب اللہ کے حکم سے (اور اس کے حکم ومصالح واسباب وعلل کو کوئی نہیں جانتا) لیکن جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ان کے قلوب کو اللہ پاک ہدایت کرتا ہے(وہ سمجھتے ہیں کہ مصیبتیں کیوں آئیں اور ان سے نجات کا کیا طریقہ ہے اور یوں تو مدعیان ہدایت بہت سے پیدا ہو سکتے ہیں؛ لیکن) اللہ تعالی ہر شئے کو جانتا ہے(اور اس کو خوب معلوم ہے کہ کون قلب راہ یافتہ ہے)۔

چنانچہ اس قانون کے ماتحت اکثر مسلمانان ہند اور علماء ہند کی معتد بہ جماعت نے ان حقائق اور واقعات پر غور وخوض کیا اور اس کے علل واسباب کے ساتھ اس کے دفاع کی تدبیریں بھی سوچنے لگے۔آخر اللہ پاک نے ان حضرات کی رہنمائی کی اور حکمائے امت کو ان امراض مہالکہ کی تشخیص کی توفیق عطا فرمائی اور پھر فوری طور پر اس ہلاکت کے ہیجان وسوران کو توڑنے کے لیے جو کچھ تدبیریں ہو سکتی تھیں کی گئیں۔انھیں تدابیر میں سے ایک اہم تدبیر جمیعت کا قیام تھا؛ تاکہ علماء کرام جو حقیقۃً حکمائے امت ہیں،امت کو مہالک سے نجات دلانے کے لیے بہتر سے بہتر نسخے تجویز کریں اور دوسروں کے نسخہ جات کو شریعت کے اصول حکمیہ سے جانچ کر امت کے استعمال کے لیے پیش کریں"۔(۲)

جمیعت علماء ھند سے غفلت:

جمیعت علماء ہند کی بقا اور استحکام کی طرف عوام الناس اور زعمائے قوم کے ساتھ خاص طور پر علماء کرام کو توجہ دلاتے ہوئے حضرت مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:

"کچھ عرصہ سے میں دیکھ رہا ہوں کہ اب مسلمانان ہند کو جمیعۃ علماء ہند کی بقا اور استحکام کی فکر نہیں ہے اور میری یہ شکایت کچھ صرف عوام الناس سے اور زعمائے قوم ہی سے نہیں؛ بلکہ اپنے گروہ کے محترم علماء کرام سے بھی مجھ کو مؤدبانہ شکایت ہے کہ یہ حضرات بھی جمیعۃ کے معاملہ میں ایک طرح پر عازمانہ غفلت برت رہے ہیں"۔(۳)

جمیعت علماء مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے والی طاقت:

اسلام اور مسلمانوں کو بالکل ختم کرنے کی باطل طاقتیں جو کوششیں کر رہے ہیں،اس کی فکر اور

حفاظت ہندوستان میں اس وقت کی اہم جماعت جمیعت علماء ہند کو تھی؛ اس لیے حضرت مولاناؒ نے ان خطرات سے حفاظت کرنے والی اہم طاقت جمیعۃ علماء ہند کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''کامل غور وخوض کے بعد میں نہایت وثوق کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ دنیائے اسلام کے حالات اور خود ہندوستان کے واقعات جو ہمارے اور آپ کے سامنے پیش آرہے ہیں ان کے اسباب وعلل اور ان کے نتائج وعواقب مسلمانوں کے لیے ایک مہالکہ عظیمہ کی خبر دے رہے ہیں؛ اگر ہم نے جلد از جلد اسلام اور مسلمانوں کی فکر نہ کی تو یقین مانئے کہ تمام باطل پرستان اسلام اور مسلمانوں کی بیخ وبن اکھاڑ کر رکھ دیں گے اور اس کے ساتھ یہ بھی مجھے یقین ہے کہ ان تمام مہالک سے محفوظ رکھنے کی اگر کوئی طاقت اس وقت ہندوستان میں موجود ہے تو وہ صرف جمیعۃ علماء ہے''۔(۴)

مصائب سے بچنے کے رہنما علماء ہیں:

مسلمانوں پر ہونے والے مصائب وآلام وہ سب اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو چھوڑنے اور اس کو پس پشت ڈالنے کی وجہ سے ہو رہے ہیں، جن سے بچنے کی صورت بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''کیوں کہ جتنے مصائب مسلمانوں پر آرہے ہیں وہ صرف ترک شریعت کے باعث؛ اس لیے اگر اس کا دفاع بھی ممکن ہے تو صرف اعتصام بالشریعت کے ذریعہ؛ لیکن یہ معلوم ہے کہ سوائے علماء ماہرین کے اور کون ہے، جو اس کی طرف رہنمائی کرے۔

ہر کسے از سرِّ او آگاہ نیست   زانکہ اینجا ہر کسے را راہ نیست

اس لیے سب سے پہلے تمام قوم اور بالخصوص علمائے کرام سے ہماری پر زور درخواست ہے کہ خدارا غفلت کو دور کیجئے، جمیعت کو مستحکم اور مضبوط بنائیے، ایسا نہ ہو کہ ہماری لاپروائیوں اور غفلت کی بدولت (خدانخواستہ) یہ تباہ اور برباد ہو جائے، خوب یقین کر لیجئے کہ اس وقت جمیعت کے ساتھ غفلت کرنا عین اپنی خودکشی کے مرادف ہے۔

شرم بادت کہ نمیدانی وآگاہ نئی   کہ ترا در رہ ایں مادیہ چندیں خطرست (۵)

اسلامی جمہوریت کے فوائد:

مروجہ جمہوریت کے مقابلہ میں اسلامی جمہوریت کا فائدہ یہ ہے کہ ملک کا ہر ایک شخص،

چاہے وہ غریب سے غریب ہو؛ لیکن وہ اہل الرائے ہوتو وہ صاحب شوریٰ ہوتا ہے، وہ مشورہ دے سکتا ہے اور احکام شرع سے واقف ایک ادنیٰ فرد بھی خلاف شرع امور میں بڑے سے بڑے حاکم کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے، اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے حضرت مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:

''بخلاف اسلامی جمہوریت کے کہ اصحاب شوریٰ معین ومحدود نہیں ہیں؛ بلکہ ملک کا ہر اہل الرائے والعلم صاحب شوریٰ ہے اور ہر ایک کے مشورہ کے لیے دروازہ کھلا ہوا ہے غریب سے غریب آدمی جس کی دنیاوی حیثیت کی کوئی وجاہت نہیں مگر اہل العلم والرائے ہے، وہ ہر وقت مشورہ دے سکتا ہے اور اس سے مشورہ لیا جاسکتا ہے اور اگر بعد مشورہ کوئی ایسا حکم نافذ کیا جائے، جو خلاف حق ہے تو امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ادنیٰ فرد کو جو احکام شرع سے واقف ہے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بڑے سے بڑے اسلامی حاکم کا ہاتھ پکڑ لے اور سختی سے زجر کرسکتا ہے۔ آپ حضرات کے سامنے خلفائے راشدین کے واقعات موجود ہیں، ان سے اسلامی جمہوریت کی پوری شان عملی صورت میں نظر آتی ہے ان پر غور کیجیے اور مروجہ جمہوریت کو سامنے رکھئے، دونوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے؛ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ مروجہ جمہوریت اسلامی جمہوریت کو مردہ کردیتی ہے اور اس کے ساتھ ہزاروں دیگر مفاسد کا فتح باب کرتی ہے''۔(۲)

وطنی پرستی کا مرض:

یورپ کی باطل طاقتوں کی طرف سے مسلمانوں میں پھیلایا جانے والا تیسرا مہلک مرض وطن پرستی ہے؛ تاکہ مسلمان اسی میں الجھ جائیں اور ان میں اتحاد عالم نہ ہونے پائے، پھر باطل دشمن طاقتیں آسانی سے ایک ایک کو اپنا لقمہ بناسکیں، اس حقیقت کو آشکارا کرتے ہوئے حضرت مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:

''تیسرا نہایت مہالک مرض جو اب چند سالوں سے پیدا ہورہا ہے، وہ مسلمانوں کی وطنی فدویت ہے؛ یعنی قومیت کی تعمیر اپنی وطنیت کی زمین پر کی جائے۔

حب الوطن از ملک سلیماں خوشتر

حالانکہ اسلامی قومیت کی تعمیر صرف کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور اصول اسلام کی تسلیم انقیاد پر ہے اور اسلامی قومیت حدود جغرافیہ سے بالاتر ہے۔

وطنیت کے جذبہ کا یقیناً آخری یہی اثر ونتیجہ ہوگا کہ مختلف ممالک کے مسلمان ایک دوسرے سے بے نیاز ہوکر اس وطن پرستی میں مشغول ہوجائیں گے، جو یقیناً اتحاد عالم اور

اسلامی مرکزیت کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنادے گا،اس کے بعد مغربی گروہ ایک ایک کر کے ہرایک کو نگلنا شروع کردیں گے‘‘۔(۷)

ان امراض کے شیوع کے اسباب:

علماء کرام جو دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے مسلمانوں کے رہنما ہوتے ہیں، انھوں نے مسلمانوں کے نفس کی اصلاح اور علوم شرعیہ میں تو بڑی بڑی خدمتیں انجام دیں؛ لیکن اجتماعی زندگی اور حکومت وسیاست میں جس طرح خدمت انجام دینی تھی،اس طرح کما حقہ فرض ادا نہیں کیا گیا،اسی کوتاہی کو حضرت مولاناؒ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’’ان تمام امور کے اصلی وجوہ کیا ہیں؟ جہاں تک میں حالات اور واقعات اور اسلامی سوانح پر غور کرتا ہوں تو سب سے بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ علمائے ربانیین اور علوم شرعیہ کے ماہرین نے اگرچہ اپنے نفس کی اصلاح اور علوم شرعیہ وحکمیہ کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دیں اور انفرادی زندگی کی اصلاح میں اپنی عمریں گذاریں؛ مگر مجھے معاف فرمایا جائے،ایک بہت بڑی کوتاہی یہ ہوئی ہے کہ اجتماعی زندگی،حکومت اور سیاست مدن کے متعلق جوان کے فرائض تھے ان سے کسی نہ کسی بنا پر چشم پوشی کی گئی اور کما حقہ فرض ادا نہیں کیا۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میدان سیاست میں ان حضرات نے کبھی قدم نہیں رکھا اور اجتماعی زندگی کی خاردار وادی میں انھوں نے بادیہ پیمائی نہیں کی، حاشا وکلّا۔اگر خدانخواستہ یہ حضرات ان ابواب میں کچھ بھی نہ کرتے تو مسلمان جس حالت میں اس وقت موجود ہیں غالباً یہ بھی نہ ہوتا؛ بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ جس قدر رہونا چاہئے تھا اور جس حد تک کرنا چاہئے تھا وہ قرون اولیٰ کے بعد سے نہ ہوا اور ان میدانوں میں ہمیشہ علمائے ربانیین کی کمی نمایاں طور پر محسوس ہوتی رہی، اگر علمائے کرام کی معتد بہ جماعت علمی اور عملی حیثیت سے ان میدانوں میں پیش پیش رہتی تو غالباً معاملہ اس حد تک نہ پہونچتا‘‘۔(۸)

سیاست میں علماکی شرکت کے بارے میں غلط تصور:

علمائے کرام کے سیاست میں عدم دلچسپی کی وجہ سے آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ غلط تصور پیدا ہو گیا کہ علمائے کرام کا سیاست میں شریک ہونا بیجا مداخلت اور منصب علماء کے منافی ہے، چنانچہ اس غلط تصور کو حضرت مولاناؒ بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایاتے ہیں:

’’اسی عملی دلچسپی کی کمی کا نتیجہ ہے کہ آج علماء اسلام کے متعلق بہت سے خیالات

فاسدہ پیدا ہو گئے اور علما کے توغل فی السیاسۃ کو ایک بیجا مداخلت تصور کیا جانے لگا؛ بلکہ مجھے اگر معاف کیا جائے تو میں یہ بھی کہوں گا کہ خود ہمارے بعض علما بھی اشتغال فی السیاسۃ کو منصب علماء کے منافی سمجھنے لگے''۔(۹)

سیاست دین کا حصہ ہے اورعلماء کی ذمہ داری ہے:

سیاست عین دین ہے اور علماء کرام کو اس میں شریک ہونے کی ذمہ داری بھی ہے، یہ کوئی دنیا کی مذمومہ شیٔ نہیں ہے، جس سے کنارہ کشی اور پہلو تہی کی جائے چنانچہ حضرت مولاناؒ نے قرآن واحادیث سے اس کو ثابت کرتے ہوئے فرمایا:

''قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم: إن بنی اسرائیل کانت تسوسھم الأنبیاء''. (الحدیث)(۱۰)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قوم بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کرام کے ہاتھ میں تھی۔)

اسی کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کی اس مخاطبت اور مطالبہ کو بھی پیش نظر رکھئے، جس کو قرآن حکیم نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

﴿ان ادوا الی عباد اللہ انی لکم رسول امین﴾(۱۱)

(اے فرعون اور فرعونی حکومت کے ارباب حل وعقد! خدا کے بندوں کو ہمارے سپرد کردے؛ کیوں کہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں اور میں ہی ان خدا کے بندوں کا امین ہوں، ان کی نگرانی کا میں مستحق ہوں۔)

اس کے بعد آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات گرامی کو بغور ملاحظہ فرمائیں، جس سے نہ صرف ان کا منصب معلوم ہوتا ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان سے علماء کے فرائض پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

''علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل''. (۱۲)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہماری امت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کے مثل ہیں۔)

''قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم: العلماء مصابیح الأرض وخلفاء الأنبیاء و یورثتی وورثۃ الانبیاء''.

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علماء روئے زمین کے روشن چراغ ہیں اور انبیاء کے قائم مقام ہیں اور ہمارے اور تمام انبیاء کے وارث ہیں۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہماری امت کے امانت دار علماء ہیں۔

ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے خدا کی مخلوق کے امین علماء ہیں۔

اب آپ ان تمام باتوں کو ملا کر غور فرمایئے کہ آپ کا منصب کیا ہے؟ خدا کی مخلوق کی نگہبانی اور حفاظت آپ کے ذمہ ہے، یا دوسرے لفظوں میں یوں خیال فرمایئے کہ آپ کا اہم مقصد سیاست ہے؛ کیوں کہ آپ کو انبیاء بنی اسرائیل سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کا کیا فرض تھا، ''تسوسھم'' میں ان کی نگرانی اور حفاظت ان کے تمام کاموں کی ذمہ داری اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کو امت کا امین قرار دیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے وصف امانت کا اعلان کیا؛ مگر کس وقت؟ اس مطالبہ کے وقت کہ خدا کے بندوں کو ہمارے سپرد کر دو، تم انسانی غلامی سے ان کو نجات دو اور آزاد کر دو اور اپنے اسی مطالبہ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے فرماتے ہیں: ﴿**انی لکم امین**﴾ میں من جانب اللہ امانت دار ہوں۔

کیا ان شواہد کے بعد یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ علماء کو سیاست میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، یا گمان کیا جا سکتا ہے کہ سیاست میں اشتغال علماء کے منصب کے منافی ہے۔

حضرات علماء کرام! سیاست دنیا مذمومہ شئے نہیں ہے، جو اس پر لعنت کی جائے اور اس سے کنارہ کشی کی جائے، اگر سیاست منافی دین ہوتی اور دنیائے مذمہ ہوتی، تو ایسا ارشاد نہ ہوتا: ''**تسوسهم الانبیاء**'' اور پھر علماء محمدیہ کو انبیاء بنی اسرائیل سے تشبیہ دے کر ان کے سیاست میں قدم ڈالنے کی ترغیب نہ دی جاتی''۔ (۱۳)

سیاست کی حقیقت:

سیاست کی حقیقت سمجھانے کے لیے حضرت مولاناؒ نے قرآن وحدیث کے بعد مزید وضاحت کے لیے اہل لغت اور فقہائے کرام کے قول کو پیش کرتے ہیں؛ تاکہ یہ بات پوری طرح آشکارا ہو جائے کہ سیاست عین دین ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''سیاست کے معنی اہل لغت نے لکھے ہیں: ''نگاہ داشتن ورعیت داری کردن''۔

علامہ مقریزی خطط میں لکھتے ہیں: ''**یقال ساس الامر سیاسة بمن قام به**

وهو سائس من قولهم ساسه ويسوسه ويسوسه القوم جعلوه يسوسهم".

پھر معانی لغویہ کی تشریح کے بعد اصطلاحی معنی اس طرح بیان فرماتے:

"ثم رسمت بانها القانون الموضوع لرعايته الآداب و المصالح والانتظام والاموال".

(سیاست کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ سیاست وہ قانون ہے، جو رعایت ونگرانی آداب مصالح وانتظام واموال کے لئے وضع کیا گیا ہو۔)

ہمارے فقہاء نے ذرا اور وضاحت کے ساتھ سیاست کی تعریف کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"والسياسة استصلاح الخلق بارشادهم الى الطريق المنجي فى الدنيا والآخرة". (یعنی سیاست کیا ہے؟ اللہ کی مخلوق کو دنیا وآخرت میں تمام مہالک سے نجات پانے کی راہ بتا کر ان کی اصلاح کی سعی کرنا۔)

پھر انھیں فقہاء کرام نے تعریف سیاست کے بعد اس کی دو قسمیں بیان کی ہیں اور ہر ایک کا حکم بھی بتاتے ہیں، چنانچہ صاحب البحر الرائق لکھتے ہیں کہ!

"والسياسة نوعان، سياسة عادلة تخرج الحق من الظالم الفاجر فهى من الشريعة علمهامن جهلهاوجهلها من جهلها و النوع الآخر سياسة ظالمة فا لشريعة يحرمها". (۱۴)

(اور سیاست کی دو قسمیں ہیں: سیاست عادلہ، جو حق کو ظالم فاجر کے ہاتھ سے چھڑائے، پس جو شریعت کے اندر داخل ہے اور وہی اس کا ماخذ ہے، جس خوش نصیب کے حصہ میں یہ علم ہے، اس نے جانا اور اچھا جانا اور جس کے نصیب میں اس سے جہل تھا، اس سے جاہل رہا اور وہ سخت جاہل رہا اور دوسری قسم سیاست کی "سیاست ظالمہ" ہے، پس اسی سیاست کو شریعت نے حرام بتایا ہے۔)

بہرحال آپ غور فرمائیں کہ سیاست کے اندر کون سی ایسی چیز ہے، جو شریعت کے منافی ہے اور اس کو دنیائے مذمومہ کہا جائے، اگر تمکین فی الارض کی سعی مسلمانوں کے لیے غیر محمود ہے تو پھر آیت تمکین اور آیت استخلاف کا کیا منشا ہے۔

علماء سلف کا سیاست میں اشتغال:

"میں سمجھتا ہوں کہ شریعت کی کما حقہ واقفیت رکھنے والا یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ

سیاست کو خارج از دین کہے؛ بلکہ سیاست حقہ تو درحقیقت شریعت ہی سے معلوم ہوسکتی ہے اور وہ عین دین ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفاء راشدین و دیگر صحابہ کرام جو بہترین علماء امت تھے، نے سیاست میں بہترین حصہ لیا اور ہمارے لیے اپنے اسوہ حسنہ کے اندر کافی ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

خلفائے راشدین تو خود سادات العلماء تھے، وہ بھی سیاست میں کام کرتے تھے، خلفائے کرام کی مجلس شوریٰ میں شریک ہوتے اور رائے دیتے تھے، ہمای خوش قسمتی سے ہمارے سامنے ایسے آثار بھی موجود ہیں کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کی جماعت میں ایسے لوگ تھے کہ جن کو علماء سے تعبیر کیا گیا ہے اور وہ خلفاء کرام کی مجلس مشاورت میں حصہ لیا کرتے تھے"۔(۱۵)

محض ازدیاد اطمنان کے لئے میں یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ علماء امت محمدیہ کا سیاست میں توغل صرف قرون اولیٰ تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، چنانچہ دور اول کے بعد بھی بڑے بڑے علماء نے سیاست میں حصہ لیا، اگرچہ حصہ لینے والوں کی تعداد میں کمی ہوتی گئی۔

حضرت مولاناؒ نے نمونہ کے طور پر چند اکابر علماء کے اسمائے گرامی پیش فرمائے ہیں؛ تاکہ ہمیں اپنی بزدلی پر ندامت ہوکر الوالعزمی پیدا ہو، جسے طوالت کی وجہ سے یہاں ترک کیا جاتا ہے، چنانچہ حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں

"چند اکابر علماء، محدثین اور فقہا کے اسمائے گرامی تو اس لیے پیش کرتا ہوں؛ تاکہ ہماری بزدلی اور پست ہمتی کو کچھ ندامت ہو، اور ہم میں الوالعزمی پیدا ہو اور ہم عزیمت کی راہ اختیار کریں، ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے علماء ایک طرف علم وعمل اور زہد وتقویٰ کے علمبردار ہیں تو دوسری طرف وزارت خارجہ، داخلہ اور وزارت مالیہ کے قلمدان کو بھی سنبھالے ہوئے ہیں، اگر ایک وقت فقاہت کی مسند پر جلوہ گر ہیں تو دوسرے وقت بین السلاطین سفارت کی خدمت انجام دے رہے ہیں، تیسرے وقت دشمنان اسلام سے جہاد بالسیف بھی کر رہے ہیں"۔(۱۶)

اقامت خلافت کے سلسلے میں دستور:

حالات کے پیش نظر خلافت کے قیام کے سلسلے میں دستور کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ!

’’میرے نزدیک مسلمانانِ ہند کا اولین فرض یہ ہے کہ:

(۱) سب سے پہلے نظام اسلام کے تمام اصول وقواعد کو نہایت ترتیب وتہذیب کے ساتھ مرتب کیا جائے اور اس کی ترتیب میں حسب ذیل امور کا خیال رکھا جائے۔

(الف) شرعی اصول سے تمام دنیائے اسلام میں اقتدار خلافت کے قیام کے لئے جن جن امور کی ضرورت ہے، سب کو نہایت تفصیل کے ساتھ اس میں داخل کیا جائے اور ان امور ضروریہ کے اندراج میں کسی خوف وملامت کی پرواہ نہ کی جائے۔

(ب) رخصت کے اصول کی رعایت اسی حد تک کی جائے، جس سے کسی بنیادی اصول کے اندر خلل واقع ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

(ج) نظام اسلام کی ترتیب میں اولیت اور سابقیت حالت اختیار کے اصول پر دیا جائے اور بعدہ بدرجہ مجبوری حالت صبر کی صورتوں میں درج کیا جائے۔

(د) تمام اصول ونظام کی ترتیب میں صرف اقوال فقہائے کرام اور محدثین ومتکلمین کو سامنے نہ رکھا جائے؛ بلکہ ہر ایک اصول کے تدارک کو معلوم کر کے اور اصول استصلاح کا لحاظ کر کے مرتب کیا جائے۔

(۲) نظام اسلام جو مذکورالصدر طریقہ پر تیار کیا جائے، اس کی ایک شرح مبسوط لکھی جائے، جس میں تمام دفعات کے مآخذ ومدارک شرعیہ کو واضح کیا جائے اور ہر دفعہ کے اخذ ونتائج کو بیان کرتے ہوئے اس کے ترک، یا اس کی مخالف صورت کو بھی ظاہر کیا جائے۔

(۳) اصل نظام اسلام اور اس کی شرح کو عربی، اردو اور انگریزی میں بکثرت شائع کیا جائے اور تمام دنیائے اسلام کو اس پر غور کر کے عمل کرنے کی دعوت دی جائے۔

(۴) اس کے علاوہ جن جراثیم کا میں نے پہلے تذکرہ کیا ہے، اس کے اندفاع کے لیے وطنیت کا اصل مفہوم اور اس کے حدود پر شرعی نقطہ نظر سے تبصرہ کیا جائے اور عقلی دلائل سے بھی اس پر روشنی ڈالی جائے اور ان الفاظ کے ان حقائق کے غلط ہونے کو پرزور دلائل سے ثابت کیا جائے، جو عموماً ان دنوں کئے جارہے ہیں اور ان تمام رسائل کو اردو، عربی اور انگریزی میں شائع کیا جائے؛ تاکہ تمام دنیا کے اہل اسلام کے ہاتھوں میں یہ رسائل پہونچیں اور دنیائے اسلام کے ہر طبقہ کے تعلیم یافتہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

(۵) ایک مستقل رسالہ مسئلہ استصلاح پر لکھا جائے، جس میں بتایا جائے کہ

مصلحت کی حقیقت کیا ہے اور اس کے کتنے معانی ہیں، شریعت اسلامیہ مصلحت کے کس معنیٰ کو اختیار کرتی ہے اور پھر مصلحت کے کتنے مدارج ہیں اور باعتبار مدارج مصالح کسی مصلحت کی رعایت کا کیا حکم ہے، اس رسالہ سے یہ مقصود ہے کہ رعایت، مصلحت کے باب میں جتنی غلط فہمیاں ہیں دور ہو جائیں گی اور یہی وہ حقیقت ہے کہ جس کے عدم انکشاف کے باعث علماء اور جدید تعلیم یافتہ افراد کا ایک مرکز پر پورے اخلاص کے ساتھ اجتماع نہیں ہو رہا ہے؛ بلکہ روز بروز دونوں کے درمیان تفریق کی خلیج وسیع ہوتی جارہی ہے۔(اناللہ وانا الیہ راجعون)

اس رسالہ کو بھی تینوں زبانوں میں شائع کیا جائے، جس سے نظام خلافت کے سمجھنے اور اس کی مقبولیت میں بڑی مدد پہونچے گی۔

(۶) ''نظام اسلام مع اس کی شرح'' کو لے کر تمام ممالک اسلامیہ بالخصوص خود مختار و آزاد ممالک میں وفود روانہ کئے جائیں، تاکہ گفتگو اور مکالمہ کے بعد اس نظام پر عمل در آمد کے لیے ان سے مخلصانہ عہد و پیمان حاصل کریں اور اصول نظام کی صحت پر وثوق حاصل ہونے کے بعد پھر آخری مشورہ اس اسلوب پر کریں، جس طرح پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے خلافت راشدہ ثالثہ کے قیام کے وقت اصحاب ستہ سے کیا تھا، بعدہ مؤتمر اسلامی کر کے خلافت اسلامہ کی بنیاد ایک مستحکم نظام پر قائم کر کے تمام دنیائے اسلام کو ایک مسلک میں منسلک کر دیا جائے۔

(۷) اور ان تمام رسائل کو مدارس واسکول وکالج میں حسب مدارج نصاب تعلیم میں لازم قرار دیا جائے اور کوشش کی جائے کہ تمام ممالک اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں یہ سب رسالے لازم قرار دیئے جائیں؛ تاکہ یہ جراثیم فساد پھر ہمارے نوجوانوں میں نہ پیدا ہونے پائیں اور نظام اسلام کی تعلیم سے ان کا دماغ ہمیشہ تر وتازہ رہے''۔(۱۷)

جزیرۃ العرب سے غیر مسلوں کو نکالنا:

جزیرۃ العرب جہاں حرم، مسلمانوں کا قبلہ اور بہت سارے مقدس مقامات ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مسلوں کو وہاں سے نکالنے کی واضح وصیت اور صحابہ کرام کا عمل ہمارے سامنے ہے، اس کے باوجود عمل اس کے خلاف ہونے پر مولاناؒ توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بیرونی مسائل میں ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ جزیرۃ العرب کو

غیر مسلم اثر سے ہمیشہ کے لیے مامون ومحفوظ بنادیا جائے کہ جس میں دنیائے اسلام کا واحد قبلہ اور ہزاروں اسلامی مشاہد اور مقدس مقامات واقع ہیں، جن کی تفصیلات ایک سے زائد مرتبہ خلافت کانفرنسوں اور جمیعت علماء کے اجلاسوں میں بیان کی گئی ہیں، نیز اس کو غیر مسلم اثرات سے پاک رکھنے پر حکم ومصالح بھی بتائے جا چکے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حکم شرعی اس آخری وصیت پر مبنی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ان لفظوں میں فرمائی تھی کہ:

''اخرجوا الیھود والنصاریٰ عن جزیرۃ العرب''. وفی روایۃ: ''اخرجوآ المشرکین عن جزیرۃ العرب''.

جو نہایت معروف ومشہور ہے۔

چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اس حکم پر عمل کر کے اس مقدس سر زمین کو مشرکین اور دیگر کفار کی نجاستوں سے ہمیشہ کے لیے پاک وصاف کر دیا تھا۔

﴿لھم البشریٰ فی الحیاۃ الدنیا و فی الآخرۃ﴾

لیکن شریف حسین کی غداریوں نے اسلام اور مسلمانوں پر وہ مصائب کبریٰ نازل کیے، جن نہ صرف ساکنان حرمین شریفین زادھم اللہ شرفاً وتعظیماً چیخ اٹھے؛ بلکہ تمام دنیائے اسلام لرز اٹھی اور انھوں نے انگریزوں کے اشارہ اور امداد کے بھروسہ پر وہ وہ فتنے برپا کیے، جن کو سن کر دنیائے اسلام حیرت زدہ ومبہوت رہ گئی''۔ (۱۸)

وھابیت اور حنفیت کی جنگ نہ چھیڑیئے:

خدارا اس وقت وہابیت وحنفیت کی جنگ نہ چھیڑیئے، ورنہ دنیائے اسلام پر ایک عظیم مصیبت نازل ہوگی، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عبدالوہاب نجدی کے وجود سے پہلے بھی دنیائے اسلام حنفیت وشافعیت کے محاربے پر ماتم کر چکی ہے، جس سے ہزاروں علماء کے پاک خون سے عراق وشام کی زمین رنگی ہوئی ہے:

﴿ان فی ذٰلک لعبرۃ لاولی الالباب﴾

باہمی سب وشتم کو بند کیجئے، مسائل میں اختلاف ہو تو نہایت زوردار لفظوں کے ساتھ عملی اصول سے بحث کیجئے، جو علماء کے شایان شان ہے؛ بلکہ یہ ان کا فریضہ ہے۔ (۱۹)

ترک موالات کا مفہوم:

ترک موالات کے سلسلے میں چونکہ جمعیۃ علماء نے متفقہ فتویٰ شائع کیا تھا، جو دراصل حضرت

مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ ہے، اس کی صحیح حقیقت اور مفہوم کو بیان کرتے ہوئے حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں:

''ترک موالات کے متعلق جمیعۃ علماء ہند نے جو متفقہ فتویٰ شائع کیا ہے، وہ فتویٰ موجودہ دور کے علماء کا نہیں ہے؛ بلکہ دراصل جناب مولانا سید شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ ہے''۔

پھر موالات کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہر مسلم کو جاننا چاہئے کہ موالات کے دو معنی ایک معنی محبت اور مودت ہے اور پھر محبت کی دو جہتیں ہیں: ایک دینی و مذہبی دوسرے دنیاوی اور محبت دنیاوی کی بھی دو صورتیں ہیں: اختیاری و اضطراری۔ الغرض کافر کے ساتھ محبت کی تین صورتیں ہیں:

نمبر ایک دینی محبت من جہۃ الدین؛ یعنی کسی کافر کی دوستی اس طرح پر ہو کہ اس کے دین و مذہب کو پسند کیا جائے تو وہ عین کفر ہے۔

نمبر۲۔ محبت من جہۃ الدنیا ہو اور اختیاراً ہو؛ یعنی کسی کافر کے ساتھ دلی محبت ہو؛ مگر نہ اس جہت سے کہ اس سے دین کو اچھا سمجھتا ہو؛ بلکہ کسی دنیاوی وجہ سے ہو؛ مگر یہ دنیاوی اختیار کی ہوئی محبت یعنی اپنی خواہش و اختیار سے کسی کافر سے کوئی دنیاوی مقصد اور غرض کے حصول کے لیے محبت کرتا ہو اور فطری اسباب اس محبت کے پیدا ہونے کے لیے موجود نہ ہوں تو یہ محبت بھی حرام ہے؛ مگر کفر نہیں۔

نمبر۳، محبت میں جہۃ الدنیا ہو؛ مگر اضطراراً ہو اور اس محبت کا سبب غیر اختیاری ہو، جیسے کسی مسلمان کا باپ یا بھائی کافر ہو اور بسبب رشتہ داری اور قرابت کے مسلمان کے دل میں کافر باپ، یا بھائی کی محبت ہو تو یہ محبت جائز ہے، بشرطیکہ اس دلی محبت کا اثر مسلمانوں کے ایمان پر نہ پڑے۔

اور محبت کی پہلی صورت یعنی محبت من جہۃ الدین اور دوسری صورت یعنی محبت من جہۃ الدنیا اختیاراً کا جو حکم بیان کیا گیا، وہ ہر کافر کے ساتھ یکساں و برابر ہے؛ عام ازیں کہ کافر محارب ہو یا غیر محارب، دونوں کے ساتھ ان دونوں قسموں کی محبت کا ایک ہی حکم ہے؛ یعنی اول کفر ہے دوم حرام بغیر کفر اور یہ حکم بہر حال دوامی اور بہر حال ہے۔

لیکن محبت کی تیسری قسم یعنی محبت من جہۃ الدنیا اضطراراً، اس میں محارب اور غیر محارب میں فرق ہے، یہ کہ غیر محارب کے ساتھ تو یہ محبت جائز ہے؛ لیکن محارب کے

ساتھ یہ محبت بھی حرام ہے،بقوله تعالیٰ: **لا تجد قوماً یؤمنون باللّٰه والیوم الآخر یوادون من حاد اللّٰـه ورسوله ولو کانوا آبائهم أو أبنائهم أو إخوانهم أو عشیرتهم، الخ.** (سورہ مجادلہ پ:۲۸)

موالات بمعنی محبت کے احکام تو سب کو معلوم ہی ہیں اور متفقہ فتوے میں بھی مذکور ہے اور موالات کے دوسرے معنی نصرت اور مدد کے ہیں،جس کا تعلق افعال وجوارح سے ہے، دل سے اس کا کوئی سروکار نہیں، اس معنی کے اعتبار سے کافروں کے ساتھ موالات کرنے کے متعلق شرعی احکام مختلف احوال اور مختلف اسباب اور مختلف مقتضیات کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں۔

بعض حالتوں اور بعض اسباب کی موجودگی میں کافروں سے موالات بمعنی نصرت ومعاملہ بھی حرام ہوجاتا ہے اور بعض حالتوں میں اور بعض دوسرے اسباب کی موجودگی سے موالات بمعنی نصرت حرام نہیں ہوتا ہے''۔(۲۰)

تبدیل احکام کی حقیقت:

یہاں پر ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اختلاف احوال سے بعض احکام بدلتے ہیں تو اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ درحقیقت حکم شرعی نہیں بدلتا کہ اس سے یہ بدگمانی ہو کہ حکم شرعی تو ہمیشہ کے لیے ہے تو اس میں ردوبدل کے کیا معنی؟ بلکہ واقعہ اور اصل حقیقت یہ ہے کہ حکم شرعی کا محل بدل جاتا ہے اور جب وہ محل نہیں رہا تو اس کا جو حکم تھا وہ بھی نہیں رہا۔

اس کی مثال یہ سمجھنا چاہیے کہ کہ ایک کپڑا ہے جو دھوبی کے یہاں سے دھل کر آیا ہے؛ اس میں کوئی نجاست نہیں لگی ہوئی ہے تو اس کپڑے پر حکم شرعی یہ ہوا کہ یہ کپڑا طاہر ہے؛ اور جب اسی کپڑے میں نجاست لگ گئی تو حکم شرعی یہ ہوا کہ کپڑا نجس ہے اور طہارت کا حکم شرعی جو اس کپڑے میں تھا بدل گیا؛ مگر حقیقتاً حکم شرعی نہیں بدلا ہے؛ بلکہ وہ چیز بدل گئی ہے، جس پر حکم طہارت تھا، جب وہ چیز ہی نہیں ہے تو پھر وہ حکم کیوں کر رہ سکتا ہے اور پھر اس کپڑے سے نجاست دور کردی جائے تو پھر چونکہ محل حکم بدل گیا؛ یعنی کپڑے کی حالت بدل گئی؛ اس لئے پھر حکم دیا جائے گا کہ کپڑا طاہر ہے۔

پس حکم شرعی درحقیقت جس حال اور جس محل کے لئے مخصوص ہے، وہ اس حال اور اس محل مخصوص کے لئے یکساں رہتا ہے، حکم شرعی میں حقیقتاً کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔

امیر شریعت کے اختیارات:

امیر کے انتخاب میں جو غلط خیالات ذہن میں پیدا ہوئے کہ امیر شریعت جس خیال

ومشرب کا ہوگا، اسی کے مطابق احکامات نافذ کرے گا، جس کی اتباع سارے لوگوں کے لئے دشوار ہوگی، حضرتؒ اس خیال کو دور کرتے ہوئے امیر شریعت کے اختیارات کو ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

(۱) امیر کے اختیارات محدود ہوں گے وہ نہایت مدبر مصالح شریعت سے واقف ہوگا؛ یعنی وہ مسائل متفقہ منصوصہ کو نافذ کرے گا۔

(۲) مقاصد ووسائل اعلاء کلمۃ اللہ پر ہمیشہ نگاہ رکھے گا اور ان کے متعلق خصوصیت کے ساتھ احکامات نافذ کرتا رہے گا۔

(۳) وہ ایسے احکامات نافذ کرے گا، جس سے بلا امتیاز فرق تمام امت مسلمہ کی فلاح و بہبود متصور ہو۔

(۴) فروعی اور مختلف فیہ مسائل کے اجراء وتنفیذ کو اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا کہ جن کی اجتماعی زندگی میں کوئی حاجت نہیں ہے۔

(۵) مختلف فیہ مسائل کی بحث وتحقیق کو نہیں روکے گا؛ لیکن جنگ وجدال اور فساد کو رفع کرنے کی ہمیشہ کوشش کرے گا۔

(٦) اس کا ہر عمل اور ہر خیال تمام فرق اسلامیہ کے لئے واجب الاتباع نہیں ہوگا، جس عالم کی تحقیق امیر کی تحقیق کے خلاف ہو اور اس بنا پر اس مسئلہ خاص میں امیر کی اتباع نہ کرے تو کوئی حرج نہیں وہ عالم ہرگز مستحق طعن نہیں اور نہ اس کی بیعت ٹوٹ سکتی ہے، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کتنے مسائل ہیں، جن میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے؟ کتنے جزئیات ہیں جن میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے موافق نہ تھے؟ تو کیا آج تک کسی نے اس کو نقض بیعت سمجھا، یا ان پر طعن کیا گیا اور کیا اس فروعی مخالفت کی وجہ سے ان حضرات نے دوسرے اجتماعی احکامات میں امیر کی اتباع وانقیاد سے روگردانی کی؟ ہرگز نہیں۔

پس آج کس قدر ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم ان مسائل کو جانتے ہیں؛ لیکن محض ظنون واوہام کی بنا پر ایک اہم الواجبات کی ادائیگی میں پس وپیش کرتے ہیں۔

امیر کے انتخاب کے شرائط:

امیر کے انتخاب میں امیر کے لئے کیا کیا شرائط ہیں؟ حضرتؒ ان شرائط کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”اس قحط الرجال کے زمانہ میں اغراض و مقاصد شریعت کو مدنظر رکھ کر میرے نزدیک جن شرائط کے ساتھ امیر کا انتخاب ہونا چاہیے، وہ حسب ذیل ہیں، مجھے امید ہے کہ آپ بھی پسند کریں گے۔

(۱) عالم باعمل صاحب فتاویٰ جس کا علمی حیثیت سے زمرۂ علماء میں ایک حد تک وقار واثر ہو؛ تاکہ علماء کرام اس کے اقتدار کو تسلیم کریں اور صاحب بصیرت ہو؛ تاکہ نہایت تدبر کے ساتھ احکامات نافذ کرے۔

(۲) مشائخ طریقت میں بھی صاحب وجاہت ہو اور اس کے حیطۂ اثر میں اپنے صوبہ کے مسلمانوں کی ایک معتدبہ جماعت اس حیثیت سے موجود ہو کہ عوام وخاص اس کے اثر سے متأثر ہوں اور تنظیم شرعی واجتماعی قوت جلد سے جلد پیدا ہوسکے۔

(۳) حق گوئی وحق بینی میں نہایت بیباک ہو اور کسی مادّی طاقت سے متأثر ومرعوب ہونے کا بظاہر اندیشہ نہ ہو۔

(۴) مسائل حاضرہ میں بھی ایک حد تک صاحب بصیرت ہو اور تدبیر کے ساتھ کام کررہا ہو؛ تاکہ ہمارا کام بحسن وخوبی تیزی کے ساتھ آگے بڑھے۔

(۵) لاپرواہی اور خودرائی کے مرض سے پاک ہو۔

میرے نزدیک اسی قدر شرائط موجودہ وقت میں مع احکام شریعت بہت کافی ہیں؛ بلکہ یہ وہ معیار ہے، جس کی بنا پر شاید صوبۂ ہذا میں ایک دو ہی آدمی مل سکتے ہیں۔(۲۱)

پنچایت کے مقابلے میں قضا کی اہمیت:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے (الحیلۃ الناجزۃ) کو جس میں پنچایت کی اہمیت بیان کی گئی ہے، جب تقریظ کے لئے حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد رحمہ اللہ کے پاس بھیجا تو حضرت نے بلاتکلف قضاء کے سلسلے میں فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کی تجویز کی ہوئی صورت اور کتابوں کی طرف اشارہ فرمایا، نیز پنچایت کو اختیار کرنے میں بلاضرورت مسئلہ غیر کو اختیار کرنا اور عملی دقتیں اور ان شرائط کی نگاہ داشت کی دشواری کی طرف حضرت نے توجہ دلائی، چنانچہ حضرت اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

”دارالکفر میں قضاء بین المسلمین کی ضرورت کو پوری کرنے کے لیے فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ نے جو صورت تجویز فرمائی ہیں، وہ نہ معلوم کیوں اس رسالہ میں مذکور نہ ہوئیں؛ یعنی: ”**یصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین**“ اور ”**أن ینفقوا علی**

واحد یجعلونه والیا فیولی قاضیا، الخ‘‘.

اور جب یہ صورت موجود ہے تو پنچایت کی صورت اختیار کرنا بلاضرورت مسئلہ غیر کا اختیار کرنا ہوگا، اس مسئلہ کی بابت شامی، بحر، فتح القدیر وغیرہ میں جو عبارتیں ہیں، وہ آپ سے پوشیدہ نہ ہوں گی، اگر جناب کے متبرک قلم سے حنفیہ کے اس مسلک کا بیان بھی اب بطورِ ضمیمہ اس رسالہ میں شامل ہو جائے تو بہتر ہوگا، اس مسئلہ کی ضرورت واہمیت کے علاوہ پنچایت کی عملی دقتیں بہت زیادہ ہیں اور ان شرائط کی نگاہ داشت بھی بہت مشکل ہوگی‘‘۔(۲۲)

اصلی ہلاکت کا سر چشمہ برٹش حکومت کا دستور حکومت:

ایک اصلی ہلاکت کا سر چشمہ برٹش حکومت کا دستور حکومت ہے؛ کیونکہ برٹش امپائر نے جس قسم کی جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی ہے، اسی بنیاد پر گورنمنٹ آف ۱۹۳۵ء کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، اس حقیقت کو حضرت مولاناؒ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح کو خط لکھتے ہوئے تحریر فرمایا:

’’اندرون ملک مسلمانوں کی ملی ومذہبی پوزیشن جن مصائب ومشکلات میں گھری ہوئی ہے، وہ کسی واقف کار پر مخفی نہیں ہے، جا بجا فرقہ وارانہ فساد جو ہوتے رہتے ہیں، یا ذبیحہ گاؤ وقربانی میں رکاوٹیں ہوتی رہتی ہیں، جو اگرچہ نہایت تکلیف دہ اور مصیبت زدہ ہیں؛ لیکن ان سے زائد مصیبت کبریٰ یہ ہے کہ برٹش امپائر نے ۱۹۳۵ء سے جس قسم کی جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی ہے اور جس بنیاد پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے ملت اسلامیہ کے لیے خصوصیت کے ساتھ نہایت خطرناک ہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے اندر اور اس کے ماتحت حکومت کے جمہوری اداروں کے اندر مسلمانوں کو دین وملت کے کاموں کے لیے کوئی اختیار بھی نہیں دیا گیا ہے، پس اصلی فساد اور ہلاکت کا سر چشمہ برٹش حکومت کا لعنتی دستور حکومت ہے، یہ روگ بمنزلہ سل ودق ہے اور فرقہ وارانہ فسادات، نوکریوں یا وزارتوں میں حق تلفی بمنزلہ پھوڑا پھنسی ہیں‘‘۔(۲۳)

مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی طرف ’’مسلم لیگ‘‘ کو توجہ دلانا:

حضرت مولاناؒ نے اس وقت کی مسلمانانِ ہند کی نمائندگی اور دعویٰ کرنے والی سیاسی جماعت ’’مسلم لیگ‘‘ کو اسلامی سیاست اور مذہبی حقوق کی طرف توجہ نہ کرنے پر بلا تکلف ’’مسلم لیگ‘‘ کے صدر مسٹر جناح کو اس کمی کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’’نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ اس مقصد کے اعتبار سے مسلم لیگ کا

اجلاس پٹنہ بھی اپنی ۳۳؍سالہ روایات کا حامل اور اپنی زندگی میں مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت کے ادعا کے باوجود اسلامی سیاست اور مذہبی حقوق کی حفاظت کی طرف اس نے ادنیٰ توجہ بھی نہیں کی، چنانچہ حضرت مولاناؒ چند چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: جیسے (الف) احکام وراثت میں تبدیلی، (ب) محکمۂ دار القضاء کی بربادی، (ج) ساردا ایکٹ، (د) شریعت بل اور اس میں ترمیم، (ہ) نص قرانی کی تنسیخ، (و) مسودۂ فسخ نکاح کا مرکزی اسمبلی میں حشر، (ز) کرسچن میرج ایکٹ کے ذریعہ اسلامی قانون میں مداخلت بیجا، (ح) اجتماع بین الاختین اور الہ آباد ہائی کورٹ۔ (۲۴)

پس ان حالات اور واقعات کی روشنی میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ کی تمام کاروائیوں پر ایک مسلمان غائر نظر ڈالتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈران کرام ان آٹھ اہم اسلامی حقوق کی پامالی پر جو بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں، ایک لفظ نہیں کہتے اور اس وجہ سے کہ اگر وہ سمجھتا ہے کہ ارباب مسلم لیگ کو یا تو اسلام کے اصول اور حقیقی مفادات وحقوق سے کوئی لگاؤ نہیں، یا یہ کہ وہ اس کی حفاظت کو ضروری نہیں سمجھتے۔ (۲۵)

مصادر ومراجع

(۱) سورۃ التغابن: ۱۱

(۲) خطبہ صدارت ص: ۱۶

(۳-۴) خطبہ صدارت: ص ۱۸

(۵) خطبہ صدارت: ص ۱۹

(۶) خطبہ صدارت ص: ۳۵

(۷) حوالہ بالا، ص: ۳۶

(۸) حوالہ بالا، ص: ۴۰-۴۱

(۹) حوالہ بالہ، ص: ۴۴

(۱۰) رواہ ابن ماجہ، باب الوفاء بالبیعۃ، حدیث نمبر: ۲۸۷۱

(۱۱) سورہ الدخان: ۱۸

(۱۲) مرقاۃ المفاتیح: ۳۹۳۳/۹

(۱۳) ص: ۴۵ تا ۴۷

(۱۴) البحر الرائق: ۱۱/۵

(۱۵) حوالہ بالا، ص: ۵۰

(۱۶) تفصیل کیلئے طبہ صدارت ص: ۲۵ تا ۴۵ ملاحظہ فرمائیں

(۱۷) حوالہ بالا، ص: ۶۰ تا ۶۳

(۱۸) ص: ۶۸

(۱۹) ص: ۷۷

(۲۰) ص: ۸۷

(۲۱) مکاتیب سجاد، ص: ۱۵

(۲۲) مکاتب سجاد، ص: ۱۸

(۲۳) مکاتیب سجاد، ص: ۲۵

(۲۴) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں مکاتیب سجادؒ، ص ۶۳ تا ۴۴

(۲۵) مکاتیب سجادؒ ص: ۶۴

باب سوم

ملی وسیاسی خدمات

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ

حیات وخدمات

مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی
صدر مفتی (دارالعلوم وقف) دیوبند، وامیر جامعہ دارالسلام مالیرکوٹلہ

بیسوی صدی کے نصف اول میں ہندوستان کے علمی وفکری، دینی وملی، سیاسی وسماجی افق پر مسلم علما ومشائخ اور قائدین ودانشوران کا ایک بڑا طبقہ نمودار ہوا تھا، جس نے علم وادب، دین ومذہب اور سیاست وسماج پر بہت گہرا اثر ڈالا؛ مگر ان تمام شخصیتوں میں ایسی ہستی جس نے فکر وعمل، مذہب وسیاست پر بہت دیرپا اور دوررس گہرا اثر ڈالا ہو، جیسے جیسے زمانہ گذرتا ہے، اس کی رائے کی صلابت، فکر کی گہرائی، سوچ کی بلندی اجاگر ہوتی جاتی ہے، علما اور دانشوران کی رائے کو ماننے اور ان کے طریقہ کار پر چلنے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہے تھے، وہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کی ذات گرامی ہے، ان کی وفات پر ایک طویل عرصہ گذر گیا، مگر آج بھی ان کے اصول، ان کی فکر ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

مولانا کو قدرت نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، ان کی ذات گوناگوں صفات کی حامل تھی، وہ ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے، تواضع اور اخلاص کے ساتھ جرأت وبے باکی، حق شناسی وحق گوئی ان کی خاص صفت تھی، اپنے گہرے وعمیق علم، وسعت مطالعہ، اصابت رائے اور معاملہ فہمی میں وہ اپنے زمانہ کے علما ومشائخ اور قومی وملی قیادت کرنے والی ہستیوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے علم اور مسائل حاضرہ میں ان کو مہارت تامہ حاصل تھی، ان کی فقہی بصیرت ایسی تھی کہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ وسلم جیسا صاحب علم انہیں فقیہ النفس عالم کہا کرتے تھے اور حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو فقیہ العصر عالم کہا کرتے تھے، اس ذیل میں وہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب نازک فقہی سوالات ابھرتے تو مولانا برجستہ کتابوں کی طرف مراجعت کئے بغیر جو جواب دیتے تو ہم وہی جواب کتاب وسنت اور فقہ میں غور وفکر کرنے کے بعد پاتے، جو مولانا اول وہلہ میں فرمادیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد سجادؒ ملت کے لیے دردمندی اوران کے مسائل ومشکلات کا حل اور مستقبل کا صحیح تجزیہ کرکے علمی طریقۂ کار طے کرنے اوران کو عملی جامہ پہنانے میں یکتا تھے، امت کی شیرازہ بندی اوردین اسلام کی بالادستی ان کی زندگی کا نصب العین تھا،انہوں نے حالات سے مصالحت نہیں کی تھی، وہ مشکل حالات سے نمٹنے کا فن جانتے تھے، وہ نہ تھکنے والی جدوجہد اور نہ ہارنے والی ہمت کے مالک تھے؛اسی لیے انہوں نے اجتماعی کاموں کی ضرورتوں میں تن کی آسانی کو راہ نہ دی اور لفظوں کے پردہ میں واقعات وحقائق کی غلط تاویل وتعبیر کو قبول نہ کیا۔

مولانا صرف درس وتدریس کے عالم نہ تھے؛ بلکہ مسلکی اوربین الاقوامی سیاست پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور ہر مسئلہ فکروتدبر سے حل کرتے، سیاست کی گتھیوں کو اس طرح سلجھاتے جیسے کوئی فقہی مسئلہ ہو، سیاسی مشکلات کو سلجھانے کا ملکہ رکھتے تھے، مختلف المسلک اور مختلف المشرب جماعتوں کو منظّم کرنے میں ان کے اندر خدا داد صلاحیت موجود تھی، وہ روادار تھے، دوسرے کے وجود کو تسلیم کرتے تھے؛مگر خود اپنے نظریہ میں مستحکم تھے، حضرت سجاد برقعہ پوش سیاست کے قائل نہ تھے، وہ خطرات سے کھیلنا جانتے تھے، حالات سے نپٹنے کی صلاحیت ان میں تھی۔ وہ اپنی شخصیت کو بنانے سنوارنے اوراس کی عظمت کے داؤ پیچ کے قائل نہ تھے، وہ ملت کی سر بلندی کے خواہاں اورامت کی سرفرازی کے طلب گار تھے،اسی لیے انہوں نے اتحاد ملت کے بعد سیاسی طاقت بنانے کا فیصلہ کیا، الیکشن لڑایا،حکومت بنائی، پارٹی کے اندروباہر لوگوں کو وزیر بنایا اور بتادیا کہ اقلیت میں ہوتے ہوئے اکثریت کے ذہن ومزاج اوران کی سیاست کو کس طرح متاثر کیا جاسکتا ہے۔(۱)

جمعیۃ علماء ہند کا قیام:

مسلمانوں کو منظّم کرنا اوراس کے لیے اولاً علماء کو منظّم کرنا تھا، اس کے لیے ہر وقت فکر مند اور پریشان رہتے ،اجتماعات، جلسوں، کانفرنسوں میں علما اور دانشوران قوم سے اس موضوع پر بحث وتمحیص بھی ہوتی رہتی، چنانچہ دہلی میں خلافت کانفرنس میں بعض اہل علم (جس میں مولانا پیش پیش تھے اور دراصل یہ مولانا ہی کی تحریک تھی) نے مشورہ کیا کہ ہندوستان کے علما کی ایک تنظیم ہونی چاہیے، چنانچہ خاص خاص علما کا ایک مختصر سا اجتماع دہلی کے سید شاہ حسن کی درگاہ پر منعقد ہوا، جس میں تمام علماء نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، مولانا نے بھی اس اجتماع میں مختصر؛ مگر جامع ومانع اور مدلل تقریر فرمائی، اس اجتماع میں موجود مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ علماء ہند کا بیان

ہے کہ:

"اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا کے جذبات ایمانی کا ترجمان تھا، حاضرین کی تعداد اگرچہ دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی؛ لیکن کوئی آنکھ اور کوئی دل ایسا نہ تھا، جس نے اثر قبول نہ کیا ہو"۔

چنانچہ اس مختصر اجتماع کی برکت اور مولانا کی سعی سے ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی، جس کا پہلا اجلاس ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں خلافت کانفرنس کے ساتھ منعقد ہوا۔

خود داری وغیرت:

مولانا تواضع وانکساری کے ساتھ نہایت خوددار اور غیور تھے، ابتدائی دور میں مولانا کے گھر وسعت اور فارغ البالی تھی اور دو چار کام کرنے والے ملازم ہمیشہ مصروف خدمت رہتے تھے؛ مگر یہ سب کچھ اس زمانہ میں تھا، جب مولانا مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں مدرس تھے، چنانچہ جب کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ کسی وجہ سے مدرسہ ہفتہ دو ہفتہ کے لیے بند ہو جاتا تھا تو مولانا پندرہ بیس طلبہ کو اپنے ساتھ اپنے مکان پنہسہ لے جاتے تھے اور سب کے ناشتہ اور کھانے کے خود کفیل ہوتے تھے اور ان کو وہیں پڑھاتے تھے، ایک مرتبہ نواب خاں بہادر عبدالوہاب خاں صاحب مونگیری نے مجھ سے بیان کیا، میں نے تنہائی میں مولانا سے ایک دفعہ کہا کہ مجھ کو خدمت کا موقع دیجیے تو مولانا نے فرمایا کہ اس سے مجھے معاف کیجیے، اس سے ہمارے اور اللہ کے درمیان توکل کا جو رابطہ ہے، اس میں خلل واقع ہو جائے گا۔ نواب صاحب کہتے ہیں کہ اس کے بعد میری ہمت نہیں ہوئی کہ ایک لفظ زبان پر لاؤں اور دوبارہ درخواست کروں۔ (۲)

بیعت وسلوک:

حضرت مولانا کم عمری ہی میں مولانا قاضی سید احمد صاحب شاہ جہاں پوری سے بیعت ہو چکے تھے، قاضی صاحب موصوف نہایت دیندار، متقی، پرہیزگار اور مشائخ حقہ میں سے تھے، موصوف ہی سے حضرت مولانا کے والد اور گھر کے دیگر افراد بھی بیعت تھے، حضرت مولانا نے اپنے شیخ سے بھی تعلیم حاصل کی اور آخر میں شیخ نے اجازت وخلافت سے بھی سرفراز کیا، حضرت مولانا بہت کم بیعت کیا کرتے تھے، اسی وجہ سے ان کے مریدین ومتوسلین کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی۔ (۳)

اور فنائے قومیت اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے۔ (۴)

علالت ووفات:

مولانا کی طبیعت ۱۰/نومبر ۱۹۴۰ء کوخراب ہوئی، بخار شروع ہوگیا تھا، مختلف ڈاکٹروں اورحکیموں کا علاج ہوتا رہا، لیکن افاقہ نہیں ہوا، آخر ۹/دنوں کی مختصر علالت کے بعد ۱۷/شوال ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸/نومبر ۱۹۴۰ بروز دوشنبہ کو بوقت پونے پانچ بجے اس دار فانی سے رحلت فرما گئے، دس بجے نماز جنازہ ہوئی اورساڑھے دس بجے خانقاہ مجیبیہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔(اناللہ وانا الیہ راجعون)

مولانا نے کل انسٹھ (۵۹) برس ساڑھے آٹھ ماہ کی عمر پائی، ہروہ شخص جس نے مولانا کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس اعتراف پر مجبور ہے کہ اتنے بہتر دل ودماغ کا مالک، فکروعمل کا ایسا جامع، ایثار وقربانی کا ایسا پتلا، علوم وفنون کا ایسا ماہر، خلوص وللہیت کا ایسا مجسمہ اور پھران ساری اچھائیوں کے ساتھ ایسا منکسر اور متواضع شخص کم دیکھا گیا ہے۔

مصادر ومراجع

(۱) حیات سجاد، ص:۴

(۲) حیات سجاد، ص:۴۲

(۳) حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حیات وخدمات، ص:۵۸

(۴) حیات سجاد ص:۴۵

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی ملی خدمات

مولانا ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی
سابق ڈین فیکلٹی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ (م ۱۹۴۰ء) ہندوستان کے برگزیدہ، اولوالعزم اور نابغۂ روزگار علماء میں تھے، خانقاہوں سے نکل کر رسم شبیری ادا کی تھی، جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایسے وقت میں سہارا دیا، جب وہ انگریزوں کے ظلم وستم کا شکار تھے، ان کے حقوق سلب کئے جارہے تھے اور ان کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جارہا تھا، مختلف عنوانوں سے ان کو ستایا جاتا تھا اور مختلف بہانوں سے ان کے علماء اور رہنماؤں کو قید وبند میں ڈالا جاتا تھا، ان کا سماجی اور سیاسی شیرازہ منتشر کیا جارہا تھا اور ان کی قومی زندگی کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے ایسے وقت میں ملک وملت کی خدمت کی، اس کی قومی وحدت کو بچانے اور دینی غیرت کی حفاظت کرنے میں مدد کی، انہوں نے اہل وطن کی بھی خبر گیری اور دست گیری کی، ان کو مخالف ماحول میں جینے کا حوصلہ دیا اور بادمخالف سے لڑنا سکھایا اور خاص طور پر مسلمانوں کی شیرازہ بندی کی، وہ اقبالؒ کے اس شعر کا مصداق تھے

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نہ تو صاحب زر تھے اور نہ صاحب منصب وزور، نہ بڑے قلم کار تھے اور نہ شعلہ بیان صاحب گفتار، نہ ان کے پاس فوج تھی اور نہ تلوار؛ مگر وہ اخلاص اور خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار تھے، دینی حمیت، علمی بصیرت، دینی قابلیت، مومنانہ فراست اور قائدانہ صلاحیت میں وہ دوسروں سے ممتاز تھے، ان کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے بجا طور پر لکھا ہے:

”ان کی تواضع میں بلندی، سادگی میں بناؤ اور خاموشی میں گویائی تھی، وہ اکیلے تھے؛ لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے، سراپا حال تھے، کہتے کم تھے، کرتے زیادہ تھے، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ راہ اور منزل کے فرق کو کبھی

فراموش نہیں کیا، انہوں نے راہ میں ہم راہیوں کے لطف کلام میں پھنس کر منزل سے ہٹنا کبھی گوارہ نہ کیا''۔(۱)

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بنیادی طور پر معلم اور مدرس تھے، مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد اور مدرسہ انوارالعلوم گیا میں مدتوں تدریسی فرائض انجام دیئے، وہ علم دین کی اشاعت کے لیے اس نسل کو تیار کررہے تھے، جو مسلمانوں کے دینی فرائض کی ادائیگی میں رہنمایانہ کردار ادا کرسکے اور مسلم معاشرہ کو داخلی تضاد اور خارجی فساد سے بچایا جاسکے، وہ خود دین کے اصولوں کو عوام کے قلوب میں راسخ کرنے کے لیے شبانہ روز محنت کرتے تھے؛ مگر اس پر نظر رہنی چاہیے کہ ان کا تصور دین و مذہب، مدرسوں، مسجدوں اور خانقاہوں تک محدود نہ تھا، وہ اللہ کے دین کو اپنی تمام تر وسعت اور رفعت کے ساتھ قابل نفاذ سمجھتے تھے اور اللہ کے بندوں اور اللہ کی سرزمین میں اسے غالب دیکھنا چاہتے تھے، وہ گوشۂ تعلیم گاہ سے سیاست کے ایوانوں تک اور خوابگاہ بشر سے رزم گاہ خیر وشر تک اسلام کے پاکیزہ احکام کی جلوہ گری اور ہمہ گیری کے قائل تھے، ان کا نصب العین حکومت الٰہیہ کا قیام تھا، چنانچہ اس یقین کو سلیقہ اور اعتماد کے ساتھ انہوں نے اپنی کتاب ''حکومت الٰہیہ'' میں پیش کیا اور ہندی مسلمانوں کو راستہ دکھایا کہ ﴿**هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله**﴾ کی عملی تعبیر کیوں اور کس طرح پیش کی جاسکتی ہے، اس سلسلہ میں بزرگوں کا سرمایہ نئی نسل تک کیسے پہونچایا جاسکتا ہے، خاص طور پر علماء اسلام اپنی ذمہ داریوں سے کیوں کر عہدہ برآ ہوسکتے ہیں، دین کا علم تو بہتوں کے پاس ہے؛ مگر دین کے نفاذ کا شعور اور سلیقہ بہت کم کے پاس ہے۔

مگر ان کے عہد کے مسلمان جن مشکل حالات میں گرفتار تھے اور انگریز کے پنجۂ خونیں کا جس طرح شکار تھے، اس کا تقاضا تھا کہ پہلے ان سلگتے ہوئے مسائل کا حل تلاش کیا جائے، ان کی شیرازہ بندی کی جائے اور بحیثیت امت مسلمہ ان کا عزم وحوصلہ استوار کیا جائے، چنانچہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے آزادی وطن کی تحریک میں بھی حصہ لیا، تحریک آزادی میں کانگریس کا ساتھ دیا اور کانگریس کے ساتھ مل کر اپنی سیاسی جماعت بھی بنائی اور قوت واقتدار میں شرکت بھی کی؛ مگر ہمیشہ ان کی اپنی منزل پہ نظر رہی، بقول علامہ سید سلیمان ندوی!

''وہ وطن کی آزادی اور احکام مذہبی کی پیروی کے درمیان التباس اور تصادم سے کبھی بے خبر نہیں رہے، جذبۂ آزادی کی پوری قوت کے باوجود انہوں نے کانگریس یا کانگریسی حکومت کے غلط اقدام اٹھانے پر بزدلانہ یا صلح پسندانہ درگذر سے کام نہیں لیا''۔(۲)

مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے لیے ضروری تھا کہ ان کے دینی اور فکری رہنماؤں کو متحد کیا جائے، یعنی طبقۂ علماء کی صف بندی کی جائے؛ کیوں کہ یہ طریقہ امت میں وحدت کا شعور پیدا کرسکتا ہے اور شریعت محمدی کی پاسداری کے لیے امت محمدی میں روح پھونک سکتا ہے، چنانچہ ۱۹۱۷ء میں انہوں نے مدرسہ انوار العلوم گیا مین بہار کے برگزیدہ علما و ارمشائخ کو سالانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت دی اور اس جلسہ میں انہوں نے علماء بہار کی انجمن کی بنا ڈالی۔ سلطان القلم سید مناظر احسن گیلانی نے مولانا سجاد کے بارے میں لکھا ہے:

''ابھی چند مہینے ہوئے تھے کہ وہی استھانواں کا الکن خطیب مونگیر اس غرض سے آیا تھا کہ علما کی منتشر اور پراگندہ جماعت کو ایک نقطہ خاص سیاسی حالات کے ساتھ جمع کیا جائے، اس وقت تک دلی کی جمعیۃ العلماء کا خواب بھی نہ دیکھا گیا تھا، طے ہوا کہ صوبہ بہار کے علماء کو پہلے ایک نقطہ پر متحد کیا جائے، پھر بتدریج اس کا دائرہ بڑھایا جائے، صوبہ کی جمعیۃ العلماء کے پہلے اجلاس کے پہلے صوبہ بہار کا انتخاب عمل میں آیا، مونگیر کی خانقاہ کی طرف سے جمعیۃ کی شرکت کے لیے خاکسار کو بھیجا گیا''۔(۳)

یہ نہ بھولنا چاہیے کہ برادران وطن بیدار اور ہوشیار تھے، جبکہ مسلمان خوابیدہ اور باہمی افتراق کا شکار تھے، آزادی کی تحریک اور سیاسی شعور میں مسلمانوں سے کہیں آگے برادران وطن تھے، مولانا ابوالمحاسن سجاد نے اس تنظیم علماء کے ذریعہ مسلمانوں کے علاقوں کا دورہ کیا، ان میں سیاسی شعور کی بیداری اور اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے قدم بڑھانے کی گذارش کی اور اپنی صف بندی اور تنظیمی وحدت کو باعزت زندگی کا ذریعہ قرار دیا، علماء کی اس تنظیم کا جب پہلا اجلاس مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں ہوا تو اس میں مدارس و مکاتیب کے ذمہ داروں کے علاوہ بڑی خانقاہوں کے مشائخ کی بھی نمائندگی ہوئی اور مولانا ابوالمحاسن کی اس جدوجہد کو تائید اور تقویت ملی، بقول مولانا عبدالصمد رحمانی علیہ الرحمہ:

''مولانا علماء کو ایک جگہ مجتمع کرنے میں، ایک راہ پر لگانے میں، نئے ڈھب، نئے طریقے اختیار کرنے، ماحول کے مقتضیات اور مواقع و احوال کی نامساعدات کے ساتھ کام کو بڑھانے میں اس کی اہمیت و افادیت کو منوانے میں کامیاب ہو گئے''۔(۴)

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے صرف صوبہ بہار کے علماء کو مجتمع کرنے پر قناعت نہیں کی، ان کی نظر میں پورا ہندوستان تھا اور پورے ملک کے علماء کو متحد کرنا ان کا ان مشن تھا، ان کے دل و دماغ میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی کہ مسلمان حکومت اور اقتدار سے محروم ہیں اور منتشر رہ کر وہ اپنا

قومی ورثہ اور دینی خصوصیت کو برقرار نہ رکھ سکیں گے، رفتہ رفتہ ہر شعبۂ زندگی میں زوال پذیر ہوجائیں گی، اسلام کی امانت جوان کو بزرگوں سے ملی ہے، اس کی حفاظت نہ کرپائیں گے، اس لیے ملک گیر سطح پر ان کی اجتماعیت ضروری ہے، اس طرح وہ ایک ایسی تنظیمی طاقت میں ڈھل جائیں گے، جو اسلام کی حفاظت بھی کرسکے گی اور مسلمانوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے موثر جدوجہد بھی کرسکے گی، نیز اغیار کے لیے آسان نہ ہوگا کہ اس اجتماعیت کو لقمۂ ہوس بنالے۔

چنانچہ دہلی میں ۱۹۱۹ء میں ایک درجن منتخب علماء کا ایک خصوصی جلسہ سید حسن رسول نما کی در گاہ میں منعقد ہوا اور اس میں جمعیۃ علماء ہند کے قیام کا مبارک اور تاریخی فیصلہ لیا گیا، اس یادگار جلسہ میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے اپنے دلی جذبات اور عملی تجربہ کا اظہار جس طرح کیا، وہ مولانا احمد سعید دہلوی کے الفاظ میں سنئے:

> ’’حضرت مولانا سجاد صاحب نے بھی اس جلسہ میں مختصر تقریر فرمائی تھی، اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا سجاد کے جذبات ایمانی کا ترجمان تھا، حاضرین کی تعداد اگرچہ دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی؛ لیکن کوئی آنکھ اور کوئی دل ایسا نہ تھا، جس نے اثر قبول نہ کیا ہو‘‘۔(۵)

جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا، اس کا پہلا اجلاس ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں اور دوسرا اجلاس ۱۹۲۰ء میں دہلی میں منعقد ہوا، دہلی کے اجلاس میں پورے ملک سے تقریباً پانچ سو (۵۰۰) علماء و مشائخ اور دردمندان اسلام کی جماعت حاضر تھی، مسلمانان ہند کے لیے جمعیۃ علماء کے قیام کا فیصلہ تائید غیبی لیئے ہوا تھا، آزادیٔ ہند اور تقسیم ہند کے موقع پر اور اس کے بعد مسلمانوں پر جو قیامت گذری، اس سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں، ان خونچکاں حالات میں علماء کی یہی جماعت تھی جو ایک طرف مسلمانوں کو قتل وغارت گری کے عذاب سے بچانے میں جان کی بازی لگارہی تھی، حکام وقت اور سرکاری قوتوں سے انصاف اور قانون کی پاسداری کا مطالبہ کررہی تھی اور مسلمانوں کو ہمت وحوصلہ، بے خوفی، دلجمعی اور صبر واستقلال کی نصیحت کررہی تھی، فسادات کے مارے ہوئے کے لیے راحت رسانی اور لٹے پٹے ہوئے کے لیے سامان زندگی کی فراہمی کررہی تھی۔ ہمارے بزرگ علماء کا یہ اخلاص تھا کہ جمعیۃ علماء نے مسلمانوں کی رہنمائی اور دست گیری کو کبھی فراموش نہیں کیا، آج بھی وہ دکھے دلوں کی صدا ہے اور دکھیاروں کے درد وغم کا مداوا کررہی ہے، آزاد ملک میں قید وبند کی ناحق اذیت سہنے والے نوجوانوں کی قانونی جنگ لڑنے میں اس کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، مولانا محمد سجاد پوری عمر اسی راستہ پر رہے، وفات ۱۹۴۰ء سے پہلے جمعیۃ علماء بہار کے ناظم عمومی بنائے گئے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے صرف مسلمانوں کی اجتماعیت ووحدت کو کافی نہیں سمجھا؛ بلکہ ان کے خانگی وسماجی مسائل کے حل کے لیے اور شریعت اسلامی کے عملی نفاذ کے لیے ہندوستان میں امارت شرعیہ کے قیام کا منصوبہ پیش کیا، تاکہ ملت اسلامیہ اپنے خدارسیدہ اور شریعت کے محافظ علماء کرام کی نگرانی میں اپنے معاملات طے کرے اور اپنے مسائل خود حل کرے، چنانچہ دہلی کے ۱۹۲۰ء کے اجلاس میں مولانا سجاد نے امارت شرعیہ فی الہند کے قیام کی تجویز پوری بصیرت اور وضاحت کے ساتھ رکھی، اس تجویز کا پس منظر بیان کرتے ہوئے مولانا عبدالصمد رحمانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

دراصل صحیح معنوں میں یہی پہلا اجتماع تھا جو تمام اسلامیان ہند کا نمائندہ اجتماع تھا اور آئینی حیثیت سے یہ پہلا اجتماع تھا کہ آئینی طریقہ پر پورے اسلامی ہند کے لیے امیر شریعت یا امیر الہند کا مسئلہ طے کیا گیا، چنانچہ اس اجلاس کے موقع پر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے مسئلۂ امارت فی الہند کو ارباب حل وعقد کے سامنے رکھا''۔(۶)

مولانا محمد سجاد نے صرف تجویز ہی نہیں رکھی، بلکہ اس سلسلہ میں پورے ملک کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی۔ علماء، مشائخ، اصحاب فکر ونظر سے ملاقاتیں کیں اور امام المسلمین کے انتخاب کی ضرورت کو محسوس کرایا، علماء کے دستخط سے ایک فتویٰ بھی شائع کرایا، جس میں مسلمانوں کی شرعی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اور باہمی معاملات کے حل کے لیے امام المسلمین کی ضرورت پر زور دیا گیا، مولانا سجاد نے اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ملاقات کی، مولانا آزادؒ نے ان کے خیال، تجویز، دلیل اور مصالح کو سن کر ان کی تائید اور توثیق کی اور امارت شرعیہ کے قیام سے اتفاق کیا۔(۷)

مولانا سجاد نے یہ محسوس کیا کہ پورے ملک میں امارت شرعیہ کا قیام فی الحال دشوار ہے تو انہوں نے ماڈل کے طور پر پہلے بہار میں اس کے قیام کو یقینی بنانے کی جدوجہد کی اور بالآخر وہ اپنی مبارک کوشش میں کامیاب ہوگئے، ۲۳ رمئی ۱۹۲۱ء کو انجمن علماء بہار کے اجلاس میں مولانا نے اپنے اس منصوبہ کا اظہار کیا اور سارے علماء سے تجویز منظور کرائی، جس کا خلاصہ یہ تھا:

''صوبہ بہار واڑیسہ کے محکمہ شرعیہ کے لیے ایک عالم مقتدر شخص امیر منتخب کیا جائے، جس کے ہاتھ میں تمام محاکم شرعیہ کی باگ ہو اور اس کا ہر حکم مطابق شریعت ہر مسلمان کے لیے واجب العمل ہو، نیز تمام علماء ومشائخ اس کے ہاتھ پر حفاظت اسلام کے لیے بیعت کریں، جو سمع وطاعت کی بیعت ہوگی اور جو بیعت طریقت سے ایک الگ اور ضروری اہم

چیز ہے"۔(۸)

چنانچہ مولانا سجاد کی اس جد وجہد اور علماء کی تجویز ۲۶؍جون ۱۹۲۱ء کو بارآور ہوئی، جب پتھر کی مسجد پٹنہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں امیر شریعت کے انتخاب کا اجلاس منعقد ہوا اور پورے صوبہ کے پانچ سو علماء اور مشائخ جمع ہوئے، اس اجلاس نے متفقہ طور پر مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی کو امیر شریعت اور خود مولانا سجاد کو نائب امیر شریعت کے طور پر منتخب کیا۔(۹)

یہ اس امارت شرعیہ کی اساسی مجلس تھی، جس نے بہار واڑیسہ میں نہ صرف مسلمانوں کے خاندانی اور سماجی تنازعات کے شرعی حل کے لیے ایک پُر وقار، دستوری راستہ نکالا، بلکہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور دینی رہنمائی میں بھی تاریخی اور روشن خدمات انجام دیں، اس نے مسلمانوں میں اعتبار اور افتخار کا وہ مقام حاصل کیا کہ اس کی مثال ہم سایہ ممالک میں مشکل سے مل سکتی ہے، اس اجلاس کے صدر مجلس استقبالیہ مولانا سید شاہ حبیب الحق سجادہ نشیں خانقاہ عمادیہ منگل تالاب نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا:

"یہ سب سے پہلے اسی صوبہ کے علماء چوں کہ غفلت سے بیدار ہوئے اور جمعیۃ علماء کی بنیاد ڈالی، سوئے ہوئے شیرازہ کا استحکام شروع کیا، ہماری اصلاح کی طرف مخاطب ہوئے، موجودہ حالات پر غور وفکر کی تدبیریں نکالیں، اس طرح اب امیر شریعت کے لیے بھی سب سے پہلے یہی صوبہ سب سے آگے بڑھا، خدا اسے کامیاب کرے"۔(۱۰)

تاریخ میں ان درویش علما کا یہ کارنامہ محفوظ رہے گا کہ جب مسلم بادشاہوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کو اپنی نااہلی سے گنوا دیا تو علماء کی اس مخلص جماعت نے اسلامی ورثہ کو بچالیا اور اسلام اور مسلمانوں کی آبرو بچانے کا فریضہ انجام دیا، بقول علامہ اقبالؒ:

ان کے ارادے قلیل ان کے مقاصد جلیل

ازم ہو یا بزم پاک دل و پا کباز

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی، بیماری وآزادی سے بے نیاز اور خانگی ذمہ داریوں سے وقت بچا کر ملک وملت اور دین وشریعت کے لیے سرگرم سفر رہتے تھے، انہوں نے خلافت تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور عالم اسلام کی وحدت اور امت مسلمہ کی آفاقیت کو زمینی سطح پر محسوس کرانے میں اپنا کردار ادا کیا، انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کو یقینی بنانے کے لیے مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی بھی بنائی، غرضیکہ ہر وہ کام کیا، جس سے

مسلمانوں کی عزت میں اضافہ ہو، ان کے مسائل حل ہوں اوران کا وزن محسوس کیا جا سکے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ دینی، تنظیمی اورشرعی سرگرمیوں کے علاوہ مسلمانوں کی سماجی اوررفاہی کاموں میں بھی اسی اخلاص اور جانفشانی سے حصہ لیتے تھے، فسادات کی آگ ہو، یا زلزلہ کا جھٹکا، سیلاب کی تباہ کاری ہو، یا آسمانی آفتوں کا حملہ، ان تمام مصائب میں وہ مسلمانوں کے ساتھ کھڑے رہتے اور ہر طرح سے ان کی راحت رسانی کی جتن کرتے تھے، وہ مال وزر کی چاہت، عہدہ واقتدار کی ہوس اور نام ونمود اور شہرت سے دور رہ کر اللہ کے بندوں کی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے:

> ''مسلمانوں کی سلامتی اور تنظیم کی ایک دھن تھی کہ ان کو دن رات چکر میں رکھتی تھی، کہیں قربانی کا جھگڑا ہو، مسلمانوں پر مقدمہ ہو، کہیں سیلاب آئے، کہیں آگ لگے، کہیں ہندو مسلم کا تنازعہ ہو، ہر جگہ خود پہونچ جاتے تھے، معاملہ کا پتہ لگاتے تھے، مسلمانوں کی مدد کرتے تھے، ان کے لیے چندہ کرتے تھے، جہاں سے ہوسکتا ہے، وہ ان کو لا کر دیتے تھے اور خود خالی ہاتھ رہتے تھے''۔ (۱۱)

ان کی وفات حسرت آیات پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے لکھا تھا کہ بہار کی تنہا دولت گئی، ﴿**یالیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین**﴾ کی آیت شاید ان کے لیے بھی نازل ہوئی تھی۔ (۱۲)

اسلام کے اس عظیم فرزند، مسلمانوں کے اس عظیم رہنما اور علماء کے اس بے لوث نمائندہ کے لیے ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں:

پھونک کر اپنے آشیانہ کو
بخش دی روشنی زمانہ کو

مصادر ومراجع

(۱) یادرفتگان از سید سلیمان ندوی، ص: ۲۴۰، مکتبہ الشرق کراچی ۱۹۵۵ء

(۲) یادرفتگان، ص: ۲۴۰

(۳) مولانا عبدالصمد رحمانی، حیات سجاد، ص: ۵۱-۵۲، مقالہ مولانا مناظر احسن گیلانی، امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، ۱۳۶۰ھ

(۴) مولانا عبدالصمد رحمانی، تاریخ امارت، ص ۴۳، پٹنہ ۱۳۶۷ھ

(۵) مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، حیات سجاد، ص: ۹، پٹنہ ۱۹۹۸ء

(۶) تاریخ امارت، ص: ۴۹

(۷) پروفیسر محسن عثمانی، مشاہیر علوم اسلامیہ اور مفکرین و مصلحین، ص: ۴۷۲، نئی دہلی ۲۰۱۷ء

(۸) تاریخ امارت، ص: ۵۴

(۹) حسن حیات، سوانح قاضی سید احمد حسین، ص: ۱۳۵، مرتب شاہ محمد عثمانی، نئی دہلی ۱۹۹۱ء

(۱۰) حسن حیات، سوانح قاضی سید احمد حسین، ص: ۱۳۵، مرتب شاہ محمد عثمان، نئی دہلی ۱۹۹۱ء

(۱۱) یادرفتگان، ص: ۴۵

(۱۲) مکاتیب گیلانی، ص: ۲۸۵، مرتب مولانا منت اللہ رحمانی خانقاہ رحمانی مونگیر، ۱۹۷۲ء

مفکر ملت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد

فراست ایمانی کا ایک عملی نمونہ

محمد سالم جامعی
ایڈیٹر ہفت روزہ ’الجمعیۃ‘ دہلی، مدنی ہال، ۱- بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرّہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

جمعیۃ علماء ہند شمسی ماہ وسال کے حساب سے اپنی زندگی کے ننانوے سال پورے کرکے سوویں سال میں قدم رکھ چکی ہے، جو ہندستان کی ملّی تاریخ کا ایک ایسا عجیب؛ مگر خوشگوار واقعہ ہے، جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

ہندستان میں نہ جانے ملت کے نام پر کتنی تنظیموں نے جنم لیا، جو آندھی اور طوفان کی طرح اُٹھیں اور سمندر کے جھاگ کی طرح اپنی آخری منزل کو پہنچتی چلی گئیں۔ آزادی سے پہلے سقوطِ خلافت کے بعد خلافت تحریک اُٹھی، جس کا مقصد اس انگریز سامراج کے خلاف رائے عامہ بیدار کرنا تھا، جو خلافتِ اسلامیہ کے خاتمہ کا اوّلین محرک تھا، خلافت تحریک نے مسلسل ایک دہائی تک ملک میں سرگرم جدوجہد جاری رکھی؛ لیکن ایک دہائی کے بعد وہ اپنی سرگرمی جاری نہ رکھ سکی۔ مسلم لیگ آندھی اور طوفان بن کر مسلمانوں کے دلوں پر چھائی؛ لیکن ملک آزاد ہوتے ہی وہ اپنا وجود کھو بیٹھی، مجلس احرار اور خاکسار تنظیم کا بھی تقریباً ایسا ہی حشر ہوا اور آج کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ ان ناموں کی کوئی تنظیم کبھی وجود میں آئی بھی تھی، یا نہیں؟ لیکن خدا کا بیکراں فضل واحسان ہے کہ جمعیۃ علماء ہند اپنی درازئ عمر کے باوجود نہ صرف زندہ ہے؛ بلکہ پہلے دن جیسے جوشِ عمل اور سرگرمی کے ساتھ زندہ ہے۔ تنظیموں کے لیے ایک سو برس کی عمر کچھ کم نہیں ہوتی اور اگر کوئی تنظیم اپنی عمر کے سو سال پورے کرلے تو اسے فضلِ خداوندی اور اکابرو اسلاف کی دعائے نیم شبی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند ۱۹۱۹ء میں ایسے وقت میں قائم ہوئی، جب انگریزی استبداد اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا اور کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ سات سمندر پار کی اس اجنبی مخلوق کے خلاف کوئی آواز بلند کر سکے؛ لیکن جمعیۃ علماء ہند اور اس کے بانیوں نے سب سے پہلی جو آواز لگائی، وہ وہی تھی جسے سننے کے لیے ہر ہندستانی گوش برآواز تھا، اس نے مکمل آزادی کا نعرہ دیا اور کہنا چاہیے کہ اس نعرہ کے ذریعہ اس نے تحریک آزادی کے لیے قائم تمام تنظیموں، تحریکوں اور انجمنوں پر سبقت حاصل کر لی۔

اپنی سو سالہ زندگی میں جمعیۃ علماء ہند نے ملتِ اسلامیہ ہند کی کیا خدمت انجام دی؟ اس کی صرف فہرست شماری کے لیے بھی ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، چہ جائیکہ ان خدمات کی تفصیل بیان کی جائے؛ تاہم یہ بات انتہائی وثوق اور اطمینانِ قلب کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس نے مسلمانوں کی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں چھوڑا، جہاں اس نے اپنی خدمت کے نقوش نہ چھوڑے ہوں۔

الحمدللہ جمعیۃ علماء ہند اپنی زندگی کے سو سال پورے کر رہی ہے اور جس کے اظہارِ تشکر کے لیے اس نے مختلف پروگراموں کی شکل میں ان شاء اللہ پورے سال صد سالہ تقریبات منانے کا فیصلہ کیا ہے، جن کا اختتام نومبر ۲۰۱۹ء میں ایک عظیم الشان صد سالہ اجلاسِ عام پر ہوگا، جمعیۃ علماء ہند اپنی ان صد سالہ تقریبات کو مؤثر اور یادگار بنانے اور اپنے اکابر و اسلاف، بانیان اور اہم جماعتی شخصیتوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کی حیات و خدمات پر مشتمل سیمیناروں کا بھی اہتمام کر رہی ہے اور الحمدللہ آج کا یہ سیمینار جو مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے سلسلہ میں منعقد ہو رہا ہے، اسی سلسلۃ الذہب کی ایک سنہری کڑی ہے۔ مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی شخصیت اس کاروانِ ملت میں انتہائی اہمیت کی حامل تھی، جمعیۃ علماء ہند کے دورِ اوّل میں اگر سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ کو جمعیۃ علماء ہند کی زبان کہا جاتا تھا تو حضرت مولانا محمد سجادؒ اس کا دماغ کہے اور سمجھے جاتے تھے، وہ اپنی قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ملک کے صف اوّل کے رہنماؤں میں شامل تھے، ملّی جد و جہد کے ذیل میں ملت کی شیرازہ بندی ان کا خاص موضوع تھا، ایک طرف انھوں نے جمعیۃ علماء ہند کی تحریک و تاسیس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تو دوسری طرف ملت کی شرعی رہنمائی کے لیے انھوں نے امارتِ شرعیہ کی بنیاد ڈالی جس کی ابتدا بہار سے کی گئی۔

دراصل انگریزی سامراج کی سازشوں کے ذریعہ خلافت کے سقوط نے ہندستانی مسلمانوں

کو یہ سمجھنے پر مجبور کردیا تھا کہ انگریزی سامراج اگرچہ مسلمانوں کے دین وایمان پر شب خون مارنے اور عیسائی مشنریوں کی ہزار کوششوں کے باوجود انھیں اسلام سے بیگانہ کردینے میں ناکام ہوگیا ہے، تاہم اس نے اپنے اقتدار کے سہارے مسلمانوں میں انتشار وافتراق اور ان کی عائلی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انگریزی عدالتوں کے ذریعہ شریعت اسلامی کے خلاف بہت سے ایسے فیصلے کرائے، جن کے ذریعہ اسلامی روایات، موروثی وعرفی قوانین وراثت اور نکاح و طلاق کے معاملات میں شریعت اسلامی سے انحراف نے جنم لینا شروع کردیا۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے شرعی وعائلی مسائل ومعاملات تھے، جو انگریزی سامراج کے نشانے پر تھے اور جس کا مقصد صرف اور صرف ان کا اسلامی تشخص ختم کرکے انھیں ان کے دین وایمان سے بیگانہ کردینا تھا۔ یہ ایسی صورتِ حال تھی جس نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور ان کے دردمند اور حساس اربابِ فکر کو تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ انھیں اربابِ فکر ودانش میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ بھی تھے۔ ملک کے مسلمانوں میں اپنے شعائر اسلامی کے تعلق سے بے چینی عام تھی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کا ملی موضوع چونکہ ملت کی شرعی شیرازہ بندی ہی تھا؛ اس لیے انھیں ملت کے اس احساس کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی اور پھر ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی قیادت ورہنمائی میں اس احساس نے ایک ادارہ کی شکل اختیار کرلی، جسے امارتِ شرعیہ بہار کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے، جس کے تادم واپسیں (۱۹۴۰ء) آپ نائب امیر شریعت رہے۔ یہ آپ کی کسر نفسی تھی کہ آپ نے مولانا شاہ بدرالدین صاحبؒ کی موجودگی میں علماء وعوام کے شدید اصرار کے باوجود امارت قبول نہیں فرمائی؛ اس لیے کہ وہ ہی اس پورے نظام کا دماغ اور روحِ رواں تھے اور بلاشبہ امارت آپ کا حق تھا۔ دراصل مولانا محمد سجاد قدس سرہٗ کو پروردگارِ عالم نے فراستِ ایمانی سے خوب خوب نوازا تھا، مستقبل پر ان کی گہری نظر تھی، مستقبل کے حالات کا اندازہ کرکے حال کا نقشہ بنانے میں وہ ماہر تھے۔ حدیث شریف میں فراستِ مومن کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، ایک حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ یہ نورِ حق کا پرتو ہوتی ہے، مومن نورِ خداوندی کی روشنی میں مستقبل کو دیکھ لیتا ہے۔ بقول مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ: وہ دقیق النظر اور عمیق العلم تھے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''میرے محدود علم میں ان کا جیسا دقیق النظر اور عمیق العلم عالم دور دور نہ تھا۔ فقہ بالخصوص اصولِ فقہ پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ سیاست وتمدن اور تاریخ کا بھی انھوں نے

گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، خاص طور پر قانونی ودستوری باریکیوں اور ہندستان کے دستور اور سیاسی نظاموں سے وہ گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ان کا انھوں نے بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ ان کے تکلم وخطابت اور تحریر وانشا کے حصہ کی قوت وصلاحیت بھی (جس سے ان کے بہت سے معاصرین نے عام طور پر بڑی فیاضی سے کام لیا) مسلمانوں کے موجودہ حالات، مستقبل کے خطروں اور ہندستان میں ان کے مقام کے تعین کے مسئلہ پر صرف ہوئی تھی۔ وہ بدلتے ہوئے ہندستان کو اپنی چشم بصیرت سے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسا کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اس وقت چشم بصارت سے بھی نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ وہ اقبال کی زبان میں ہر وقت زبانِ حال سے گویا تھے:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

(ہفت روزہ ’نقیب‘ پھلواری شریف)

مفکرِ ملت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی فراستِ ایمانی کا اندازہ ۲۳؍جنوری ۱۹۳۹ء کے مسٹر جناح کے نام لکھے گئے اس مکتوب سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے، جس میں انھوں نے وقت کے سیاسی مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلم لیگ کے رہنماؤں کو مشورہ دیا تھا کہ چار کروڑ روپے جمع کرکے مسلمانوں کی صنعتی ترقی کے لیے کارخانے اور فیکٹریاں کھولی جائیں؛ تاکہ بے کار و بے روزگار مسلم نوجوان کام اور روزگار حاصل کرسکیں اور مسلمانوں کے لیے ملک میں صنعتی کام فراہم ہو جائے۔ دراصل مولانا مرحوم اپنی فراستِ ایمانی سے یہ بات سمجھ چکے تھے کہ جلد، یا بدیر انگریزی سامراج کو ملک سے راہِ فرار اختیار کرنی ہی ہوگی اور پھر ملک میں جو بھی حکومت قائم ہوگی، اس پر اکثریت کا غلبہ رہے گا اور حکومت کے زیرِ سایہ ملک کی صنعت وحرفت پر بھی برادرانِ وطن ہی قابض ہوں گے۔ مولانا مرحوم کی یہ دور اندیشی تھی، جسے آج ہم کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں۔ اپنے مکتوب میں حضرت مفکرِ ملت تحریر فرماتے ہیں:

”مکرمی! جس طرح میں نے ”الدین النصیحۃ“ کے تحت آپ کو پہلے خط میں محض اسلامی اور ملکی مفاد کے لیے عین وقت پر اہم مشورہ دیا تھا، اسی طرح ایک دوسرا مشورہ نہایت ضروری دیتا ہوں، یہ بھی آپ سال دو سال کے اندر کرسکتے ہیں، ورنہ پھر شاید موقع نہ رہے۔ مجھے امید تھی کہ آپ اگر میری انقلابی تجویز کو منظور نہ کریں گے تو کم از کم کوئی تعمیری پروگرام مسلمانوں کے اقتصادی مفاد کے لیے بنا کر کام شروع کردیں گے؛ مگر افسوس ہے کہ

سوائے بیکار اور لاحاصل شور وشغف کے کچھ نہیں ہوا؛ اس لیے آج دوسری بات لکھتا ہوں۔
اس وقت خوش قسمتی سے مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے تمام سرمایہ دار مسلمان جمع ہو گئے ہیں، اتنے سرمایہ دار اس سے پہلے کبھی جمع نہیں ہوئے تھے؛ لیکن آج غالبًا کوئی مسلم سرمایہ دار ایسا نہیں ہے، جو اس سے الگ ہو، بس یہ وقت ہے کہ آپ تین کروڑ روپے ان سرمایہ داروں سے جلد از جلد جمع کرلیں اور ایک کروڑ روپے غریب مسلمانوں سے وصول کرنے کا انتظام کریں اور اس چار کروڑ روپے کے سرمایہ سے صنعتی کارخانے اور فیکٹریاں کھول دیں؛ تاکہ ایک طرف تو سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے اور دوسری طرف لاکھوں تعلیم یافتہ مسلم نوجوان اور مزدور جو ذریعہ معاش نہ ملنے سے تباہ ہو رہے ہیں، برسرروزگار ہو جائیں؛ کیونکہ اس وقت بھی الحمدللہ مسلمان سرمایہ داروں میں بست ہزاری سے لے کر لاکھ پتی تک ہیں، تمام ہندستان میں چند ہزار مسلمان ایسے موجود ہیں، جن سے آپ بآسانی تین کروڑ روپیہ جمع کر سکتے ہیں، پہلے ان سے روپے فراہم کرلیں، اس کے بعد متوسطین اور غریب افراد سے ایک کروڑ روپے کا جمع کرنا کوئی مشکل نہیں، اگر مسلم لیگ تمام باتوں سے علیحدہ ہو کر صرف اس کام کو انجام دے دے تو وہ مسلمانوں کے لیے بہت مفید کام کرے گی۔

تعجب ہے کہ کانگریس کے وزرا صنعتی کانفرنس کر کے ہندستان کی صنعتی ترقی کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں، ان کی رپورٹیں اخبارات میں شائع ہو جاتی ہیں؛ مگر مسلم لیگ کے اصحاب صرف ہندوؤں اور کانگریس اور ان مسلمانوں کو کوسنے میں مشغول ہیں، جو انگریزی نظام حکومت کی تخریب کا کامل جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں اور آج تک اس مسلک پر قائم ہیں؛ مگر مسلم لیگ کے سب سے بڑے شاندار اجلاس میں غریب مسلمانوں کے مالی مفاد کے لیے صنعتی ترقی کے مسئلہ پر ایک لمحہ بھی صرف نہیں کیا جاتا اور نہ کوئی اسکیم بنائی جاتی ہے اور نہ بنگال و پنجاب کے وزراء اعظم کو کوئی ہدایت دی جاتی ہے اور نہ وہ خود کوئی اسکیم پیش کرتے ہیں تو کیا غریب مسلمانوں کی خدمت کے یہی آثار ہیں؟ میرے الفاظ پر نگاہ نہ کیجیے؛ بلکہ اس کے معانی پر غور کیجیے"۔

آپ کا خیر اندیش

ابوالمحاسن محمد سجاد

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ پر اکابر امت کا مکمل اعتماد تھا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کو جون ۱۹۴۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کا صدر منتخب کیا گیا تو آپ نے جولائی ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کو مجلس عاملہ کے مشورہ پر ناظم عمومی نامزد فرمایا؛ مگر حضرت مولانا

ابوالمحاسنؒ کی عمر نے وفا نہ کی، آپ کا اسی سال وصال ہو گیا، جس کے بعد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی لکھنوی کی نامزدگی عمل میں آئی، اس سے قبل ۱۹۳۲ء میں حضرت مولانا محمد سجادؒ کی مومنانہ فراست، قوتِ عمل اور حاضر دماغی کا ہمارے اکابر اس وقت مشاہدہ کر چکے تھے، جب جمعیۃ علماء ہند نے سول نافرمانی کا پروگرام طے کیا اور اس کے لیے آپ کی سربراہی میں 'ادارہ حربیہ' قائم کیا۔ ادارہ حربیہ کا قیام، اس کا پس منظر اور مولانا مرحوم کی مومنانہ بصیرت کا حال مورخ جمعیۃ سیّد الملت حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب قدس سرہٗ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت سیّد الملّتؒ 'مجاہد ملت نمبر' میں مجاہد ملتؒ کے حالات پر ایک تفصیلی مضمون میں رقم طراز ہیں:

''تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس موقع پر یہ بات خاص طور سے نوٹ کر لینی چاہیے کہ جمعیۃ علماء ہند نے جب ۱۹۲۹ء میں جنگِ آزادی میں شرکت طے کی تھی تو ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اس کا پلیٹ فارم علیحدہ ہوگا۔ اس کے رضا کاروں کا نظام بھی علیحدہ رہے گا، گرفتاریوں کا پروگرام بھی جمعیۃ علماء ہند اپنے ارکان اور کارکنوں کے لیے علیحدہ بنائے گی اور اگر مقدمات وغیرہ کے سلسلہ میں مصارف کی ضرورت ہوگی تو ان کا انتظام بھی جمعیۃ علماء اپنے طور پر کرے گی، کانگریس یا کسی اور پارٹی کی طرف نظر نہیں اُٹھائے گی، اب ۱۹۳۲ء میں جب تحریک میں دوبارہ جان پڑی تو اس کو زندہ رکھنے کے لیے غذا کی ضرورت تھی، پروگرام کے مطابق سول نافرمانی کرتے ہوئے گرفتار ہو جانا تحریک کی غذا تھی؛ مگر اس مرتبہ اس غذا کا فراہم کرنا کانگریس اور جمعیۃ علماء دونوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا؛ کیونکہ اوّل تو مسلسل تین سال گزر جانے کے بعد کارکنوں کے جوشِ عمل میں اضمحلال پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا، اس کے علاوہ ولنگڈن گورنمنٹ نے اس مرتبہ تحریک شروع ہونے سے پہلے ہی صف اوّل کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا تھا، مزید برآں ضبطی جائداد اور گرفتاریوں کے سلسلہ میں بھی حکومت کی پالیسی پہلے سے بہت زیادہ سخت ہو گئی تھی، ان تمام حالات کی بنا پر اگرچہ کام بہت مشکل ہو گیا تھا؛ مگر ان حالات کا تقاضا یہ بھی تھا کہ تحریک کی رگوں اور پٹھوں میں تقویت کے انجکشن اس پردہ داری کے ساتھ لگائے جائیں کہ سی آئی ڈی کی نظرِ تفتیش اُن ڈاکٹروں تک نہ پہنچ سکے، جو انجکشن کی سوئیاں ہاتھ میں لیے ہوں۔

عام طور پر پروگرام یہ ہوا کرتا تھا کہ ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ رضا کاروں کے جتھے بھیجے جاتے تھے، جو برسرِ عام قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے اور گرفتار کر لیے جاتے تھے، عام طور پر دفعہ ۱۴۴/۸۸ نافذ رہتی تھی، رضا کاروں کے جتھے خلافِ قانون نعرے لگاتے تھے، جو

جماعتیں خلافِ قانون قرار دے دی جاتی تھیں، اُن کا پرچم لہراتے، یا اُن کا لٹریچر تقسیم کرتے تھے اور جب وہ جلوس بنا کر چلتے تھے تو دفعہ ۱۴۴/۸۸ کی خلاف ورزی بھی ہو جاتی تھی، پولیس کی کوشش یہ رہتی تھی کہ وہ یہ معلوم کرے کہ رضا کاروں کا جتھہ کہاں سے روانہ ہوگا؛ تاکہ روانگی سے پہلے ہی ان کو گرفتار کرلے اور یہ نہ ہو سکے تو جیسے ہی جتھہ روانہ ہو فوراً گرفتار کرلے؛ تاکہ شہر میں خلافِ قانون اقدام کا مظاہرہ نہ ہو سکے، پورے ملک میں سول نافرمانی اور خلاف ورزی قانون کے اس نظام کو زندہ رکھنے کے لیے ایک مستقل نظام کی ضرورت تھی؛ چنانچہ کانگریس نے جنگی کونسل قائم کردی تھی اور جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اس نظام کے لیے عربی کا لفظ 'ادارہ حربیہ' منتخب کیا تھا۔

وہ زمانہ بھی عجیب تھا، جمعیۃ علماء ہند کے صدر مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اور ناظم اعلیٰ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب تھے؛ مگر وہ ڈاکٹر جس کو بہت سے انجکشن دے دیئے گئے تھے ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب (نائب امیر شریعت صوبہ بہار) تھے۔ 'ادارہ حربیہ' کے کلید بردار یہی حضرت تھے، جمعیۃ علماء ہند کے دفتر سے علیحدہ محلّہ بلیماران کی ایک تاریک گلی میں ایک مکان لے لیا گیا تھا، حضرت مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اسی مکان میں رہتا تھا، جس کا علم دفتر کے لوگوں میں سے بھی غالباً صرف قاضی اکرام الحق صاحب کو تھا، جماعت کے جو حضرات اس ادارہ کی ضرورت سے حضرت موصوف سے ملاقات کرنا چاہتے تھے تو قاضی اکرام الحق صاحب ہی اُن کے رہبر بنتے تھے''۔

حضرت سیّد الملتؒ اپنے اسی مضمون میں مزید رقم طراز ہیں:

''موصوف کی ہدایت اس احقر کے لیے یہ تھی کہ ہر ہفتہ جمعہ کی صبح کو مرادآباد سے چل کر دہلی پہنچا کرے اور نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں تقریر کر کے واپس جایا کرے، چند جمعے اس طرح گزرے، مرادآباد سے تقریباً پانچ بجے صبح کو گاڑی چلتی تھی (جیسا کہ آج کل بھی چلتی ہے) احقر اس ٹرین سے تقریباً ساڑھے دس بجے دہلی پہنچتا تھا، اسٹیشن پر ہی کوئی صاحب موجود رہتے، جو احقر کو احتیاط سے طے کردہ مقام پر پہنچا دیتے تھے، پھر اسی احتیاط سے رقیبوں کی نظروں سے بچاتے ہوئے جامع مسجد پہنچاتے اور تقریر کے فوراً بعد اسی احتیاط سے کسی صاحب کی رہنمائی میں صوبہ دہلی کی حدود سے باہر پہنچا دیتے تھے، پولیس جب تلاش کرتی تو اس کو اپنی ناکامی پر کافی جھنجھلاہٹ ہوا کرتی تھی، جمعہ کا دن تھا،

احقر حسب ہدایت مراد آباد سے دہلی پہنچا، اس روز پولیس پوری طرح چوکنی تھی اور احقر کی گرفتاری کا سامان اس نے مکمل کر رکھا تھا، حضرت مولانا سجاد صاحب کو اس کا علم تھا، مولانا موصوف نے نمازِ جمعہ کے لیے احقر کو خفیہ راستوں سے روانہ فرمایا تو احقر کے رہبر قاضی اکرام الحق صاحب کو تاکید کر دی کہ نماز کے بعد جنوبی دروازہ سے احقر کو نہ نکالیں، اس طرف پولیس چوکی ہے اور آج چوکی کے علاوہ بھی پولیس کا انتظام ہے؛ بلکہ شمالی دروازہ کے سامنے تانگہ تیار رکھیں اور اسی راستہ سے نکال کر لائیں، اس طرف پولیس نہیں ہوگی، قاضی اکرام الحق صاحب سہو اور نسیان کے پرانے مریض ہیں، یہاں بھی وہ اس ہدایت سے ایسے غافل ہو گئے کہ خاص طور پر ممنوعہ راستہ ہی پر تانگہ کا انتظام کیا؛ یعنی جنوبی پھاٹک سے ہی احقر کو لے کر آئے جہاں پولیس کی چوکی ہے، پھر راستہ بھی چاوڑی بازار کے علاوہ چاندنی چوک کی طرف کا اختیار کیا، چنانچہ جیسے ہی کوتوالی کے سامنے تانگہ پہنچا، سی آئی ڈی کے سب انسپیکٹر نے جو جامع مسجد سے ہی تانگہ کے پیچھے لگ لیا تھا اور اطمینان سے اپنی سائیکل پر ہمارے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا، اس سب انسپکٹر نے تانگہ رُکوالیا اور احقر کو پورے اعزاز کے ساتھ تانگہ سے اُتار کر حوالات میں پہنچا دیا''۔

مولانا مرحوم واقعی مفکرِ ملت تھے، وہ ملت کے درد کا درماں اور اس کے امراض کے نباض حکیم تھے، وہ جانتے تھے کہ دُنیا میں بلا فکر کے کوئی نظام قائم نہیں ہوسکتا؛ اس لیے انھوں نے جو ادارے قائم کیے، پہلے ان کی فکری تربیت قائم کی اور پھر اس کا عملی نظام بنایا۔ دراصل وہ مولانا رومؒ کی اس نصیحت پر عمل پیرا تھے:

اوّل فکر آخر آمد در عمل
ہیئت عالم چناں داں در ازل

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی شخصیت ان کے علمی و عملی کارنامے اور ان کی قومی وملّی خدمات بہت وسیع اور ہمہ جہت ہیں جنھیں تحریر کرنے کے لیے ایک بڑے دفتر کی ضرورت ہے۔ راقم الحروف تو آخر میں مثنوی مولانا رومؒ کا ہی ایک شعر پیش کر کے رخصت ہونا چاہتا ہے:

خود نباشد آفتابے را دلیل
جز کہ نورِ آفتاب مستطیل

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب

حیات وخدمات

مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی
استاذ و ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیو بند

ہندوستان میں مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کو بیک وقت بہت سے مختلف قسم کے مسائل کا سامنا تھا۔ مذہبی اقدار و روایات پر حملے ہورہے تھے، سیاسی وسماجی سطح پر مسلمان پسماندگی کا شکار ہورہا تھا، مسلمانوں کی معاشی اور اقتصادی حالت روز بہ روز پست ہوتی جارہی تھی، انگریز حکومت کے تسلط کی وجہ سے ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمان انتہائی کسمپرسی اور بے بسی کے عالم میں اپنے شب وروز بسر کررہے تھے، زندگی کے ہر مرحلے میں وہ انگریزوں کے ظلم و ستم، جانب داری اور عصبیت کے شکار تھے، ملک سے انگریزوں کو در بدر کرنے کے لیے مختلف تحریکیں شروع کی گئیں تھی، دارالعلوم دیو بند کا قیام اس سلسلے میں سب سے اہم اقدام تھا اور دارالعلوم اپنے مقصد کی جانب تیز گام تھا، اسی مقصد کے لیے حضرت شیخ الہندؒ نے جمعیۃ الانصار قائم کی تھی اور پھر اس ضمن میں سب سے بڑی جدوجہد تحریک ریشمی رومال کے ذریعہ کی گئی؛ لیکن چند غداروں کی وجہ سے انگریزوں نے اس تحریک کو بھی ناکام بنادیا؛ بلکہ علماء کے حوصلوں کو پست کردیا تھا، حضرت شیخ الہند کے جیل میں چلے جانے کے بعد کئی سالوں تک سکوت طاری ہوگیا۔

مسلمانوں کے حواس مفلوج، قلب و ذہن مجروح اور عقل و دماغ محکوم ہورہے تھے، مسلمانوں کو سیاسی طور پر تلخیوں کا احساس ہورہا تھا اور وہ کسی میر کارواں کی تلاش میں سرگرداں تھا، بیمار قوم کسی مسیحا کے مبارک قدموں کے چاپ سننے کو منتظر اور پر امید نگاہوں سے کسی نجات دہندہ کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ایسے وقت میں اس ضرورت کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا کہ کوئی مرد مؤمن اپنے دل دردمند اور فکر ارجمند کو لے کر نمودار ہو اور اس لیے پٹے ہوئے کارواں کو یک جا کرکے تازہ دم کرے اور نہ صرف گفتگو کے ذریعہ؛ بلکہ عملی اقدامات کو بروئے کار لا کران کے تن مردہ میں ایک نئی روح پھونک دے؛ تاکہ مجموعی اعتبار سے بے حس وحرکت پڑی ہوئی قوم پوری

طرح صحت یاب اور فکری طور پر بیدار ہو کر خود کو مرد آہن ثابت کر سکے اور اپنے وجود کی اہمیت کا احساس دلا سکے اور ایک نئے جوش اور تاریخ ساز ولولے کے ساتھ اٹھیں اور خود کو دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے کے بجائے اپنے نوشتہ تقدیر خود اپنے ہاتھوں سے تحریر کر سکے۔

غرض یہ کہ سیاسی میدان میں کسی ایسے مستانے کی شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کی جارہی تھی، جو بگڑے ہوئے ''دستور مے خانہ'' میں تبدیلی لاکر اپنے نئے لائحۂ عمل اور سیاسی فہم و تدبر کے ذریعہ اس ''قوم'' کے گیسوئے برہم کو سنوار سکے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے درد کے درماں کے لیے بارگاہ ایزدی میں ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کو قبول کرلیا گیا، جس کا ظہور مسلمانان ہند کے ذریعہ آپ کی ذات کو سیاسی رہنمائی کے لئے منتخب کئے جانے کی صورت میں ہوا۔

شخصیت کے خدوخال :

آپ کی ولادت ۱۲۹۹ھ میں موضع پنہسہ ضلع پٹنہ کے ایک باوقار علمی و دینی گھرانے میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی مزید حصول علم کے لیے مدرسہ اسلامیہ بہار شریف اور پھر کانپور گئے، کانپور میں مجموعی طور پر تین سال قیام کر کے حصول علم میں مصروف رہے؛ لیکن یہاں تحصیل علم کی تکمیل نہیں ہوئی تھی، جس کی تکمیل کے لئے انہوں نے الہٰ آباد کا سفر کیا اور وہاں انہوں نے جید الاستعداد اساتذہ کرام سے حصول علم کا مرحلہ مکمل کیا۔

فراغت کے بعد اپنے استاذ و خسر حضرت مولانا وحید الحق صاحب مرحوم کے قائم کردہ ادارہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں تدریسی سلسلہ کا آغاز کیا۔ آپ کے مثالی طرز تدریس نے ادارہ کو شہرت کے بام عروج تک پہونچایا اور شاگردوں کی ایک کھیپ تیار ہوئی، مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے بعد اپنے استاذ حضرت مولانا عبدالکافی صاحب مرحوم کے اصرار پر الہٰ آباد تشریف لائے اور مدرسہ سبحانیہ میں مدرس مقرر ہوئے۔ الہٰ آباد میں طویل قیام کے بعد آپ گیا تشریف لے گئے وہاں برسوں سے بند پڑا ادارہ مدرسہ انوارالعلوم کو از سر نو جاری کیا۔ گویا جس وقت آپ گیا تشریف لے گئے وہاں کوئی اور ادارہ نہیں تھا، آپ کے جاری کردہ ادارہ کا فیض دور دور تک پہنچا، دوسرے صوبوں سے بھی تشنگانِ علوم اس کے چشمہ فیضان سے سیراب ہوتے رہے، آپ کی سعیٔ بلیغ سے ادارہ نے صوری و معنوی دونوں طور پر ترقی کی۔

جس وقت آپ الہ آباد میں مقیم اور مدرسہ سبحانیہ گیا میں علم و معرفت کے گراں مایہ یواقیت

ولآلی مستفیدین کے آگے لٹانے میں مصروف تھے اور ہر کوئی اپنے اپنے ظرف کے بہ قدر اسے دامن شوق میں سمیٹ رہا تھا۔ طلبہ کی ایک بڑی تعداد اس وقت آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کررہی تھی اور مولانا پوری جاں فشانی کے ساتھ ان کے دامن طلب کو علم وحکمت کے تابندہ جواہر سے بھر رہے تھے۔ ان ہی دنوں زاہد خاں دریابادی نامی ایک شخص مولانا سے اکتساب فیض کے لئے آیا کرتے تھے، وہ انگریزی زبان سے واقف تھے اور انگریزی اخبارات مولانا کو پڑھ کر سنایا کرتے، جس میں عالم اسلام کی دگرگوں صورت حال سے متعلق نہایت تشویش ناک خبریں ہوا کرتیں تھیں، مولانا جب یہ سب سنتے تو تڑپ اٹھتے اور آپ کی مفکرانہ طبیعت یہ سوچ کر رنجیدہ اور ملول ہوجایا کرتی تھی، اسی خلش اور عالم اسلام کی اسی بے کسی و بے بسی نے آپ کو مضطرب کردیا اور میدان سیاست کو اپنی جولان گاہ کے طور پر منتخب کرنے کو مجبور کردیا۔ وہ جودت فہمی اور ذکاوت ذہنی جو کبھی علمی گتھیوں کے سلجھانے میں صرف ہوتے تھے تو کبھی تفسیر وحدیث کے بحر ذخار میں غواصی کرتے ہوئے نظر آتے تھے، کبھی فقہ وادب کے گلہائے رنگا رنگ کی فرحت افزا اور سرور بخش خوشبوؤں سے مشام جاں کو معطر کرتے ہوئے ملتے تھے تو کبھی فلسفہ ومنطق کی پر پیچ گھاٹیوں میں محو سفر دکھائی پڑتے تھے، تدریسی وانتظامی سرگرمیوں کے باوجود مولانا مرحوم اپنے دل میں جس چیز کی تڑپ محسوس کررہے تھے وہ کوئی اور چیز تھی، جس کی بنا پر اب ان کے سمت سفر میں تبدیلی آ گئی تھی اور سفینۂ فہم وفراست نے ''صحیح رخ'' پر چلنے کا فیصلہ کرلیا اور مدرسہ سبحانیہ کو الوداع اور الہ آباد کو خیر آباد کہا اور صوبے کے علماء کو منظّم کرنے اور مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط لائحہ عمل کی تیاری کا فیصلہ لیا۔

جمعیۃ علماء بہار کا قیام:

''مدرسہ انوار العلوم'' گیا کے سالانہ اجلاس اکتوبر ۱۹۱۷ء میں پورے صوبہ کے علماء کو دعوت دی اور علماء کی ایک کثیر تعداد کو اکٹھا فرما کر ان کی ایک متحدہ تنظیم بنائی، جو ''انجمن علماء بہار'' کے نام سے موسوم ہوئی۔

یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان گیر پیمانہ پر قائم ہونے والی جمعیۃ کا مولانا گیلانی کے الفاظ میں خواب بھی نہیں دیکھا گیا تھا؛ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مولانا سجادؒ صرف بہار کی حد تک جمعیۃ پر قناعت کر لینے کا ارادہ رکھتے تھے؛ بلکہ مولانا شروع ہی سے ''جمعیۃ علماء ہند'' کا قیام چاہتے تھے۔
یہ تنظیم کئی وجوہ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی، پہلی بات یہ ہے کہ یہی علماء دراصل

مسلمانوں کے ارباب حل وعقد تھے، ان ہی کو قوم کی امامت اور قیادت کا فریضہ انجام دینا تھا؛ لیکن بد قسمتی سے قوم کا یہ دماغ اپنے آپ کو وقتی مصالح اور عصری تقاضوں سے کاٹ کر گوشوں میں فروکش ہو چکا تھا۔

دوسرے: مسلمانوں کا باہمی انتشار اور گروہ بندیاں ہی دراصل مسلمانوں کے عالمگیر زوال کا سبب تھیں، پھر یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مذہبی سطح پر جو کچھ نزاعات تھے، دراصل وہ علماء ہی کے آپسی اختلاف پر مبنی تھے، اگر یہ حضرات ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہونے اور دوش بدوش ہو کر کوئی کام کرنے کو آمادہ ہو جائیں اور ''قدر مشترک'' کے لئے مشترکہ جدو جہد کرنے کو آمادہ ہوں تو ان کی باہمی غلط فہمیاں بھی کم ہو جاتیں، خواص اور عوام دونوں طبقوں سے پراگندگی دور ہوتی اور رفتہ رفتہ علماء کی تنظیم مسلمانوں کی ایسی تنظیم کا ذریعہ بن سکتی تھی، جو مسلکی اور گروہی اختلافات اور عصبیتوں سے بالاتر ہو کر ملی مسائل سے نمٹے، یقیناً جمعیۃ اس حیثیت سے اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔

اس نوخیز جمعیۃ کا پہلا باضابطہ اجلاس اس وقت بہار کی مشہور درسگاہ ''مدرسہ عزیزیہ بہار شریف'' میں ۵-۶؍شوال ۱۳۳۶ھ کو مشہور واعظ و یکے از بانیان تحریک ندوۃ العلماء شاہ سلیمان پھلواروی ؒ کے زیر صدارت منعقد ہوا، جو غالباً اس حیثیت سے اپنی نوعیت کا پہلا اجلاس تھا کہ اس میں بڑی تعداد میں مختلف مسلک و مشرب کے علماء شریک ہوئے، اس اجلاس میں علماء کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضۂ منصبی کی طرف متوجہ کرنے کے علاوہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب ؒ (دیوبند) اور مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہ کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا ابوالکلام آزاد اور علی برادران جیسے قائدین حریت ''ڈیفینس آف انڈیا ایکٹ'' کے تحت اسیری کے دن کاٹ رہے تھے اور گویا یہی حضرت ابوالمحاسن ؒ کی سیاسی زندگی کا آغاز تھا، اس وقت ان کی رہائی کے لئے کوئی تحریک تو کیا چلتی اور اس کے خلاف کوئی آواز تو کیا اٹھتی، لوگ ''خداوندان فرنگ'' کے خوف سے ان کے نام لینے سے بھی خائف رہتے تھے؛ لیکن ''انجمن علمائے بہار'' نے ان مسلم قائدین کی رہائی کے لئے صدا بلند کی تو مولانا کے اس جرآت مندانہ کارنامے نے ملک کے علماء و دیگر حریت پسندوں کے ولولوں کو دوآتشہ کر دیا۔

نیز مذکورہ بالا اجلاس میں ''ذبح گاؤ'' کو شعائر اسلام قرار دیتے ہوئے اس معاہدہ کی مخالفت کی گئی، جس میں ''ذبح گاؤ'' کے چھوڑ دینے پر مصالحت کر لی گئی تھی، ان تجاویز کی روشنی میں کوئی بھی صاحب انصاف فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس جمعیۃ نے اس وقت کے دشوار گذار اور مایوس کن حالات

میں میدانِ عمل سے کھنچے اور ملت کے مسائل سے کٹے ہوئے علماء کو میدانِ عمل میں آ کر جدو جہد کرنے اور ان کو سر دو گرم سے نمٹنے پر آمادہ کرنے میں کیا رول ادا کیا؟

مولانا ابوالمحاسنؒ کی امت مسلمہ کی حالت زار اور ان کی ناگفتہ بہ صورت حال کے تئیں فکر مندی کا نتیجہ تھا کہ آپ کی فطری صلاحیتوں نے مدارس اسلامیہ میں اصلاحی نصاب کے اجراء، امارت شرعیہ، غلہ اسکیم، علماء بہار کی متحدہ تنظیم ''انجمن علماء بہار'' کے قیام کے وقت مسلمانوں کو نہایت پر آشوب حالات کا سامنا تھا۔

جمعیۃ علماء ھند:

انجمن علمائے بہار کے قیام کے دو سال بعد ۱۹۱۹ء میں جب آپ کی تمنائیں ''جمعیۃ علماء ہند'' کی شکل میں بار آور ہوئیں تو آپ جی جان سے اس کی آب یاری میں لگ گئے، گویا مولانا علیہ الرحمہ ''جمعیۃ'' کے ''سابقین اولین'' کی حیثیت رکھتے تھے، اس کے روز اول سے ہی اس میں آپ کی شمولیت رہی اور ''جمعیۃ'' سے ان کا یہ ربط تادم واپسیں قائم رہا، حالانکہ اس راہ میں بے شمار جاں گداز مراحل آئے اور متعدد پریشان کن مواقع نے ان کی راہ کو روکنا چاہا؛ لیکن جب بھی ان کے پاؤں کے چھالوں نے منزل کی دوری کا شکوہ کیا تو انہوں نے بہ جائے حوصلہ ہارنے کے ایک نئے ولولے کا مظاہرہ کیا اور آبلہ پا ہونے کے باوجود ''جمعیۃ'' کے لئے دیوانہ وار چلتے رہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ حضرت ابوالحاسن مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے ''انجمن علماء بہار'' کی بنیاد رکھی تھی، اس وقت آپ کا دائرۂ حلقۂ اثر بظاہر صوبہ بہار تک محدود تھا؛ لیکن تحریک خلافت نے آپ کے روابط کو ہندوستان گیر سطح پر وسیع کر دیا، جمعیۃ علماء ہند کی تاسیسی نشست مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی دعوت پر امرتسر میں مولانا عبدالباری فرنگیؒ کے زیر صدارت منعقد ہوئی، مولانا سجاد صاحبؒ اس کے محرکین اور داعیان میں تھے، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی اور مولانا آزاد سبحانی نیز دوسرے رفقا نے بھی شرکت فرمائی اور اس پہلی نشست کے تمام شرکا بنیادی ارکان تسلیم کئے گئے، پس بظاہر جمعیۃ کے قیام کے محرک مولانا بھی تھے؛ اس لیے کہ آپ اس سے پہلے بہار کی سطح پر ایسی ہی تنظیم قائم کر چکے تھے اور اس کی حیثیت ایک عملی نمونہ کی تھی۔

اس کے بعد سال بہ سال جمعیۃ کے اجلاس ہوتے رہے، جن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، مولانا برابر جلسوں میں شرکت فرماتے رہے اور شروع سے عاملہ کے رکن رکین رہے، ہمیشہ آپ کی قانونی بصیرت اور سیاسی دور اندیشی کا لوہا مانا جاتا رہا، مختلف مواقع پر حکومت کے منظور کردہ یا

مجوزہ کسی ایکٹ میں ترمیم یا اس کا کوئی متبادل فارمولہ پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو یہ اہم کام آپ ہی کو سونپا جاتا، جمعیۃ کے انتظامی اور تحریکی معاملات میں آپ کی حیثیت ''روح'' کی تھی؛ چنانچہ مولانا محمد میاں فرماتے ہیں:

''جمعیۃ علماء ہند کے صدر اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ اور ناظم اعلیٰ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید تھے؛ مگر وہ ڈاکٹر جس کو بہت سے انجکشن دیئے گئے تھے، ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ نائب امیر شریعت تھے''۔ (الجمعیۃ مجاہد الملت نمبر، ص: ۴۵)

حضرت ابوالمحاسنؒ کے بارے میں ایک صاحب نظر نے کہا ہے کہ وہ دین کی حقیقت، اسلامی علوم کی بصیرت بدلتے حالات کی بھرپور واقفیت، حوصلہ مندانہ فیصلہ کی قوت، عمل کی غیر معمولی طاقت اور واقف راہ طریقت پر مشتمل ایک اولوالعزم شخصیت کے پیکر تھے۔ انہوں نے قوم کی ڈوبتی نیا کو سمندر کنارے لگانے اور انگریزوں کے ملک بدر کرنے کے لئے سب سے پہلے علماء کو متحد کرنے کا بیڑہ اٹھایا، ۱۹۲۱ء جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس عام پانی پت میں منعقد ہوا جس کی صدارت مالٹا کی جیل سے رہائی ملنے کے بعد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ نے فرمائی۔ اسی اجلاس میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ کو جمعیۃ علماء ہند کا صدر منتخب کیا گیا۔ اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کو جنرل سکریٹری۔ جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی رہنماؤں میں مولانا آزاد، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد میاں دیوبندی جیسے اکابر سرفہرست ہیں جمعیۃ علماء ہند کے اس دوسرے اجلاس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت اہل حدیث مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے دو نامور عالم دین مولانا ثناء اللہ امرتسری، اور مولانا داؤد غزنوی نے بھی جمعیۃ علماء ہند میں شمولیت اختیار کی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں: شروع میں جمعیۃ علماء ہند ہندوستانی مسلمانوں کی ایک نمائندہ تنظیم تھی۔ اس میں مسلک کی تفریق کے بغیر ہر ایک کو شرکت کی اجازت تھی۔

جمعیۃ علمائے ہند اپنی خدمات کے آئینے میں:

جمعیۃ علماء ہند اپنے قیام کے اول دن سے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی خدمات میں مصروف ہے۔ ملک کی آزادی، ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی اور مذہبی جنگ لڑنے میں جمعیۃ علماء ہند ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ اس حقیقت کا ہر کسی کو اعتراف ہے کہ ملک کی آزادی میں جمعیۃ علماء ہند کی خدمات ناقابل فراموش ہے۔ ابو المحاسن مولانا محمد سجاد، مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر اکابر نے

ہمیشہ جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے حقوق کی آواز بلند کی حکومت نے ان کی طاقت کو تسلیم کیا۔ مسلم مسائل حل کیئے۔ قدرتی آفات اور دیگر موقع پر مسلمانوں کی مدد کی، انہیں ریلیف کا سامان فراہم کیا۔ جمعیۃ علماء ہند کا ایک طرح امتیاز یہ بھی ہے کہ تقسیم ہند کی مخالفت کرنے والوں میں یہ تنظیم سرفہرست تھی۔ بانی پاکستان محمد علی جناح کے نعروں پر یقین کرنے کے بجائے جمعیۃ کے ذمہ داروں نے ایک سیکولر ہندوستان کی ترجمانی کی اور تقسیم کی شدید مخالفت کی، جمعیۃ کا یہ موقف تھا کہ جن پرکشش نعروں کی بنا پر قیام پاکستان کی کوشش کی جارہی ہے، اس کی تعبیر ناممکن ہے۔ حقیقت حال آج سامنے ہے، ۷۰؍سالوں کا طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود آج بھی پاکستان میں اسلامی شریعت کا نفاذ تو بہت دور کی بات ہے، سیاسی ومعاشی استحکام زوال پذیر ہے۔ جمعیۃ علماء ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے قدیم تنظیم ہے، اس سے وابستہ علماء نے ہمیشہ مسلمانوں کے مفاد کی خاطر حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کی ہیں، کسی بھی اہم موقع پر حکومت ہند کے سامنے مسلمانوں مطالبات ملی مسائل رکھے جاتے ہیں اور مسلمانوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان یہاں کی دوسری سب سے بڑی اکثریت ہیں، ان کے بغیر حکومت سازی ناممکن ہے، یہ یہاں کے حصہ دار ہیں، کرایہ دار نہیں، یہاں کی سرخ مٹی میں ان کا خون شامل ہے، اس ملک کو سینچنے کے لیے انہوں نے اپنے پسینے سے زیادہ خون بہایا ہے؛ اس لیے حکومت ہند مسلمانوں کے ساتھ کسی طرح کا امتیازی رویہ اپنانے کے بجائے انہیں مکمل حقوق فراہم کرے، ہر ایک کو بغیر کسی مذہبی تفریق کے ہندوستانی قوم کے زمرے میں رکھے، ساتھ جمعیۃ علماء ہند کی توجہ بے قصور گرفتار مسلم نوجوانوں کی رہائی پر بھی ہے، اب تک جیل کی سلاخوں میں بند دسیوں بے قصور مسلمانوں رہائی جمعیۃ کی کوششوں سے ہوچکی ہے اور اب بھی کئی بے قصور مسلمان کے مقدمہ جمعیۃ لڑ رہی ہے، جمعیۃ علماء ہند ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے، سب سے قدیم اور تاریخی تنظیم ہے، آج کے دور میں ہم اسے متحدہ اور سب سے بڑی جماعت تو نہیں کہہ سکتے ہیں؛ لیکن یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ماضی شاندار اور قابل فخر ہے۔ سیاسی اور سماجی مسائل پر مسلمانوں کے حقوق کا مطالبہ کرنے والی یہی ایک جماعت رہی ہے۔ آج بھی مسلمانوں کو اس جماعت سے یہی توقع ہے کہ ذمہ داران اپنے اسلاف کے طرز پر چلتے ہوئے شاندار ماضی کی روایت قائم کریں گے، جن اغراض ومقاصد کے تحت جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا تھا، اس کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے گی۔

حضرت ابوالمحاسن اور امارت شرعیہ :

۴؍ستمبر ۱۹۲۰ء کو کلکتہ کی کانفرنس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جانب سے پیش کیے گئے ''تحریک عدم تعاون'' کو منظوری حاصل ہوگئی، ''تحریک خلافت'' اس سے پہلے منظور ہو چکی تھی اور اپنی منزل کی جانب محوسفر تھی؛ اس لیے اب ''تحریک عدم تعاون'' نے پورے ملک کے اندر ایک انقلابی کیفیت برپا کردی تھی۔ مولانا ان دونوں تحریکوں میں نہ صرف پیش پیش رہے؛ بلکہ ان کے ذریعہ مسلمانان ہند اور خصوصاً مسلمان بہار کو منظّم اور متحد کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا، جس کی وجہ سے دیہی علاقوں میں بھی یہ تحریکیں زور پکڑنے لگیں، نیز امارت شرعیہ کے قیام کا آپ کا دیرینہ خواب اور برسوں کی تگ ودو کی محنت رنگ لانے لگی اور اس راہ میں حائل دشواریاں بھی دور ہٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں اور بڑی حد تک اس کے لئے راہ ہموار بھی ہوگئی اور بالآخر ۱۹۲۱ء میں ''امارت شرعیہ'' وجود پذیر ہوا جو مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے حسن تخیل، مولانا ابوالکلام آزادؒ کی توثیق وحمایت اور قاضی احمد حسینؒ کی کاوشوں کا ثمرہ تھا۔

اس کے بعد جب ہندوستان کے لئے نیا قانون وضع کیا گیا اور اس کی تنفیذ عمل میں آئی، تو صوبائی ومرکزی اسمبلیوں کے انتخابات کے سلسلے میں مختلف مسائل نے سر اٹھانا شروع کردیا۔ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے دوران مسلمانان ہند نے ایک دوسرے سے مربوط ہوکر مکمل اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا؛ لیکن جب یہ تحریکیں دم توڑ گئیں تو کانگریس کی غیر مخلصانہ پالیسیوں نے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنا شروع کردیا، یہاں تک کہ انتخابات میں بھی مسلم حلقوں کو نظر انداز؛ بلکہ پس انداز کرکے انہیں مزید زک پہنچانے کی کوشش کی گئی، گوکہ مسلمانان بہار کانگریس کے اس متعصّبانہ رویے سے حد درجہ بددل اور ناراض تھے؛ مگر دوسرے صوبوں کے مسلمانون کی طرح کانگریس کی مخالفت پر کھڑے نہیں ہوئے تھے، جس کی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ ''مسلم لیگ'' کوئی زیادہ مضبوط و مستحکم تنظیم یا پارٹی نہ تھی۔

جب مرکزی اسمبلی کے انتخابات کا اعلان ہوا تو پرانے ''خلافتی''، لیگی اور جمعیتی'' ذمہ داران کی مدد سے ''مسلم یونیٹی بورڈ'' تشکیل دے کر ہندوستان کی آزادی کے لیے مر مٹنے والے اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار مسلمانوں کو انتخابی میدان میں اتارا گیا۔ اس ''یونیٹی بورڈ'' سے الیکشن لڑنے والے چار میں سے تین نے اپنی جیت درج کروائی، جس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی جب صوبائی اسمبلی کے الیکشن کا وقت آیا تو کانگریس کو مسلم حلقوں کے متعلق نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور

کر کے پوری دور اندیشی کے ساتھ فیصلہ کرنا پڑا، پھر بھی کانگریس نے ''امارت شرعیہ'' کے ساتھ جانے کے بجائے ''مسلم لیگ'' کے تعاون سے انتخاب لڑنے کو ترجیح دی، چنانچہ مسٹر محمد علی جناح نے بہار میں ''مسلم لیگ'' کو استحکام بخشنے کی خاطر بہار سے کچھ مخصوص و معروف چہروں کا انتخاب کر کے اپنے پارلیمینٹری بورڈ میں بھی شامل کرلیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے اس اتحاد کی وجہ سے ''امارت شرعیہ'' کو یہ مشکل پیش آئی کہ ''امارت شرعیہ'' جہاں ''تحریک خلافت'' میں شامل ہوکر بہترین کارکردگی کے سبب مسلمانوں کی حمایت اور ان کا اعتماد حاصل کرچکی تھی، وہیں ''مسلم لیگ'' اس تحریک کی مخالفت کر کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرچکی تھی، یہی وجہ تھی کہ مسلمان ''مسلم لیگ'' اور مسٹر جناح سے بدظن؛ بلکہ بڑی حد تک متنفر ہو چکے تھے، ایسے نازک ترین حالات میں مسلمانوں کو ایک بار پھر ایسی جماعت کے ہاتھوں سونپ دینا جوان کے جذبات کا پاس ولحاظ کئے بغیر فیصلہ کرتی ہو اور اس کی قطعاً پرواہ نہ کرتی ہو کہ اس فیصلے سے کن احساسات کو چوٹ پہنچے گی اور دلوں کے کتنے نازک آبگینوں کو ٹھیس لگے گی؛ گویا خود ''امارت شرعیہ'' کے لئے خودکشی کے مرادف تھا، ذمہ دارانِ امارت ذہنی کش مکش میں مبتلا اور گومگو کی کیفیت سے دوچار تھے۔

مولانا ہمیشہ اپنی سوچ پر عامل رہے کہ سیاسی وابستگی دین وملت سے فروتر ہے؛ اس لیے ممکن نہ تھا کہ دین وملت کے مسائل میں سیاست ذرا بھی آپ کے قول وعمل پر اثر انداز ہو جائے، مولانا کانگریس کے حامیوں میں تھے اور کانگریس کے اسٹیج سے خطاب بھی کرتے تھے؛ لیکن جب بھی کانگریس کا کوئی عمل مسلمانوں کے دینی یا قومی مفاد کے خلاف ہوتا تو آپ بلا جھجھک اور پوری شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کرتے، ۱۹۳۷ء میں حکومت بہار نے زرعی انکم ٹیکس کا قانون پاس کیا اور مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، مولانا نے اس کی سخت مخالفت کی، مسلم ممبران اسمبلی کے ذریعہ اس کے خلاف اسمبلی میں آواز اٹھوائی، فضاء ہموار کی، بالآخر ۲۹/اپریل ۱۹۳۸ء کو اسمبلی میں حکومت بہار نے مولانا کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا اور وقف کی جائداد کو ٹیکس سے مستثنیٰ کردیا، پھر اس کے بعد آپ نے مسلم اوقاف کا ایک بل مرتب فرمایا اور اسے بہار اسمبلی میں پیش کرایا، جو منظور ہوا، جب گاؤکشی کا مسئلہ اٹھا تو کانگریس پارٹی کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو رضا کارانہ طور پر اسے تسلیم کرلینا چاہیئے اور گائے کی قربانی نہیں کرنی چاہیے، مولانا نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی اور اس پر اپنا ایک تفصیلی فتویٰ تحریر فرمایا، جو مولانا کی فقہی بصیرت کا آئینہ دار ہے اور فتاویٰ امارت شرعیہ جلد اول میں شامل ہے۔

۱۹۳۹ء میں ایک قانون پاس ہوا، جس میں دَین مہر اور جہیز کو قانونی جرم قرار دیا گیا تھا، مولانا نے اس کی سخت مخالفت کی اور امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ (جو مولانا کی تائید سے رکن اسمبلی منتخب ہوئے تھے) کے ذریعہ بہار اسمبلی میں اپنے موقف کی ترجمانی کرائی، بالآخر مسلمان اس سے مستثنیٰ کر دیئے گئے، جب شدھی تحریک شروع ہوئی تو کانگریس کے اعلیٰ قائدین کی رائے تھی کہ مسلمان اس کی مخالفت میں زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کریں اور کانگریس کے مسلم قائدین بھی تذبذب میں تھے؛ تاکہ ہندو مسلم نفرت کی فضاء پیدا نہ ہوجائے، جو انگریز چاہتے تھے؛ لیکن مولانا کی اسلامی حمیت نے اس معاملے میں کسی رواداری کو گوارہ نہ کیا، آپ نے پوری قوت وشدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی اور عملی طور پر ہندو فرقہ پرستوں کی اس مہم کو ناکام بنا دیا۔

۱۹۳۷ء میں جب بہار میں الیکشن ہوا تو مولانا نے ''مسلم انڈیپینڈنٹ پارٹی'' قائم کی، مولانا خود اس پارٹی کے سرپرست تھے اور امارت شرعیہ اس کی تائید کرتی تھی، کانگریس کے بعد سب سے زیادہ سیٹیں اسی پارٹی کو حاصل ہوئیں؛ لیکن کانگریس نے حکومت بنانے سے انکار کر دیا، مولانا نے محسوس کیا کہ اگر مسلم انڈیپنڈ ینٹ پارٹی حکومت بنالیتی ہے تو یہ مسلمانوں کے مفاد میں ہوگا؛ چنانچہ اس پارٹی نے حکومت بنائی اور جناب محمد یونس وزیر اعلیٰ بنائے گئے، اس حکومت نے مسلمانوں کے حق میں کئی اہم فیصلے کئے، جن میں ایک اردو زبان سے متعلق تھا، یہاں تک کہ کانگریس کے فرقہ پرست لیڈر محسوس کرنے لگے کہ انھوں نے حکومت نہ بنا کر غلطی کی ہے، غرض کہ مولانا کے یہاں دین وملت کے تعلق کو ہر تعلق پر تقدم حاصل تھا اور جب کبھی ملی مفادات خطرہ میں پڑتے تھے، آپ اس کے خلاف شمشیر برہنہ بن جاتے تھے۔ بلاخوف وتردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کی شخصیت نہ صرف سیاست میں ایک اہم مقام کی حامل تھی بلکہ ان کی ذات گرامی اس باب میں نہایت ممتاز حیثیت بھی رکھتی تھی، جن کی زندگی کا ہر لمحہ، ساری تگ ودو اعلاء کلمۃ اللہ، تحفظ شریعت، مسلمانوں کے تشخص اور ان کی شناخت کی بقا کے لیے گویا وقف تھی۔

فقیہ النفس علامہ ابوالمحاسن محمد سجادؒ
حیات وخدمات پر ایک نظر

ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی
شعبہ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

بانی امارت شرعیہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کی پیدائش ۔۔ رصفر 1301ھ اور وفات 17 رشوال 1359ھ کو ہوئی، اس طرح آپ نے اپنی ساڑھے اٹھاون سالہ زندگی کے اکثر حصہ کو قوم مسلم کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے محنت وخدمت میں گزاردی، قیام امارت کے بعد آپ 19 رشوال 1339ھ سے 17 رشوال 1359ھ تک نائب امیر شریعت رہے، اس طرح آپ سن ہجری کے حساب سے انیس سال، گیارہ مہینے، اٹھائیس دن امارت شرعیہ کے نائب امیر رہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ حقیقی معنوں میں دیدہ ور تھے اور انھوں نے اپنے حسن عمل وتدبیر اور جہد مسلسل سے یہ ثابت کردیا کہ یہ صفت ان پر صحیح صادق آتی ہے۔ ''مولانا دبلے پتلے تھے؛ لیکن قد نکلتا ہوا، رنگ سانولا تھا؛ لیکن آنکھوں میں محبت بھری چمک، چہرہ لمبا تھا؛ لیکن اس پر کشادہ پیشانی ان کی ذہانت کی غماز تھی، سادہ لباس میں ایک چلتی پھرتی انجمن تھے''۔ یہ الفاظ ہیں جد وجہد کے پیکر امیر شریعت رابع حضرت مولانا محمد منت اللہ رحمانی صاحب علیہ الرحمہ کے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ جہاں ایک طرف ممتاز عالم دین، فقیہ، مفتی، قاضی اور تفسیر وحدیث کے شناور تھے، وہیں امت کے مسائل کے نباض، قانون داں، علوم سیاست کے ماہر، مصلح امت، سماج کے خدمت گار، دعوت الی اللہ کا کام کرنے والے اور ارتداد کی لہروں کا رخ موڑ دینے والے تھے۔ بلا شبہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ بہر حال مولانا کی اٹھاون سالہ زندگی کو ہم دو دور میں تقسیم کریں گے: پہلا دور علمی؛ یعنی تعلیم وتعلم کا اور دوسرا دور عملی؛ یعنی قیادت وسیاست اور خدمت کا۔

(الف) مولانا محمد سجاد کا علمی دور:

۱۔ ایام تعلیم و تربیت:

ریاست بہار میں راجگیر کے قریب ایک قصبہ بہار شریف میں ایک گاؤں پنہسہ ہے، وہاں کے زمیندار مولوی حسین بخش کے یہاں ایک بچہ ماہ صفر 1301ھ میں تولد ہوا، جس کا نام محمد سجاد رکھا گیا، ابھی آپ چار سال کے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، چنانچہ آپ کی تربیت کی ذمہ داری آپ کے بڑے بھائی مولوی احمد سجاد کے سر آئی۔ ابتدائی تعلیم کے لیے اپنے ہی گھر میں ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھائے گئے اور قرآن مجید، اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

سن 1310ھ میں عربی تعلیم کے لئے مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں ڈالے گئے، کچھ دنوں کے بعد اپنے بڑے بھائی احمد سجاد صاحب کے ساتھ کانپور گئے اور وہاں مولانا احمد حسن کانپوری کے پاس پڑھنے لگے، تقریباً وہاں چار سال رہے اور پھر اپنے بھائی کے ساتھ وطن واپس آ گئے، اس وقت وہ عمر کے پندرہویں سال میں تھے، آٹھ نو سال کے اس تعلیمی دورانیہ میں یہ محسوس کیا گیا کہ مولانا پڑھنے سے بھاگتے ہیں اور پڑھنے میں جی نہیں لگاتے ہیں؛ بلکہ اکثر اوقات کھیل کود میں صرف کرتے ہیں، ایک دن بڑے بھائی نے سخت تنبیہ کرتے ہوئے پٹائی بھی کر دی، بس پھر کیا تھا، اسی دن گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے، بعد میں پتہ چلا کہ کانپور میں ہیں اور پڑھ رہے ہیں، گویا مولانا محمد سجاد کی اصل تعلیم یہاں سے شروع ہوتی ہے، شوق تعلیم کی لَو مزید تیز ہوئی تو کانپور سے دیوبند کا قصد کیا؛ لیکن چھ ماہ بعد ہی ایک تبّتی لڑکے سے لڑائی ہو جانے کی وجہ سے دیوبند سے واپس ہو گئے۔

پھر 1317ھ میں مولانا نے کانپور سے الہ آباد کا سفر کیا اور وہاں مدرسہ سبحانیہ میں داخلہ لے لیا، آپ یہاں 1322ھ تک رہے، جس کے دوران عربی کے مروجہ نصاب کو پورا کیا، اس مدرسہ کے مشہور استاد مولانا عبدالکافی صاحب کی خصوصی توجہ آپ کو حاصل رہی۔ ربیع الاول 1322ھ مطابق جون 1905ء میں مدرسہ کے جلسہ میں آپ کی دستار بندی ہوئی اور اس طرح آپ کو وہاں سے سند فراغت حاصل ہوئی۔ (مستفاد از حیات سجاد: مرتب مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، مقالہ مولانا سید منت اللہ رحمانی، ص: ۱۱-۱۴، ہمارے امیر، مرتب مولانا رضوان احمد ندوی، مقالہ مولانا نور الحق رحمانی، ص: ۳۴)

۲۔ ایام تدریس و تادیب:

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کا تدریسی دور سترہ اٹھارہ برسوں پر محیط ہے، مدرسہ سبحانیہ

الہ آباد سے فراغت کے بعد سب سے پہلے مولانا سید وحیدالحق صاحب (جو اس مدرسہ کے ناظم اور مولانا سجاد صاحب کے خسر بھی تھے) کی دعوت پر مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں تدریسی خدمات انجام دینی شروع کیں، یہاں انھوں نے تین سال تک پڑھایا، پھر محرم 1325ھ کو اپنے استاد مولانا عبدالکافی صاحب کی طلبی پر الہ آباد گئے، جہاں انھوں نے صرف چار ماہ بحیثیت مدرس گزارے اور دوبارہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف چلے آئے، یہاں تقریباً ڈیڑھ سال تک تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد پھر ذی قعدہ 1326ھ میں الہ آباد تشریف لے گئے اور پھر اپنے استاد کے زیر سایہ مدرسہ سبحانیہ میں 1329ھ تک تدریس کے فرائض انجام دیئے، یہاں تدریس کے ساتھ فتوی نویسی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔

شعبان 1329ھ میں مولانا سجاد صاحب نے الہ آباد کو خیر باد کہا اور مستقل طور پر وطن آ گئے اور ضلع گیا کے ایک ادارہ مدرسہ انوارالعلوم کو از سر نو قائم کیا۔ (اس مدرسہ کو پہلے مولانا عبدالوہاب صاحب فاضل بہاری مرحوم نے قائم کیا تھا؛ لیکن خود بانی کے اس سے علاحدہ ہو جانے کی وجہ سے یہ مدرسہ بالکلیہ ختم ہو گیا تھا، مولانا سجاد صاحب نے اسی نام سے دوبارہ شروع کیا) مولانا کی مسلسل محنت اور لگن نے دیکھتے ہی دیکھتے اس مدرسہ کو علوم عربیہ اسلامیہ کا ایک مرکزی ادارہ بنا دیا، شدہ شدہ طلباء کی ایک بڑی تعداد یہاں جمع ہو گئی، شروع شروع میں یہ مدرسہ کرایہ کے مکان میں چلتا رہا، ابتدائی ایام میں مولانا کو اس مدرسہ کو چلانے کے لیے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، کچھ عرصہ بعد جب ایک خاتون نے مدرسہ کے لیے زمین وقف کی تو وہاں پر عمارت بنائی گئی اور پھر مدرسہ وہاں منتقل ہوا، اور اس طرح 1329ھ میں باضابطہ مدرسہ انوارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔

مولانا سجاد صاحب کی تدریس کا ایسا شہرہ تھا کہ آپ جہاں بھی جاتے طلباء کھنچ کر وہیں پہنچ جاتے، چنانچہ بہت سے طلباء الہ آباد سے گیا آ گئے، طلباء کے ساتھ آپ کا تعلق ہمیشہ ہمدردانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا، اور بہت نرمی کے ساتھ بچوں کی اخلاقی تربیت کرتے تھے، مولانا مدرسہ کے اوقات کے علاوہ خارجی اوقات میں بھی طلباء کو پڑھاتے، اسی طرح طلباء کے دکھ درد کا بھی خیال رکھتے، نادار طلباء کی امداد و اعانت کرتے، اگر کوئی بیمار پڑ جاتا تو اس کی تیمارداری کرتے اور ڈاکٹر کے پاس خود ہی اسے لے کر جاتے اور ایک ساتھی کی طرح خود ہی اسے دوا وغیرہ پلاتے۔ یہی وجہ ہے کہ طلباء بھی ان کے گرویدہ رہتے اور ہمیشہ اپنی خدمات دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ (مستفاد از حیات سجاد، مقالہ مولانا سید منت اللہ رحمانی ص14-15، ہمارے امیر، مقالہ مولانا نورالحق رحمانی ص35:-36)

(ب) مولانا محمد سجاد کا عملی و تحریکی دور:

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ صاحب بصیرت اور دور رس نگاہ رکھتے تھے، آگے ہندوستان کا نقشہ کیا ہوگا اور صورتحال کیا ہوگی؟ انھوں نے اپنے تصور میں دیکھ لیا تھا، چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں کو اس صورتحال سے ابارنے کے لیے ایک خاکہ بنایا اور اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے میدان عمل میں تن تنہا کود پڑے اور پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا حتی کہ گھر بار سب کچھ تج دیا، ان کے بارے میں جس نے بھی کہا سچ کہا کہ:

پھونک کر اپنے آشیانے کو
بخش دی روشنی زمانے کو

زندگی کے تقریبا 36 سال کی جدو جہد، اتار چڑھاؤ اور درد و تڑپ اور سوز و اضطراب نے ان کو تپا کر کندن بنا دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ تمام مصلحتیں اور مخالفتیں ایک طرف، اور امت وقوم کے تیئں لگن اور کڑھن دوسری طرف انھوں نے اپنے وسیع تجربہ سے یہ جان لیا تھا کہ مسلمانوں کی زبوں حالی کی فکر اگر ابھی نہیں کی گئی تو پھر کبھی نہ ہو سکے گی، چنانچہ انھوں نے اللہ کے بھروسے میدان میں قدم رکھ دیا، پھر کیا تھا: ’’لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا‘‘۔

مولانا کی حیات و خدمات پر سمینار بھی ہو چکا ہے، ان کی وفات کے بعد لوگوں نے بہت کچھ لکھا بھی ہے، کئی کتابیں ان کی سوانح پر بھی آ گئی ہیں؛ لیکن اس شخصیت کے اتنے گوشے ہیں اور سب نمایاں ہیں کہ ان پر جتنا بھی کام کیا جائے اور جتنی بھی گفتگو کی جائے کم ہے، چنانچہ یہاں پر بھی مولانا کی ہمہ جہت خدمات پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

ا۔ انجمن علماء بہار:

مولانا محمد سجاد صاحب کے اٹھارہ سالہ دور تدریس نے ان کے علوم شرعیہ و تاریخیہ کو مزید وسعت دے دی تھی اور ان کے ان علوم سے گہری وابستگی اور انہماک نے ان کے اسلامی فکر اور ایمانی جذبہ کو مستحکم اور مضبوط تر بنا دیا تھا۔ مولانا اپنے گہرے مطالعہ اور وسیع تجربہ کی بنیاد پر یہ سمجھتے تھے کہ صرف ہندوستان ہی نہیں؛ بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کی زوال کا سبب ان کے آپسی اختلافات و باہمی جھگڑے ہیں؛ اسی لیے وہ یہ خیال کرتے تھے کہ مسلمانوں کے وجود و بقا اور باعزت زندگی گزارنے کے لیے ان کے درمیان آپسی اتحاد و اتفاق ضروری ہے اور اس کے لیے مسلمانوں کی شرعی تنظیم، امارت شرعیہ کا قیام اور نصب امیر کو بنیاد مانتے تھے، چنانچہ آپ نے سب

سے پہلے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کی کوشش کی اوراس کے لئے انھوں نے سب سے پہلے علماء کو ایک پلیٹ فارم پرجمع کرنے کا سوچا، چونکہ مولانا یہ جانتے تھے کہ علماء ہی اصل میں قوم وملت کے رہنما ہیں اگر یہ متحد ہوجائیں تو لازمی طور پرتمام مسلمان متحد ہوجائیں گے، چنانچہ آپ نے مدرسہ انوارالعلوم گیا میں مورخہ 30/صفر 1336ھ مطابق 1917ء کو مدرسہ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر شرکت کے لئے پورے صوبہ کے علماء کو دعوت دی اوران کی ایک بڑی تعداد کو جمع کرکے''انجمن علماء بہار'' کے نام سے ایک متحدہ تنظیم قائم کی اوراس طرح پورے بہار کے علماء ومشائخ اور ارباب حل وعقد کی اجتماعی شیرازہ بندی کرکے انھیں ایک مرکزی نقطہ اورایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع کردیا۔مولانا مناظراحسن گیلانی تحریر کرتے ہیں:

''ابھی چند مہینے ہوئے تھے کہ وہی استھانواں کا الکن خطیب مونگیر اس غرض سے آیا تھا کہ علماء کی منتشر اور پراگندہ جماعت کو ایک نقطہ پر خاص سیاسی خیالات کے ساتھ جمع کیا جائے،اس وقت تک دلّی کی جمعیۃ العلماء کا خواب بھی نہ دیکھا گیا تھا، طے ہوا کہ صوبہ بہار کے علماء کو پہلے ایک نقطہ پر متحد کیا جائے، پھر بتدریج اس کا دائرہ بڑھایا جائے،صوبہ کی جمعیۃ العلماء کے پہلے اجلاس کے لیے قصبہ بہار کا انتخاب عمل میں آیا،مونگیر کی خانقاہ کی طرف سے جمعیۃ کی شرکت کے لیے خاکسار کو بھیجا گیا، بہار میں تقریباہر ضلع کے علماء موجود تھے،حضرت شاہ سلیمان پھلواروی اس جمعیۃ کے پہلے صدر مقرر ہوکر آئے،......خیروخوبی سے جمعیۃ علماء بہار کا پہلا اجلاس ختم ہوگیا''۔(حیات سجاد،مرتب:مولانا عبدالصمد رحمانی،ص: 51۔52،مقالہ مولانا مناظراحسن گیلانی)

انجمن علماء بہار کے قائم ہوجانے کے بعد اس انجمن کی ترقی،علمائے امت کے اتحاد اور مسلمانوں کے دینی وملی اور سیاسی مصالح کے تحفظ کی جدوجہد کے لیے مولانا محمد سجاد نے بہار کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا،علماء ومشائخ سے ملاقاتیں کیں اور قیام امارت کے سلسلے میں ان سے مشورہ اور تبادلہ خیال کیا اور ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر اس شرعی فریضہ کی ضرورت واہمیت کا انھیں احساس دلایا اوراس سلسلہ میں علماء کے جو شکوک وشبہات تھے ان کا ازالہ کیا،اس سلسلہ میں آپ نے بہار کے دودینی اورروحانی مراکز خانقاہ رحمانی مونگیر اور خانقاہ مجیبیہ پٹنہ کا خاص طور پر دورہ کیا اوران کی تائید وحمایت حاصل کی اور پھر انجمن علماء بہار کے قیام کے سات ماہ بعد انجمن کا پہلا باضابطہ اجلاس 5۔6/شوال 1336ھ کو مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں منعقد ہوا۔(مستفاد از حضرت

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ۔حیات وخدمات، مرتب: مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، ص:97 ، مقالہ مولانا نورالحق رحمانی)

مولانا عبدالصمد رحمانی تحریر کرتے ہیں:

''بالآخر مولانا کی انتھک کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا علماء کو ایک جگہ مجتمع کرنے میں، ایک راہ پر لگانے میں، نئے ڈھب، نئے طریقے اختیار کرنے میں، ماحول کے مقتضیات اور مواقع واحوال کی نامساعدت کے ساتھ کام کو بڑھانے میں اور اس کی اہمیت و افادیت کو منوانے میں کامیاب ہوگئے اور اسی سال شوال کے مہینہ میں علماء کی جمعیۃ کا پہلا اجلاس بہار شریف میں کیا، جس میں صوبہ کے پچاس علماء شریک ہوئے، جس میں صوفیاء اور مقتدر حضرات بھی تھے''۔(تاریخ امارت، مولانا عبدالصمد رحمانی، ص:43)

اس پہلے اجلاس میں جو تجاویز منظور ہوئیں، ان میں طبقہ علماء کو اپنے فرائض منصبی خصوصا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے کو بلا خوف لومۃ لائم ادا کرنے، انجمن علماء بہار کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک قومی بیت المال کے قیام اور اوقاف کی اصلاح، اضحیہ بقر جو شعار اسلام اور سنت نبوی ہے، اس کو حسب دستور جاری رکھنے اور حضرت شیخ الہند اسیر مالٹا، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، اور مولانا محمد علی جوہر و دیگر نظر بندان اسلام کی نظر بندی پر احتجاج وغیرہ شامل ہیں۔(مستفاد از حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ۔حیات وخدمات، ص:97 ۔98)

۲۔ خلافت کمیٹی:

یہی دور تھا جب اہل یورپ کی سازش سے ترکی خلافت خانہ جنگی میں مبتلا ہوئی اور عالم اسلام کی متحدہ طاقت منتشر ہو کر مختلف سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی، ترکوں کو اتحادیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی اور اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں اسلامی خلافت کا زوال ہوا، ترکوں کی شکست پورے عالم اسلام کے لئے سوہان روح تھی اور ان کے سامنے اسلامی تہذیب و ثقافت اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کا مسئلہ تھا، ہندوستانی مسلمان جو اپنی دینی غیرت وحمیت کی وجہ سے مشہور ہیں، وہ بھی قدرتی طور پر اس حادثے سے بے حد متاثر ہوئے، چنانچہ ترکوں کی 1919ء میں خلافت کمیٹی قائم ہوئی جو اپنے وقت کی بے مثال تحریک تھی، اس کمیٹی کے قیام میں جن علماء ودانشوران ہند نے قائدانہ رول ادا کیا اور پیش پیش رہے ان میں نمایاں نام مولانا محمد سجاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا ہے، اس کمیٹی کے دیگر بانی ارکان میں مولانا محمد علی جوہر، مفتی کفایت اللہ، مولانا شوکت علی اور حکیم اجمل خاں وغیرہ تھے۔سب سے پہلے بمبئی میں یہ خلافت کمیٹی قائم ہوئی، پھر مولانا سجاد

کے ہاتھوں دوسری کمیٹی گیا میں اور تیسری پھلواری شریف میں قائم ہوئی۔ (مستفاد از حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ۔ حیات وخدمات، ص:98)

۳۔ جمعیة علماء ہند:

مولانا محمد سجاد صاحب پورے ملک کے علماء کو ان کے آپسی اختلافات کو کم سے کم کر کے متحد اور منظّم کرنا چاہتے تھے، اسی فکر کو لے کر پہلے صوبائی سطح پر انجمن علمائے بہار کی تشکیل کی اور اسی انجمن نے جمعیۃ علماء ہند کے قیام کی راہ ہموار کی، چنانچہ دہلی میں جب خلافت کمیٹی کی کانفرنس ہوئی تو اس موقع پر چند اصحاب فکر ونظر علماء کی رائے ہوئی کہ بہار کی طرح پورے ملک کے علماء کی ایک تنظیم قائم ہونی چاہیے، لہٰذا اس غرض سے بارہ افراد پر مشتمل علماء کا ایک مخصوص اجتماع دہلی میں سید حسن رسول نما کی درگاہ پر منعقد ہوا اور اس طرح آپ کی کوششوں سے 1919ء میں جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا، مولانا احمد سعید دہلوی فرماتے ہیں:

''اس (اجتماع) میں تمام حضرات نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، حضرت مولانا سجاد صاحب نے بھی اس جلسہ میں ایک مختصر تقریر فرمائی تھی، اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا سجاد کے جذبات ایمانی کا ترجمان تھا، حاضرین کی تعداد اگر چہ دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی، لیکن کوئی آنکھ اور کوئی دل ایسا نہ تھا جس نے اثر قبول نہ کیا ہو''۔ (حیات سجاد: مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، ص:89۔90)

اس کا پہلا اجلاس خلافت کمیٹی کی کانفرنس کے ساتھ 1919ء میں امرتسر میں منعقد ہوا اور دوسرا اجلاس 1920ء میں دہلی میں منعقد ہوا، اس اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس اجلاس میں پورے ہندوستان کے علماء کی نمائندگی تھی، اس میں تقریباً پانچ سو علماء نے ملک کے گوشے گوشے سے شرکت کی تھی، اس موقع پر مولانا محمد سجاد نے علماء کرام کے اس منتخب مجمع میں امارت شرعیہ فی الہند کے قیام کی تجویز پیش کی۔ مولانا عبدالصمد رحمانی تحریر کرتے ہیں:

''دراصل صحیح معنوں میں یہی پہلا اجتماع تھا جو تمام اسلام ہند کا نمائندہ اجتماع تھا اور آئینی حیثیت سے یہ پہلا اجتماع تھا کہ آئینی طریقہ پر پورے اسلامی ہند کے لیے امیر شریعت یا امیر الہند کا مسئلہ طے کیا جاتا، چنانچہ اس اجلاس کے موقع میں حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد نے مسئلہ امارت فی الہند کو ارباب حل وعقد کے سامنے رکھا اور سیاست دینیہ کا صحیح مداوا تھا''۔ (تاریخ امارت، ص:49)

بہر حال جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس میں جہاں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور مفتی ہند مولانا کفایت اللہ دہلوی جیسے فعال اور پیکر علم وعمل نے حصہ لیا، وہیں مولانا محمد سجاد صاحب کی خدمات نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی، قیام کے بعد جمعیۃ کو کئی دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑا، جس کی وجہ سے بعض حضرات تو تھک ہار کر بیٹھ گئے اور اس سے علاحدگی اختیار کرلی؛ لیکن آپ تمام عمر جمعیۃ سے منسلک رہے اور اس کی آبیاری کرتے رہے۔ سن 1940ء میں آپ جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلی مقرر کیے گئے تھے۔

۴۔ قیام امارت شرعیہ:

قیام امارت شرعیہ کے سلسلہ میں مولانا محمد سجاد صاحب کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا احمد سعید دہلوی لکھتے ہیں:

''اس طرح مولانا سجاد نے پورے ہندوستان کے علماء ومشائخ اور ارباب بصیرت کو بیدار کرنے میں کامیابی حاصل کی، اور انھیں بہت جلد آئینی راہ پر لگا دیا، ایک طرف خلافت کے نام پر پورے ملک میں نظم ملت کا چرچا ہوا، امام المسلمین کی ضرورت پر پورے ملک کے علماء کے دستخط کے ساتھ فتوی شائع ہوا، جس پر خود مولانا سجاد نے چند تائیدی سطریں لکھ کر دستخط فرمائے ہیں، دوسری طرف جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ہندوستان میں قیام امارت شرعیہ اور انتخاب امیر کی ضرورت واہمیت پر ہر زمانہ میں آپ نے زور دیا''۔ (امارت شرعیہ۔ دینی جدوجہد کا روشن باب، مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی، ص: 56)

خود مولانا محمد سجاد صاحب نے اس تعلق سے اپنے خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند منعقدہ مراد آباد میں تحریر کیا ہے کہ!

''بعدہ کچھ ایسے واقعات وحوادث پیش آئے کہ اس مسودہ پر مجلس منتظمہ کو غور وفکر کرنے کا موقع نہیں ملا، اس بنا پر جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس اجمیر میں یہ غور کیا گیا کہ امارت شرعیہ ہند کے قیام میں چونکہ بہ ہمہ وجوہ متعدد تعویق ہے؛ اس لیے جب تک صوبہ وار امارت شرعیہ قائم کی جائے؛ اس لیے جمعیۃ علماء ہند نے صوبہ وار جمعیتوں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تجویز کے ذریعہ ان کو ہدایت کی کہ جلد از جلد صوبہ وار امارت شرعیہ قائم کریں؛ مگر اکثر صوبوں کے ناظمین جو اس دور میں اپنے صوبہ کے کاموں کے ذمہ دار تھے گرفتار کر لیے گئے؛ اس لیے غالباً اس تجویز پر عمل نہ کر سکے''۔ (خطبہ صدارت مراد آباد، مولانا ابوالمحاسن محمد

سجاد،ص:127)

مولانا نے شرعی نظام کے قیام اور مسلمانوں کی زندگی میں اسے پھر سے بحال کرنے کے لیے مسلسل کوششیں کیں اور اجتماعات، جلسوں اور کانفرنسوں میں علماء اور دانشوروں سے اس موضوع پر گفتگو اور بحثیں کیں اور جمعیۃ علماء ہند کے اجلاسوں میں اس فکر کو کئی بار پیش کیا اور جمعیۃ کے تجویز و فیصلے کے باوجود جب ملکی پیمانے پر امارت شرعیہ کا قیام اور امیر الہند کا انتخاب ممکن نہ ہوسکا تو جمعیۃ کی صوبہ وار امارت شرعیہ کے قیام کے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے مولانا نے انجمن علماء بہار کے اجلاس منعقدہ 23۔24/شعبان 1339ھ مطابق 2۔3/مئی 1921ء میں اس مسئلہ کو پھر پیش کیا، اور اس سلسلے میں یہ تجویز منظور ہوئی:

''صوبہ بہار واڑیسہ کے محکمہ شرعیہ کے لیے ایک عالم مقتدر شخص امیر منتخب کیا جائے جس کے ہاتھ میں تمام محاکم شرعیہ کی باگ ہو، اور اس کا ہر حکم مطابق شریعت ہر مسلمان کے لیے واجب العمل ہو، نیز تمام علماء ومشائخ اس کے ہاتھ پر خدمت وحفاظت اسلام کے لیے بیعت کریں جو سمع وطاعت کی بیعت ہوگی اور جو بیعت طریقت سے الگ ایک ضروری اور اہم چیز ہے، یہ جمعیۃ متفقہ طور پر تجویز کرتی ہے کہ انتخاب امیر محکمہ شرعیہ کے لئے ایک خاص اجلاس علماء بہار کا بمقام پٹنہ وسط شوال میں منعقد کیا جائے''۔(تاریخ امارت،ص:54)

چنانچہ اس تجویز کے مطابق مولانا ابو الکلام آزاد کی صدارت میں مورخہ 19/شوال 1339ھ مطابق 26/جون 1921ء کو پتھر کی مسجد بانکی پور پٹنہ میں انتخاب امیر کے لئے ایک نمائندہ اجلاس منعقد ہوا، جس میں بہار واڑیسہ کے پانچ سو سے زائد علماء ومشائخ نے شرکت کی، اور کل شرکاء کی تعداد تقریبا چار ہزار کے قریب تھی، اسی جلسہ میں امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا، جس کے پہلے امیر شریعت مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی منتخب ہوئے اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو نائب امیر شریعت بنایا گیا اور یہ حقیقت ہے کہ مولانا محمد سجاد صاحب کے مخلصانہ جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ امارت شرعیہ ایک طویل عرصہ گزرجانے کے باوجود اپنی خدمات کو انجام دینے میں ویسے ہی مصروف عمل ہے، جیسا کہ اپنے آغاز میں تھا، مولانا نورالحق رحمانی تحریر کرتے ہیں کہ!

:''آپ کے اخلاص کی برکت تھی کہ آج بھی امارت شرعیہ نہایت ہی آب وتاب کے ساتھ قوم وملت کی خدمت میں مصروف ہے''۔(ہمارے امیر، مرتب: مولانا رضوان احمد ندوی، مقالہ مولانا نورالحق رحمانی،ص:38)

اور بقول پروفیسر اختر الواسع صاحب:

''اپنے قیام کے 90/ برسوں بعد آج بھی امارت شرعیہ اپنے زیر کار دائرہ میں اپنا مخصوص مقام واعتبار اور وقار حاصل کیے ہوئے ہے''۔(روزنامہ ''انقلاب'' دہلی، مورخہ 29/12/2011ء،ص:6)

۵۔ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی:

عہد انگلشیہ کے ہندوستان میں جس طرح مسلمانوں کے خلاف جانبداری برتی جانے لگی اور جس طرح انگریزی حکومت نے طرح طرح کے قوانین بنا کر مسلمانوں کے عائلی قوانین کو زک پہنچانے کی کوشش کی تھی، ٹھیک اسی طرح سیاسی طور پر مسلمانوں کو پیچھے دھکیلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی، اور ہر محاذ پر مسلمانوں کے ساتھ متعصّبانہ رویہ اپنایا جانے لگا تھا، انگریزی نظام حکومت اور اس کی طرف سے وضع کی جانے والی پالیسیاں مسلم قوم کے حق میں کہیں نہ کہیں مذہبی، معاشی اور سیاسی حق تلفی پر مبنی ہوتی تھیں اور جو گنے چنے مسلمان لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر بن کر جاتے تھے، وہ نہ تو مسلم قوم کی صحیح نمائندگی کر پاتے تھے اور نہ ہی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پاس ہونے والے بل پر کوئی آواز ہی اٹھا سکتے تھے اور اگر کوئی آواز اٹھتی بھی تھی تو وہ اتنی کمزور ہوتی تھی کہ اس کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی تھی، ایسے وقت اور حالات میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے ذہن رسا نے مسلمانوں کے تشخص کو بچانے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہونے کے لیے سیاسی اور آئینی طاقت کے حصول کو ایک اہم ذریعہ سمجھا، چنانچہ اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے 25/ اگست 1935ء کو جناب ایم محمود بیرسٹر کے مکان پر نواب علی سجاد کی صدارت میں علماء ودانشوران قوم کا ایک اجتماع ہوا، اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی زوردار اپیل پر ایک سیاسی تحریک ''مسلم انڈی پنڈینٹ پارٹی'' کا قیام عمل میں آیا۔ (مستفاد از حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ۔ حیات و خدمات، مرتب: قاسمی، مقالہ مولانا محمد سہیل اختر قاسمی، ص:348)

اس پارٹی کا تاسیسی اجلاس 14/ستمبر 1936ء کو انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں جمعیۃ العلماء کے جنرل سکریٹری مولانا احمد سعید کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو ان کے انکار کے باوجود متفقہ طور پر صدر منتخب کرلیا گیا، اس پارٹی کے دو اہم مقاصد قرار پائے:

(۱) ملک کی مکمل آزادی کی حمایت کرنا۔

(۲) دینی امور میں امیر شریعت کی ہدایات کو قبول کرتے ہوئے ان پر عمل کرنا۔(مستفاد از

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ۔حیات وخدمات،مرتب: قاسمی،مقالہ فضل حق عظیم آبادی،ص:259)

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے عہدیداران کی تعداد پندرہ افراد پر مشتمل تھی،ان عہدیداران کی ترتیب کچھ اس طرح تھی:

صدر:	حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد
نائبین صدر:	(۱) مولوی بدرالحسن صاحب ایم،ایل،اے،مظفرپور
	(۲) خان بہادر مولانا عبدالعزیز صاحب،سنتھال پرگنہ
	(۳) نواب سید علی سجاد صاحب پٹنہ
	(۴) مولانا غلام احمد صاحب،گریڈیہہ،ہزاری باغ
سکریٹری:	مسٹر محمد محمود بیرسٹر،پٹنہ
جوائنٹ سکریٹریز:	(۱) حاجی شیخ شرف الدین صاحب
	(۲) مرزا ابابر حسین صاحب مختار،سمستی پور
	(۳) مولوی عبدالمجید صاحب وکیل،بھاگل پور
	(۴) حکیم سید محمد الیاس صاحب،رانچی
اسسٹنٹ سکریٹری:	مولانا عبدالصمد رحمانی،مونگیر
خازن:	(۱) مولوی خلیل احمد صاحب وکیل،پٹنہ
	(۲) مولوی محمد اسماعیل صاحب تاجر،پٹنہ
پروپگنڈہ سکریٹری:	مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب،مونگیر
اسسٹنٹ پروپگنڈہ سکریٹری:	مولوی ولی الحق صاحب شاہو بیگھوی

اسی طرح پارٹی کی مجلس عاملہ تشکیل دی گئی،جو اکیس ممبران پر مشتمل تھی۔(ہفت روزہ''نقیب''، ص:1 ،امارت شرعیہ پٹنہ،5/رجب1355ھ مطابق22/ستمبر1936ء)

بہرحال مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی نے اپنے منشور کے ساتھ الیکشن میں حصہ لیا اور پارٹی کی طرف سے کھڑے ہونے والوں کو عہد نامہ کا پابند کیا،بہار میں مسلمانوں کے لئے چالیس سیٹیں مخصوص تھیں،جب الیکشن کا نتیجہ سامنے آیا تو مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کو اسی فیصد کامیابی ملی،مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی نے چالیس میں سے 23/سیٹوں پر اپنے امیدوار کھڑے کیے تھے،جن میں سے 20/امیدوار کامیاب ہوئے،ایک سیٹ عورتوں کے لیے مخصوص تھی جس پر آزاد امیدوار کی

حیثیت سے لیڈی انیس امام جیتیں، مسلم یونائیٹڈ پارٹی کے 33/ میں سے صرف 5/امیدوار کامیاب ہوئے اور احرار پارٹی کو صرف 3/سیٹیں ملیں، کانگریس کو 7/ میں سے صرف 5/سیٹوں پر کامیابی حاصل ہوئی، جبکہ کانگریس کو بہار اسمبلی کے 152/سیٹوں میں سے کل 98/سیٹیں ملی تھیں اور بقیہ 6/سیٹوں پر آزاد امیدوار جیتے تھے،اس طرح مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کانگریس کے بعد سب سے بڑی پارٹی تھی۔

الیکشن کے نتائج آنے کے بعد کانگریس اور گورنر کے مابین اختلاف ہوگیا،جس کی وجہ سے انتخاب کے بعد بعض شرائط کی بنا پر کانگریس نے وزارت بنانے سے انکار کردیا، چنانچہ گورنر نے مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر کو وزارت بنانے کی دعوت دی اور گورنر کی دعوت پر مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی نے حکومت تشکیل کی اور اس طرح مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی حکومت بہار میں قائم ہوگئی اور مسٹر محمد یونس صاحب بیرسٹر (جنھیں پارٹی لیڈر منتخب کیا گیا تھا) نے بہار کے وزیر اعظم کی حیثیت سے یکم اپریل 1937ء کو حلف لیا، بہار کی حکومت اگر چہ مسٹر محمد یونس کے ہاتھ میں تھی؛ مگر اصلا پاٹی کے پارلیمنٹری بورڈ کے صدر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب اس حکومت کے روح رواں اور پالیسی ساز تھے،اگر وہ چاہتے تو صرف مسلم ممبران اسمبلی کو ہی اپنی کابینہ میں شامل کرتے ؛لیکن انھوں نے جناب عبدالوہاب خاں کے علاوہ بابو گرسہائے لال ایڈوکیٹ اور کمار اجیت پرشاد کو بھی کابینہ میں جگہ دے کر انھیں اہم محکمے سپرد کیے۔(نقیب،جلد:5 ،17/اپریل 1937ء، نیز مستفاد از مقالہ فضل حق عظیم آبادی، اور مولانا سہیل اختر قاسمی، بحوالہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد۔ حیات و خدمات،ص: 259 اور مابعد،ص: 348 اور مابعد)

پارٹی کی مدت حکومت اور خدمات:

مسٹر محمد یونس کی حکومت کل ایک سو بیس (120) دن چلی، جب گورنروں کے خصوصی اختیارات کے سوال پر گورنر جنرل کے ساتھ گاندھی جی کا سمجھوتا ہوگیا اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے وزارتوں کی تشکیل کی اجازت دے دی تو 7/جولائی کو مسٹر محمد یونس نے استعفادے دیا؛لیکن گورنر کی درخواست پر 19/جولائی تک حکومت کا کام دیکھتے رہے۔

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی نے دوران حکومت جو خدمات انجام دیں ذیل میں ہم ان کا مختصرا ذکر کرتے ہیں:

ا۔ اس کی پہلی خدمت سرکاری دفاتر میں اردو زبان کا اجرا ہے، جاننے والے جانتے

ہیں کہ اس میں مولانا کی کن کن کوششوں کو دخل ہے۔

۲۔ پارٹی کی دوسری اہم ترین خدمت جس سے صوبہ کے کسان آج تک مستفید ہو رہے ہیں، وہ دفعہ 112 کی ترمیم ہے، جس سے کسانوں کو کئی طرح پر تخفیف لگان کا فائدہ پہنچا اور یہ سب کچھ مولانا مرحوم کے اشارہ پر ہوا ہے۔ (مستفاد از حیات سجاد، مرتب: مولانا عبدالصمد رحمانی، ص: 147۔148)

۳۔ بہار اسمبلی میں امارت شرعیہ نے اپنی ہدایت اور رہنمائی میں اسلامی اوقاف کی حفاظت کے لیے ایک مسودہ قانون وقف اسلامی کی کامل رعایت کے ساتھ مرتب کر کے بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ذریعہ پیش کیا، جس کو بہار حکومت نے منظور کیا۔

۴۔ ''زرعی جائدادوں'' پر ٹیکس قانون میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے اپنی پارٹی کے ذریعہ یہ ترمیم پیش کرائی کہ اوقاف اسلامی کو اس ٹیکس سے مستثنی رکھا جائے، اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ صوبہ بہار میں تمام زرعی اوقاف کو بحیثیت زرعی اوقاف کے ٹیکس سے مستثنی قرار دیا گیا۔

۵۔ صوبہ بہار میں حکومت کی پالیسی جب یہ قرار پائی کہ ابتدائی تعلیم کو عام اور جبری کیا جائے تو مولانا سجاد صاحب نے فوراً مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کو اس طرف متوجہ کیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ ابتدائی تعلیم میں مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم بھی لازماً داخل کی جائے، یہاں تک کہ 19رفروری 1939ء کو وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود صاحب نے اعلان کیا کہ:

''حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت کے کہنے پر میں نے تعلیم گاہوں میں مذہبی تعلیم اصولاً منظور کر لیا ہے''۔

۶۔ اسی طرح بہار اسمبلی میں ایک مسودہ قانون''ڈاوری بل''کے نام سے پیش ہوا جس کی رو سے شادی میں جہیز اور مہر تک لینا جرم قرار پاتا تھا، امارت شرعیہ نے انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ذریعہ قانون میں ترمیم کروا کر اس غیر شرعی قانون سے مسلمانوں کو بچا لیا۔ (تاریخ امارت، ص: 159۔163)

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی دیگر خدمات:

۱۔ خلافت تحریک کی ناکامی کے بعد بہار میں فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، کہیں مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا تھا، کہیں ان کے گھر جلائے جا رہے تھے، اس صورتحال سے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بے چین ہو گئے اور جہاں جہاں ایسے واقعات ہوئے مولانا وہاں وہاں خود تشریف

لے گئے، اس کی خود تحقیقات کی، یا امارت شرعیہ کے کارکنوں کے ذریعہ تحقیقات کرائی اور مظلوم مسلمانوں کی مالی امداد، یا قانونی امداد فراہم کرایا اور نقصان کا انھیں تاوان دلوایا۔

۲۔ بتیا شہر کے محلّہ میر شکار ٹولی میں جب خوفناک فساد رونما ہوا اور چالیس پچاس ہزار مسلح ہندوؤں نے پورے محلے کو جلا کر راکھ کر دیا، بے شمار مسلمان قتل کئے گئے اور الٹے تین سو سے زائد مظلوم مسلمانوں کو سنگین الزامات عائد کر کے انھیں مقدمات میں پھنسا دیا گیا؛ لیکن مولانا محمد سجاد کی انتھک محنت سے ایک ایک مسلمان رہا ہوئے، مجرموں کو سخت سزا ہوئی، اور مسلمانوں کو ان کے نقصانات کا تاوان حکومت سے دلوایا گیا۔

۳۔ ویشالی ضلع کے پاتے پور تھانہ کے موضع سمر وارہ میں گائے کی قربانی کو لے کر ہندوؤں نے نثار علی نامی ایک مسلمان کو شہید کر دیا اور اس بستی میں آباد بہت سے مسلمانوں کو لوٹ لیا گیا، اسی طرح سمستی پور ضلع کے ایک گاؤں سرسونا میں بھی بقرعید ہی کے موقع سے فساد ہو گیا، جس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں کو لوٹ لیا، ان دونوں جگہوں کے مقدمات بھی مولانا محمد سجاد صاحب کی کوششوں سے نہایت کامیابی سے لڑے گئے اور قاتلوں کو کیفر کردار تک پہونچایا گیا۔

۴۔ اسی طرح گیا کے فساد کے موقع سے بھی مسلمانوں کی امداد کی گئی اور مولانا کی کوششوں اور جد و جہد سے انھیں تاوان دلوایا گیا۔

۵۔ ملکانہ میں جب ارتداد کی وبا پھیلی تو مولانا نے خود دورہ کر کے تبلیغی کام انجام دیئے اور امارت شرعیہ کے متعدد مبلغین کو وہاں متعین کر کے ان سے دفع ارتداد اور تبلیغ و اصلاح کا کام انجام دلایا۔

٦۔ صوبہ بہار کے گدیوں اور بھانٹوں میں جب ارتداد کی وبا پھیلی تو ضلع چمپارن میں گدیوں کی اصلاح کے لیے اور ضلع سارن میں بھانٹوں کی اصلاح کے لیے خود بھی دورہ کیا اور چونکہ ارتداد کی یہ لہر گورکھپور سے آ رہی تھی تو آپ نے گورکھپور کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور اصلاحی و تبلیغی جلسے کیے، اور اس طرح آپ کی کوششوں سے اس صوبہ سے ارتداد کی یہ وبا ختم ہوئی۔

۷۔ چمپارن کے ابتدائی اسکولوں اور پاٹھ شالوں میں مسلمان بچوں کو ہندی کی تعلیم دی جاتی تھی اور بجائے ''قرآن'' کے ''گیتا'' پڑھایا جاتا تھا، مولانا محمد سجاد صاحب نے اس کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی اور محکمہ تعلیم سے اس سلسلہ میں مراسلت کی، اور ان مکاتب اور اسکولوں کا از خود معائنہ کر کے حکام تک اس کی اطلاع دی، متعصب افسران کو بدلوایا اور مسلمان

بچوں کی تعلیم مذہبی کا نظم کرایا، اور بکثرت اردو داں مسلمان معلم بحال کرائے۔(حیات سجاد، نیز حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد۔ حیات و خدمات، مرتب: قاسمی، مستفاد از مقالہ مولانا سید محمد عثمان غنی، ص: 113۔115، نیز مقالہ انوار الحسن وسطوی، ص:342 ۔344)

آپ کی زندگی کے آخری ایام بھی قوم وملت کی خدمت کرتے ہوئے گزرے، چمپارن کے تر واہ علاقہ میں ملیریا بخار کی وبا پھیلی ہوئی تھی، اس حال میں بھی آپ کا آنا جانا لگا رہتا تھا، اور مسلمانوں کی فلاح واصلاح اوران کی امداد کے لئے ہمہ تن مصروف رہتے تھے، بالآخر آپ بھی اس وبا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ملیریا بخار میں مبتلا ہوگئے، علاج کے لئے آپ کو پھلواری شریف پٹنہ لایا گیا؛ لیکن بسیار کوششوں کے باوجود آپ جاں بر نہ ہوسکے اور 9/دن اسی بخار میں مبتلا رہ کر 17/شوال 1359ھ کو ہزاروں آنکھوں کو اشکبار چھوڑ کر اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔

تالیفات:

۱۔ فتاوی امارت شرعیہ (اول): یہ پوری جلد آپ کے دیئے گئے فتاوی پر مشتمل ہے (مرتب: قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ)

۲۔ حکومت الٰہی (تصحیح وتقدیم: قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ)

۳۔ خطبہ صدارت (اجلاس جمعیۃ علماء ہند مرادآباد) (تصحیح وتقدیم: قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ)

۴۔ قضایا سجاد (تصحیح وتقدیم: قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ)

۵۔ مقالات سجاد (جمع وترتیب: مولانا ضمان اللہ ندیمؒ)

۶۔ مکاتیب سجاد (تصحیح وتقدیم: قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ)

۷۔ تذکرہ جمعیۃ علماء ہند

۸۔ قانونی مسودے (جمع وترتیب: مولانا ضمان اللہ ندیمؒ)

۹۔ امارت شرعیہ۔شبہات وجوابات (تصحیح وتقدیم: قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ)

۱۰۔ دستور امارت شرعیہ

۱۱۔ متفقہ فتوی علماء ہند

۲۱۔ نظارت امارت شرعیہ کی مختصر اسکیم

۞۞

مصادر و مراجع:

1۔ حیات سجاد: مرتب: مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، ناشر: امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، سال اشاعت: 1419ھ 998ء۔

2۔ ہمارے امیر، مرتب مولانا رضوان احمد ندوی، ناشر: امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، سال اشاعت: 2006ء 1427ھ۔

3۔ حیات سجاد، مرتب: مولانا عبدالصمد رحمانی، ناشر: امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، طباعت: 1360 ھ۔

4۔ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ۔ حیات وخدمات، مرتب: مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، ناشر: مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، سن طباعت: 2003 ء۔

5۔ تاریخ امارت، مولانا عبدالصمد رحمانی، ناشر: امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، طبع دوم: 1367 ھ۔

6۔ امارت شرعیہ۔ دینی جد و جہد کا روشن باب، مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی، ناشر: مکتبہ امارت شرعیہ پٹنہ، طبع اول: ربیع الاول 1394ھ/اپریل 1974ء۔

7۔ خطبہ صدارت مرادآباد، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، ناشر: امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، سن اشاعت: ذی الحجہ 1419ھ/اپریل 1999ء۔

8۔ روزنامہ ''انقلاب'' دہلی، مورخہ 29/12/2011ء۔

9۔ ہفت روزہ ''نقیب''، ص: 1، امارت شرعیہ پٹنہ، 5/رجب 1355ھ مطابق 22/ستمبر 1936ء۔

10۔ ہفت روزہ ''نقیب''، جلد: 5، 17/اپریل 1937ء۔

ملک وملت کی تعمیر کے لیے مولانا سجاد کی قربانیاں

احمد بن مفتی نذر توحید مظاہری
جامعہ رشید العلوم چترا (جھارکھنڈ)

زمانہ ہوگیا گزرا تھا کوئی بزم انجم سے
غبار راہ روشن ہے بہ شکل کہکشاں اب تک

صاحبان نظراورارباب دانش وبینش کی دوربیں نگاہوں سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ شخص سے شخصیت کا سفر طے کرنے میں کوئی تھوڑا وقت اور مختصر مدت نہیں لگتی بلکہ اس کے لیے برسہا برس لگانا اور "کھپانا" پڑتا ہے تب کہیں جا کے کوئی "جیالا" حالات کی بھٹی سے کندن بن کر زبان حال سے یہ کہتا ہوا نکل آتا ہے کہ:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے "انسان" نکلتے ہیں

ورنہ اگر یہ اتنا ہی آسان عمل ہوتا تو شاعر مشرق کو ہرگز یہ نہ کہنا پڑتا:

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم

شخصیت کے تعمیر وتشکیل میں محنت شاقہ ایک ازلی صداقت اور ابدی حقیقت ہے گوکہ کور چشموں کو نظر نہ آئے کہ:

کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

"تمنائے مختصر" کے لئے قائم کی گئی اس "تمہید طولانی" کا خلاصہ یہ ہے کہ شخص سے شخصیت بننے میں جو عرصہ لگتا ہے وہ متاع حیات کا ایک معتد بہ حصہ ہوا کرتا ہے جسے یوں بھی واشگاف کرنے کی کوشش کی گئی کہ:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یقیناً شخصیت کی تعمیر کے لئے جاں کاہی اور مغز پاشی کا "میٹیریل" وافر مقدار میں درکار ہوتا ہے کیوں کہ:

سارا کلیجہ کٹ کٹ کے جب اشکوں میں بہ جائے ہے
تب کوئی فرہاد بنے ہے تب مجنوں کہلائے ہے

لیکن پھر شخصیات کی بھیڑ اور "ہستیوں" کے انبوہ میں بھی کچھ چہرے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور دیکھنے والے بہت دور سے بھی ان کے رخ روشن کو دیکھ بآسانی پہچان لیتے ہیں اور اس میں ذرا خطا نہیں کرتے۔ ایسی ہی امتیازی حیثیت اور خصوصی شناخت رکھنے والی شخصیات میں سے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی بھی ہے جو بہ یک وقت بہترین مدرس بھی تھے اور زبردست منتظم بھی، امت کا درد رکھنے والے مفکر بھی تھے اور ملی کاموں کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے والے مجاہد بھی، باوقار عالم بھی تھے اور بلا کی ذہانت سے مالا مال سیاست دان بھی!

مولانا کی شخصیت گوناگوں اوصاف حمیدہ کا مرقع اور مختلف النوع خوبیوں کا پیکر تھی، اس دور قحط الرجال میں ایسی فقید المثال شخصیت قرون ماضی کی یاد دلاتی تھی۔ ان کی شخصیت بلا شبہ ایک ہمہ جہت شخصیت تھی، وہ جس میدان میں جا نکلتے وہاں اپنی لیاقت ومہارت کا لوہا منوا لیتے، وہ:

چہرہ کھلی کتاب ہے عنوان جو بھی دو
جس رخ سے بھی پڑھو گے تم "اسے" جان جاؤ گے

کے مصداق تھے۔ وہ "در کفے جام شریعت" کے مالک تھے تو "در کفے سندان عشق" بھی رکھتے تھے۔ ان کے متعلق یہ کہنے میں کہیں سے کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ انہوں نے:

پھونک کر اپنے آشیانے
روشنی بخش دی زمانے کو

وہ "بسطۃ فی الجسم" تو نہ تھے مگر "بسطۃ فی العلم" ہونے میں نایاب نہ سہی لیکن کم یاب ضرور تھے۔ انہوں نے جہاں اپنی تدریسی خوبیوں اور افہام وتفہیم کی بے پناہ صلاحیتوں سے بہار ایسی بنجر اور شوریدہ زمین کو تعلیم وتعلم کے لیے کچھ اس طرح زرخیزی بخشی کہ بہاری طلبہ جن کے نزدیک بیرون بہار حصول تعلیم کے لئے جانا ہی کام یابی کی معراج تصور کیا جاتا تھا۔ اور یہ احساس کم تری بہاری طلبہ کے لیے سم قاتل ثابت ہو رہا تھا؛ لیکن مولانا کی پرکشش اور سحر انگیز شخصیت نے ان تشنگان علم وآگہی کو اس سلیقے سے سیراب کیا کہ ہمیشہ "ہل من مزید" کا نعرہ لگانے

والوں کے قدم تھم بلکہ جم سے گئے اور انہیں ''دور کے ڈھول سہاون'' کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آ گیا، دیکھتے ہی دیکھتے شائقین علم نے جوق در جوق اس بافیض شخصیت کی جانب رجوع کرنا شروع کر دیا تو دیکھنے والی متحیر نگاہیں سراپا سوال بن کر یہ پوچھنے لگیں کہ:

ہجوم کیوں ہے زیادہ ''شراب خانے'' میں؟

پھر مولانا کی شخصیت کو دیکھ اور ان سے واقفیت حاصل کر کے انہیں اس کا جواب بھی جلد ہی مل جایا کرتا کہ:

فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے ''مرد خلیق'' (۱)

''زمین شور'' اور ''مردم خور سرزمین'' کہنے کی جرأت اس ناچیز کو نہیں؛ بلکہ اس ''خصوصیت'' کا تذکرہ بہار کے مایہ ناز سپوت، صاحب طرز ادیب اور عالم شہیر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے کیا ہے؛ یہ خیالات ناچیز نے ان ہی سے مستعار لئے ہیں۔ اور ویسے بھی پیش نظر تحریر میں زیادہ تر ''مانگے کے اجالوں'' سے کام لیا گیا ہے؛ اس لیے اس اعتراف میں کوئی حجاب مانع نہیں ہے کہ:

''ان'' ہی کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات ''ان'' کی

جہاں مولانا نے وادیٔ تدریس میں اپنی لیاقت مندی کے پرچم نصب کئے، وہیں انہوں نے اپنے جذبۂ اخلاص اور تواضع وکسر نفسی کے وہ نمونے پیش کئے اور ''مد نظر مرضیٔ جاناناں چاہیے'' کا عملی ثبوت کچھ انداز سے سے پیش کیا کہ تاریخ کی نگاہیں عش عش کر اٹھیں اور ''لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو!'' کی صدا لگانے والوں کو مانگی مراد مل گئی، لگے ہاتھوں ان واقعات کا ذکر بے محل نہ ہوگا، جو مولانا کے انکسار و تذلل پر دال ہیں، جہاں آپ کو ''مدرسہ انوار العلوم، گیا'' کی عمارت کے موقع پر طلبہ کے ساتھ اینٹیں ڈھونے میں بہ نفس نفیس شرکت کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ (۲) وہیں اس کا بھی مشاہدہ کیا گیا کہ جب چمپارن میں زلزلے کے زد کی تاب نہ لا کر بیشتر کچے مکانات زمین بوس ہو گئے اور مفلوک الحال لوگ جن کے پاس سے سر چھپانے کو جو سائبان میسر تھا، وہ بھی جاتا رہا تو مولانا نے زلزلہ کی زد میں آئے ان علاقوں کا سفر کیا اور ان افلاس زدہ بے یار و مددگار لوگوں کو نہ صرف یہ کہ اپنے ''نیک مشوروں'' سے نوازا، بلکہ ہاتھ میں چاقو اور رسی لیے ان گھروں کے ٹھاٹھ کے بندھن کو باندھ کر سنت نبوی کا عملی مظاہرہ کیا۔ (۳)

آپ قول سے زیادہ عمل پر یقین رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ گفتار نہیں بلکہ کردار کے غازی تھے۔ آپ نہ کرنے سے پہلے بلند بانگ دعوے کر کے مخاطبین کو خواہ مخواہ مرعوب کرنے کی

بے جا کوشش کرتے نہ ہی ''کر جانے'' کے بعد موقع بہ موقع خود منہ میاں مٹھو بن کر ان کارناموں کا کسی نہ کسی بہانے سے تذکرہ کر کے دوسروں کو صبر وضبط کے امتحان میں مبتلا کرتے۔ وہ جو کچھ کرتے اسے نہایت رزداری کے ساتھ انجام دیتے اور اگر کبھی اس کا ذکر ناگزیر بھی ہوتا تو کسی لگاوٹ، بناوٹ اور تصنع کو جگہ دیئے بغیر نہایت دیانت داری کے ساتھ بیان فرما دیتے۔ انہیں کسی کام کا کریڈٹ لینے کے لیے بھاگم بھاگ کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا بلکہ اکثر اپنے کاموں کا کریڈٹ دوسروں کو دے جاتے؛ کیوں ان کے پیش نظر ہمیشہ ہی ''مرضیٔ جاناں'' ہوا کرتا، وہ جو بولتے وہی کرتے اور جو کرتے وہی بولتے؛ بلکہ اکثر اپنے کارناموں کے حوالے سے خاموش رہتے؛ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہاں ان کاموں کی قیمت چاہ کر بھی ادا نہیں کی جاسکتی؛ اس لیے ﴿ان اجری الاعلی اللہ﴾ کہہ کر وہ تجارت کر لیتے، جس کے بارے میں حقیقت کی غمازی کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

سودا یہ وہ ہے جس میں خسارہ کوئی نہیں

انہوں نے ایسے وقت میں سیاست میں قدم رکھا جب کہ پوری قوم کا شیرازہ بری طرح انتشار کا شکار تھا؛ ان کے حواس مفلوج، قلب و ذہن مجروح اور عقل ودماغ محکوم ہو رہے تھے، مسلمانوں کو سیاسی طور پر ''یتیم'' کی تلخیوں کا احساس ہو رہا تھا' کارواں ''نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز'' جیسے وقیع اوصاف سے متصف میر کارواں کی تلاش میں سرگرداں تھا، بیمار قوم کسی مسیحا کے مبارک قدموں کے چاپ سننے کو منتظر اور پر امید نگاہوں سے کسی ''نجات دہندہ'' کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ایسے وقت میں ''استحباب'' کے درجے میں نہیں؛ بلکہ یہ ضرورت ''وجوب'' کی حد تک پہنچ چکی تھی کہ پردۂ غیب سے کوئی ''مردمؤمن'' اپنے دل دردمند اور فکر ارجمند کو لے کر نمودار ہو اور اس لٹے پٹے ہوئے کارواں کو یک جا کر کے تازہ دم کرے اور نہ صرف گفتگو کے ذریعہ؛ بلکہ عملی اقدامات کو بروئے کار لا کر ان میں ''اسپرٹ'' بھرے اور ان کے تن مردہ میں روح پھونک دے؛ تاکہ یہ قوم جو مجموعی اعتبار سے بےحس وحرکت پڑی ہوئی ہے اور جو کچھ مقسوم میں ہے، اسی پر ''راضی برضا'' رہنے اور اسے اپنا مقدر کہہ کر ''صبر وشکر'' کا مظاہرہ کر رہی ہے، وہ پوری طرح صحت یاب اور فکری طور پر بیدار ہو کر خود کو ''مرد آہن'' ثابت کر سکے اور اپنے وجود کی اہمیت اس انداز میں بتا سکے کہ جو ''ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا'' ہیں، وہ ایک نئے جوش اور تاریخ ساز ولولے کے ساتھ اٹھیں اور خود کو دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے کے بہ جائے اپنے نوشتۂ تقدیر

خوداپنے ہاتھوں سے تحریر اور چند کلیوں پر قانع ہونے کے بہ جائے ''علاج تنگیِ داماں'' کی فکرو تدبیر بھی کرسکیں۔

غرض یہ کہ سیاسی میدان میں کسی ایسے مستانے کی شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کی جارہی تھی، جوبگڑے ہوئے ''دستورِ مے خانہ'' میں تبدیلی لاکر اپنے نئے لائحۂ عمل اور سیاسی فہم وتدبر کے ذریعہ اس ''قوم'' کے گیسوئے برہم کوسنوار کرسکے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے درد کے درماں کے لیے بارگاہ ایزدی میں آپ کوقبول کرلیا گیا، جس کا ظہور مسلمانانِ ہند کے ذریعہ آپ کی ذات کو سیاسی رہ نمائی کے لیے منتخب کئے جانے کی صورت میں ہوا، بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کی شخصیت نہ صرف سیاسیات میں ایک اہم مقام کی حامل تھی؛ بلکہ ان کی ذات گرامی اس باب میں نہایت ممتاز حیثیت بھی رکھتی تھی، یہ صرف ایک نوخیز طالب علم کی مبالغہ آمیز رائے نہیں ہے؛ بلکہ عالم اسلام کے نام ور، مقتدر اور مسلم الثبوت علمانے بھی کھل کران کے اس ''وصف خاص'' کا واضح انداز میں اعتراف کیا ہے۔

یوں تو مولانا کی زندگی کا ہرلمحہ، تمام چلت پھرت اور ساری تگ ودو اعلاء کلمۃ اللہ، تحفظ شریعت، مسلمانوں کے تشخص اور ان کے شناخت کی بقا کے لیے گویا وقف تھے؛ لیکن باضابطہ اور مرتب انداز میں اس کام کا آغاز تب ہوا، جب کہ مولانا الہ آباد میں مقیم اور مدرسہ سبحانیہ میں علم ومعرفت کے گراں مایہ یواقیت ولآلی مستفیدین کے آگے لٹانے میں مصروف تھے اور ہر کوئی اپنے اپنے ظرف کے بہ قدر اسے دامن شوق میں سمیٹ رہا تھا۔ طلبہ کی ایک بڑی تعداد اس وقت آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کررہی تھی اور مولانا پوری جاں فشانی کے ساتھ ان کے دامن طلب کوعلم وحکمت کے تابندہ جواہر سے بھر رہے تھے۔ ان ہی دنوں زاہد خاں دریابادی نامی ایک شخص مولانا سے اکتساب فیض کے لیے آیا کرتے تھے، وہ انگریزی زبان سے واقف تھے اور انگریزی اخبارات مولانا کو پڑھ کر سنایا کرتے، جس میں عالم اسلام کی دگرگوں صورت حال سے متعلق نہایت تشویش ناک خبریں ہوا کرتیں، مولانا جب یہ سب سنتے تو تڑپ اٹھتے اور آپ کی مفکرانہ طبیعت یہ سوچ کر رنجیدہ، ملول اور بے چین ہوجایا کرتی کہ:

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پہ ہوگا اس کا امتحاں کب تک؟

آپ کی بے کلی یہ کہتی ہوئی نظر آتی کہ:

یہ فکر مجھے چین سے سونے نہیں دیتی
اب کون میری قوم کو بیدار کرے گا

اسی خلش اور عالم اسلام کی اسی بے کسی و بے بسی نے آپ کو مضطرب کر دیا اور میدان سیاست کو اپنی جولان گاہ کے طور پر منتخب کرنے کو مجبور کر دیا، چوں کہ یہ لابدی حقیقت مولانا کے آگے آفتاب نیم روز کی طرح آشکارا تھی اور آپ کو بہ خوبی اس کا ادراک تھا کہ:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس لیے وہ جودت فہمی اور ذکاوت ذہنی جو کبھی علمی گتھیوں کے سلجھانے میں صرف ہوتے تھے تو کبھی تفسیر وحدیث کے بحر ذخار میں غواصی کرتے ہوئے نظر آتے تھے، کبھی فقہ وادب کے گلہائے رنگا رنگ کی فرحت افزاء اور سرور بخش خوشبوؤں سے مشام جاں کو معطر کرتے ہوئے ملتے تھے تو کبھی فلسفہ و منطق کی پر پیچ گھاٹیوں میں محو سفر دکھائی پڑتے تھے، اب ان کے سمت سفر میں تبدیلی آ گئی تھی اور اس شخصیت کے سفینۂ فہم و فراست نے ''صحیح رخ'' پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا؛ کیوں کہ خلاق عالم نے جس کی تخلیق پوری قوم کی قیادت وسیادت کے لیے کی ہو اسے ایک تنگ دائرے میں محدود؛ بلکہ محصور کب تک رکھا جا سکتا تھا؟ جس کے شخصیت کی بلندی:

فلک تو وسعتیں اپنی بڑھا لے
مجھے اڑنے کی خواہش ہو رہی ہے

کہنے کا حق رکھتی ہو اسے ایک چھوٹی سی چہاردیواری کے اندر کہاں تک مقید کیا جا سکتا تھا؟ (۴)

چناں چہ مولانا نے مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسی کرب سے متاثر ہو کر مدرسہ سبحانیہ کو الوداع اور الہ آباد کو خیر آباد کہتے ہوئے ''گیا'' کی راہ لی۔ ''گیا'' آنے کے بعد آپ نے سب سے پہلے مدرسے کی بنیاد ڈالی؛ تا کہ اس فانی زیست کی یہ یادگار سدا باقی رہ سکے اور اس کا نفع تا صبح قیامت صدقۂ جاریہ کی صورت میں ملتا رہے، نیز مدرسے کے قیام کے پس پردہ یہ مصلحت بھی کار فرما تھی کہ اس کے توسط سے عوامی رابطہ مضبوط کیا جا سکے، آپ کو عوام کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے میں سہولت ہو اور آپ کی ذات سے عوام متعارف ہو جائے؛ تا کہ ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہوئے ملکی، ملی وسیاسی مسائل کے منجدھار سے اپنی کشتی بآسانی باہر نکالی جا سکے۔ ''گیا'' کو مرکز عمل بنا کر آپ نے پورے لگن، جوش وجذبے، حوصلے اور ولولے کے

ساتھ عموماً پورے عالم اسلام اور خصوصاً ہندوستان کا اپنے ''کارگاہ'' کے طور پر انتخاب کیا۔(۵)

امت مسلمہ کی حالت زار اور ان کی ناگفتہ بہ صورت حال کے تئیں فکر مندی کا نتیجہ تھا کہ آپ کی اختراعی صلاحیتوں نے مدارس اسلامیہ میں اصلاحی نصاب کے اجراء، امارت شرعیہ، غلہ اسکیم، علماء بہار کی متحدہ تنظیم ''انجمن علماء بہار'' کے قیام اور ایسے ہی متعدد رفاہی تنظیموں وفلاحی کاموں کو اپج دیا۔''انجمن علمائے بہار'' کے قیام کے وقت مسلمانوں کو نہایت پرآشوب حالات کا سامنا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا ابوالکلام آزاد اور علی برادران جیسے قائدین حریت ''ڈیفینس آف انڈیا ایکٹ'' کے تحت اسیری کے دن کاٹ رہے تھے، ان کی رہائی کے لئے کوئی تحریک تو کیا چلتی اور اس کے خلاف کوئی آواز تو کیا اٹھتی، لوگ ''خداوندان فرنگ'' کے خوف سے ان کے نام لینے سے بھی خائف رہتے تھے؛ لیکن ''انجمن علمائے بہار'' نے ان مسلم قائدین کی رہائی کے لیے صدا بلند کی تو مولانا کے اس جرأت مندانہ کارنامے نے ملک کے علماء ودیگر حریت پسندوں کے ولولوں کو دوآتشہ کر دیا۔(۶)

''انجمن علمائے بہار'' کے قیام کے دوسال بعد معاً ۱۹۱۹ء میں جب آپ کی تمنائیں ''جمعیۃ علماء ہند'' کی شکل میں بارآور ہوئیں، پھر اس کے بعد ''جمعیۃ'' کا دوسرا اجلاس مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کی تحریک اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی حمایت سے دہلی کی سرزمین پر شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی صدارت میں ہوا تو مولانا جی جان سے اس کی آب یاری میں لگ گئے۔مولانا ''جمعیۃ'' کے ''سابقین اولین'' کی حیثیت رکھتے تھے، اس کے روز اول سے ہی اس میں آپ کی ''خادمانہ'' شمولیت رہی اور ''جمعیۃ'' سے ان کا یہ ربط تادم واپسیں قائم رہا، حالانکہ اس راہ میں بے شمار جاں گداز مراحل آئے اور متعدد پریشان کن مواقع نے ان کی راہ روکنا چاہا؛ لیکن جب بھی ان کے پاؤں کے چھالوں نے منزل کی دوری کا شکوہ کیا تو انہوں نے بہ جائے حوصلہ ہارنے کے ایک نئے ولولے کا مظاہرہ کیا اور آبلہ پا ہونے کے باوجود ''جمعیۃ'' کے لیے دیوانہ وار چلتے رہے، آپ کے عزم کی بلندی اور ارادے کی پختگی کو دیکھ کر متعجب نگاہیں بے اختیار کہہ اٹھتیں:

اولوالعزمان دانش مند جب کرنے پہ آتے ہیں

سمندر پاٹتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں(۷)

پھر ۶ رستمبر ۱۹۲۰ء کو کلکتہ کی کانفرنس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جانب سے پیش کئے گئے ''تحریک عدم تعاون'' کو منظوری حاصل ہوگئی تو چوں کہ ''تحریک خلافت'' اس سے پہلے منظور ہو

چکی تھی اور اپنی منزل کی جانب محوسفر تھی، اس لیے اب ''تحریک عدم تعان'' نے پورے ملک کے اندر ایک انقلابی کیفیت بپا کردی تھی، مولانا ان دونوں تحریکوں میں نہ صرف پیش پیش رہے؛ بلکہ ان کے ذریعہ مسلمانان ہند اور خصوصاً مسلمان بہار کو منظّم اور متحد کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا، جس کی وجہ سے دیہی علاقوں میں بھی یہ تحریکیں زور پکڑنے لگیں اور ''امارت شرعیہ''۔ جو مولانا کا ایک دیرینہ خواب تھا اور اس کے لیے آپ برسوں تگ ودو میں مشغول رہے، کے قیام کی راہ میں حائل دشواریاں بھی دور ہٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں اور بڑی حد تک اس کے لیے راہ ہموار ہونے لگی، یہاں تک کہ روز وشب کی جاں گسل کوششوں اور جی توڑ محنتوں نے رنگ لانا شروع کردیا اور بالآخر ۱۹۲۱ء میں ''امارت شرعیہ'' وجود پذیر ہوا جو مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے حسن تخیل، مولانا ابوالکلام آزادؒ کی توثیق وحمایت اور قاضی احمد حسینؒ کے کاوشوں کا ثمرہ تھا۔(۸)

اس کے بعد جب ''مانٹگو چیمس فورڈ ایوارڈ'' کے مطابق جب ہندوستان کے لیے نیا قانون وضع کیا گیا اور اس کی تنفیذ عمل میں آئی تو صوبائی ومرکزی اسمبلیوں کے انتخابات جے سلسلے میں مختلف مسائل نے سر اٹھانا شروع کردیا۔ ''تحریک خلافت'' اور ''تحریک عدم تعاون'' کے دوران مسلمانان ہند نے ایک دوسرے سے مربوط ہوکر مکمل اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا؛ لیکن جب یہ تحریکیں دم توڑ گئیں تو کانگریس کی مکارانہ پالیسیوں نے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنا شروع کردیا تھا، یہاں تک کہ انتخابات میں بھی مسلم حلقوں کو نظر انداز؛ بلکہ پس انداز کرکے انہیں مزید زک پہنچانے کی کوشش کی گئی، گو کہ مسلمانان بہار کانگریس کے اس متعصّبانہ رویے سے حد درجہ بددل اور ناراض تھے؛ مگر دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کی طرح کا کانگریس کی مخالفت پر کھڑے نہیں ہوئے تھے، جس کی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ ''مسلم لیگ'' کوئی زیادہ مضبوط ومستحکم تنظیم، یا پارٹی نہ تھی۔

جب مرکزی اسمبلی کے انتخابات کا اعلان ہوا تو پرانے ''خلافتی''، ''لیگی'' اور ''جمعیتی'' ذمہ داران کی مدد سے ''مسلم یونیٹی بورڈ'' تشکیل دے کر ہندوستان کی آزادی کے لیے مرمٹنے والے اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار مسلمانوں کو انتخابی میدان میں اتارا گیا۔ اس ''یونیٹی بورڈ'' سے الیکشن لڑنے والے چار میں سے تین نے اپنی جیت درج کروائی، جس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی، جب صوبائی اسمبلی کے الیکشن کا وقت آیا تو کانگریس کو مسلم حلقوں کے متعلق نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرکے پوری دور اندیشی کے ساتھ فیصلہ کرنا پڑا، پھر بھی کانگریس نے

’’امارت شرعیہ‘‘ کے ساتھ جانے کے بہ جائے ’’مسلم لیگ‘‘ کے تعاون سے انتخاب لڑنے کو ترجیح دیا، چناں چہ مسٹر محمد علی جناح نے بہار میں ’’مسلم لیگ‘‘ کو استحکام بخشنے کی خاطر بہار سے کچھ مخصوص ومعروف چہروں کا انتخاب کر کے اپنے پارلیامینٹری بورڈ میں بھی شامل کر لیا، کانگریس اور مسلم لیگ کے اس اتحاد کی وجہ سے ’’امارت شرعیہ‘‘ کو یہ مشکل پیش آئی کہ ’’امارت شرعیہ‘‘ جہاں ’’تحریک خلافت‘‘ میں شامل ہو کر بہترین کارکردگی کے سبب مسلمانوں کی حمایت اور ان کا اعتماد حاصل کر چکی تھی، وہیں ’’مسلم لیگ‘‘ اس تحریک کی مخالفت کر کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کر چکی تھی، یہی وجہ تھی کہ مسلمان ’’مسلم لیگ‘‘ اور مسٹر جناح سے بدظن؛ بلکہ بڑی حد تک متنفر ہو چکے تھے۔ ایسے نازک ترین حالات میں مسلمانوں کو ایک بار پھر ایسی جماعت کے ہاتھوں سونپ دینا، جو ان کے جذبات کا پاس ولحاظ کئے بغیر فیصلہ کرتی ہو اور اس کی قطعاً پرواہ نہ کرتی ہو کہ اس فیصلے سے کن احساسات کو چوٹ پہنچے گی اور دلوں کے کتنے نازک آبگینوں کو ٹھیس لگے گی؛ گویا خود ’’امارت شرعیہ‘‘ کے لیے خودکشی کے مرادف تھا۔ ذمہ داران امارت ذہنی کش مکش میں مبتلا اور گومگو کی کیفیت سے دوچار تھے۔(۹)

چناں چہ مولانا نے اس پیچیدہ اور بظاہر لاینحل سے نظر آنے والے اس مسئلے پر غور وخوض اور اس کے حل کی تدبیر کرنے کی غرض سے ’’امارت‘‘ کے زعما کی میٹنگ بلائی، جس میں دو فیصلے لیے گئے، وہ دو اہم ترین فیصلے یہ تھے: پہلا یہ کہ ’’امارت شرعیہ‘‘ مسلمانوں کی سیاسی رہ نمائی کے لیے خود آگے بڑھے اور الیکشن کی مہم کو سر کرنے کے لیے ایک نئی پارٹی تشکیل دی جائے اور دوسرا یہ کہ اگر کوئی دوسری مجلس ’’امارت شرعیہ‘‘ کے اصول وضوابط کے مطابق تشکیل دی جائے تو ’امارت‘‘ اس کی حمایت کرے گی، اس فیصلے کو عملی شکل دینے کے لیے ’’امارت شرعیہ بورڈ‘‘ قائم کیا گیا اور مولانا نے اس میں ’’اماراتی‘‘، ’’خلافتی‘‘ اور ’’جمعیتی‘‘ کارکنان کے علاوہ مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ اور درست نہج پر چلنے وسوچنے والے طبقے کو بھی شامل کیا، پھر ان سب کے مشورے اور تعاون سے ’’مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی‘‘ کا قیام عمل میں آیا؛ تا کہ آئندہ الیکشن میں ’’مسلم لیگ‘‘ کے ساتھ چلنے کے بہ جائے اسی پارٹی سے امیدواروں کو انتخابی میدان میں اتارا جا سکے۔(۱۰)

’’مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی‘‘ کے تاسیسی اجلاس کا انعقاد ۱۴/ستمبر ۱۹۳۶ء کو پٹنہ کے ’’انجمن اسلامیہ ہال‘‘ میں جمعیۃ العلماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا احمد سعید دہلوی کے زیر صدارت ہوا، اس تاسیسی اجلاس میں مولانا کے صدہا انکار کے باوجود آپ کو اتفاق رائے سے اس کا صدر

منتخب کرلیا گیا، اس کے دو مقاصد کو سب سے اہم قرار دیا گیا: پہلا یہ کہ ملک کے مکمل آزادی کی حمایت کرنا اور دوسرا دینی امور میں امیر شریعت کے ہدایات کو قبول کرتے ہوئے اس پر عمل کرنا، پارٹی کے اراکین عاملہ کی کل تعداد اکیس تھی، جن میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کو صدر، مسٹر محمود بار ایٹ لاء (پٹنہ) کو سکریٹری، مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو پروپگنڈہ سکریٹری اور جسٹس خلیل احمد و مولوی محمد اسماعیل تاجر (پٹنہ) کو خازن کی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں، ان ذمہ داروں کے علاوہ چار نائبین صدر، چار جوائنٹ سکریٹری اور ایک پروپگنڈہ سکریٹری بھی متعین کئے گئے۔ (۱۱)

عین اسی وقت بہار میں مسٹر عبدالعزیز نے ''مسلم یونائیڈیڈ پارٹی'' اور مولانا شفیع داؤدی نے ''احرار پارٹی'' کے نام سے دو الگ الگ پارٹیاں بنالیں، چوں کہ اس سے مسلمانوں کو نقصان اٹھانے کا اندیشہ تھا، اس لیے مولانا نے دونوں پارٹیوں کو ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' میں ضم کرنے کی حتی المقدور کوشش کی لیکن مذکورالصدر دونوں پارٹیوں کے سربراہان اپنی بات پر اڑے رہے اور اس کے لیے تیار نہ ہوئے بالآخر کوئی نتیجہ نہ نکلتے دیکھ کر ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' کو تنہا اپنے بوتے پر انتخاب لڑنے کے لئے کمر کس لینا پڑا۔ ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' چوں کہ مسلمانان بہار کے لیے امید کی کرن بن کر نمودار ہوا تھا؛ اس لیے اس کے حوالے سے ان میں کافی جوش وخروش پایا جارہا تھا، یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' کی صرف نیک مشوروں سے ہی نہیں؛ بلکہ جان و مال ہر طرح سے مکمل اعانت کی تھی، مسلمانوں کی اس بھرپور حمایت وتعاون کا اثر یہ ہوا کہ انتخابی نتائج مخالفین کے لئے نہایت ہی حیران کن وحوصلہ شکن جب کی حامیین وموءیدین کے لیے حد درجہ امید افزاء ثابت ہوئے۔

انتخابات کے اس چونکا دینے والے نتیجے کے بعد نہ صرف یہ ہوا کہ ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' نے بہار کے پچاس فی صد مسلم سیٹوں پر کامیابی حاصل کی؛ بلکہ یہ پارٹی کانگریس کے بعد سب سے بڑی پارٹی کے طور پر ابھری، پارٹی کی زبردست مقبولیت میں ''امارت شرعیہ'' کی بہترین کارکردگی، مولانا کی ترقی پسندانہ حکمت عملی اور ان کے مخلص رفقاء کا روبے لوث معاونین کی ان تھک کوششوں کو بہت زیادہ دخل تھا۔ (پارٹی کے کامیاب امیدواروں کی فہرست بھی ''نقیب'' کے ''مولانا سجاد نمبر'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔)

''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' کے مقبولیت کی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر ڈلٹا اپنی کتاب ''فریڈم موومنٹ ان بہار'' میں رقم طراز ہیں کہ:

''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' کے الیکشن مینی فیسٹو میں زرعی اصلاحات اور مہاجنی لوٹ پر روک لگانے کے متعلق مسلم لیگ اور کانگریس سے زیادہ ترقی پسندانہ مطالبات تھے''۔(۱۲)

چوں کہ ۱۹۳۷ء کے صوبائی اسمبلی انتخابات میں کانگریس کو ۱۵۲/ میں سے ۹۸/ نشستیں ملی تھیں؛ اس لیے گورنر بہار نے کانگریس کو وزارت تشکیل دینے کے سلسلے میں مدعو کیا؛ مگر چوں کہ گورنر بہار نے کانگریس کی جانب سے پیش کیے گئے شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا؛ اس لیے کانگریس بھی اس پیش کش کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہوئی۔ اب دوسری پارٹی جو کانگریس کے بعد اکثریت میں تھی، وہ ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' تھی، چناں چہ وزارت کی تشکیل کے لیے اسے ہی بلایا گیا، مولانا نے تشکیل وزارت سے قبل اراکین عاملہ کی میٹنگ طلب کی، میٹنگ کے شرکاء میں سے کچھ رائے تھی کہ وزارت بنالی جائے، جب کہ کچھ لوگوں کے خیالات اس کے برعکس تھے۔

بہ ہر حال: بعد بحث وتمحیص کے وزارت قبول کر لی گئی اور یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو مسٹر محمد یونس نے بہار کے ''وزیر اعظم'' کا حلف لے لیا، مولانا کی سرپرستی میں بنائی، مسٹر محمد یونس کی وزارت گو کہ ایک سو بیس ہی دن قائم رہ سکی اور گورنر بہار اور کانگریس کے درمیان مصالحت ومفاہمت کے بعد کانگریس نے وزارت قبول کرنے کی حامی بھر لی تو مسٹر محمد یونس کو وزارت عظمی سے مستعفی ہونا پڑا؛ مگر اس تھوڑی مدت اور قلیل عرصے میں ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' نے بہتیرے فلاحی کام انجام دیئے، جو تاریخ کے سنہرے اوراق کی زینت ہیں۔(۱۳)

مولانا کا سیاسیات میں آنے اور اسے ''منہ لگانے'' کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ احکام شرعیہ کا نفاذ کلی طور پر نہ سہی؛ لیکن کم از کم شعائر اسلام اور مسلمانوں کا تشخص حالات کی ستم ظریفی کے نذر نہ ہونے پائیں اور یہ پوری قوم اپنے مذہبی احکامات پر مکمل آزادی اور کسی آئینی بندش کے بغیر عمل کر سکے، اس ''آزادی'' کے لیے مولانا کی دور رس نگاہ میں اس کے علاوہ کوئی کوئی سبیل نہ تھی کہ باہر سے غل غپاڑہ مچانے کے بہ جائے باضابطہ سیاست میں شمولیت اختیار کی جائے اور پوری ثبات قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتخابات میں اپنے امیدوار کھڑے کیے جائیں تا کہ ان کے ذریعہ مسلمانوں کے آواز کی دھمک ایوان حکومت کے بلند وبالا دیواروں پر بھی محسوس کی جا سکے اور مسلمانوں پر پڑنے والی آئینی زد کا مداوا بھی بسہولت ممکن ہو سکے ورنہ یوں ہی صرف شور شرابہ کا رویہ اپنانے سے:

کون سنتا ہے فغان درویش؟

مولانا سیاست کی باگ علماء کے ہاتھوں میں دیکھنا چاہتے تھے اور انہیں بہ خوبی اس کا علم

تھا کہ علماء ہی میدان سیاست میں قوم کی بہترین رہ نمائی وسر براہی کا فریضہ سرانجام دے سکتے ہیں۔خدا مغفرت کرے شاعر مشرق کی کہ وہ اگر مولانا کی ذات'ان کے عزائم' منصوبوں اوران کے سیاسی کارناموں سے واقف ہوتے توانہیں ہرگز یہ نہ کہنے کی زحمت نہ کرنی پڑتی کہ:

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
کیا جانیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام؟

کیوں کہ کہ مولانا بہ یک وقت ''دو رکعت کے امام'' بھی تھے، بوریہ نشیں مدرس بھی اور میدان سیاست کے سرخیل بھی!

مولانا کے سیاسی تبحراورآئین پر بے پناہ دست رس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ مولانا شفیع داؤدی اور مولانا کے فکری اختلاف کی وجہ سے حالات کچھ سنگین سے ہوتے چلے گئے اور بعض حضرات کے مطابق یہ اختلافات رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی مخالفت کی صورت اختیار کرتے چلے جارہے تھے؛اس لیے پٹنہ کے کچھ مخلصین نے اس صورت حال سے نمٹنے اوراس الجھتے معاملے کوسلجھانے کی غرض سے باہمی مصالحت کی راہ نکالنی چاہی اوراس کے لیے دونوں یعنی مولانا ابولمحاسن اورمولانا شفیع داؤ دی کوایک جگہ مدعو کیا اور دونوں حضرات سے یہ کہا گیا کہ ''آپ آپسی گفتگو کے ذریعہ ایک دوسرے کے نقطہائے نظر سے واقف ہوں؛ تا کہ یہ اختلافات ختم ہوں اوراسی بحث وتمحیص کے ذریعہ مسلمانان ہند کے لیے کوئی اچھی سی راہ نکل سکے''،مجمع اچھا خاصا تھا،جس میں ایک معتد بہ تعداد ذی فہم،صاحبان بصیرت حضرات کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کی بھی تھی، یہ ''مصالحتی مجلس'' ڈاکٹر سید عبدالحفیظ فردوسی کے کوششوں کا ثمرہ تھی،حقیقی معنوں میں وہی اس کے منتظم اعلی تھے اور یہ مصالحتی کوشش ان ہی کی ذہنی اپج تھی، گفتگوشروع ہوئی تو ''زلف لیلیٰ'' کی طرح دراز سے درازتر ہوتی چلی گئی اور جس گفتگو کا آغاز عشائیہ کے بعد ہوا تھا، وہ فجر تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد کرنے میں کام یاب نہ ہو پائی تھی،مجمع اب بھی پورے سکون ووقاراورنہایت دل چسپی کے ساتھ فریقین کے موقف کی درستگی اوردلائل کی قوت کے پرکھنے میں مصروف تھا۔مولانا شفیع داؤ دی کواس وقت لاہور کا سفر درپیش تھا کہ دوران گفتگواسی سلسلے میں دنیا کے دیگر ممالک کے سیاسی نظام کی طرف بات چل پڑی،مولانا شفیع داؤ دی اس کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے کہ مولانا نے ٹوکا اور پھر ہندوستان نہیں؛ بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک کے آئین وقوانین کے بارے میں بتلانا شروع کیا کہ فرانس کا نظام یہ ہے، اٹلی میں یہ قانون چلتا ہے،

امریکہ میں یہ آئین نافذ ہے، ترکی کیا ندر یہ سسٹم رائج ہے اور مولانا تھے کہ بے تکان بس بولتے ہی چلے جارہے تھے، مجمع حیرانی واستعجاب کی تصویر بنے انہیں دیکھ رہا تھا۔''کانسٹی ٹیوشن'' کے متعلق معلومات سے پراس گفتگو کو سن کر نہ صرف وہاں موجود سننے والوں کو بلکہ مولانا شفیع داؤدی کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ مولانا صرف ایک روایتی عالم اور مذہبی معلومات پر اکتفاء کرنے والی شخصیت نہیں ہیں؛ بلکہ آپ کی دقیقہ رس نگاہ اقوام عالم کے اصول وقوانین پر بھی زبردست گرفت رکھتی ہے، آپ کی گفتگو کے اس رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ:

انگشت بہ دنداں ہیں زمیں چاند ستارے (۱۴)

مولانا کی سیاست ہمیشہ شریعت کے آگے دست بستہ کھڑی رہتی، کبھی بھی کسی بھی موقع پر ان کی سیاست ان کے شریعت پر غالب نہیں ہوسکتی تھی؛ بلکہ شریعت پر حملہ آور ہونے کو سوچ بھی نہیں سکتی تھی، آپ کی سیاست منافقت، کذب بیانی اور فریب کاری اور مداہنت کے رہین منت نہیں تھی؛ بلکہ ہر موقع پر آپ نے:

آئین جواں مردی حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اور

ہزار خوف ہو، لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

کا عملی ثبوت پیش کیا۔ آپ حق بات کہنے میں کبھی کسی ''مصلحت'' کے شکار نہیں ہوئے؛ بلکہ تمام ''مصلحتوں'' کو بالائے طاق رکھ کر حقائق کو بیان کرنے میں کسی پس وپیش اور لومۃ لائم کی پرواہ کئے بنا زبان حال سے:

جو سچ سمجھتا ہوں وہی بولنے کا عادی ہوں
میں اپنے ''شہر'' کا سب سے بڑا ''فسادی'' ہوں

کہتے رہے۔

انہوں نے ان بیرسٹروں کو بھی دنداں شکن جواب دیا، جنہوں نے سیاست پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور میدان سیاست کے تمام حصوں پر ''ریز رو'' کا بورڈ لگا کر خود اس پر قابض رہنا چاہتے تھے، انہوں نے ایسے وقت میں نہ صرف سیاست کے رخ کو تبدیل کر دیا؛ بلکہ ایک نئ

طرح ڈالی، جب کہ علما کے لیے سیاست کو ''شجر ممنوعہ'' قرار دے دیا گیا تھا اور مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کی زبان میں ''ایک بڑا گروہ نام نہاد دانش مندوں کا تھا، جس نے سیاست کا حق ان بیرسٹروں کے لئے خاص کر رکھا تھا، جو انگلستان سے چودہ ڈنر کھا کے آئے ہوں۔''

یہ تھی مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ والرضوان کے ملکی وملی کارناموں اور خدمات کی مختصر روداد ادنی جھلک اور معمولی سا عکس، ورنہ:

طویل عمر درکار ہے اس کے پڑھنے کو
''ہماری'' داستاں اوراق مختصر میں نہیں

مولانا کی حیات بابرکات نہ صرف قابل صد ستائش ہے؛ بلکہ ان کی بلند و بالا ذات لائق تقلید بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ دیدہ وروں نے ان کی سیاسی بصیرت کو دیکھ کر اسی وقت کہہ دیا تھا کہ:

غبار راہ سے کہہ دو سنبھالے نقش قدم
زمانہ ڈھونڈے گا پھر ان کو رہ بری کے لئے

مصادر و مراجع

(۱) ''حیات سجادؒ''۔صفحہ:۶۵،۶۴
(۲) ''حیات سجادؒ''۔صفحہ:۴۰
(۳) ''حیات سجادؒ''۔صفحہ:۴۱
(۴) ''حیات سجادؒ''۔صفحہ:۱۷
(۵) ''حیات سجادؒ''۔صفحہ:۱۸
(۶) ''مقالات سجادؒ''۔صفحہ:۲۵۶
(۷) ''حیات سجادؒ''۔صفحہ:۵۶،۵۵
(۸) ''مقالات سجادؒ''۔صفحہ:۲۵۷
(۹) ''مقالات سجادؒ''۔صفحہ:۲۵۸
(۱۰) ''مقالات سجادؒ''۔صفحہ:۲۵۹
(۱۱) ''مولانا سجاد نمبر'' (ہفت روزہ ''نقیب''، پھلواری شریف، پٹنہ) صفحہ:۷۲
(۱۲) ''فریڈم موومنٹ ان انڈیا'' جلد: دوئم، صفحہ:۲۸۲
(۱۳) ''مقالات سجادؒ''۔صفحہ:۲۶۳
(۱۴) ''حیات سجادؒ''۔صفحہ:۱۰۵

تحریک خلافت اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ

(ولادت ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء۔وفات ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء)

مفتی محمد خالد حسین نیموی قاسمی

ناظم تعلیمات مدرسہ بدرالاسلام بیگوسرائے بہار، سابق معین المدرسین دارالعلوم دیوبند یوپی

خلافت کی حقیقت اور اس کی شرعی حیثیت:

خلافت کے لفظی معنی نیابت کے ہیں؛یعنی کسی کا نائب ہونا۔ اصطلاحِ شریعت میں خلافت اُس اقتدارِ عمومی کا نام ہے، جو معاشرے میں اقامت دین کا اہتمام کرے، امن وامان کا بندوبست کرے، لوگوں کو انصاف فراہم کرے، احکام اسلام کے نفاذ کی ذمہ داری قبول کرے اور فریضۂ جہاد کی ادائیگی کا اہتمام کرے، بالفاظِ دیگر وہ مسلم حکم راں'' خلیفہ'' کہلاتا ہے، جو مسلمانوں کی اجتماعی یا ریاستی وحکومتی امور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کرتے ہوئے سرانجام دیتا ہے۔

اللہ تعالی نے انسان کو روئے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا؛ تاکہ وہ اللہ تعالی کے احکام اور اس کے نظامِ عدل کو دنیا میں نافذ کرے اور فتنہ وفساد کا خاتمہ کرکے ایسی مامون فضا اور راحت بخش ماحول قائم کرے، جس میں بندگانِ خدا آزادی اور اطمینان کے ساتھ اپنے خالق ومالک کی عبادت کرسکیں، ایسے نظام کو خلافت یا امارت اور اس نظام کے سربراہ کو خلیفہ، یا امیر کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے'' خلافت'' کا لفظ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے لیے استعمال فرمایا ہے۔اللہ تعالی نے فرشتوں سے فرمایا:

﴿انّی جَاعِلٌ فِی الأرضِ خَلِیفَة﴾ (۱) کہ میں روئے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اس کائنات ارضی کا نظام اللہ تعالی نے نسل انسانی کے سپرد فرمایا ہے اور وہ اس نظام کو چلانے میں اللہ تعالی کا نائب ہے۔مشہور نبی حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے بھی اللہ تعالی نے خلیفہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے:

﴿يا داؤدُ انّي جَاعِلُکَ فِي الارضِ خَلِيفَة، الخ﴾ (۲) یعنی اے داؤد! ہم نے تم کو روئے زمین میں خلیفہ بنایا، پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کیا کرو اور نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا، ورنہ وہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ نسل انسانی اس دنیا میں آزاد اور خود مختار نہیں ہے؛ بلکہ نائب اور خلیفہ ہے؛ جو اپنے دائرہ کار اور اختیارات میں متعین کردہ حدود اور اُس آسمانی ہدایات کی پابند ہے، جو حضرات انبیاء کرام کے ذریعے سے نازل ہوئیں اور جو ''دین'' کی صورت میں حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوگئی۔ اسلام کا شرعی قانون یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ وامیر ہونا چاہیے، جو شریعت کے اجرا ونفاذ اور تحفظِ مسلمین کی پوری قدرت رکھتا ہو، نیز دشمنوں سے مقابلہ کے لیے پوری طرح طاقت ور ہو۔ (۳) جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں خلیفہ اور امیر کے بارے میں ہدایت فرمائی ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم کی ایک روایت میں خلافت کے سسٹم کو اس طرح بیان فرمایا کہ: ''بنی اسرائیل میں نبوت کے ساتھ سیاسی قیادت بھی انبیاء کرامؑ کے ہاتھ میں تھی، جب ان میں سے کسی نبیؑ کا وصال ہوجاتا تو دوسرے نبی ان کی جگہ لے لیتے تھے؛ لیکن چوں کہ میں خاتم النّبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے؛ اس لیے میری جگہ میرے خلفاء ہوں گے۔ (۴)

یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء کرام نے ''خلافت'' کے قیام کو واجب قرار دیا ہے۔ علامہ ابن حجر مکیؒ نے اپنی کتاب ''الصواعق المحرقة'' میں اسے ''اہم الواجبات'' فرمایا ہے؛ یعنی وہ تمام واجبات میں سے اہم واجب ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے نزدیک یہ واجب اس قدر اہمیت رکھتا تھا کہ انھوں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین سے بھی مقدم سمجھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد امت کا سب سے پہلا اجماع اسی خلافت کے مسئلہ پر ہوا تھا، پہلے خلیفہ کا انتخاب ہوا، پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین ہوئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی شاہکار تصنیف ''ازالۃ الخفاء'' میں خلافت کو قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ قرار دیا ہے؛ یعنی دنیا بھر میں اگر کسی بھی حصہ میں خلافت کا نظام موجود نہ ہوتو دنیا بھر کے مسلمان گنہہ گار قرار پائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس حالت میں مرگیا کہ اس کی گردن میں بیعت نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ (۵)

حضرتِ دہلویؒ یہاں بیعت سے خلافت کی بیعت مراد لیتے ہیں اور اسے ہر مسلمان کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔قرآن کریم کے بہت سے احکام کا نفاذ حکومت کے قیام پر موقوف ہونا، اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ ایک ایسی حکومت موجود ہو، جو قرآن وسنت کے احکام کے نفاذ کو اپنی ذمہ داری سمجھتی ہو؛اس لیے کہ جو چیز کسی فرض کی ادائیگی کے لیے ضروری ہو، وہ خود بھی فرض ہو جاتا ہے۔مسلم معاشرہ میں ارکانِ اسلام کا قیام، جہاد کا اہتمام، نظام قضا کا قیام، امن عامہ کی استواری اور علوم اسلامیہ کا احیاسب فرائض ہیں اور ان فرائض کی ادائیگی خلافت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں؛اس لیے خلافت کا قیام بھی مذکورہ بالا مقاصد کے لیے اسی طرح فرض ہے،جس طرح نماز کے لیے وضو فرض ہے۔

خلافت کی سیاسی اھمیت :

خلافت اگر چہ ایک شرعی حکم ہے؛لیکن اس کے دنیوی فوائد بھی بے شمار ہیں۔سیاسی نقطہ نظر سے بھی اس کے بڑے فوائد ہیں، اس لفظ میں اللہ تعالی نے ایک دبدبہ رکھا ہے، جو عام طور پر دشمنوں کے دلوں پر آخری حد تک قائم رہتا ہے، اس کی سیاسی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، جسے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے حوالہ سے بیان کیا جاتا:

’’جن دنوں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ تحریک ریشمی رومال چلانے کے الزام میں مالٹا میں قید تھے، ان کے ساتھ ان کے شاگرد حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی قید تھے۔اتفاق سے ایک انگریز افسر بھی کسی جرم میں وہاں سزا کاٹ رہا تھا۔یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ترکی کی خلافت عثمانیہ تقریباً چھ سو سالوں تک عالم اسلام کی بے نظیر قیادت وحکمرانی کے بعد اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔برطانیہ، فرانس، اور اٹلی سمیت پورا یورپ اس خلافت کے خاتمہ کے لیے سازشوں میں مصروف تھا۔ایک روز ملاقات میں حضرت مدنیؒ نے اس انگریز فوجی افسر سے پوچھا کہ آپ لوگ ایک کم زور، جان بلب، برائے نام سی حکومت کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ آخر آپ لوگوں کو خلافت عثمانیہ سے کیا خطرہ ہے ؟اس نے جواب میں کہا کہ جناب! بات اتنی آسان نہیں ہے؛جتنی آپ کہہ رہے ہیں، یہ درست ہے کہ خلافت عثمانیہ اس وقت ایک کمزور سی حکومت ہے، جس کی شان وشوکت اور رعب ودبدبہ قصۂ پارینہ ہو چکا ہے؛لیکن ایک قوت اس کے پاس اب بھی موجود ہے اور وہ ’’خلافت‘‘ کا لفظ ہے اور’’امیر المومنین‘‘ کی اصطلاح ہے؛ کیوں کہ خلیفہ کے لفظ میں آج بھی اتنی طاقت ہے کہ اگر خلیفہ کی طرف سے دنیا کے کسی خطہ میں کسی کافر قوم کے خلاف جہاد کا

اعلان ہوجائے تو دنیا بھر کے مسلم نوجوانوں میں ہلچل مچ جاتی ہے اور ایک جذباتی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، ہم اس قوت سے خائف ہیں اور اسے ختم کرنا چاہتے ہیں''۔(٦)

مذکورہ سطور سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خلافت اسلامی دبدبہ اور شان وشوکت کی علامت ہے، خلافت گویا اسلام کی روح اور مذہب کی بنیاد ہے؛ اسی لیے خلافت کا مسئلہ شروع ہی سے عالم اسلام کا اہم مسئلہ بنا رہا ہے۔ خلافت کا قیام اور اس کی بقا کو مسلمانوں نے ہمیشہ اپنا مذہبی فریضہ جانا، جب ہلاکو نے بغداد پر حملہ کیا تو علامہ ابن تیمیہؒ اپنے عبادتی اور تصنیفی گوشہ سے باہر آکر شمشیر بدست اس کی حفاظت کے لیے میدان جہاد میں کود پڑے، علامہ ابن کثیرؒ اس قلیل مدت میں جب طوفانِ ہلاکو کے بعد کچھ دنوں کوئی خلیفہ نہیں تھا، نہایت رنج کے ساتھ ہر سال کے شروع میں یہ تحریر کیا کرتے تھے کہ افسوس اس وقت عالم اسلام کا کوئی خلیفہ نہیں ہے۔

دنیا کی بہترین خلافت:

دنیا کی بہترین خلافت جو سو فیصد نبوی بنیاد اور طریقۂ رسولؐ پر قائم تھی، وہ خلافت راشدہ تھی، خلافت راشدہ کا دور تیس سال تک چلا، بعد میں ان کڑی شرائط کے حامل افراد موجود نہیں رہے؛ اس لیے خلافت راشدہ کے بعد اس کی جگہ خلافت عامہ کا دور شروع ہوا، جن پر خلافت راشدہ کا اطلاق نہیں ہوتا؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ خلافتیں غیر اسلامی تھیں؛ بلکہ یہ خلافتیں بھی اسلامی تھیں، جنھیں علمائے امت نے ہر دور میں تسلیم کیا، ان خلافتوں میں قابل ذکر خلافت بنو امیہ (۹۰ سال)، خلافت عباسیہ (۷۵۰ء-۱۲۵۸ء تقریباً ۵۰۰ سال) اور خلافت/سلطنت سلجوقیہ (۱۰۷۷-۱۳۰۷ء) اور خلافت عثمانیہ (از ۱۲۸۲ء تا ۱۹۲۴ء) ہیں۔ خلافت راشدہ کا دار الحکومت مدینہ منورہ اور کچھ عرصہ کے لیے کوفہ تھا، بنو امیہ کا دار الخلافۃ دمشق رہا، بنو عباس نے بغداد کو اپنا دار الخلافۃ بنایا اور بنو عثمان کا دار الخلافہ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد اسی شہر میں ۱۹۲۴ء تک قائم رہا۔

ترکی کی خلافت عثمانیہ اور صلیبی طاقتوں کی سازشیں:

اخیر کی صدیوں میں خلافت اسلامیہ کا منصب ترکی کے سلاطین عثمانیہ کو حاصل رہا اور عام طور پر مسلمانان عالم نے انھیں کو اپنا خلیفہ اور امیر سمجھا اور ان کی اطاعت واعانت کو اپنا فرض جانا، چوں کہ حرمین شریفین، بیت المقدس، آثار قدیمہ بغداد، نجف اشرف، کربلائے مُعلیٰ وغیرہ تمام مقامات مقدسہ کی حفاظت ونگہداشت اور اس کا نظم وانتظام بھی ترکی کے عثمانی خلفاء کے سپرد تھا، جو خلیفہ وحکمراں ہونے کے باوجود اپنے کو ''خادم الحرمین الشریفین'' کہتے تھے، خلافتِ عثمانیہ اسلامی

تاریخ کی چوتھی بڑی خلافت تھی، اس میں تقریباً ۶۴۲ رسال (از ۱۲۸۲ء تا ۱۹۲۴ء) کل ۳۷ حکم راں مسند آرائے سلطنت ہوئے، جن میں شروع کے آٹھ حکم راں صرف سلطان تھے، انھیں خلافت کا روحانی منصب حاصل نہ تھا، نویں حکم راں سلطان سلیم اول سے لے کر چھتیسویں حکم راں سلطان وحیدالدین محمد سادس تک تیس (۳۰) حضرات سلطان بھی تھے اور خلیفہ بھی تھے؛ کیوں کہ خلافت عباسیہ کے آخری حکم راں نے سلطان سلیم کو منصب واعزاز خلافت کی سپردگی کے ساتھ وہ تبرکات نبویہ بھی بطور سند و یادگار دے دیئے تھے، جو کہ خلفائے بنوعباسؓ کے پاس نسل در نسل چلے آرہے تھے، یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو جب مصطفیٰ کمال پاشا نے مغربی طاقتوں کے اشارے پر ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کی قرار داد منظور کر کے خلیفہ اسلام محمد وحیدالدین ششم کے اٹلی کی طرف ملک بدری کے احکام جاری کردیئے تو اس نامبارک دن سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا، اس کے بعد عبدالمجید آفندی کو آخری عثمانی خلیفہ بنایا گیا؛ مگر ۳ مارچ ۱۹۲۴ء ترکی کی قومی اسمبلی نے اپنے اسلام دشمن آقاؤں (فری میسن) کے حکم پر اسلامی خلافت کے خاتمہ کا قرارداد بھی منظور کرلیا، اس طرح آخری خلیفہ عبدالمجید کے پہلے سوئزرلینڈ پھر فرانس جلا وطنی کے ساتھ ہی خلافت عثمانیہ کے سقوط کا المناک سانحہ پیش آگیا۔ (۷)

خلافت عثمانیہ سے مسلمانوں کا جذباتی لگاؤ:

خلافت عثمانیہ سے مسلمانوں کو جذباتی لگاؤ تھا، اس کے علاوہ عالمی طور پر نئے سیاسی منظر نامہ اور نئی عالمی قطب بندی کے پس منظر میں مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات پیوست ہوگئی تھی کہ ترکی کی بقاء اسلام کی بقاء کی علامت ہے، اگر خدانخواستہ خلافت اسلامیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل ہوگیا تو مسلمانوں کی کوئی عزت اور قدر ومنزلت دنیا میں باقی نہیں رہے گی اور مسلمان دنیا کے صحرائے ریگ زار میں ایک گم کردہ راہ کارواں کی شکل اختیار کرلیں گے۔

برطانیہ مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے میں سب سے آگے تھا، اس نے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر کرنے کا پورا سامان کرلیا تھا، مصر پر انگریز کا آہنی پنجہ گڑا ہوا تھا، ایران روس اور برطانیہ کا غلام ہوچکا تھا، مراقش پر فرانس قابض تھا، ترکی طرابلس المغرب (تریپولی) کا صوبہ افریقہ میں کھوچکا تھا، ترکی ایک مرد بیمار کی طرح اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا، ترکی اور کل یورپ کی پانچ سوسال کی جنگ سب کے نظروں کے سامنے تھی، جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں مسلمانان ہند نے جو جوش اور ولولہ اور ایثار وقربانی کا مظاہرہ کیا، وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ خلافت کا زوال مسلمانوں کے

برداشت سے باہر ہے، جنگ طرابلس کے موقع پر علامہ اقبالؔ نے ایک انقلابی نظم کہہ ڈالی، جس کا ایک مصرع تھا:

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اسی طرح اس شعر کو بھی بڑی شہرت ملی جو اس موقع کے لیے کہا گیا تھا، آج تک زبان زد خاص وعام ہے۔

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا ٹوٹا
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

دوسری طرف صورت حال یہ تھی کہ صلیبی طاقتیں استعماریت کے ذریعہ لوٹ کھسوٹ اور مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے میں مصروف تھی، انگریزوں کی اسلام دشمنی دن بدن آشکارا ہوتی جارہی تھی، ۱۹۱۴ء سے قبل ہی انگریز نے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر کر کے اس کو نیست ونابود کرنے کا پورا منصوبہ بنالیا تھا، پھر جب جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے ذریعہ خلافت اسلامیہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے کی تیاری ہونے لگی اور جنگ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد برطانیہ نے خلافت کے حوالہ سے مسلمانوں سے جو وعدہ کیا تھا، اس سے مکرنے لگا۔ اس صورت حال نے عوام وخواص ہر طبقہ میں اضطراب پیدا کردیا، ہر طرف مایوسی کی کیفیت چھانے لگی۔

ہندوستانی مسلمان ترکی کے معاملہ کو تحفظ اسلام اور تحفظ خلافت مرکزیہ کا مسئلہ سمجھ کر اسے اپنی قومی زندگی کا مسئلہ سمجھتے تھے، برطانیہ کی طرف سے خلافت عثمانیہ کی اس توہین وتذلیل پر ردعمل کے طور پر ہندوستان میں ہر طرف زبانی وتحریری آہ وفغاں، پھر اس پر اشک سوئی کا سماں بندھ گیا؛ لیکن مسلماں سرگرداں تھے، انھیں راہ عمل کی تلاش تھی اور راہ عمل وحی الٰہی کی طرح ایک دم سے نازل نہیں ہوتی؛ بلکہ بہت ٹھوکریں کھانے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ اس وقت کے حالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ رقم طراز ہیں:

''مسلمانوں کو اندرونِ ہند کی سیاست سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی، ان کی دل چسپی کا اصل مرکز بیرونی سیاست میں خلافت عثمانیہ تھی، جس سے مسلمان دنیا میں اپنی ملی عزت واحترام کو وابستہ سمجھتے تھے اور جس کا سلطان، حرمین محترمین کا خادم اور اسلامی مقاماتِ مقدسہ کا محافظ تھا۔ حوادث واتفاقات ایسے پیش آئے کہ ۱۹۰۸ء میں خلافت عثمانیہ میں

انقلاب پیش آیا۔ نوجوان ترکوں کی خفیہ تدبیریں کامیاب ہوئیں اور انور بے وغیرہ نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرکے دستوری حکومت کا اعلان کردیا اور یہی وہ وقت تھا جب یورپ کی سلطنتوں نے مل کر یہ چاہا کہ ترکی حکومت کے حصے بخرے کرلیں، اس کے مطابق چند ہی روز بعد اٹلی نے دولت عثمانیہ کے آخری افریقی مقبوضہ طرابلس الغرب (ترپیولی) پر حملہ کردیا، اس حملے نے سارے دنیائے اسلام میں آگ لگا دی، خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ اس میں حصہ لیا اور شبلی اور اقبال جیسے شعراء باکمال نے اپنے ترانوں کے سے مسلمانوں کو گرمایا۔ اقبال کا یہ شعر اب بھی زمانے کو یاد ہوگا:

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ابھی وہ یہ صدمہ بھولے بھی نہ تھے کہ ۱۹۱۰ء میں بلقان کی ریاستوں نے یورپ کی سلطنتوں کی شہ پاکر ایک ساتھ مل کر دولت عثمانیہ کے یورپی حصوں میں بغاوت کردی اور جنگ بلقان کا آغاز ہوا، یہ جنگ کے شعلے اگرچہ یورپ میں اٹھ رہے تھے؛ مگر ہندوستان کے مسلمانوں کا جوش وخروش دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جنگ ہندوستان میں لڑی جارہی تھی۔ چندسال بعد یہ جنگ اس طرح ختم ہوئی کہ ترکوں کے ہاتھ سے یورپ کا بڑا حصہ نکل گیا، اس کے چار سال بعد ۱۹۱۴ء میں خود یورپ کی سلطنتوں میں جنگ شروع ہوگئی، روس جرمنی اور اسٹریا ایک طرف اور انگلینڈ فرانس اور اٹلی دوسری طرف، اس جنگ کے چند ماہ بعد ٹرکی نے نومبر ۱۹۱۴ء میں جرمنی کے ساتھ ہوکر اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا، اس وقت انگریزی حکومت نے ایک طرف اپنی مسلمان رعایا کی تسکین کی خاطر یہ اعلان کیا کہ اسلام کے مقدس مقامات حملہ سے محفوظ رہیں گے۔ دوسری طرف انھوں نے اس جنگ کے جیتنے کے لیے عجیب وغریب سازش کی۔ انھوں نے ترکوں سے عربوں کو الگ کرنے کے لیے شریف حسین امیر مکہ کو اپنے ساتھ ملا کر اور ایک عرب شہنشاہی کا خواب دکھا کر، جو بحر احمر سے لے کر بحر روم تک محیط ہوگی، ترکی حکومت سے بغاوت کا اعلان کرادیا اور اس لالچ میں عربوں کو ترکوں سے لڑانے کے لیے عراق وشام اور حجاز کے میدانوں میں کھڑا کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ عراق اور شام اور فلسطین اور حجاز دولت عثمانیہ سے الگ ہوکر اتحادیوں

کے قبضے میں چلے گئے، ان ممالک اسلامیہ کا احترام جو روزِ اول سے مسلمانوں میں تھا، اس کے لحاظ سے ان کے دل کو سخت چوٹ لگی۔ دوسری طرف انگریز جرمن کے یہودیوں کو فلسطین کی نذر پیش کر کے سارے یورپ کے یہودیوں کو اپنے ساتھ ملا رہے تھے اور آخر یہودیوں نے جرمن کے خلاف سازش کر کے اس کو تباہ کر ڈالا اور اس کے بدلہ میں فلسطین کے یہودی قومی وطن بنائے جانے کا اعلان انگریزی حکومت سے کرایا۔ ہندوستان کے مسلمان اس صورت حال کو انگریزوں کے اس صریح اعلان کے خلاف سمجھتے تھے، جس کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں سے ان کے مقدس مقامات کے محفوظ رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس صورت حال سے ساری دنیائے اسلام میں زلزلہ برپا تھا''۔(۸)

لیکن ان سیاہ بادلوں میں امید کی کرن بھی تھی؛ مصلحین امت میں جو زیادہ تر روشن خیال علماء تھے؛ برابر حالات کو سدھارنے کے لیے آواز لگا رہے تھے، ان میں ایک نمایاں نام سید جمال الدین افغانیؒ (۱۸۳۸ء۔۱۸۹۷ء) کا ہے، اس صاحبِ بصیرت نے قبل سے ہی حالات کو بھانپ کر افغانستان سے لے کر مصر تک ایران عرب اور ترکی تمام بلاد مسلمین کو روند ڈالا، ان کا پیغام اتحاد اسلام کا تھا، جسے ''پان اسلام ازم'' کا نام دے کر انگریزوں نے بدنام کیا، اتحاد کا منشا صرف یہ تھا کہ اسلامی سلاطین اپنے اندر اصلاح پیدا کریں اور قرآن کے قانون پر عمل پیرا ہوں، جن ملکوں میں اسلامی حکومت نہیں ہے، وہاں مسلمان حب الوطنی کے جذبے کے ساتھ روشن خیالی سے اپنے کو دین کا متبع بنائیں اور آزادی حاصل کریں اور سب مل کر ایک ''مرکزی خلافت اسلامیہ'' قائم کریں؛ تاکہ یورپ کے دست برد سے محفوظ رہ سکیں اور جو خطرہ بلاد اسلامیہ اور اسلامی مقدسات کو لاحق ہیں وہ دور ہوسکیں۔

یہی تعلیم ہندوستان کے مجاہد اعظم اور صاحب فراست شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی تھی جو ہندوستان کے اول درجہ کے قائد تھے، جنھوں نے تمام بلاد اسلامیہ میں اصلاح اور حصول قوت وشوکت کا ایک زبردست کام جاری کر رکھا تھا۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی:

''شیخ الہندؒ انگریزی حکومت اور اقتدار کے سخت ترین مخالف تھے، سلطان ٹیپو(۱۷۵۰ء۔ ۱۷۹۹ء) کے بعد انگریزوں کا ایسا دشمن اور مخالف دیکھنے میں نہیں آیا۔ ۱۹۱۲ء جنگ بلقان کے زمانے میں شیخ الہند دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے روزانہ جہاد سے متعلق احادیث کا درس دیا کرتے تھے، جس سے طلبہ میں ایک عظیم جوش پیدا ہوا اور ایک

بڑی تعداد جہاد کے لیے آمادہ ہوگئی۔ حضرت شیخ الہند نے مسلمانوں کو ذلت وخواری اور پستی ونکبت سے نکالنے اور انگریزوں کے تسلط سے برصغیر ہندوستان؛ بلکہ پورے عالم اسلام کو نکالنے کی اپنے شاگردوں کے ساتھ جو تحریک چلائی تھی وہ ''تحریک ریشمی رومال'' کہلاتی ہے، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان سے لے کر افغانستان، روس، ترکی اور جزائر عرب کا ایک خفیہ جنگی اتحاد قائم کیا جائے اور اس راستے سے انگریز امپائر کو شکست دی جائے؛ لیکن اپنوں کی غداری اور بعض حکمرانوں کے نفاق کی وجہ سے تحریک کی بعض دستاویزات قبل از وقت انگریز گورنمنٹ کے ہاتھ لگ گئیں؛ جس کی وجہ سے یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکی اور اس تحریک کے قائد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ۱۹۱۷ء میں مکہ مکرمہ سے گرفتار کر لیے گئے اور انھیں بحیرۂ روم کے جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ اگر یہ تحریک کامیاب ہوجاتی تو خود انگریز کے بقول: فرنگی کو سمندر بھی پناہ نہیں دیتا''۔

اس پر آشوب دور میں کچھ بزرگوں نے اپنے بیان اور تحریر کے ذریعہ اس صورت حال پر تنقید کی مثلاً مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ مولانا شوکت علیؒ؛ تو انھیں انگریز حکمرانوں کی طرف سے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اور زبانوں پر تالے ڈال دیے گئے۔ اس پورے مرحلہ میں ہندوستان میں ایک جمود کی اور ناامیدی کی فضا مسلط تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی خودنوشت سوانح حیات ''انڈیا ونس فریڈم'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''الہلال کی اس کامیابی سے حکومت بھی پریشان ہوگئی، پریس ایکٹ کے تحت اس نے دوہزار روپے کی ضمانت طلب کی اور سوچا کہ اس سے الہلال کا لب ولہجہ دبایا جاسکے گا۔ اس طرح کی چھیڑخانیوں سے میں نے اپنے حوصلے پست نہیں ہونے دیئے۔ جلد ہی حکومت نے زرضمانت ضبط کرلی اور دس ہزار کی نئی زرضمانت طلب کی۔ یہ اقدام بھی جلد ہی بے اثر ثابت ہوا۔ اسی دوران ۱۹۱۴ء کی جنگ بھڑک اٹھی تھی اور ۱۹۱۵ء میں الہلال پریس ضبط کرلیا گیا، پانچ مہینے بعد میں نے البلاغ کے نام سے ایک نیا پریس شروع کیا اور اسی نام کا اخبار شروع کیا۔ حکومت اب یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ صرف پریس ایکٹ کے ذریعہ وہ میری سرگرمیوں کو روک نہیں سکتی۔ چنانچہ اس نے ڈیفینس آف انڈیا ریگولیشنز کا سہارا لیا اور ۱۹۱۶ء میں مجھے کلکتہ سے شہر بدر کردیا۔ پنجاب، دہلی، یوپی اور بمبئی کی حکومتیں اسی ریگولیشن کے تحت اپنے صوبوں میں

میرے داخلے پر پابندی لگا چکی تھیں، صرف ایک جگہ جہاں میں جا سکتا تھا، بہار تھی۔ سو میں رانچی چلا گیا۔ مزید چھ مہینوں بعد مجھے رانچی میں نظر بند کر دیا گیا اور ۳۱؍دسمبر ۱۹۱۹ء تک حراست میں رہا پہلی جنوری ۱۹۲۰ء کو مجھے بعض دوسرے قیدیوں اور نظر بندوں کے ساتھ شاہ انگلستان کے اعلامیہ کے تحت رہائی دی گئی"۔ (۹)

شب تاریک میں قندیل رہبانی مولانا سجاد:

ایسے حوصلہ شکن حالات میں "مردے از غیب بیروں آمد" کے مصداق حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد کو اللہ تعالی نے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بر پا کیا، یقیناً وہ اس شعر کا مصداق تھے:

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

مولانا کی ولادت سنہ ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں پنہسہ ضلع نالندہ میں ہوئی، حصول علم کے مراحل سے سنہ ۱۹۰۳ء میں فارغ ہوئے اور ۳؍جون ۱۹۰۵ء کو آپ کے سر پر دستار فضیلت سجائی گئی، ۱۲۹۹ء مطابق ۱۹۱۱ء میں مدرسہ انوار العلوم گیا قائم کیا اور عمر کی ساٹھ بہاریں دیکھ کر ۱۷ شوال ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸/نومبر ۱۹۴۰ء میں وفات پا گئے۔ آپ کی پوری زندگی نشیب و فراز اور جہد مسلسل سے عبارت ہے، اللہ تعالی نے آپ کو حساس قلب و نظر اور فکر رسا عطا فرمایا تھا، جس کے نتیجے میں آپ مستقل حالات حاضرہ کا تجزیہ کرتے تھے اور حالات پر کڑھنے کے ساتھ صورت حال کو بدلنے کے لیے تدابیر کیا کرتے تھے، الہ آباد اور پھر گیا میں تدریس کے زمانے میں آپ نے امت مسلمہ کی زبوں حالی کا بھر پور مشاہدہ کیا۔ آپ کے ایک شاگرد واجد علی خاں تھے، انگریزی کے ماہر وہ روزانہ انگریزی اخبارات سے اہم عالمی خبریں روزانہ مولانا سجاد کو سنایا کرتے تھے، جس میں عالم اسلام کی زبوں حالی، اندرون ملک افتراق و انتشار و دیگر تشویش ناک خبریں بھی ہوتی تھیں، جس سے مولانا سجادؒ کا دل و دماغ بری طرح متاثر ہوتا تھا، اس صورت حال کی ترجمانی کرتے ہوئے امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ فرماتے ہیں:

"اسی تاثر نے مولانا کے غور و فکر کے موضوع کو بدلا، وہ دماغ جواب تک برابر مختلف علوم و فنون کی باریکیوں پر صرف ہوا کرتا تھا اور وہ فکر جواب تک مشکل سے مشکل مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں کام آیا کرتی تھی، وہ مسلمانوں اور ہندوستان کے دیگر اہم مسائل تک بھی پہنچنے لگی اور درس و تدریس کے ساتھ دوسرے مسائل میں بھی غور و فکر ہونے لگا، ایک مصلح قوم

کی تمام خوبیاں پہلے سے موجود تھیں، ایسے دل ودماغ کے لیے مدرسہ کی چہار دیواری کافی نہیں ہوسکتی تھی، اسے وسعت کی ضرورت تھی، جب دوسرے مسائل سامنے آگئے تو وسعت مل گئی، پہلے مولانا کے سامنے مدرسہ، مدرسین، طلبا، یا اس کے ہمدرد لواحقین تھے، اب ان کی نگاہ کے سامنے دنیا میں بسنے والا ہر ایک مسلمان اور ہندوستان میں رہنے والا ہر ایک انسان تھا، پہلے ان کے دماغ کی خوراک مروجہ علمی گھر تھے، اب دنیائے اسلام میں عموما اور ہندوستان میں خصوصا روزانہ پیدا ہونے والے نئے نئے معاملات تھے، بس اب کیا تھا، مولانا نے وہ چیز پالی، جس کی ضرورت تھی، ضرورت ہی نہیں، جس کے لیے پیدا کیے گئے تھے، چند ہی روز کے غور وفکر کے بعد دماغ نے فیصلہ کیا اور صحیح فیصلہ کیا کہ درس وتدریس سے بھی زیادہ اہم ملک اور دین کے دوسرے کام ہیں''۔(۱۰)

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ یادرفتگاں میں تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا سجاد مدرسہ انوار العلوم کا جلسہ سال بہ سال کیا کرتے تھے اور اس میں علما کو بلاتے تھے اور ان سے تقریریں کراتے تھے، میرا خیال ہے کہ اکثر علما سے ان کی ملاقاتوں کا آغاز انھیں جلسوں سے ہوا، مجھے بھی ایک دو دفعہ ان جلسوں میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ان کو سیاسیات کا ذوق جنگ عظیم میں ترکی کی شکست اور ممالکِ اسلامیہ کی پراگندگی سے ہوا، وہ اس وقت الہ آباد میں تھے، ان کے ایک انگریزی داں شاگرد ان سے عربی پڑھنے آتے تھے، وہ اپنے ساتھ اردو اور انگریزی اخبارات لاتے تھے اور مولانا کو پڑھ کر سناتے تھے، یہ آگ روز بروز بھڑکتی چلی گئی، مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' کی تحریک نے بنگال کے قرب کے سبب بہار پر پورا اثر ڈالا تھا اور بہت سے علمانے ان کی تحریک پر لبیک کہا، ان میں مولانا سجادؒ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔رانچی کی اسیری کے زمانے میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ہم خیال وکارفرما علماء کی تلاش وتفتیش کا کام ایک مخلص کے سپرد کیا؛ انھوں نے جن علماء کا نشان دیا، ان میں ایک مولانا سجاد بھی تھے، جو اس وقت مدرسہ انوار العلوم گیا کی مسند درس پر تھے ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کی ترقی کے ساتھ ساتھ مولانا کا ذوق سیاست بھی بڑھتا گیا ۱۹۲۰ء میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی تحریک اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی تائید سے جب جمعیۃ العلماء دہلی کی بنیاد پڑی تو موصوف اس کے لبیک کہنے والوں میں سب سے اول تھے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے کتنے رفیق سفر تھک تھک کر اپنی جگہ بیٹھ رہے؛ مگر انھیں کی ایک ہستی تھی جو آخر تک جمعیۃ کے ساتھ لگی رہی؛ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انھیں کی

روح تھی، جو اس کے قالب میں جلوہ گر ہوتی رہی، بہار میں امارت شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت تھی، زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں، ۱۹۱۸ء میں ''معارف'' میں اس تحریک کو اٹھایا گیا اور اصلاحات کے سلسلہ میں اس کو پیش کیا گیا، پھر ۱۹۲۰ء میں یورپ سے واپسی کے بعد چاہا کہ اس کو تمام ہندوستان کا مسئلہ بنایا جائے؛ مگر اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علم برداروں نے اس کو کسی طرح بھی چلنے نہیں دیا؛ مگر بہار میں مولانا سجاد کی قوت عمل نے اس کو وجود کا قالب بخش دیا۔

ان کا وجود گو سارے ملک کے لیے پیام رحمت تھا؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ صوبہ بہار کی تنہا دولت وہی تھے، اس صوبہ میں جو کچھ تبلیغی، تنظیمی، سیاسی و مذہبی تحریکات کی چہل پہل تھی، وہ کل انھیں کی ذات سے تھی، وہی ایک چراغ تھا، جس سے یہ سارا گھر روشن تھا، وہ وطن کی جان اور بہار کی روح تھے، وہ کیا مرے کہ بہار مر گیا، مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا، جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ کے خطبہ میں میرے قلم سے ان کی نسبت یہ الفاظ نکلے تھے، جو پہلے مدح تھی اور اب مرثیہ ہے:

۱۳۴۳ھ کے اجلاس خاص مراد آباد کے موقع پر بھی مجھے یہ عزت عطا ہوئی تھی؛ مگر عین وقت پر وفد جدہ کی شرکت نے انکار پر مجبور کیا اور میں خوش ہوں کہ اس کی بدولت ایک خاموش ہستی بولی اور ایک بے زبان نے زبان کے جوہر دکھائے اور ایک ہمہ تن سوز و گداز نے کاغذ کے صفحوں پر اپنے دل کے ٹکڑے بکھیر دیئے، یہ بھی مولانا کی قوت جاذبہ تھی جو مختلف الخیال علماء اور مختلف الرائے سیاسی رہنماؤں اور قومی کارکنوں کو ایک ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کئے اور ایک شیرازہ میں باندھے ہوئی تھی''۔(۱۱)

مولانا سجاد کی سیاسی مہارت:

اللہ تعالی نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو بے پناہ علمی و عملی صلاحیتوں سے نوازا تھا؛ لیکن سیاسی مہارت وہ صفت تھی، جس میں آپ پورے ملک میں طاق تھے، اس صفت کا استعمال بھی آپ نے ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے لیے بھرپور انداز میں کیا اور اسی سیاسی بصیرت اور اصابت رائے کے ذریعہ آپ نے تحریکِ خلافت، جمعیۃ علماء، امارت شرعیہ اور مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کی کامیاب قیادت فرمائی، آپ کے اکثر معاصرین اور تلامذہ اس حوالہ سے رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ اس زمانے کے مشہور صاحب قلم محقق عالم دین حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ فرماتے تھے:

''ان کے علمی رسوخ سیاسی شعور اور دینی اخلاص کے جو تجربات تھے، وہ مجھے حیرت میں ڈالتے تھے، حالاں کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے علم دین کی بڑی بڑی شخصیوں تک پہنچنے کا موقع عطا فرمایا؛ لیکن ان تینوں شعبوں کی جامعیت اور وہ بھی اس پیمانے پر اپنے جاننے والوں میں سے کسی کے اندر نہیں پایا''۔(۱۲)

سینئر لیڈر اور وزیر جناب سید محمود (۱۳) کی شہادت ہے:

'' مولانا سجاد عام علما کی طرح محض ایک صاحب درس عالم نہیں تھے، تدبر اور ملکی مسئلوں کی گرفت میں وہ کسی بڑے سے بڑے سیاسی مدبر سے کم نہیں تھے اور تو اور خالص قانونی اور دستوری موشگافیوں میں بھی ان کا دماغ اس طرح کام کرتا تھا جیسے کسی معمولی فقہی مسئلہ کو سلجھانے میں۔ وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے پر جوش سپاہی اور جرنل تھے؛ لیکن ساتھ ساتھ اسلامی حقوق بلکہ پورے اسلامی نظام معیشت اور اسلامی قانون کے نفاذ کے بھی سرگرم داعی تھے اور اسی کے لیے وہ پچیس سال سے کچھ اوپر شب وروز سرگرم عمل رہے، امارت شرعیہ، جمعیۃ علماء اور دوسری تحریکیں سب اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھیں، مجھے وقف میں ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہے۔ بعض دفعات میں جہاں الجھاؤ پیدا ہوا اور سلیکٹ کمیٹی کے سرکاری وغیر سرکاری ممبران ہار مان چکے تھے۔ مولانا کے قانونی دماغ نے مسئلہ کو سمجھنے اور سلجھانے میں کوئی دقت والجھن محسوس نہیں کی اور جہاں کوئی تجویز یا ترمیم کی پیچیدگیاں پیش کی گئیں ان کے ناخن تدبیر نے الجھی ہوئی گتھیاں فوراً سلجھادیں''۔(۱۴)

اسلامی علوم کے عظیم اسکالر علامہ سید سلیمان ندویؒ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ان کا علم کتابی نہ تھا بلکہ آفاقی بھی تھا، معاملات کو خوب سمجھتے تھے ان کو بارہا بڑے معاملات اور مقدمات میں ثالث بنتے ہوئے دیکھا اور تعجب ہوا کہ وہ کیوں کر فریقین کو اپنے فیصلہ پر راضی کر لیتے تھے اور اسی لیے لوگ اپنے بڑے بڑے کام بے تکلف ان کے سپرد کر دیتے تھے؛ کیوں کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا بڑا عطیہ فکر رسا اور رائے صائب تھی، مسائل وحوادث میں ان کی نظر بہت دور تک پہنچ جاتی تھی اور حریف کی چالوں کی تہہ تک پہنچ جاتی تھی، باوجود تواضع وخاکساری کے اپنی رائے پر پوری قوت کے ساتھ جمے رہتے تھے اور ہٹ اور ضد کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ دلائل کی قوت اور مصالح کی طاقت سے وہ دوسروں

کومنوانے میں کامیاب ہوجاتے تھے''۔(۱۵)

مشہور مصنف مولانا منظور نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

''میں ان کو دور حاضر میں کم از کم طبقہ علماء میں اسلامی سیاست کا اعلیٰ ماہر سمجھنے لگا، میں صاف کہتا ہوں کہ پھر اس کے بعد سے آج تک اس باب میں حلقہ علماء میں کسی کی بھی عظمت وجلادت کا اس درجہ قائل نہیں ہوسکا واللہ العظیم اگر میرے بس میں ہوتا تو میں سیاسی کام کرنے والے کم از کم نوجوان علماء کے لیے تو فرض قرار دیتا کہ وہ پہلے کچھ دنوں حضرت مرحوم کی زیرنگرانی ٹریننگ حاصل کریں''۔(۱۶)

جمعیۃ العلماء کے پہلے ناظم اعلیٰ اور بعد کے صدر حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''بعض موقع پر میں نے اور انھوں نے (مولانا سجاد) ایک ماہ سے زائد سفر کیا اور مجھے ان کی ہم رکابی کا شرف حاصل رہا، اس بیس سالہ زندگی میں بارہا ان سے مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی فقہ حدیث قرآن تینوں چیزوں میں نے ان کی نظر کو وسیع اور علم کو مستحضر پایا''۔(۱۷)

مشہور اسلامی مصنف مولانا مسعود عالم ندویؒ لکھتے ہیں:

''اور حقیقت میں یہی یونیٹی بورڈ کے جلسے تھے جہاں مولانا کے سیاسی تدبر کا لوہا موافق اور مخالف سب ماننے پر مجبور ہوئے۔ یوں کہنے کو جمعیت کی پوری مجلس انتظامی موجود تھی، بورڈ میں اس کے نمائندے بھی موجود تھے۔ پر ''دماغ'' ایک تھا اور سب جسم محض کی حیثیت رکھتے تھے''۔(۱۸)

آپ کے ایک سخت سیاسی مخالف جناب راغب احسن صدر مسلم لیگ کلکتہ لکھتے ہیں:

''یہ مولانا سجاد کی عظمت کی دلیل ہے کہ وہ ایک غریب جھونپڑے میں پیدا ہوئے، عربی مدرسوں میں چٹائیوں پر تعلیم پائی، لیکن ایک ایسی سیاسی پارٹی کے بانی ہوئے جس میں ہزار عیب سہی؛ لیکن جس نے دینی امور میں ایک امیر شریعت کی تابعداری کی بیعت کی تھی اور جس کے نمائندے ان کی کارپردازی کی بدولت بہار کے اولین وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے، حالاں کہ خود بانی جماعت مولانا سجادؒ جھونپڑے میں پیدا ہوئے اور اسی میں فوت ہوئے''۔(۱۹)

مولانا سجاد جدید اسلامی ہند کے صف اول کے رجال دین وسیاست میں ممتاز مقام رکھتے تھے، وہ ان چند واقعی سیاسیین میں تھے، جن کو تحریک خلافت نے پردۂ گمنامی سے

ابھار کر ہندوستانی سیاست کے صف اول میں کھڑا کیا تھا؛ پھر وہ تحریک خلافت کے رہنماؤں میں اپنی اصابت رائے، سیاست دانی، معاملہ فہمی، نکتہ رسی، ذہانت، عملی صلاحیت، تنظیمی طاقت، کاردانی، کار پردازی، عزم واستقلال کے ساتھ ایک نصب العین کے لیے مسلسل یکسوئی سے محنت کرنے کی قابلیت، حالات وضرورت کے مطابق زمانہ کے ساتھ چلنے اور ساتھ دینے کی اہلیت کے لیے ممتاز تھے۔ مولانا سجاد علمائے ہند میں نہ صرف سب سے زیادہ سیاست حاضرہ کے ماہر تھے، بلکہ سب سے بڑے عملی سیاست کار بھی تھے''۔(۲۰)

انجمن علماء بہار کا قیام تحریک خلافت وجمعیۃ کی تمہید:

حضرت مولانا سجاد علوم اسلامیہ کی روشنی، تاریخ اسلام کے تجزیہ اور خدادا بصیرت سے مسلمانوں کے باہمی اختلاف وانتشار کو مسلمانوں کے عالم گیر زوال کا سبب سمجھتے تھے اور قیام خلافت وامارت کو ہندوستان ہی نہیں؛ بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے لازم اور شرعی ضرورت خیال کرتے تھے؛ مگر اس راہ میں ان کے باہمی اختلاف اور گروہی ومسلکی جھگڑے سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ وہ پوری امت کی شیرازہ بندی کلمہ طیبہ کی بنیاد پر کرنا چاہتے تھے ؛لیکن اس کے لیے علماء کرام کا اتحاد لازمی تھا۔ علماء ہی دراصل قوم وملت کے قائد ورہنما ہیں اگر وہ باہم متحد ہوجائیں، تو لازماً تمام مسلمان متحد ہوجائیں گے۔

چنانچہ اس عظیم کام کے لیے دور دراز کا سفر کیا، ہر مکتب فکر کے نامور علماء وقائدین کے پاس گئے، انھیں اتحاد ویکجہتی کا قرآنی پیغام یاد دلایا۔ انتشار وافتراق نے ملت کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تاریخ بیان کی۔ احادیث میں مذکورہ وعیدوں کا تذکرہ کیا اور پوری دردمندی کے ساتھ ان تمام کو جوڑتے رہے، بالآخر یہ تحریک کارگر ہوئی اور ۱۹۱۷ء میں انجمن علماء بہار کا قیام عمل میں آیا۔ مقصد یہ تھا کہ پورے بہار میں بھی اسی انداز کی تنظیم قائم ہو۔

حضرت مولانا سجاد خود اپنے ایک مکتوب میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس طرح انجمن علمائے بہار سرزمین ہند پر پہلی جمعیۃ تھی، جو یہاں قائم کی گئی؛ لیکن اس کے بعد مرکزی جمعیت علمائے ہند بھی قائم ہوئی اور مختلف صوبوں میں جمعیۃ علماء قائم ہوتی گئی اسی طرح بہت ممکن ہے، صوبہ بہار میں امارت شرعیہ اور امیر کے انتخاب کے بعد دوسرے صوبوں میں بھی یہ کام چل پڑے اور جس طرح جمعیۃ علماء بہار کے بعد جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی، اس طرح امیر الہند بھی بعد میں منتخب ہوجائے''۔(۲۱)

اسی حوالہ سے مولانا عبدالصمد رحمانیؒ سابق نائب امیر شریعت تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا نے مدرسہ انوار العلوم گیا کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ۳۰/صفر ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء میں پورے صوبہ کے علماء کو دعوت دی اور ان کی بڑی تعداد کو جمع کر کے انجمن علماء بہار کے نام سے ایک متحدہ تنظیم قائم کی اور بہار کے علماء، مشائخ اور ارباب حل وعقد کی اجتماعی شیرازہ بندی کر کے انھیں ایک مرکزی نقطہ اور ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع کیا اس انجمن کا مختصر لفظوں میں دو بڑا مقصد تھا۔ایک دعوت اسلامیہ اور دوسرے حفاظت حقوق ملیہ''۔(۲۲)

پھر انجمن کے قیام کے سات ماہ بعد انجمن کا پہلا باضابطہ اجلاس ۶/۵ /شوال ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء کو مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں منعقد ہوا۔اس سلسلہ میں مولانا عبدالصمد رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

''بالآخر مولانا کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہوا کہ مولانا علماء کو ایک جگہ مجتمع کرنے میں ایک راہ پر لگانے، نئے ڈھب، نئے طریقے اختیار کرنے میں، ماحول کے مقتضیات اور مواقع واحوال کی نامساعدت کے ساتھ کام کو بڑھانے اور اس کی اہمیت وافادیت کو منوانے میں کامیاب ہوگئے اور اسی سال شوال کے مہینے میں علماء کی جمعیۃ کا پہلا اجلاس بہار شریف میں کیا، جس میں صوبہ کے پچاس علماء شریک ہوئے جس میں صوفیا اور مقتدر حضرات بھی تھے''۔(۲۳)

سچ ہے: ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' کے مصداق حضرت نے جو فرمایا تھا، وہ بالکل سچ ثابت ہوا اور الحمد للہ اب بہار میں امیر شریعت کے علاوہ پورے ہندوستان میں امت مسلمہ کو ''امیر الہند'' کی سرپرستی حاصل ہے، حضرت مولانا سجاد کا یہ مقولہ کافی شہرت رکھتا ہے کہ ''انگریزوں کو جو کچھ کرنا ہوتا ہے، تیس سال پہلے ہی اس کا پلان تیار کرتے ہیں؛اس لیے ہم لوگوں کو تیس سال آگے کے مسائل سامنے رکھ کر اقدام کرنا چاہیے''۔ یقیناً اپنے اس مقولہ کے مطابق آپ نے جو اقدام کیا، بعد کے حالات نے اس کو درست ثابت کر دکھایا۔

اس پہلے اجلاس میں جو اہم تجاویز منظور ہوئیں، ان میں طبقہ علماء کو اپنے فرائض منصبی، خصوصا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے کو بلا خوف لومۃ لائم ادا کرنے، انجمن علمائے بہار کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک قومی بیت المال کے قیام، اوقاف کی اصلاح، اضحیہ بقر جو شعار اسلام اور سنت نبوی ہے، اسے حسبِ دستور جاری رکھنے اور مخالفین اسلام کے دباؤ سے اسے ترک

کی مصالحت کے باطل ہونے اور شیخ الہندؒ اسیر مالٹا، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر و دیگر نظر بندان اسلام کی نظر بندی پر احتجاج وغیرہ شامل ہیں۔(۲۳)

انجمن علماء بہار کے اس پہلے باضابطہ اجلاس میں اس امر پر شدید احتجاج کیا گیا کہ حق گوئی اور خلافت اسلامیہ مرکزیہ کے تحفظ کے لیے زبان وقلم کو حرکت میں لانے کے جرم میں ہندوستان کے اکثر بڑے ملی قائدین خاص طور پر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ کو گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں میں ڈال دیا گیا اور ان تمام حضرات کی کی رہائی کا انگریز گورنمنٹ سے مطالبہ کیا گیا، ایسے حالات میں جب کہ زبانون پر تالے ڈال دیے گئے تھے اور قلم پر پہرے بٹھا دیئے گئے تھے، ہر شخص جاسوسوں کے نرغے میں تھا، ایسے میں یہ ایک مضبوط اور متحدہ اجتماعی آواز تھی، جو ان قائدین ملت کی حمایت میں اور ان کی رہائی کے لیے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی قیادت میں بلند ہوئی، اجتماعی آواز انفرادی آواز سے بدرجہا مضبوط ہوتی ہے، الحمد للہ اس کے دورس اور مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ایک نامور مبصر تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، شیخ لاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور علی برادران جیسے قائدین حریت ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت اسیری کے دن کاٹ رہے تھے، ان کی رہائی کے لیے کوئی تحریک تو کیا چلتی اور اس کے خلاف کوئی آواز تو کیا اٹھتی، لوگ خداوندان فرنگ کے خوف سے ان کے نام لینے سے بھی خائف رہتے تھے، اس وقت اسی بہار کے سپوت ابوالمحاسن محمد سجاد نے ''انجمن علماء بہار'' قائم کر کے ان جنگ آزادی کے قائدین کی رہائی کے لیے آواز بلند کی''۔

انجمن علماء بہار کے پاس شدہ تجاویز کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

''ان تجاویز کی روشنی میں کوئی بھی صاحب انصاف فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس جمعیۃ نے اس وقت کے دشوار گذار اور مایوس کن حالات میں میدان عمل سے کھینچے اور ان فتنوں سے کٹے علماء کو میدان عمل میں لا کر جدوجہد کرنے اور ان کے سرد و گرم سے نمٹنے پر آمادہ کرنے میں کیا رول ادا کیا''۔(۲۴)

اس سلسلہ میں حضرت مولانا سجاد کے شاگرد مولانا عبدالحکیم صاحب تحریر فرماتے ہیں:

’’مولانا نے بھی عجیب دل ودماغ پایا تھا، مدرسہ میں پڑھاتے بھی تھے، مدرسہ کی نگرانی اوراس کا نظم بھی کرتے تھے، پھر وقتی سیاست اور مسلمانوں کی زبوں حالی، آپس کے نفاق وشقاق اور علماء کی نفرت وانتشار اور لامرکزیت کو گہری نظر سے دیکھتے تھے اوران کی اصلاح کی تڑپ بھی دل میں رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح عوام اور علماء کی بھی اصلاح ہوجائے اور یہ اپنے فرائض سمجھنے لگیں، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے چند علماء کے مشورہ سے بہار میں ۱۳۳۵ھ میں جمعیت علماء صوبہ بہار قائم کیا اور بہت جلد اس کو ترقی اور افادیت کے مرتبہ تک پہنچایا، صوبہ کے مختلف شہروں میں اس کے عظیم الشان پیمانے پر اجلاس ہوتے رہے، بہت غور وخوض کے بعد امارت شرعیہ کی اسکیم آپ کے ذہن میں آئی، اس سلسلہ میں مولانا نے مولانا ابوالکلام آزاد سے رانچی میں ملاقات کی اور اس سلسلہ میں باہمی تبادلہ خیال اور مشورہ ہوا۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلی اور دیگر سربرآوردہ علماء سے بھی ملے اور رائے عامہ کو تیار کیا‘‘۔(۲۵)

مولانا اصغر حسین سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدی پٹنہ تحریر فرماتے ہیں:

’’آخر جمعیۃ علماء بہار کی تاسیس کا عزم ہوا۔ شوال ۱۳۳۶ھ میں مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں جلسہ طلب کیا گیا، مدعو علماء اور عوام کے اس جلسہ میں جمعیۃ علماء بہار کی بنیاد رکھی گئی، شاہ سلیمان پھلواروی بھی اس میں شریک تھے، پھر دوسرے سال پھلواری شریف میں بڑے پیمانے پر اس کا اجلاس ہوا، مولانا آزاد سبحانی کو مدعو کیا گیا تھا، انھوں نے اپنی زبردست تقریر اور سحر بیانی سے سامعین میں جوش وولولہ کی روح پھونک دی۔ امسال (انتقال کے سال) حضرت نائب امیر شریعت کو جمعیت علمائے ہند کا ناظم اعلی مقرر کیا گیا تھا اگرچہ آپ کی ذات اس عہدہ سے پیشتر بھی جمعیت کے لیے روح رواں تھی؛ لیکن جب کہ ارکان جمعیت کے اصرار سے اس عہدہ نظامت کی باگ ہاتھ میں لی تو ایک جدید اسکیم کے تحت نئے اسلوب سے جمعیت کو چلانے کا کام شروع کردیا تھا‘‘۔(۲۶)

ہندوستان میں تحریک خلافت کا قیام:

مسلمانوں کے دیگر گوں ملکی وعالمی حالات نے مولانا سجاد کے دل میں یہ بات ڈالی کہ اس وقت مسلمانوں کی رہنمائی اور عملی اعتبار سے قوت پہنچانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، اس کے لیے سب سے ضروری امر یہ ہے کہ آپس کے انتشار واختلاف کو دور کیا جائے اور امت مسلمہ خاص

طور پر اس کے علماء کو اتحاد و اتفاق کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور ملکی اور بین الاقوامی مسائل میں ایک پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے مفاد کی آواز بلند کی جائے، خاص طور پر ترکی کی خلافت عثمانیہ کے تحفظ و دفاع کے لیے ہندوستان میں ایک پلیٹ فارم قائم کر کے بھر پور کوشش کی جائے، ترکی کی خلافت عثمانیہ کی بحالی کے لیے باضابطہ منظم اور مربوط تحریک چھیڑنے کا خیال سب سے پہلے جن حضرات کے ذہن میں آیا، ان میں ایک ممتاز نام مفکر اعظم حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بانی امارت شرعیہ کا ہے۔ مسلمانوں کا ایک امیر اور خلیفہ ہو اور مسلمان ان کی ماتحتی میں شرعی زندگی گذاریں، یہ خواہش مولانا سجاد کے دل و دماغ میں ہمیشہ موجزن رہی، پھر جب خلافت کے بچے کھچے نام اور اس کے باقی ماندہ آثار کو بھی مٹا دینے کی سازش ہونے لگی اور ترکی کی حمایت کی آواز اٹھانے والے قائدین کو اندھا دھن گرفتار کیا جانے لگا تو مولانا سجاد کے دل و دماغ پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور آپ کے اندر عملی اقدامات اور مؤثر کوشش کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔

اس سلسلہ میں آپ نے اس وقت کی ملی وقومی سرگرمیوں کا روحانی مرکز لکھنؤ کے مشہور خانوادہ فرنگی محل کی باوقار روحانی ہستی جید عالم دین اور مدبر رہنما مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ سے تبادلہ خیال کیا اور بحالی خلافت کے لیے ایک باضابطہ کمیٹی قائم کر کے مؤثر اور مربوط تحریک چلانے کا مشورہ دیا۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ انھیں ایام میں جناب مشیر حسن قدوائی (۱) بیرسٹرایٹ لاء (متوفی ۱۹۳۷ھ) نے بھی مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو خط لکھ کر یہ گذارش کی کہ اگر ہندوستان میں خلافت کمیٹی کے نام سے کوئی انجمن قائم کی جائے اور اس کے ذریعہ وسیع پیمانے پر برطانیہ کے الغائے خلافت یعنی خلافت عثمانیہ کو کالعدم قرار دینے کے رویہ پر احتجاج کیا جائے تو حکومت برطانیہ کے متاثر ہونے کی امید ہے۔ مولانا عبدالباری چوں کہ اس طرح کی کوششوں سے پہلے سے جڑے ہوئے تھے اور انھوں نے ۱۹۱۲ء ہی سے انجمن خدام کعبہ کے نام سے حرمین شریفین کے تحفظ کے لیے ایک کمیٹی بنا رکھی تھی، اس لیے مولانا فرنگی محلی نے حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد کے مشورہ کو قبول کیا اور باضابطہ خلافت کمیٹی قائم کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

علامہ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

”لیکن اللہ تعالی نے اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو چند بہادر، دردمند حساس ہیرو عنایت کیے تھے جو اپنی جان پر کھیل کر کھڑے ہوئے اور انھوں نے مجلس خلافت کے نام سے مرکزی مجلس بمبئی میں قائم کی، جس کی شاخیں سارے ہندوستان میں قائم کی گئیں۔ اس

مجلس کی تنظیمی قوت اتنی زبردست تھی کہ سارا ہندوستان اس کی ایک آواز پر اٹھتا اور بیٹھتا تھا، پورے ملک میں جس قدر نوجوان کارکن تھے، سب اس کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے، ہر طرف اس کی امداد کے لیے روپے برس رہے تھے اور قوتیں یکجا ہو رہی تھیں؛ عوام علماء اور تعلیم یافتہ سب اس تحریک میں یکساں شریک تھے، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ سب سے پیش تھے۔ ان کے علاوہ علمائے دیوبند، علمائے بدایوں، علمائے ندوہ، علمائے بہار اور دیگر علماء سب شریک تھے اور اس زور وقوت سے چلا رہے تھے کہ اس کے دبانے میں حکومت کی ساری تدبیریں بیکار ہو رہی تھیں اور دنیائے اسلام کی نظریں اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں اور ان کی جمعیۃ خلافت پر لگی ہوئی تھیں اور اس وقت مسلمانوں کو اپنی متحدہ قوت کا اندازہ ہو رہا تھا''۔(۲۷)

علامہ ندویؒ کی تحریر میں جن علماء بہار کا تذکرہ ہے۔ یقیناً ان کے سرخیل حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ تھے۔

خلافت کمیٹی کب اور کیسے قائم ہوئی ؟

خلافت کمیٹی کا قیام کب ہوا اور کیسے ہوا؟ اس سلسلہ میں قاضی عدیل عباسی تحریر فرماتے ہیں:

خلافت ترکی کے معاملہ میں قانون کے اندر جدوجہد کا مرکز تھا فرنگی محل۔ مولانا عبدالباری کی فراست نے بادلوں کے محیط ہونے سے پہلے بارش کا اندازہ کرلیا اور خدام کعبہ کی بنیاد رکھی، جس نے ملت اسلامیہ ہند کے ہر فرد میں ایک ولولہ تازہ اور خلافت اسلامیہ اور اماکن مقدسہ سے ایک عظیم محبت وعقیدت کا جذبہ پیدا کیا، بعدہ تحریک خلافت کے زمانے میں فرنگی محل مرکز رہا، مولانا محمد علی مولانا عبدالباری کے مرید تھے اور وہیں سے ان کو اور شوکت علی کو ''مولانا'' کا اعزازی خطاب عطا ہوا تھا، چنانچہ وہ واقعی مولانا ہو گئے، بہر حال ۲۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو باضابطہ طور پر بمبئی میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا بمبئی کے لوگوں نے اس تحریک کی بھرپور معاونت کی اور اس کے اخراجات کا بوجھ اٹھانے کی ذمہ داری لی۔

خلافت کمیٹی کب اور کیسے قائم ہوئی؟ اس کا سراغ لگانے اور محقق طور پر جاننے کی میں نے بڑی کوشش کی؛ لیکن مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ میں کامیاب نہیں ہوا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس ۱۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو منعقد ہوئی تھی، وہی کانفرنس خلافت کمیٹی میں تبدیل ہوگئی، یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا؛ کیوں کہ اس کانفرنس میں ایک تجویز خلافت کمیٹی کے شکریہ کی منظور ہوئی،

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبد الباری نے خلافت کمیٹی قائم کی اور پھر وہ بمبئی منتقل ہوگئی؛ کیوں کہ وہاں کے لوگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے کی ذمہ داری لی، اس کی تائید حیات سلیمان کے ص ۱۷۵ کے ذیلی حاشیہ سے ہوتی ہے۔

پھر قاضی عدیل عباسی حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے اس امر کی تحقیقات میں بہت وقت صرف کیا کہ کوئی دستاویزی شہادت اس بات کی مل جائے کہ خلافت کمیٹی کب اور کہاں اور کس کی تحریک پر قائم ہوئی؛ مگر افسوس مجھے اس میں ناکامی ہوئی''۔(۲۸)

کس کی تحریک پر قائم ہوئی؟ اس حوالہ سے قاضی عدیل عباسی نے اگرچہ عدم علم کا اعتراف کیا ہے؛ لیکن مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کا نام بھی انھوں نے خلافت کے قائدین میں درج فرمایا ہے، مولانا سجاد کی جو بے چینی تھی اور جس طرح ملت کے اتحاد و یگانگت خاص طور پر تحریک خلافت کے لیے آپ سرگرم عمل رہتے تھے اور جس طرح آپ نے ۱۹۱۷ء میں انجمن علماء بہار قائم کر کے خلافت اسلامیہ مرکزیہ کے تحفظ کی آواز بلند کرنے والے قائدین کی گرفتاری پر احتجاج کیا تھا اور ان کی رہائی کا مطالبہ انگریز گورنمنٹ سے کیا تھا، اس کی بنیاد پر آپ کے سوانح نگار آپ کو اس تحریک کا محرک اور فکری بانیوں میں سے قرار دیتے ہیں۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

''اس خلافت کمیٹی کے مؤسسین میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بھی تھے، مولانا سجاد نے اس بارے میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے تبادلہ خیال کیا اور ان ہی دونوں بزرگوں کی تحریک پر مولانا محمد علی جوہر، مفتی کفایت اللہ، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں اور بعض دیگر علماء و قائدین کی مشاورت سے بمبئی میں خلافت کمیٹی کی بنیاد پڑی؛ مگر اس پوری تحریک کو قوت بخشنے والا جو دماغ تھا وہ دراصل یہی مستعد اور شہرت و ناموری سے دور شخصیت تھی یعنی مفکر اعظم مولانا محمد سجاد کی تھی''۔(۲۹)

تحریک خلافت کی ہمہ گیری:

تحریک خلافت کا یہ پہلو بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے یہ محض بحالی خلافت کی ایک تحریک ہی ثابت نہیں ہوئی؛ بلکہ اس سے ہمارے ملک میں آزادی کامل کی بنیاد پڑی، اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب ہندوستان برطانیہ کی رعایا ہونے پر فخر کرنے کی

ذلت سے نکلا اور ملک کے ہر باشندے نے خودداری اور خوداعتمادی کی فضا میں اپنے کو ہندوستانی کہنے پر شرم نہ کرنا دریافت کرلیا۔ تحریک خلافت ایک مشعل تھی، جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اس اجالے میں اپنے آپ کو دیکھا اور پالیا۔ یہ صحیح ہے کہ ایک زمانے میں تحریک خلافت کے روح رواں مہاتما گاندھی تھے؛ لیکن اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ تحریک خلافت نے گاندھی جی کو شناخت عطا کی اور اس کے ذریعہ ہندوستان کے ہندو مسلم کو متحد کرنے اور اسے آزادی کامل کی جانب گامزن کرنے کا مواد فراہم کیا، تحریک خلافت ہی کے زمانے میں جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا جس کے روشن خیال علماء نے آخر وقت تک کا ملک کی آزادی کے لیے دار ورسن کو دعوت دی اور مسلم لیگ کا تا دم آخر مقابلہ کر کے تقسیم پر کبھی راضی نہیں ہوئے۔ تحریک خلافت کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے قاضی عدیل عباسی تحریر فرماتے ہیں:

''جس وقت تحریک خلافت کا آغاز ہوا مسلمانوں میں بہترین دل ودماغ رکھنے والے دانشور موجود تھے مثلاً مولانا ابوالکلام آزادؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مفتی کفایت اللہؒ، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا (ابوالمحاسن) محمد سجاد بہاری، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی، مولانا احمد سعید، مولانا آزاد سبحانی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مشیر حسن قدوائی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار انصاری، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مسٹر مظہر الحق اور ظفر علی خاں۔ یہ وہ لوگ تھے جو تحریر وتقریر، علم وفن، فکر صالح اور تحقیق کے علاوہ میدان عمل کے بھی مجاہد تھے ان میں انشا پرداز بھی تھے اور شاعر بھی، علوم دینیہ کے مجتہد اور محقق بھی اور علوم دنیا اور علوم مغرب کے شناسا اور امام بھی۔ یہ تمام اکابر ملت اس سرفروشانہ جدوجہد میں پورے انہماک اور بے جگری سے شریک ہوگئے اور تحریک خلافت تحریک آزادی ہند میں تبدیل ہوگئی''۔(۳۰)

آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لکھنؤ:

بہرحال بمبئی میں خلافت کمیٹی کے قیام کے بعد طے کیا گیا کہ خلافت کے تعلق سے بڑے پیمانے پر ایک اجلاس لکھنوء میں بلایا جائے، جس کے ذریعہ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند کے سربراہوں کو ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا جائے؛ تاکہ لندن میں جو صلح کانفرنس کمیٹی تین بڑے ممالک: امریکہ، برطانیہ اور فرانس پر مشتمل کام کر رہی ہے، اس پر اثر پڑے اور

مسلمانوں کے جذبات سے ہم آہنگ فیصلہ ہو، چنانچہ خلافت کے سلسلہ کا ایک عظیم الشان جلسہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے ۱۸ ستمبر ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ میں طلب کیا گیا، جس میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ہر طبقہ کے علماء و زعماء شریک ہوئے کہا جاتا ہے مجمع بہت زیادہ تھا اور کوئی طبقہ خیال ایسا نہیں تھا، جس کے نمائندے شریک نہ ہوئے ہوں۔

کانفرنس کا پہلا ریزولیشن خلافت عظمی کے اقتدار کو برقرار رکھنے کی بابت مولانا سید فاخرالہ آبادیؒ نے پیش کیا اور مولوی سید حسن آرزوؒ (پٹنہ) نے اس کی تائید کی۔ دوسرا ریزولیشن جس میں ترکی کے بڑے علاقوں عراق، عرب، فلسطین، شام، آرمینیا وغیرہ کو ترکی کی سلطنت سے علاحدہ کر کے غیر مسلم حکمراں طاقتوں کے ماتحت رکھنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا تھا اور جزیرۃ العرب کو غیر اسلامی اثرات سے پاک رکھنے پر زور دیا گیا تھا، جسے مولانا ثناءاللہ امرتسری نے پیش کیا اور شیخ عبداللہ وکیل علی گڑھ نے اس کی تائید کی۔ اسی طرح ایک ریزولیشن سمرنا سے یونانیوں کو نکالنے اور ان کے مظالم پر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک رقت انگیز تقریر میں پیش کیا، جس نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو مستحضر کر دیا۔ ایک ریزولیشن میں بمبئی کی خلافت کمیٹی کے کام پر اظہار پسندیدگی کیا گیا اور اس کی شاخیں صوبوں اور مختلف مقامات پر قائم کرنے کی ضرورت جتائی گئی، اس کانفرنس میں کل سات ریزولیشن پاس کیے گئے تھے، جن میں سے ہر ایک کا تعلق خلافت کی بحالی سے تھا؛ اس لیے آل انڈیا مسلم کانفرنس کو خلافت کانفرنس کہا جانے لگا۔

اس موقع پر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بھی قائدانہ طور پر شریک تھے اور ہر محاذ پر پیش پیش تھے، آپ کی شرکت اس لیے بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل تھی کہ آپ تحریک خلافت کے فکری بانیوں میں سے تھے۔ لکھنؤ کے اس سفر میں بہار کے مشہور عالم اور خلافت عظمی کی برقراری کے ریزولیشن کی تائید میں تقریر کرنے والے مولانا سید شاہ حسن آرزو بھی شریک تھے۔ ان کا بیان ہے:

> ”اس سفر میں مولانا سجاد کی معیت کا شرف حاصل ہوا میں نے پہلی ملاقات ہی میں اس دبلے پتلے نحیف عالم دین سے مل کر یہ محسوس کیا کہ اس کے جسم کے اندر گوشت کا لوتھڑا نہیں؛ بلکہ دہکتی آگ کا شعلہ ہے۔ اس کی نظر کی گہرائی، اس کے دماغ کی بلندی، ارتقائے ملک کے لیے صاف اور سیدھا نظام عمل اپنے اندر مخفی رکھے ہوئے ہے۔ لکھنؤ کی وہ صحبت یقیناً ایک تاریخی صحبت تھی۔ مخصوص مسلمانوں کا ایک اچھا مجمع تھا اور کم از کم میری زندگی کا ایک تاریخی دن تھا۔ مضامین کی مخصوص صحبت میں پتہ چلا کہ مولانا سجاد کی ذہنی پہنچ کیا ہے اور سیاسی معلومات میں

وہ کس درجہ ماہر ہیں‘‘۔(۳۱)

علاقائی خلافت کمیٹیوں کا قیام:

آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کے پاس شدہ تجاویز میں سے ساتویں تجویز میں خلافت کمیٹی بمبئی کے کام پر اظہار اطمینان کیا گیا۔ اور اس کی شاخیں صوبوں اور مختلف مقامات پر قائم کرنے پر زور دیا گیا تھا، چنانچہ اس تجویز کو بھی عملی جامہ پہنانے میں مولانا سجادؒ نے سبقت کی۔ آپ نے بمبئی خلافت کمیٹی کے قیام کے بعد ہی بمبئی سے واپسی پر بہار کے مشہور شہر گیا میں خلافت کمیٹی کی شاخ قائم کر دی تھی اور ایک عظیم الشان خلافت کانفرنس شہر گیا میں اپریل ۱۹۱۹ء کو منعقد کروایا، اس اجلاس میں خلافت کمیٹی کے مرکزی قائد مولانا شوکت علی ودیگر نے شرکت کی۔(۳۲)

اس سلسلہ میں آپ کے سوانح نگار جناب مولانا حافظ عبدالحکیم صاحب سابق مہتمم مدرسہ انوار العلوم گیا لکھتے ہیں:

’’بارہ برس تک مولانا انوار العلوم میں درس دیتے رہے اور اس درمیان میں سیاست حاضرہ کا مطالعہ بھی فرماتے رہے، چنانچہ تحریک خلافت کے زمانے میں سیاست میں داخل ہوئے اور آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا، اس کے بعد ہندوستان بالخصوص بہار میں کوئی تحریک ایسی نہیں تھی، جس میں آپ شریک نہ ہوئے ہوں اور عملی حصہ نہ لیا ہو؛ بلکہ کامیاب نہ بنایا ہو اور کامیاب بنانے کی کوشش نہ کی ہو؛ لیکن انوار العلوم کے بعد سب سے اہم اور نمایاں کام گیا میں خلافت کمیٹی کی تاسیس تھی۔ مولانا نے قاضی احمد حسین وغیرہ کی معاونت سے گیا میں خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی، جو صوبۂ بہار کی پہلی خلافت کمیٹی تھی اور ہزاروں ہزار روپیہ ٹرکی کو بھجوایا اور خوب چندہ ہوا، مجھے یاد ہے کہ غالباً یوم انقرہ کے سلسلہ میں ایک چھوٹے سے محلّہ سے ڈیڑھ سو روپیہ وصول کر کے دفتر میں داخل کیا تھا‘‘۔(۳۳)

اس کے بعد آپ نے بہار کے مرکز کی طرف رخ کیا اور یہاں پٹنہ کے قریب روحانی مرکز پھلواری شریف میں خلافت کمیٹی قائم کی اس کے علاوہ آپ کی تحریک پر صوبۂ بہار کے دوسرے مقامات پر بھی تحریک خلافت کی علاقائی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ خلافت کمیٹی کا دوسرا علاقائی اجلاس مولانا سجاد صاحب کی تحریک اور سعی سے پھلواری شریف میں منعقد ہوا، جس کی صدارت حضرت شاہ محی الدین قادریؒ امیر شریعت ثانی نے فرمائی۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں گیا میں ایک اعلیٰ سطحی خلافت کانفرنس جمعیۃ علماء کانفرنس اور کانگریس کے اجتماع کے ساتھ منعقد ہوئی۔

اس سلسہ میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

''اس کے بعد برابر مولانا اس تحریک کے دل ودماغ بنے رہے۔ مولانا کی یہی صلاحیت تھی کہ ۱۹۲۲ء میں گیا میں ہونے والی آل انڈیا خلافت وجمعیۃ کانفرنس کے اجلاس کے موقع پر اپنے عصر کے جید عالم مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری صدر مجلس استقبالیہ نے برسرعام مولانا کے متعلق یہ اعتراف کیا کہ اگر ابھی آزاد ملک ہو، تو اس کا گورنر جنرل مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو بنایا جائے اور مولانا حبیب الرحمان عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس کی تائید فرمائی، اس کے بعد بھی مولانا بہار میں مختلف مقامات پر خلافت کے جلسے کراتے رہے اور مالی معاونت کے سلسلہ میں کوشاں رہے''۔ (۳۴)

گیا خلافت کانفرنس کی منظر کشی ایک مشاہد کی زبانی:

گیا کی خلافت کانفرنس کئی لحاظ سے ممتاز کانفرنس تھی، آپ کے سخت سیاسی مخالف جناب راغب احسن مرحوم صدر مسلم لیگ کلکتہ گیا میں منعقد ہونے والے اس خلافت کانفرنس میں بنفس نفیس موجود تھے، وہ اس کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد سجاد کو پہلی دفعہ اور یہ آخری دفعہ بھی تھا کہ میں نے گیا کانگریس ۱۹۲۲ء کے موقع پر جمعیۃ علمائے ہند کے عظیم الشان پنڈال میں دیکھا تھا۔ گیا کانگریس کا اجلاس مسٹر سی آر داس آنجہانی ہو رہا تھا، سوراج پارٹی کی بنیاد پنڈت موتی لال نہرو، داس اور حکیم اجمل خاں مل کر ڈال رہے تھے۔ گیا میں اس موقع پر آل انڈیا خلافت کانفرنس اور جمعیۃ علمائے ہند کی سالانہ کانفرنسیں بھی ہو رہی تھیں۔ دسمبر کا مہینہ تھا، کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا، کانگریس، خلافت اور جمعیۃ کے پنڈال دریائے پھلگو کے کنارے شہر کے باہر ریت کے ٹیلوں اور خوبصورت پہاڑوں کے دامن میں قائم تھے۔ کانگریس اس وقت بھی سرمایہ دار ہندوؤں کی مجلس تھی، اس کا پنڈال ہندو طرز تعمیر کا نمونہ تھا۔ صدر گیٹ، اس کے دروازے اور اس کے ستون بدھسٹ طرز تعمیر کے مطابق بنائے گئے تھے، اس کا ظاہر اور باطن کاملاً ہندو تھا۔ اس کی تعمیر پر ہزاروں ہزار روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ اس کے بالکل برعکس جمعیۃ علمائے ہند کا پنڈال اسلامی سادگی نفاست اور جدت اور انڈو سارا سینیک (indo.saracenic) عربی ہندی طرز تعمیر کی رعنائیوں کا آئینہ دار تھا۔ اس کے عالی شان صدر پھاٹک اور داخل و خارج ہونے کے دروازوں پر عربی حروف میں معنی خیز آیات قرآنی درج تھے۔ مسلمانوں

کے علاوہ ہزاروں لاکھوں ہندو روزانہ جمعیۃ علماء کے پنڈال آکر دیکھتے اورتعریف کرتے تھے؛ جوکلمہ سب کی زبان پر عام تھا کہ باوجود سادہ اورکم خرچ ہونے کے جمعیۃ کا پنڈال کانگریس کے پنڈال سے ہزار درجہ زیادہ آرام دہ زیادہ روشن وفراخ اورزیادہ حسین وجمیل اورزیادہ عالی شان اورزیادہ پرشکوہ تھا اور یہ سب کچھ مولانا سجاد کی اعلی تعمیری صلاحیت کا نتیجہ تھا، مجھے معلوم تھا کہ مولانا نے یہ سارا انتظام انتہائی بے سروسامانی، بے مائیگی اور پریشانی کے عالم میں اورقلیل ترین وقت یعنی صرف چند دنوں کے اندر کیا تھا، گیا کی جمعیۃ علماء کانفرنس اور خلافت کانفرنس کے اصل روح رواں، دماغ، مدبر اور مرکزی شخصیت مولانا سجاد کی ذات تھی۔ مولانا سجاد نے چند گنے ہوئے دنوں میں جمعیۃ اورخلافت کانفرنس کے متعلق جملہ انتظامات باوجود غربت وافلاس اور بے سروسامانی کے اتنے اعلی پیمانے اور بہترین، بلکہ نادرترین انداز پر کیا کہ ہندو مسلم اکابر کی نگاہیں بے اختیار مولانا پر مرکوز ہورہی تھیں اورسب کی زبانیں اس حقیقت کے اعتراف میں ہم آواز تھیں کہ گیا کانگریس نے ملک کی ایک نادر اورحیرت انگیز تنظیمی طاقت کا انکشاف کیا ہے۔ مولانا حکیم ابوالبرکات عبد الرؤف صاحب قادری دانا پوری جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، آپ نے مولانا سجاد کی انتظامی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے کھلے عام اجلاس میں فرمایا تھا۔

مولانا سجاد نے مسلمانوں کی عظیم الشان تنظیمی اور سیاسی کاردانی کا جوثبوت دیا ہے وہ اس درجہ بلند ہے کہ سوراج ملنے کے بعد مولانا کو ہندوستان کا گورنر اور گورنر جنرل بنانا موزوں ہوگا کیوں کہ وہ ایک نئے ہندوستان کے نئے خیالات واصول کے مطابق تعمیر کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند صدر اجلاس نے جوخود بھی بہت بڑے منتظم بزرگ تھے، اس خراج تحسین کی تائید فرمائی تھی۔ اس اجلاس گیا کے موقع پر مجھے مولانا مرحوم کی تقریر سننے کا پہلا موقع ملا تھا اور یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ صاحب بیان نہیں؛ بلکہ صاحب عمل بزرگ تھے۔ مولانا سجاد نہ صرف ایک بڑی تنظیمی صلاحیت رکھنے والے بزرگ تھے؛ بلکہ جدید خیالات وافکار رکھنے والے ایک معمار اورخلاق بھی تھے، وہ صرف منتظم اورمدبر نہیں تھے؛ بلکہ مفکر، مجتہد اورآرٹسٹ بھی تھے، گیا کی مجلس اوراس کے متعلقہ انتظامات ان کی اعلی قوت تخیل اوراعلی تخلیق کی مخلوقات فکروعمل تھے، اجلاس گیا کے موقع پر ہر چیز اور ہر

انتظام پر مولانا سجاد کی تخلیقی شخصیت اور اجتہادی آرٹ کا چھاپ صاف نمایاں تھا''۔(۳۵)

خلافت کانفرنس گیا کی تجاویز:

خلافت کانفرنس اور جمعیۃ علماء کے جس اجلاس کا تذکرہ راغب احسن مرحوم نے کیا، یہ اجلاس دسمبر ۱۹۲۲ء کو گیا میں زیر صدارت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند منعقد ہوا، جس میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا:

''حضرات علماء! آپ کی بروقت مستعدی سے جمعیۃ علماء کا وجود تو قائم ہوگیا جس کی سخت ضرورت تھی، اگر آپ ایسا نہ کرتے تو درحقیقت ایک بڑے اور اہم فرض سے غفلت کا الزام آپ پر آتا۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کی ذمہ داریاں بنسبت سابق بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ علماء و مشائخ کرام بہار کا مسلمانوں پر بھاری احسان ہے کہ انھوں نے اپنے صوبہ میں امارت شرعیہ قائم کر کے ایک سڑک تیار کردی ہے، ہم ان حضرات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ دوسرے صوبوں کے علماء بھی جلد از جلد صوبہ بہار کی تقلید کریں گے''۔(۳۶)

ایسی حالت میں کہ مسلمان ایک غیر مسلم طاقت کے زیر حکومت ہیں اور اور ان کو اپنے معاملات میں آزادی حاصل نہیں ہے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے لیے والی اور امیر مقرر کریں دارالقضاء قائم کر کے قضاۃ اور مفتیان کرام کا تقرر کریں جمعیۃ علماء میں یہ تجویز منظور ہو چکی ہے۔(۳۷)

مولانا محمد سجاد کی شخصی زندگی میں تحریک خلافت نے زبردست انقلاب پیدا کیا تھا، مسلمانوں میں معاشرتی اصلاح کے زبردست حامی ہونے کا ثبوت وہ پہلے ہی اپنے ایک ایسے اقدام سے دے چکے تھے جس نے گیا کی مسلم شوشیل سیاست میں بھونچال ڈال دیا تھا۔(۳۸)

مولانا سجاد کے صاحبزادے حسن سجاد کی گرفتاری:

تحریک خلافت کی متحرک اور سرگرم قیادت میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد تنہا نہیں تھے؛ بلکہ آپ کے جواں سال صاحبزادے جناب مولانا حسن سجاد بھی آپ کے دست و بازو بنے ہوئے تھے، وہ اپنے والد کے ساتھ یا ان کی نیابت میں بہار کے مختلف خطوں کا دورہ کرتے تھے اور پرجوش تقریریں کیا کرتے تھے، چنانچہ اسی انداز کا ایک جلسہ پٹنہ ضلع کے باڑھ سب ڈویزن میں منعقد ہوا، جس میں مولانا احمد سجاد نے انتہائی ولولہ خیز تقریر کی، ان کی تقریروں سے ایوان باطل میں زلزلہ برپا ہوگیا اور بالآخر سی آئی ڈی کی رپورٹ پر انھیں گرفتار کرلیا گیا اور چھ مہینے کی سزا بھی

ہوئی، اس سلسلہ میں آپ کے شاگرد مولانا عبدالحکیم صاحب یوں لکھتے ہیں:

''مولانا سجاد کے نوعمر مگر پر جوش صاحبزادے حسن سجاد مرحوم تحریک خلافت کے سلسلہ میں باڑھ میں ایک تقریر کے جرم میں اسیر فرنگ ہوئے اور غالباً چھ مہینے کی سزا ہوئی''۔(۳۹)

بیٹے کو بستر مرگ پر چھوڑ کر حضرت سجاد ملی ضرورت سے سفر میں:

یہی وہ صاحب زادے تھے، جن کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا کہ:

''ان کا بڑا لڑکا جو پڑھ لکھ کر فاضل اور گھر کا کام سنبھالنے کے قابل ہوا، عین اس وقت کہ اس کے نکاح میں چند روز باقی تھے، باپ نے اس کی دائمی جدائی کا داغ اٹھایا اور یہ سننے کے قابل ہے کہ وہ لڑکا۔۔۔مرض الموت میں تھا کہ مسلمانوں کی ایک ضرورت ایسی سامنے آئی کہ باپ بیمار بیٹے کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہوگیا، واپس آیا تو جوان بیٹا دم توڑ رہا تھا''۔(۴۰)

محاسن سجاد کے مرتب مولانا مسعود عالم ندویؒ رقم طراز ہیں:

اچھی طرح یاد نہیں کہ چھوٹے مولانا (مولانا سجاد) کی خدمت میں پہلی بار کب نیاز حاصل ہوا، تحریک خلافت کے ہنگامہ خیز دنوں میں راقم ایک انگریزی اسکول کا طالب علم تھا والد ماجد مقامی خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کے خاص کارکن تھے، اسکول چھوڑ کر مدرسہ آنا پڑا۔ والد ماجد کے پاس آئے دن جمعیۃ العلماء اور خلافت کمیٹی کی گشتی چٹھیاں آتی رہتی تھیں، خیال آتا ہے کہ سب سے پہلے انہی مراسلوں میں ''ابوالمحاسن محمد سجاد کان اللہ لہ'' نظر سے گذرا، انھیں دنوں میں روداد انجمن علماء بہار (۱۹۱۷ء) کہیں پڑی ہوئی ملی، بے سمجھے بوجھے پڑھ لیا، مولانا سجاد کا نام پہلے پہل اسی روداد سے مرتسم ہوا''۔(۴۱)

جناب سید مجتبی لکھتے ہیں:

''میں نے حضرت مولانا سجاد کو ۲۰۔۱۹۲۱ء کو عدم تعاون اور خلافت کے جلسوں میں بمقام بانکی پور (پٹنہ) دیکھا۔۔۔تحریک خلافت کے انھیں جلسوں میں حضرت مولانا پہلی بار بانکی پور پٹنہ میں سیاسی پلیٹ فارم پر مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کے دوش بدوش نظر آئے، حضرت مولانا سجاد کا نام اس سے قبل تحریک خلافت کے ہنگاموں میں مشہورِ عالم ہو چکا تھا؛ لیکن اس وقت تک مولانا ایک مدرس اور عالم تھے۔ اب

۲۰ء کی تحریک عدم تعاون نے مولانا کو خالص سیاسی رہبر بنا دیا''۔(۴۱)

خلافت کمیٹی کی اثر آفرینی:

ان خلافت کمیٹیوں نے مسلمانوں میں صحیح شعور وآگہی پیدا کرنے اوران کی باہمی تنظیم میں جوکارہائے نمایاں انجام دیئے وہ تاریخ کا روشن باب ہے۔اس شعور وآگہی کے دوررس اثرات ریاست بہار کی سیاسی صورت حال پرمرتب ہوئے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کی سیاسی حصہ داری اور تحفظ مسلمین کے نقطہ نظر سے مولانا سجاد نے مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی قائم کی،تو اس نے جو نمایاں کامیابی حاصل کی،اس کے پیچھے تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے انجام دی جانے والی مولانا سجاد کی کوششوں کا بھی دخل تھا، چنانچہ مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کی کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ کے ایک سوانح نگار تحریر فرماتے ہیں:

''گرچہ مسلمانان بہار سیاسی بےعملی کا شکار ہوکر کانگریس سے بددل ہو چکے تھے۔پھر بھی وہ دوسرے صوبہ کے مسلمانوں کی طرح کانگریس مخالف لہروں میں نہیں بہہ پائے،جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہاں مسلم لیگ کی کوئی ٹھوس تنظیم نہیں تھی،جب مرکزی اسمبلی کے لیے چناؤ کا فیصلہ ہوگیا تو یوپی اور بہار کے مسلم رہنماؤں نے انتخاب میں حصہ لینے کے لیے پرانے ''خلافتی''،لیگی اور جمعیۃ علمائی رہنماؤں کی مدد سے مسلم یونیٹی بورڈ قائم کرکے محبان وطن اور آزادی ہند کے خواہاں مسلمانوں کو الیکشن لڑنے کے لیے کھڑا کیا۔امارت شرعیہ نے جہاں ''خلافت تحریک'' میں شریک ہوکر مسلمانان بہار پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تھی ؛ وہیں مسلم لیگ اس تحریک کی مخالفت کرکے مسلمانان بہار کو صدمہ پہنچا چکی تھی؛اس لیے مسلمان مسٹر جناح اور مسلم لیگ دونوں سے بدظن تھے''۔(۴۲)

تحریک خلافت کا ثمرہ ''جمعیۃ علماء ہند'':

۲۳نومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس دلی میں ہوا تھا،آل انڈیا مسلم کانفرنس لکھنو کے بعد برطانوی وزیراعظم مسٹر لائیڈ جارج نے لارڈ میر کی دعوت میں ایک دل خراش تقریر کی،جس سے اندازہ ہوگیا کہ برطانوی وزیراعظم اپنے اوراپنی حکومت کے وعدوں سے انحراف کرنے والے ہیں،اس تقریر نے مسلمانوں میں بہت جوش بھردیا،اس کے بعد فورا ۲۳نومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کانفرنس کا ایک اجلاس بڑی دھوم دھام سے دلی میں شیر بنگال جناب فضل الحق کی صدارت میں منعقد ہوئی،اس موقع پر اتنا ہجوم خلائق تھا کہ چاندنی چوک اور جامع مسجد کی راہ دو گھنٹے میں طے

ہوئی، اس اجلاس میں صرف خلافت کمیٹی کے قائم مقام شریک کیے گئے، جو تمام صوبوں سے آئے تھے، اس اجلاس میں مہاتما گاندھی کو ان کی عظمت کی وجہ اور دیگر کچھ غیر مسلم قائدوں کو بھی پہلی بار جلسہ میں شریک کیا گیا تھا، اس طرح یہ اجلاس ہندو مسلم اتحاد کے لیے سنگ میل ثابت ہوا اور تحریک خلافت آگے چل کر تحریک آزادی میں بدل گئی، مہا تما گاندھی بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے اور ان کے خیر مقدم کا خاص اہتمام کیا گیا۔ (۴۳)

اس خلافت کمیٹی کے آل انڈیا اجلاس میں بہار کے صوبائی ذمہ دار کی حیثیت سے بھی مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے قائدانہ شرکت کی تھی، اس خلافت کانفرنس میں بعض علماء نے (جن میں سر فہرست مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد) مشورہ کیا کہ باہمی افتراق وانتشار سے ملت اسلامیہ کو بے پناہ نقصان ہو رہا ہے، لہٰذا یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ ہندوستان کے علماء کی ایک ملک گیر تنظیم ہو۔ سارے حضرات نے اس سے اتفاق کیا اور علماء کی ایک مختصر اور مخصوص جماعت کا ''خفیہ اجتماع'' دہلی کے ایک مشہور بزرگ سید حسن رسول نماؒ کی درگاہ پر مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کی صدارت میں ہوا۔ مولانا سجادؒ نے بھی اس جلسہ میں ایک مختصر تقریر فرمائی، اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا سجاد کے جذبات ایمانی اور غیرت دینی کا ترجمان تھا۔ حاضرین کی تعداد اگر چہ بیس سے زیادہ نہیں تھی؛ لیکن کوئی دل ایسا نہ تھا جس نے اثر قبول نہ کیا ہو، اس جلسے میں ہر مکتب فکر اور طبقہ خیال کے ممتاز علماء نے شرکت کی اور یہ عہد کیا کہ: ''ہم سب دہلی کے مشہور ومقدس بزرگ کے مزار کے سامنے اللہ کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ مشترکہ قومی وملی مسائل میں ہم سب آپس میں متحد ومتفق رہیں گے اور فروعی واختلافی مسائل کی وجہ سے اپنے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہونے نہیں دیں گے اور گورنمنٹ کی طرف سے جو سختی اور تشدد ہوگا اس کو صبر ورضا کے ساتھ برداشت کریں گے، اس طرح خلافت مرکزیہ کے تحفظ لیے شاید اول بار وہ علماء جو فروعی مسائل کی وجہ سے آپس میں اس قدر دور ہو گئے تھے کہ بعض اوقات ایک دوسرے کی تکفیر سے بھی نہیں چوکتے تھے، آج مولانا ابوالمحاسن سجاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی جیسے مخلص علماء کی کوششوں سے ایک دل اور ایک جان ہو کر پوری قوت سے میدان عمل تیار کرنے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔

مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؒ تاریخ جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ ص ۴۴ پر تحریر کرتے ہیں:

''نومبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس کی تقریب سے تمام اقطاع ہند کے علماء کی ایک

مقتدر جماعت جمع ہوگئی، خلافت کانفرنس کے اجلاسوں سے فراغت کے بعد تمام علماء موجودین نے ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں صرف حضرات علماء ہی شریک تھے مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری صاحب کی تحریک اور مولانا منیر الزماں صاحب اور دیگر حاضرین کی تائید میں جناب فاضل علامہ حضرت مولانا عبدالباری صاحب اس جلسہ کے صدر قرار پائے اور کاروائی شروع ہوئی، تمام حاضرین جلسہ نے بالاتفاق طے کرلیا کہ علماء کی ایک جمعیۃ قائم کی جائے اور اس کا نام جمعیۃ علماء ہند رکھا جائے اور اس کے حلقہ کو تمام ہندوستان کے لیے وسیع کیا جائے، چنانچہ تمام حاضرین نے اسی وقت جمعیۃ کی رکنیت منظور کرلی اور جمعیۃ علماء ہند قائم ہوگئی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ اس جمعیۃ کے عارضی صدر اور مولانا احمد سعید ناظم منتخب کیے گئے''۔(۴۴)

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے اس میں قائدانہ شرکت کی اور ایک اثر انگیز تقریر بھی کی۔ جمعیۃ العلماء کے پہلے ناظم عمومی سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی مولانا سجاد کی اس تقریر کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

''اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا کے جذبات ایمانی کا ترجمان تھا، کوئی آنکھ اور کوئی دل ایسا نہ تھا، جس نے اثر قبول نہ کیا ہو، یہ مجلس اگرچہ دو گھنٹے سے زیادہ کی نہ تھی، ایک گھنٹہ بحث ومباحثہ میں اور ایک گھنٹہ عہد و پیمان میں صرف ہوا؛ لیکن اس جلسہ کا یہ اثر تھا کہ جمعیۃ علماء قائم ہوئی''۔(۴۵)

حضرت شاہ محی الدین امیر شریعت ثانی فرماتے ہیں:

''جمعیۃ علماء ہند کے لیے ہندوستان کے اکثر صوبوں میں سفر کرکے علماء میں اس کی تبلیغ کی اور لوگوں کو آمادہ کیا لیکن عمل کی طرف پہلا قدم مولانا محمد سجاد کا تھا''۔(۴۶)

بقول قاضی عدیل عباسی مرحوم:

''اس دور ابتلاء میں ہر طبقہ خیال کے علماء ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے تھے، مثلاً: دیوبندی فکر کے مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، اہل حدیث طبقہ کے مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالحکیم گیاوی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی، بریلوی جماعت کے سید محمد فاخر الہ آبادی، مولانا عبدالماجد بدایونی۔ معتدل طبقہ کے اور شمالی ہند کے قدیم ترین مرکز سے تعلق رکھنے والے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا سلامت

اللہ فرنگی محلی، مولانا آزاد سبحانیؒ علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ
الغرض ہندوستان کے اکابر علماء سالہا سال کے اختلافات اور گروہ بندیوں کو نظر انداز کر کے
تحریک خلافت میں شانہ بشانہ کام کر رہے تھے''۔(۴۷)

اس سے صاف طور پر نمایاں ہے کہ تمام علمائے اسلام متحد و متفق ہو کر خلافت کانفرنسوں میں شریک ہوتے تھے اور ہر طرح امداد بھی فرماتے تھے۔ جن حضرات نے رکنیت قبول کی وہ ایسے اساطین تھے جن میں سے ایک ایک کے لاکھوں پیرو تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے امرتسر میں پہلے جلسہ کی دعوت دی، چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس عام امرتسر میں خلافت کانفرنس کے ساتھ ۲۸/دسمبر ۱۹۱۹ء میں زیر صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ منعقد ہوا۔ یہ اجلاس بہت ہی کامیاب رہا۔ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد جمعیۃ علماء اور خلافت کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور مدلل اور زوردار انداز میں مجمع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے خلافت، ہندوستانی سیاست اور امارت شرعیہ فی الہند کے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اعادہ کیا، اسی اجلاس میں مولانا سجاد کی تحریک پر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی فی الفور رہائی سے متعلق قرارداد منظور کی گئی۔ اس سے قبل مولانا سجاد انجمن علماء بہار کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۷ء میں بھی حضرت شیخ الہند، شیخ مدنی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد و دیگر اسیران اسلام کی رہائی کی تجویز منظور کروا چکے تھے۔ اسی طرح تحریک خلافت کے ایک قائد علامہ سید سلیمان ندوی وفد خلافت میں شاہ انگلستان کے سامنے حضرت شیخ الہند کی رہائی کی آواز بلند کر چکے تھے۔(۴۸)

۶ستمبر ۱۹۲۰ء کو جمعیۃ علماء کا ایک اجلاس کلکتہ میں زیر صدارت مولانا تاج محمد سندھی منعقد ہوا اور ۸ستمبر ۱۹۲۰ء کو پانچ سو علماء کے دستخط سے ترک موالات کا فتوی شائع ہوا، یہ فتوی مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار نے تحریر فرمایا تھا۔(۴۹)

تحریک خلافت نے کنجشک فرومایہ کو شاہین بنادیا:

تحریک خلافت کے قائدین بالخصوص مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مہاتما گاندھی نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا، جہاں گئے، لوگوں نے پلکیں بچھائیں، پبلک ٹوٹ پڑی، عظیم الشان جلسے ہوئے، گاندھی جی تو پانچ سات منٹ سے زیادہ تقریر نہیں کرتے تھے؛ مگر مولانا محمد علی دو ڈھائی گھنٹہ سے کم وقت نہ لیتے تھے، روتے اور رلاتے تھے۔ ان تقریروں کا انجام یہ ہوا کہ

انگریز حکومت سے قید و بند، جرمانہ؛ بلکہ گولی سے مرنے تک کا خوف دماغ سے کافور ہو گیا، حتی کہ وہ دیہاتی جو کانسٹبل کی صورت سے ڈر جاتے تھے، اب میدان میں سینہ کھول کر نکل آئے تھے، جب کوئی جیل جاتا تھا تو اس کے گھر والوں کو مبارک باد دی جاتی تھی اور گھر والے شان سے گردن اونچی کرتے تھے گویا خاندان میں کوئی قابل فخر کارنامہ انجام پایا ہے۔ دوسری طرف گورنمنٹ کی جانب سے دار و گیر کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ اسکول و کالج سے طلبہ نکل کر خوشی خوشی جیل جاتے تھے۔(۵۰)

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی بتیول (چھنڈوارہ) جیل سے دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے۔ اس وقت امرتسر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا اجلاس مقرر تھا اور اسی کے ساتھ خلافت کانفرنس بھی ہو رہی تھی، دونوں بھائیوں کو کانفریس کی طرف سے دعوت دی گئی تھی اور دونوں بھائی براہ راست جلسہ گاہ میں پہنچے۔ مولانا محمد علی جوہر نے ایک طویل جذباتی تقریر کی جو کافی پر اثر تھی بقول مولانا عبدالماجد دریابادی: مولانا محمد علی جوہر کی شرکت تمام مسلمانان ہند کی شرکت تھی، کیوں کہ وہ اپنے علم و فضل، اسلام نوازی، جرأت و حق گوئی و بیباکی عظیم ایثار و قربانی کی وجہ سے پورے ملک کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

”یہی وقت تھا جب محمد علی، شوکت علی وغیرہ نے اس تحریک کی کامیابی کے لیے ہندوؤں کو بھی اپنے ساتھ لیا، اور اسی طرح گاندھی جی، اور مولانا عبدالباری فرنگی محی اور محمد علی اور شوکت علی نے مل کر احیائے خلافت کے ساتھ ہندوستان کی تحریک آزادی کے مسئلہ کو بھی تحریک کے مقاصد میں شامل کر لیا اور اس طرح سیاست نے ہندوستان میں نئی کروٹ لی۔ گاندھی جی نے اس تحریک میں عملا حصہ لیا اور شوکت صاحب کے ساتھ مل کر پورے ہندوستان کا دورہ کیا“۔(۵۱)

علی برادران ہندوستان کے مسلمہ لیڈر بن چکے تھے، بیتول جیل سے رہائی کے بعد وہ جن جن اسٹیشنوں سے گذرے، وہاں ان کا عظیم الشان استقبال کیا گیا، وہ دلی گئے تو پبلک امڈ کر آ گئی، اس طرح کے عظیم الشان مجمع اور جلسے اس امر کی نشاندہی کرتے تھے کہ مسلمان سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہے، اب مسلمانون کے سوچنے کا یہ انداز تھا کہ خلافت اسلامیہ مرکزیہ کی بربادی جزیزۃ العرب کی شکست و ریخت اور پوری دنیائے اسلام کی تباہی و بربادی کی ذمہ داری برطانیہ پر ہے اور مسلمانوں کو اپنے ہندو بھائیوں سے مل کر ایک متحدہ قومی جمہوریہ برطانیہ کے اثر

سے آزاد بنانی چاہیے، اس سے برطانیہ کے غرور اور اس کی طاقت کا توڑ ہوسکتا ہے۔

تحریک خلافت کا نقطہ عروج:

تحریک خلافت کا نقطۂ عروج کراچی کے خالق دینا ہال میں علی برادران اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی پر غداری کا مقدمہ تھا۔ ان کی گرفتاری کے بعد ان کی والدہ بی اماں اور بے شمار خواتین میدان میں آ گئیں، اس دوران نظم:

بولی اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پر دے دو

تیرے ساتھ شوکت علی بھی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

کو تاریخی شہرت حاصل ہوئی۔ بچے بچے کی زبان پر یہ شعر تھا، تمام ہندوستانی مسلمان خلافت کے نظام کو بچانے کے لیے قربانیاں دے رہے تھے۔ ۸، ۹، ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس ہوئی، جس میں حضرت شیخ مدنیؒ نے یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ کی فوج کی ملازمت کرنا حرام، کسی کو بھرتی کرانا، یا بھرتی ہونے کی ترغیب دینا سب حرام ہے۔ اس تجویز کو کانفرنس میں اتفاق رائے سے پاس کر دیا گیا۔ انگریز حکمراں طیش میں آ گئے، ان حضرات کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا، گرفتاری ہوئی اور خالق دینا ہال میں مقدمہ چلایا گیا، اس موقع پر جج کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت مدنی نے "**افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر**" کے مصداق پوری جرأت سے فرمایا، اگر لارڈ ریڈنگ اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کریم کو جلا دیں، احادیث کو مٹا دیں اور کتب فقہ کو برباد کر دیں تو سب سے پہلے اسلام پر جان قربان کرنے والا میں ہوں، یہ سن کر مولانا محمد علی جوہر حضرت مدنیؒ کے قدموں میں گر پڑے، انگریز سے یہ حق گوئی برداشت نہیں ہوئی اور آپ کو دو سال قید با مشقت کی سزا دی گئی؛ لیکن آپ کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ (۵۲)

شیخ الهند کی رهائی اور تحریک خلافت کی سرپرستی:

تحریک خلافت کی تاریخ ناقص رہے گی؛ اگر اس میں حضرت شیخ الہند کی رہائی اور ہندوستان واپسی کے بعد اس تحریک میں عملاً شرکت کا تذکرہ نہ کیا جائے؛ کیوں کہ اس تحریک سے جڑے زیادہ تر قائدین شیخ الہند کے تربیت یافتہ اور فکری جانشیں تھے۔ ۱۹۱۶ء میں شریف مکہ نے انھیں گرفتار کر کے انگریزی حکومت کے حوالہ کر دیا تھا، شریف نے خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کی تھی، وہ انگریزوں کا وفادار اور مسلمانوں کی تحریک آزادی اور خلافت عثمانیہ کا شدید مخالف تھا۔ ۱۹۱۷ء میں

بحیرۂ روم میں واقع جزیرۂ مالٹا میں شیخ الہند اور آپ کے تلامذہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل پشاوری، مولانا نصرت حسین، مولانا وحید احمد کو قید کیا گیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن ۲؍مارچ ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے روانہ ہوئے تو ابھی حراست ہی میں تھے، درمیان کی منزلوں پر ٹھہرتے ہوئے آخر مئی میں بمبئی پہنچے تو یہاں رہا کردیے گئے، ان کے ساتھ حکومت کے سی آئی ڈی کے لوگ ہمیشہ لگے رہے، آپ نے جہاز سے قدم باہر نکالا تو تمام ہندوستان کے قائدین استقبال کے لیے موجود تھے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے فضائے آسمانی گونج رہی تھی، بڑے تزک واحتشام کے ساتھ جلوس نکلا اور آپ براہ راست ''خلافت کمیٹی'' کے دفتر تشریف لے گئے، جہاں آپ کا عظیم الشان استقبال کیا گیا اور یہیں آپ کو زعمائے ہند نے ''شیخ الہند'' کا خطاب دیا، جو آپ کے نام کا ایک جز بن گیا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دو دن بمبئی میں قیام کر کے دلی کے لیے روانہ ہوگئے، وہاں ڈاکٹر انصاری کے مکان میں قیام فرمایا، وہاں سے دوسرے دن دیوبند کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں اہل میرٹھ نے سپاس پیش کیا۔

مولانا محمد میاں علمائے حق جلد اول کے ص ۲۱۰ پر تحریر فرماتے ہیں:

> ''راستہ کے اسٹیشنوں پر زائرین کا ہجوم تھا، دیوبند کے اسٹیشن پر پہونچے تو ہجوم کی انتہا نہ رہی، شہر اور دیہات کے لوگ زیارت کو آئے تھے''۔

آگے لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں کے قلوب کسی اطمینان کے طالب تھے، حضرت شیخ الہندؒ کی تشریف آوری نے یہ طلب پوری کردی، اب مسلمانوں کا قدم سب سے تیز تھا، ہر شخص تحریک کا متوالا، جان ومال قربان کرنے پر آمادہ۔ حضرت شیخ الہندؒ کے آجانے سے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک قائد مل گیا، ایک مسلمہ قائد جس کے آگے سب کی گردنیں جھکتی تھیں اور جس کا حکم سب کے لیے واجب التعمیل تھا''۔

جمعیۃ علماء کا پہلا اجلاس زیر صدارت مولانا عبدالباری امرتسر میں ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہوا تھا اور اس میں بہت سے عملی اقدامات کے سلسلہ میں رہنمائی کی گئی تھی؛ لیکن درمیان میں حالات تیزی سے بدلنے لگے، جب خلافت کے سلسلہ میں انگریزوں کا رویہ بے لچک اور سخت ہونے لگا تو ۹ جون ۱۹۲۰ء کو الہ آباد میں خلافت کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا کہ وائسرائے ہند کو نوٹس دی جائے کہ وہ خلافت کے مسئلہ کو جو ایک مذہبی مسئلہ ہے حل کرادیں ورنہ ہم ترک موالات پر مجبور ہوں گے اور

اخیر جون میں خلافت کمیٹی کے ایک وفد نے وائسرائے سے مل کر کہا کہ خلافت کا مسئلہ ہم مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی مسئلہ ہے آپ ہوم گورنمنٹ پر دباؤ ڈالیں وہ ہمارے مطالبات کے مطابق معاہدہ صلح ترکی میں مناسب ترمیم کردے ورنہ ہم مجبور ہوں گے کہ یکم اگست سے ترک موالات (نان کوپریشن) کی تحریک جاری کریں دوسری طرف صلح نامہ ترکی یا معاہدہ سیورے پر دستخط کرنے اور ذلت آمیز شرائط قبول کرنے کا دباؤ اس حد تک بڑھا کہ کہ ترکی کی جانب سے توفیق پاشا نے اہانت آمیز معاہدہ پر دستخط کردیا اس انگریز نواز نے تمام دنیا کے مسلمانوں کی آرزوں اور تمناؤں کا خون کردیا اور ملت اسلامیہ کی ہر آواز ''فغان درویش ثابت ہوئی''

ایسے خطرناک حالات میں جمعیۃ کا دوسرا اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو بمقام دلی ہوا، اس کی صدارت پہلی مرتبہ شیخ الہند نے تمام علمائے امت کی خواہش کے احترام میں نیز اپنا پیام ساری ملت کے لوگوں تک پہنچانے کے لیے قبول فرمالی۔ چوں کہ حضرت شیخ الہندؒ اس وقت بہت زیادہ علیل تھے اس لیے اجلاس کی کاروائی کا اکثر حصہ مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے زیر صدارت انجام پذیر ہوا۔ آپ کی صحت اس وقت بہت کم زور تھی؛ لیکن آپ کا خطبہ صدارت ایک مجموعہ حقائق تھا، جس کی بنیادی باتیں ذیل میں درج ہیں:

(۱) اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے، جس سے ترک موالات کرنا فرض ہے۔

(۲) تحفظ ملت اور تحفظ خلافت خالص اسلامی مطالبے ہیں، اگر برادران وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں۔

(۳) آپ نے اس کے بعد علمائے ملت کو وصیت فرمائی کہ جو صراط مستقیم آپ نے معلوم کی اس پر چلے جایئے، جو لوگ آپ سے علحدہ ہیں ان کو بھی حکمت وموعظت سے اپنی جماعت میں جذب کیجیے اور اگر مجادلہ کی نوبت آئے تو بالتی ھی احسن ہونی چاہیے۔

پانچ سو علماء کا متفقہ فتوی :

اسی اجلاس میں خلافت کمیٹی کی تحریک کی تائید کرتے ہوئے حکومت برطانیہ سے عدم تعاون اور ترک موالات (نان کوپریشن) کی تجویز پاس ہوئی اور جس کا نام آگے چل کر پانچ سو علماء کا متفقہ فتوی ہوا، وہ تاریخی فتوی فقیہ النفس حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کا مرتب کیا ہوا تھا،

یہ فتوی مستقل رسالہ کی شکل میں جمعیۃ علماء ہند سے شائع ہوا، فتاوی امارت شرعیہ میں بھی یہ فتوی شامل اشاعت ہے، اسے گورنمنٹ نے کئی دفعہ ضبط کرایا، شیخ الہند کی رہائی کے بعد سب سے پہلے ترک مولات کا فتوی ۲۹ جولائی ۱۹۲۰ء میں شائع کیا گیا۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ لکھتے ہیں:

''جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے اجلاس کے موقع سے ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں سے علماء تشریف نہ لائے ہوں، اس اجلاس میں حکومت برطانیہ سے عدم تعاون کی تجویز کے سلسلہ میں جو فتوی مرتب کیا گیا اور جس کا نام پانچ سو علماء کا متفقہ فتوی ہوا وہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کا مرتب کیا ہوا تھا۔ فتوی اگرچہ گورنمنٹ برطانیہ سے عدم تعاون کے سلسلہ میں تھا؛ لیکن اس فتوی سے مولانا کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔ جو مولانا کو قدرت سے عطا ہوا تھا۔ اس اجلاس کے بعد مولانا سے تعلقات وسیع ہو گئے۔ جمعیۃ علماء کے اس تاریخی اجلاس سبجیکٹ کمیٹی میں بھی مولانا نے ایک تقریر فرمائی تھی، وہ تقریر اپنی نظیر آپ تھی''۔(۵۳)

مولانا سجاد نے ترک موالات کا جو فتوی مرتب کیا اس کے اغراض ومقاصد کیا تھے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سجاد نے اپنے خطبہ صدارت بموقع اجلاس جمعیۃ علماء مراد آباد میں لکھا ہے:

(۱) ایک مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں اور مسلمان کسی کافر کے محکوم بن کر نہیں رہیں۔

(۲) دوسرا یہ کہ کم از کم حکومت برطانیہ اتنی مفلوج اور کمزور ہو جائے کہ بیرون ملک کے ممالک اسلامیہ پر دست درازی نہ کر سکے۔

(۳) تیسرا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان مسلمانوں کے عقائد واعمال واخلاق پر موجودہ حکومت کی غلامی اشتراک عمل اور خلط ملط سے جو برا اثر پڑ رہا ہے اور جس سے اسلامی روح مردہ ہو جاتی ہے، وہ اس سے محفوظ رہیں۔(۵۴)

خلاصہ کلام:

حاصل یہ ہے کہ خلافت عثمانیہ مسلمانوں کی لیے نشان عظمت تھی، عالم اسلام بالخصوص ہندوستان کے مسلمان اس کو وقار کی علامت سمجھتے تھے اور اس سے جذباتی تعلق رکھتے تھے، اس کے تحفظ کے لیے پورے ہندوستان میں اکبر کے زیر نگرانی تحریک خلافت چلائی، ہر خطہ اور علاقے میں خلافت کمیٹیاں قائم کی گئیں، اسی پلیٹ فارم سے نان کوپریشن مومنٹ یا تحریک عدم تعاون چلائی

گئی، تحریک خلافت کی تنظیمی قوت اتنی زبردست تھی کہ سارا ہندوستان اس کی ایک آواز پر اٹھتا اور بیٹھتا تھا، پورے ملک میں جس قدر نوجوان کارکن تھے، سب اس کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے، ہر طرف اس کی امداد کے لیے روپے برس رہے تھے اور قوتیں یکجا ہو رہی تھیں؛ عوام علماء اور تعلیم یافتہ سب اس تحریک میں یکساں شریک تھے، جب تک ترکی کی خلافت عثمانیہ باقی رہی، یا اس کی بقا کے موہوم، یا متوقع آثار اور موہوم امیدیں باقی رہیں، تو تحریک خلافت کی بھی گرم بازاری رہی اور حضرت مولانا سجاد اس تحریک کے سرگرم داعی اور اس کے تمام اقدامات میں شریک کار رہے اور اس کو اپنا نصب العین سمجھتے رہے؛ لیکن عام طور پر عہدہ ومنصب سے دور رہ کر آپ کا کام کرنے کا مزاج تھا اور عام طور پر پس منظر میں رہ کر کام کرنے کی کوشش کرتے تھے، کام کرنے میں ہمیشہ آپ پیش پیش رہے؛ لیکن جب باری عہدہ ومنصب سنبھالنے کی آئی تو آپ نے دوسرے کو آگے بڑھایا۔ تحریک خلافت ہو جمعیۃ علماء کے قیام کا معاملہ، بہار میں مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کے بینر تلے وزارت اعلیٰ قبول کرنے کا، یا امارت شرعیہ میں امیر شریعت کے عہدہ قبول کرنے کا، ہر جگہ آپ نے دوسروں کو آگے بڑھایا۔

آپ اور دیگر اکابر کی شب وروز جد وجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک خلافت ایک مشعل بن گئی، جس نے ہندوستانیوں کے ضمیر کو روشن کیا اور اسی کے بطن سے علماء کرام کا متحدہ پلیٹ فارم جمعیۃ علماء جیسی مضبوط تنظیم نعمت عظمیٰ کے طور پر حاصل ہوئی، جس نے ہندوستان کی تاریخ میں انقلاب برپا کر دیا اور اسی تحریک کے نتیجے میں اس ملک میں آزادی کامل کی بنیاد پڑی؛ لیکن جب ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو حکومت برطانیہ نے خلافت عثمانیہ کو بالکلیہ کالعدم قرار دے دیا تو خود بخود ہندوستان کی تحریک خلافت کا زور بھی کم ہونے لگا اور بعد میں اس کا وجود بھی پردہ خفا میں چلا گیا؛ تاہم مولانا سجادؒ تا حیات نظریہ امارت وخلافت کے حامی رہے اور کم از کم اس کی عملی تشکیل کے لیے امارت شرعیہ فی الہند کا منصوبہ علماء کے سامنے پیش کیا؛ لیکن ملک گیر پیمانے پر وہ نافذ نہ ہو سکا تو ریاست بہار میں ۱۹ر شوال ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء کو امارت شرعیہ قائم کر کے اس فکر کو دوام عطا کر دیا اور الحمد للہ آج کے حالات میں ملک کی زیادہ تر ریاستوں کے افراد ایک امیر شریعت کی ماتحتی میں شرعی زندگی گذار رہے ہیں اور کل ہند پیمانے پر بھی امارت شرعیہ فی الہند قائم ہو چکی ہے، جو مولانا سجاد کے افکار کا پرتو ہے۔ (فجزاہ اللہ عن المسلمین خیر الجزاء)

❁❁

مصادر ومراجع

(۱) سورۃ البقرۃ ۳۰

(۲) سورۃ ص: ۲۶

(۳) الاحکام السلطانیہ، ص ۲۲

(۴) صحیح بخاری رقم ۳۴۵۵۔ صحیح مسلم ۱۸۴۲

(۵) مجمع الزوائد ۶۱۸/۵

(۶) ماہنامہ الشریعۃ گوجرانوالہ بابت اپریل ۱۹۹۶ء

(۷) ترک ناداں سے ترک داناں تک از مفتی ابولبابہ شاہ منصور ص ۲۸۰

(۸) برید فرنگ۔ص ۱۳۔ مطبوعہ مجلس تحقیق ونشریات لکھنؤ

(۹) آزادی ہند ترجمہ انڈیا ونس فریڈم، مطبوعہ لاہور

(۱۰) حیات سجاد ص ۱۷، ۱۸

(۱۱) یادرفتگاں ص ۲۱۹۔ ۲۲۰، مطبوعہ ادارہ تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

(۱۲) نقیب، مولانا سجاد نمبر ص ۹۷

(۱۳) یہ بہار کے سب سے بڑے کانگریسی لیڈر اور سیاست داں تھے۔ مولانا آزاد ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ جس وقت انتخابات ہوئے ڈاکٹر سید محمود صوبے کے سب سے بڑے لیڈر تھے وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک جنرل سکریٹری تھے اور اس طرح انھیں صوبے کے اندر بھی ایک حیثیت حاصل تھی اور باہر بھی۔ (انڈیا ونس فریڈم ص ۳۳)

(۱۴) محاسن سجاد: ص ۶۱

(۱۵) یادرفتگاں ص ۲۱۷

(۱۶) حیات سجاد ص ۱۳۱

(۱۷) حیات سجاد ص ۹۱

(۱۸) محاسن سجاد ص ۸۴

(۱۹) محاسن سجاد ص ۱۳۱

(۲۰) محاسن سجاد ص ۱۲۲

(۲۱) تاریخ امارت ص ۷۱

(۲۲) تاریخ امارت ص ۴۳

(۲۳) تاریخ امارت ص ۴۶

(۲۳) حضرت مولانا محمد سجاد- حیات وخدمات ص ۹۷، ۹۸

(۲۴) نقیب، مولانا سجاد نمبر ۵۹

(۲۵) محاسن سجاد ص ۲۱

(۲۶) محاسن سجاد۴۳
(۲۷) برید فرنگ ۔ص۱۳۔ مطبوعہ مجلس تحقیق ونشریات لکھنؤ
(۲۸) تحریک خلافت ص۳۹
(۲۹۔۳۰) نقیب مولانا سجاد نمبر ص ۶۰
(۳۱) حیات سجاد ص۱۰۰
(۳۲) فریڈم مومنٹ ان بہار ص ۲۹۹ بحوالہ ہندوستان کی آزادی میں علماء بہار کا حصہ
(۳۳) محاسن سجاد ص۲۰
(۳۴) نقیب مولانا سجاد نمبر ص ۶۰
(۳۵) محاسن سجاد ص۱۰۵
(۳۶) امارت شرعیہ دینی جدوجہد کا روشن باب ص ۶۰
(۳۷) خطبہ صدارت جمعیۃ علمائے ہند گیا
(۳۸) محاسن سجاد ص۱۰۵
(۳۹) محاسن سجاد ص۱۹۲/۱۹ مطبوعہ الہلال بک ایجنسی پٹنہ، کتب خانہ عزیزیہ دہلی
(۴۰) یادرفتگاں ص۲۲۰
(۴۱) محاسن سجاد
(۴۲) مولانا محمد سجاد حیات وخدمات ۲۵۸
(۴۳) تحریک خلافت ص۱۰۳
(۴۴) تحریک خلافت از قاضی عباسی
(۴۵) حیات سجاد ص۸۹،۹۰
(۴۶) حیات سجاد ص۸۶
(۴۷) تحریک خلافت
(۴۸) تحریک خلافت، برید فرنگ
(۴۹) تحریک خلافت ص۱۶۲
(۵۰) تحریک خلافت ۱۶۶
(۵۱) برید فرنگ ص۱۳
(۵۲) شیخ الاسلام، ایک سیاسی مطالعہ ص ۱۲۹
(۵۳) حیات سجاد ۷۷،۷۸
(۵۴) خطبہ صدارت از مولانا سجاد ص۹۴

ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد بہاریؒ

جمعیۃ علماء ہند کے ایک اَہم معمار

مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری
استاذ حدیث ومفتی جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

جمعیۃ علماء ہند کو جن بزرگوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے، اُن میں ایک نمایاں اور سنہرا نام ''ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد صاحب بہاریؒ'' کا بھی ہے۔

موصوف انتہائی جرأت مند، باہمت، فعال اور صائب الرائے شخص تھے، ملی ہمدردی اور اِیمانی حمیت رگ وپے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، شروع میں اِصالۃً کم آمیزی اور گوشہ نشینی کی زندگی گذارتے تھے، بس درس وتدریس کا مشغلہ تھا، جس میں فراغت کے بعد کم وبیش اٹھارہ سال تک مشغول رہے۔

لیکن جنگ عظیم ۱۹۱۶ء میں ممالک اِسلامیہ کے ہوش ربا حالات اور خلافتِ اِسلامیہ عثمانیہ کے سقوط کے واقعہ نے آپ کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور آپ خالص تدریسی زندگی سے سماجی اور سیاسی زندگی کی طرف منتقل ہوگئے۔

جمعیۃ علماء بہار اور جمعیۃ علماء ہند کا قیام:

چناں چہ نہ صرف یہ کہ آپ نے ''خلافتِ تحریک'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا؛ بلکہ ''جمعیۃ علماء ہند'' کے قیام سے بھی دوسال پہلے ۱۹۱۷ء ''جمعیۃ علماء بہار'' کے نام سے علماء کی ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔

اور نومبر ۱۹۱۹ء میں جب دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کا پہلا مشاورتی اجلاس منعقد ہوا، اُس میں آپ کے نمائندے مولانا عبدالحکیم صاحب گیاوی نے شرکت کی۔

حضرت مولانا سید مناظر حسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اُس زمانہ کی روداد لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اُس وقت تک دلی کی جمعیۃ العلماء کو خواب میں بھی نہ دیکھا گیا تھا، طے ہوا کہ صوبہ بہار کے علماء کو پہلے ایک نقطہ پر متحد کیا جائے، پھر بتدریج اُس کا دائرہ بڑھایا جائے۔ صوبہ کی جمعیۃ علماء کے پہلے اجلاس کے لئے قصبہ ''بہار'' کا انتخاب عمل میں آیا، مونگیر کی خانقاہ کی طرف سے جمعیۃ کی شرکت کے لئے خاکسار کو بھیجا گیا، بہار (شریف) میں تقریباً ہر ضلع کے علماء موجود تھے، حضرت مولانا شاہ اَبن پھلواروی اِس جمعیۃ کے پہلے صدر مقرر ہوکر آئے۔ مسماۃ بی بی صغریٰ مرحومہ کے وقف اسٹیٹ کے مکان میں مولانا پھلواروی کا قیام تھا، مجلس قائمہ نے انتظامی تجویزوں کا خاکہ تیار کیا، اَب یاد نہیں ہے کہ کس پر غالبًا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی رہائی کی تجویز تھی، اُس سے شاہ صاحب کو کچھ اختلاف ہوا؛ یعنی اجلاس کے دوران حکومت کی برہمی کا اندیشہ ہوا اور عین وقت پر صدارت کے فریضہ سے دست کشی کی آواز ہر طرف سے آنے لگی، حضرت مولانا محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت میں ہم لوگ شاہ اَبن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یاد ہے کہ اُس وقت کا فقرہ اِس لیے ذکر کردوں کہ علماء اُس وقت تک حکومت مسلطہ سے کس درجہ خوف زدہ کردئے گئے تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ''بھائی تم لوگوں کو کیا؟ آزاد ہو، جو چاہو کہو؛ لیکن انگریز کمشنر کی گرم نگاہوں کا مقابلہ تو مجھے کرنا ہوگا''؛ مگر ہم لوگوں کی منت وسماجت سے شاہ صاحب راضی ہوگئے اور جلسہ میں تشریف لائے، اور خطبہ صدارت بجائے تحریر کے تقریر کے ذریعہ سے پڑھا گیا......الخ۔

خیر وخوبی سے جمعیۃ علماء بہار کا پہلا اجلاس ختم ہوگیا......الخ۔ (۱)

اور حضرت مولانا شاہ سید محی الدین صاحب قادری رحمۃ اللہ علیہ اَمیر شریعت ثانی اِمارت شرعیہ بہار اِس بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے لئے ہندوستان کے اکثر صوبوں میں سفر کرکے علماء میں اس کی تبلیغ کی اور لوگوں کو آمادہ کیا؛ لیکن عمل کی طرف پہلا قدم مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اور پہلا اجلاس ہندوستان میں جمعیۃ کا بنام ''انجمن بہار شہر بہار'' میں ......منعقد ہوا، اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی اور اس کے بعد مختلف صوبوں میں شاخیں قائم ہوئیں اور پھر علماء نے مستعد ہوکر کام شروع کردیا اور الحمد للہ آج ہندوستان کے ہر صوبہ میں جمعیۃ علماء قائم ہے اور جس قدر جمعیۃ نے اسلام اور مسلمانوں کا کام انجام دیا ہے، وہ دنیا پر ظاہر

ہے''۔(۲)

اِسی دوران آپ نے انگریز کے خلاف ترکِ موالات کا مبسوط فتویٰ بھی جاری کیا، جس پر اُس وقت کے اکابر علماء کے دستخط ہیں اور آپ نے اپنے نام کے ساتھ ناظم جمعیۃ علماء بہار تحریر فرمایا ہے، یہ رسالہ ۱۶؍صفحات پر مشتمل ہے اور مطبوعہ ہے۔

گیا (بہار) میں جمعیۃ علماء ہند کا ایک یادگار اِجلاسِ عام:

حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ ''جمعیۃ علماء ہند'' کی اہم مجالس میں شریک رہتے، بہترین مشورے دیتے اور جو بھی خدمت سپرد کی جاتی، اُسے بحسن وخوبی انجام دیتے تھے، چناں چہ جس وقت پورے ملک میں خلافت کمیٹی کا غلغلہ تھا اور جمعیۃ علماء ہند ابھی گویا کہ انگڑائی لے رہی تھی، اُسی وقت گیا میں جمعیۃ علماء ہند کا ایک اِجلاس ۱۹۲۱ء میں ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کی نگرانی میں پوری شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ اِس اِجلاس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا سید مناظر اَحسن گیلانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

''دلی میں بہار والی جمعیۃ ''جمعیۃ العلماء ہند'' کے نام سے چمکی اور ایسی چمکی کہ ایک زمانہ تک کم اَز کم مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا وہ ایسا ممتاز اِدارہ رہا، جس کا مقابلہ مدت تک کوئی اِسلامی سیاسی اِدارہ نہ کرسکا، حالاں کہ اُس وقت کانفرنسوں کا بڑا زور تھا؛ لیکن گیا کے میدانوں میں آکر دنیا نے تماشا کیا کہ جس جمعیۃ کی بنیاد ''بہار'' میں رکھی گئی تھی، وہ ایک خالص ہندو شہر اور بودھسٹ مرکز میں تھی، ایسے روشن چراغ کو اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھی کہ اُس کے سامنے کانگریس کا آفتاب اور خلافت کا ماہتاب بھی شرمانے لگا اور اِس کا اعتراف اپنے اور غیروں سب نے کیا، اِسی کا اعتراف نہیں؛ بلکہ اس کا بھی کہ سارے ہندوستان کا سب سے نمایاں اجلاس ''جمعیۃ علماء گیا'' کا اِجلاس تھا، اور جمعیۃ علماء گیا کا اجلاس صرف اُس واحد شخصیت (حضرت مولانا سجادؒ) کی عملی قوتوں کا مظہر تھا، جس کے معنی یہی ہوئے کہ وہ اُس وقت سارے ہندوستان کی بڑی نمایاں ہستی حضرت مولانا محمد سجادؒ کی تھی، جمعیۃ علماء اُس کے بعد بھی بڑھتی رہی، چمکتی رہی؛ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ گیا کا اجلاس نہیں؛ بلکہ جمعیۃ کے جتنے اجلاس ہوتے رہے، اُس کی بولنے والی روح اور خاموش زبان تھی، جو زندگی میں بھی خاموش رہنے کے باوجود سب سے زیادہ بولنے والی تھی اور اِن شاء اللہ اُس کی خاموش بولیاں اَبد تک نہ چپ ہونے والی بولیاں ہیں''۔(۳)

اور جناب راغب حسین ایم اے کلکتہ اپنے تأثراتی مضمون میں لکھتے ہیں کہ!

''حضرت مولانا محمد سجادؒ کی پہلی دفعہ...... میں نے گیا کانگریس ۱۹۲۲ء کے موقع پر جمعیۃ علماء ہند کے عظیم الشان پنڈال میں دیکھا تھا، گیا کانگریس کا اجلاس زیر صدارت مسٹر سی آر داس آنجہانی ہورہا تھا، سوراج پارٹی کی بنیاد پنڈت موتی لال نہرو، داس اور حکیم اجمل خاں مل کر ڈال رہے تھے، گیا میں اس موقع پر آل انڈیا خلافت کانفرنس اور جمعیۃ علماء ہند کی سالانہ کانفرنسیں بھی ہورہی تھیں، دسمبر کا مہینہ تھا، کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا، کانگریس، خلافت اور جمعیۃ کے پنڈال دریائے پھلگو کے کنارے شہر سے باہر ریت کے ٹیلوں اور خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں قائم تھے۔

کانگریس اُس وقت بھی سرمایہ دار ہنود کی مجلس تھی، اس کا پنڈال ہندو طرز تعمیر کا نمونہ تھا، صدر گیٹ، دروازے اور اس کے ستون بدھسٹ طرز تعمیر کے مطابق بنائے گئے تھے، اس کا ظاہر و باطن کاملاً ہندو تھا، اس کی تعمیر پر ہزاروں ہزار روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔

اس کے بالکل برعکس ''جمعیۃ علماء ہند'' کا پنڈال اسلامی سادگی، نفاست اور جدت اور انڈو سارا سینک عربی ہندی طرز تعمیر کی رعنائیوں کا آئینہ دار تھا، اس کے عالی شان صدر پھاٹک اور داخل و خارج ہونے کے دروازوں پر عربی حروف میں معنی خیز آیاتِ قرآنی درج تھے، مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں لاکھوں ہندو روزانہ جمعیۃ علماء کے پنڈال کو آکر دیکھتے اور تعریف کرتے تھے، جو کلمہ سب کی زبانوں پر عام تھا، وہ یہ تھا کہ ''باوجود سادہ اور کم خرچ ہونے کے جمعیۃ کا پنڈال؛ کانگریس کے پنڈال سے ہزار درجہ زیادہ آرام دہ، زیادہ روشن وفراخ اور زیادہ حسین وجمیل اور زیادہ عالی شان، زیادہ پرشکوہ تھا'' اور یہ سب کچھ مولانا سجادؒ کی اعلیٰ تعمیری صلاحیت کا نتیجہ تھا، مجھے معلوم تھا کہ مولانا نے یہ سارا انتظام انتہائی بے سروسامانی، بے مائیگی اور پریشانی کے عالم میں اور قلیل ترین وقت؛ یعنی صرف چند دنوں کے اندر کیا تھا، گیا کی جمعیۃ علماء کانفرنس اور خلافت کانفرنس کی اصل روح رواں، دماغ مدبر اور مرکزی شخصیت مولانا سجادؒ کی ذات تھی، مولانا سجادؒ کے محض چند گنے ہوئے دنوں کے اندر جمعیۃ علماء اور خلافت کانفرنس کے متعلق جملہ انتظامات باوجود غربت وافلاس اور بے سروسامانی کے اتنے اعلیٰ پیمانہ اور بہترین؛ بلکہ نادر ترین انداز پر کیا تھا کہ ہندو مسلم اکابر کی نگاہیں بے اختیار مولانا پر مرکوز ہورہی تھیں اور سب کی زبانیں اس حقیقت کے اعتراف میں ہم آواز تھیں کہ گیا

کانگریس نے ملک کی ایک نادر اور حیرت انگیز تنظیمی طاقت کا انکشاف کیا ہے“۔

مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب قادری دانا پوریؒ جمعیۃ علماء ہند کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، آپ نے مولانا سجادؒ کی انتظامی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے کھلے اجلاس میں فرمایا تھا کہ:

”مولانا سجاد نے مسلمانوں کی عظیم الشان تنظیمی اور سیاسی کارروائی کا جو ثبوت دیا ہے، وہ اس درجہ بلند ہے کہ سوراج ملنے کے بعد مولانا کو ہندوستان کا گورنر اور گورنر جنرل بنانا موزوں ہوگا؛ کیوں کہ وہ ایک نئے ہندوستان کے نئے خیالات واُصول کے مطابق تعمیر کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں“۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند صدر اجلاس نے جو خود بھی بڑے منتظم بزرگ تھے، اس خراجِ تحسین کی تائید فرمائی تھی:

”اسی اجلاس گیا کے موقع پر مجھے مولانا مرحوم کی تقریر سننے کا پہلا موقع ملا تھا اور یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ صاحب بیان نہیں؛ بلکہ صاحب عمل بزرگ تھے“۔(۴)

اِس مبسوط چشم دید تأثر سے حضرت مولاناؒ کی عظیم شخصیت اور عظیم کمالات کا بہت کچھ اَندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جمعیۃ علماء ھند کی مرکزی قیادت میں آپ کا مقام:

جب ہم جمعیۃ کے پرانے ریکارڈ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اُس وقت کے جمعیۃ کے قائدین میں مرکزی مقام حاصل تھا۔

چناں چہ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو جمعیۃ علماء کے اِجلاس امرتسر میں آپ کو مرکزی منتظمہ کا رکن نامزد کیا گیا۔(۵)

جمعیۃ علماء ہند کے اِجلاس پشاور منعقدہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں ملک بھر میں محاکم قضاء کے قیام کے لیے ایک سب کمیٹی بنائی گئی، جس میں خصوصی طور پر حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کا نام شامل تھا۔

اِسی طرح مسودہ قانون فسخ نکاح کی تیاری کے لیے ۱۹۳۶ء میں مراد آباد کے اِجلاس میں آپ کو ذمہ داری دی گئی اور آپ نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ مسودہ پیش فرمایا۔

نظامت عمومی:

تا آں کہ جولائی ۱۹۴۰ء میں آپ کو باقاعدہ جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی ناظم عمومی کے منصب

پر فائز کیا گیا؛ لیکن افسوس کہ آپ کی عمر نے وفا نہ کی اور نومبر ۱۹۴۰ء میں آپ کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

اِس طرح کل ۶ر مہینے آپ نظامت عمومی کے منصب پر فائز رہے۔

جمعیۃ علماء ھند کا جنگ کے متعلق اعلان:

اِسی دوران آپ نے جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے فیصلے کے مطابق جنگ عظیم میں برطانیہ کی طرف سے ہندوستانی شہریوں کو زبردستی شامل کرنے کے خلاف احتجاج کا اعلان فرمایا، نیز آپ نے ہندوستانی وائسرائے کے نام ایک مکتوب روانہ کیا، جس میں یہ صراحت تھی کہ!

''جمعیۃ علماء ہند کا جنگ میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ مذہبی اُصول اور قرآنِ مجید کی تصریحات پر مبنی ہے، نیز وہ اپنے صحیح اور مستحکم مذہبی عقیدے کی تبلیغ واِشاعت کا حق بھی رکھتی ہے، اُس کے اِس تبلیغی حق کو حکومت غصب نہیں کرسکتی اور اگر وہ اِس تبلیغ واِشاعت پر بھی پابندی عائد کرنے کا اِقدام کرے گی تو یہ صریح طور پر مداخلتِ مذہبی ہوگی''۔

انتقال پرملال پر تعزیت:

آپ کی وفات نومبر ۱۹۴۰ء میں ہوئی، اُس کے بعد ۵رتا۶ رجنوری ۱۹۴۱ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا ایک اہم اجلاس دفتر جمعیۃ علماء ہند میں زیر صدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر جمعیۃ علماء ہند منعقد ہوا، جس میں آپ کی وفات پر درج ذیل تجویز باتفاق رائے منظور کی گئی:

تجویز: جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ زعیم لمیت، مجاہد ملت، مفکر جلیل، عالم نبیل، حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند و نائب امیر شریعت صوبہ بہار کی وفات پر (جو ۱۸رشوال ۱۴۵۹ھ کو پھلواری شریف میں ہوئی) اپنے عمیق رنج واندوہ کا اظہار کرتا ہے اور اِس سانحۂ روح فرسا کو مسلمانانِ ہند کے لئے نا قابل تلافی نقصان سمجھتا ہے، مولانا کی ذات گرامی مذہب وملت اور اِسلامی سیاست کی ماہر خصوصی تھی، ان کی مذہبی، قومی، وطنی خدمات صفحاتِ تاریخ پر آبِ زر سے لکھی جائیں گی اور مسلمانانِ ہند اُن کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد بہاریؒ غیر معمولی علمی وعملی اور فکری صلاحیتوں کا مجموعہ تھے اور جمعیۃ علماء ہند کا بیش قیمت سرمایہ تھے، اُن کی کمی کو شدت سے محسوس کیا گیا۔

یہ مجلس مولانا کی اہلیہ محترمہ اور اُن کے صاحب زادے اور دیگر اعزاء کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی ظاہر کرتی ہے اور رب العزت جل شانہ کی بارگاہ میں دست بدعا ہے کہ مولانا کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور اُن کی تربت کو اپنی رحمتوں کی بارش سے سیراب کرے۔ آمین''۔(۶)

اِس تجویز کے ہر ہر لفظ سے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مزید یہ کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ صدر جمعیۃ علماء ہند نے جمعیۃ علماء ہند کے تیرہویں اجلاس منعقدہ ۱۹۴۲ء لاہور میں اپنے خطبہ صدارت میں درج ذیل کلمات سے آپ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ آپ نے فرمایا:

''حضرات! رفقاء کار کے اِس اجتماع میں ہم حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم اور برگزیدہ شخصیت کو فراموش نہیں کرسکتے، جنہوں نے گذشتہ تیس سال میں مسلمانانِ ہند کی زبردست خدمات انجام دی ہیں، اِسی عرصہ میں مسلمانانِ ہند کی تمام اہم مذہبی اور سیاسی تحریکات میں کوئی ایک تحریک بھی ایسی نہیں ہے، جس میں مرحوم نے پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ نمایاں حصہ نہ لیا ہو، جمعیۃ علماء ہند میں اُن کی شخصیت بہت اہم تھی، اُنھوں نے اپنی تمام زندگی جمعیۃ علماء کی خدمت اور اُس کو ترقی دینے کے لئے وقف کردی تھی، اپنی زندگی کے آخری دور میں مرحوم جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے، اُن کی وفات مسلمانوں کے لئے عموماً اور جمعیۃ علماء ہند کے لیے ایک ایسا قومی وملی صدمہ عظیم ہے، جس کی تلافی نہیں ہوسکتی''۔(۷)

خلاصہ یہ کہ حضرت ابوالمحاسنؒ ایک طرف جہاں اِمارتِ شرعیہ بہار کے روحِ رواں تھے، وہیں جمعیۃ علماء ہند کے بھی فعال رہنما اور مرکزی قائد تھے، اُن کی زندگی آنے والوں کے لیے بہترین مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مرحوم کو اُن کی عظیم خدمات کا بہترین صلہ عطا فرمائیں اور ہمیں اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازیں۔(آمین یارب العالمین)

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمد وآلہ وصحبہ أجمعین

برحمتک یا أرحم الراحمین

۞۞

مصادر ومراجع

(۱) حیاتِ سجاد ۵۱-۵۲

(۲) حیاتِ سجاد ۶۹

(۳) حیاتِ سجاد ۵۵-۵۶

(۴) محاسن سجاد ۱۰۲-۱۰۴

(۵) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری ۹۸/۲

(۶) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی سیاسی ڈائری ۱۵۳/۳-۱۵۴

(۷) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی سیاسی ڈائری ۱۵۶/۳

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحبؒ

اور جمعیۃ علماء ہند

مفتی اختر امام عادل قاسمی
بانی و مہتمم جامعہ ربانی، منوراشریف، سمستی پور

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجادؒ اپنے عہد کے ممتاز عالم دین، بلند پایہ مفکر، بے نظیر داعی انقلاب اور انتہائی عظیم قومی، ملی اور سیاسی رہنما تھے، ان کے دل و دماغ کے تمام دروازے کھلے ہوئے تھے، وہ علم و عمل کا مجسمہ اور فکر و انقلاب کا پیکر تھے، ان کا علم زندہ، روحانیت مضبوط اور جذبۂ عمل طاقتور تھا، وہ نگاہ دوررس اور ذہن رسا کے مالک تھے، بصیرت دینی، فراست ایمانی اور تبحر علمی کے وہ عظیم شاہکار تھے، وہ اشیاء کے حقائق اور معاملات کی گہرائیوں تک پہونچنے والے رہنما تھے، ان کا تدبر بے نظیر اور تفکر عالمگیر تھا، وہ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو کی زندہ مثال تھے، وہ اس عہد زوال میں انسانیت کے لیے رب کائنات کا بیش قیمت عطیہ تھے، جس عہد میں وہ پیدا ہوئے اور جہاں انہوں نے شعور و آگہی کی آنکھیں کھولیں، اس میں ایسے ہی زندہ دل، بلند حوصلہ، تازہ دم اور پختہ کار رہنما کی ضرورت تھی، حضرت مولانا سجاد کی ملی خدمات کا دائرہ بے حد وسیع ہے، مولانا کی زندگی کا تقریباً پچیس سالہ عرصہ انہی خدمات میں صرف ہوا، جس میں زندگی کے ہر نشیب و فراز کا سامنا کیا، حصولیابیاں بھی دیکھیں اور محرومیاں بھی، بقول حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ:

> ''سخت سے سخت مصیبتیں جھیلیں، لوگوں کی زبان سے گالیاں بھی سنیں اور پھر انہی کے ہاتھ سے پھولوں کے ہار بھی پہنے، ایسا بھی ہوا کہ گاؤں والوں نے تقریر نہیں کرنے دی اور گویا نکال دیا اور یہ بھی دیکھا کہ مولانا کی سواری کے ساتھ دو دو کوس تک گاؤں والے خوشی میں نعرہ لگاتے دوڑتے چلے جا رہے ہیں''۔(۱)

ذھنی انقلاب-تدریس سے ملی قیادت کی طرف:

مولانا فطری طور پر خالص مدرس تھے، فراغت کے بعد تقریباً اٹھارہ سال (۱۸) تک آپ

مختلف مدارس اسلامیہ میں مصروف تدریس رہے، مولانا میں یہ ذہنی تبدیلی قریب ۱۹۰۸ءیا۱۹۰۹ء سے شروع ہوئی، جب ان کا ایک انگریزی داں شاگرد زاہد حسین خان دریا آبادی (الٰہ آباد کا ایک محلّہ) ان کو انگریزی اخبارات سے دنیا کے حالات سناتا تھا اور مولانا ان کو سن کر تڑپ تڑپ اٹھتے تھے، دل کے اسی اضطراب نے ان کا ذہنی رخ تبدیل کیا اور رفتہ رفتہ وہ کتابی دائرے سے نکل کر ملت کے وسیع میدان میں پہونچ گئے، روز روز ایک ہی سبق کی تکرار سے دلچسپی کم ہوتی چلی گئی، دنیا کے بدلے ہوئے حالات میں مدرسہ کا حصار انہیں تنگ محسوس ہونے لگا، بالآخر''انہوں نے وہ چیز پالی، جس کی انہیں ضرورت تھی؛ بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں اسی کے لیے وہ پیدا کئے گئے تھے'' پہلے ان کے سامنے صرف مدرسہ کے لوگوں کے مسائل تھے، اب ساری قوم بلکہ ساری انسانیت کا درد ان کا درد بن گیا:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیؔر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ایک مرکز جامع کی تاسیس:

چنانچہ اس ذہنی انقلاب کے بعد انہوں نے گیا پہونچ کر ایک ایسے مدرسہ کی بنیاد ڈالی، جو ان کی تعلیمات کا مرکز بھی تھا اور تحریکات کا منبع بھی۔ مولانا منت اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا نے گیا پہونچ کر قومی اور ملکی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا، علماء کی تنظیم، جمعیۃ علماء کا قیام، تمام مدارس عربی میں ایک اصلاحی نصاب کا اجراء، امارت شرعیہ کی اسکیم وغیرہ، یہ سب چیزیں مولانا کے دماغ نے گیا ہی میں پیدا کیں''۔(۲)

جمعیۃ علماء ہند کی تحریک اور مشکلات:

مولانا سجاد صاحب غیر اسلامی ہندوستان میں نصب امیر کو مسلمانوں کا ملی فریضہ تصور فرماتے تھے؛ مگر اس کے لیے علماء کا اتحاد ضروری تھا، چنانچہ ۱۹۱۷ء سے بہت قبل ہی مولانا نے جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس کا پروگرام بنایا، علماء کو خطوط لکھے اور ملک کے مختلف حصوں کے دورے کئے اور اس تعلق سے پیدا ہونے والے شبہات کے جوابات دیئے، ان مراسلات واسفار کے اخراجات آپ کے خصوصی مسترشد اور شہر گیا کی متمول شخصیت حضرت مولانا قاضی احمد حسین صاحبؒ نے برداشت کئے؛ مگر علماء کے مسلکی اور نظریاتی اختلافات کی بنا پر کافی دشواریوں کا سامنا ہوا، مختلف الخیال اور مختلف المشرب علماء کو ایک جگہ جمع کرنا آسان نہیں تھا، علاوہ

اکثر علماء کو سیاست سے دلچسپی نہیں تھی، بعض کے نزدیک تو یہ شجر ممنوعہ تھا اور علماء کی شان کے منافی تصور کیا جاتا تھا۔۔۔ مولانا شاہ محمد عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ!

''مولانا سجاد کی کوششوں اور افہام وتفہیم سے ضرورت تو بہت علماء محسوس کرنے لگے تھے؛ لیکن قابل عمل نہیں سمجھتے تھے''۔(۳)

آپ کے اولین رفیق کار امیر شریعت ثانی حضرت مولانا شاہ محی الدین پھلواروی تحریر فرماتے ہیں:

''جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے لیے ہندوستان کے اکثر صوبوں میں سفر کر کے علماء میں اس کی تبلیغ کی اور لوگوں کو آمادہ کیا؛ لیکن عمل کی طرف پہلا قدم مولاناؒ کا تھا''۔(۴)

مولانا عظمت اللہ ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک میں، یا خیر خواہی اور وفاداری تھی، یا خاموشی تھی، یا گوشہ نشینی تھی، مولانا نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا، علماء صوفیاء اور تعلیم یافتہ لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں، لوگ آپ کے مخلصانہ جذبات اور فدا کارانہ عمل کو دیکھ کر تحریک حریت میں شریک ہوئے۔۔ اس وقت تک ہندوستان میں علماء کا کوئی باقاعدہ نظام نہ تھا، نہ علماء میں جماعتی زندگی کا احساس تھا، پوری فضائے ہند تنظیم علماء کی تحریک سے خاموش تھی، مولانا کو علماء کی جماعتی زندگی کا خیال آیا اور ۱۹۱۷ء میں مدرسہ انوار العلوم کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر جمعیۃ العلماء بہار کی طرح ڈالی، اس کے دیکھا دیکھی دوسرے صوبوں میں بھی جمعیۃ علماء قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی''۔(۵)

جمعیۃ علماء بہار کی تاسیس:

آخر ایک روز مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے قاضی احمد حسین صاحبؒ سے کہا کہ!

''علماء ہند کو جمعیۃ علماء کے قیام پر انشراح نہیں ہے؛ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ گیا میں علماء بہار کا جلسہ بلاؤں''۔

قاضی صاحب نے اتفاق کیا اور اجلاس کے انعقاد میں اپنا پورا تعاون پیش کیا، چنانچہ ۳۰ر صفر المظفر ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو مدرسہ انوار العلوم گیا کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر جمعیۃ علماء بہار کی بنیاد پڑی اور اس کا صدر مقام مدرسہ انوار العلوم قرار پایا، اس کا ابتدائی نام ''انجمن علماء بہار'' رکھا گیا۔(٦)

حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ جوان دنوں خانقاہ رحمانی مونگیر میں خدمت انجام دے رہے تھے اور جب مولانا سجاد صاحبؒ اس فکر کو لے کر مونگیر تشریف لے گئے تھے تو اس منظر کے عینی شاہد تھے اور پھر خانقاہ رحمانی کی طرف سے جمعیۃ علماء بہار کے پہلے اجلاس میں شریک بھی ہوئے، ان کا بیان ہے کہ!

''ابھی (مونگیر میں مولانا گیلانیؒ کے قیام کو) چند مہینے ہوئے تھے کہ وہی استھاواں کا الکن خطیب مونگیر اسی غرض سے آیا ہوا تھا کہ علماء کی منتشر اور پراگندہ جماعت کو ایک نقطہ پر خاص سیاسی خیالات کے ساتھ جمع کیا جائے، اس وقت تک دلی کی جمعیۃ العلماء کا خواب بھی نہ دیکھا گیا تھا، طے ہوا کہ صوبہ بہار کے علماء کو پہلے ایک نقطہ پر متحد کیا جائے، پھر بتدریج اس کا دائرہ بڑھایا جائے''۔(۷)

امیر شریعت ثانی حضرت مولانا شاہ محی الدین پھلواروی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''پہلا اجلاس ہندوستان میں جمعیۃ کا بنام انجمن علماء بہار شہر بہار میں بزمانہ عرس حضرت مخدوم الملکؒ منعقد ہوا، اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی اور اس کے بعد مختلف صوبوں میں شاخیں قائم ہوئیں اور پھر علماء نے مستعد ہو کر کام شروع کر دیا اور الحمدللہ کہ آج ہندوستان کے ہر صوبہ میں جمعیۃ علماء قائم ہے''۔(۸)

پر آشوب دور:

یہ دور ملک وملت کے لیے انتہائی پرآشوب اور نازک تھا، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ وغیرہ مالٹا میں قید تھے اور "علی برادران (مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا شوکت علیؒ وغیرہ)، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور بہت سے ہندو مسلم زعماء وقائدین بھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتار اور نظر بند تھے؛ کیوں کہ اتحادیوں (انگریز، اٹلی، یونان، امریکا اور فرانس) کی صف سے روس کے نکل جانے کی وجہ سے حکومت برطانیہ کو خطرہ ہو گیا تھا کہ ان کے دشمن ترکوں کو قوت حاصل ہو جائے گی۔(۹)

جمعیۃ علماء بہار کا پہلا اجلاس:

قیام انجمن کے بعد مولانا سجادؒ نے اس کو عملی صورت دینے کے لیے باقاعدہ ایک اجلاس عام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے مسلمانوں کے مشہور تاریخی شہر بہار شریف کا انتخاب فرمایا، حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین احمد منیری قدس سرہ کے عرس کی مناسبت سے ۵،

۶/شوال ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۴، ۱۵/جولائی ۱۹۱۸ء کی تاریخ طے کی گئی، حضرت مولاناؒ کی خواہش پر جناب سید محمد قاسم صاحبؒ متولی صغریٰ وقف اسٹیٹ بہار شریف نے مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں جلسہ کرنے کی اجازت دے دی، استقبالیہ کمیٹی کے صدر آپ کے تلمیذ ارشد مولانا اصغر حسین بہاریؒ مقرر ہوئے، اس کے بعد صوبہ بہار کے تمام ہی مقتدر علماء ومشائخ اور دینی اداروں کو دعوت نامے ارسال کئے گئے، طوطیٔ ہندوستان حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلوارویؒ اس پہلے اجلاس کے صدر قرار پائے۔۔۔اکثر علمی اور ملی حلقوں میں اس دعوت کو پذیرائی ملی، مقررہ تاریخ پر یہ اجلاس نہایت تزک واحتشام کے ساتھ مدرسہ عزیزیہ کے وسیع وعریض صحن میں منعقد ہوا جس میں ہر مکتب فکر کے علماء کی نمائندگی شامل تھی، تقریباً پچاس (۵۰) ممتاز علماء وصوفیاء وقائدین ملت نے شرکت کی، علاوہ عوام وخواص کا ایک جم غفیر تھا، جو حد نگاہ پھیلے ہوئے شامیانوں کے اندر اور باہر پھیلا ہوا تھا۔(۱۰)

حضرت شاہ سلیمان پھلوارویؒ اس اجلاس میں کلیدی شخصیت کے حامل تھے، مجلس قائمہ میں تجاویز کی منظوری کے وقت ان کو بعض جزئیات سے اختلاف ہوا (بقول علامہ گیلانیؒ) غالباً حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی رہائی کے مطالبہ کی تجویز سے ان کو اتفاق نہیں تھا (جو ان دنوں مالٹا میں قید تھے)؛ مگر اس کا سبب کوئی مسلکی اختلاف نہیں؛ بلکہ حکومت وقت کا خوف تھا؛ لیکن مولانا سجادؒ کی نگاہ بہت دوررس تھی، وہ اس تجویز کو ہر حال میں شامل کرنا چاہتے تھے؛ مگر شاہ صاحبؒ کو بھی اپنی رائے پر اصرار تھا، آخر اچانک عین وقت پر اجلاس کی صدارت سے معذرت کر دی اور معاملہ نازک صورت حال اختیار کر گیا، مولانا گیلانیؒ کا بیان ہے کہ!

”ہم لوگ حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کی رفاقت میں شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، یاد ہے اس وقت کا فقرہ اس لیے ذکر کر دیا، علماء اس وقت تک حکومت مسلطہ سے کس درجہ خوف زدہ کر دیئے گئے تھے، شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بھائی تم لوگوں کو کیا، آزاد ہو جو چاہو کہو؛ لیکن اولڈہم (شاید پٹنہ کے کسی انگریز کمشنر کا نام تھا) کی گرم نگاہوں کا مقابلہ تو مجھے کرنا پڑتا ہے؛ مگر ہم لوگوں کی منت وسماجت سے شاہ صاحبؒ راضی ہو گئے، جلسہ میں تشریف لائے اور خطبۂ صدارت بجائے تحریر کے تقریر کے ذریعہ سے پڑھا گیا، خاکسار کے شباب کا زمانہ تھا، جوش وخروش میں خوب دھواں دھار تقریریں کی گئیں۔۔۔جلسہ بہت کامیاب رہا، علماء اور مہمانوں کی پرتکلف ضیافت کا انتظام وقف

اسٹیٹ کی جانب سے کیا گیا''۔(۱۱)

اس اجلاس میں جواہم تجاویز منظور ہوئیں، ان میں علماء کے فرائض منصبی کی یاددہانی، بلاخوف ملامت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی، ایک قومی بیت المال کا قیام، اوقاف کی اصلاح، قربانی اور دیگر شعائر اسلام کی حفاظت اور اس سلسلے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش وغیرہ کے علاوہ حضرت شیخ الہندؒ، مولانا ابوالکلام آزاد اور علی برادران وغیرہ اسیران فرنگ کے مطالبۂ رہائی کی تجاویز منظور کی گئیں۔(۱۲)

جمعیۃ علماء ہند کا قیام:

حضرت مولانا سجاد صاحبؒ جمعیۃ کو صرف بہار کی حد تک محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے، حسن اتفاق ۲۹؍صفر المظفر ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۳؍نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں جشن صلح کے موقعہ پر خلافت کانفرنس ہونے والی تھی، جس میں ہر مکتب فکر ونظر کے افراد بڑی تعداد میں شریک ہو رہے تھے، مولانا عبدالباری اور مولانا محمد سجاد صاحب تحریک خلافت کے بنیادی لوگوں میں تھے، ان حضرات نے فیصلہ کیا کہ اس موقعہ پر الگ سے کوئی نشست کر کے جمعیۃ علماء کی عملی تشکیل کی کوشش کی جائے گی۔

۲۳؍نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کمیٹی کی پہلی کانفرنس زیر صدارت شیر بنگال جناب فضل الحق صاحب منعقد ہوئی، اس اجلاس میں اس قدر ہجوم تھا کہ چاندنی چوک سے جامع مسجد تک کا راستہ طے کرنے میں دو گھنٹے صرف ہو جاتے تھے، اجلاس میں تمام صوبوں سے صرف خلافت کمیٹی کے قائم مقام حضرات شریک ہوئے تھے، اس میں مہاتما گاندھی اور کئی غیر مسلم قائدین نے بھی شرکت کی تھی، یہ ہندو مسلم اتحاد کا شاندار مظاہرہ تھا، چنانچہ یہ تحریک خلافت بعد میں تحریک آزادی میں تبدیل ہوگئی۔(۱۳)

اس میں بہار سے صوبائی ذمہ دار کی حیثیت سے حضرت مولانا محمد سجادؒ بھی شریک ہوئے، کانفرنس کے اختتام پر چند مخصوص علماء کا خفیہ اجتماع بوقت صبح دہلی کے مشہور بزرگ سید حسن رسول نماؒ کی درگاہ پر مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے زیر قیادت منعقد ہوا، تمام حاضرین نے جن کی تعداد دس بارہ (۱۲) سے زائد نہ تھی جمعیۃ کے قیام سے اتفاق کیا، جلسہ کا آغاز مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کی تحریک اور مولانا منیر الزماں اسلام آبادی وغیرہ کی تائید سے ہوا۔(۱۴)

تمام حضرات نے اپنے اپنے خیالات پیش کئے، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے بھی ایک

مختصر تقریر فرمائی، سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب کے الفاظ میں:

''اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا کے جذبات ایمانی کا ترجمان تھا، حاضرین کی تعداد اگرچہ دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی؛ لیکن کوئی آنکھ اور کوئی دل ایسا نہ تھا جس نے اثر قبول نہ کیا ہو''۔ (۱۵)

اسی دن شام میں جمعیۃ علماء کی باقاعدہ تشکیل کے لیے علماء کا اجتماع ہوا، جس کو ہم دوسری نشست کہہ سکتے ہیں، اس میں نسبتاً زیادہ لوگ شریک ہوئے، اس میں چھبیس (۲۶) علماء شریک ہوئے۔ (۱۶)

جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس:

جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی دعوت پر امرتسر میں ۵ / ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۸ / دسمبر ۱۹۱۹ء میں منعقد ہوا، اجلاس کی صدارت حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے فرمائی۔ (۱۷)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ بھی اس میں قائدانہ طور پر شریک ہوئے اور مجمع کو اپنے افکار عالیہ سے مستفید فرمایا، مولانا احمد سعید دہلویؒ لکھتے ہیں:

''جمعیۃ علماء کے اس پہلے اجلاس میں بھی حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم شریک ہوئے اور انہوں نے اپنے خیالات کا پھر اعادہ فرمایا''۔ (۱۸)

اس اجلاس میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی رہائی سے متعلق ایک تجویز منظور کی گئی، اسی اجلاس میں جمعیۃ علماء کا دستور اساسی بھی پیش کیا گیا، طے پایا کہ علماء کی رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے دستور کو شائع کر دیا جائے اور آئندہ سال (۱۹۲۰ء) دہلی میں اجلاس عام ہو اور اس میں لوگوں کی آراء کے ساتھ یہ دستور پیش کیا جائے، اسی اجلاس کے موقعہ پر جمعیۃ علماء کی ایک مجلس منتظمہ تشکیل دی گئی، جس میں مختلف علاقوں اور حلقوں سے درج حضرات کے اسماء گرامی شامل تھے:

دہلی: مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، حکیم اجمل خان

یوپی: مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی، مولانا سلامت اللہ، مولانا حسرت موہانی، مولوی مظہر الدین

بنگال: مولانا محمد اکرم خان (کلکتہ)، مولانا منیر الزماں اسلام آبادی (چاٹگام)

بہار: مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، مولانا رکن الدین، مولانا خدا بخش مظفر پوریؒ
سندھ: پیر تراب علی، مولانا عبداللہ، مولانا محمد صادق
پنجاب: مولانا ثناءاللہ امرتسری، مولانا سید محمد داؤد، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی
بمبئی: مولانا عبداللہ، مولانا عبدالمنعم، مولانا سیف الدین، حکیم یوسف اصفہانی (۱۹)

جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس عام:

جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس عام دہلی میں بتاریخ ۷تا۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹تا۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء زیر صدارت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ منعقد ہوا، مجلس استقبالیہ کے صدر حکیم اجمل خان صاحب تھے۔(۲۰)

اس اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پورے ملک سے علماء کی نمائندگی تھی، بقول مولانا احمد سعید دہلویؒ:

''ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا، جہاں سے علماء تشریف نہ لائے ہوں، پانچ سو(۵۰۰) سے زائد علماء شریک ہوئے''۔(۲۱)

ترک موالات پر متفقہ فتویٰ علماء ہند:

اس اجلاس میں برطانوی حکومت کے خلاف عدم تعاون کی مفصل تجویز بھی منظور ہوئی، یہ تجویز حضرت مولانا سجادؒ نے مرتب کی تھی۔

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ لکھتے ہیں:

''عدم تعاون کی تجویز کے سلسلے میں جو فتویٰ مرتب کیا گیا اور جس کا نام آگے چل کر پانچ سو(۵۰۰) علماء کا متفقہ فتویٰ ہوا، وہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کا مرتب کیا ہوا تھا،۔۔۔اس فتویٰ سے مولانا کے اس تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے، جو مولانا کو قدرت کی جانب سے عطا ہوا تھا''۔(۲۲)

مولانا شاہ محمد عثمانی صاحبؒ کا بیان ہے کہ:

''اس فتویٰ سے عام مسلمان جوش سے بھر گئے، برطانوی مالوں کا مقاطعہ ہوا، اسکول اور کالج چھوڑ دیئے گئے؛ لیکن سرکاری ملازمتوں سے کم لوگ دستبردار ہوئے''۔(۲۳)

تقریر بے نظیر:

☆ ظاہر ہے کہ اجلاس عام میں بھی آپ نے اظہار خیال فرمایا ہوگا؛ لیکن حضرت

مولانا احمد سعید دہلوی صاحبؒ کا بیان ہے کہ!

''جمعیۃ علماء کے اس تاریخی اجلاس کی سبجیکٹ کمیٹی میں بھی مولانا نے ایک تقریر فرمائی تھی اور وہ تقریر اپنی آپ ہی نظیر تھی''۔(۲۴)

تجویز امارت شرعیہ فی الھند:

☆ ۱۹۲۱ء میں حضرت مولانا ابوالکلام آزادؔ کی صدارت میں جمعیۃ علماء ہند کا تیسرا اجلاس ہوا، اس میں مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ کی کوششوں سے امارت شرعیہ فی الہند کی تجویز باتفاق رائے منظور کی گئی۔ مولانا احمد سعید صاحب رقمطراز ہیں:

''جمعیۃ علماء نے جو تجویز امارت شرعیہ کے سلسلے میں پاس کی تھی، وہ بھی انہی کی سعی کا نتیجہ تھا''۔(۲۵)

مسودۂ فرائض واختیارات امیرشریعت:

☆ ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ علماء ہند کی مجلس منتظمہ نے ''مسودۂ فرائض واختیارات امیر شریعت'' اور ''نظام نامہ امارت شرعیہ فی الہند'' تیار کرنے کی تجویز منظور کی، ان میں ''مسودہ فرائض واختیارات امیر الشریعۃ فی الہند'' کو ایک سب کمیٹی نے تیار کیا، جس کے ارکان درج ذیل حضرات تھے:

☆ مولانا مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ علماء ہند

☆ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب

☆ مولانا سبحان اللہ صاحب

☆ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب

☆ مولانا محمد فاخر الٰہ آبادی صاحب

☆ مولانا عبدالماجد صاحب

☆ اور مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی نائب ناظم جمعیۃ علماء ہند

ارکان کمیٹی کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا فرخند علی وغیرہ تیرہ (۱۳) علماء اور بھی شامل تھے، اس مجلس نے ۲۰؍نومبر ۱۹۲۱ء کو لاہور میں یہ مسودہ تیار کیا، یہ کل چار (۴) صفحات کا مسودہ ہے، جس میں ایک صفحہ پر شرکاء کے نام اور تین (۳) صفحات پر تجاویز ہیں۔

نظام نامۂ امیرشریعت:

جب کہ ''مسودۂ نظام نامہ امیر الشریعۃ فی الہند'' کو حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے تنہا مرتب

فرمایا تھا، یہ دس (۱۰) صفحات پر مشتمل ہے اور مسودہ فرائض کے مقابلے میں زیادہ مفصل اور جامع ہے۔
ان دونوں مسودات کا مجموعہ جمعیۃ علماء ہند نے حمیدیہ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کیا۔

امارت شرعیہ اور جمعیۃ علماء ہند:

☆ امارت شرعیہ کا قیام مولانا سجادؒ کے نصب العین میں شامل تھا، مولاناؒ نے جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ہی قیام امارت شرعیہ کی تحریک شروع کی، جمعیۃ کے اجلاس عام میں اس کو منظور بھی کرایا اور اکابر جمعیۃ کی تائید بھی اسے حاصل رہی؛ لیکن مرکزی سطح پر بعض وجوہات کی بنا پر انتخاب امیر کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا تو مولانا محمد سجادؒ نے صوبہ بہار میں امارت شرعیہ کی بنیاد ڈال دی، بہار کا یہ اجلاس جس میں امیر شریعت کا انتخاب ہوا یہ بھی جمعیۃ العلماء کے ہی زیر اہتمام منعقد ہوا تھا اور مرکز (دہلی) سے جمعیۃ کے نمائندہ حضرات شریک ہوئے تھے، اس کے بعد بھی عرصہ تک امیر شریعت کے انتخاب کے موقع پر اکابر جمعیۃ کی شرکت ہوا کرتی تھی، مولانا سجاد کو بہار کا نائب امارت شریعت رہتے ہوئے ہی جمعیۃ علمائے ہند کا ناظم مقرر کیا گیا تھا اور انتقال کے وقت بھی مولانا ان دونوں عہدوں پر فائز تھے۔

گیا میں عظیم الشان جمعیۃ کانفرنس:

گیا (بہار) (جو اصلاً مولانا سجادؒ کا فکری دار السلطنت تھا) میں خلافت اور کانگریس کے اجلاس کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کی بھی عظیم الشان کانفرنس ربیع الثانی ۱۳۴۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۲ء میں حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کی سرپرستی میں منعقد ہوا، جس کی صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے فرمائی، مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوریؒ مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، گیا کانگریس کے اجلاس کے صدر مسٹر سی آر داس تھے، یہ جلسے مولانا سجاد کی خوش ذوقی، فنکارانہ مہارت اور انتظامی صلاحیت کی آئینہ دار تھی۔ علامہ مناظر احسن گیلانیؒ رقمطراز ہیں:

> ''اسی کا اعتراف نہیں؛ بلکہ اس کا بھی کہ سارے ہندوستان کا سب سے نمایاں اجلاس جمعیۃ علماء گیا کا اجلاس تھا اور جمعیۃ علماء گیا کا اجلاس صرف ایک واحد شخصیت (حضرت مولانا سجاد) کی عملی قوتوں کا مظہر تھا''۔(۲۶)

گیا کانفرنس کا منظر جمیل:

یہاں کے پروگراموں کی چشم دید کہانی حضرت مولانا محمد سجادؒ کے سیاسی ناقد جناب راغب

احسن صاحب ایم اے جنرل سیکریٹری کلکتہ مسلم لیگ کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

''حضرت مولانا محمد سجادؒ کو پہلی دفعہ اور یہ آخری دفعہ بھی تھا، میں نے گیا کانگریس ۱۹۲۲ء کے موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند کے عظیم الشان پنڈال میں دیکھا تھا، گیا کانگریس کا اجلاس زیر صدارت مسٹر سی آر داس ہو رہا تھا، سوراج پارٹی کی بنیاد پنڈت موتی لال نہرو، داس اور حکیم اجمل خان مل کر ڈال رہے تھے، گیا میں اس موقعہ پر آل انڈیا خلافت کانفرنس اور جمعیۃ علماء ہند کی سالانہ کانفرنسیں بھی ہو رہی تھیں، دسمبر کا مہینہ تھا، کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا، کانگریس، خلافت اور جمعیۃ کے پنڈال دریائے پھلگو کے کنارے شہر سے باہر ریت کے ٹیلوں اور خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں قائم تھے، کانگریس اس وقت بھی سرمایہ دار ہنود کی مجلس تھی، اس کا پنڈال ہندو طرز تعمیر کا نمونہ تھا، صدر گیٹ، دروازے اور اس کے ستون بدھسٹ طرز تعمیر کے مطابق بنائے گئے تھے، اس کا ظاہر و باطن کاملاً ہندوانہ تھا، اس کی تعمیر پر ہزاروں ہزار روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔

اس کے بالکل برعکس جمعیۃ علماء ہند کا پنڈال اسلامی سادگی، نفاست اور جدت اور انڈو ساراسینک (Indo Sara Cenic) عربی ہندی طرز تعمیر کی رعنائیوں کا آئینہ دار تھا، اس کے عالیشان صدر پھاٹک اور داخل و خارج ہونے کے دروازوں پر عربی حروف میں معنیٰ خیز آیات قرآنی درج تھے، مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں لاکھوں ہندو روزانہ جمعیۃ علماء کے پنڈال کو آکر دیکھتے اور تعریف کرتے تھے، جو کلمہ سب کی زبانوں پر عام تھا، وہ یہ تھا کہ باوجود سادہ اور کم خرچ ہونے کے جمعیۃ کا پنڈال کانگریس کے پنڈال سے ہزار درجہ زیادہ آرام دہ، زیادہ روشن وفراخ، زیادہ حسین وجمیل اور زیادہ عالیشان، زیادہ پرشکوہ تھا اور یہ سب کچھ مولانا سجاد کی اعلیٰ تعمیری صلاحیت کا نتیجہ تھا، مجھے معلوم تھا کہ مولانا نے یہ سارا انتظام انتہائی بے سروسامانی، بے مائیگی اور پریشانی کے عالم میں اور قلیل ترین وقت؛ یعنی صرف چند دنوں کے اندر کیا تھا، گیا کی جمعیۃ علماء کانفرنس اور خلافت کانفرنس کی اصل روح رواں، دماغ، مدبر اور مرکزی شخصیت مولانا سجاد کی ذات تھی، مولانا سجاد نے محض چند گنے ہوئے دنوں کے اندر جمعیۃ علماء اور خلافت کانگریس کے متعلق جملہ انتظامات باوجود غربت وافلاس اور بے سروسامانی کے اتنے اعلیٰ پیمانہ اور بہترین؛ بلکہ نادر ترین انداز پر کیا تھا کہ ہندو مسلم اکابر کی نگاہیں بے اختیار مولانا پر مرکوز ہو رہی تھیں اور سب کی

زبانیں اس حقیقت کے اعتراف میں ہم آواز تھیں کہ!

''مولانا سجاد کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنانا موزوں ہوگا''۔

گیا کانگریس نے ملک کی ایک نادر اور حیرت انگیز تنظیمی طاقت کا انکشاف کیا ہے، مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب قادری داناپوریؒ جمعیۃ علماء ہند کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، آپ نے مولانا سجاد کی انتظامی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے کھلے اجلاس میں فرمایا تھا کہ!

''مولانا سجاد نے مسلمانوں کی عظیم الشان تنظیمی اور سیاسی کاروائی کا جو ثبوت دیا ہے، وہ اس درجہ بلند ہے کہ سوراج ملنے کے بعد مولانا کو ہندوستان کا گورنر اور گورنر جنرل بنانا موزوں ہوگا؛ کیوں کہ وہ ایک نئے ہندوستان کے نئے خیالات واصول کے مطابق تعمیر کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں''۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند صدر اجلاس نے جو خود بھی بڑے منتظم بزرگ تھے، اس خراج تحسین کی تائید فرمائی تھی۔

اسی اجلاس گیا کے موقعہ پر مجھے مولانا مرحوم کی تقریر سننے کا پہلا موقعہ ملا تھا اور یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ صاحب بیان نہیں؛ بلکہ صاحب عمل بزرگ ہیں۔

مولانا سجاد نہ صرف ایک بڑی تنظیمی صلاحیت رکھنے والے بزرگ تھے؛ بلکہ جدید (Qriginal) خیالات وافکار رکھنے والے ایک معمار اور خلاق بھی تھے، وہ صرف منتظم اور مدبر نہیں تھے؛ بلکہ مفکر، مجتہد اور آرٹسٹ بھی تھے اور کوئی اول درجہ کا معمار اور آرٹسٹ نہیں ہوسکتا ہے، جب تک کہ وہ اعلیٰ درجہ کی قوت تخیل اور اعلیٰ درجے کی قوت تخلیق نہ رکھتا ہو اور گیا کے ملی مجالس اور اس کے متعلقہ انتظامات ان کی اعلیٰ قوت تخیل اور اعلیٰ تخلیق کے مخلوقات فکر وعمل تھے، مولانا کی شخصیت میں بیک وقت اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیت اور عملی طاقت کے ساتھ نئے نئے خیالات وتعمیرات کے عدم سے وجود میں لانے کی تخلیقی قوت بھی جمع تھی، وہ نہ صرف حسب موقع نئے خیالات کو قبول کرسکتے تھے؛ بلکہ نئے خیالات کی آفرینش کی بھی قوت رکھتے تھے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ اپنے نئے خیالات کے مطابق ایک نئی دنیا کی تعمیر بھی کرسکتے تھے، اجلاس گیا کے موقعہ پر ہر چیز اور ہر انتظام پر مولانا سجاد کی تخلیقی شخصیت اور اجتہادی آرٹ کا چھاپ صاف نمایاں تھا۔(۲۷)

اجلاس جمعیۃ علماء ہند مرادآباد کی صدارت:

☆ جمعیۃ العلماء کے چھٹے اجلاس عام (۱۳۴۳ھ، ۱۹۲۵ء) مرادآباد کی صدارت آپ نے قبول فرمائی، جمعیۃ کے اراکین و ذمہ داران اس پر اس قدر مسرور اور جذبۂ امتنان سے لبریز تھے کہ اجلاس عام میں باضابطہ آپ کے لیے تجویز شکریہ منظور کی گئی، جو کہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے، چنانچہ اجلاس کی تجویز (نمبر ۲۹) اس طرح ہے:

''جمعیۃ علمائے ہند کا یہ اجلاس حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ صدر اجلاس جمعیۃ علماء ہند مرادآباد کی خدمت میں اپنا مخلصانہ شکریہ پیش کرتا ہے کہ حضرت ممدوح نے اجلاس کی صدارت و رہنمائی فرما کر اس کو عزت بخشی، حق تعالی مولانا کو اجر جزیل عطا فرمائے''۔ (تجاویز:۲۹)

ادارۂ حربیہ کے سربراہ:

☆ ۱۹۲۹ء میں انگریزوں کے خلاف کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو جمعیۃ علماء ہند نے بھی اپنے اجلاس مجلس عاملہ (۱۱، ۱۲/اگست ۱۹۲۹ء مرادآباد) میں سول نافرمانی کا پروگرام منظور کیا، پھر جمعیۃ علماء ہند نے اپنے دسویں اجلاس عام (۳۱/مارچ تا یکم اپریل ۱۹۳۱ء کراچی) میں ایک تجویز کے ذریعہ سول نافرمانی کی تحریک کو جاری رکھنے اور رضا کاروں کی بھرتی کا پروگرام منظور کیا، سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جو لوگ سول نافرمانی کی تحریک میں گرفتار ہوتے تھے، جیل کی سزا کے ساتھ ان کی جائداد بھی ضبط کر لی جاتی تھی اور بڑے بڑے جرمانے عائد کئے جاتے تھے، جس کی وصولی کے لیے ان کی جائیدادوں کو نیلام کر دیا جاتا تھا، (۲۸) اس لیے اس بار تحریک چلانا سخت دشوار معلوم ہو رہا تھا، پورے ملک میں اس تحریک کو چلانے کے لیے ایک مستقل نظام کی ضرورت تھی، چنانچہ جمعیۃ علماء ہند نے اس کے لیے ایک خفیہ ادارہ ''ادارہ حربیہ'' قائم کیا، کانگریس نے اس کے لیے ''جنگی کونسل'' قائم کیا تھا، اس نظام کے سربراہ کو جمعیۃ اور کانگریس دونوں جگہ ''ڈکٹیٹر'' کہا جاتا تھا، اس ادارہ حربیہ کے پورے نظام کے قائد و کلید بردار حضرت مولانا محمد سجادؒ تھے، مولانا محمد میاں صاحب کے الفاظ میں:

''جمعیۃ علماء ہند کے صدر مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اور ناظم اعلیٰ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب تھے؛ مگر وہ ڈاکٹر جس کو بہت سے انجکشن دیئے گئے تھے، ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب (نائب امیر شریعت صوبہ بہار) تھے۔ (رحمہم

اللہ) ادارہ حربیہ کے کلید بردار یہی حضرت تھے‘‘۔(۲۹)

آپ کے شریک کار اور اس نظام میں آپ کے دست راست مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

’’جمعیۃ علماء ہند نے اس اکیس سالہ سیاسی دور میں ہندوستان کے اندر اسلام کی سربلندی اور ملک ووطن کی آزادی کے لیے برٹش حکومت کے مقابلہ میں جب بھی ’’دائرۂ حربیہ‘‘ قائم کر کے سول نافرمانی کا آغاز کیا تو ہمیشہ مولانائے موصوف ہی اس ادارہ کے امیر، یا انچارج مقرر ہوئے اور مولانا نے اس بے سروسامان مجلس کے جھنڈے کے نیچے ہندوستان کے مختلف صوبوں کے ہزاروں مسلمانوں کی بہترین قیادت انجام دی اور دائرہ حربیہ کے کام کو اس خوبی سے انجام دیا کہ اس سے بہتر اس اہم اور مشکل مہم کو انجام دینا دوسروں کے لیے بہت مشکل تھا‘‘۔(۳۰)

مدح صحابہ ایجی ٹیشن کی قیادت:

☆ لکھنؤ میں مدح صحابہ ایجی ٹیشن بھی جمعیۃ علماء ہند کی اسی پالیسی کا حصہ تھا، جس میں سول نافرمانی کر کے اہل سنت کی طرف سے گرفتاریاں پیش کی جاتی تھیں، جس کی قیادت حضرت مدنیؒ اور حضرت سجادؒ نے کی۔(۳۱)

یوم فلسطین کی تجویز:

☆ خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد فلسطین کا مسئلہ پیچیدہ ہوگیا، اعلان بالفور کے ذریعہ فلسطین میں ایک نئی یہودی مملکت قائم کرنے کا منصوبہ سامنے آیا تو یہ مسئلہ اور بھی زیادہ حساس ہوگیا، ان حالات میں ۳؍اگست ۱۹۳۸ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ نے سول نافرمانی کی تجویز منظور کی، جو دراصل مولانا محمد سجاد صاحب کی تحریک پر پیش کی گئی تھی، (۳۲) مولانا نے امارت شرعیہ کی طرف سے بھی پورے صوبے میں اس کے خلاف احتجاجی جلوس نکالنے کی ہدایت جاری فرمائی، جمعہ ۳؍ستمبر ۱۹۳۷ء کو یوم فلسطین منایا گیا۔(۳۳)

شاردا ایکٹ کے خلاف احتجاج:

☆ ملک میں جب شاردا ایکٹ (تحدید عمر ازدواج اور سول میرج قانون) نافذ ہوا، جس میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے شادی کی عمر کی تحدید کی گئی تھی تو مولانا سجاد نے الجمعیۃ اور جریدہ امارت میں اس کے خلاف مضامین لکھے اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ اگر حکومت ان کا مطالبہ تسلیم نہ کرے تو اس قانون کی نافرمانی کریں، چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے

اجلاس (۱۱، ۱۲/ ۱۳ اگست ۱۹۲۹ء مراد آباد) میں اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا گیا اور اس کو مذہب میں مداخلت کے ہم معنی قرار دیا گیا، پھر جمعیۃ علماء ہند کے نواں اجلاس عام (۳ تا ۶ / مئی ۱۹۳۰ء امروہہ) میں شاردا ایکٹ کے خلاف سخت تجویز منظور کی گئی۔ (۳۴)

جمعیۃ علماء کے اس فیصلہ کے بعد حضرت مولانا سجاد صاحب کے ایما پر گیا میں قانون شکنی کے عنوان سے ایک ''متحدہ کانفرنس'' ہوئی، جس میں علی الاعلان قانون شکنی کے مظاہرے کیے گیے، جس میں خود مولانا سجاد بھی بہ نفس نفیس شریک ہوئے، مولانا شاہ محمد عثمانی صاحب نے اس اجلاس کا آنکھوں دیکھا حال نقل کیا ہے کہ!

''چند نوجوان ایسی لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتے تھے، جن کی عمریں قانون کی مقرر کردہ حد سے کم تھیں؛ لیکن وہ یتیم لڑکیاں تھیں، ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا مولانا نے ان کا نکاح پڑھایا اور مطبوعہ فارم پر یہ لکھ کر کہ ''ہم نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے؛ کیوں کہ ہم انگریزی حکومت کو اس کا حق دینا نہیں چاہتے کہ وہ مسلمانوں کے معاملہ میں دخل دے اور یہ کہ نکاح مولانا محمد سجاد نے پڑھایا ہے، حکومت ہند کو بھیج دیا گیا۔ (۳۵)

مجلس تحفظ ناموس شریعت کے سربراہ:

☆ شاردا ایکٹ (تحدید عمر ازدواج اور سول میرج قانون) کے پاس ہونے کے بعد جمعیۃ علماء ہند نے آئندہ کے خطرات کے انسداد کے لیے ''مجلس تحفظ ناموس شریعت'' قائم کی اور اس کا ناظم حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کو بنایا گیا، آپ نے اس مجلس کے ذریعہ دیگر بہت سے کاموں کے علاوہ دہلی کی وہ مساجد اور اوقاف کی جائیدادیں جو مرکزی یا صوبائی حکومتوں کے قبضے میں چلی گئی تھیں، ان کی واگذاری کی تحریک چلائی اور سینکڑوں مساجد اور اوقاف کو آزاد کرایا۔

آپ نے مساجد و اوقاف کے متعلق مرکزی اسمبلی میں سوال کرایا تو معلوم ہوا کہ حکومت ہند کے قبضہ میں تقریباً پانچ سو (۵۰۰) مساجد ہیں، اوقاف کے متعلق کوئی جواب نہیں ملا۔ (۳۶)

سیاسی انتخابات میں شرکت کی تجویز:

☆ جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ترک موالات کا فتویٰ آپ نے ہی مرتب کیا تھا، اس میں مجالس مقننّہ کا بھی مقاطعہ کیا گیا تھا اور اس کی روشنی میں پارلیمانی انتخابات میں مسلمانوں کی شرکت ممنوع تھی۔۔۔لیکن اس کے بعد ایسے ارکان منتخب ہوکر مجالس قانون ساز میں

پہونچے، جن کو اپنے دین وملت اور ملک وقوم کی کوئی پرواہ نہیں تھی، اس سے ملت کو سخت نقصانات پہونچے، جس کی وجہ سے کئی لوگ ضرورت محسوس کرنے لگے تھے کہ اس مقاطعہ کا خاتمہ ہونا چاہیے؛ تاکہ ملک وملت سے محبت کرنے والے لوگ مجالس مقنّنہ میں پہونچ سکیں، مولانا محمد عثمان غنیؒ اس کی روداد بیان فرماتے ہیں کہ!

''حضرت مولانا نے فرمایا کہ جب تک جمعیۃ علماء ہند مقاطعہ کی تجویز واپس نہ لے لے، اس وقت تک ہم لوگ کس طرح کسی کی تائید، یا حمایت کرسکتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ مجالس مقنّنہ کے ارکان کی جو روش ہے اس کو دیکھتے ہوئے مقاطعہ کو قائم رکھنا جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، ''إذا ابتلی ببلیتین فاختر أھونھما'' پر عمل کرنا چاہیے، مثال میں ہم نے قاضی احمد حسین صاحب کے وقف بل کی ناکامیابی کو بیان کیا کہ صرف مسلمان ارکان کی حکومت پرستی نے اس مفید بل کو ناکام بنادیا، نیز مرکزی اسمبلی کے بعض ارکان جیسی حرکتیں کررہے تھے، ان کو عرض کیا۔

حضرت مولانا نے فرمایا کہ تم جریدہ امارت میں لکھو، اگر جمعیۃ علماء ہند اپنی عائد کردہ پابندی ہٹالے تو پھر آئندہ حصہ لیا جائے گا، چنانچہ راقم الحروف نے جریدہ امارت میں مضامین لکھنا شروع کردیا، اس کے بعد نقیب میں بھی کچھ مضامین لکھے۔

حضرت مولانا کی عادت تھی کہ جس معاملہ میں ان کا قلب مطمئن ہوجاتا تھا، پھر اس کو جلد سے جلد انجام دینے کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ اس معاملہ میں بھی جب ان کا قلب مطمئن ہوگیا تو انہوں نے جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس (منعقدہ ۱۴تا۱۶؍جنوری ۱۹۳۴ء مرادآباد) میں مجالس مقنّنہ میں شرکت کی تجویز پیش کردی جو منظور ہوگئی۔

اس کے بعد ربیع الاول ۱۳۵۳ھ میں امارت شرعیہ کی مجلس شوریٰ میں بھی حضرت مولانا نے اس تجویز کو منظور کرالیا اور اسی تجویز کی بنیاد پر امارت بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی اور امارت شرعیہ نے پہلی بار انتخاب میں حصہ لیا''۔(۳۷)

آزادھندوستان کادستوراساسی:

☆ ۳؍اگست ۱۹۳۱ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس سہارن پور میں آزاد ہندوستان کے دستور اساسی کا مسودہ ''جمعیۃ علماء کا فارمولہ'' کے نام سے پیش کیا گیا، جس میں تمام مذاہب کی مکمل آزادی، مسلم پرسنل لا کی حفاظت اور مسلمانوں کے مخصوص مقدمات مسلم

قاضیوں سے فیصل کرائے جانے کی وضاحتیں شامل تھیں، یہ فارمولہ بھی حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔(۳۸)

قانون فسخ نکاح کی تسوید :

☆ اِسی طرح مرادآباد کے اجلاس (۱۹۳۶ء) میں مسودۂ قانون فسخ نکاح کی تیاری کی ذمہ داری حضرت مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ کو دی گئی اور آپ نے نہایت بالغ نظری کے ساتھ مسودہ مرتب فرمایا۔

نظارت امورشرعیہ کامسودہ:

☆ جمعیۃ علماء ہند نے ۱۹۵۷ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں جونظارت امورشرعیہ کا منصوبہ پیش کیا، جس میں حکومت سے ایک ناظر امور اسلامی کے عہدہ کی بحالی کا مطالبہ کیا گیا تھا، یہ تجویز بھی دراصل حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی تھی اور انہوں نے ہی اس کا مسودہ بھی تیار کیا تھا، بعد میں اس پر غور وخوض کرنے کے لیے جو سب کمیٹی بنائی گئی، اس کے روح رواں اور داعی بھی آپ ہی تھے، یہ اسکیم مولانا سجاد صاحب نے ۱۹۳۷ء ہی میں پیش فرمائی تھی، جیسا کہ قانونی مسودے میں اس پر درج تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، جو ۱۹۳۹ء کے اجلاس میں منظور ہوئی، یہ پورا مسودہ مولانا محمد میاں صاحب کی کتاب ''جمعیۃ علماء کیا ہے؟'' اور مولانا سجاد کے قانونی مسودات کا مجموعہ'' قانونی مسودے'' میں موجود ہے۔(۳۹)

واردھا تعلیمی اسکیم کا جائزہ :

☆ اسی اجلاس میں حکومت کی واردھا تعلیمی اسکیم پر بھی غور کیا گیا اور اس کے نقائص کا جائزہ لیتے ہوئے ایک جامع رپورٹ تیار کی گئی، یہ رپورٹ بھی مولانا محمد سجاد کی نظر و فکر کی شاہکار ہے۔(۴۰)

نہرورپورٹ کابائیکاٹ:

☆ لندن پارلیامنٹ میں برطانوی وزیر اعظم نے تقریر کی، جس میں ہندوستانیوں کی غیرت کو چیلنج کیا گیا کہ اگر ہندوستان آزادی کا مطالبہ کرتا ہے تو چاہئے کہ وہ ایک دستور تیار کر کے پیش کرے، ہم اس کو منظور کرلیں گے، اس چیلنج کے جواب میں موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنائی گئی، جس نے ایک دستوری خاکہ مرتب کیا، جو نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوا، بدقسمتی سے اس رپورٹ پر خالص ہندو ذہنیت کا رنگ حاوی تھا، مسلمانوں کے حقوق کی رعایت

ملحوظ نہیں رکھی گئی تھی؛اس لیے جمعیۃ علماء ہند کے لیے اس کی تائید ممکن نہیں تھی، کانگریس نے نہرو رپورٹ پر غور وخوض اوراس کی منظوری کے لیے لکھنؤ میں ۱۹۲۸ء کے آخر میں آل پارٹیز کانفرنس بلائی، جمعیۃ علماء ہند کوبھی دعوت ملی، جمعیۃ نے اپنا ایک نمائندہ وفد کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ کیا، جس میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا حسرت موہانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا محمد شفیع فرنگی محلیؒ، مولانا محمد عرفانؒ اورمولانا ریاست حسینؒ شامل تھے، جمعیۃ علماء ہند کے نزدیک نہرو رپورٹ میں گیارہ (۱۱) بنیادی خامیاں تھیں، جن سے مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی تھی، ارکان وفد نے ان خامیوں کواجاگر کیااورنہرو رپورٹ سے اپنی بیزاری کااعلان کیا، اس موقعہ پرمولانا سجاد صاحبؒ کی آئین شناشی کے جوہر کھل کرسامنے آئے اورآپ نے جمعیۃ؛ بلکہ تمام مسلمانان ہند کی مضبوط نمائندگی فرمائی۔(۴۱)

جمعیۃ علماء ہند کی قیادت کا مسئلہ:

☆ مولانا سجادؒ یوں تو ایک متواضع شخص تھے؛لیکن مشکل وقتوں میں آپ جمعیۃ کے لیے مضبوط ڈھال بن جاتے تھے، آپ کی دلیلوں اور حکمت عملی کا کوئی جواب نہیں تھا، ایک موقعہ پر جمعیۃ علماء میں مسٹر اور مولانا کی جنگ چھڑ گئی، کچھ لوگ چاہتے تھے کہ جمعیۃ پر سے علماء کا غلبہ ختم کیا جائے اور قیادت میں انگریزی داں طبقہ کوبھی شامل کیا جائے، مولانا محمد علی جوہر جو حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے فیض صحبت وارادت سے مسٹر سے مولانا بن گئے تھے، کچھ لوگ ان کوجمعیۃ علماء ہند کا صدر بنانا چاہتے تھے، اس موقعہ پر مفتی کفایت اللہؒ، مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ اورعلامہ انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ نے شدت کے ساتھ ان کوششوں کی مخالفت کی، ان حضرات کی ہمیشہ یہ رائے رہی کہ یہ علماء کی جماعت ہے، اس کے کلیدی عہدوں پر صرف علماء فائز ہو سکتے ہیں، مولانا سجاد صاحب کواس کی بھاری قیمت بھی چکانی پڑی، ان کے بہت سے قریب ترین لوگ دشمن بن گئے ؛لیکن مولانا کے پائے استقامت میں فرق نہیں آیا۔(۴۲)

بے لوث خدمات :

☆ غرض جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے حضرت مولانا سجادؒ نے بے شمار دینی، ملی وقومی خدمات انجام دیں اورکبھی کسی صلہ، یا ستائش وتحسین کے طلب گار نہیں ہوئے، بے لوث خدمات کا وہ

ریکارڈ قائم کیا کہ شاید تنظیموں اور جماعتوں کی تاریخ میں ایک دو ہی ایسی مثال مل سکے گی، ہر طرح کے استحقاق اور لوگوں کے اصرار کے باوجود کبھی اپنے لیے کوئی عہدہ قبول نہیں فرمایا، کسی عہدہ کے بغیر بھی جماعت کی روح رواں بنے رہے، ذمہ دار قائدین گرفتار ہوجاتے تو ان کی ذمہ داریاں بھی آپ اٹھاتے تھے، کئی بار جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ کے فرائض انجام دیئے، مولانا احمد سعید دہلوی جب بھی گرفتار ہوکر جیل گئے تو حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد ہی قائم مقام ناظم عمومی بنائے گئے۔(۴۳)

بحیثیت ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند:

☆ جمعیۃ علماء ہند کے بارھویں اجلاس عام (منعقدہ جونپور ۲۸، ۲۹ / ربیع الثانی و یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۵۹ھ مطابق ۷، ۸، ۹ / جون ۱۹۴۰ء) میں جمعیۃ علماء ہند کے جدید دستور العمل کے پیش نظر جب حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ صدر منتخب کئے گئے تو حضرت مولانا سجاد کو ناظم عمومی کے عہدہ کے لیے منتخب کیا گیا، آپ نے ہر چند انکار کیا، امارت شرعیہ، جمعیۃ علماء بہار اور دیگر مصروفیات کا عذر پیش فرمایا؛ لیکن ورکنگ کمیٹی کے بے حد اصرار پر بالآخر قبول کرنا پڑا، اس کے بعد تا حیات (۱۷ / شوال المکرّم ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸ / نومبر ۱۹۴۰ء) اس عہدہ پر فائز رہے۔(۴۴)

تذکرہ جمعیۃ علماء ہند کی تصنیف:

☆ مگر رسمی نظامت کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد حیات مستعار کے صرف چند ماہ باقی رہ گئے تھے، بمشکل پانچ (۵) ماہ زندہ رہے، اس دوران جمعیۃ کے معمول کی خدمات (اندرونی تنظیم اور بیرونی نشرواشاعت (۴۵) کے علاوہ آپ نے بڑا کام یہ کیا کہ (مولانا احمد سعید دہلویؒ کے الفاظ میں):

> ''صرف دو دن میں انہوں نے جمعیۃ علماء کی بیس (۲۰) سالہ زندگی کی ایک مختصر تاریخ لکھ دی''۔(۴۶)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے اس تاریخی اور دستاویزی کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

> ''جمعیۃ علماء کی بیس (۲۰) سالہ تبلیغی، دینی، سیاسی، اجتماعی خدمات اور عملی جدوجہد کا ایک مرقع تالیف فرمایا، جو ''تذکرہ جمعیۃ علماء ہند'' کے نام سے معنون کیا گیا اور یہ عجیب بات پیش آئی کہ باوجود اس امر کے کہ اس ''تذکرہ'' میں جمعیۃ علماء ہند کی گذشتہ خدمات کی فہرست مرتب کرنے اور مسلمانان ہند کے سامنے ان خدمات کی تفصیل کو یکجا کرکے ان کی توجہ کو جمعیۃ علماء ہند کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے سوائے اور کچھ نہ تھا؛ مگر

حکومت دہلی اس کو بھی برداشت نہ کرسکی اور فوراً اس کو ضبط کرلیا اور دفتر کی تلاشی لے کر اس کی تمام کاپیاں حاصل کرلیں اور ساتھ ہی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کا وہ معرکۃ الآراء خطبہ صدارت بھی ضبط کرلیا جو جون پور کے اجلاس کی بہترین یادگار ہے''۔(۴۷)

افسوس اس دستاویزی کتاب کی ایک کاپی بھی شاید آج محفوظ نہیں ہے، اگر یہ تذکرہ محفوظ رہتا تو ہمیں یقین ہے کہ یہ جمعیۃ علماء ہند کی سب سے مستند تاریخ ہونے کے علاوہ فن تاریخ نویسی کا بھی شاہکار نمونہ ہوتا؛ لکن قدر اللہ ماشاء۔

جمعیۃ علماء ہند کے لیے نئی منصوبہ بندی :

☆ نظامت اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد آپ نے جماعت کے لیے نئی اسکیمیں اور نئے خطوط وضع فرمائے، آپ چاہتے تھے کہ نئے حالات میں نئے طور وطریق اختیار کرنے اور نئے مسائل کے لیے نئے اسلحوں سے لیس ہونے کی ضرورت ہے، اس کے لیے انہوں نے ایک جامع خاکہ مرتب کیا تھا اور عملی اقدامات شروع ہی کئے تھے کہ رب العالمین کی طرف سے بلاوا آگیا، مولانا سجادؒ کے اولین تذکرہ نگار مولانا عظمت اللہ ملیح آبادیؒ رقمطراز ہیں:

''مولانا نے جمعیۃ علماء ہند کے توسیعی نظام کے سلسلے میں ایک مستقل پروگرام بنایا تھا، وہ عام مسلمانوں کو جمعیۃ علماء سے وابستہ کرنا چاہتے تھے، اس مشغولیت میں مولانا کی بصارت اور عام صحت کمزور ہوگئی؛ مگر ہمت اور اولوالعزمیوں میں رفعت اور بلندی ہوتی گئی''۔(۴۸)

آپ کے تلمیذ رشید اور تحریکی امور میں آپ کے شریک کار مولانا اصغر حسین صاحب بہاریؒ سابق پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ تحریر فرماتے ہیں:

''امسال (۱۹۴۰ء) حضرت نائب امیر شریعت کو جمعیۃ علماء ہند نے ناظم اعلیٰ مقرر کیا تھا اور اگرچہ آپ کی ذات اس عہدہ سے پیشتر بھی جمعیۃ کے لیے روح رواں تھی؛ لیکن جب ارکان جمعیۃ کے اصرار سے اس عہدۂ نظامت کی باگ ہاتھ میں لی تو ایک جدید اسکیم کے ماتحت نئے اسلوب سے جمعیۃ کے چلانے کا کام شروع کردیا تھا کہ ایسے نازک وقت میں ایثار وعزم کا یہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہوگیا''۔(۴۹)

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ رقمطراز ہیں:

''جمعیۃ علماء ہند کی نظامت اعلیٰ کو سنبھالے ہوئے ابھی چند ہی مہینے ہوئے تھے اور

جمعیۃ علماء کے نظام میں اپنے عہدہ کے پیش نظر تھوڑا ہی قدم بڑھایا تھا کہ پیغام اجل آ پہنچا اور اس مردِ حق نے اپنے رفقاء کار کو ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتا ہوا چھوڑ دیا''۔(۵۰)

جمعیۃ علماء ہند کے دماغ:

☆ اس طرح مولانا سجاد صاحب جمعیۃ علماء بہار(۱۹۱۷ء)سے جمعیۃ علماء ہند(۱۹۱۹ء) تک اور پھر اس کے بعد سے تاحیات (۱۹۴۰ء تک)تقریباً تئیس (۲۳) سالوں تک جمعیۃ علماء ہند کے روح رواں رہے، بناء سے قیام واستحکام اور زلف وگیسو کی آراستگی تک ہر ہر جزو میں مولانا سجادؒ کا سوز دماغ اور خون جگر شامل رہا، درحقیقت وہ جمعیۃ علماء ہند کے دماغ اور مرکز اعصاب تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''میں ہمیشہ سنا کرتا تھا کہ مولانا جمعیۃ علماء کے دماغ ہیں''۔(۵۱)

جمعیۃ علماء ہند کی اکثر تجاویز، منصوبے اور فارمولے مولانا سجادؒ ہی کے مرتب کردہ ہیں۔(۵۲)

سانحہ ارتحال پر تعزیتی قرارداد:

غرض آپ کی عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ قوم وملت کی خدمت میں صرف ہوا، آخر زندگی بھر کے تھکے ہارے مسافر نے ۱۷ر شوال المکرّم ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹ر نومبر ۱۹۴۰ء کو سوموار کے دن ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موندلیں اور خانقاہ مجیبیہ کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

جمعیۃ علماء ہند نے آپ کے سانحۂ ارتحال پر اپنی مجلس عاملہ (منعقدہ ۵تا۶ر جنوری ۱۹۴۱ء زیرصدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر جمعیۃ علماء ہند) میں درج ذیل قرارداد تعزیت منظور کی، جس کا ایک ایک لفظ آپ کی عظمت شان کو ظاہر کرتا ہے:

تجویز: جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ زعیم الامت، مجاہد ملت، مفکر جلیل، عالم نبیل، حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند و نائب امیر شریعت صوبہ بہار کی وفات پر (جو ۱۸ر شوال ۱۳۵۹ھ کو پھلواری شریف میں ہوئی) اپنے عمیق رنج واندوہ کا اظہار کرتا ہے اور اِس سانحۂ روح فرسا کو مسلمانانِ ہند کے لیے ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے، مولانا کی ذات گرامی مذہب وملت اور اِسلامی سیاست کے ماہر خصوصی تھی، ان کی مذہبی، قومی، وطنی خدمات صفحاتِ تاریخ پر آبِ زر سے لکھی جائیں گی اور مسلمانانِ ہند اُن کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد بہاریؒ غیر معمولی علمی وعملی اور فکری صلاحیتوں کا مجموعہ تھے اور جمعیۃ علماء ہند کا بیش قیمت سرمایہ تھے، اُن کی کمی کو شدت سے محسوس کیا گیا، یہ مجلس مولانا

کی اہلیہ محترمہ اور۔۔۔۔دیگر اعزاء کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی ظاہر کرتی ہے اور رب العزت جل شانہ کی بارگاہ میں دست بدعا ہے کہ مولانا کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور اُن کی تربت کو اپنی رحمتوں کی بارش سے سیراب کرے۔(آمین)(۵۳)

پھر جمعیۃ علماء ہند کے تیرہویں اِجلاس لاہور (منعقدہ ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء) میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اپنے خطبہ صدارت میں اپنے قلبی تأثرات ان الفاظ میں بیان فرمائے:

''حضرات! رفقاء کار کے اِس اجتماع میں ہم حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم اور برگزیدہ شخصیت کو فراموش نہیں کرسکتے، جنہوں نے گذشتہ تیس (۳۰) سال میں مسلمانانِ ہند کی زبردست خدمات انجام دی ہیں، اِس عرصہ میں مسلمانانِ ہند کی تمام اہم مذہبی اور سیاسی تحریکات میں کوئی ایک تحریک بھی ایسی نہیں ہے، جس میں مرحوم نے پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ نمایاں حصہ نہ لیا ہو۔ جمعیۃ علماء ہند میں اُن کی شخصیت بہت اہم تھی، اُنہوں نے اپنی تمام زندگی جمعیۃ علماء کی خدمت اور اُس کو ترقی دینے کے لیے وقف کردی تھی، اپنی زندگی کے آخری دور میں مرحوم جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے، اُن کی وفات مسلمانوں کے لیے عموماً اور جمعیۃ علماء ہند کے لیے ایک ایسا قومی وملی سانحۂ عظیم ہے، جس کی تلافی نہیں ہوسکتی''۔(۵۴)

پھونک کر اپنے آشیانے کو   روشنی بخش دی زمانے کو

مصادر ومراجع

(۱) حیات سجاد، ص:۱۵

(۲) حیات سجاد، ص:۱۳، ۱۴

(۳) حسن حیات، ص:۴۴، مرتبہ شاہ محمد عثمانی

(۴) حیات سجاد، ص:۶۸، ۶۹، مضمون حضرت امیر شریعت ثانی مولانا شاہ محی الدین پھلواروی

(۵) حیات سجاد مصنفہ مولانا عظمت اللہ ملیح آبادیؒ، ص:۲ تا ۵

(۶) کتاب الفسخ والتفریق، ص:۴۳ مصنفہ مولانا عبدالصمد رحمانیؒ ☆ تاریخ امارت شرعیہ، ص:۴۱، مرتبہ: مولانا عبدالصمد رحمانی ☆ حسن حیات، ص:۴۵، مرتبہ: شاہ محمد عثمانیؒ ☆ حیات سجاد، ص:۶۸، مضمون حضرت امیر شریعت ثانی مولانا شاہ محی الدین پھلوارویؒ

(۷) حیات سجاد،ص:۵۱،ارتسامات گیلانیہ
(۸) حیات سجاد،ص:۶۸،۶۹،مضمون حضرت امیر شریعت ثانی مولانا شاہ محی الدین پھلواروی
(۹) حسن حیات،ص:۴۵،مرتبہ شاہ محمد عثمانیؒ
(۱۰) محاسن سجاد،ص:۲۴،۲۵،مضمون مولانا اصغر حسین بہاریؒ صدر مجلس استقبالیہ اجلاس اول جمعیۃ علماء بہار☆وحیات سجاد،ص:۵۱،مضمون علامہ مناظر احسن گیلانیؒ شریک اجلاس بحیثیت نمائندہ خانقاہ رحمانی مونگیر
(۱۱) حیات سجاد،ص:۵۱،۵۲،مضمون علامہ مناظر احسن گیلانیؒ شریک اجلاس بحیثیت نمائندہ خانقاہ رحمانی مونگیر
(۱۲) حسن حیات،ص:۴۵،مرتبہ شاہ محمد عثمانیؒ
(۱۳) تحریک خلافت،ص:۱۰۳،مرتبہ: قاضی عدیل عباسی
(۱۴) جمعیۃ علماء ہند پر ایک تاریخی تبصرہ،ص:۴۴،مرتبہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف
(۱۵) حیات سجاد،ص:۱۰۱،مضمون مولانا احمد سعید دہلوی
(۱۶) حسن حیات،ص:۴۸
(۱۷) علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے،ص:۲۰۷،مرتبہ مولانا مفتی محمد میاں صاحب
(۱۸) حیات سجاد،ص:۱۰۲،مضمون مولانا احمد سعید دہلوی
(۱۹) حسن حیات،ص:۵۱
(۲۰) حسن حیات،ص:۵۳ ☆ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی-ایک سیاسی مطالعہ،ص:۵۰،مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری
(۲۱) حیات سجاد،ص:۱۰۳
(۲۲) حیات سجاد،ص:۱۰۲
(۲۳) مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد-حیات وخدمات،ص:۱۲۸،۱۲۹،مضمون مولانا شاہ محمد عثمانی
(۲۴) حیات سجاد،ص:۱۰۲
(۲۵) حیات سجاد،ص:۱۰۵
(۲۶) محاسن سجاد،ص:۵۵،ارتسامات گیلانیہ
(۲۷) محاسن سجاد،ص:۱۰۲تا۱۰۵
(۲۸) مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد-حیات وخدمات،ص:۱۲۹،مضمون مولانا شاہ محمد عثمانی
(۲۹) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن-ایک سیاسی مطالعہ،ص:۱۳۹تا۱۴۵، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، ناشر: فرید بک ڈپو، دہلی ۲۰۱۱ء
(۳۰) حیات سجاد،ص:۱۵۰،مضمون مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
(۳۱) اس موقعہ کے کئی واقعات مولانا نعمانیؒ نے نقل فرمائے ہیں۔(محاسن سجاد، ص:۶۱، مضمون

مولانا منظور احمد نعمانیؒ)

(۳۲) جمعیۃ علماء کیا ہے؟ مرتبہ: مولانا سید محمد میاں صاحب، مطبوعہ الجمعیۃ بکڈپو

(۳۳) امارت شرعیہ دینی جدوجہد کا روشن باب، ص:۲۱۱

(۳۴) مولانا محمد سجاد- حیات وخدمات ص:۱۳۱، ۱۳۲، مضمون مولانا شاہ محمد عثمانی

(۳۵) مولانا محمد سجاد- حیات وخدمات، ص: ۱۳۱، ۱۳۲ ☆ حیات سجاد ص:۱۳۹، مضمون مولانا عثمان غنی صاحب سابق ناظم امارت شرعیہ پٹنہ

(۳۶) حیات سجاد ص: ۱۳۹، ۱۴۰، مضمون مولانا عثمان غنی صاحب

(۳۷) حیات سجاد ص: ۱۴۲، ۱۴۳، مضمون مولانا عثمان غنی صاحبؒ

(۳۸) حیات سجاد، ص: ۱۵۰، مضمون مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، ☆ مولانا ابوالمحاسن سجاد- حیات وخدمات، ص: ۲۹۷، مضمون مولانا اسرار الحق قاسمیؒ

(۳۹) جمعیۃ علماء کیا ہے؟ (ضمیمہ) حصہ دوم، ص: ۵ تا ۸، مرتبہ مولانا محمد میاں صاحب، مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی ☆ قانونی مسودے، ص: ۴۱ تا ۴۵، جمع وترتیب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

(۴۰) جمعیۃ علماء کیا ہے؟ حصہ دوم ص ۱۳ تا ۱۷، مرتبہ مولانا محمد میاں صاحب

(۴۱) مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد- حیات وخدمات ص: ۲۹۵، مضمون مولانا اسرار الحق قاسمی

(۴۲) مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد- حیات وخدمات ص: ۱۳۶، مضمون مولانا شاہ محمد عثمانی

(۴۳) مولانا ابوالمحاسن سجاد- حیات وخدمات ص: ۲۹۳، مضمون مولانا اسرار الحق قاسمیؒ سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند

(۴۴) حیات سجاد، ص: ۱۵۰، مضمون مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

(۴۵) یہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے الفاظ ہیں۔ (حیات سجاد، ص: ۱۵۱)

(۴۶) حیات سجاد، ص: ۱۰۹ مضمون سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ

(۴۷) حیات سجاد، ص: ۱۵۱، مضمون مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

(۴۸) حیات سجاد، مصنفہ مولانا عظمت اللہ ملیح آبادیؒ، ص: ۷

(۴۹) محاسن سجاد، ص: ۲۹

(۵۰) حیات سجاد، ص: ۱۵۴، مضمون مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

(۵۱) محاسن سجاد، ص: ۴۹، مضمون مولانا امین احسن اصلاحی

(۵۲) مولانا ابوالمحاسن سجاد- حیات وخدمات، ص: ۲۹۳، مضمون مولانا اسرار الحق قاسمیؒ سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند

(۵۳) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی سیاسی ڈائری ۱۵۳/۳، ۱۵۴

(۵۴) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری: ۱۵۶/۳

سول نافرمانی کی تحریک اور ادارہ حربیہ

حضرت مولانا سجاد کی مجاہدانہ زندگی کا شاہکار

مفتی محمد خالد حسین نیموی قاسمی

ناظم تعلیمات مدرسہ بدرالاسلام بیگوسرائے بہار، سابق معین المدرسین دارالعلوم دیوبند یوپی

اللہ تعالی نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے، آزادی انسان کے لیے سب سے قیمتی دولت ہے، اسلام نے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا لوگوں کو حوصلہ دیا، غلاموں کو آزاد کرنے کی بھر پور ترغیب دی اور اس کے لیے کئی اقدامات کیے، انسان درحقیقت اللہ کا بندہ ہے۔ انسان کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لانا اسلام کا نصب العین ہے۔ اس نصب العین کا اعلان حضرت ربعی بن عامرؓ نے شاہ ایران رستم کے دربار میں اس طرح کیا تھا:

"قد بعثنا اللّٰہ لنخرج من یشاء من عبا دہ من عبادة العباد إلی عبادة اللّٰہ". (۱)(ہمیں تو اللہ تعالی نے اس لیے بھیجا ہے کہ ہم بندوں کو اپنے جیسے دیگر بندوں کی غلامی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔)

اسلام نے مظلوم ومقہور اقوام میں ظالم کے خلاف دفاعی اقدامات اور مؤثر کاروائیاں کرنے کا حوصلہ پیدا کیا، رفع ظلم اور قیام امن کے لیے جہاد کو مشروع قرار دیا اور ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے کو افضل ترین جہاد قرار دیا گیا:

"الا ان افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جائر". (۲)

ہندوستان میں عہد مغلیہ کے زوال کے بعد جب صلیبی طاقتوں کا پنجۂ استبداد مضبوط ہونے لگا تو اسلام کے کئی جیالوں نے اس کے خلاف وقفہ وقفہ سے آواز بلند کی اس سلسلہ میں سب سے مضبوط اقدام ۱۸۵۷ء میں کیا گیا؛ لیکن اپنوں کے نفاق اور غیروں کی عیاری کے نتیجے میں یہ تحریک ناکام ہوگئی تو اکابر علماء نے وقتی طور پر بظاہر تعلیمی، تدریسی، تصنیفی اور اصلاحی امور کی طرف توجہ فرمائی ؛لیکن بباطن نظام باطل کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے فکرمند رہے، ایک لمبی خاموشی کے بعد پھر سکوت

ٹوٹا اور سب سے پہلے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور ان کے تلامذہ نے نظام باطل کو للکارنے کے لیے ''جمعیۃ الانصار'' اور ''تحریک ریشمی رومال'' کے ذریعہ منظّم پلاننگ کی تو دوسری طرف شہرہ آفاق مجلّہ ''الہلال'' اور البلاغ'' کے ذریعہ آزادی کی روح پھونکنے کی مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بھرپور کوششیں فرمائیں، اس کے علاوہ خلافت اسلامیہ مرکزیہ کے تحفظ ودفاع، ملت اسلامیہ کی تنظیم اور ہندوستان کی آزادی کے لیے ایک منظّم اور بھرپور تحریک چھیڑنے کے لیے کئی عظیم شخصیتیں میدان عمل میں جلوہ گر ہوئیں، جن میں ایک ممتاز نام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کا ہے، حضرت مولانا سجاد نے مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے اشتراک سے پہلے تحریک خلافت قائم کی اور پھر مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ وغیرہ کے ساتھ سے جمعیۃ علماء ہند قائم کرنے میں قائدانہ رول ادا کیا، جب تحریک عدم موالات؛ یعنی نان کوپریشن مومنٹ چلایا گیا تو مولانا سجاد نے اس کے لیے ایک متفقہ فتوی مرتب کیا، جس پر پانچ سو علماء نے دستخط کیے۔ انگریزی سامان، انگریزی ملازمت، انگریزی عطیہ اور انگریزی القاب وآداب، الغرض انگریز سے وابستہ ہر چیز کا بائیکاٹ کیا گیا۔ کانگریس اور جمعیۃ علماء قدم سے قدم ملا کر اور آزادی کے جذبات سے سرشار ہو کر جانب منزل رواں دواں تھی؛ آثار ایسے نظر آنے لگے کہ آزادی کی منزل اب قریب ہے، اب تک کی مکمل تحریک پرامن انداز میں چلائی گئی تھی؛ لیکن نوشتہ دیوار یہ بتا رہا تھا کہ'' صاحب سلامت اور حضرت حضور'' سے کام چلنے والا نہیں ہے؛ بلکہ عظیم مقصد کے لیے دار ورسن کو آباد کرنا پڑے گا، سنت یوسفی کو بڑے پیمانے پر زندہ کرنا پڑے گا، اکثر علماء وطن کی آزادی کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھے؛ لیکن رقیبوں کی بھی کمی نہیں تھی، کئی صاحبان وہ تھے، جو انگریزوں کو ''اولی الامر'' قرار دے کر ان کے خلاف تحریک کو ناجائز قرار دے رہے تھے، جن کی پشت پر کئی نواب اور ''سر'' صاحبان تھے، تاہم وہ کثیر تعداد جو تحریک خلافت میں سرگرم ہو چکی تھی وہ تو آزادی کی حامی تھی؛ مگر اس کے سامنے بھی ایسی معقول وجوہات تھیں، جن کی بنا پر اب وہ تحریک آزادی میں شرکت کے لیے کچھ شرائط ضروری سمجھتی تھی، ایک طبقہ وہ بھی تھا، جو تحریک آزادی کو خودکشی کے مرادف سمجھنے لگا تھا، ایسے حالات میں ایک طرف کانگریس نے لاہور کے اجلاس میں ملک کی مکمل آزادی کی تجویز پیش کر کے آزادی کی جدوجہد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

آزادی عطا نہیں کی جاتی ہے؛ جد وجہد سے حاصل کی جاتی ہے:

اس نازک موقع پر مسلمانان ہند کی عظمت وعزت برقرار رکھنے کے لیے صرف جمعیۃ علماء

ہند ہی ایک ایسی اسلامی جماعت تھی، جو آگے بڑھی اور اس نے جنگ آزادی میں شرکت کے مسئلہ کو مستقل ایجنڈا بنایا اور اس کے لیے مستقل اجلاس طلب کیا اور اپنی روایت کے مطابق قبل میں ملک وملت کو درپیش اہم مسائل کا جائزہ لے کر مفتی کفایت اللہ، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر الشریعۃ صوبہ بہار واڑیسہ، مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ایک جامع رپورٹ پیش کی تھی، جسے ۲۱؍ستمبر ۱۹۲۶ء کو مجلس عاملہ جمعیۃ علماء نے منظوری دی تھی، جس کا ایک اہم دفعہ ''آزادی ہند'' سے متعلق تھا، جس کا متن یہ تھا:

''جمعیۃ علماء کا یہ اجلاس اپنے اس اذعان ویقین کا اعلان کرتا ہے کہ آزادی عطا نہیں کی جاتی؛ بلکہ اپنی جد وجہد سے حاصل کی جاتی ہے اور یہ کہ ہندوستان کی حکومت کا دستور اساسی وضع کرنے کا حق صرف ہندوستانیوں کو ہے اور کسی اجنبی قوم کو ان کی قسمت کے فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے''۔(۳)

اس فیصلہ کے بین السطور میں یہ امر پوشیدہ تھا کہ آزادی تحفہ میں نہیں ملنے والی ہے؛ بلکہ اسے ظالم حکم رانوں سے چھین کر لینا ہوگا؛ لیکن آزادی چھیننے کی ترکیب کیا ہوگی؟

حصول آزادی کی واحد راہ سول نافرمانی:

اس موضوع پر امروہہ میں جمعیۃ علماء ہند کا مستقل اجلاس منعقد ہوا، جمعیۃ علماء ہند کے اس اجلاس میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سبجیکٹ کمیٹی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ!

''انقلاب کی تحریک جب شروع ہو جاتی ہے تو تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ وہ بے نتیجہ ختم نہیں ہوتی ہے، بے شک اس کو مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نیست ونابود معلوم ہونے لگتی ہے؛ لیکن اس کی خاک میں چھپی ہوئی چنگاریاں پھر دہکتی ہیں اور شعلہ بن کر مختلف طاقتوں کو نذر آتش کر دیتی ہیں، اب کیا مسلمان یہ پسند کریں گے کہ مخالفِ انقلاب طاقتوں کا ضمیمہ بن کر وہ بھی نذر آتش بن جائیں، یا ساحل پر کھڑے ہوئے طوفان کا تماشہ دیکھتے رہیں اور جب طوفان ختم ہو تو وہ اپنی سیاسی حیثیت بھی ختم کر چکے ہوں اور ان کا شمار بھی انھیں پسماندہ قوموں میں ہو، جن کے لیے ہندوستان میں نفرت وحقارت کی پالیسی ہمیشہ کے لئے طے ہو چکی ہے''۔(۴)

۱۹۲۹ء کے جمعیۃ علماء کے اس اجلاس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے باضابطہ جنگ آزادی ہند میں مسلمانوں کی فعال شرکت اور حرب سلمی (سول نافرمانی) کی تجویز پیش کی اور

حضرت شیخ الاسلام مدنی، امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تائید سے جنگ آزادی میں شرکت کی اور سول نافرمانی کی تجویز کو منظوری دے دی گئی، جتنے حریت پسند تھے، انھوں نے جمعیۃ علماء کی اس تحریک سے اتحاد قائم کیا اور جمعیۃ علماء نے بھی اس عظیم مقصد کے لیے دیگر تنظیموں کا ساتھ دیا، گاندھی جی کا شروع کردہ نمک ستیہ گرہ اور، ڈانڈی مارچ کا بھی جمعیۃ علماء اور اس کے رضا کاروں نے ساتھ دیا۔

جمعیۃ علماء کا ادارہ حربیہ:

لیکن سول نافرمانی کو باضابطہ ایک تحریک کے طور پر چلانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اس کے لیے جمعیۃ علماء ہند نے ایک ذیلی اور خفیہ ادارہ ادارہ حربیہ کے نام سے قائم کیا، جس کے پلیٹ فارم سے پورے ہندوستان میں جمعیۃ علماء کے رضا کار ہزاروں کی تعداد میں انگریز کی پالیسیوں سے ٹکراتے، اس کو توڑتے اور قانون شکنی کے جرم میں گرفتار کیے جاتے اور بزبان حال وقال یہ اعلان کرتے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

ادارہ حربیہ کے مدبر منتظم مولانا سجاد:

اس نظام کو کامیابی خفیہ حکمت عملی اور منظّم پلاننگ کے ساتھ چلانے کے لیے ضرورت تھی، ایک ایسی دور اندیش اور مدبر شخصیت کی جو سیاست کے نشیب وفراز کو بھی خوب جانتی ہو اور انگریز کی ہر عیاری کا جواب جرأت وبیباکی اور خاموش پلاننگ کے ساتھ دے سکے، اکابرِ جمعیۃ کی نگاہ انتخاب جس شخصیت پر پڑی، وہ کوئی اور نہیں؛ بلکہ ملت اسلامیہ کے تجربہ کار، بابصیرت قائد اور سیاست کے نشیب وفراز سے واقفیت رکھنے والی جامع شخصیت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ سابق نائب امیر شریعت بہار وسابق ناظم اعلی جمعیۃ علماء ہند تھے، انھیں اس ادارہ حربیہ کا امیر بنایا گیا اور وہ بڑی کامیابی کے ساتھ عرصہ دراز تک اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے، آپ کی پلاننگ اتنی خفیہ، منظّم اور مربوط ہوتی تھی کہ آپ جو آپریشن بھی جمعیۃ علماء کے رضا کاروں کے ذریعہ انجام دلواتے تھے، انگریز حکمرانوں، اس کی پولیس اور اس کی انٹیلی جنس کو اس کی بھنک بھی نہیں لگتی تھی۔

حضرت مولانا سجادؒ کے رفیق کار مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ فرماتے ہیں:

''جمعیۃ علمائے ہند نے اس اکیس سالہ سیاسی دور میں ہندوستان کے اندر اسلام کی سر بلندی اور ملک و وطن کی آزادی کے لیے برٹش حکومت کے مقابلہ میں جب بھی ''دائرہ حربیہ'' قائم کر کے سول نافرمانی کا آغاز کیا تو ہمیشہ مولانائے موصوف ہی اس ادارے کے امیر، یا انچارج مقرر ہوئے اور مولانا نے بے سروسامان مجلس کے جھنڈے کے نیچے ہندوستان کے مختلف صوبوں کے ہزاروں مسلمانوں کی بہترین قیادت انجام دی اور دائرہ حربیہ کے کام کو اس خوبی سے انجام دیا کہ اس سے بہتر اہم کام اور مشکل کو انجام دینا دوسرے کے لیے بہت مشکل تھا''۔(۵)

تاریخ سے دل چسپی رکھنے والوں کو اس موقع پر یہ بات خاص طور پر نوٹ کر لینی چاہیے کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد اپنی تمام تر اعلیٰ صفات اور ہمہ گیر خوبیوں کے باوجود بنیادی طور پر خاموش مزاج اور گمنامی پسند طبیعت کے مالک تھے، بڑے سے بڑے انقلابی عمل اور تحریکوں کے لیے مستقل منصوبہ سازی کرتے تھے؛ لیکن اسٹیجوں پر عام طور پر پہلی صف میں نظر آنے سے گریز کرتے تھے اور بہت سی تحریکوں میں اپنے معتمد عزیزوں کو پیش پیش رکھنے کی کوشش کرتے تھے، مولانا سجاد کس طرح بیک گراؤنڈ میں رہ کر تحریکوں کی قیادت کرتے تھے، اس کا اندازہ ادارہ حربیہ میں آپ کی قیادت سے لگایا جا سکتا ہے۔

ادارہ حربیہ کے پس منظر اور مولانا سجادؒ کی بابصیرت قیادت و رہبری کو مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''جمعیۃ علماء ہند نے جب ۱۹۲۹ء میں جنگ آزادی میں شرکت طے کی تھی تو ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اس کا پلیٹ فارم علاحدہ ہوگا، اس کے رضا کاروں کا نظام بھی علاحدہ رہے گا، گرفتاریوں کا پروگرام بھی جمعیۃ علماء ہند اپنے ارکان اور کارکنان کے لیے علحدہ بنائے گی اور اگر مقدمات وغیرہ کے سلسلے میں مصارف کی ضرورت ہوگی تو ان کا انتظام بھی جمعیۃ علماء اپنے طور پر کرے گی، کانگریس یا کسی اور پارٹی کی طرف نظر نہیں اٹھائے گی، اب ۱۹۳۲ء میں جب تحریک میں دوبارہ جان پڑی تو اس کو زندہ رکھنے کے لیے غذا کی ضرورت تھی، پروگرام کے مطابق سول نافرمانی کرتے ہوئے گرفتار ہو جانا تحریک کی غذا تھی؛ مگر اس مرتبہ غذا کا فراہم کرنا کانگریس اور جمعیۃ دونوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا؛ کیوں کہ اول تو مسلسل تین سال گذر جانے کے بعد کارکنوں کے جوشِ عمل میں اضمحلال پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا، اس کے علاوہ ولنگڈن گورنمنٹ نے اس مرتبہ تحریک

شروع ہونے سے پہلے ہی صف اول کے تمام لیڈروں کو گرفتار کرلیا تھا، مزید برآں ضبطی جائیداد اور گرفتاریوں کے سلسلہ میں بھی حکومت کی پالیسی پہلے سے زیادہ سخت ہوگئی تھی۔

مگران حالات کا تقاضہ یہ بھی تھا کہ تحریک کی رگوں میں اور پٹھوں میں تقویت کے انجکشن، اس پردہ داری کے ساتھ لگائے جائیں کہ سی آئی ڈی کی نظر تفتیش ان ڈاکٹروں تک نہ پہنچ سکے، جو انجکشن کی سوئیاں ہاتھ میں لیے ہوئے ہوں، عام طور پر یہ پروگرام ہوا کرتا تھا کہ ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ رضا کاروں کے جتھے بھیجے جاتے تھے، جو برسر عام قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے اور گرفتار کرلیے جاتے تھے، عام طور پر دفعہ ۸۸/۴۴ کی خلاف ورزی بھی ہوجاتی تھی، پولیس کی کوشش یہ رہتی تھی کہ وہ یہ معلوم کرے کہ رضا کاروں کا جتھا کہاں سے روانہ ہوگا؟ تاکہ روانگی سے پہلے ہی ان کو گرفتار کرلیا جائے اور اگر یہ نہ ہوتو جیسے ہی جتھا روانہ ہو، فوراً گرفتار کرلے، تاکہ شہر میں خلاف قانون اقدام کا مظاہرہ نہ ہوسکے، پورے ملک میں ''سول نافرمانی'' اور خلاف ورزی قانون کے اس نظام کو زندہ رکھنے کے لیے ایک مستقل نظام کی ضرورت تھی، چنانچہ کانگریس نے جنگی کونسل قائم کردی تھی اور جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اس نظام کے لیے عربی لفظ'' ادارہ حربیہ'' منتخب کیا تھا، وہ زمانہ بھی عجیب تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کے صدر مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور ناظم اعلی سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ تھے؛ مگر وہ ڈاکٹر جس کو بہت سے انجکشن دیئے گئے تھے، ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحبؒ نائب امیر شریعت صوبہ بہار تھے۔ (رحمہم اللہ) ادارہ حربیہ کے کلید بردار یہی حضرت تھے، جمعیۃ علماء ہند کے دفتر سے علاحدہ محلّہ بلیماران کی ایک تاریک گلی میں ایک مکان لے لیا گیا تھا، حضرت مولانا سجاد رحمہ اللہ علیہ کا قیام اسی مکان میں رہتا تھا، جس کا علم دفتر کے لوگوں میں سے بھی غالباً صرف قاضی اکرام الحق صاحب کو تھا، جماعت کے جو حضرات اسی ادارہ کی ضرورت سے حضرت موصوف سے ملاقات کرنا چاہتے تھے تو قاضی اکرام الحق صاحب ہی ان کے رہبر بنتے تھے؛ ہمیں یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت مولانا سجاد صاحب کے دست راست اور نفس ناطقہ یہی رفیق محترم مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کو نظام رضا کاران کا ناظم اعلی یا کمانڈر بنایا گیا تھا اوران کا کام یہ تھا کہ ملک میں گھوم پھر کر تحریک کا جائزہ لیں اور اس نظام کو کامیاب بنائیں۔ (۶)

ادارہ حربیہ کے لیے ڈکٹیٹر کی اصطلاح:

آزمائش کے زمانے کے ضابطے بھی الگ ہوجاتے ہیں اس سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس دونوں نے اس ادارہ کے صدر، سکریٹری خازن اور دیگر

عہدوں کوایک سرکلر کے ذریعہ ختم کر دیا تھا؛اس لیے کہ صدراورسکریٹری کا انتخاب عام طور پر جنرل باڈی کی میٹنگ یا عاملہ کے ذریعہ ہوا کرتا تھا؛ لیکن یہاں صورت حال یہ تھی کہ نہ تو میٹنگ کی فرصت، نہ اجلاس کا موقع، کب کس کو کہاں سے گرفتار کرلیا جائے گا؟ اس کا کچھ اتہ پتہ قائدین کو نہیں ہوتا تھا، ایسے میں صدر، یا سکریٹری کے انتخاب کا کوئی موقع نہیں ہوتا تھا؛اس لیے صدر سکریٹری کے عہدوں کو ختم کر کے جمعیۃ علماء نے ڈکٹیٹر شپ قائم کردی تھی، ڈکٹیٹر ہی نظام چلاتا تھا اور جب وہ گرفتار ہوجاتا تھا تو اپنی گرفتاری کے وقت اپنے جانشیں ڈکٹیٹر کا اعلان کر دیتا تھا، ایسے حضرات کی فہرست خفیہ طور پر پہلے تیار کر لی جاتی تھی، جو ڈکٹیٹر بنائے جائیں اوران کی ترتیب بھی مقرر کردی گئی تھی، مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ پہلے ڈکٹیٹر، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی دوسرے ڈکٹیٹر، پھر مولانا احمد سعید، پھر مولانا ابوالمحاسن محمد چوتھے ڈکٹیٹر۔ (اس زمانے کا ریکارڈ پولیس کے چھاپوں اور بقیہ دیمک کی نذر ہوچکا۔اس وقت بہت سی چیزیں لکھی نہیں جاتی تھیں؛ بلکہ ذہن نشیں کی جاتی تھیں تاکہ خبر لیک نہ ہوجائے۔سی آئی ڈی کے لوگ سائے کی طرح ساتھ لگے رہتے تھے)۔

بہر حال جانبازوں اور سرفروشوں کے اس دستہ کے کمانڈر انچیف مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ تھے اور وہی دائرہ حربیہ کے کلید بردار تھے،حضرت نے اپنے مختلف رفقاء کاراور رضا کاروں کے لیے الگ الگ ترتیب بنا رکھی تھی، جو انتہائی خفیہ طور پر اپنے منصوبوں کو نافذ کرتے تھے۔اہم عوامی مقامات، مدارس اور مساجد میں پہنچ کر مولانا سجادؒ کے فرستادے بیان کرتے،تقریر کرتے رائے عامہ کوانگریزوں کی نافرمانی کے لیے بیدار کرتے اورانٹلی جنس کو بھنک لگنے سے پہلے واپس ہوجاتے۔

جامع مسجد دھلی کے منبرو محراب سے سول نافرمانی کا اعلان :

دہلی کا سب سے مرکزی مقام جامع مسجد دہلی ہے۔دیگر تمام مساجد کے مقابلہ میں جمعہ کی سب سے بڑی جماعت بھی اسی جامع مسجد میں ہوتی ہے۔اس میں موثر بیان کا مطلب ہزاروں ہزار افراد کا تیار ہونا تھا؛ اس لیے مولانا سجادؒ کی خاص نظر جامع مسجد دہلی کے منبر ومحراب پر تھی اور اپنے خاص افراد ورفقاء کو وہاں بیان وخطاب کے لیے بھیجتے تھے۔مولانا سجادؒ کے ان رفقاء میں ایک نمایاں نام حضرت مولانا محمد میاں صاحب کا بھی تھا، وہ ادارہ حربیہ کی کارگذاری بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''موصوف (مولانا) سجاد کی ہدایت احقر (مولانا محمد میاں) کے لیے یہ تھی کہ ہر ہفتہ جمعہ کی صبح کو مرآ آباد سے چل کر دہلی پہنچا کرے اور جمعہ بعد جامع مسجد دہلی میں تقریر کرے اور

واپس ہوجایا کرے۔ چند جمعے اسی طرح گذرے، مراد آباد سے تقریباً پانچ بجے صبح کو گاڑی چلتی تھی، احقر اس ٹرین سے تقریبا ساڑھے دس بجے دہلی پہنچتا تھا۔ اسٹیشن پر ہی کوئی صاحب (حضرت مولانا سجاد کی ہدایت پر) موجود رہتے تھے، جو احقر کو احتیاط کے ساتھ طے کردہ مقام پر پہنچا دیتے تھے، پھر اسی احتیاط کے ساتھ رقیبوں کی نظروں سے بچاتے ہوئے جامع مسجد پہنچاتے اور تقریر کے فوراً بعد اسی احتیاط سے کسی صاحب کی رہنمائی میں صوبہ دہلی کے حدود سے باہر پہنچا دیتے، پولیس جب تلاش کرتی تو اس کو اپنی ناکامی پر کافی جھنجھلاہٹ ہوا کرتی تھی۔

جمعہ کا دن تھا احقر حسب ہدایت مولانا سجاد مرادآباد سے دہلی پہنچا۔ اس روز پولیس پوری طرح چوکنی تھی۔ احقر کی گرفتاری کا سامان اس نے مکمل کر رکھا تھا۔ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو اس کا علم تھا۔ مولانا موصوف نے نماز جمعہ کے لیے احقر کو خفیہ راستوں سے روانہ فرمایا، تو احقر کے رہبر قاضی اکرام الحق صاحب کو تاکید کردی کہ نماز کے بعد جنوبی دروازے سے احقر کو نہ نکالیں۔ اس طرف پولیس چوکی ہے اور آج چوکی کے علاوہ بھی پولیس کا انتظام ہے؛ بلکہ شمالی دروازے کی طرف تانگہ تیار رکھیں اور اسی راستہ سے نکال کر لائیں۔ اس طرف پولیس نہیں ہوگی۔ قاضی اکرام الحق صاحب سہو اور نسیان کے پرانے مریض تھے۔ یہاں بھی وہ مولانا سجاد کی اس ہدایت سے ایسے غافل ہوگئے کہ خاص طور پر ممنوعہ راستہ پر ہی تانگہ کا انتظام کیا، یعنی جنوبی پھاٹک سے ہی احقر کو لے کر آئے جہاں پولیس کی چوکی ہے۔ پھر راستہ بھی چاوڑی بازار کے علاوہ چاندنی چوک کی طرف اختیار کیا، چنانچہ جیسے ہی کوتوالی کے سامنے تانگہ پہنچا، سی آئی ڈی کے سب انسپکٹر نے جو جامع مسجد ہی تانگے کے پیچھے لگ گیا تھا اور اطمینان سے اپنی سائیکل پر ہمارے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اس سب انسپکٹر نے تانگہ کو رکوالیا اور احقر کو پورے اعزاز کے ساتھ تانگہ سے اتروا کر حوالات پہنچا دیا۔ اس حوالات میں مولانا منت اللہ رحمانیؒ صاحب موجودہ امیر شریعت صوبہ بہار صبح سے قیام پذیر ہوچکے تھے (مولانا منت اللہ رحمانی حضرت مولانا سجاد کے عزیز ترین شاگرد اور ان کے افکار و آراء کے امین تھے، انھیں حضرت مولانا سجاد نے ضلع سہارنپور میں سول نافرمانی پر لوگوں کو آمادہ کرنے کے لیے ادارہ حربیہ کا ڈکٹیٹر بنایا تھا۔ سی آئی ڈی کی خفیہ رپورٹ پر مولانا منت اللہ رحمانی کو بھی گرفتار کرکے اسی جیل میں پہنچایا گیا تھا۔ خالد نیموی)اور چند ساتھی اور تھے جو اسی روز یا اگلے روز آئے۔

غالباً اگست کا مہینہ تھا شدید گرمی۔ حوالات سب طرف سے بند۔ نہ کوئی روشن دان نہ کھڑکی۔ صرف ایک جانب مین دروازے کی طرف جنگلے تھے؛ مگر سامنے چوڑا برآمدہ تھا؛ جس کی وجہ سے جنگلے بھی ہوا سے نا آشنا رہتے تھے۔ پیشاب پاخانہ کے لیے صبح کو ۸ بجے ایک گھنٹہ کے لیے کھولا جاتا تھا۔ باقی تیئس گھنٹے اسی کمرے میں بند رہتے تھے۔ یہیں وضو بھی کیا جاتا تھا، پانی نکلنے کی کوئی نالی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وضو کا پانی کمرے ہی میں بھرتا رہا، حسنِ اتفاق کمرے میں ڈھال کافی تھا، پانی اسی ڈھال میں رہتا تھا۔۔۔ ایک مہینے کے بعد حوالات سے رہائی ملی اور ۶ ماہ کے لیے دہلی میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا، اگست کے مہینے میں حبس بے جا کا یہ اثر ہوا کہ تمام ساتھیوں کو عوارض لاحق ہو گئے، احقر کو پیچش ہو گئی''۔ (۷)

حضرت مولانا سجاد صاحب کی دور اندیشی اور منظّم منصوبہ بندی اور کار سیاست میں اعلیٰ درجہ کی مہارت تھی کہ انتہائی خاموشی کے ساتھ اس ''ادارہ حربیہ'' کے پلیٹ فارم سے سول نافرمانی میں شامل ہو کر ہزاروں ہزار جیل میں گئے؛ لیکن انگریز کی خطرناک سی آئی ڈی حضرت مولانا سجاد تک پہنچنے اور یہ سمجھنے میں کامیاب نہ ہو سکی کہ حضرت مولانا سجاد ہی انقلابی اور باغیانہ تیور پیدا کرنے والے محرک اور نافرمانی کا انجکشن لگانے والے ڈاکٹر اور تحریک کے کمانڈر انچیف ہیں، صرف دہلی ہی میں نہیں، جمعیۃ علماء کی طرف سے سول نافرمانی کی تحریک ملک کے ہر شہر میں چلائی گئی اور بالآخر انگریز گورنمنٹ کو ہندوستانی شہریوں کے بعض اہم مطالبات کو ماننے پر مجبور ہونا پڑا۔

تحریک کا جو سلسلہ جو ۱۹۲۹ء سے شروع ہوا، یہ تسلسل کے ساتھ ۱۹۳۳ء تک چلتا رہا، یہاں تک جب جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ منعقدہ اگست ۱۹۳۳ نے یہ تجویز منظور کر دی کہ!

''جمعیۃ علماء کا یہ جلسہ مولانا عبدالحق ڈکٹیٹر دوازدہم جمعیۃ علماء ہند کے اس بیان کی، جو انھوں نے ۲۸/اپریل ۱۹۳۳ء مطابق ۵ محرم ۵۲ھ کو جامع مسجد دہلی کے عظیم الشان جلسہ میں دیا تھا، تصدیق کرتا ہے اور مقتضیات احوال وقومی ضروریات پر کامل غور وخوض کرنے کے بعد سول نافرمانی کے اس پروگرام کو جو حضرت صدر محترم نے اپنے اختیار خصوصی سے جاری فرمایا تھا، ملتوی کرتے ہوئے اس امر کی تصریح کرتا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کا سیاسی مسلک تحصیل آزادی اور استخلاص وطن کے متعلق آج بھی وہی ہے، جس پر وہ تیرہ سال سے گامزن ہے۔ ۔۔۔ مجلس عاملہ کا یہ جلسہ آئندہ پروگرام مرتب کرنے کی غرض سے حسب ذیل حضرات کی سب کمیٹی مقرر کرتا ہے اور اس کو اجازت دیتا ہے کہ آئندہ کے لیے جو پروگرام اتفاق رائے

سے مرتب ہوا سے شائع کرے: (۱) صدر محترم (۲) ناظم جمعیۃ علماء ہند (۳) حضرت مولانا حسین احمد صاحب (۴) حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ''۔

اس کے مطابق سول نافرمانی کی تحریک موقوف کردی گئی اور مقرر کردہ کمیٹی کی رپورٹ میں بھی اس کو مناسب نہیں سمجھا گیا، اس کے بعد حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی تمام تر توانائی ملت کے دیگر محاذوں پر امت مسلمہ کی قیادت وترجمانی پر صرف ہونے لگی؛ لیکن اس کے بعد بھی جب بھی ضرورت پڑی تو جمعیۃ علماء کی آواز پر مولانا سجاد نے متعدد بار سول نافرمانی کی تحریک شروع کی ہے۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں بہت کچھ اختیارات مرکزی اسمبلی اور صوبائی کونسلوں کو دے دیئے گئے تھے، اس کے بعد تحریک کا نہج تبدیل ہوگیا اور ادارہ حربیہ بھی عملی طور پر جمعیۃ علماء میں مدغم ہوگیا۔

حضرت مولانا سجاد کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ عزم واستقلال کے پہاڑ تھے، جس چیز کا منصوبہ بنالیا، اس کو آخری منزل تک پہنچا کر دم لیتے تھے، سول نافرمانی کی تحریک کو بھی انھوں نے منزل تک پہنچا کر دم لیا، آپ کے رفیق کار مولانا احمد سعید دہلوی فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد میں جہاں بیشمار خدداد قابلیتیں موجود تھیں، ان تمام خوبیوں اور قابلیتوں میں ان کی پختہ کامی، عزم بالجزم، مستقل مزاجی اور ہمت وارادے کی طاقت ضرب المثل تھی۔ وہ بڑی سے بڑی مشکل کا ان تمام قوتوں کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے، وہ کام کرنے میں تھکتے نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ ان تمام طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے بعد ان کو کامیابی نصیب ہوئی۔ سول نافرمانی تحریک کی قیادت انھوں نے جہاد سمجھ کر اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کیا۔ سچائی تو یہ ہے کہ ان کی پوری زندگی کا مقصد اولیں ہی اعلاء کلمۃ اللہ تھا''۔

مولانا سید عثمان غنی سابق ناظم امارت شرعیہ لکھتے ہیں کہ!

''حضرت مولانا کی زندگی کا مقصد وحید اسلامی نظریہ کے مطابق مسلمانوں کی تنظیم، ان کی وحدت ملی کا قیام اور ان کی فوضیت کا خاتمہ تھا اور یہ سب کچھ اخلاص کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کی رفعت وبرتری کے لیے تھا''۔

جناب محمد یونس سابق وزیر اعظم حکومت بہار لکھتے ہیں:

”ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے سیاست میں حصہ لیا، تو وہ بھی مذہب کے لیے الیکشن میں حصہ لیا؛ تو وہ بھی مذہب کے لیے۔ کانسل اور اسمبلی کے مباحثات میں حصہ لیا؛ تو وہ بھی مذہب کے لیے“۔(۸)

بندہ خالد نیموی یہ عرض کرتا ہے کہ حضرت نے تحریک خلافت کی قیادت فرمائی تو وہ بھی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے، نان کو پریشن مومنٹ کی قیادت کی اور ترک موالات کا فتوی مرتب کیا (جسے انگریز گورنمنٹ نے کئی بار ضبط کیا) وہ بھی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے، سول نافرمانی کے لیے ادارہ حربیہ کی قیادت کی تو وہ بھی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے، اس راہ میں وہ کسی قسم کی مداہنت منظور نہیں کرتے تھے۔

جب بھی انگریز گورنمنٹ کی طرف سے کوئی ایسا قانون مسلمانوں پر مسلط کیا جاتا، جس سے مسلمانوں کے خالص مذہبی معاملات میں مداخلت ہوتی ہو اور اسے نقصان پہنچتا ہو تو اس قانون کو روکنے اور اس کو بدلوانے کے لیے سب سے پہلے جمعیۃ علماء اور اس کے فکری قائد حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حرکت میں آتے اور عام طور پر اس قانون کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جاتی۔

مدح صحابہ کی تحریک:

لکھنوء میں شیعہ فرقہ کی بڑی آبادی ہے، ۱۹۰۲ء سے لکھنؤ میں شیعوں کی طرف سے سنیوں کے خلاف فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کی مذموم کوششیں ہونے لگیں، اہل سنت کے عقائد کی تردید، حضرات شیخینؓ و اکابر صحابہ پر اور امہات المومنینؓ پر کھلے عام تبرا کیا جانے لگا تو اہل سنت بیدار ہوئے اور انھوں نے ۱۳ر فروری ۱۹۰۸ء کو احتجاج کیا، جس کے نتیجے میں انگریز حکام نے تبرائی جلوسوں پر پابندی عائد کردی، شیعوں نے ۱۹۰۸ء ہی میں انگریز حکام کو درخواست دی کہ سنیوں کے مدح صحابہ پر بھی پابندی عائد کردی جائے، انگریز حکام نے مدح صحابہؓ کے جلسوں پر بھی پابندی عائد کردی، اس کے ردعمل میں تحریک مدح صحابہ چلائی گئی، جو مسلسل ۳۴ر سال تک چلی، انگریز گورنمنٹ نے اس کے لیے کئی کمیشن اور کمیٹیاں تشکیل دی؛ لیکن حالات سدھرنے کے بجائے اور بگڑتے گئے، بالآخر اس کے خلاف جمعیۃ علماء کی قیادت میں سول نافرمانی کی تحریک چلائی گئی۔(۹)

یہ مسئلہ کئی بار جمعیۃ علماء کے اجلاس کا ایجنڈا بنا: جمعیۃ علماء کے مجلس مرکزیہ منعقدہ مرادآباد مورخہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ر مئی ۱۹۳۹ء کے اجلاس میں یہ قرارداد

منظور کی گئی کہ جمعیۃ علماء ہند مجلس مرکزیہ کا یہ اجلاس لکھنؤ میں شیعوں کی طرف سے تبرا ایجی ٹیشن کو انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے، اس خلافِ آئین وانسانیت حرکت کو ملک کے امن کے لیے خطرہ عظیم سمجھتا ہے، تبرا کسی حالت میں، کسی وقت بھی قابل برداشت نہیں ہے، نہ اس کو کوئی ذی فہم انسان ایک لمحہ کے لیے بھی جائز قرار دے سکتا ہے؛ اس لیے یہ اجلاس حکومت سے پرزور طریق پر استدعا کرتا ہے کہ وہ اس شر وفساد کو جلد ختم کرائے، پھر مدح صحابہ سے متعلق یہ قرارداد منظور کی گئی کہ جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اجلاس دوازدہم میں منعقدہ جونپور جون ۱۹۴۰ء میں یہ قرارداد منظور ہوئی:

''جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اس امر کا اعلان ضروری سمجھتا ہے کہ لکھنؤ میں مدح صحابہؓ کی تحریک سنیوں کی تیس سالہ تحریک ہے، جو وہ اپنے ایک مذہبی اور شرعی حق کی تحصیل کے لیے جاری کئے ہوئے ہیں، یہ اجلاس مدح صحابہ کے متعلق اپنے اجلاس دہلی کی مکرر توثیق کرتا ہے کہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی علی الاعلان مدح وثنا کرنا سنیوں کا مذہبی حق ہے، وہ اس کو کسی حال میں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور نہ اس پر کسی پابندی کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں''۔

اس سلسلہ میں سول نافرمانی کی ایک تحریک؛ جس میں حضرت مولانا سجاد اور حضرت شیخ الاسلام مدنی قائدانہ حصہ لے رہے تھے؛ اس کی تفصیل حضرت مولانا منظور نعمانی یوں تحریر فرماتے ہیں:

مدح صحابہ پر پابندی کے خلاف سول نافرمانی:

''لکھنؤ میں مدح صحابہ ایجی ٹیشن جاری تھا، حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ اور مولانا (ابوالمحاسن محمد سجاد) مرحوم اس کی قیادت فرمارہے تھے، جمعہ کا دن تھا، جس دن کہ قانون امتناع مدح صحابہ کی خلاف ورزی کرکے اجتماعی سول نافرمانی کی جاتی تھی، ٹیلے کی مسجد اس جنگ کا محاذ تھا، جمعہ کی نماز کے بعد پہلے وہیں جلسہ ہوتا تھا، مردوں کے علاوہ عورتوں کا بھی بڑا مجمع ہوتا تھا اور ان کے لیے قناتوں کے ذریعہ پردہ کا انتظام کیا جاتا تھا، جب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پردہ نشیں عورتوں کے مجمع سے ایک خط ایک بچہ کے ذریعہ صدر جلسہ کے نام پہنچا، اس میں ایک عورت نے اپنے دینی ولولہ کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس ایجی ٹیشن میں عملی حصہ لینے کا موقع مجھ کو اور میری بہنوں کو بھی دیا جائے؛ اس کے لیے اس خط میں صحابیات کی شرکت غزوات کا حوالہ بھی دیا گیا تھا، حضرت مولانا حسین احمد

مدنیؒ جو اس دن جلسہ کے صدر تھے، راقم الحروف (مولانا منظور نعمانی) سے فرمایا کہ لاؤڈ اسپیکر کے پاس جا کر تم اس خط کا جواب دے دو اور ان بہنوں کو جا کر بتلا دو کہ ابھی تو ہم لوگ باقی ہیں، جب تک ہم میں سے ایک بھی موجود رہے گا، یہ گوارہ نہیں ہوسکتا ہے کہ آپ تکلیف اٹھائیں۔

میں چلنے لگا تو حضرت امیر صاحب (مولانا محمد سجاد) مرحوم نے فرمایا کہ اس کے علاوہ مستورات کو یہ بھی سمجھا دینا کہ ''حرب سلمی'' (یعنی آئینی جنگ، یا سول نافرمانی) اور تلوار کی جنگ کے احکامات شریعت میں جداگانہ ہیں، تلوار کی لڑائی میں تو خاص حالات میں عورتوں کے لیے بھی شرکت کا موقع ہوتا ہے؛ مگر یہ آئینی جنگ جس میں اپنے آپ کو گرفتار ہی کرایا جائے، اس میں عورتوں کے لیے شرکت کا کوئی موقع نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ شرعا ان کے لیے ناجائز ہے کہ وہ اپنے کو غیر آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار کرا کے قید خانہ میں جائیں، لہٰذا ان بہنوں کا جذبہ قربانی تو قابل قدر ہے؛ لیکن سول نافرمانی میں عملی شرکت کے خیال کو وہ قطعی طور پر دل سے نکال دیں کہ ان کے حق میں وہ معصیت اور خدا کی نافرانی کا باعث ہے''۔(۱۰)

مولانا سجاد مرحوم کی سیاسی بصیرت کے ساتھ فقہی بصیرت سے مولانا منظور نعمانی (واقعہ نگار) اس درجہ متاثر ہوئے کہ آپ نے لکھا:

''یہی حضرت مرحوم کی وہ خصوصیات تھیں، جنھوں نے مجھے ان کا فریفتہ کر دیا تھا اور واللہ العظیم اگر میرے بس میں ہوتا تو میں سیاسی کام کرنے والے کم از کم نوجوان علماء کے لیے تو فرض قرار دے دیتا کہ وہ پہلے کچھ دنوں حضرت مرحوم کی زیر نگرانی ٹریننگ حاصل کریں''۔(۱۱)

لکھنؤ کی تحریک مدح صحابہ کو مولانا سجاد کی مستقل نگرانی حاصل تھی، اگر چہ اس کی تفصیلات بہت کم صفحۂ قرطاس پر موجود ہیں، حضرت کی ذات اور آپ کی خدمات سے استفادہ کرنے والوں کے قلم نے بھی اس سلسلہ میں بخالت سے کام لیا، ورنہ فنائیت و وارفتگی کی ایک سے بڑھ کر ایک مثال صفحۂ قرطاس پر موجود ہوتی، آپ کے سوانح نگار مولانا مسعود عالم ندویؒ ''محاسن سجادؒ'' کی ترتیب کے مرحلہ میں بعض اہل کرم کے رویہ سے شاکی ہو کر لکھتے ہیں:

''لکھنؤ کے ایک صاحب جو تحریک مدح صحابہ کے سلسلہ میں مولانا کی خدمات اور

مشوروں سے مستقل فائدہ اٹھاتے رہے تھے، انھیں ''محاسن سجاد'' کے لیے مضمون لکھنے کی درخواست کی گئی تو وہ اس بے رخی سے پیش آئے کہ حیرت ہوتی ہے''۔ (۱۲)

شاردا ایکٹ کے خلاف سول نافرمانی :

اسلام میں شادی کے لیے عمر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، جس عمر میں پختگی کے آثار نظر آئیں اور اولیاء مناسب سمجھیں اس عمر میں بچیوں کو رشتہ ازدواج سے منسلک کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں بھی یہی معمول تھا؛ لیکن انگریز کے اس ملک پر تسلط کے بعد جہاں اور بھی جبریہ قوانین مسلط کیے گئے؛ ان میں سے ایک قانون ''شاردا ایکٹ تھا''۔ ۲۳/ستمبر ۱۹۲۹ء کو گورنمنٹ کی طرف سے شاردا ایکٹ بنایا گیا، جس کا مدعا یہ تھا کہ ۱۸/سال سے کم عمر میں لڑکے کی اور ۱۲ سال سے کم عمر میں لڑکی کی شادی نہیں کی جاسکتی ہے اور جو شخص بھی اس قانون کی خلاف ورزی کرے گا، چاہے وہ گارجین ہو، یا گواہ ہو، یا ایسے گارجین، جو اس پر رضامندی کا اظہار کریں گے، ان سب پر سزا کے طور پر جرمانہ (ایک ہزار روپئے) عائد کیے جائیں گے، یہ قانون عام تھا، اس میں مسلمان بھی شامل تھے، ان کے لیے اس قانون میں کوئی استثنا نہیں تھا، حالاں کہ یہ اسلامی قانون، مقاصد نکاح اور اسوۂ نبوی کے خلاف تھا اور شریعت میں اور پرسنل لا میں صریح مداخلت تھی، اس موقع پر پورے ہندوستان میں علماء کی قیادت میں مسلمانوں نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا، مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم جمعیۃ علماء ہند نے مجلس تحفظ ناموس شریعت قائم کی اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد ہی اس کے ناظم اور ذمہ دار قرار پائے۔

جمعیۃ علماء ہند نے اپنے نویں اجلاس عام منعقدہ امروہہ میں اس تعلق سے یہ تجویز پاس کیا کہ!

''چونکہ شاردا ایکٹ بحق اہل اسلام صریح مداخلت فی الدین اور اسلامی پرسنل لاء پر شدید حملہ ہے اور حکومت ہند نے انتہائی احتجاج وتنبیہ کے بعد بھی مسلمانوں کو آج تک اس سے مستثنی نہیں کیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح اس حکومت نے ملک پر جابرانہ قبضہ کر کے تمام اہل وطن کو غلام اور مفلس و بے کس بنادیا ہے اور ظالمانہ قوانین کے وضع ونفاذ اور اخلاق ومعاشرت کی تخریبی حکمت عملی پر اصرار ہے۔ اسی طرح وہ اب اسلامی پرسنل لا کے واجب الحفظ قلعے کو بھی مسمار کر کے دین وملت کو بھی برباد کردینا چاہتی ہے، جو تمام اہل ملک خصوصا مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت ہے اور ان تمام مفاسد کے سدّ باب اور ناموس شریعت کی حفاظت کے لیے آخری صورت یہ ہے کہ ملک وملت کو حکومت متسلطہ کی گرفت

سے مکمل طور پر آزاد کرالیا جائے؛ اس لیے یہ اجلاس مسلمانوں سے یہ اپیل کرتا ہے کہ ملک وملت کی آزادی اور اپنے پرسنل لا کی حفاظت کے لیے پورے جوش اور کامل استقلال سے احکام شرعیہ کے موافق کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کرتے ہوئے سرفروشانہ پرامن جنگ آزادی میں شریک ہوں''۔

چنانچہ حضرت مولانا سجاد نے اس کی قانونی سماجی اور شرعی وفقہی حیثیت پر ''الجمعیۃ'' اور امارت شرعیہ کے ترجمان نقیب میں مضامین لکھے اور مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ اگر گورنمنٹ ان کے مطالبہ کو تسلیم نہ کرے تو گورنمنٹ کا بائیکاٹ کریں اور سول نافرمانی کی تحریک چلائیں، چنانچہ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کی سرپرستی میں ان ریاستوں میں سول نافرمانی کی زبردست تحریک چلائی گئی، مولانا محمد سجاد نے مختلف علاقوں میں اس قانون کی خلاف ورزیاں کرائیں اور کم عمری کی شادیاں کروائیں اور اوران خلاف قانون شادیوں میں قاضی کے فرائض گورنمنٹ کے علی الرغم آپ نے انجام دیئے، حضرت مولانا سجاد کے ایما پر ہی اس سلسلہ میں ''متحدہ کانفرنس'' منعقد ہوئی، جو مسلمانوں کے مختلف گروہ اور نظریات کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ اس سلسلہ میں جناب شاہ محمد عثمانی (مکہ مکرمہ) تحریر فرماتے ہیں:

میں ''گیا'' میں قانون شکنی کے ایک جلسہ میں شریک تھا، مولانا محمد سجاد قائدانہ حصہ لینے کے لیے جلسہ میں آئے، چند نوجوان ایسی لڑکیوں سے شادی کرنا چاہ رہے تھے، جن کی عمریں قانون کی مقررہ حد سے کم تھیں؛ لیکن وہ یتیم لڑکیاں تھیں، ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا، مولانا نے ان کا نکاح پڑھایا اور مطبوعہ فارم پر یہ لکھ کر کہ ہم نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے؛ کیوں کہ ہم انگریزی حکومت کو اس کا حق نہیں دینا چاہتے، وہ مسلمانوں کے معاملہ میں دخل دے اور یہ کہ یہ نکاح مولانا محمد سجاد نے پڑھایا اور حکومت ہند کو بھیج دیا''۔(۱۳)

قبلہ اول کی حفاظت اور مسلمانان فسلطین کی امداد واعانت کے لیے سول نافرمانی:

خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد سے ہی مسئلہ فلسطین ایک لاینحل مسئلہ بنتا چلا گیا، اعلان بالفور کے ذریعہ فلسطین میں ایک ناجائز یہودی مملکت کا اعلان کیا گیا تو یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہوگیا۔ قبلہ اول اور فلسطین کے مسلمانوں کو انگریزوں اور یہودیوں کے ناپاک عزائم کے لیے تختہ

مشق بنایا جانے لگا، ایسے حالات میں جمعیۃ علماء ہند کے مجلس عاملہ منعقدہ ۳؍اگست ۱۹۳۸ء میں یہ قرارداد منظور کی گئی:

''جمعیۃ علماء کا یہ جلسہ فلسطین کے جگر خراش اور روح فرسا واقعات اور برطانوی مظالم کو سخت غم وغصہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور قبلہ اول کی حفاظت اور مسلمانان فلسطین کی امداد واعانت کے سلسلہ میں مجلس تحفظ فلسطین نے جو حسب ذیل تجویز پاس کی ہے، جمعیۃ عاملہ کا یہ اجلاس اس کی توثیق وتصدیق کرتا ہے اور تجویز کرتا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند اپنے تمام ذرائع اس تجویز کو کامیاب بنانے میں بروئے کار لائے اور جمعیۃ کی صوبہ وار شاخوں اور تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس مقدس اور مذہبی فریضہ کی ادائیگی میں پورے جوش اور انہماک کے ساتھ قربانی کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ ''مجلس تحفظِ فلسطین'' کا یہ جلسہ فلسطین کے جگر خراش اور روح فرسا واقعات کے پیش نظر مسلمانان ہند قبلہ اول کی آزادی اور مسلمان بھائیوں کی نصرت واعانت کا جو فریضہ عائد ہو رہا ہے، اس کی ادائیگی کے لیے تجویز کرتا ہے کہ سول نافرمانی کی جائے۔

سول نافرمانی کی تیاری کے لیے تمام ہندوستان میں فوراً جلسے شروع کر دیئے جائیں، فلسطین کمیٹیاں قائم کی جائیں، رضا کار بھرتی کیے جائیں اور ان کی مضبوط اور منظّم جماعتیں بنائی جائیں اور پوری تیاری کے ساتھ سول نافرمانی کے لیے مستعدی پیدا کی جائے، سول نافرمانی کا مؤثر اور نتیجہ خیز طریقہ متعین کرنے کے لیے ہندوستان کی دوسری جماعتوں سے مشورہ کرنے اور سول نافرمانی کے تیار کرنے کی غرض سے فوراً کام شروع کر دیا جائے؛ تاکہ ۱۷؍اکتوبر ۳۸ء کی موتمر عالم اسلامی کے اجلاس کے بعد فلسطین کے معاملات پر بحث کرنے اور اس کا حل تلاش کرنے قاہرہ مصر میں منعقد ہو رہی ہے، اس پر اثر پڑے، جس قسم کی سول نافرمانی مناسب ہو فوراً شروع کر دی جائے''۔(۱۴)

اہل نظر جانتے ہیں کہ مولانا سجاد جمعیۃ علماء ہند کے لیے دماغ کا درجہ رکھتے تھے، عام طور پر ایجنڈا تیار کرنا تجاویز کا ڈرافٹ تیار کرنا اور اسے پیش کرنا آپ ہی کے ذمہ ہوا کرتا تھا، چنانچہ مسئلہ فلسطین کے سلسلہ میں سول نافرمانی کی تجویز آپ ہی کی تحریک پر منظور ہوئی اور جمعیۃ کی ان تجاویز کو عملی جامہ پہنچانے کے لیے حضرت مولانا سجاد نے ہر ممکن کوشش فرمائی، چنانچہ حضرۃ الاستاذ مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ اپنی مایہ ناز کتاب ''امارت شرعیہ دینی جدوجہد کا روشن باب میں تحریر فرماتے ہیں:

''۱۹۳۰ء میں بالفور اسکیم سے فلسطین کے عرب مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا، وہ اب عیاں

ہو چکا ہے، ابھی اسرائیلی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی؛ بلکہ اس کے قائم کرنے کے لیے یہ بالفور اسکیم تیار ہوئی تھی، ہندوستان میں اس کے خلاف سخت احتجاج ہوا، صوبہ بہار واڑیسہ کے بھی تمام شہروں اور قصبات میں امارت شرعیہ کی ہدایت پر احتجاجی جلوس نکالے گئے، جن میں تمام مسلمانوں نے جوش وخروش سے حصہ لیا تھا، ۱۹۳۶ء میں جب یہ خبر آئی کہ حکومت برطانیہ فلسطین کو تقسیم کرنا چاہتی ہے تو امارت شرعیہ نے اعلان کیا کہ پورے صوبہ میں ۲۸ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ ۱۹ جون ۱۹۳۶ء یوم جمعہ کو ''یوم فلسطین'' منائیں اور حکومت برطانیہ کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کریں اور ساتھ مسلمانان فلسطین کے لیے دعا کریں، پھر جب انگریزوں کے مظالم فلسطینیوں پر حد سے فزوں تر ہو گئے اور وہاں یہودیوں کی کالونیاں آباد کی جانے لگیں تو اس وقت مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں سے یہ اپیل کی کہ پورے ملک میں اس کے خلاف احتجاج کریں اور اس کے لیے ۳ ستمبر ۱۹۳۷ء یوم جمعہ کی تاریخ مقرر کی، چنانچہ مسلمانان ہند نے پورے ملک میں اس دن جلوس نکالا اور جلسے کیے اور عرب اور فلسطین کے حق میں تقریریں کی گئیں''۔ (۱۵)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی یہ وہ سرفرشانہ خدمات تھیں کہ ۱۸ شوال ۵۹ھ میں جب اچانک ان کا انتقال ہو گیا تو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ نے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی صدارت میں مورخہ ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو جو تعزیتی قرارداد منظور کی ہے، اس کا ہر جملہ حضرت مولانا سجاد کے لیے بہترین خراج تحسین ہے۔ تجویز نمبر ۲ کے الفاظ ہیں:

''مجلس عاملہ نے مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر انتہائی رنج وملال کے ساتھ حسب ذیل تعزیتی قرار داد منظور کی۔ تجویز: جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ زعیم الامۃ، مجاہد ملت، مفکر جلیل، عالم نبیل حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند و نائب امیر شریعت صوبہ بہار کی وفات پر اپنے عمیق رنج واندوہ کا اظہار کرتا ہے اور اس سانحہ روح فرسا کو مسلمانان ہند کے لیے ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے۔ مولانا کی ذات گرامی مذہب وملت اور اسلامی سیاست کے ماہر خصوصی تھے۔ ان کی مذہبی، قومی وطنی خدمات صفحات تاریخ پر آب زر سے لکھی جائیں گی اور مسلمانان ہند ان کو کبھی نہیں فراموش کریں گے''۔

تجویز کے الفاظ کے مطابق یقیناً حضرت زعیم الامۃ بھی تھے اور مجاہد ملت بھی تھے اور جمعیۃ

علماء سے متعلق مختلف خدمات بطور خاص سول نافرمانی ادارہ حربیہ اورآپ کی مجاہدانہ زندگی کا شاہکار تھا عمر کے اخیر مرحلہ تک جب بھی امت کی فلاح کے لیے کوئی محاذ قائم کرنا پڑا تو پورے انہماک اور سرفروشانہ جذبات کے ساتھ اس کی قیادت فرماتے رہے۔(جزاہ اللہ خیراعن المسلمین)

مصادر ومراجع

(۱) معجم طبرانی فی الاوسط، البدایہ والنہایة: ۳۹/۷
(۲) مسند احمد بن حنبل: ۱۱۶۰
(۳) تجاویز منظور شدہ اجلاس ہشتم جمعیۃ علماء ہند منعقدہ پشاور ۵/دسمبر ۱۹۲۷ء
(۴) مولانا حفظ الرحمٰن ایک سیاسی مطالعہ ص ۱۳۶
(۵) حیات سجاد ص ۷۸
(۶) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ایک سیاسی مطالعہ ص ۱۵۴
(۷) مستفاد از مجاہد ملت ایک سیاسی مطالعہ۔ص ۱۵۰
(۸) مولانا سجاد حیات وخدمات ص ۱۷۴
(۹) www.farooqia.com
(۱۰) محاسن سجاد، ص: ۶۱
(۱۱) محاسن سجاد، ص: ۶۲
(۱۲) محاسن سجاد ص ۱۲
(۱۳) مولانا محمد سجاد، حیات وخدمات ۳۱
(۱۴) جمعیۃ العلماء کیا ہے؟ از مولانا سید محمد میاں صاحبؒ، مطبوعہ الجمعیۃ بکڈپو۔ دیگر تجاویز جمعیۃ بھی اسی کتاب سے منقول ہیں
(۱۵) امارت شرعیہ دینی جدوجہد کا روشن باب۔ص ۲۱۱

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد
اورتحریک امارت

حضرت مولانا شاہ ہلال احمد قادری

خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ

چودھویں صدی ہجری میں ہندستان کے علمی افق پرطلوع ہونے والے مہر وماہ میں ایک اہم اورممتاز نام مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کا ہے جن کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ان کے علمی اور دینی کارنامے خودان کا بہترین تعارف ہیں۔حضرت مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایسے وقت میں علماء کی جمعیت اورامارت شرعی کے قیام کی تحریک چلائی جب اس کی سخت ضرورت تھی۔

ہم اس مجمع المحاسن ذات کے علمی اوور دینی خدمات کے مختصر جائزے کے بعدان کی پیش کردہ تحریک امارت شرعیہ کے قیام کا ذکرکریں گے جو ہماری اس تحریر کا اصلا موضوع ہے۔

ہندستان کے علما کے درمیان مولانا سجاد صاحب کا بڑاوزن اور وقار تھا،ان کی تحریروں کو اہل علم قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دینی اورقومی معاملات میں ان کی رائے اوران کے فیصلے کو تسلیم کرتے تھے۔فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا نے علماء کے طریقے اور ذوق کے مطابق مسند درس سنبھالی،جن درسگاہوں میں انہوں نے تدریسی خدمات انجام دیں ان درسگاہوں کا تدریسی معیار بلند ہوگیا؛ کیوں کہ طلبہ کی ذہنی تربیت اور ان میں علمی استعداد پیدا کرنے کی صلاحیت مولانا کے اندروہبی اور خداداد تھی،حضرت سجاد کے درس کی افادیت جب طالبین کی سمجھ میں آنے لگی توان کے پاس طلبہ کا مرجوعہ ہونے لگا،مولانا تمام علوم وفنون کی تدریس میں یدطولی رکھتے تھے،مولانا کے علمی کارناموں میں ان کا ایک بڑا کارنامہ گیا میں مدرسہ انوارالعلوم کا قیام ہے،یہ مدرسہ مولانا کی علمی یادگار رہے۔

فقہ وافتا میں بھی مولانا کی شخصیت مسلم تھی،مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں اور مدرسہ انوارالعلوم گیامیں مولانا نے افتا کی خدمات انجام دیں،امارت شرعیہ سے ان کے جوفتاوے جاری

ہوئے ان کو جمع کر دیا گیا ہے۔ کتاب وسنت پر ان کی نظر وسیع تھی اس لئے ان کے فتوؤں سے ان کا فقہی تبحر ظاہر ہوتا ہے، قیام امارت کے بعد انہوں نے بعض مقدمات کے فیصلے کئے ہیں وہ قضایا بھی شائع ہو چکے ہیں۔ حضرت مولانا سجاد کی علمی شخصیت ہر اعتبار سے مکمل تھی، علمی اور دینی موضوعات پر مولانا کی تحریریں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ یہ میدان بھی مولانا کی دسترس میں تھا۔

وہ زمانہ ہندستان میں سیاسی اور مذہبی انتشار کا زمانہ تھا، پورے عالم اسلام اور بالخصوص ہندستان میں مسلمانوں کے لیے بڑے ابتلاء وآزمائش کا دور تھا، اب تک مولانا اپنی تدریسی ذمہ داریوں اور درس نظامی کو مفید تر بنانے میں لگے ہوئے تھے، لیکن گیا میں رہ کر جب ان کی سماعتوں میں مسلمانوں کی حالت زار کی خبریں پہنچنے لگیں تو ان کا دردمند دل بے چین ہونے لگا، اور ان کی توجہ مسلمانوں کے ان مسائل کی طرف ہونے لگی اور آہستہ آہستہ تدریسی مشاغل سے ہٹتی گئی بلکہ یہ کہیے کہ ان کے اندر موجود قائدانہ صلاحیتیں ظاہر ہونے لگیں اور وہ امت مسلمہ کے مسائل کے حل تلاش کرنے میں لگ گئے۔ مولانا کے افکار پہلے سے خالص اسلامی افکار تھے، جذبۂ اخلاص و للٰہیت ان کے تمام جذبات قلبی پر پہلے سے غالب تھا، فقط ''رسم شبیری'' کے لئے قدم باہر نکالنے کا مرحلہ تھا اور وہ پورے طور پر معمار قوم اور مصلح امت کی حیثیت سے منصّہ شہود پر آگئے، اس عہد میں امت کے ہر مسیحا کے لیے سیاست سے ایک گونہ تعلق کا ہونا لازمی اور ضروری تھا؛ کیوں کہ اس وقت بلکہ آج بھی سیاست، دین سے یا تو دور ہے، یا سیاست متبوع اور دین اس کے تابع ہے، مولانا نے ''چنگیزیت'' کو ختم کرنے کے لیے سیاست کو دین سے قریب لانے کی کوشش شروع کی۔ مولانا کا سیاسی پارٹیوں سے تعلق اور سیاسی سطح پر ان کے بیانات اور فیصلے سب ان کے ان ہی افکار سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس طرح انہوں نے حکومت وقت سے مسلمانوں کے بہت سے مسائل حل کرائے، حکومت کے کئی ایسے قوانین پر احتجاج کر کے اس کو تبدیل کرایا، جو مسلمانوں کے حق میں سخت مضر تھے، مولانا کی سیاسی بصیرت کے، علماء کے علاوہ سیاسی حلقے کے لوگ بھی قائل ومعترف تھے۔ مولانا کی سیاسی خدمات کی تفصیل ان کے حالات میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا کی ان تمام قومی اور ملی خدمات کے علاوہ جو ایک فکر ان کے قلب ودماغ پر حاوی اور ان کی زندگی کا مقصد بن چکی تھی، وہ حکومت الہیہ کا تصور تھا۔ یہ کام کیسے ہو اور عصر حاضر میں اس کو کس طرح عمل میں لایا جاسکتا ہے؟ اپنی اس فکر کو انہوں نے جس حد تک اپنی تحریر میں پیش کیا ہے وہ خاص چیز ہے اور ان کے فکر عالی کا نتیجہ ہے، اس انداز فکر کے اسباب ہندستان کے وہ حالات

تھے، جو حکومت برطانیہ کے برسر اقتدار آنے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔

ہندستان میں جب مغلوں کی حکومت زوال پذیر ہوئی اور برطانوی سامراج نے یہاں اپنا قبضہ جمانا شروع کیا اور مغل حکمراں سلطنت پر اپنی گرفت نہ رکھ سکے اور ان کو اقتدار کی باگ ڈور مجبوراً انگریزوں کے حوالے کرنی پڑی تو انہوں نے اپنی کچھ مذہبی شرائط ان سے منظور کرائیں، جن میں مسلمانوں کے خاص خاص مسائل کے لیے ایک الگ شرعی عدالت قائم کی گئی، اس کے تمام شعبوں کے ملازمین کے لئے تنخواہیں بھی حکومت نے متعین کیں، بنگال و بہار واڑیسہ (جو اس وقت ایک ہی صوبہ تھا) کے بے شمار علماء اس شرعی عدالت میں افتا وقضا کے منصب پر فائز رہے اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس کے ذیلی شعبوں میں کام کرتی رہی، اصلاً یہ سب لوگ برطانوی حکومت کے ہی ملازم تھے، یہ سلسلہ جاری تھا کہ ہندستان کو برطانوی اقتدار سے آزاد کرانے کی جزوی کوششیں پہلی بار ۱۸۵۷ء میں ایک خوں ریز جنگ کی صورت میں ظاہر ہوئی، برطانوی ظالم سامراجی طاقت نے ہندستانیوں کا بے دریغ خون بہایا اور اس تحریک کو کچل کر رکھ دیا اور ایسا کچلا کہ ۱۹۴۷ء تک ہندستانیوں میں انگریزی حکومت کے مقابلے میں تاب مقاومت بھی باقی نہیں رہی، آزادی کی اس کوشش میں ناکامی کا نقصان تو ہر ہندستانی کو ہوا؛ لیکن مسلمانوں کو اس کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑی، حالت جنگ میں جو مسلمان عوام وخواص مارے گئے اور ان کی املاک ضبط کی گئیں، وہ معاملہ تو الگ رہا، مسلمانوں کا سب سے بڑا نقصان جس کی تلافی آزاد ہندستان میں بھی آج تک نہ ہوسکی، وہ مسلمانوں کی شرعی عدالت کا خاتمہ ہے، انگریزی حکومت نے مسلمانوں سے سخت انتقام لیا اور افتا وقضا کے سارے شعبے یک لخت ختم کردیئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ سے ہندستان میں رہنے والی کسی قوم کو وہ نقصان نہیں پہنچا، جتنا قوم مسلم کو پہنچا۔

شرعی عدالت کے خاتمے سے مسلمانوں کو اپنے خاص مسائل میں بھی انگریزوں کی غیر اسلامی عدالتوں کا رخ کرنا پڑا، دوسری طرف مسلمانوں میں دینی تعلیم حاصل کرنے کا رجحان بھی جاتا رہا کیونکہ شرعی عدالتوں کی موجودگی میں علماء اور دینی تعلیم سے وابستہ لوگوں کو قضا وافتا کے شعبوں میں ملازمتیں حاصل ہوجاتی تھیں۔ یہ ایک ایسا پرآشوب عہد تھا کہ مسلمانوں کے علمی، دینی اور معاشی مسائل ایک طوفان کی طرح یک لخت اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

اس پر مزید یہ آفت نازل ہوئی کہ دنیا سے خلافت اسلامیہ کا خاتمہ ہوگیا، خلافت کا ختم ہونا عالم اسلام میں ایک قیامت تھی، سقوط خلافت میں حکومت برطانیہ پورے طور پر ملوث تھی، خلافت کے

خاتمے کا غیر منقسم ہندستان پر بہت گہرا اثر پڑا؛ کیوں کہ یہ ملک حکومت برطانیہ کے زیر اقتدار تھا۔
اس وقت کے حالات کی طرف مولانا نے جو اشارہ کیا ہے، وہ ملاحظہ کرلیں:
اور جب انگریز ۱۸۵۷ء کا غصہ اچھی طرح نکال چکے اور کسی قدر ان کے دل ٹھنڈے ہوئے تو تاج برطانیہ اور اس کے بااختیار نمائندوں کی طرف سے ہندستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی اشک شوئی کے لئے نہایت شاندار الفاظ کے ساتھ اعلانات ہونے لگے جس سے ان کو مطمئن کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے سے غافل کرنا مقصود تھا اور یہ کہ ہندستانیوں کو غافل رکھ کر شیر برطانیہ کے پنجۂ گرفت کو مضبوط کیا جائے، چنانچہ یہ مقصد بخوبی پورا ہوا اور حکومت برطانیہ پوری قوت کے ساتھ ہندستان پر مسلط ہوگئی، پھر کیا تھا جو بعض اسلامی ادارے مسلمانوں کے لئے خصوصیت سے باقی رکھے گئے تھے، وہ سب بھی ایک ایک کر کے اٹھا دیے گئے، نہ محکمۂ قضا رہا، نہ محکمۂ صدرالصدور، نہ اوقاف کا نظام باقی رکھا گیا، نہ ججوں کے ساتھ مفتی اسلام کا عہدہ، الغرض یہ چند اسلامی چیزیں جو حسب معاہدہ یا حسب وعدہ انگریزوں نے باقی رکھی تھیں، سب کی سب ایک جنبش قلم سے زائل ہوگئیں، اسی کے ساتھ جاگیروں اور زمینداریوں کی ضبطی کے بعد جو کچھ دولت بچی کھچی تھی، وہ بھی ختم ہوگئی، اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ہندی غیر مسلم اقوام اپنی جبلی عادت کے مطابق انگریزوں کی خوشامد کر کے برسر اقتدار ہوگئے اور وہ جو کل نظر بھی برابر نہیں کر سکتے تھے، مسلمانوں کے منہ آنے لگے، سر چڑھنے لگے، گویا جب سر سے پانی گذر گیا تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور سوچنے لگے کہ اب کیا تدبیر کی جائے، ان مفاسد کا کیوں کر سدباب ہو۔
چنانچہ اس وقت سے برابر زعمائے ملت اپنی عقل ودانش سے مختلف قسم کی تدبیریں کرتے رہے اور مسلمانوں کو ابھار کر حرکت عمل پیدا کرنے کے لیے بہت سے طریقے اختیار کئے۔(۱)

یہی وہ اسباب تھے جنھوں نے حضرت مولانا سجاد کی فکر کو خلافت کے نہج پر ہندستان میں امیر اور والی کے قیام کی طرف متوجہ کیا، ان کی کتاب ''حکومت الٰہی' ان کی اسی فکر کا نتیجہ ہے، بعنوان ''تحدیث نعمت'' اپنے مقالے میں ان ہی امور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الغرض مسلمانوں کی حکومت کیا زائل ہوئی کہ ان کا قومی شیرازہ بالکل بکھر گیا اور ایسی پراگندگی پھیلی کہ اجتماعیت ومرکزیت کی کوئی صورت باقی نہیں رہی پھر اس انتشار اور پراگندگی کے جو نتائج تھے وہ ظاہر ہوئے...... یعنی جو قوم پراگندہ اور منتشر رہتی ہے، جن کا کوئی سردار نہ ہو وہ ہرگز فوز وفلاح نہیں پا سکتی، پس اس انتشار اور پراگندگی کی وجہ سے جو

کچھ بھی برائیاں پیدا ہوں اور جس قدر تباہی و بربادی ہو، یا ذلت و رسوائی ہو، قومی و مذہبی کاموں میں رخنے پڑ جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے؛ اسی لیے دین اسلام نے (جس کی تعلیمات دنیا و آخرت کی بھلائی کی کفیل ہیں) اجتماع قومی و مذہبی نظام کے قیام و بقا کے لئے بہت زیادہ تاکید کی ہے، منتشرانہ و پراگندگی کی زندگی گذارنے کو اس نے غیر اسلامی زندگی قرار دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ مسلمان جہاں اور جس جگہ بھی رہیں اجتماعی زندگی بسر کریں، تا آنکہ اگر سفر میں بھی مسلمان ساتھ ہوں تو ایک شخص کو اپنا امیر بنالیں اور اس کی امارت کے ماتحت سفر کریں، یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے ان اسلامی ملکوں کے لیے جہاں کفار مسلط ہو جائیں، بلحاظ نصوص و احکام جماعت و اجتماع، یہ حکم دیا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خود اپنے لیے مسلمان والی منتخب کر کے ولایت شرعیہ قائم کریں؛ بلکہ علمائے ہند میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ العزیز پہلے بزرگ ہیں، جنہوں نے ہندستان میں انگریزوں کے قدم آتے ہی یہ فتوی دے دیا تھا کہ مسلمان اپنا والی منتخب کر کے اس کی ولایت کے ماتحت اپنے جماعتی و اجتماعی کاموں کو انجام دیں، حالانکہ ان کے زمانہ تک انگریزوں کا پورا تسلط ہندستان میں نہیں ہوا تھا؛ لیکن قرائن بتا رہے تھے کہ یہ قوم مسلط ہو کر رہے گی''۔(۲)

''حکومت الٰہی'' مولانا سجاد صاحب کا ایک مختصر رسالہ ہے؛ لیکن وہ ان کی گہری دینی بصیرت اور ان کے فکر عالی کا ایک شاہکار ہے۔ اصلاً یہ کتابچہ مسلم حکمرانوں کے لیے فائدہ مند ہے، جو یہود و نصاریٰ کے وضع کئے ہوئے ملکی قوانین کو ملک و قوم کے حق میں مفید سمجھتے ہیں۔ مولانا نے اس میں ناقابل تردید دلائل سے یہ بات ثابت کی ہے کہ انسانیت کی فلاح کا ذریعہ صرف حکومت الٰہی ہے اور نظامہائے حکمرانی میں فلاح انسانیت اور عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کرنے کے لیے اگر کوئی نظام حکمرانی مفید ہو سکتی ہے تو وہ صرف اللہ تعالی کا بنایا ہوا نظام ہے۔ اس بحث میں انہوں نے جمہوری نظام سلطنت کی خرابیاں جس بالغ نظری اور تعمق فکر سے واضح فرمائی ہے، وہ مولانا ہی کا حق ہے۔

مولانا نے حکومت الٰہی کی اثر انگیزی اور اس کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ نظام خداوندی محدود سطح پر مسلمانوں کی اجتماعیت اور اور سواد اعظم کی شیرازہ بندی کی صورت میں روبعمل ہو سکتی ہے، اگر مسلمان چاہیں، بالخصوص اس ملک کے مسلمان جہاں غیر مسلم حکومت، اقتدار پر قابض ہو چکی ہو۔

اجتماعیت جس کو ہم ملی وحدت بھی کہہ سکتے ہیں ایک بہت بڑی طاقت ہے، اگر مسلمانوں کو غیر مسلم حکومت میں سزا و جزا کے قوانین نافذ کرنے کی طاقت نہ ہو، دیوانی اور فوجداری کے معاملات میں فیصلہ کرنے قوت نہ ہو تو بھی اگر ان کی اجتماعی قوت مضبوط ہو، حمیت دین میں تصلُّب ہو اور وہ اللہ و رسول کے فیصلے کے مطابق زندگی کے تمام خوش گوار و نا خوش گوار معاملات طے کرنے پر آمادہ ہوں تو ان کو کسی غیر مسلم عدالت سے رجوع کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔

مولانا کے ذہن میں اسلامی حکومت اور قوانین اسلامی کے نفاذ کے لیے جہاد کا منشور نہیں تھا اور کبھی انہوں نے انگریزوں سے جہاد کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا، مولانا کی حکمت بالغہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ موقع اس ملک میں جہاد بالسیف کے لیے سرے سے نامساعد ہے اور جو کام جہاد سے ہوسکتا ہے، وہ بغیر کسی جدال کے حاصل ہوجائے تو ایسر الامرین پر عمل ہوگا، جن لوگوں نے بعد میں قوم کو جہاد بالسیف کا نعرہ دیا اور اس کو اپنی تنظیم کا منشور بنایا، وہ ان کے خود ساختہ منشور کی زینت ہی بنا رہا، کبھی روبعمل نہ ہوا۔ حضرت مولانا سجاد کی تحریک جذباتی تحریک نہ تھی اور نہ مولانا ان جذباتی داعیوں میں تھے، جو عواقب و نتائج سے بے پروا ہو کر میدان عمل میں اتر پڑتے ہیں اور ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔

مولانا نے اس تحریک کا آغاز بڑی حکمت و بصیرت کے ساتھ کیا، تحریک امارت کی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ علماء متحد اور متفق ہوں، اس مقصد کے لیے مولانا نے جمعیۃ العلماء کے قیام کی کوششیں شروع کیں، امیر شریعت ثانی حضرت مولانا سید شاہ محمد محی الدین قادری زیب سجادہ مجیبیہ قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

”جمعیۃ علمائے ہند کے قیام کے لیے ہندستان کے اکثر صوبوں میں سفر کر کے علماء میں اس کی تبلیغ کی اور لوگوں کو آمادہ کیا؛ لیکن عمل کی طرف پہلا قدم مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، چنانچہ پہلا اجلاس ہندستان میں جمعیۃ کا بنام انجمن بہار، بہار شریف میں بہ زمانہ عرس حضرت مخدوم الملک منعقد ہوا، اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی اور اس کے بعد مختلف صوبوں میں شاخیں قائم ہوئیں اور پھر علماء نے مستعد ہو کر کام شروع کیا“۔(۳)

جمعیۃ العلماء کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سجاد خود فرماتے ہیں:

”اللہ کی رحمت کو جوش آیا اور اس نے مسلمانان ہند؛ بلکہ مسلمانان عالم کی بھلائی کے لیے کچھ ایسے اسباب پیدا کر دیے، جن کی وجہ سے علمائے کرام نے اجتماعی زندگی کے

میدانوں میں قدم بڑھایا، بنگال میں عیسائی مشنریوں کے حملہ میں علمائے بنگال کو متنبہ کیا کہ وہ جمعیت علمائے بنگالہ قائم کریں اور پھر اس کے بعد اندرون ہند و بیرون ہند کے محاربۂ عظیمہ کو دیکھتے ہوئے علمائے بہار کو تنبہ ہوا، لہٰذا انہوں نے ۱۳۳۵ھ میں انتظامی زندگی کے تمام مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جمعیۃ علمائے بہار قائم کی، آخر جب دنیائے اسلام میں انتہائی درد انگیز واقعات رونما ہوئے تو اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں مرکزی جمعیت، جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی اور ۱۹۲۰ء میں اس کا دستور العمل مرتب ہوا اور مستعدی کے ساتھ کام شروع ہوا''۔(۴)

مولانا سجاد کے تذکرہ نگاروں نے یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ مولانا نے اسی زمانے میں مجلس علماء کے زیر سرپرستی ایک دار القضا بھی ہر شہر میں قائم کیا تھا، ایک دار القضاء پھلواری شریف خانقاہ میں قائم ہوا، جس کے قاضی مولانا شاہ نور الحسن صاحب پھلواروی مقرر ہوئے (اور امارت قائم ہونے کے بعد تاحیات اس کے منصب قضا پر فائز رہے)، یہ امارت شرعیہ کے قیام سے پہلے کی بات ہے؛ یعنی قیام امارت سے پہلے قضا کا شعبہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی، امارت شرعیہ کے قیام کے بعد وہ دار القضا امارت کے زیر اہتمام آ گیا، جبکہ دوسرے شہروں میں قضا کے شعبے باقی نہ رہے۔

حضرت مولانا سجاد صاحب رحمہ اللہ کے ذہن میں پورے ہندستان کی سطح پر امارت شرعی قائم کرنے کا خیال تھا اور اس پر ان کی طویل اور مدلل تحریریں ہیں، جیسا کہ ہم نے ان کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کیا ہے، ہندستان میں امارت و ولایت شرعیہ کے قیام اور امیر و والی کے انتخاب کے مسئلے میں مولانا نے ملک کے ممتاز علما سے تبادلۂ خیالات کیا بالخصوص علامہ ابوالکلام آزاد سے انہوں نے بھی اس سے اتفاق کیا۔

مولانا ابوالمحاسن سجاد نے علمائے ہند کو قیام امارت شرعیہ فی الہند کی رائے سے متفق کر لیا اور اسی مقصد کے لیے علمائے ہند کی جمعیت قائم کی اور جمعیۃ علمائے ہند کو اس کا ذمہ دار بنایا کہ وہ امارت شرعیہ فی الہند قائم کرنے کی کوشش کرے اور انتخاب امیر شریعت کی ذمہ داری بھی جمعیۃ العلماء کے ذمہ کی گئی (چنانچہ انتخاب رابع تک، جمعیۃ العلماء امیر شریعت کا انتخاب کرتی رہی)، علماء کے استصواب رائے سے خود اس کا ایک خاکہ بنایا، انتخاب کی شرائط متعین کیں، امور شرعی کے امیر کی ذمہ داریاں بتائیں، یہ بھی وضاحت فرمائی کہ امیر کے اختیارات کیا ہوں گے، شرعی اعتبار سے اطاعت امیر کا پیمانہ کیا ہوگا، اس سلسلے میں لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو رہے تھے، اپنی تحریر سے ان شبہات کو دور کیا، مولانا کی یہ باتیں ان کی مختلف تحریروں میں موجود

ہیں، تمام تحریروں کا یہاں پر نقل کرنا مشکل ہے، ان کے طویل خطبہ صدارت کی حسب ذیل عبارت سے بہت سی باتیں واضح ہوجائیں گی، جو انہوں نے جمعیۃ علماء ہند کے ایک بڑے اجلاس میں بحیثیت صدر پڑھا تھا:

حضرات ؛اگر چہ نظام اسلام کی پوری تشریح اس وقت ہمارے امکان سے باہر ہے؛مگر مختصر لفظوں میں یہ عرض کرتا ہوں کہ جلد از جلد جس طرح ممکن ہو،اس طرح پر نظام اسلام کو تمام ہندستان میں جاری کر دیجیے کہ:

(۱) شخص واحد پر بالاتفاق یا بکثرت آراء اتفاق کیجیے، جو ذی علم بھی ہو اور مدبر بھی اور صمیم قلب وصدق دل سے اس کے ہاتھ پر بیعت طاعت فی المعروف فرمایئے اور اس کے ہاتھ میں کتاب وسنت دیجیئے اور اس کے اعوجاج کی تقویم کے لئے اپنے بازو مضبوط رکھیئے اور کتاب وسنت کی مخالفت پر فلا سمع ولا طاعۃ کو پیش نظر رکھیے۔(ص ۵)

(۲) ہر ہر صوبہ اور ہر ہر ضلع میں ولاۃ مقرر کیجیے۔

(۳) ہر ہر شہر اور ہر ہر گاؤں کے محلے وقبائل میں نقباء وعرفاء مقرر کیجیے۔

(۴) ہر ایک کے فرائض کتاب وسنت اور آثار ائمہ کرام وفقہائے عظام کو پیش نظر رکھ کر بنادیجیے۔

(۵) امارت ہی کے ماتحت بیت المال قائم کیجیے اور دیگر اقتصادیات و وضروریات کے محاکم کو رائج کیجیے۔

بغیر اس اسلوب کے اختیار کیئے ہوئے آپ یقین فرمایئے کہ آپ تنظیم کے مقاصد میں کامیاب نہ ہوں گے،مثلاً فرض کیجیے کہ آپ یہ تو چاہتے ہیں کہ بیت المال ہو تمام زکوۃ و عشر انفرادی طور پر صرف نہ ہو؛ بلکہ بیت المال کے ذریعہ جمع ہو کر **تؤخذ من أغنيائهم و ترد على فقرائهم** پر عمل درآمد کیا جائے ؛مگر میں دریافت کرتا چاہتا ہوں کہ بغیر والی وامیر بنائے ہوئے، جو اولوالامر کا ایک مصداق ہے، کسی شخص کو اغنیا سے مطالبہ کا شرعاً حق حاصل ہے اور کون شخص، یا مجلس ہے، جو اغنیا سے یہ کہہ سکے کہ تم کو شرعاً اپنی زکوۃ ہمارے عمال کے سپرد کرنی پڑے گی، اگر تم انحراف کروگے تو کم از کم گنہگار رہوگے۔

مطالبہ کا حق شرعاً ہونا اور چیز ہے اور ترغیب علی الخیر اور چیز ہے، موجودہ حالات میں اہل مدارس، یا مجالس جو زکوۃ وصول کرتے ہیں تو وہ مطالبہ حق نہیں ہے؛ بلکہ ترغیب علی الخیر

کی صورت ہے ....آخر میں اس بحث کوختم کرتے ہوئے صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لئے جس چیز کی آج ضرورت ہے اور حصول سوراج کے بعد بھی ضرورت ہوگی؛ بلکہ ہندستان کے آزادی کی منزل کوقریب کرنے کے لیے جو چیز سب سے زائد مفید ہوگی، یہی نظام اسلام یعنی امارت شرعیہ ہے۔(۵)

لیکن امارت شرعیہ فی الہند قائم نہ ہوسکی، اس کے بعض وجوہ کا مولانا نے خطبۂ صدارت میں ذکر کیا ہے تو یہ فیصلہ لیا گیا کہ اس کے لئے حالات کی سازگاری کا انتظار کرنے کے بجائے صوبہ وار امارت قائم کی جائے، یہ بھی امر حیرت ہے کہ مولانا سجاد صاحب کی حیات میں بھی نہ امارت شرعیہ فی الہند قائم ہوسکی اور نہ صوبۂ بہار کے علاوہ کسی دوسرے صوبے میں امارت شرعیہ کا قیام ممکن ہوسکا، اس پر ہم اپنا تجزیہ آگے پیش کریں گے۔ان سب مسائل کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

حضرات؛جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ جمعیت اپنی ابتدائے وجود سے ہندستان کی اجتماعی زندگی کے اصولوں کی ترویج اور اس کے قیام کے لئے اہم مقاصد کو پیش نظر رکھتی ہے، ادھر ہیجان کے زمانہ میں جب کہ صرف آزادی ہند اور ممالک اسلامیہ کی اعانت اور خلافت کے لئے تحریک ترک موالات کا دور دورہ ہے اور جس وقت سب سے زیادہ تخریبی لائحۂ عمل پر تمام قوتیں صرف ہورہی ہیں جمعیت بھی اسی ہیجان میں طلاطم کرنے کے لیے سرگرم کار ہے اور وہ ٹھیک اسی وقت مسلمانان ہند کی تنظیم کا خیال کرتی ہے تو مجھے جمعیت کے ارباب حل وعقد اور اس کے کارکنان کی فراست کی بے حد تعریف کرنی پڑتی ہے۔ **جزاھم اللّٰــہ أحســن الجزاء**. چنانچہ انہوں نے اجلاس جمعیت ۱۹۲۱ء امارت شرعیہ فی الہند کی تجویز منظور کی، جو زیر صدارت حضرت علامہ ابوالکلام صاحب آزاد منعقد ہوا تھا، اور اسی اجلاس میں امیر شریعت کے اصول کو منضبط کرنے اور بعض امور کی تشریحات کے لئے ایک مجلس بنائی گئی اور اسی اجلاس میں یہ بھی طے پایا کہ ایک ماہ بعد فوراً ایک دوسرا خصوصی اجلاس اس مسودہ کی منظوری اور انتخاب امیر الہند کے لئے منعقد کیا جائے؛ مگر جس ہفتہ اجلاس خصوصی تھا وہی وقت حکومت کے جبر واستبداد کے کامل مظاہرے اور قوم کے دلیرانہ مقابلہ کا تھا اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور دوسرے علماء وغیرہ بھی گرفتار ہوئے، اور شاید دشمنان اسلام کی طرف سے جابجا مختلف عنوانوں سے یہ مشہور کیا گیا کہ اجلاس ملتوی

ہوگیا، بات بھی لگتی ہوئی تھی؛ کیوں کہ خاص خاص مراکز میں گرفتاریاں عام تھیں، جن اراکین کے کانوں تک التوا کی غلط آواز پہنچی انہوں نے قرائن پر قیاس کرکے صحیح سمجھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتنے ارکان نہ پہنچ سکے، جن کی موجودگی میں اجلاس منعقد ہوسکتا؛ مگر پھر بھی بعض حضرات علمائے اکابر و بعض ارکان زعمائے ہند پہنچ گئے، مثلاً: مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب، مولوی احمد صاحب سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ وغیرہ۔ آخر ان حضرات کا باہمی مشورہ ہوا اور مجلس نے جو ترتیب مشورہ کے لیے مرتب ہوئی تھی مسودہ مرتب کیا۔

بعدہ کچھ ایسے واقعات وحوادث پیش آئے کہ مسودہ پر مجلس منتظمہ کو غور کرنے کا موقع نہیں ملا، اس بنا پر جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس اجمیر میں یہ غور کیا گیا کہ امارت شرعیہ ہند کے قیام میں چونکہ بہ ہمہ وجوہ متعددہ تعویق ہے اس لئے جب تک صوبہ وار امارت شرعیہ قائم کی جائے اور اس لیے جمعیۃ علمائے ہند نے صوبہ وار جمعیتوں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تجویز کے ذریعہ ان کو ہدایت دی کہ جلد از جلد صوبہ وار امارت شرعیہ قائم کریں؛ مگر اکثر صوبوں کے ناظمین اس دور میں اپنے صوبہ کے کاموں کے ذمہ دار تھے؛ اس لیے غالباً اس تجویز پر عمل نہ کرسکے۔(۶)

چند سطروں کے بعد جمعیۃ علمائے ہند کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یہ ہیں جمعیۃ علمائے ہند کی مساعی جمیلہ جو اس نے ہندستان کے اندر سب سے پہلے اجتماعی زندگی کے اصول کے قیام اور اجرائے نظام کے لیے آج تک انجام دی ہیں؛ لیکن افسوس کہ حالات نے مساعدت نہ کی اور عملی شکل اس نے اختیار نہیں کی۔(۷)

قیام امارت شرعیہ ہند کے روبہ عمل نہ ہونے کا ایک اور سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

شاید اس تعویق اور تاخیر میں یہ مصلحت ہو کہ اس وقت ہندستان کے بہت سے ارباب حل وعقد، علماء وغیرہ قید خانوں میں محبوس تھے؛ اس لیے امارت کے قیام واستحکام کے لیے ان اصحاب کے باہر آجانے کی ضرورت تھی؛ تاکہ تمام یا اکثر ارباب حل وعقد علماء وغیر علماء غور وفکر کے بعد ایک مضبوط بنیاد پر اس کو قائم کریں۔(۸)

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن کی تحریک نے علمائے ہند کو بیدار کردیا، امارت شرعیہ ہند کے قیام کی مشروعیت میں علماء کو کوئی شک وشبہہ نہ رہا، یہ تجویز اگرچہ ہندستان کے علمائے حق کے ذہنوں میں تھی، مثلاً حضرت اقدس امیر شریعت اول مولانا سید شاہ محمد

بدرالدین قادری قدس سرہ کو اس مسئلے پر مکمل انشراح تھا، جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے؛ لیکن حضرت مولانا سجاد نے قیام امارت کی تحریک ایسے ہمت اور جذبۂ اخلاص کے ساتھ اٹھائی کہ پورے ہندستان میں اس کی گونج سنائی دینے لگی؛ بلکہ ہندستان کی فضا اس آوازہ سے پر شور ہو گئی۔

حضرت مولانا سجاد خود بہار کے تھے؛ اس لیے انہوں نے صوبہ وار قیام امارت شرعیہ کی تجویز کے مطابق صوبۂ بہار میں کام شروع کیا اور دفتر جمعیۃ علمائے بہار گیا سے علماء و مشائخ بہار کے نام ایک دعوتی مکتوب روانہ کیا، وہ مکتوب، العدل پریس بانکی پور مراد پور پٹنہ کا چھپا ہوا میرے سامنے ہے، اس پر ۶؍شوال ۱۳۳۹ھ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ امارت شرعیہ سے جو''مکاتیب سجاد'' شائع کیا گیا ہے، اس میں بھی یہ موجود ہے؛ لیکن اس پر تاریخ اور مقام نہیں لکھا گیا ہے، میں نے امارت شرعیہ سے شائع شدہ مکتوب کی بجائے، ۶؍شوال ۱۳۳۹ھ کے چھپے ہوئے اصل مکتوب کو اس لیے سامنے رکھا ہے کہ امارت شرعیہ کے شائع شدہ مکتوب میں بعض ضروری باتیں غائب ہیں، اس مکتوب میں بحیثیت ناظم جمعیۃ علماء بہار، مولانا نے بہار کے علماء کے سامنے قیام امارت کے مسئلے کو پیش کیا ہے، آٹھ صفحات کے اس مکتوب کو مکمل شامل مقالہ کرنا ذرا مشکل ہے، ہم اس کے اقتباس حسب موقع پیش کریں گے۔

یہ مکتوب اصلاً انتخاب امیر کے لیے ۱۹؍شوال ۱۳۳۹ھ کو منعقد ہونے والے اجلاس کا دعوت نامہ ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> جناب کو جمعیۃ علماء بہار کے غیر معمولی اجلاس کی شرکت کی دعوت نہایت خلوص کے ساتھ دے رہا ہوں اور جس مقصد کی غرض سے خاص اجلاس قرار پایا ہے، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کے متعلق مختصراً شرعی حیثیت سے اپنے خیالات ظاہر کر دوں؛ تا کہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے اور اس مسئلہ کے متعلق جس قدر شکوک واوہام ہیں، زائل ہو جائیں۔
>
> ''جناب اس مسئلہ کی ضرورت واہمیت سے یقیناً باخبر ہوں گے کہ جب مسلمانوں کے بلاد پر کافروں کا استیلاء اور غلبہ ہو جائے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے نظام شرعی کے قیام و بقا کے لیے مسلم والی (امیر محکمۂ شرعیہ) منتخب کر لیں۔''

پھر یہ ذکر کرتے ہیں کہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے ہم اجتماعی زندگی کا نظام قائم کرنے سے غافل ہیں اور اس کے نتیجے میں ملت جس خسران سے گذر رہی ہے، وہ سامنے ہے۔ اس کے بعد اس مکتوب کا ایک فکر انگیز حصہ ملاحظہ کریں:

’’اس اہم فریضہ کی ادائیگی میں ہم سے آج تک جو کوتاہی ہوئی، اس سے بری الذمہ ہونے کے لیے عنداللہ کوئی عذر معقول نہیں ہے، آپس کی جنگ وجدال، فروعی اختلافات کا ہونا اور حضرت امام ابوحنیفہ، امام بخاری، یا حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہم کے امثال و نظائر کا فقدان، عذر غیر مقبول ہے اور مسقط وجوب نہیں، کما لایخفی؛ کیوں کہ اول الذکر شئی اختیاری اور خود ساختہ ہے اور ثانی الذکر کے غیر معتبر ہونے کے لیے نظیر سلف موجود کہ امامت عظمی کے شرائط میں بھی حسب ضرورت تنزل اختیار کیا گیا؛ مگر یہ صورت اختیار نہیں کی گئی کہ بصورت فقدان جامع الشرائط اصل وجوب انعقاد امامت ساقط ہے، پس جبکہ آج ہم لوگوں کو تنبہ ہو گیا ہے اور توفیق جل شانہ نے بھی مساعدت کی ہے تو اب فریضہ کی ادائیگی میں ادنی تساہل بھی بدترین جرم ہے، بالخصوص بہ نظر حالات موجودہ اور حوادث لاحقہ جو غالباً بہت جلد پیدا ہوں گے، اب اس کا موقع بھی نہیں کہ کچھ اور تاخیر کی جائے؛ بلکہ ہم پر واجب ہے کہ اس اہم امر کو فوراً انجام دیتے ہوئے اس تیزی سے قدم اٹھائیں کہ برسوں کی مسافت مہینوں میں اور مہینوں کی دنوں میں اور دنوں کی لمحوں میں طے پائے، ورنہ یاد رکھئے کہ اگر خدانخواستہ آج بھی ہماری جماعت کے تنافس وتفاخر کا پہاڑ، فروعی اختلافات کا خلیج اس راہ میں حائل ہوا تو سرزمین ہند میں جو آج ہماری حالت ہو رہی ہے، اس سے بھی بدتر ہو جائیگی اور ہمارے علماء ومشائخ کی یہ محترم جماعت اپنے طرز عمل سے تمام دنیا پر ثابت کر دے گی کہ ان میں کام کرنے کی صلاحیت نہیں اور پھر اس جماعت کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ اصلاح امت ووراثت انبیاء کے دعووں سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جائے اور جرأت کر کے نہایت صفائی کے ساتھ اعلان عام کر دے کہ ہم میں امت کی رہبری کی صلاحیت نہیں، امت مسلمہ اپنا رہنما کسی اور کو تلاش کرے‘‘۔

امارت شرعیہ کا قیام اور اس کے لیے ایک امیر شریعت کا انتخاب جس کے ہاتھ پر لوگ بیعت طاعت کریں، عوامی سطح پر ایک نئی چیز تھی اور بعض علماء ومشائخ کی نظر میں بھی اس کی مشروعیت مشکوک تھی، امیر شریعت کے اختیارات کے بارے میں بہت سے علماء ومشائخ متردد تھے کہ اس کی حیثیت کیا ہوگی اور اس کے اختیارات کیا ہوں گے اور اس کی بیعت کی کیا نوعیت ہوگی، اہل علم کو اس مسئلے پر انشراح نہیں تھا۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے اس مکتوب میں اسکو بھی واضح کیا ہے:

''جو چیز ہمارے محترم علماء ومشائخ کو اس امر کی طرف اقدام کرنے سے روکتی ہے اور باوجود اقرار وجوب وتحقیق، ضرورت اس امر کے انجام دینے میں سخت متردد ومتفکر بنادیتی ہے اور مشکلات کا پہاڑ ان کے سامنے کھڑا کردیتی ہے، وہ صرف ایک غلط تخیل ہے کہ امیر شریعت کے اختیارات غیر محدود ہوں گے، اتباع واطاعت کی کوئی حد نہ ہوگی، امیر مطلق العنان ہوگا اور اس لیے امیر جس خیال ومشرب کا ہوگا اسی کے مطابق احکامات نافذ کرے گا، جس کی اتباع لوگوں پر شرعاً واجب ہوگی، ورنہ بصورت عدم اتباع نقض بیعت ہوگی، جو بدترین معصیت ہے اور اگر اپنی تحقیق کے خلاف اس صورت میں اتباع کی جائے تو تدین کے خلاف، یہی خطرات ہیں جو اس باب میں اکثر حضرات کے دلوں میں گذرتے ہیں۔''

ظاہر ہے کہ اگر امیر شریعت کے یہی اختیارات ہوں گے تو قیام امارت کے باوجود اس کا استحکام نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ صوبے میں مختلف الخیال اور مختلف مسالک کے ماننے والے رہتے ہیں، کون چاہے گا کہ امیر کے حکم پر وہ اپنا مسلک ومشرب چھوڑ دے؛ اس لیے ضروری تھا کہ ان شبہات کی وضاحت کردی جائے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ امیر کے اختیارات محدود ہوں گے اور اس کے ذیل میں انہوں نے اختیارات امیر شریعت کو ۶ نمبرات کے تحت میں بیان کیا ہے:

(۱) وہ (امیر) مسائل متفقہ منصوصہ کو نافذ کرے گا۔

(۲) مقاصد و وسائل اعلاء کلمۃ اللہ پر ہمیشہ نگاہ رکھے گا اور ان کے متعلق خصوصیت کے ساتھ احکامات نافذ کرے گا۔

(۳) وہ ایسے احکامات نافذ کرے گا جس سے بلا امتیاز فِرَق تمام امت مسلمہ کی فلاح و بہبود متصور ہو۔

(۴) فروعی اور مختلف فیہ مسائل کے اجرا وتنفیذ کو اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا کہ جن کی اجتماعی زندگی میں کوئی احتیاج نہیں۔

(۵) مختلف فیہ مسائل کے بحث وتحقیق کو نہیں روکے گا؛ لیکن جنگ وجدال اور فساد کو رفع کرنے کی کوشش کرے گا۔

(۶) اس کا ہر عمل اور ہر خیال تمام فرق اسلامیہ کے لیے واجب الاتباع نہیں ہوگا، جس عالم کی تحقیق امیر کی تحقیق کے خلاف ہو اور اس بنا پر اس مسئلہ خاص میں امیر کی اتباع نہ کرے تو کوئی حرج نہیں، وہ عالم ہرگز مستحق طعن نہیں اور نہ اس کی بیعت ٹوٹ سکتی

ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ؟ کتنے مسائل ہیں، جن میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے خلاف تھے۔ کتنے جزئیات ہیں، جن میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما کے موافق نہ تھے تو کیا آج تک کسی نے اس کو نقض بیعت سمجھا، یا ان پر طعن کیا گیا اور کیا اس فروعی مخالفت کی وجہ سے ان حضرات نے دوسرے اجتماعی احکامات میں امیر کی اتباع وانقیاد سے روگردانی کی؟ ہرگز نہیں۔

مولانا نے اس مکتوب دعوت میں ۲۴ شعبان/۱۳۳۹ھ میں دربھنگہ میں منعقد ہونے والے جمعیۃ علماء بہار کے سالانہ اجلاس کی تجاویز بتائی ہیں کہ اس میں علماء کے اتفاق سے انتخاب امیر کے لیے کیا تجویز منظور کی گئی؟

دفتر امارت شرعیہ سے شائع شدہ ''مکاتیب سجاد'' میں دربھنگہ کے اجلاس جمعیت کا ذکر اور اس کی تجاویز سرے سے، مذکور نہیں، ہم ذیل میں دعوت نامہ کے اس حصے کو نقل کرتے ہیں:

''جمعیت یہ تجویز کرتی ہے کہ صوبہ بہار واڑیسہ کے محکمہ شرعیہ کے انتظام کے لیے ایک عالم مقتدر امیر کیا جائے جس کے ہاتھ میں تمام محکمہ شرعیہ کی باگ ہو اور اس کا ہر حکم مطابق شریعت مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہو، نیز تمام علماء ومشائخ اس کے ہاتھ پر خدمت وحفاظت اسلام کے لیے بیعت کریں (یہ بیعت سمع وطاعت کی ہوگی جو بیعت سلسلہ طریقت سے علیحدہ ایک ضروری واہم چیز ہے) اور اس امیر کے تحت ہر ضلع میں ایک ایک نائب ہو؛ تاکہ صوبہ کے تمام مسلمان اسلامی زندگی بسر کرسکیں اور انتظام محکمہ شرعیہ مکمل ہو۔

یہ جمعیت متفقہ طور پر تجویز کرتی ہے کہ انتخاب امیر محکمہ شرعیہ کے لیے ایک خاص اجلاس جمعیۃ علماء بہار بہ مقام پٹنہ وسط شوال میں منعقد کیا جائے۔

اور اسی لیے بتاریخ ۱۸/ ۱۹/ شوال المکرّم ۱۳۳۹ھ روز شنبہ و یک شنبہ مطابق ۲۶/۲۵/ جون ۱۹۲۱ء بہ مقام بانکی پور حسب مشورہ ارکان جمعیۃ علماء بہار کا ایک غیر معمولی اجلاس ہونا قرار پایا ہے، جناب سے خصوصیت کے ساتھ گذارش ہے کہ وقت کی نزاکت اور ضرورت کی اہمیت کا خیال فرما کر ضرور بالضرور اجلاس میں شرکت کی تکلیف گوارا فرمائیں اور دیگر علماء ومشائخ کو بھی ترغیب دیں''۔

اس مکتوب دعوت میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ سب سے پہلے امیر الہند کا انتخاب ہونا چاہیے تھا؛ لیکن جب لوگ اس کام کے لیے ابھی تیار نہیں ہیں تو بجائے اصل مرکز بننے کا انتظار

کرنے کے ہر صوبہ میں امیر منتخب کیا جائے، جس طرح جمعیت علمائے ہند بعد میں قائم ہوئی اسی طرح امیر الہند بھی آخر میں آسانی سے منتخب ہو جائے گا؛ لیکن ایسا نہیں ہوسکا، مولانا نے بہار کی سطح پر اس کام کے لیے راہ ہموار کر لی۔

گذشتہ سطور میں مولانا سجاد علیہ الرحمۃ نے امیر کے اختیارات بیان فرمائے تھے، آگے چل کر وہ علماء ومشائخ کے سامنے امیر شریعت کے شرائط بتاتے ہیں؛ یعنی جس کو امیر شریعت منتخب کیا جائے، اس کے اندر کیا کیا شرائط ہونی چاہئیں، چنانچہ پانچ شرائط متعین کی گئیں کہ جو امیر منتخب ہوگا، اس کے اندر یہ پانچ صفات پائی جانی ضروری ہیں، وہ پانچ شرائط حسب ذیل ہیں:

(۱) عالم باعمل صاحب فتوی جس کا علمی حیثیت سے زمرۂ علماء میں ایک حد تک وقار واثر ہو؛ تاکہ علمائے کرام اس کے اقتدار کو تسلیم کریں اور صاحب بصیرت ہو تاکہ نہایت تدبیر کے ساتھ احکامات نافذ کرے۔

(۲) مشائخ طریقت میں بھی صاحب وجاہت ہو اور اس کے حیطۂ اثر میں اپنے صوبہ کے مسلمانوں کی معتد بہ جماعت ہو؛ تاکہ عوام وخواص اس کے اثر سے متاثر ہوں اور تنظیم شرعی و اجتماعی قوت جلد سے جلد پیدا ہوسکے۔

(۳) حق گوئی وحق بینی میں نہایت بے باک ہو اور کسی مادی طاقت سے متاثر ومرعوب ہونے کا بظاہر اندیشہ نہ ہو۔ (ص۹)

(۴) مسائل حاضرہ میں بھی ایک حد تک صاحب بصیرت ہو اور تدبیر کے ساتھ کام کر رہا ہو؛ تاکہ ہمارا کام بہ حسن تدبیر تیزی کے ساتھ آگے بڑھے۔

(۵) لاپروائی اور خودرائی کے مرض سے پاک ہو۔

امیر کے لیے یہ شرائط اجلاس جمعیت میں اتفاق رائے سے متعین ہوئے تھے اور مولانا کا خیال تھا کہ امیر شریعت کے لیے یہ معیار احکام شریعت کے لحاظ سے اس دور میں بہت کافی ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ مولانا کو اس بات کا بھی اعتراف تھا کہ صوبہ بہار میں اس معیار کے ایک ہی دو آدمی مل سکتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت مولانا سجاد کے اس معیار شرائط پر ایک ہی دو آدمی مل سکتے ہیں اور صوبہ بہار میں انہوں نے اور ارباب حل وعقد نے جس پر اتفاق کیا، اس سے مولانا کی مردم شناسی بھی ظاہر ہوتی ہے اور ارباب حل وعقد کی اصابت رائے بھی معلوم ہوتی ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:

''اب رہا اصول انتخاب تو ظاہر کہ یہ کام شرعاً ارباب حل وعقد کا ہے، جس کے مصداق علمائے کرام وذی علم مشائخ ہیں اور یہ حق شرعاً انہی کو حاصل ہے، اس کے بعد عوام کا فرض انقیاد واتباع ہے''۔

اس دعوت نامہ میں مولانا نے طریقۂ انتخاب کے متعلق یہ واضح فرمایا ہے کہ جس کسی صوبے میں امیر کا انتخاب ہو وہاں کے ہر عالم وشیخ طریقت کا وقت انتخاب موجود رہنا بھی ضروری نہیں ہے اور اس کی دلیل انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے طریقہ انتخاب سے دی ہے کہ بغیر تمام ارباب حل وعقد کی موجودگی کے ان کا انتخاب عمل میں آیا اور اس کی صحت پر اجماع ہوا؛ بلکہ تمام اہل مدینہ وبلاد اسلامیہ میں انتخاب کئے جانے کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا۔ مولانا نے یہ بھی واضح فرمایا کہ جمعیۃ کے اعلان عام اور دعوت خاص کے بعد جس قدر بھی علماء ومشائخ تاریخ مقررہ پر مجتمع ہوکر انتخاب فرمالیں، شرعاً وہ بالکل درست ہوگا، امیر کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟ اس بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ چند منتخب علماء کی ایک مجلس شوریٰ ہوگی، جن سے مشاورت کے بعد امیر فیصلہ کرے گا، احکامات جاری ونافذ کرے گا، جس کی نظیریں قرون اولیٰ کے اندر موجود ہیں۔

مولانا محمد سجاد رحمہ اللہ کی اس دعوت کے مطابق صوبہ بہار کے مرکزی شہر پٹنہ میں جو اس وقت عرف عام میں بانکی پور کہا جاتا تھا انتخاب امیر شریعت کے لیے ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ مولانا حکیم سید محمد شعیب رحمہ اللہ ''مسئلۂ امارت شرعیہ میں لکھتے ہیں:

۱۹ر شوال ۱۳۳۹ھ میں بانکی پور محلّہ پتھر کی مسجد میں بہ غرض انتخاب امیر الشریعۃ علماء کا عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا اور علماء کے اتفاق سے ہمارے پیر ومرشد مولانا شاہ محمد بدرالدین صاحب نفعنا اللہ والمسلمین ببرکات روحہ وقدس سرہ، امیر الشریعۃ منتخب ہوئے، حاضرین نے نیابۃً مولوی محمد سجاد صاحب مہتمم مدرسہ انوارالعلوم گیا کے ہاتھ پر بیعت امارت کی، جن میں علماء کی کثیر تعداد اس کارخیر میں سبقت لے گئی۔ (۹)

حضرت مولانا محمد سجاد صاحب خود رقم طراز ہیں:

چنانچہ بحمداللہ چند سالوں کی پیہم کوشش وتبادلۂ خیالات کے بعد ۱۹ر ماہ شوال ۱۳۳۹ھ کو وہ مبارک ساعت آئی، جس میں علمائے کرام ومشائخ عظام اور داعیان بہار کے علاوہ بعض بیرونی علمائے کرام کی باہمی مشاورت سے بہ مقام پٹنہ جمعیۃ علماء بہار کے اجلاس خصوصی میں امیر شریعت کا متفقہ طور پر انتخاب ہوا، نیابۃً بیعت عامہ لی گئی، محکمہ شرعیہ کے قیام کا اعلان ہوا، اس طرح یہ نعمت عظمیٰ

سب سے پہلے تمام ہندستان کی سرزمین میں صوبہ بہار کو ملی، جو شاید قسام ازل نے بلحاظ اولیت اسی کے لیے ودیعت رکھی تھی، اس نعمت کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔(۱۰)

اس انتخاب میں حضرت مولانا سجاد، نائب امیر شریعت منتخب ہوئے۔ صوبۂ بہار میں امارت شرعیہ کا قائم ہونا حضرت مولانا ابوالمحاسن کی بہت بڑی کامیابی تھی، قیام امارت کے لیے ان کی مساعی جمیلہ صوبہ بہار میں تو کامیابی سے ہم کنار ہوئی؛ لیکن دوسرے صوبوں میں کامیاب نہ ہوئی، اس کے اسباب وعلل کی طرف مولانا سجاد صاحب نے اشارہ فرمایا ہے، سطور ماسبق میں ہم ان کی وہ عبارت پیش کر چکے ہیں۔

۱۹۹۹ء میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے زیر اہتمام وسیع پیمانے پر ایک سمینار منعقد کیا گیا تھا، جس کی تفاصیل اور مضامین ہمارے سامنے ہیں؛ لیکن سمینار کے مضامین میں کسی نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا ہے کہ دوسرے صوبوں میں امارت نہ قائم ہونے کے کیا کیا اسباب ووجوہ تھے، جن وجوہ کی طرف خود مولانا نے اشارہ فرمایا ہے، وہ صحیح ہے؛ لیکن ہمارے تجزیے کے مطابق صرف صوبہ بہار میں امارت قائم ہونے اور دوسرے صوبوں میں قائم نہ ہونے کی ایک وجہ نہیں ہے؛ بلکہ اس کے کئی عوامل ہیں۔

اولاً: یہ کہ حضرت مولانا سجاد خود بہار میں تھے اور اس صوبے میں ان کی کوشش اور محنت بہ نسبت دوسرے صوبوں کے زیادہ رہی اور ان کے ہمہ وقتی توجہ نے اس کام کو آسان کیا۔

ثانیاً: جمعیت علمائے بہار نے قیام امارت کی تحریک کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا، اگرچہ جمعیۃ مولانا کی ہی قائم کی ہوئی تھی؛ لیکن علمائے بہار کا مولانا کی رائے سے اتفاق کرنا اور امیر کے انتخاب میں اصابت رائے کے ساتھ فیصلہ کرنا اور پھر محکمۂ شرعیہ کے قیام میں مولانا کا مکمل تعاون کرنا، قابل ذکر ہے، علمائے بہار کی جمعیت ساتھ نہ دیتی تو بہار میں امارت قائم نہیں ہوسکتی تھی؛ اس لیے مولانا نے شروع ہی میں یہ بات واضح فرمادی تھی کہ امارت کا قیام اور امیر شریعت کا انتخاب جمعیت علماء کیا کرے گی، چنانچہ صوبہ بہار میں چوتھے امیر کے انتخاب تک یہ دستور جاری رہا۔

ثالثاً: صوبۂ بہار میں خانقاہ مجیبیہ کے صاحب سجادہ حضرت مولانا سید شاہ محمد بدرالدین قادری قدس سرہ، خلافت وامارت کے موضوع پر عمیق مطالعہ رکھتے تھے اور اس موضوع پر حضرت کی وقیع تحریریں ہیں، مولانا سجاد علیہ الرحمۃ نے قیام امارت کے مسئلے پر جو فکر پیش کی، مولانا کے

تذکرہ نگار یہ سمجھتے اور سمجھانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ یہ فکر مولانا نے ہی علماء کو دی ہے، حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے، حضرت اقدس امیر شریعت اول کو اس مسئلے پر مکمل انشراح پہلے سے تھا، اگر حضرت اقدس کے ذہن میں قیام امارت کے مسئلے میں شکوک وشبہات ہوتے تو بہار میں امارت شرعیہ قائم نہیں ہوسکتی تھی، حضرت کا مسئلہ امارت سے مطمئن ہونا اور اس کو قبول کرنا، حضرت مولانا کی تحریک کے رو بہ عمل ہونے کی اہم وجہ ہے، حضرت اقدس کے علمی وعرفانی اثرات کی ہمہ گیری کا یہ حال تھا کہ ساکنان صوبۂ بہار کی اکثریت کو مسئلۂ امارت کے جواز واستحباب سے کوئی بحث نہیں رہی جب انہوں نے دیکھ لیا کہ حضور اقدس شاہ بدرالدین صاحب نے اس کو قبول فرمالیا ہے۔ سطور گذشتہ میں حضرت مولانا سجاد کا یہ جملہ کہ ''اس معیار پر صوبہ ھذا میں شاید ایک ہی دو آدمی مل سکتے ہیں'' مبالغہ نہیں تھا؛ بلکہ ایک حقیقت تھی، حضرت امیر شریعت اول کے علاوہ کسی دوسری شخصیت پر اتفاق اس لیے نہیں ہوا کہ حضرت کی ذات والا صفات جامع الشرائط تھی اور اس بات پر مجھے حیرت ہے کہ حضرت اقدس کی خلوت نشینی بھی علماء کی نظر میں امارت کے حوالے سے قابل اعتراض نہیں ہوئی کہ ''امیر شریعت خلوت نشینی کی پابندی کی وجہ سے باہر نہیں نکل سکتے تو کام کیسے کریں گے'' راقم سطور کی نظر میں (اگر چہ وہ کوتاہ نظر ہے) مشائخ بہار میں کوئی اور شخصیت ایسی نہیں تھی، جس کی نگاہ اس مسئلے کے مالہ وماعلیہ پر گہری اور عمیق ہو اور جس کی وسیع النظری، بصیرت دینی، اخلاص وللّٰہیت اور زہد وتقوی کے عوام وخواص سبھی معترف ہوں۔ کیا یہ بات قابل ذکر نہیں ہے کہ حضرت اقدس کے انتخاب میں پورے صوبے کے دو مسلمان عالم بھی اختلاف کرنے والے نہ تھے، صوبہ بہار میں خانقاہ مجیبیہ کی علمی وعرفانی مرکزیت نے جو اس کو کئی صدیوں سے حاصل تھی (امارت شرعیہ کی دین نہیں تھی) اور حضرت بدر الکاملین مولانا شاہ بدرالدین قادری کی دینی وروحانی مرجعیت نے تحریک امارت کو عوام وخواص میں روشناس اور متعارف کرایا اور اس کو استحکام بخشا اور حضرت اقدس نے امارت شرعیہ کو اپنی آغوش میں جگہ بھی دی، محکمۂ شرعیہ کے تمام شعبے دارالقضاء، دارالافتاء، بیت المال، دفتر نظامت وغیرہ خانقاہ مجیبیہ میں ہی قائم کیئے گئے۔

کسی دوسرے صوبے میں امارت شرعیہ حالات بہتر ہونے کے بعد بھی قائم نہ ہوسکی؛ کیوں کہ بہت سے علماء کو قیام امارت کے جواز میں شبہات تھے اور دوسرے صوبوں میں حضرت اقدس مولانا شاہ محمد بدرالدین قادری قدس سرہ جیسی شخصیت نہ تھی، جس پر تمام اہل صوبہ

متفق ہو جاتے۔ یہ ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ ہے کسی متعصب عنید کو اس سے اختلاف ہوسکتا ہے، غیر جانب داری سے حقائق کا تجزیہ کرنے والا اسی نتیجہ پر پہنچے گا، کسی بھی تحریک کی کامیابی میں اس کے اسباب وعوامل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

سمینار منعقدہ ۱۹۹۹ء کے مقالہ نگاروں کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشیں امیر شریعت بنا دیئے گئے تھے مگر ان کی حیثیت ایک نمایشی صدر سے زیادہ نہ تھی، جو کر رہے تھے وہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کر رہے تھے اور ان کے زمانے کے یہ دو امیر، امیر اول و امیر ثانی ان کے مشورے اور ان کے فیصلے کے تابع تھے۔

کیا واقعی حقیقت یہی تھی۔صوبہ اور بیرون صوبہ؛ بلکہ بیرون ہند کے لاکھوں دلوں کے مرکز عقیدت حضرت اقدس شاہ بدرالدین وحضرت شاہ محی الدین قدس سرہما، رشد وہدایت اور تزکیہ و تطہیر قلوب کی عظیم خدمات انجام دینے کے باوجود اتنے بے شعور تھے کہ مسئلۂ امارت میں ان کے افکار وخیالات اپنے نائب کے فکر وعمل کے تابع تھے؟ جب ہندستان کے بعض علماء کو قیام امارت کے جواز میں شکوک وشبہات پیدا ہوئے تو ان میں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، انہوں نے حضرت اقدس کے امیر شریعت منتخب ہونے کے بعد رفع شبہات کے لیے ایک مکتوب لکھا تھا، وہ اعتراضات خود ان کے اور ان کے ہم خیال علماء کے تھے۔مکتوب کی ابتدائی عبارت یہ ہے:

قبلۂ عقیدت کیشاں وکعبۂ درویشاں زیدت معالیکم السلام علیکم

آج زمین دار میں، میں نے جناب کا اعلان دیکھا، جس سے معلوم ہوا کہ امیر الشریعت کا لقب آپ نے قبول فرمالیا ہے اور اس کے موافق نہ صرف بہار؛ بلکہ تمام ہندستان میں بیعت لینے کے لئے وفد روانہ فرمانے کا قصد ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ اہم ترین مسائل سے ہے اور مجھے بہت تأمل ہے جناب کی ذات سے اس کا تعلق ہونا اور میرا تأمل کرنا کچھ مناسب نہیں ہے اس واسطے امید ہے کہ جناب میرے شبہات دفع فرماویں گے تاکہ اتفاق سے یہ تحریک ملک میں جاری ہو۔ایک خط مکرمی مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کے نام قبل انعقاد جلسہ ارسال کیا گیا ہے، وہ غالباً دفتر امیر الشریعۃ میں ہوگا، اس کو ملاحظہ فرماکے اور دوسرا عام علما کے نام کا جناب کی خدمت میں گذارا گیا ہے، اس کے جواب سے بھی جلد ایما ہو؛ تاکہ جلد اتفاق کرسکوں۔

یہ تحریک میری نظر میں اس قدر خطرناک ہے، جس کا اجراء ہونا تمام جدوجہد کو امور خلافت

واغراض اسلامیہ میں مٹادینے والا ہے، اس واسطے جب تک مجھے اطمینان نہ ہو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کے انسداد کی کوشش کروں گا اور اگر سمجھ جاؤں تو اس کے اجرا میں ساعی ہوں، امید ہے جواب سے جلد اعزاز بخشا جائے۔(۱۱)

اس مکتوب کے ساتھ قیام امارت اور بیعت امیر سے متعلق آٹھ سوالات ہیں، ان سوالات کا جواب دینا عام علما کے بس کی بات نہیں، ان کا جواب وہی دے سکتا تھا، جس کو اس مسئلے کے مالہ و ماعلیہ پر مکمل انشراح اور گہرا مطالعہ ہو۔ جواب میں حضرت امیر شریعت اول کے یہ جملے قابل ذکر ہیں:

کاش امیر شریعت کوئی دوسرا شخص منتخب کیا گیا ہوتا اور اس کی ضرورت پر احقر سے دلائل پوچھی جاتیں تو اس کے لکھنے میں مجھے عذر نہ ہوتا؛ لیکن اس حالت میں کہ میں امیر شریعت منتخب اور مقرر کردیا گیا ہوں، اس کی ضرورت پر دلائل لکھنے کو دل آمادہ نہیں؛ مگر کیا کروں، آپ کے حکم کی تعمیل بھی ضروری ہے۔(ص ۲۰۵)

حضرت اقدس کے جوابات اور مولانا عبدالباری فرنگی علیہ الرحمۃ کے سوالات غامض بحثوں پر مشتمل ہیں، یہاں پر ان کی تلخیص پیش کرنا بھی مشکل ہے، حضرت اقدس کی مدلل تحریر اس بات کی شاہد ہے کہ صوبہ بہار کا نومنتخب امیر شریعت نہایت بالغ نظر وسیع المطالعہ بڑے گہرے دینی شعور کا حامل تھا، اس کی فکر کسی فکر کا عکس و پرتو نہیں تھی، اس کی دینی، قومی اور ملی بصیرت کہیں سے مستعار لی ہوئی نہیں تھی، اس کا تبحر علمی، اس کا تفقہ، کتاب وسنت پر اس کی نگاہ عمیق، رموز دین سے اس کی واقفیت، موھبت الٰہیہ تھی اور اس کی باکرامت ذات اس عہد میں اسلام کا ایک معجزہ تھی۔

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی رحمہ اللہ کے دو مکاتیب کے جواب دیئے گئے، ان کے شبہات پھر بھی باقی رہے تو تیسرے مکتوب کا جواب مکمل ہونے سے پہلے نائب امیر شریعت حضرت مولانا سجاد کو لکھنو جانے کی ضرورت پیش آئی، فرنگی محل میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب سے بالمشافہ گفتگو ہوئی اور ان کے تمام شبہات رفع ہوگئے۔لمعات بدریہ میں مولانا سجاد صاحب کا بیان حسب ذیل ہے:

صوبہ بہار میں قیام امارت کے بعد کچھ ایسے اتفاقات ہوئے کہ میں عرصہ تک صوبہ بہار سے باہر نہ جاسکا، اس عرصہ میں مولانا عبدالباری صاحب قبلہ (مرحوم ومغفور) کے بعض مضامین مسئلہ بیعت امارت کی بابت اخبارات میں شائع ہوئے، جس کا جواب میں نے بھی مجبوراً بذریعہ

اخبارات ہی دیا، پھر مولانا موصوف اور حضرت مولانا سید شاہ محمد بدرالدین امیر شریعت اول (قدس سرہ العزیز) سے اس مسئلہ میں مکاتیب جاری ہوئے۔

اتفاق یہ ہوا کہ مولانا موصوف کا تیسرا خط آیا تو میں اسی زمانہ میں کسی قومی مجلس کی شرکت کے سلسلہ میں لکھنؤ بھی گیا اور حسب دستور مولانا موصوف ہی کا مہمان ہوا، ان دنوں مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی بھی وہیں رونق افروز تھے، مولانا کے شکوک اور مکاتیب سے مولانا عبدالقدیر صاحب بھی واقف تھے۔

ایک صحبت میں عندالتذکرہ یہ رائے قرار پائی کہ جو شکوک ہیں ان پر دوبدو گفتگو کرلی جائے اور مسئلہ صاف ہوجائے تو بہتر ہے، چنانچہ دوسرے روز مولانا عبدالباری صاحب سے گفتگو ہوئی، مولانا عبدالقدیر صاحب بھی موجود تھے دو گھنٹہ کے اندر تمام باتیں صاف ہوگئیں، بعدہ مولانا نے خود ایک تحریر بغرض اشاعت عنایت فرمائی؛ تاکہ سب لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ مسئلہ امارت میں ہمارے اور مولانا کے درمیان اب کوئی اختلاف نہیں۔

مولانا کی وہ تحریر اخبارات میں شائع ہوگی، اب اس کے بعد مولانا موصوف کے تیسرے خط میں جو شکوک تھے، اس کے جوابات دینے کی حاجت نہیں رہی؛ اس لیے حضرت امیر شریعت اول نے اس کا جواب نہیں روانہ فرمایا؛ بلکہ جواب لکھ کر بھیجنا بالکل نامناسب تھا، باوجودیکہ حضرت امیر شریعت اول، جواب کے لئے چند یادداشت لکھوا چکے تھے، پھر بھی جواب رقم نہیں فرمایا؛ لیکن اب جبکہ حضرت امیر شریعت اول قدس سرہ العزیز کے مکاتیب شائع ہورہے ہیں اور اسی سلسلے میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب کا تیسرا خط بھی شائع ہورہا ہے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس خط میں جو شکوک ہیں اس کے جوابات بھی قلم بند کردیے جائیں؛ تاکہ ان مکاتیب کے مطالعہ کرنے والے کسی مغلطہ میں نہ پڑیں؛ اس لیے حضرت مولانا عبدالباری صاحب قبلہ کا وہ خط جس میں مفاہمت اور رفع اختلاف کا تذکرہ ہے، اس کو اس مقام پر نقل کرنے کے بعد ان کے تیسرے خط کا جواب تفصیلی بھی درج کردیا جاتا ہے؛ تاکہ ناظرین کو زیادہ بصیرت حاصل ہو۔(۱۲)

حضرت مولانا سجاد، حضرت امیر شریعت اول کے نائب تھے، جو کام نائب کو کرنا چاہیے وہ مولانا کرتے تھے، مولانا نے امیر شریعت اول وثانی کے ہاتھوں پر بیعت طاعت کی تھی، اگر وہ اپنے امیر کی اجازت، مرضی اور استصواب رائے کے بغیر کچھ کرتے تو خود ان ہی کی فکر اور ان ہی کے نظریے کے خلاف بات ہوتی۔ اس انداز میں سوچنا اور امیر شریعت کی شخصیت کو مجروح کرنا

خود مولانا سجاد کے کردار کو مشکوک بنانا ہے۔ نائب کو غلوئے عقیدت میں اصل قرار دینا اور مناب کو متبوع سمجھنا کم فہموں اور متعصبوں کا کام ہے اور یہ اسی قسم کے تعصّبات کا نتیجہ ہے کہ حضرت امیر شریعت اول وثانی کو مولانا سجاد صاحب کے رفیقوں میں شامل کر دیا گیا، ۱۹۹۹ء کے سمینار کے عنوانات میں سمینار کے منتظمین ومرتبین نے یہ عنوان بھی رکھا تھا، ''مولانا سجاد اوران کے عالی مقام رفقا'' (اوراس پر ایک صاحب نے مقالہ لکھنے کی سعادت بھی حاصل کی اوراس مقالہ کو مجموعہ مقالات میں سب سے آخر میں جگہ دی گئی) ان رفقا میں حضرت امیر شریعت اول، حضرت امیر شریعت ثانی، حضرت امیر شریعت ثالث اور امارت شرعیہ کے قاضی ومفتی صاحبان حتی کہ ایسے لوگوں کے نام بھی اس فہرست میں شامل ہیں جو حضور امیر شریعت اول وثانی کی جوتیوں میں بھی بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، حضرت امیر شریعت اول قدس سرہ کی حیات میں امیر شریعت ثانی قدس سرہ مولانا سجاد صاحب کے ساتھ امارت شرعیہ کے کاموں کی انجام دہی میں سفر وحضر میں ساتھ رہے تھے؛ مگر پھر وہ بعد میں امیر شریعت ہوئے اور حضرت مولانا سجاد ان کے بھی نائب ہوئے، حضرت امیر ثانی کو نائب امیر کا رفیق ایک حد تک کہا جا سکتا ہے؛ لیکن حضور امیر شریعت اول کو مولانا کا رفیق کہنا نہ صرف خلاف ادب ہے اصولاً بھی غلط ہے، نائب اپنے مناب کا رفیق تو کہا جائے گا؛ لیکن مناب کو نائب کا رفیق کہنا کس قاعدے سے صحیح ہوگا؟ جبکہ حضرت نائب امیر شریعت مولانا سجاد صاحب، حضرت امیر شریعت اول کے بڑے صاحبزادہ اور جانشین حضرت مولانا سید شاہ محمد محی الدین قادری قدس سرہ کے ہم عمر بلکہ ان سے چند سال چھوٹے تھے؛ یعنی نائب امیر اور امیر شریعت اول کے درمیان باپ بیٹے کی عمر کا فرق تھا، لوگوں نے ادب کا لحاظ نہیں رکھا تو عمر کا لحاظ تو رکھتے، دراصل اس بے اعتدالی اور بے اصولی کے پس منظر میں وہ عصبیتیں کار فرما تھیں، جو اس زمانے میں بہت سے علما کا ''طرۂ امتیاز'' ہیں۔

حضرت امیر شریعت اول کے کچھ فرامین مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار پیغام میں شائع ہوئے اور علیحدہ بھی نائب امیر شریعت مولانا سجاد صاحب کی حیات میں دفتر امارت شرعیہ نے شائع کئے، وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ امیر شریعت کس حیثیت اور اختیار کے مالک تھے۔ امیر شریعت منتخب ہونے کے بعد حضرت امیر شریعت اول نے جو بیان یا فرمان جاری فرمایا وہ ملاحظہ فرمائیے:

> خدا کا شکر ہے کہ صوبۂ بہار واڑیسہ کے علماء ومشائخ امارت شرعیہ جیسے اہم مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے لیے آمادہ ہو گئے اور بحمد اللہ نہایت جوش وعزم راسخ کے ساتھ بحسن و

خوبی اس امر کو متفقہ طور پر انجام دیا اور تمام ہندستان کے لئے ایک مہتم بالشان نظیر قائم کر دی ؛مگر اس امارت کا بار گراں مجھ ضعیف و ناتواں کے کاندھے پر ڈالا گیا، جس کے لیے میں تیار نہ تھا؛ لیکن اب جب کہ حضرات علماء و مشائخ نے اس اہم منصب کے لئے متفقہ طور پر مجھ کو منتخب کیا ہے اور اطاعت و فرماں برداری کی بیعت کر لی اور نیز عوام کی ایک کثیر جماعت نے بھی بیعت کر لی تو اب میں نہایت عزم و استقلال کے ساتھ اس اہم منصب کے فرائض کی ادائیگی کے لیے اپنے دل میں خاص جوش پاتا ہوں اور اللہ تعالی کی توفیق پر اعتماد کر کے ہر طرح تیار ہوں، لہٰذا آج میں عام اعلان کرتا ہوں۔تمام خاص و عام کو متنبہ ہونا چاہیے کہ اس دور پر فتن اور شورش کے زمانہ میں سب سے بڑی سعادت جو تم کو ملی ہے، وہ یہی قیام امارت شرعیہ ہے، اگر تم نے اس کی قدر کی اور اس کی منزلت کو پہچانا اور اپنے عہد و میثاق پر قائم رہے تو پھر ان شاء اللہ تمام مصائب خس و خاشاک کی طرح اڑ جائیں گے، صرف ایما ن، خوف خدا اور حزم و احتیاط کے ساتھ استقلال کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس امارت کا مقصد کیا ہے، خدمت و حفاظت، بقائے عزت و ناموس دین، اجرائے احکام شرعیہ جو بجز اجتماعی قوت کے ممکن نہیں ہے اور اسی لیے مقاصد و مصالح شرعیہ کو پیش نظر رکھ کر میں اسی نوع کے احکام جاری کروں گا، جس سے حیات اجتماعی کو تعلق ہو اور وہ ایسے احکام ہوں گے، جو مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف نہ ہوں۔ ہمارا فرض ہوگا کہ کسی مسلمان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچے، چونکہ یہ بیعت ہر شخص کے لئے نہایت ضروری ہے؛ اس لیے قریب کے لوگوں کو یہاں آکر بیعت کر لینی چاہیے اور دوسرے اضلاع کے لیے میں اپنے نائب کو ایک وفد کے ساتھ بیعت لینے اور تشریح احکام کے لئے عنقریب روانہ کروں گا۔(۱۳)

اس فرمان کا یہ جملہ کہ ’’میں اپنے نائب کو ایک وفد کے ساتھ بیعت لینے اور تشریح احکام کے لیے عنقریب روانہ کروں گا‘‘ کیا کچھ ظاہر کر رہا ہے، اہل نظر سے مخفی نہیں۔ اسی مجموعۂ فرامین کے آخر میں حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب نے ’’صوبہ بہار واڑیسہ کا بیت المال‘‘ کے عنوان سے بیت المال کی اہمیت اور اس کی آمدنی واخراجات کی تفصیلات تحریر فرمائی ہیں۔ اس مضمون کے نیچے لکھا ہے ’’خادم الاسلام والمسلمین ابوالمحاسن محمد سجاد عفی عنہ (نائب امیر حضرت امیر شریعت مدظلہ العالی)‘‘ اس کے نیچے حضور امیر شریعت اول قدس سرہ نے تحریر فرمایا ہے: ’’یہ کل باتیں

ضروری ہیں، تمام مسلمانوں خصوصاً صوبہ بہار کے مسلمانوں کو اس پر عمل کرنا چاہیے"۔محمد بدرالدین۔پھلواری (امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ) ۹/ربیع الاول ۱۳۰۴ھ۔

جب امیر شریعت ثانی کے انتخاب کا موقع آیا تو حضرت مولانا سجاد صاحب کا ووٹ حضرت مولانا سید شاہ محمد محی الدین قادری قدس سرہ کے حق میں تھا اور انتخاب امیر کا جلسہ مولانا نے خانقاہ مجیبیہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ خانقاہ میں اجلاس ہوا اور حضور شاہ محی الدین قادری امیر شریعت منتخب ہوئے، حضرت کی طرف مولانا کے رجحان کا سبب ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مولانا ان کو اس کا اہل سمجھتے تھے؛ کیوں کہ ان کو مولانا نے قریب سے دیکھا تھا، ان کے شب وروز دیکھے تھے، سفر وحضر میں ان کے ساتھ رہے تھے، امارت کے ساتھ ان کا اخلاص اور ان کی للٰہیت کا مشاہدہ کیا تھا مولانا کی نظر میں وہ ان شرائط کے حامل تھے، جو امیر کے لیے مطلوب تھیں، حضرت امیر شریعت ثانی کے متعلق حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ نے حضور شاہ بدرالدین قادری کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا، جب کسی ضرورت سے امیر شریعت ثانی خانقاہ مونگیر میں ایک شب قیام پذیر ہوئے تھے کہ" ایک رات میں ان کے حالات معلوم ہوگئے، ان کو مجھے دے دیجئے رد قادیانیت کے لئے مجھے ان کی بڑی ضرورت ہے" (یہ مکتوب کتب خانہ مجیبیہ میں محفوظ ہے)۔مولانا سجاد صاحب بھی امیر شریعت منتخب ہوسکتے تھے، ان کی لیاقت واہلیت میں کوئی کلام نہیں؛ لیکن مولانا کسی مشہور ومعروف خانقاہ کے شیخ طریقت نہیں تھے، علماء میں تو ان کی شخصیت مستند اور مسلم تھی؛ لیکن غیر علماء میں جو عوام وخواص تھے وہ ان کے عقیدت مند نہیں تھے، عوام وخواص کا ایک بڑا حلقہ خانقاہ مجیبیہ کا عقیدت مند تھا اور شرائط امیر میں وسیع حلقۂ اثر کا مالک ہونا بھی شامل ہے؛ تاکہ امیر شریعت کے احکام وفرامین پر زیادہ لوگ عمل کرسکیں۔مزید یہ کہ کوئی دوسرا امیر شریعت منتخب ہوتا تو امارت شرعیہ کو خانقاہ سے کہیں اور منتقل کرنا پڑتا، امارت شرعیہ کے ابتدائی دور میں نقل مکانی کے اثرات استحکام امارت کے لیے مضر ثابت ہوتے۔ بعد کے دور میں بھی جب امارت خانقاہ سے منتقل ہوئی تو نئے امیر شریعت نے اس کو پھلواری شریف کی اہمیت کے پیش نظر پھلواری سے باہر لے جانے کا ارادہ نہیں کیا، یہیں رکھا، اصولاً امارت شرعیہ کو اپنی خانقاہ میں جگہ دینی چاہیے تھی، جس طرح امیر شریعت اول وثانی وثالث رحمہم اللہ نے ایک قومی اور دینی ادارے کو خانقاہ کے احاطے میں رکھا تھا اور امیر شریعت ثالث حضرت مولانا سید شاہ محمد قمرالدین قادری تو خانقاہ کے سجادہ نشیں بھی نہیں تھے؛ لیکن پھر بھی ان کی حیات تک امارت شرعیہ

خانقاہ میں رہی، اس کے لئے کوئی دوسرا گھر نہیں ڈھونڈا گیا، اگر چہ یہ سب جزئی اور ضمنی باتیں ہیں؛ لیکن جزئیات وضمنیات میں بھی بعض اوقات بڑے اسرار ورموز چھپے ہوتے ہیں۔

ان باتوں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمۃ والرضوان کو امارت شرعیہ کا داعی و بانی کہا جائے تو حضرات امیر شریعت اول وثانی بھی بانیان امارت میں شامل رہے ہیں؛ بلکہ امارت شرعیہ کا استحکام ان ہی حضرات کا مرہون منت ہے۔ نائب امیر شریعت حضرت مولانا سجاد تو بزرگان خانقاہ مجیبیہ کے احوال ومقامات کے معترف رہے؛ لیکن ان کے تذکرہ نگار اظہار حقائق میں بڑے ''کوتاہ دست'' نکلے، حالانکہ حضرت سجاد کا دامن اس قسم کی تعلّیوں سے یک سر پاک ہے۔

ہم ان سطور کو ختم کرتے ہوئے حضرت امیر شریعت ثانی مولانا سید شاہ محمد محی الدین قادری زیب سجادہ خانقاہ مجیبیہ قدس سرہ کے وہ تأثرات پیش کر دینا چاہتے ہیں، جو انہوں نے مولانا کی وفات پر لکھے تھے، اس کو پیش کرنے کا دو مقصد ہے:

اول یہ کہ مولانا اخلاص وللّٰہیت کے جس مقام پر تھے اور اپنے اخلاص عمل کا جو نمونہ انہوں نے چھوڑا ہے، وہ سامنے آجائے، اس کی ضرورت اس دور میں سب سے زیادہ علماء کو ہے، ان علماء کو جو شہرت ونام کے حصول کو اپنی علمی اور دینی ترقی سمجھتے ہیں۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ایک مرجع خلائق شیخ طریقت اپنے معاصر اور ہم عمر عالم کے بارے میں کتنے بلند خیالات رکھتا ہے اور کھل کر اظہار کرتا ہے، وہ بھی وہ عالم جو ان کا نائب بھی ہو۔ حضرت محی الملۃ والدین امیر شریعت ثانی کا علو ظرف بھی اس سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے حق میں ایک وقیع شہادت بھی ہے، اگر چہ ''حیات سجاد'' کے مرتبین نے ان تأثرات کو لائق ترجیح نہ سمجھا اور نائب امیر شریعت کے بارے میں امیر شریعت کے تأثرات کو اولیت نہیں دی۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد غفر اللہ لہ ورحمہ کا حادثۂ ارتحال بے حد جاں سوز اور صبر آزما ہے، ایسی ذات جس نے دین و مذہب کی حمایت اور مسلمانوں کی اصلاح میں جان و دل و عافیت و راحت و آرام سب کچھ لٹا دیا تھا، خلوص مجسم تھے۔ یہ ان ہی کا دل وجگر تھا کہ ایسی حالت میں کہ ایک طرف اکلوتا بیٹا ''حسن سجاد'' مرحوم جس کی عمر ۲۴۔ ۲۵ سال ہوگی، جب عالم فاضل ہو کر مختلف صلاحیتوں کا مجسم بن کر باپ کی آرزوؤں کا مرجع بنتا ہے اور باپ کی بہتیری امیدیں اس

کی ذات سے وابستہ ہوتی ہیں، حمی محترقہ میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسری طرف دینی اور جماعتی ضرورت داعی ہوتی ہے کہ فوری طور پر مظفرپور اور چمپارن کے علاقہ میں پہنچیں، اس کش مکش کے امتحان کی بھٹی میں کھرے سونے کی طرح نمایاں اور اجاگر ہوتے ہیں اور نسبی علائق، پدری شفقت، دنیاوی اور مادی محبت پر، دین ومذہب کی حمایت اور مسلمانوں کی فلاح واصلاح کا جذبہ غالب آتا ہے اور علالت کی اطلاع وخبر کے باوجود اس کی تیمارداری کے سروسامان کو دوسرے کے سپرد کر کے خود اللہ کی راہ میں رخت سفر باندھ کر روانہ ہوجاتے ہیں، پھر وہاں پہنچ کر مصیبت زدگان زلزلہ کے سلسلے میں مظفر پور اور بتیا کے دیہاتوں کے امدادی کام میں ہمہ تن مشغول ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ لڑکے کی حالت خراب ہوئی، تار پر تار گئے، جواب میں علاج کرانے کی ہدایات دیتے رہے، آخر کار آدمی گیا اور ان کو جبراً لایا گیا جب گھر پہنچے تو یہ جوان لڑکا سکرات میں مبتلا تھا اور چند گھنٹوں میں انتقال کر گیا۔ اس حادثۂ جاں کاہ کا اتنا بھی اثر نہ لیا کہ دو ہفتہ بھی گھر بیٹھ کر غم والم کی گھڑیوں کو سکون سے گذارتے اور تعزیت کرنے والوں کی آمد ورفت اور کلمات صبر سے سہارا حاصل کرتے، صرف پانچ دن مکان پر بہ ضرورت خاص ٹھہرے اور پھر اپنے کام پر چل کھڑے ہوئے، جس وقت وہ پھلواری شریف پہنچے اور میں نے ان کو دیکھا، مجھے حیرت ہوئی کہ جس کے باغ امید کا شاداب پھول ابھی خاک میں مل چکا ہے، ان کے چہرے بشرے سے ذرا بھی غم کے آثار ظاہر نہیں ہیں، پھلواری میں بھی قیام کرنا کیسا، دوسرے یا تیسرے دن علاقہ چمپارن کے اطراف اپنے کام میں چلے گئے، یہ ایسی ہی ذات سے ہوسکتا ہے، جو راہ خدا میں خلوص مجسم ہو، جس کے دل میں اللہ ورسول کی محبت، بال بچوں اور مال ومنال اور تمام چیزوں کی محبت پر غالب ہو اور یہی مومن کامل کی خصوصیت ہے، اخلاص کے ساتھ مولانا سجاد پیکر عمل اور کامل مدبر بھی تھے، مفید تحریکات پیدا کرنے پھر اس کو عمل میں لانے کی جو صلاحیت رکھتے تھے، اس صلاحیت کا دوسرا آدمی نظر نہیں آتا۔ (۱۴)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر یہ شعر بجا طور پر صادق آتا ہے:

پھونک کر اپنے آشیانے کو
زندگی بخش دی زمانے کو

❁❁

مصادر ومراجع

(۱) مقالات سجاد۔۱۳۶

(۲) مقالات سجاد۔۱۳۲

(۳) حیات سجاد۔۸۷

(۴) خطبۂ صدارت

(۵) خطبۂ صدارت، مطبوعہ امارت شرعیہ۔۱۳۳

(۶۔۷) خطبۂ صدارت۔۱۲۷

(۸) خطبۂ صدارت ۱۲۸

(۹) لمعات بدریہ حصہ سوم۔۲۰۱

(۱۰) مقالات سجاد۔۱۳۷

(۱۱) لمعات بدریہ حصہ۳۔۲۰۳

(۱۲) لمعات/۳/۲۲۸

(۱۳) مجموعۂ فرامین حصۂ اول۔حضرت امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ۔مدظلہ العالی۔مرتبہ مولانا ابوالبیان صاحب اعجاز گیلانی ناظر دارالامارۃ الشرعیۃ صوبہ بہار واڑیسہ۔مطبوعہ دفتر امارت شرعیہ پھلواری شریف ۱۳۰۴ھ

(۱۴) حیات سجاد ص ۸۵ تا ۸۸

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ اوران کی تحریک امارت شرعیہ

مولانا نورالحق رحمانی قاسمی
استاذ المعہد العالی برائے قضاوافتاامارت شرعیہ

چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں سرزمین ہند نے ایک ایسی عبقری شخصیت کوجنم دیا،جن کی سیرت، علمی ودینی کارناموں اورملی خدمات کے مختلف النوع پہلو ہیں،جن کوتمام شرعی علوم وفنون میں کامل دسترس اورمہارت حاصل تھی، زمانہ تعلیم میں بھی ہمیشہ ممتاز رہے، پھرتقریباً بیس سال کے عرصہ تک مدارس اسلامیہ میں تدریسی اورفتویٰ نویسی کی خدمت انجام دی، خصوصاً فقہ وفتاویٰ، تاریخ وادب اورمنطق وفلسفہ میں انہیں یدطولیٰ حاصل تھا، پھران کے دست مبارک پر صوبہ بہار،اڑیسہ وجھارکھنڈ میں امارت شرعیہ کی تاسیس عمل میں آئی جواپنی نوعیت کامنفرداورمثالی تجربہ اورہندوستان جیسے سیکولر ملک میں مسلم معاشرہ میں شرعی احکام کے نفاذ کی ایک کامیاب کوشش ہے، جوان تمام ممالک کے لیے ایک مثال ہے، جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے زندگی گذاررہے ہیں۔

شہرپٹنہ جوصوبہ بہارکی راجدھانی ہے،اس کا شمار ہندوستان کے مشہوراورقدیم شہروں میں ہوتا ہے، ہندوستان میں علم وادب کے چارمراکز دلی،لکھنؤ،حیدرآباداورعظیم آباد،شہرعظیم آباد ہی کا موجودہ نام پٹنہ ہے، اسے تاریخ کے ہردور میں مرکزیت حاصل رہی ہے، چنانچہ وہ ہندوبادشاہوں کے دور میں بھی اورمسلم سلاطین کے زمانے میں بھی علم وادب کا گہوارہ رہاہے، جہاں مشرقی علوم میں سے ہرفن مین ماہرین اوررجال کارپیداہوتے رہے ہیں،جن کی تصنیفات وتحقیقات کواہل علم کے درمیان خاص اہمیت حاصل رہی ہے، بہارشریف پہلے پٹنہ ضلع کاایک قصبہ تھا،اسی کے نام پرصوبہ کا نام بہاررکھا گیا،جس سے اس قصبہ کی اہمیت کااندازہ ہوتاہے، بہارشریف کوعالم ربانی حضرت شرف الدین یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ جومخدوم بہاری کے نام سے مشہور ہیں،ان کے مولدومسکن ہونے کاشرف حاصل ہے۔

بہارشریف کا خطہ بڑا زرخیز اورتاریخی اہمیت کا حامل ہے،جس میں بہت سے علماء ومشائخ، صلحاء واتقیا اورعلوم اسلامی کے ماہرین اقطاب واعلام پیداہوئے، خصوصاً ماضی قریب میں مولانا

محمد سجاد، عظیم اسلامی اسکالر مولانا مناظر احسن گیلانی اور سیرت النبی کے مصنف علامہ سید سلیمان ندوی رحمہم اللہ پیدا ہوئے، پنہسہ، گیلان اور دسنہ یہ سب پندرہ کیلومیٹر ہی کے فاصلہ پر ہیں۔

اس قصبہ سے چند میل کے فاصلے پر راجگیر نامی مقام ہے، جسے مخدوم بہار نے اپنی عبادت وریاضت کا مرکز بنایا تھا اور وہ سڑک جو بہار شریف سے راجگیر کو جاتی ہے، اسی سڑک کے پچھّم جانب چھ میل کے فاصلے پر پنہسہ گاؤں واقع ہے، یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے، جو شہر کی آبادی اور شور وشغب اور ہنگاموں سے بالکل دور ہے، اس گاؤں کے باشندوں کا پیشہ کاشتکاری ہے۔

حضرت مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ اسی گاؤں میں مولوی حسین بخش کے گھر پیدا ہوئے، جو گاؤں کے زمین دار اور معزز لوگوں میں تھے اور صلاح وتقویٰ کی صفت سے متصف تھے، انہوں نے عربی پڑھی تھی اور دینی علوم حاصل کئے تھے، لیکن عالمیت کا نصاب مکمل نہ کر سکے تھے، کچھ عرصہ انہوں نے تدریسی خدمات مدارس میں انجام دیں، پھر کاشتکاری میں لگ گئے، جو ان کا آبائی پیشہ اور ذریعۂ معاش تھا اور پھر تاحیات زراعت ہی سے وابستہ رہے، وہ بڑے متقی، پرہیزگار، بااخلاق اور متواضع تھے، سخاوت وفیاضی اور مہمان نوازی ان کا نمایاں وصف تھا، جو لوگ اس راہ سے راجگیر جاتے اور وہاں سے لوٹتے تو کم از کم ایک دن ان کے گھر ضرور قیام کرتے۔

مولانا محمد سجاد کی پیدائش چودھویں صدی کے بالکل آغاز میں ماہ صفر ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں ہوئی، ان کے والد ماجد نے ان کا نام محمد سجاد رکھا اور وہ اپنی کنیت ابوالمحاسن کے ساتھ مشہور ہوئے، چار سال ہی کی عمر کو پہونچے تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا اور بچپنے ہی میں یتیم ہوگئے؛ لیکن اللہ رب العزت کی خاص عنایت ان کے ساتھ رہی، پھر وہ اپنے برادر بزرگ مولوی احمد سجاد مرحوم کی کفالت وتربیت میں آئے، مولانا نے اپنی علمی زندگی کا آغاز اپنی بستی ہی میں کیا، پھر مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں ۱۳۱۰ھ میں تعلیم کی غرض سے داخلہ لیا، جو ان کی بستی سے صرف چھ میل کی دوری پر واقع ہے، اس مدرسہ کے بانی اور ناظم مولانا حافظ سید وحید الحق استھانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن سے ان کی چچازاد بہن منسوب تھیں، بعد میں چل کر مولانا وحید الحق رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی مولانا سجاد علیہ الرحمہ کے نکاح میں آئیں اور وہ آپ کے خسر بنے، جب مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلب علم کے لیے انہوں نے بیرون صوبہ کا سفر کیا، اس وقت ان کی عمر تقریباً چودہ سال تھی، اس سلسلے میں ان کی پہلی منزل کانپور یوپی قرار پائی اور وہاں کے مدرسہ میں مولانا احمد حسن کانپوری رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے، وہاں چند سال قیام کرنے کے بعد ازہر الہند دار العلوم دیوبند کا سفر کیا اور وہاں کچھ عرصہ رہ

کر اس کے بڑے علماء واساتذہ سے کسب فیض کیا، پھر فقہ وتفسیر اور علم حدیث کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں داخل ہوئے اور وہاں کے سب سے بڑے استاذ مولانا عبدالکافی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے خصوصی استفادہ کیا اور شرعی علوم کی تکمیل کر کے ۱۳۲۲ھ میں فارغ ہوئے اور سند فضیلت حاصل کی۔

مولانا مرحوم قیادت کے میدان میں:

فراغت کے بعد مولانا مرحوم نے پوری زندگی تعلیم وتدریس اور قوم وملت کی خدمت میں گذاری، البتہ آپ کی زندگی کا آخری دور قیادت وسیاست سے تعلق رکھتا ہے، جو چالیس سال کے بعد سے لے کر اخیر عمر تک جاری رہا، یہ آپ کی عمر کا سب سے بیش قیمت اور عہد زریں ہے، جو تقریبا بیس برسوں پر محیط ہے اور یہ بھی گویا قدرتی فیصلہ تھا کہ آپ نے قیادت کے میدان میں اس وقت قدم رکھا، جب عمر مبارک مقررہ عمر نبوت سے تجاوز کر چکی تھی، تعلیم وتربیت کے میدان میں ایک طویل عرصہ گذارنے کے بعد علم میں رسوخ، عقل وشعور میں پختگی، تجربات میں وسعت اور ملکی وعالمی حالات اور سیاست حاضرہ پر نظر ہو چکی تھی جو ایک کامیاب اور مخلص قائد کے لیے ضروری صفات ہیں، انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے عام طور پر اسی عمر میں انسانیت کی قیادت ورہنمائی سپرد کی، ماہرین نفسیات بھی اس سے قبل اس میدان میں قدم رکھنے کو مناسب خیال نہیں کرتے۔ خلاصہ یہ کہ اصلاح وقیادت کے میدان میں آپ اس وقت داخل ہوئے، جب اس کی مطلوبہ تمام شرائط اور خوبیاں آپ کی ذات میں جمع ہو چکی تھیں۔

مولانا قرآن وحدیث اور تاریخ کے گہرے مطالعہ اور اپنی خداداد بصیرت کی روشنی میں مسلمانوں کے باہمی اختلاف وانتشار کو مسلمانوں کے عالمگیر زوال کا سبب سمجھتے تھے اور ان کی شرعی تنظیم، امارت شرعیہ کے قیام اور نصب امیر کو اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے وجود وبقا اور باعزت زندگی کے لیے ضروری سمجھتے تھے، مگر اس راہ میں ان کا باہمی اختلاف اور گروہی اور مسلکی جھگڑے سب سے زیادہ رکاوٹ تھے، وہ پوری امت کی شیرازہ بندی کلمہ واحدہ کی بنیاد پر کرنا چاہتے ہیں اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا چاہتے تھے، لیکن یہ اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ پہلے علما میں اتحاد قائم ہو اور وہ دین کے مصالح اور بلند مقاصد کی خاطر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں، اس لیے انہوں نے مدرسہ انوار العلوم گیا کے سالانہ اجلاس کے موقع پر جو وہ ہر سال منعقد کرتے تھے، ۳۰؍صفر ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں پورے صوبہ کے علما کو دعوت دی اور ان کی ایک بڑی تعداد کو جمع کر کے انجمن علماء بہار کے نام سے ان کی ایک متحدہ تنظیم قائم کی اور بہار کے

علماء ومشائخ اورارباب حل وعقد کی اجتماعی شیرازہ بندی کر کے انہیں ایک مرکزی نقطہ اورایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع کیا، اس انجمن کا مختصر لفظوں میں دو بڑا مقصد تھا، ایک اسلامی دعوت کی نشرواشاعت اوردوسرا حقوق ملیہ کی حفاظت۔

مولانا مرحوم کی اسی کوشش نے جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے لیے میدان ہموار کیا، پھر تقریبا سال بھر کے بعد جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا، مولانا جمعیۃ علماء کے بڑے داعی اوراعوان وانصار میں سے تھے، چنانچہ جمعیۃ علماء کی تاسیس کے لیے جو مجلس شوریٰ دہلی میں منعقد ہوئی تھی مولانا اس میں بھی شریک ہوئے ،اس طرح جمعیۃ کے قیام میں مولانا کا اہم رول رہا ہے۔

بہرحال انجمن علماء بہار کے قیام کے بعد مولانا اس انجمن کی ترقی، علماء امت کے اتحاد اور مسلمانوں کے دینی، ملی اور سیاسی مصالح کے تحفظ کے لیے بالکل فارغ ہو گئے اور مدرسہ انوار العلوم گیا جس کے وہ بانی اور مہتمم تھے، اس کے نظم واہتمام کی ذمہ داری اپنے ایک ممتاز شاگرد رشید جناب مولانا عبدالحکیم کے سپرد کر کے ملی کاموں کے لیے فارغ ہو گئے، صوبہ بہار جو اس وقت جھارکھنڈ اوراڑیسہ ان سب پر مشتمل تھا، اس کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا، علماء ومشائخ اورارباب دانش سے ملاقاتیں کیں اور قیام امارت کے سلسلے میں ان سے مشورہ اور تبادلہ خیال کیا اور ملک کے موجودحالات کے پیش نظر اس دینی وشرعی فریضہ کی ضرورت واہمیت کا انہیں احساس دلایا اوراس سلسلے میں علماء کے جو شکوک وشبہات تھے، ان کا ازالہ کیا، اس سلسلے میں آپ نے بہار کے دو دینی وروحانی مراکز خانقاہ رحمانی مونگیر اورخانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ کا خاص طور پر دورہ کیا اور قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیری اور بدرالکاملین حضرت مولانا بدرالدین قادری پھلواروی کی تائیدوحمایت حاصل کی۔

مولانا مرحوم کی پہلی کوشش یہ تھی کہ جمعیۃ علماء ہند کی طرح آل انڈیا پیمانے پر امارت شرعیہ قائم ہوجائے؛ لیکن ان کی انتھک کوشش اور جمعیۃ علماء ہند کی تجویز اور فیصلے کے باوجود جب ملکی پیمانے پر امارت شرعیہ کا قیام اورامیر الہند کا انتخاب بچند وجوہ ممکن نہ ہوسکا تو مولانا نے سوچا کہ جس طرح انجمن علماء بہار کے قیام سے جمعیۃ علماء ہند کے قیام کی راہ ہموار ہوئی، اسی طرح بہار میں امارت شرعیہ قائم ہوجانے سے پورے ملک اور ہر صوبہ کے لیے نمونہ اورمثال بنایا جائے، چنانچہ انجمن علماء بہار کا سالانہ اجلاس جو دربھنگہ میں ۲۳،۲۴ر شعبان ۱۳۳۹ھ مطابق ۲،۳ر مئی ۱۹۲۱ء منعقد ہوا، اس میں تمام ارکان نے بہ اتفاق رائے قیام امارت کی تجویز منظور کی، جو درج ذیل ہے:

''صوبہ بہار واڑیسہ کے محکمہ شرعیہ کے لیے عالم مقتدر شخص منتخب کیا جائے، جس کے

ہاتھ میں تمام محاکم شرعیہ کی باگ ہو اور اس کا ہر حکم مطابق شریعت ہر مسلمان کے لیے واجب العمل ہو، نیز تمام علماء ومشائخ اس کے ہاتھ پر خدمت وحفاظت اسلام کے لیے بیعت کریں جو سمع وطاعت کی بیعت ہوگی اور جو بیعت طریقت سے الگ ایک ضروری اور اہم چیز ہے، یہ جمعیۃ متفقہ طور پر تجویز کرتی ہے کہ انتخاب امیر محکمہ شرعیہ کے لیے ایک خاص اجلاس علماء بہار کا بمقام پٹنہ وسط شوال میں منعقد کیا جائے''۔(۱۴)

اجلاس سے قبل جو تاریخی مکتوب مولانا مرحوم نے علماء ومشائخ اور دانشوران ملت کے نام ارسال فرمایا، وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے، اس میں ہندوستان جیسے غیر اسلامی ملک میں امارت کی ضرورت واہمیت، اس کی شرعی حیثیت اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا مدلل جواب ہے، یہ مکتوب تاریخ امارت کے گیارہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، صوبہ کے اکثر علماء ومشائخ نے مولانا کی اس تجویز سے مکمل اتفاق کیا اور مثبت جواب لکھا، حضرت مولانا بدرالدین صاحب سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ نے اپنے جواب میں لکھا کہ امیر شریعت کے لیے جن صفات وشرائط کا جناب والا نے ذکر کیا ہے، وہ مولانا مونگیری کے علاوہ کسی اور شخصیت میں نہیں پائی جاتی، دوسری طرف حضرت مولانا مونگیری جو عمر میں بڑے تھے، ان کا اصرار تھا کہ اس عہدہ کے لیے سب سے زیادہ موزوں شخصیت حضرت مولانا بدرالدین قادری کی ہے، بالآخر انہیں کی تجویز غالب رہی اور حضرت بدرالکاملین کو امیر شریعت منتخب کیا گیا، یہ ہمارے بزرگوں کا ایثار آج کے دور کے لیے ایک مثال اور باعث عبرت ہے۔

چنانچہ یہ انتخابی اجلاس حسب تجویز ۱۸؍شوال ۱۳۳۹ھ کو ۸؍بجے صبح بمقام پٹنہ پتھر کی مسجد میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں صوبہ کے سو سے زائد علماء ومشائخ شریک ہوئے، بیرون صوبہ کے شرکاء میں مولانا آزاد کے علاوہ مولانا آزاد سبحانی اور مولانا سبحان اللہ خاں قابل ذکر ہیں، عام شرکاء کی تعداد تقریبا چار ہزار تھی، شرکائے اجلاس نے بہ اتفاق رائے حضرت مولانا شاہ بدرالدین سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ کو امیر شریعت اور حضرت مولانا سجاد کو نائب امیر شریعت منتخب کیا، یہ مسلمانان ہند بالخصوص صوبہ بہار کے لیے ایک مبارک اور تاریخی دن تھا، جس میں شرعی امارت کا قیام اور امیر شریعت کا انتخاب عمل میں آیا اور اس طرح اس دینی فریضے کی تکمیل ہوئی، جو کسی ملک پر غیر مسلمانوں کے غلبہ وتسلط کے بعد وہاں کے باشندوں پر انتخاب امیر کے سلسلے میں عائد ہوتا ہے، اس شرعی تنظیم نے صوبہ کے مسلمانوں میں ملی واجتماعی روح کو بیدار کر دیا اور اسلامی زندگی کی لہر دوڑ گئی، دارالقضاء، بیت المال اور زکوٰۃ وصدقات کی اجتماعی

وصولی اور تقسیم کا نظام قائم ہوا، شرعی مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے دارالافتاء کا شعبہ قائم ہوا اور اکل آٹھ شعبے قائم ہوئے اور اس کے لیے مولانا مرحوم نے خود شہر شہر اور بستی بستی کا دورہ کر کے مسلمانوں کی بہت سی آبادی کو مرکزی امارت سے جوڑا اور تمام مقامی مسائل ومشکلات کو شریعت کی روشنی میں حل کرنے کا نظام بنایا اور ہر آبادی کے دینی سردار کے لیے قرآنی تعبیر کے مطابق نقیب کا اصطلاحی نام تجویز کیا، اس طرح تبلیغ اسلام، تحفظ مسلمین، دارالاشاعت اور دیگر شعبے باضابطہ قائم ہوئے اور کام کرنے لگے۔

امارت شرعیہ کے قیام کے بعد مولانا نے اپنی تدریسی اور دیگر مصروفیات سے کنارہ کش ہوکر اس اہم دینی تنظیم کے استحکام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور بقول مولانا عبدالصمد رحمانی کے کہ جب وہ دور آیا کہ مولانا جماعتی اور دینی کاموں میں ایسے منہمک ہوئے کہ اس کی (یعنی کھیتی کی) طرف سے بے توجہی ہوگئی تو آہستہ آہستہ کاشتکاری خراب ہوگئی اور محض خراب نہیں؛ بلکہ بربادی کی حد تک پہونچ گئی، یہاں تک کہ اس کی پیداوار سے زمین کی مالگذاری بھی ادا نہ ہوسکی اور کچھ زمین نیلام ہوگئی اور حضرت امیر شریعت رابع کی تحریر کے مطابق چوبیس بیگھہ زمین مالگذاری ادا نہ کرنے کے باعث نیلام ہوگئی۔

امارت شرعیہ کے قیام کے بعد امارت ہی آپ کا اوڑھنا بچھونا بن گئی، پورے صوبہ کا دورہ کر کے آپ نے مسلمانوں کے درمیان اس اہم تنظیم کو متعارف کرایا، اپنے تبلیغی دوروں میں مسلمانوں کے عقائد واعمال کی اصلاح کی، شرک وبدعات، غیر شرعی اور جاہلانہ رسوم ورواج کو ختم کیا، ان کے باہمی اختلاف وانتشار کو مٹا کر انہیں اتحاد واتفاق کی لڑی میں پرویا، عشر وزکوٰۃ کی اہمیت کو سمجھایا اور اس کی اجتماعی وصولی اور صحیح مصارف میں صرف کرنے کے لیے عمال ومبلغین مقرر کیے، ادارہ کی ضروریات کی تکمیل کے لیے قومی محصول کا نظام قائم کیا، ارتداد اور تمام اسلام دشمن تحریکات کا مقابلہ کیا، مظلوم عورتیں جو امارت کے قیام سے قبل اپنے شوہروں کے ظلم وستم کا شکار تھیں، یا شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی وجہ سے حقوق زوجیت سے محروم تھیں، دارالقضاء کے ذریعہ ان کے حقوق دلائے، مجبوری کی حالت میں نکاح فسخ کیا، امت کی ڈھارس بندھائی، ان کے آنسو پوچھے اور ان کے زخم پر مرہم رکھا، تحریک سدھی سنگٹھن کا مقابلہ کیا، ضلع چمپارن، سارن اور ہزاری باغ کے مرتدین کو حکمت کے ساتھ اسلام کی طرف واپس لائے، ان علاقوں میں امارت شرعیہ اور دیگر اہل خیر کے تعاون سے مساجد اور مکاتب کی تعمیر کی، ان میں بچوں کی دینی تعلیم کے لیے امارت شرعیہ کی طرف سے اساتذہ بحال کیے، ان میں متعدد مکاتب ومدارس کی کفالت آج تک امارت شرعیہ کر رہی ہے۔

مرتدین کو اسلام کی طرف واپس لانے کے ساتھ دوسرا اہم کام آپ نے یہ بھی کیا کہ بعض جرائم پیشہ غیر مسلم قوموں کو حلقہ بگوش اسلام کیا، مگھیا ڈوم اپنے جرائم و کرائم سے مشہور ہے، موضع چوترو ا تھانہ بگہا ضلع چمپارن میں انگریز حکومت انہیں عیسائی بنانا چاہتی تھیں، مولانا نے اپنے مبلغین بھیج کر ان میں اسلام کی تبلیغ کا کام کیا، اللہ کے فضل و کرم سے سو(۱۰۰) گھرانے بخوشی اسلام میں داخل ہو گئے۔

۲۸ر رمضان ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں بہار میں ہولناک زلزلہ آیا جس میں بے حد تباہی ہوئی، ہزاروں مکانات منہدم ہو گئے، آپ نے ان کی تعمیر کے لیے یہ اسکیم چلائی کہ رضا کاروں کی ایک ٹیم آپ کے ہمراہ کام کرتی اور آبادی کے لوگوں کو ساتھ لے کر باری باری ایک ایک گھر تعمیر کرتے، اس طرح تھوڑے عرصہ میں بہت سے مکانات کم خرچ میں تعمیر ہو گئے، اسی زلزلہ کے بعد آپ متاثرہ علاقوں کے دورہ پر تھے کہ آپ کے اکلوتے صاحبزادے مولانا حسن سجاد مرحوم جنھوں نے دارالعلوم دیوبند سے امیر شریعت رابع کے ساتھ دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی تھی، جن کی عمر ۲۴، ۲۵ر سال تھی اور شادی کی بات چل رہی تھی کہ وہ سخت علیل ہوئے، حالت نازک ہوگئی، گھر سے تار پر تار جاتا ہے، جواب میں علاج کی ہدایت فرماتے ہیں، قوم وملت کے ہزاروں فرزندوں کی فکر وخدمت اپنے اکلوتے فرزند کی فکر سے باز رکھتی ہے، جب آخری وقت میں گھر سے آدمی آتا ہے تو رفیق سفر مولانا احمد سعید دہلوی باصرار آپ کو گھر جانے پر مجبور کرتے ہیں، جب گھر پہونچتے ہیں تو بیٹے کو سکرات کی حالت میں پاتے ہیں اور بس تجہیز وتکفین کا موقع مل پاتا ہے، صحیح معنوں میں آپ کی ذات گرامی اس شعر کا مصداق تھی

پھونک کر اپنے آشیانے کو
بخش دی روشنی زمانے کو

امارت شرعیہ اوراس کے بنیادی شعبے:

یہاں تک تو میں نے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات وواقعات اوران کی مختلف النوع علمی، دینی اور ملی خدمات کا اجمالی تذکرہ کیا، اب آگے چند صفحات میں اس امارت شرعیہ کا مختصر تعارف کرانا چاہتے ہیں، جو ان کا سب سے بڑا دینی وملی کارنامہ ہے اور جو ان کے لیے ان شاء اللہ صدقہ جاریہ اور باقیات صالحات کی حیثیت رکھنے والی الشان دینی خدمت اور ہندوستانی تاریخ میں دینی جدوجہد کا روشن باب ہے، امارت شرعیہ کا جو اجمالی تخیل مولانا مرحوم نے علماء ومشائخ کے سامنے پیش فرمایا تھا، ابتداء اس کے آٹھ شعبے قائم فرمائے جو اس کے مستقل اور بنیادی شعبے میں

اوروہ سب قرآن وحدیث سے ماخوذ اورحکم الٰہی کی تعمیل ہے، بعد میں ضرورت کے مطابق اس میں اضافہ ہوتا رہااوراب ان نئے شعبوں نے بھی مستقل شعبہ کی صورت اختیار کرلی ہے، مستقل شعبے یہ ہیں:

(۱) دارالقضاء

(۲) دارالافتاء

(۳) شعبہ تبلیغ

(۴) شعبہ تنظیم

(۵) شعبہ تعلیم مذہبی وعصری

(۶) شعبہ تحفظ مسلمین

(۷) شعبہ نشر واشاعت

(۸) شعبہ بیت المال

اور بعد میں قائم ہونیوالے شعبہ جات:

(۹) المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء، پھلواری شریف پٹنہ

(۱۰) دارالعلوم الاسلامیہ رضانگر گونپورہ پھلواری شریف پٹنہ

(۱۱) امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفئر ٹرسٹ

(۱۲) شعبہ امور مساجد

(۱۳) شعبہ تعمیرات

(۱۴) ریلیف فنڈ، ریلیف فنڈ دراصل بیت المال ہی کے تحت آجاتا ہے۔

اب ان تمام شعبہ جات کا تعارف تاریخ امارت اوران دو کتابچوں کی روشنی میں اجمالا ذکر کیا جاتا ہے، جو امارت کے ذمہ داروں کے ایما پراس عاجز نے اردو میں ''امارت شرعیہ تعارف وخدمات'' کے نام سے اورعربی میں ''**منظمة الإمار ة الشرعية مؤسسة إسلامية رائدة فی إقامة نظام القضاء وتنظيم شئون المسلمين**'' کے نام سے مرتب کئے ہیں۔

دارالقضاء:

یہ امارت شرعیہ کا سب سے اہم شعبہ ہے، جس کا مقصد مسلمانوں کے عائلی مقدمات اورمعاشرتی مسائل کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا ہے،قرآن کریم میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ اوراس کے رسول اوراپنے امیر کی اطاعت کریں اورآپس میں کوئی نزاع اوراختلاف ہوتو اسے اللہ اوررسول کی طرف لوٹائیں۔(سورہ نساء) یعنی شریعت کی روشنی میں اس کا حل تلاش کریں،

اسلامی عدالت اور مسلم قاضی کے ہوتے کسی غیر شرعی عدالت یا غیر مسلم جج کی طرف رجوع کرنا کسی صاحب ایمان کے لیے روا نہیں، اسی حکم الٰہی کی تعمیل میں امارت کے تحت نظام قضاء قائم کیا گیا، پھلواری شریف میں دارالقضاء مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ نے امارت شرعیہ کے قیام سے قبل انجمن علماء بہار کی نگرانی میں قائم فرمایا تھا، پھر جب امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا تو اسے امارت شرعیہ کے ماتحت کردیا، ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے، وہاں مسلم قاضی اور دارالقضاء کے بغیر مسلمانوں کے بہت سے مسائل حل نہیں ہوسکتے، مثلا اگر کسی عورت کا شوہر مفقود الخبر اور لاپتہ ہے اور وہ نفقہ اور حقوق زوجیت سے محروم ہے، یا زوجین کے درمیان کسی بناپر حرمت مصاہرت پیدا ہوگئی تو مسلم قاضی ہی فسخ نکاح کا فیصلہ کرسکتا ہے، سرکاری عدالت کا کوئی غیر مسلم جج اگر تفریق کا فیصلہ کردے تو وہ شرعا معتبر نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی مسلم خاتون شوہر کے ظلم وتعدی کا شکار ہو اور نان ونفقہ اور حقوق زوجیت سے محروم ہو تو اس صورت میں عورت کی رہائی اور گلوخلاسی کا واحد ذریعہ مسلم قاضی کا فیصلہ ہے، اسی طرح یتیم اور لاوارث بچوں کی ولایت اور ان کے مفادات ومصالح کا تحفظ مسلم قاضی ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے، چنانچہ اس ناگزیر ضرورت کا حل دارالقضاء کے قیام کے ذریعہ ہوا اور مسلمانوں کے لیے بڑی راحت کا ذریعہ بنا، اس کے پہلے قاضی شریعت حضرت مولانا نورالحسن پھلواری رحمۃ اللہ علیہ تھے جو بڑے قدآور عالم وقاضی اور بانی امارت شرعیہ کے رفقا میں تھے، علامہ قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند ایک مرتبہ امارت شرعیہ تشریف لائے اور دارالقضاء کے نظام کا معاینہ فرمایا تو بہت خوش اور مطمئن ہوئے اور فرمایا کہ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر یہاں اسلامی حکومت ہوتی تو اس کے دارالقضاء کا نظام اس سے زیادہ منظّم اور بہتر ہوتا۔

اب تک دارالقضاء سے ۳۰/۷ ہزار سے زائد مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہوچکے ہیں، قیام امارت کے بعد صرف پھلواری شریف میں مرکزی دارالقضاء تھا اور پہلے تینوں امراء شریعت کے زمانہ تک یہی ایک دارالقضاء مسلمانوں کے مقدمات کے فیصلے کرتا تھا اور لوگ تینوں صوبوں کے دوردراز علاقوں سے یہاں آتے تھے، جس میں انہیں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا؛ لیکن جب حضرت مولانا منت اللہ رحمانی چوتھے امیر شریعت منتخب ہوئے تو انہوں نے نظام قضاء کو وسعت دی، خانقاہ رحمانی مونگیر میں تربیت قضا کے لیے دو ہفتے کا کیمپ لگایا جس میں صوبہ کے علماء نے قضا کی تربیت حاصل کی، اس وقت کے قاضی شریعت حضرت مولانا شاہ عون احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تربیت کا فریضہ انجام دیا، پھر صوبہ کے مختلف مرکزی مقامات میں

دارالقضاء کی شاخیں قائم ہوئیں اوران ہی تربیت یافتہ علماء کوان میں قضاء کے منصب پر فائز کیا گیا، اس وقت صوبہ بہار، جھارکھنڈ، اڑیسہ اور مغربی بنگال میں ۶۶ ر دارالقضاء قائم ہیں، جس کے ماتحت مسلمانوں کے عائلی مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق انجام پاتے ہیں، ان کے علاوہ راجستھان، یوپی اور نیپال وغیرہ سے بھی مقدمات دائر ہوتے ہیں اور کتاب وسنت کے مطابق ان کے فیصلے ہوتے ہیں، قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کے بعد قاضی جسیم الدین رحمانی صدر قاضی ہوئے، اس وقت قاضی عبدالجلیل قاسمی صاحب اس عہدے پر ہیں، ان کے نائبین ومعاونین مرکزی دارالقضاء پانچ ہیں۔

دارالافتاء:

امارت شرعیہ کا دوسرا اہم شعبہ دارالافتاء ہے، جوامارت شرعیہ کے قیام ہی کے دن سے کام کررہا ہے، شریعت کا حکم یہ ہے کہ مسلمان اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق زندگی گذاریں، حلال وحرام کا حکم معلوم کریں، نہ جاننے والے جاننے والوں سے پوچھیں: ﴿**فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون**﴾ امارت شرعیہ کا دارالافتاء ملک کے ان چند اہم مراکز میں شمار ہوتا ہے، جنہیں مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے، ملک وبیرون ملک سے لوگ اہم مسائل میں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، بڑے بڑے علماء وارباب افتاء نے یہاں یہ مبارک خدمت انجام دی ہے، خود بانی امارت شرعیہ، مولانا عبدالصمد رحمانی، مفتی محمد عثمان، مفتی محمد عباس (والد مولانا عبداللہ عباس ندوی)، مفتی یحی، مفتی صدر عالم، مفتی نعمت اللہ، مفتی جنید احمد قاسمی وغیرہ اس منصب پر فائز رہے ہیں، اس وقت مفتی سہیل احمد قاسمی، مفتی نصر اللہ مظاہری، مفتی سعید الرحمٰن، مفتی احتکام الحق قاسمی اس خدمت پر مامور ہیں، اس طرح یہ اہم شعبہ ایک صدی سے زیادہ مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا ہے، دارالافتاء کے فتاویٰ کا ریکارڈ محفوظ ہے اوران کی ترتیب کا کام جاری ہے، اب تک اس کی پانچ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں، چھٹی جلد زیر ترتیب ہے، یہ عوام اور اہل علم دونوں کے لیے قیمتی سرمایہ ہے۔

شعبہ دعوت وتبلیغ:

دین کی تبلیغ ودعوت، معاشرے کی اصلاح، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے، اس مقصد کے لیے یہ شعبہ امارت شرعیہ میں شروع سے کام کررہا ہے، مبلغین کرام کی ایک بڑی تعداد ہے جو فیلڈ میں اتر کر کام کرتی، دور دراز علاقوں کا دورہ کرتی ہے، بدعات ومنکرات اور غیر اسلامی رسوم ورواج کا ازالہ، صحیح اسلامی عقائد اور اعمال صالحہ کو عام کرنے اور ارتداد والحاد کا خاتمہ کرنے میں اس شعبے نے بڑی خدمت انجام دی ہے، خود بانی امارت حضرت مولانا محمد سجاد

صاحب علیہ الرحمہ نے شدھی تحریک اور چمپارن کے علاقے میں گدیوں کے درمیان پھیلے ہوئے ارتداد کا اپنی ٹیم کے ساتھ مقابلہ کیا اور انہیں اسلام پر قائم رکھا، ایسے علاقوں میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے مدارس ومکاتب قائم کئے اور خوشگوار دینی انقلاب برپا کیا، خصوصا رد قادیانیت کے سلسلے میں کوسی کمشنری، پورنیہ، نیپال اور اڑیسہ میں فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی کی اور بہت سے لوگ جو جہالت کی بنا پر قادیانی بن گئے تھے، ان کو دوبارہ اسلام کی طرف واپس لایا گیا، آج بھی امارت شرعیہ کے حلقوں اور تینوں صوبوں میں امارت شرعیہ کے مبلغین کے مسلسل دورے ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ سماج کی اصلاح کا کام انجام پاتا ہے، خصوصا قدرتی آفات وحوادث اور فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر مصیبت زدہ انسانوں کی امداد واعانت اور ان کی ریلیف اور راحت رسانی کا کام انجام پاتا ہے۔

شعبہ تنظیم:

یہ بھی امارت شرعیہ کا اہم اور بنیادی شعبہ ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر گاؤں، ہر شہر اور شہر کے ہر محلے میں تنظیم امارت شرعیہ قائم کی جائے اور اسے مرکزی امارت شرعیہ سے جوڑا جائے اور اس کا طریقۂ کار یہ ہے کہ جس علاقے میں یہ تنظیم قائم نہیں ہے، اس آبادی کے لوگوں کا کسی خاص تاریخ میں کوئی اجتماع مقرر کیا جاتا ہے اور گاؤں والوں کو اس کی پیشگی اطلاع دی جاتی ہے، جس میں آبادی کے لوگ کسی مسجد یا کسی خاص مقام پر جمع ہوتے ہیں، ان کی موجودگی میں امارت شرعیہ کا کوئی مبلغ یا ذمہ دار وہاں پہونچتا ہے اور ان کی مرضی اور باہمی اتفاق سے ان کا کوئی امیر اور دینی سردار منتخب کرتا ہے، جس کا اصطلاحی نام نقیب ہے، جو قرآن کریم سے ماخوذ ہے، اس نقیب کے کچھ ممبران بھی منتخب ہوتے ہیں، جنہیں مشیران نقیب کہا جاتا ہے، یہ نقیب اپنے مشیروں کے ساتھ شریعت کے احکام کو اپنی آبادی پر نافذ کرتا ہے، آپس میں کوئی لڑائی جھگڑا اور اختلاف ہو تو حکمت عملی کے ساتھ ان کا تصفیہ کرتا ہے، اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو امارت کے ذمہ دار سے مدد حاصل کرتا ہے اور ایسے جھگڑوں کو مرکزی دارالقضاء میں بھیج دیتا ہے اور وہاں سے قاضی شریعت کا جو فیصلہ ہوا، اسے دونوں فریق قبول کرتے ہیں، یہ نقیب امیر شریعت اور اپنی آبادی کے لوگوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتا ہے، امیر شریعت کی طرف سے صادر ہونے والے احکام وہدایات کو محلّہ والوں تک پہونچاتا ہے اور نافذ کرتا ہے اور اپنے بستی اور علاقے کے حالات سے امیر شریعت اور امارت کے ذمہ داروں کو باخبر کرتا ہے اور اہم معاملات میں ان سے رہنمائی حاصل کرتا ہے، بانی امارت شرعیہ نے خود بہت سے علاقوں کا دورہ کر کے یہ تنظیم قائم فرمائی۔

شعبہ تعلیم مذہبی وعصری:

تعلیم کی اہمیت ہر مذہب وملت اور ہر ملک اورسماج میں مسلم ہے؛لیکن اسلام میں اس کی اہمیت دوسرے مذاہب وادیان کے مقابلے میں زیادہ ہے،اس لیے کہ اس نے حصول علم کو ہر فرد وبشر کے لیے لازم قرار دیا ہے؛اس لیے امارت شرعیہ نے شروع سے تعلیم کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اوراس میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں،ایسے دیہی علاقے جو تعلیمی مراکز سے دور ہیں اور وہاں کے لوگ جہالت کی بنا پر غلط رسوم ورواج میں مبتلا ہیں اور غیر اسلامی تہذیب سے متاثر ہیں،ایسے مقامات کا سروے کرانے کے بعد امارت شرعیہ نے وہاں سینکڑوں مکاتب قائم کئے اورامارت شرعیہ میں تربیتی کیمپ منعقد کر کے تعلیم یافتہ افراد کی تربیت کی اورانہیں وہاں اساتذہ اور مدرس بحال کیا اورامارت شرعیہ کی طرف سے ان کی تنخواہ جاری کی،ایسے مکاتب جو پسماندہ علاقوں میں امارت شرعیہ کے فنڈ سے چل رہے ہیں،ان کی تعداد ہزار سے متجاوز ہے،بہت سے غریب اورنادار طلبہ کو جو مدارس میں زیر تعلیم ہیں،انہیں امارت شرعیہ کی طرف سے وظائف دیئے جاتے ہیں۔اسی طرح اعلیٰ عصری تعلیم کے لیے بھی امارت شرعیہ نے فنڈ قائم کیا ہے اوراس سے ایسے طلبہ کو وظائف دیئے جاتے ہیں، جو گھر کے لحاظ سے کمزور ہیں؛لیکن میڈیکل اور انجینئرنگ وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے آرزومند ہیں،بہت سے نوجوانوں نے امارت شرعیہ کے تعاون سے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی ہے اورآج وہ سماجی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

دینی ماحول میں عصری تعلیم مسلم معاشرے کی ایک اہم ضرورت ہے؛اس لیے سرکاری اسکولوں اورعصری تعلیم گاہوں میں دینیات اوراخلاقیات کی تعلیم عام طور پر نہیں ہوئی اور مسلمان بچے دین سے بے گانہ رہتے ہیں،اس لیے امارت شرعیہ کے ذمہ داروں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر ضلع میں ایسے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں،جن میں دین کی بنیادی تعلیم اوراخلاقی تربیت ہوتا کہ وہ بچے جہاں رہیں مسلمان بن کر زندگی گذاریں،اس طرح کا ایک اسکول عرصہ سے پھلواری شریف میں قاضی نورالحسن میموریل اسکول کے نام سے چل رہا ہے،امارت کے ذمہ داروں کا نشانہ یہ ہے کہ دیگر مقامات پر بھی اس طرح کے اسکول قائم کئے جائیں،تاکہ نئی نسل دین سے بہرہ ور ہو اورلڑکیوں کی تعلیم کے علاحدہ ادارے قائم ہوں اوران میں دینی تعلیم وتربیت کا معقول نظم ہو۔

شعبہ تحفظ مسلمین:

امارت شرعیہ کے بنیادی مقاصد میں مسلمانوں کی جان ومال اورعزت وآبرو کی حفاظت

اوران کے مذہبی حقوق، مساجد و مدارس اور اسلامی شعائر کا تحفظ بھی ہے اور اس نے اپنی سوسالہ تاریخ میں اس میدان میں اہم کارنامے انجام دیئے ہیں، مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کا نعرہ، بھارتیہ کرن کی آواز، دینی مدارس کو سرکاری تحویل میں لینے کا منصوبہ، یہ وہ خطرناک عزائم ہیں، جن سے مسلمانوں کے ملی وجود کو خطرہ لاحق ہے، اسی طرح قادیانیت، بہائیت اور شکیلیت کا فتنہ، شدھی سنگٹھن تحریک اور اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کی دوسری باطل تحریکوں کے سد باب کے لیے امارت شرعیہ کے ذمہ داروں نے ہمیشہ کوشش کی ہے، شریعت اسلامی اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ میں امارت شرعیہ کی کوشش لائق تحسین ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاسیس اور اس کی قیادت میں امارت شرعیہ کے ذمہ داروں کا اہم رول رہا ہے، امیر شریعت رابع، قاضی مجاہدالاسلام، مولانا سید نظام الدین اور موجودہ امیر شریعت اس کے صف اول کے قائدین میں ہیں اور اس پلیٹ فارم سے وہ شریعت کا دفاع کرتے رہے ہیں۔

شعبۂ نشرواشاعت:

یہ امارت شرعیہ کا بنیادی شعبہ ہے، جس کا مقصد مختلف زبانوں میں دینی موضوعات اور سیرت نبوی پر کتابوں اور رسائل کی اشاعت ہے، تا کہ ایک طرف غیر مسلموں میں اسلام کا تعارف ہو اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو دین کے سلسلے میں ضروری معلومات فراہم کرنا، غلط رسوم ورواج کو مٹانا اور مسلمانوں میں اسلامی اور اجتماعی شعور کو بیدار کرنا ہے۔

اسلام میں اتحاد واتفاق اور اجتماعی زندگی کی اہمیت، صالح معاشرہ، صحیح اسلامی عقائد، اسلامی اخلاق، سیرت نبوی، زکوٰۃ اور عشر کے احکام ومسائل، تلک جہیز اور شادی کی بری رسمیں، نظام قضاء کی اہمیت، اسلامی نظام قضاء کا طریق کار اور اس طرح کے دوسرے موضوعات پر کتابیں، مضامین، پوسٹر اور کتابچے ہزاروں کی تعداد میں اب تک شائع کئے جاچکے ہیں۔

زکوٰۃ وعشر کے مسئلے پر امارت شرعیہ کی شائع شدہ کتابوں نے اس فریضہ کو زندہ کیا اور مسلمان جو کم ازکم عشر کے احکام کو بالکل فراموش کر چکے تھے، اب پابندی سے عشر نکالنے کے عادی ہو چکے ہیں، اسی طرح ایک بڑی تعداد پابندی سے زکوٰۃ بھی ادا کر رہی ہے، خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں جب حکومت کی سختی کی وجہ سے زبان کھولنا مشکل ہورہا ہے تھا، حضرت امیر شریعت رابع رحمۃ اللہ علیہ نے خاندانی منصوبہ بندی نامی رسالہ لکھ کر اعلان حق کا جو فریضہ ادا کیا، وہ تاریخ میں یادگار رہے، جبری نس بندی کے خلاف یہ رسالہ بڑی تعداد میں دارالاشاعت امارت شرعیہ نے شائع کیا، اس رسالہ کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس نے پورے ملک میں فیملی پلاننگ اور نس

بندی کے مسئلہ پر قول فیصل کا کام کیا، اسی طرح مسلم پرسنل لا کے موضوع پر بھی دارالاشاعت سے متعدد رسالے شائع ہو چکے ہیں، اسی شعبہ سے امارت شرعیہ کا ترجمان ہفتہ وار نقیب پابندی سے شائع ہو رہا ہے، شروع میں یہ پندرہ روزہ جریدہ امارت کے نام سے نکلتا تھا، بعد میں انگریز حکومت کی طرف سے پابندی لگنے کی وجہ سے نقیب کے نام سے جاری ہوا، اس کے اداریے اور مضامین ملک بھر میں توجہ سے پڑھے جاتے ہیں، اس شعبہ سے شائع شدہ اہم کتابوں کی تعداد پچاس (۵۰) سے متجاوز ہے۔ اس شعبہ کے تحت تجارتی مکتبہ بھی ہے، جو اسلام کے تعارف اور دعوت اسلامی کے فروغ کے لیے دینی موضوعات پر کتابیں شائع کر کے فروخت کرتا ہے اور ملک کے دیگر ناشرین کی علمی و دینی کتابیں اس میں فروخت کے لیے رہتی ہیں، امارت شرعیہ کے وفود کے دوروں میں مختلف اجتماعات کے موقع پر مکتبہ کا بک اسٹال لگایا جاتا ہے، تاکہ لوگ اس مکتبہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

بیت المال:

بیت المال امارت شرعیہ کا بنیادی اور کلیدی شعبہ ہے، جس پر دیگر تمام شعبوں کی کارکردگی کا انحصار ہے، یہ دراصل اسلامی خزانہ ہے، جہاں مسلمانوں کی زکوٰۃ وصدقات اور عطیات کی رقم جمع ہو کر دینی وملی کاموں میں خرچ ہوتی ہے، یہاں سے یتیموں، مسکینوں، بیوگان اور دوسرے محتاجوں کو وظائف دیئے جاتے ہیں، دینی تعلیم حاصل کرنے والے نادار طلبہ کو ماہانہ وظائف دیئے جاتے ہیں، دور دراز دیہاتوں کے مکاتب کے معلمین کو تنخواہ دی جاتی ہے، اس کے علاوہ دین وملت کے مختلف کاموں میں بیت المال سے رقمیں خرچ کی جاتی ہیں۔ قدرتی آفات وحوادث، زلزلہ، سیلاب، طوفان، آتش زدگی، فرقہ وارانہ فسادات اور ہنگامی حالات میں متاثر افراد اور مصیبت زدہ لوگوں کی امداد واعانت بیت المال کے ذریعہ انجام پاتی ہے، ملک و بیرون ملک جہاں کہیں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو بیت المال کے ذریعہ ان کی ریلیف اور راحت رسانی کا کام انجام پاتا ہے۔

یہ آٹھ شعبے شروع سے کام کر رہے ہیں، وقت اور حالات کے لحاظ سے اس میں مزید شعبوں کا اضافہ ہوا ہے، مثلاً المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء، دارالعلوم الاسلامیہ رضا نگر پھلواری شریف، امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفئر ٹرسٹ جس کے تحت تو تکنیکی تعلیمی ادارے اور اسپتال و ہیلتھ سنٹر چلتے ہیں، وفاق المدارس الاسلامیہ، شعبہ امور مساجد وغیرہ۔

المعهد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء:

امارت شرعیہ نے اپنے قیام ہی کے دن سے فقہ اسلامی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، کیوں کہ

اس کے بنیادی شعبوں میں دار القضاء ہے جو مسلمانوں کے عائلی مقدمات کا فیصلہ شریعت کی روشنی میں کرتا ہے اور دوسرا اہم شعبہ دار الافتاء ہے، جو مسلمانوں کی طرف سے آنے والے فقہی سوالات کا کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیتا ہے، ان دونوں ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لیے فقہ اسلامی میں بصیرت اور مہارت کی ضرورت ہے؛ اس لیے امارت شرعیہ کو شروع سے بڑے بڑے علماء وفقہاء کی ایک خدمت حاصل رہی ہیں اور ابھی بھی ان خدمات کو انجام دینے کے لیے قضاۃ وارباب افتاء ایک جماعت کا کام کررہی ہے، قضاء کے اس نظام کو مزید وسعت دینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے نظام قضاء کو پورے ملک میں نافذ کرنے کا فیصلہ کیا، اس لیے یہ مسلم معاشرے میں قانون شریعت کی تنفیذ کی مؤثر عملی تدبیر ہے، چنانچہ بورڈ نے اپنے گیارہویں اجلاس منعقدہ جے پور میں قاضی شریعت حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی تجویز پر یہ فیصلہ کیا کہ ان تمام مرکزی شہروں اور علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد ہے، وہاں بورڈ کی نگرانی میں دار القضاء قائم کیا جائے، تاکہ مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ شریعت کی روشنی میں ہوسکے۔ ظاہر ہے کہ دار القضاء کے قیام کے لیے تربیت یافتہ قضاۃ کی ضرورت ہے، اس لیے بورڈ کے سابق صدر حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ نے قضاء کی تربیت کی ذمہ داری حضرت قاضی شریعت امارت شرعیہ کے سپرد فرمائی جو اس وقت اس فن کے ہندوستان میں سب سے بڑی اور معتبر شخصیت کے حامل تھے، پھر انھوں نے سابق امیر شریعت حضرت مولانا نظام الدین صاحب کے مشورہ سے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ اہم کام امارت شرعیہ کی نگرانی میں انجام دیا جائے، جس کے پاس قضا کا سو سالہ تجربہ ہے اور جو ہندوستان میں نظام قضاء کا سب سے بڑا مرکز ہے، چنانچہ المعہد العالی کے نام سے یہ مستقل ادارہ قائم ہوا اور اس کے لیے ایک وسیع رقبۂ زمین پر چار منزلہ بلڈنگ تعمیر ہوئی اور شوال ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۹۹۹ء سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا، ماہرین کے مشورہ سے اس کا دو سالہ نصاب مقرر کیا گیا، ہر سال شوال میں انٹرویو کے بعد مدارس کے نوجوان علماء وفضلا کا داخلہ ہوتا ہے، طلبہ کی مجموعی تعداد پچاس ہوتی ہے، انہیں قیام وطعام کی سہولت کے علاوہ ماہانہ وظائف بھی دیئے جاتے ہیں، علماء وماہر اساتذہ کی نگرانی میں فقہ کی متداول کتابوں کی تدریس کے ساتھ بنیادی مصادر ومراجع کا مطالعہ کرایا جاتا ہے، طلبہ فتویٰ نویسی کی مشق کرتے ہیں اور عصر حاضر کے اہم مسائل اور فقہی موضوعات پر اساتذہ کی نگرانی میں مقالات لکھتے ہیں اور قضاء کی عملی مشق کے لیے روزانہ دار القضاء میں حاضر ہوتے ہیں، جہاں روزانہ مقدمات کی سماعت اور فیصلے ہوتے ہیں اور وہ ابتدائی کارروائی سے لے کر فیصلے تک قضاء کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

المعہد العالی میں محاضرات اورتوسیعی خطبات کا بھی نظم ہے، تھوڑے تھوڑے عرصہ پر ملک وبیرون ملک سے شرعی علوم کے ماہرین خصوصا فقہ وفتاویٰ کے متخصصین کو منتخب موضوعات پر محاضرات کے لیے دعوت دی جاتی ہے اوراس کے لیے معہد کے فوقانی ہال میں ایک خوبصورت وسیع سیمینار ہال ہے، جس میں مختلف دینی وعصری موضوعات پر خطابات ومحاضرات ہوتے رہتے ہیں، اب تک اس معہد سے بیس سال کے عرصہ میں چارسو سے زائد علماء فارغ ہوئے ہیں اورملک ومختلف صوبوں میں قضاء وافتاء، تعلیم وتدریس اورامامت وخطابت کی خدمت انجام دے رہے ہیں، دوسال قبل ''قسم الدعوۃ'' کے نام سے ایک نئے شعبے کا آغاز ہوا ہے، جس کا ایک منتخب نصاب ہے، جس میں تفسیر، حدیث اورسیرت نبوی کے علاوہ اصول الدعوۃ کتاب پڑھائی جاتی ہے، کچھ کتابیں مطالعہ میں ہیں، اس کے علاوہ ہندی، انگریزی اور سنسکرت کی بھی تعلیم دی جاتی ہے، مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرایا جاتا ہے اورفیلڈ میں اتار کر غیرمسلم بھائیوں کے درمیان دعوت کی عملی مشق کرائی جاتی ہے، اس معہد کے سکریٹری مولانا عبدالباسط ندوی ہیں۔

دارالعلوم الاسلامیہ:

المعہد العالی کے قیام کے اگلے سال حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کی تحریک اورسعی جمیل کی بدولت شوال ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۸؍جنوری ۲۰۰۰ء کوامارت شرعیہ کی نگرانی میں ایک دینی مدرسہ کا آغاز دارالعلوم الاسلامیہ کے نام سے ہوا، جوامارت شرعیہ کی مرکزی عمارت سے آٹھ میل کے فاصلہ پر رضانگر گونپورہ پھلواری شریف پٹنہ میں واقع ہے، شروع میں یہ مدرسہ پھلواری شریف میں کرایہ کے مکان میں چلتا رہا، پھرایک صاحب خیر جناب احمد رضا خاں مرحوم نے پانچ بیگھہ زمین خرید کراس مدرسے کے لیے وقف کی، پھراس کی تعمیر کا کام مکمل ہوا تو ۱۸؍فروری ۲۰۰۶ء کواس بلڈنگ کا افتتاح ہوا، اس موقع پر دارالعلوم دیوبند اوردارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے اکابر علماء تشریف لائے اورجلسہ عام ہوا اوراب دورۂ حدیث تک وہاں تعلیم ہورہی ہے، ہوسٹل میں طلبہ کی تعداد تقریباً چارسو سے زائد ہے، اساتذہ پندرہ کے قریب ہیں، بجٹ تقریبا اسی لاکھ ہے، جوعوامی چندہ ہی سے پورا ہوتا ہے، المعہد العالی اوردارالعلوم الاسلامیہ کا مالی نظام امارت شرعیہ کے بیت المال سے علاحدہ ہے اوران دونوں اداروں کو چلانے کے لیے الگ الگ ٹرسٹ ہیں، نگرانی وسرپرستی امارت شرعیہ کی ہے اورامیر شریعت تمام ذیلی اداروں کے بھی ذمہ داراعلیٰ ہیں، اس دارالعلوم کے قیام وبناء میں مفتی جنید احمد قاسمی کی ناقابل فراموش خدمات رہی ہیں اسی لئے ان کواس ادارہ کا پہلا ناظم مقرر کیا گیا، اب اس کے سکریٹری (ناظم) جناب مولانا سہیل احمد ندوی ہیں۔

وفاق المدارس الاسلامیہ

اسلامی مدارس اس ملک میں دین کے مضبوط قلعے ہیں، جنھوں نے دینی علوم کی نشرواشاعت، اسلامی تہذیب وتمدن کی حفاظت اورنسل نو کی دینی تعلیم وتربیت کا عظیم الشان فریضہ انجام دیا ہے اورآج بھی قلت وسائل کے باوجوداور حکومت کے تعاون سے کنارہ کش ہوکر یہ اہم اورنازک فریضہ انجام دے رہے ہیں، یہ براہ راست مدارس ہی کا فیض ہے اوران ہی کی برکت ہے کہ آج اس ملک میں اسلام اپنی صحیح شکل وصورت میں محفوظ ہے، ورنہ شاید حکومت اسلامیہ کے سقوط کے بعد یہاں بھی اندلس اورسمرقند وبخاریٰ کی تاریخ دہرائی جاتی، دشمنان اسلام آج بھی مدارس اسلامیہ کی اہمیت کوسمجھ رہے ہیں، وہ ان کی نظر میں کانٹے کی طرف چبھ رہے ہیں اوروہ انہیں بے جا تنقید کا نشانہ بنارہے ہیں اورانہیں دہشت گردی کا اڈہ کہہ کران کے کردار کومسخ اوران کی شبیہ کو بگاڑنا چاہتے ہیں؛ لیکن اللہ کے فضل وکرم سے ان کے بے جا پروپیگنڈہ اورمعاندانہ سازشیں اب تک ناکام ہوتی رہی ہیں اوران شاءاللہ آئندہ بھی ناکام ہوں گی اورمدارس اپنا کام کرتے رہیں گے؛ لیکن اس دورانحطاط میں جہاں زندگی کے دیگر شعبے ہیں اورسرکاری اورعصری تعلیمی اداروں میں تعلیم وتربیت کے میدان میں جوانحطاط اور بگاڑ رونما ہوا، اس سے ہمارے یہ دینی مدارس بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے؛ لیکن ایک زندہ قوم کے لیے ضروری ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے تعلیم وتربیت کے نظام کا جائزہ لیتی رہے اوراس کی اصلاح اورسدھار کے لیے ٹھوس لائحہ عمل تیار کرتی رہے۔

مدارس کی اس اہمیت کی بنیاد پر امارت شرعیہ اوراس کے ذمہ داروں نے مدارس اسلامیہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی ہے، بانی امارت شرعیہ مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ نے اپنی حیات مبارکہ میں اس سلسلے میں کتنی کوشش کی اوران کے نظام کی اصلاح اورمعیار کو بلند کرنے کے لیے مدارس کے ذمہ داروں کے کتنے اجتماعات بلائے اوراس کے لیے کیا کیا تجاویز منظور فرمائی، ان کے شاگرد رشید امیر شریعت رابع رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے عہد مبارک میں ۱۹۷۷ء میں امارت شرعیہ کی طرف سے ایک بڑا کنونشن جامعہ رحمانی مونگیر میں منعقد کیا تھا،جس نے بہ اتفاق رائے مدارس اسلامیہ کونسل کے قیام کی تجویز منظور کی تھی؛ تاکہ یہ کونسل مستقل طور پر مدارس کی اصلاح وترقی اورتعلیم وتربیت کے نظام کوبہتر بنانے کے لیے کوشش کرتی رہے،اس کے بعد مونگیر میں اساتذہ کی تربیت کا پندرہ روزہ کیمپ دومرتبہ قائم ہوا، جناب ڈاکٹر سید حسن صاحب مرحوم سابق ڈائرکٹر انسان اسکول وکالج نے تربیت کے فرائض انجام دیئے تھے،جس کا خوشگوار اثر محسوس کیا

گیا تھا۔

پھر اسی ضرورت کے پیش نظر حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی نے امارت شرعیہ کے زیرنگرانی مئی ۱۹۹۶ء میں مدرسہ ضیاء العلوم رامپور سمستی پور میں مدارس اسلامیہ کانفرنس منعقد کی، جس میں مدارس کے دوسونمائندے شریک ہوئے، پھر اس کے بعد وفاق المدارس الاسلامیہ کا قیام عمل میں آیا جو مدارس کی اصلاح وترقی اوران کے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے اور معیار تعلیم کو بلند کرنے کے لیے سرگرم عمل ہے، مدارس کا سالانہ امتحان وفاق کی نگرانی میں ہوتا ہے، ہر سال اساتذہ مدارس کا تربیتی کیمپ کسی بڑے مدرسہ میں لگتا ہے، ڈھائی سو مدارس بہار کے اس وفاق سے ملحق ہیں، جن کی فہرست شائع ہوچکی ہے، اس وقت وفاق کے ناظم جناب مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی نائب ناظم امارت شرعیہ اور حضرت امیر شریعت مدظلہ اس کے سرپرست ہیں۔

امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفئر ٹرسٹ:

امارت شرعیہ کے قیام کا مقصد مسلم معاشرے پر شریعت کا نفاذ اوران کے دینی، ملی اور سیاسی حقوق کا تحفظ ہے اورانہیں دینی، تعلیمی اور معاشی میدان میں آگے بڑھانا ہے، اس صنعتی وسائنسی دور میں مسلمانوں کی گرتی ہوئی معاشی صورتحال کو دیکھتے ہوئے حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ، حضرت امیر شریعت خامس مولانا عبدالرحمٰن صاحب، حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحب، حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب امیر شریعت سادس نے مسلم اقلیت کے نوجوانوں کو اخلاقی اور دینی تربیت کے ساتھ عصری تعلیم سے آراستہ کرکے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا اور ۱۹۹۳ء میں امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفئر ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا، اب تک مختلف مقامات میں آئی ٹی آئی، پارامیڈیکل، کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ اوراسپتال قائم ہوچکے ہیں۔ ان اداروں میں سینکڑوں کی تعداد میں طلبہ فارغ ہوکر ہندوستان کے علاوہ ایشیا کے دوسرے ملکوں نیز افریقہ اورامریکہ وغیرہ میں برسرروزگار ہیں اورصرف ۲۰۰۴ء تا ۲۰۰۵ء کے درمیان فارغ شدہ لڑکوں میں سے ۵۱؍لڑکے دہلی میٹرو ریلوے میں روزگار پانے میں کامیاب ہوئے، بارسوئی کٹیہار، بہار شریف، گریڈیہہ وغیرہ میں تعمیراتی کام جاری ہے، کوشش یہ ہے کہ جہاں جہاں اس طرح کے ادارے قائم ہوں، وہاں مسجد اوراسپتال بھی قائم کیا جائے، علاوہ ازیں خدمت خلق کے لیے پھلواری شریف میں مولانا سجاد میموریل اسپتال اورسبزی باغ پٹنہ، جمشید پور جھارکھنڈ اوررا ورکیلا اڑیسہ میں امارت ہیلتھ سنٹر کا قیام عمل میں آیا ہے، اس ٹرسٹ کے تحت درج ذیل ٹکنیکل ادارے چل رہے ہیں۔

(۱) مولانا منت اللہ رحمانی ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ، ایف سی آئی روڈ پھلواری شریف پٹنہ (۲) مولانا منت اللہ رحمانی ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ (پارا میڈیکل) پھلواری شریف پٹنہ (۳) امارت انسٹی ٹیوٹ آف کمپیوٹر اینڈ الکٹرونکس پھلواری شریف پٹنہ (۴) ڈاکٹر عثمان غنی امارت گرلس کمپیوٹر سنٹر ہارون نگر پھلواری شریف پٹنہ (۵) امارت مجیبیہ ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ مہدولی دربھنگہ (۶) امارت ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ گلاب باغ پورنیہ (۷) امارت ٹکنیکل ٹریننگ سنٹر، راورکیلا اڑیسہ (۸) ریاض انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر ساٹھی مغربی چمپارن۔

مولانا سجاد میموریل اسپتال:

اسلامی تعلیمات میں خدمت خلق کو خاص اہمیت حاصل ہے، وہ بیک وقت قرب الٰہی کا ذریعہ بھی ہے اور لوگوں کے دل و دماغ کو فتح کرنے کا وسیلہ بھی، اس لیے امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفئر ٹرسٹ نے پھلواری شریف میں جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے اور اکثر مسلمان خط افلاس سے نیچے زندگی گذار رہے ہیں، بانی امارت شرعیہ حضرت مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار کے طور پر مولانا سجاد میموریل اسپتال قائم کیا، جس کا افتتاح ۲۲؍شعبان ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۰؍اپریل ۱۹۸۸ء کو ہوا، یہ اسپتال امارت شرعیہ کے احاطہ میں واقع ہے، وقت کی اہم ضرورت اور خدمت خلق کا بہترین ذریعہ ہے، جس سے بلا تفریق مذہب وملت سبھی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، روزانہ سینکڑوں غریب مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور جو دوا اسپتال میں فراہم ہے، مریضوں کے درمیان مفت تقسیم کی جاتی ہے۔

شروع میں صرف آؤٹ ڈور کا انتظام تھا، رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوئی اور دوسرے شعبے بھی کھلے، خواتین کو نسوانی امراض خصوص ولادت میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس لیے کہ جنرل اسپتالوں میں پردہ کا اہتمام نہیں ہوتا؛ اس لیے خواتین کے علاج کے لیے مزید دو شعبے کھولے گئے، ولادت کے شعبہ کا ۲۰؍اکتوبر ۱۹۹۱ء میں افتتاح ہوا اور اس کے لیے لیڈی ڈاکٹر اور نرسوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔

اسی طرح خون پیشاب کی جانچ کے لیے اسی تاریخ میں خاص شعبہ کھولا گیا اور اسے مشینوں اور نئے آلات سے آراستہ کیا گیا اور ماہر ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کی گئی۔ امراض قلب کا علاج کافی مہنگا ہوتا ہے، جو غریب مریضوں کی استطاعت سے باہر ہوتا ہے، ۹؍دسمبر ۱۹۹۲ء میں امراض قلب کے علاج کا شعبہ کھولا گیا اور اس کے لیے ماہر ڈاکٹر بحال کئے گئے اور غریب مریضوں کے لیے آسانی فراہم کی گئی۔ آنکھ کے شعبہ کا افتتاح ۱۹؍اکتوبر ۱۹۹۲ء میں

ہوا، اس میں ہفتہ میں چار دن بدھ جمعرات سنیچر اور اتوار کو علاج کا نظم ہے اور دو ڈاکٹر اس میں کام کرتے ہیں۔ موتیابند کے آپریشن کے لیے جاڑے کے زمانے میں کیمپ لگائے جاتے ہیں، جس میں مریضوں کا مفت آپریشن ہوتا ہے اور چشمہ اور کمبل مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ہڈی کے علاج کے لیے ہفتہ میں ایک دن اتوار کو ڈاکٹر کی خدمت حاصل کی گئی ہے۔ اکسرے اور الٹراساؤنڈ کی سہولت بھی عرصہ سے حاصل ہے۔ امارت شرعیہ کے ذمہ داروں کا ارادہ ہے کہ مستقبل قریب میں آپریشن اور دوسرے امراض کا علاج کرنے لیے بھی مستقل شعبے کھولے جائیں۔ بہرحال تیس (۳۰) برسوں سے یہ اسپتال غریب، نادار اور لاچار مریضوں کو علاج کی سہولت فراہم کررہا ہے اور اس کا دروازہ بلالحاظ مذہب وملت سب کے لیے کھلا رہتا ہے، اس کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

دینی وملی فریضہ سمجھ کر محض انسانیت کی بنیاد پر خدمت خلق، کم خرچ اور صحیح علاج، مریضوں کے ساتھ محبت وہمدردی کا برتاؤ، بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ کے مختلف مقامات پر موبائل میڈیکل سروس کے ذریعہ مریضوں کا مفت علاج، غریب ونادار مریضوں کے موتیابند کا مفت آپریشن۔

شعبہ امور مساجد:

مساجد کی اہمیت مسلم سماج میں مسلم ہے، یہ وہ مرکزی کیل ہے جس کے گرد اسلامی زندگی کی چکی گھومتی ہے، ضرورت ہے کہ مسلم معاشرے میں مسجد کی مرکزیت بحال کی جائے، عہد رسالت میں مسجد عبادت وریاضت، تعلیم وتربیت، تبلیغ ودعوت، خدمت خلق، افتاء وقضاء اور دیگر تمام دینی وثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھی، خلافت راشدہ کے زمانے میں، تابعین وتبع تابعین کے دور میں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، بعد کے ادوار میں جب دین سے دوری بڑھتی گئی تو مسجد کی وہ مرکزیت بھی باقی نہیں رہی، معاشرہ کی اصلاح میں مسجد کا بڑا اہم رول ہے، اس لیے ضروری ہے کہ مسجد کی طرف بھی خاص توجہ دی جائے، اس سلسلے میں امارت شرعیہ کے ذمہ داروں نے ائمہ مساجد کا تربیتی کیمپ پھلواری شریف میں لگایا اور بہار کے ائمہ وخطباء اور مؤذنین کو جمع کیا گیا، حضرت قاضی شریعت مولانا مجاہدالاسلام قاسمی اور حضرت امیر شریعت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ نے ائمہ سے خصوصی خطاب فرمایا اور انہیں ان کی اہم اور نازک ذمہ داری کا احساس دلایا، جس کے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے اور شرکائے کیمپ نے بہت فائدہ محسوس کیا، ان کا تاثر تھا کہ اس طرح کے کیمپ امارت شرعیہ کی نگرانی میں وقتاً فوقتاً لگتے رہنا چاہیے؛ تاکہ ائمہ وخطباء کی تربیت ہو اور ان کے ذریعہ مساجد کی فعالیت وحرکیت کو بحال کیا جائے۔ موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا محمد ولی رحمانی مدظلہ

العالی سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس جانب خصوصی توجہ مبذول فرمائی ہے اور ایک باصلاحیت عالم دین کو جنہیں اس لائن کا اچھا تجربہ تھا، اس شعبے میں بحال فرمایا ہے، جو ائمہ کرام سے مستقل طور پر رابطے میں رہتے ہیں اور مختلف مقامات پر اس طرح کا کیمپ لگتا ہے، اب تک مختلف مقامات پر ۴۰؍سے زائد کیمپ لگائے جا چکے ہیں، ائمہ وخطباء کی رہنمائی کے لیے متعدد کتابیں اور رسالے شائع کئے گئے ہیں، وقتاً فوقتاً ضروری پمفلٹ اور رسائل انہیں فراہم کئے جاتے ہیں، اسی طرح امارت شرعیہ کے ہفتہ وار نقیب میں دینی موضوعات اور حالات حاضرہ سے متعلق اہم مضامین شائع ہوتے ہیں، اس کا ایک مخصوص کالم اللہ کی باتیں اور رسول کی باتیں ہے، جس میں قرآنی آیات کی تفسیر اور احادیث کی تشریح ہوا کرتی ہے، بہت سے ائمہ وخطباء اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور اسے اپنی تقریر کا موضوع بناتے ہیں، بعض مساجد میں نقیب کا یہ کالم پڑھ کر سنایا جاتا ہے، امارت کے ذمہ دار حضرات چاہتے ہیں کہ ائمہ، خطباء اور مؤذنین کی تربیت کے کام کو منظم طور پر انجام دیا جائے؛ تاکہ مساجد کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کا پورے طور پر کام انجام پا سکے۔ **والحمد للہ اولا و آخرا.**

مصادر ومراجع

(۱) حیات سجاد، ص:۴۲

(۲) حضرت امیر شریعت نقوش وتاثرات، ص:۱۵

(۳) حوالہ سابق، ص:۳۱-۳۲

(۴) حوالہ سابق، ص:۳۷

(۵) نقیب، سجاد نمبر، ص:۱۹

(۶-۷) حیات سجاد، ص:۵۷

(۸) امارت شرعیہ دینی جد وجہد کا روشن باب، ص:۲۲-۲۳

(۹) حیات سجاد، ص:۳۶

(۱۰) حیات سجاد، ص:۱۳۴-۱۳۵

(۱۱) حوالہ سابق، ص:۳۲-۳۳

(۱۲) حوالہ سابق، ص:۳۵

(۱۳) قانونی مسودے، ص:۶، ۷

(۱۴) تاریخ امارت، ص:۵۴، ۵۵

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد

امارت اور جمعیۃ کی تاسیس کا پس منظر

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی
چیرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نور اللہ مرقدہ کو میں نے نہیں دیکھا ہے، میری گنہ گار آنکھیں ان کو دیکھنے کے شرف سے محروم رہی ہیں لیکن میں نے ان کی عبقری شخصیت کے بارے میں ان کے معاصرین واقران کی نگارشات وتحریریں پڑھی ہیں، ان کی تڑپ و بے چینی اور فکری تخیل و پرواز کا ہلکا سا اندازہ ان کے دیکھنے والوں اور ان کے صحبت نشینوں کے بیانات و تاثرات سے لگایا ہے اور ان کے کیے ہوئے متنوع کاموں اور قائم کیے ہوئے اداروں اور موسسات کا بھی سرسری جائزہ لیا ہے، جس کی بنیاد پر میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اس مرد مجاہد اور مرد حق آگاہ کی پوری زندگی دو اساسی کاموں کے لئے وقف رہی ہے۔ ایک برطانوی ہندوستان اور آزادی وطن کے بعد آزاد ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہوگی اور ایسے ملک میں اسلامی احکام و قوانین شریعت کے نفاذ واجرا اور احیائے دین کی کیا صورت رہے گی اور دوسرا مسئلہ یہ تھا جہاں مسلمان عددی اعتبار سے اقلیت میں ہوں اور غیر مسلم اکثریت میں ہوں تو وہاں مسلمانوں کے ملی تشخص و بقاء کی کیا شکل ہوگی، یہ وہ سلگتے ہوئے سوالات اور عصری چیلنجز تھے جو مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو زندگی بھر بے قرار کیے رہتے تھے اور وہ دراصل ہندوستان میں مسلمانوں کی آبرومندانہ زندگی کے آرزومند تھے اور ان کے جانی و مالی حقوق کے تحفظ و بقا کے لئے کوشاں رہتے تھے ورنہ انھیں ذاتی طور پر نہ کسی قسم کی دولت کی لالچ تھی اور نہ اپنی اولاد کی فکر تھی اور نہ خود اپنی صحت و راحت کا خیال تھا، وہ تو صحابی رسول حضرت ابوذر غفاریؓ کی طرح زہد وقناعت کا مجسمہ اور دنیا و مافیہا سے کلی طور پر بے نیاز و مستغنی تھے۔

اس واقعہ کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا، اتفاق سے ایک دفعہ بہار شریف کے ایک دینی جلسہ میں جانے کا اتفاق ہوا، جب میری تقریر ختم ہوگئی تو میرے ایک رفیق سفر نے کہا کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کا گاؤں ’’پنہسّا‘‘ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے، اچھا موقع ہے

اس کو دیکھ لیجیے مجھے بھی مولانا کی یہ تجویز اچھی لگی چونکہ اس علاقہ کا میرا یہ پہلا سفر تھا، انھوں نے مجھے اپنی گاڑی سے بھیجوا دیا، ان کا ڈرائیور نالندہ کے علاقوں سے خوب واقف تھا وہ مجھے نالندہ بھی لے گیا جہاں بودھسٹوں کی قدیم یونیورسٹی کے آثار وکھنڈرات موجود ہیں، مجھے ان تمام تاریخی چیزوں کو دکھالایا، اس کے بعد مولانا سجاد صاحب کے گاؤں پنہسّا بھی لے گیا، جو بہار شریف سے راجگیر جانے والی شاہ راہ کے کنارے واقع ہے، ڈرائیور نے مجھے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کے آبائی مکان کو دکھلایا، جو اتفاق سے اس وقت بند تھا لیکن اچھا خاصا بڑا معلوم ہوتا تھا، اس کے بعد ہم لوگ گاؤں کی مسجد میں گئے، وہاں ظہر کی نماز پڑھی، وہاں معلوم ہوا کہ اسی مسجد کے صحن میں مولانا ابوالمحاسن سجاد کے بڑے بھائی احمد سجاد مرحوم بھی مدفون ہیں جو اخیر عمر میں مجذوبانہ حالت میں راج گیر کی پہاڑیوں میں چلے گئے تھے، ان کی قبر پر فاتحہ پڑھا جب ہم لوگ مسجد سے لوٹ رہے تھے تو مجھے کچھ مقامی لوگ ملے جنہوں نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے تذکرہ کے دوران راج گیر شاہ راہ کے کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ مولانا ابوالمحاسن کی کاشت کاری کی زمین تھی جو مال گزاری ادا نہ ہونے کی وجہ سے نیلام ہوگئی تھی، مجھے یہ خبر شروع میں عجیب اور مبالغہ آمیز لگی۔

جب میں نے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا، واقعی مولانا ابوالمحاسن صاحب کی ۲۴ بھیگہ زمین تھی جو وقت پر مال گزاری ادا نہ کرنے کی وجہ سے نیلام ہوگئی تھی اور اس وقت ابوالمحاسن محمد سجاد چمپارن میں زلزلہ کے مظلومین ومنکوبین کی امداد میں مصروف تھے۔ مزید برآں دوسری طرف جواں عمر مولوی حسن سجاد جو تازہ تازہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کے گھر آئے تھے، ایک مشہور بزرگ کے رفیق درس بھی تھے، سخت بیمار ہوئے، گھر سے بار بار تار پر تار آ رہا تھا، آپ جواب دے رہے تھے اور ٹال رہے تھے، آخر میں اپنے رفیق سفر سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کے اصرار پر گھر گئے۔ اپنے بچہ کو دیکھا، وہ بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا، بچہ یہ بھی نہ دیکھا سکا کہ غمزدہ باپ سامنے کھڑا ہے، صبح میں تجہیز وتدفین ہوئی، بمشکل تمام دو تین روز ٹھہرے رہے۔ تیسرے روز یہ کہتے ہوئے پھر بتیا لوٹ گیے کہ تعزیت کی سنت صرف تین روز ہے، ان دنوں مولانا، بہار میں خاص طور پر بتیا کے علاقے میں آئے ہوئے شدید زلزلہ کے متأثرین کی امداد میں مصروف تھے۔

خود مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب آخر میں چمپارن کا دورہ کر رہے تھے دوران دورہ اچانک نمونیا میں مبتلا ہو گئے، اور چند روز بخار میں مبتلا رہے بالآخر اسی نمونیا میں آپ کا انتقال ہو گیا، آپ کے انتقال کے بعد جے پرکاش نرائن یا انوگرہ مصر تعزیت کے لیے آئے تھے اور بڑے افسوس کے ساتھ کہا مولانا سجاد نمونیا میں انتقال کر گئے اور ہم انھیں نمونیا سے بھی بچا نہ سکے۔

ایک دفعہ میں نے مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم سے ان کی محسن شخصیت کے بارے میں دریافت کیا تھا تو آپ نے اس کے جواب میں ایک خط تحریر فرمایا تھا، جس کا عکس تحریر میری کتاب ''امیر شریعت نقوش وتاثرات'' میں درج ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے خود اپنے دست مبارک سے یہ خط تحریر کیا تھا ورنہ آپ عموماً املا کرایا کرتے تھے۔

عزیز مکرم مولانا عطاء الرحمٰن صاحب سلمہ اللہ

خدا آپ کو علم ظاہر و باطن سے سرفراز کرے۔ آپ نے میری زندگی کے عظیم محسن کے متعلق دریافت کیا ہے۔ میرے سب سے بڑے محسن حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ تھے۔ مولانا فقیہ النفس تھے، اصول پر بڑی گہری نظر تھی، آیات واحادیث سے بے تکلف استنباط مسائل کرتے تھے، اور میں نے ایسا تربیت دینے والا بھی نہیں دیکھا، میں پندرہ سولہ سال ان کی خدمت اور تربیت میں رہا، میں نے ایسا شفیق مربی نہیں دیکھا، حق تعالی ان کے مراتب بلند فرمائے۔

منت اللہ رحمانی

۲۹ مارچ ۱۹۸۶

آمدم بہ سر مطلب، جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس وبنا ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ کو خلافت کمیٹی کانفرنس دہلی کے موقع پر درگاہ سید رسول نما پچکوئیا روڈ نئی دہلی میں مختلف مکاتب ومسالک فکر کے علماء کی موجود گی میں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں عمل میں آئی تھی۔ جس کا نام باتفاق آراء، جمعیۃ علماء ہند رکھا گیا۔ اسی موقع پر حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرت سری کی تحریک پر حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ کو جمعیۃ علماء ہند کا عارضی صدر اور حضرت مولانا سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب کو ناظم منتخب کیا گیا۔ اور جمعیۃ کے دستور العمل کو مرتب کرنے کی ذمہ داری مولانا محمد اکرم خاں اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کے سپرد کی گئی تھی۔ اور آئندہ دسمبر میں منعقد ہونے والے اجلاس جمعیت علماء ہند امرتسر میں پیش کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔

مشہور مورخ سید طفیل احمد منگلوری علیگ نے اپنی کتاب'' مسلمانوں کا روشن مستقبل ''میں جمعیۃ علماء ہند کے قیام کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اس جماعت کی بنیاد اس وقت قائم ہوئی جب کہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ کو خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس دہلی میں منعقد ہو رہا تھا اس میں جشن صلح میں شرکت کے خلاف ایک فتوی مرتب کیا گیا جس پر علماء کرام کے دستخط ہوئے۔ اسی وقت ایک جلسہ شوریٰ

(عکس تحریر)

منت اللہ رحمانی
امیر شریعت بہار واڑیسہ

خانقاہ رحمانی مونگیر
۹ مارچ ۸۶ء

۷۹۶

عزیز مکرم مولانا عطاء الرحمن صاحب سلمہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خدا آپ کو علم نافع وعلم باطن سے سرفراز کرے،
آپ نے میری زندگی کے عظیم محسن کے متعلق دریافت کیا ہے،
سب سے بڑے محسن حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد
علیہ الرحمۃ تھے۔ مولانا فقیہ النفس تھے، اصول پر بڑی
گہری نظر تھی، آیات واحادیث سے بے تکلف استنباط
مسائل کرتے۔ اور میں نے ان سا تربیت دینے والا نہیں
دیکھا میں تقریباً سولہ سال ان کی خدمت اور تربیت
میں رہا۔ میں نے ان سا شفیق مربی نہیں دیکھا، حق تعالیٰ
ان کے مراتب بلند فرمائے،

والسلام
منت اللہ

منعقد کیا گیا جس میں طے ہوا کہ صرف مشترکہ مذہبی وسیاسی امور میں علمائے کرام عامۂ اہل اسلام کی راہنمائی کا فرض ادا کیا کریں اور حاضرین کے اتفاق رائے سے قرار پایا کہ ''جمعیۃ العلماء ہند'' قائم کی جائے اور اس کا آئندہ اجلاس مسلم لیگ کے ساتھ امرتسر میں منعقد ہوا۔ جمعیۃ کے مستقل صدر مفتی کفایت اللہ اور ناظم مولانا احمد سعید قرار پائے۔'' (ص ۵۰۹ مسلمانوں کا روشن مستقبل)

اس مشاورتی اجتماع میں جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے شائع کردہ رپورٹ بہ عنوان ''مختصر حالات انعقاد جمعیۃ علمائے ہند مقام دہلی'' کے مطابق ۲۵ علماء شریک ہوئے تھے، اس وقت کے سیاسی حالات کے پیش نظر مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے صبح کو بعد نماز فجر درگاہ رسول نما میں موجود علماء سے راز داری اور وفاداری کا حلف بھی لیا تھا، اور ان علماء کرام نے اپنے عزم وارادہ کا اظہار واعلان بھی کیا تھا، جس کے مندرجہ ذیل حلفی الفاظ تھے۔

''ہم سب دہلی کے مشہور ومقدس بزرگ کے مزار کے سامنے اللہ کو حاضر وناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ مشترک قومی دہلی مسائل میں ہم سب آپس میں متحد ومتفق رہیں گے اور فروعی واختلافی مسائل کی وجہ سے اپنے درمیان کوئی اختلاف پیدا نہیں ہونے دیں گے۔ نیز قومی وملکی جدوجہد کے سلسلے میں گورنمنٹ کی طرف سے ہم پر جو سختی اور تشدد ہوگا اس کو صبر ورضا کے ساتھ برداشت کریں گے۔ اور ثابت قدم رہیں گے۔ جماعت کے معاملات میں پوری رازداری وامانت سے کام لیں گے۔'' (ص ۵۲ جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ)

مشہور مورخ اور ادیب محمد اسحٰق بھٹی نے اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں لکھا ہے۔

''دہلی کے اس اجتماع علماء میں جس میں جمعیت علمائے ہند کا ڈھانچہ تیار ہوا تھا، بہت سے علمائے کرام شریک تھے، جن میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سلامت اللہ جیراجپوری، مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا محمد اکرام خاں، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا آزاد سبحانی قابل ذکر ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر احمد عثمانی اس اجتماع میں شریک نہیں تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمود حسن اور مولانا مدنی ان دنوں نظر بند تھے اور مولانا شبیر احمد عثمانی کسی اور وجہ سے شامل

اجلاس نہیں ہو سکے تھے۔(ص۲۷ابزم ارجمنداں)

محمد اسحٰق بھٹی ایک محقق عالم اور دیانت دار صاحب قلم ہیں، انھوں نےجمعیۃ علماء ہند کے ابتدائی قیام میں شریک بعض قابل ذکر علماء کا ذکر ضرور کیا ہے۔لیکن اس تاسیسی اجلاس جمعیۃ دہلی میں شریک بعض اہم علماء کا نام ان کے قلم سے غیر شعوری طور پر رہ گیا ہے، ان میں ایک اہم نام ابوالمحاسن محمد سجاد بانی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا ہے جو۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو قیام جمعیۃ علماء ہند میں شریک ہوئے تھے، جیسا کہ سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی اول ناظم عمومی نے مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد مرحوم سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا مرحوم سے سب سے پہلی ملاقات جہاں تک مجھے یاد ہے، خلافت کانفرنس میں ہوئی یہ خلافت کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔اسی خلافت کانفرنس میں بعض اہل علم نے یہ مشورہ کیا کہ ہندوستان کے علماء کی تنظیم ہونی چاہیے، چنانچہ علماء کی ایک مختصر اور مخصوص جماعت کا خفیہ اجتماع دہلی کے مشہور بزرگ سید حسن رسول نما رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ پر منعقد ہوا۔اس میں تمام حضرات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے بھی اس جلسہ میں ایک مختصر تقریر فرمائی تھی۔اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا کے جذبات ایمان کا ترجمان تھا، حاضرین کی تعداد اگر چہ دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی، لیکن کوئی آنکھ اور کوئی دل ایسا نہ تھا جس نے اثر قبول نہ کیا ہو۔''(ص۹۰ حیات سجاد)

بلا شبہ جمعیۃ علماء ہند کا قیام درگاہ رسول نما میں ہوا تھا، لیکن اس کے بانی اور مؤسس کے حوالے سے مختلف نقطہائے نظر اور زاویہائے نگاہ رہے ہیں، کسی نے حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ کو بانی قرار دیا (جن کا پایہ جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ میں بلند ہی نہیں بہت بلند ہے)۔کسی نے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو فاونڈر کہہ دیا (جن کا مرتبہ غیر منقسم ہندوستان کی ملی قیادت و سیادت میں کچھ کم نہیں ہے) کسی نے حضرت مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری کو مؤسس لکھ دیا (جو اہل حدیث مکتبہ فکر کے سرکردہ عالم دین اور ترجمان مسلک تھے)۔کسی نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کو بانی اعظم تک رقم کر دیا (جن کے ابتدائی تخیل و ذہنی خاکہ کے پیش نظر یہ کہنے میں آدمی حق بہ جانب بھی ہوسکتا ہے)،**للہ فیما یشقون مذاھب.**

لیکن میری رائے میں جمعیت علماء ہند کی تاسیس و بنا میں کسی ایک بزرگ کو بانی و موسس قرار دینے کے بجائے علماء اربعہ یعنی مولانا مفتی محمد کفایت اللہ، مولانا عبدالباری، مولانا ثناء اللہ،

اور مولانا سید محمد سجاد۔ کو قرار دینا، زیادہ قرین قیاس اور عدل وانصاف کے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے چونکہ یہ چاروں حضرات جمعیۃ کی تاسیس وتعمیر میں کسی نہ کسی جہت سے نمایاں رہے ہیں۔ اور ان حضرات کا مشترکہ خیال تھا کہ علماء ہند کی تنظیم ہونی چاہیے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد تو شروع ہی سے علماء کی جمعیۃ اور تنظیم کے قیام کے لیے کوشاں اور فکر مند تھے اور اپنی استطاعت کے مطابق اس سلسلہ میں کام بھی کر رہے تھے چنانچہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے نہ صرف ۱۹۱۷ ہی میں ''انجمن'' علماء بہار قائم کی تھی جس کے سالانہ اجلاس میں حضرت شیخ الہند کی رہائی کی تجویز منظور کروائی تھی اوران کی رہائی کا پرزور مطالبہ کیا تھا بلکہ ملک گیر سطح پر جمعیت علماء ہند کی تاسیس کے لیے ماحول سازگار بنانے کے لیے مختلف مکاتب فکر کے معاصر علماء ومشائخ بالخصوص مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے رابطہ بھی قائم کیا تھا اوران سے خط و کتابت بھی کی تھی اوران کی خدمت میں اپنا نمائندہ بھی بھیجا تھا، جس کا ذکر شاہ محمد عثمانیؒ نے بھی اپنی کتاب میں کچھ اس طرح کیا ہے:

''جمعیۃ علماء بہار کے قیام کے بعد مولانا سجادؒ نے قاضی احمد حسین صاحب سے کہا جو کسی غرض سے لکھنو جانے والے تھے کہ وہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے مل کر تبادلہ خیال کریں اور جمعیۃ علماء ہند کے قیام پر زور دیں کیونکہ جب تک وہ تیار نہیں ہوتے ہیں جمعیۃ علماء ہند کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ مولانا نے کہا کہ انھوں نے مولانا عبدالباری صاحب کو ایک خط بھی لکھا ہے۔ قاضی صاحب لکھنو سے واپس ہوئے تو انھوں نے مولانا کو رپورٹ دی کہ مولانا فرنگی محلی خود جمعیۃ علماء کے قیام کے لئے بے چین ہیں لیکن ان کو تردد یہ ہے کہ وہ تمام علماء ہند کو جمع نہیں کرسکیں گے۔ قاضی صاحب نے اپنی اس گفتگو کو دہرایا جو انھوں نے مولانا فرنگی محلی کے سامنے کی تھی۔ قاضی صاحب نے ان سے کہا تھا کہ تمام علماء کس مسئلہ پر جمع ہوئے ہیں؟ اگر سب جمع ہی ہوتے تو حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی فرقے کیوں بنتے۔ شیعہ سنی محاذ کیوں کھلتے۔ بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث کی صفیں کیوں بنتیں۔ ابتدائے تاریخ اسلام سے اختلافات تو ہوتے ہی رہے ہیں اور مکمل اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ اگر اختلافات کو بنیاد بنا کر کچھ نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو مسلمان کا کوئی کام ہو ہی گا نہیں اور نہ سابق میں کبھی ہوتا۔ اس کا حل تو یہی ہے کہ جتنے لوگ ساتھ دے سکیں ان کو ساتھ لیا جائے، قاضی صاحب کی اس گفتگو سے

مولانا عبدالباری بالکل مطمئن ہو گئے تھے۔(حسن حیات ص ۴۶)

جب مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی آمادگی کی اطلاع ملی تو دفتر انجمن علماء بہار، گیا سے

ایک خط مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو مورخہ ۵ جمادی اول ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں لکھا، اور انہیں اس کے داعی کی فہرست میں اپنا نام شامل کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی اور جلسہ دہلی کے بجائے لکھنو میں کرنے کا مشورہ دیا تھا تاکہ علماء بنگالہ کو بھی سہولت ہو، لیکن جمعیۃ علماء ہند کا قیام دہلی میں عمل میں آیا اور اس موقع پر دہلی میں جو نمائندہ اجتماع بلایا گیا تھا، کسی مصلحت سے اس کے لیے کوئی تحریری دعوت نامہ جاری نہیں کیا گیا تھا اور بالکل خفیہ میٹنگ تھی۔ جیسا کہ مولانا احمد سعید صاحب دہلوی نے واصف صاحب کے استفسار پر اس کی وضاحت بھی کی ہے۔

> ''مفتی صاحب (مفتی محمد کفایت اللہ) نے مجھے اور مولانا عبدالباری نے مولانا آزاد سبحانی کو حکم دیا کہ تمام علماء سے مل کر چپکے چپکے ایک مشاورتی جلسے کی دعوت دے آئیں، چنانچہ اکثر تو میں اور مولانا آزاد سبحانی ساتھ ساتھ جا کر بات چیت کرتے تھے۔کوئی تحریری دعوت نامہ نہیں تھا۔'' (ص ۵۱ جمعیۃ علماء ہند پر ایک تاریخی تبصرہ)

جمعیت علماء ہند کے قیام کے بعد مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تحریک پر پہلا باضابطہ اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ کو امرتسر میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں ہوا تھا، جس میں جمعیۃ علماء ہند کا دستور اساسی منظور ہوا تھا، اس کے علاوہ خصوصیت سے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا تھا، جو ان دنوں مالٹا میں نظر بند تھے۔ جمعیۃ کی مجلس عاملہ کے لیے بہار سے مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کا نام منظور کیا گیا تھا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی تین برس دو مہینہ مالٹا میں اسیر رہنے کے بعد جب ۸ جون ۱۹۲۰ کو عروس البلاد بمبئی کے ساحل پر اترے تھے۔ جب آپ کو بتایا گیا کہ علماء نے بھی جمعیۃ علماء ہند کے نام سے اپنی ایک تنظیم قائم کی ہے تو آپ نے بے انتہا مسرت اور قلبی توجہ وشغف کا اظہار فرمایا اور ارکان جمعیت کی تحسین اور حوصلہ افزائی فرمائی۔(ص ۴۸ جمعیت علماء پر ایک تاریخی تبصرہ)

بندرگاہ پر حضرت شیخ الہندؒ کا شاندار استقبال کیا گیا۔ آپ کے استقبال کرنے والوں میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد مرحوم، مولانا مرتضی حسن چاند پوری حکیم محمد حسن (برادر خورد شیخ الہند) حکیم عبدالرزاق انصاری، نواب محی الدین خاں مرادآبادی، قاضی بھوپال، مفتی کفایت اللہ، ڈاکٹر مختار انصاری، حاجی احمد مرزا فوٹوگرافر، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا شوکت علی اور مہاتما

گاندھی وغیرہ تھے۔ (سیاسی ڈائری ص۱۲۴)

آپ وہاں سے بعض مشتبہ کردار لوگوں کے مشورہ کے برخلاف، سیدھے خلافت ہاؤس گیے، وہاں بھی آپ کا شاندار استقبال کیا گیا اور وہیں آپ کو شیخ الہندؒ کا خطاب دیا گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن اس وقت جزیرۂ مالٹا کی قید و بند سے آزاد ہوکر ہندوستان ضرور آ چکے تھے لیکن آپ کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی اور آپ پر طویل علالت اور ضعف و نقاہت کے آثار و مظاہر نمایاں تھے۔ اس کے باوجود قومی و ملی مشاغل کا انہماک و اشتغال نے آپ کو ماہی بے آب بنا رکھا تھا اور چین نہ لینے دےتا تھا، آپ اکتوبر ۱۹۲۰ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے لئے علی گڑھ، ڈولی میں سوار ہو کر جلسہ گاہ تک تشریف لے گیے تھے اور لیٹے لیٹے سنگ بنیاد رکھا تھا اور آپ کا خطبۂ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا تھا۔ جس میں آپ نے فرمایا تھا۔

''اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں)، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں، تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا''۔ (ص۵۰ خطبۂ صدارت اجلاس تاسیسی جامعہ ملیہ اسلامیہ منعقدہ علی گڑھ)

حضرت شیخ الہندؒ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سنگ بنیاد کے بعد علی گڑھ سے سیدھے دہلی آئے اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوٹھی دریا گنج میں ٹھہرے اور ان کا علاج معالجہ ہونے لگا، اسی دوران جمعیۃ علماء ہند کے بعض ذمہ داران اور آپ کے بعض تلامذہ نے آپ سے اس دوسرے اجلاس جمعیۃ علماء ہند کی صدارت کی درخواست کی تو آپ نے شدید علالت اور غیر معمولی ضعف و نقاہت کے باوجود محض اجتماعیت کے قیام اور ملت کی شیرازہ بندی اور عزیزوں کی دل جوئی کی خاطر منظوری عنایت فرمائی، چنانچہ ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ کو جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا شاندار اجلاس، آپ کی صدارت میں نور گنج دہلی یعنی پل بنگش اور بڑا ہندو راؤ کے درمیان ہوا۔ جس میں ملک بھر سے پانچ سو (۵۰۰) علماء شریک ہوئے تھے۔

جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا فاخر الہ آبادی، عبداللہ کافی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا ابوالقاسم بنارسی، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا محمد جونا گڑھی، مولانا سید محمود داؤد غزنوی، مولانا عبدالباقی، حکیم حافظ محمد اجمل خاں، مولانا مفتی محمد کفایت

اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا محمد اکرام خاں، مولانا عبدالقادر قصوری ارمولانا محمد علی ایم اے کینٹ قصوری قابل ذکر ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس اجلاس جمعیۃ علماء ہند کے لیے اپنا خطبہ صدارت بھی تحریر فرمایا تھا، جس کو حضرت مفتی کفایت اللہ نے مرتب کیا تھا،لیکن حضرت شیخ الہندؒ اپنی شدید علالت اور ضعف و نقاہت کی بنا پر خود جلسہ گاہ میں تشریف نہ لا سکے، آپ کے خطبۂ صدارت کو مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔ مجھے حیرت ہے کہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے بھی مولانا محمد میاں صاحب کی طرح لکھ دیا کہ شیخ الہند کے اس خطبۂ صدارت کو کسی اور نے پڑھ کر سنایا تھا۔ جو سراسر غلط ہے۔

''جیسا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد حسین احمد مدنی کی سیاسی ڈائری میں مرقوم ہے:

''جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس ۱۹ تا ۲۱۔ نومبر (۱۹۲۰) کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی صدارت میں دہلی میں ہوا۔ حضرت نے اس میں نہایت اہم اصول و مباحث پر مشتمل خطبہ صدارت پیش کیا۔ اس زمانے میں حضرت کی صحت بہت خراب تھی اور نشست و برخواست میں دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کے باوجود حضرت دہلی میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر موجود تھے، جلسے میں بہ ذات خود تشریف نہیں لا سکے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے حضرت کا خطبہ پڑھ کر سنایا''۔ (ص ۱۹۰ سیاسی ڈائری)

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ حضرت شیخ الہند کیا تھے، تو میں بلا تکلف کہوں گا کہ وہ تحریک ولی اللہی کے آخری سپہ سالار تھے، ان کا علمی وفکری مرتبہ کتنا بلند تھا، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم نے حضرت شیخ الہند کو صحیح معنی میں اور صحیح پس منظر میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور انہیں ہمیشہ ایک جزیرہ مالٹا ہی میں اسیر رکھا گیا ہے۔ حالانکہ ہمارے پڑوسی ملک کے ایک عظیم مفکر و دانشور انہیں مجدد وقت مانتے تھے اور لکھا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ مسلکا دیوبندی الفکر نہیں تھے۔

حضرت شیخ الہند محدث تھے، فقیہ تھے اور مترجم قرآن تھے اور بہت کچھ تھے اور تحریک آزادی وطن میں ان کا نمایاں کردار تھا۔

لیکن ان کا ایک دیرینہ خواب یا شرعی نقطۂ نظر سے کرنیکا ایک کام بھی تھا، جو ہمیشہ موضوع بحث بنا رہے گا۔ وہ تھا (ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ہمارا غلبہ واستیلاء نہیں ہے) قیام امارت کا مسئلہ تھا، جس کا ذکر علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث کے یہاں بھی ملتا ہے۔ چنانچہ اس دوسرے اجلاس جمعیت علماء ہند دہلی میں جو آپ کی صدارت میں منعقد

ہوا تھا، سب سے اہم مسئلہ انتخاب امیر الہند اور قیام امارت کا تھا، جس کے لیے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب بے حد بے چین اور مضطرب تھے۔ مولانا عبدالصمد رحمانی نے لکھا ہے۔

''وہ لوگ جو اس میں شریک تھے، جانتے ہیں کہ اس وقت حضرت شیخ الہند ایسے ناساز تھے کہ حیات کے بالکل آخری دور سے گزر رہے تھے، نقل وحرکت کی بالکل طاقت نہ تھی، لیکن باوجود اس کے ان کو اصرار تھا کہ اس نمائندہ اجتماع میں جبکہ تمام اسلامی ہند کے ذمہ دار اور ارباب حل وعقد جمع ہیں ''امیر الہند'' کا انتخاب کر لیا جائے۔ اور میری چارپائی کو اٹھا کر جلسہ گاہ میں لے جایا جائے۔ پہلا شخص میں ہوں گا جو اس امیر کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ (ص۵۴ تاریخ امارت)

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے اس اجلاس میں امارت فی الہند کا مسئلہ پیش کیا تھا، حضرت شیخ الہند نے پہلے ہی اس تجویز کی پرزور حمایت کی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی امیر الہند کے انتخاب پر زوردار تقریر کی، قریب تھا کہ امیر الہند کا انتخاب عمل میں آجاتا لیکن بعض علماء کے اختلاف کی وجہ سے انتخاب امیر کا مسئلہ التواء میں پڑ گیا۔ جس کی تفصیل مولانا پروفیسر منتخب الدین قادری کراچی یونیورسٹی نے اپنے استاد مولانا معین الدین اجمیری کے حوالے سے لکھا ہے جسے خود ان کے استاد مولانا اجمیری نے انہیں املا کرایا تھا، مولانا منتخب الدین قادری کے بیان کے مطابق دہلی میں بڑا مجمع تھا، اس وقت کسی کو امام الہند بنانے کی تجویز زیرغور تھی، اس کے لیے پہلے بھی خط وکتابت کی گئی تھی اور اس موضوع پر نہایت زوردار تقریریں ہوئیں اور سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا، آخر میں مولانا آزاد کی تقریر گویا حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی، جس سے تمام حاضرین مسحور سے ہو گیے اور یہ آوازیں بلند ہوئیں کہ ہاتھ بڑھائیے کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں! اس منظر کو دیکھ کر حضرت مولانا معین الدین اجمیری کی عجیب کیفیت ہوگئی، انہوں نے مجھ سے بیان کیا:

''میں نے صدر جلسہ سے صرف پانچ منٹ کچھ کہنے کے لئے مانگے جو بہت مشکل سے اس شرط کے ساتھ ملے کہ چھٹا منٹ کسی صورت نہ ہونے پائے۔ میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ علماء کے اس موقر اجتماع میں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور صرف اشارہ کافی ہے۔ میں جملہ علماء کی توجہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس تقریر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو آپ نے حج سے واپسی پر اس قسم کا چرچا سن کر کی تھی کہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اگر حضرت عمر کا انتقال ہو گیا تو ہم فوراً اور فلتۃً فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمانؓ

بن عوف کو حکم دیا کہ لوگوں کو جمع کریں اور پھر فرمایا کہ ’’فلتۃ بیعۃ‘‘ امت کے حق میں کبھی مفید نہیں ہوگی۔ اگر لوگ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے استدلال کریں گے تو بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کریں گے اس لئے کہ حضرت ابوبکر واحد شخصیت ہیں جن کے لئے اس قسم کی بیعت خالی از مضرت تھی۔ انؓ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ایسا موجود نہیں ہے‘‘۔ میرے اس توجہ دلانے پر جلسے کا رنگ ایک دم تبدیل ہوگیا۔ میری تائید میں مولانا انور شاہ صاحب نے ایک نہایت غامض اور دقیق تقریر فرمائی اور مولوی شبیر احمد عثمانی نے بھی میری تائید کی اگرچہ اس سے پہلے وہ اصل تجویز کی تائید میں تقریر کر چکے تھے!‘‘۔ (ص ۵۶ جماعت شیخ الہند تنظیم اسلامی)

مولانا معین الدین اجمیری صاحب نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی صاحب کو ایک خط بھی لکھا تھا، جس میں مسئلہ امارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

از دارالخیر، اجمیر ۲ ستمبر ۲۱

مرجع انام حضرت مولانا صاحب دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

والا نامہ نے عزت بخشی، سابق والا نامہ چونکہ جواب طلب نہ تھا اس وجہ سے تاریخ مقررہ آنمخدوم کو ذہن میں رکھ کر عریضہ حاضر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ ۵ محرم الحرام کے بعد حاضر خدمت ہوکر آنمخدوم کی ہمرکابی میں پنجاب روانہ ہو جاؤنگا۔ یہی ارادہ اب بھی ہے۔ اطلاعاً عرض کیا گیا۔ لیکن دہلی کے جلسہ جمعیۃ علماء ہند کی شرکت نے اس سفر میں ایک جدید مانع پیش کر دیا کیونکہ اس کی تجویز کے مطابق ۱۷، ۱۸ ستمبر کو جلسہ منتظمہ قرار پایا ہے۔ اس (جمعیۃ علماء ہند کی مجلس منتظمہ) میں ضبطیٔ فتوی و مسئلہ امامت پیش ہوگا جس کی طرف جناب مولوی ابوالکلام صاحب کو بیحد رجحان ہے۔ چونکہ ان کو اس مسئلہ سے زیادہ دلچسپی ہے اس وجہ سے خالی الذہن علماء ان کی تقریر سے متاثر ہوئے۔ اگر منجانب فقیر اس کے التواء کے متعلق مختصر و جامع تقریر نہ ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ حاضرین علماء اسی وقت اس مسئلہ کو طے کر دیتے۔ اس وجہ سے علماء دہلی کا یہ خیال ہے کہ فقیر خصوصیت کے ساتھ اس جلسہ میں شریک ہو۔ ادھر جناب مولوی شوکت علی صاحب نزاع رنگون کے متعلق زور دے رہے ہیں کہ فقیر جلد وہاں پہونچ کر ان نزعات کا تصفیہ کرائے جن کی وجہ سے وہاں کی کمیٹی خلافت کا وجود خطرہ میں ہے۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں جاوں اور سفر کون سا پہلے اختیار کروں۔ اس کے

متعلق امروز وفردا میں آنمخدوم کی خدمت میں عریضہ حاضر کرنے والا تھا کہ دفعتہً والا نامہ
نے شرف بخشا، مناسب معلوم ہوا کہ اس کے جواب میں عرض حال کر دیا جائے۔ جو
آنمخدوم کی رائے ہوگی اس پر عمل پیرا ہوا ہونے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ فقط

(فقیر معین الدین کان اللہ لہٗ)

(ص ۵۷ جماعت شیخ الہند تنظیم اسلامی)

اس کے بعد مسئلہ امارت فی الہند اور انتخاب آمیر کا قضیہ سرد خانہ میں پڑ گیا، اور ایک عرصہ تک پڑا رہا، پھر مولانا آزاد نے ۱۹۲۱ میں اجلاس جمعیۃ علماء ہند لاہور میں اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیا اور مسئلہ امارت فی الہند کے قیام کے سلسلہ میں شیخ الہند کی آمادگی اور ان کی پرزور تائید کا ذکر کیا، چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں۔

''۱۹۱۴ء کے لیل ونہار قریب الاختتام تھے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے یہ حقیقت اس عاجز پر منکشف کی، اور مجھے یقین ہوگیا کہ جب تک یہ عقدہ حل نہ ہوگا، ہماری کوئی سعی وجستجو بھی کامیاب نہ ہوگی چنانچہ اسی وقت سے میں سرگرم سعی وتدبیر ہوگیا۔ حضرت مولانا محمود حسن رحمتہ اللہ علیہ سے میری ملاقات بھی دراصل اسی طلب وسعی کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے پہلی ہی صحبت میں کامل اتفاق ظاہر فرمایا تھا اور یہ معاملہ بالکل صاف ہوگیا تھا کہ وہ اس منصب کو قبول کرلیں گے اور ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا علاج کر دیا جائیگا مگر افسوس ہے کہ بعض زود رائے اشخاص کے مشورہ سے مولانا نے اچانک سفر حجاز کا ارادہ کر دیا، اور میری کوئی منت وسماجت بھی انھیں سفر سے باز نہ رکھ سکی۔ اس کے بعد میں نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن ایام نظر بندی میں بھی اس کی فکر وتبلیغ سے غافل نہ تھا۔ چنانچہ صوبۂ بہار کے بعض احباب مخلصین کو اسی زمانے میں اس طرف توجہ دلائی گئی اور وہاں ابتدائی بنیاد اس کی ڈال دی گئی۔ اسی زمانے میں میرے عزیز ورفیق مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رانچی میں مجھ سے ملے تھے اور اسی وقت سعی وتدبیر میں مشغول ہوگئے تھے۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں جب میں رہا ہوا اور موجودہ تحریک خلافت کی تنظیم شروع ہوئی، تو اس وقت بھی میں نے بار بار کوششیں کیں اور تمام کارکن طبقہ کو اس طرف توجہ دلائی، مگر حالات موافق ومساعد نہ ہوئے، اور مجھے مجبوراً انہی اصلاحات پر قناعت کرلینی پڑی، جو اس تحریک کے اندرہ کر انجام دے سکتا تھا۔'' (ص ۱۳۷ خطبات آزاد)

اس تیسرے اجلاس جمعیۃ علماء ہند منعقدہ لاہور میں بھی قیام امارت اور انتخاب امیر کا مسئلہ زیر غور تھا، لیکن وہاں بھی اختلاف ہوگیا جس کا ذکر مشہور صحافی نصر اللہ عزیز نے کیا ہے۔

''۱۹۲۱ میں جمعیت علماء ہند کا جو اجلاس بریڈلا ہال لاہور میں ہوا تھا اس موقع پر یہ خبر گرم تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند مان کر بیعت کی جائے گی۔ لیکن بعد میں کچھ نہ ہوا۔ اور معلوم ہوا کہ اندرون خانہ دیوبندی علماء میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی اور غیر دیوبندی علماء میں سے مولانا معین الدین اجمیری نے شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی تھی!'' (ص ۵۵ جماعت شیخ الہند)

اس کے بعد مولانا آزاد کچھ بددل ہوگیے تھے، انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت لاہور میں بھی اس بددلی کا ذکر کیا ہے، اس کے باوجود آپ کی تحریک و ترغیب پر ۲۴، ۲۶ جون ۱۹۲۱ کو ''پتھر کی مسجد'' پٹنہ میں قیام امارت اور انتخاب امیر کے لیے ایک باوقار اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت آپ نے کی تھی، مولانا آزاد نے اپنا صدارتی خطبہ زبانی پیش فرمایا تھا، اسی اجلاس میں حضرت مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی امیر شریعت بہار اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا، اس اجلاس میں سو علماء شریک ہوئے تھے، جس میں مولانا آزاد سبحانی بھی تھے، اس کے بعد جمعیت علماء ہند کے مختلف اجلاسوں اور میٹنگوں میں صدور اور نظمائے اجلاس کی جانب سے قیام امارت اور انتخاب امیر کی شرعی ضرورت کا اظہار و اعلان ہوتا رہا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ ۱۹۲۲ گیا کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

''ایسی حالت میں کہ مسلمان ایک غیر مسلم طاقت کے زیر حکومت ہیں، اور ان کو اپنے معاملات میں مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ مسلمان اپنے لیے ''والی'' اور امیر مقرر کریں۔ دارالقضاء قائم کر کے قضاۃ اور مفتین کا تقرر کریں۔ جمعیۃ علماء میں یہ تجویز منظور ہو چکی ہے۔ اور جمعیۃ علما کے اجلاس لاہور میں یہ طے ہوا تھا کہ ایک سب کمیٹی کا اجلاس بدایوں میں منعقد کیا جائے جس میں امیر شریعت کے شرائط و فرائض و اختیارات وغیرہ مسائل طے کر لیئے جائیں اور اس کے بعد انتخاب امیر کا مسئلہ پیش کیا جائے۔'' (خطبہ صدارت جمعیۃ علماء ہند گیا منعقدہ ۱۹۲۲ء)

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے جمعیت ہند کے اجلاس منعقدہ مرادآباد ۱۹۲۵ کو اپنے صدارتی خطبہ میں جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے قیام امارت اور انتخاب امیر کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے تفصیل سے بیان فرمایا ہے:

''جمعیۃ علماء ہند نے ۱۹۲۱ء ۱۹ نومبر کو امارت شرعیہ فی الھند کی تجویز اس اجلاس میں منظور کی جو زیر صدارت حضرت مولانا ابوالکلام آزاد منعقد ہوا تھا۔ اور اس اجلاس میں امیر شریعت کے اصول منضبط کرنے کے لیے بعض امور کی تشریحات کے لیے ایک مجلس بنائی گئی، اور اسی اجلاس میں یہ طے پایا کہ ایک ماہ بعد فورا ایک دوسرا اجلاس اس مسودہ کی منظوری اور انتخاب امیر کے لیے بلایا جائے گا۔ جس ہفتہ میں اجلاس خصوصی تھا وہی وقت حکومت کے جبر و استبداد کے کامل مظاہرہ اور قوم کے دلیرانہ مقابلہ کا تھا، مولانا آزاد اور دوسرے علماء وغیرہ گرفتار کر لیے گئے، شاید دشمنان اسلام کی طرف سے جا بجا مختلف عنوانات سے یہ مشہور کیا گیا کہ اجلاس ملتوی ہو گیا۔ یہ بات بھی لگتی ہوئی تھی کیونکہ خاص خاص مراکز میں گرفتاریاں عام تھیں جن اراکین کے کانوں تک التواء کی غلط آواز پہنچی، انھوں نے قرائن پر قیاس کر کے صحیح سمجھا، جس کا نتیجہ ہوا کہ اتنے ارکان نہ پہنچ سکے جن کی موجودگی میں اجلاس منعقد ہو سکتا۔ مگر پھر بھی بعض حضرات علماء اکابر و بعض ارکان زعماء ہند پہنچ گئے تھے۔ مثلاً مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ، مولوی ظہور احمد سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ وغیرہ۔ آخر ان حضرات کا باہمی مشورہ ہوا اور اس مجلس نے جو ترتیب مسودہ کے لیے قائم ہوئی تھی مسودہ مرتب کیا۔ بعدہ کچھ ایسے حوادث پیش آئے کہ اس مسودہ پر مجلس منتظمہ کو غور کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ اس بنا پر جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس اجمیر میں غور کیا گیا کہ امارت شرعیہ کے قیام میں بوجوہ متعددہ تعویق ہے۔ اس لیے جب تک صوبہ وار امارت شرعیہ قائم کی جائے۔

(خطبہ صدارت جمعیۃ علماء ہند مراد آباد ۱۳۲۱)

اس کے بعد ۱۹۲۶ میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کلکتہ زیر صدارت مولانا سید سلیمان ندوی، ۱۹۲۷ میں زیر صدارت علامہ انور شاہ کشمیری اجلاس پشاور اور ۱۹۴۰ زیر صدارت مولانا مدنی اجلاس جمعیۃ علماء ہند جونپور میں بھی قیام امارت اور انتخاب امیر کے مسئلہ کا ذکر آیا لیکن افسوس صد افسوس اس سے آگے بات نہ بڑھ سکی۔ اور حضرت شیخ الہند کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

تاریخی طور پر ثابت ہے کہ امارت فی الہند کے قیام کے لیے شیخ الہند، مولانا آزاد اور مولانا ابوالمحاسن برابر فکر مند رہے ہیں، مولانا آزاد کی مذکورہ بالا عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے حضرت شیخ الہند کو امیر الہند کے لیے آمادہ کر لیا تھا، لیکن سفر حجاز کی وجہ سے یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا، دوسری طرف حضرت شیخ الہند کے نزدیک امیر الہند کے لیے مولانا آزاد کا

نام موزوں تھا، جب اس وقت بعض اشخاص کی طرف سے حضرت شیخ الہند کا نام برائے امیر الہند پیش کیا گیا تو حضرت شیخ الہند، مولانا آزاد کے حق میں امام الہند کی دعویداری سے دست بردار ہو گیے تھے، وہ کہتے تھے کہ مولانا آزاد نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے اور ہم قاعد تھے اور مولانا آزاد قائم تھے لیکن مولانا آزاد کا اصل مقابلہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے تھا جو نوابوں اور رئیسوں کے پیر و مرشد تھے، ان کا مقابلہ بہت سخت تھا، جس کا ذکر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی کتاب ذکر آزاد میں بھی کیا ہے۔

انتخاب امیر الہند سے قطع نظر یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ امارت فی الہند کی اصل سوچ ہندوستانی تناظر میں فی الحقیقت مولانا آزاد کی ہے یا مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند لاہور میں کہا ہے کہ ۱۹۱۴ کے اختتام سے امارت فی الہند کا مسئلہ میرے پیش نظر رہا ہے، اور میرے اوپر یہ حقیقت منکشف ہوگئی تھی کہ ہمارے تمام ملی مسائل کا حل اسی میں مضمر ہے۔ جب کہ قاضی سید احمد حسین کی تحریک پر مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رانچی میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملے تھے (جب کہ وہ وہاں نظر بند تھے) تو وہ حزب اللہ کی تشکیل و تنظیم کر رہے تھے اور بیعت بھی لیتے تھے، اور جس کا ذکر ۱۹۱۲ سے ۱۹۱۴ تک الہلال کے مختلف شماروں میں ملتا بھی ہے۔ مولانا ابوالمحاسن سجاد نے مولانا آزاد کے سامنے جب حزب اللہ کے بجائے امارت فی الہند کا مسئلہ رکھا تو مولانا آزاد فوراً اس شرعی مسئلہ کی تہہ تک پہنچ گیے جس کا ذکر قاضی احمد حسین صاحب سابق ممبر پارلیمنٹ نے کچھ اس طرح کیا ہے۔

> ''یہی زمانہ تھا کہ مولانا جمعیۃ العلماء کی تنظیم کر رہے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنی جماعت ''حزب اللہ'' بنانے کی کوشش کر رہے تھے، ابھی یہ جماعت بننے نہ پائی تھی کہ مولانا ابوالکلام رانچی میں نظر بند ہوگئے۔ مولانا آزاد سے ہمیں بھی عقیدت تھی، رانچی میں ان کے یہاں بھی آنا جاتا تھا، ایک دفعہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب سے مولانا ابوالکلام صاحب کے حزب اللہ کا تذکرہ آیا تو مولانا سجاد صاحب نے فرمایا کہ شریعت میں تنظیم اسلامی کا اصول (امارت) ہے۔ اس بنیاد پر نظم کرنا بہتر ہے۔ اس گفتگو کا تذکرہ رانچی میں مولانا آزاد سے آیا، تذکرہ کے وقت ایسا محسوس ہوا کہ مولانا آزاد نفس مسئلہ تک پہنچ گئے۔ مشتاقانہ مولانا سجاد صاحب سے ملنے کی خواہش کی۔ رانچی جا کر مولانا سجاد صاحب مولانا آزاد صاحب سے ملے اور ہندوستان میں قیام امارت کے قیام سے مولانا آزاد نے اتفاق کرلیا اور مولانا سجاد صاحب

نے کوشش شروع کی ،مولانا کا خیال تھا کہ پہلے امیر الہند کا انتخاب کرلیا جائے پھر صوبہ وار امارت شرعیہّ کا قیام ہو۔مولانا مرحوم نے مولانا شیخ الہند مولانا محمود حسن کو اس امر پر راضی کرلیا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد امیر الہند ہوں۔ (ص۱۲۷ حیات سجاد)

میرے خیال میں امارت فی الہند کے قیام کے سلسلہ میں نفس مسئلہ میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں تھا، بعض اکابر کے تحفظات ضرور تھے، وہ دراصل امارت کے ضروری شرائط اور امیر کے اوصاف وشرائط کے پیش نظر تھے اور اختلاف دراصل موزوں شخصیت کے انتخاب میں تھا ورنہ نفس مسئلہ میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں تھا خود مولانا ابولکلام آزاد کو بعض ریاستی امارت شرعیہ کے قیام کے بعداس کا شدید احساس ہو گیا تھا۔اگر آج مولانا آزاد باحیات ہوتے اور بعض ریاستوں کی امارت کے طریق انتخاب کو دیکھتے اور بعض امراء امارت کے آمرانہ رویوں اور سیاسی سودہ بازیوں کو ملاحظہ فرماتے تو اپنے جذبۂ قیام امارت پر بڑے نادم وشرمسار ہوتے، اس لیے آخر میں مولانا آزاد کی رائے ہوگئی تھی کہ کل ہندامارت کا منصوبہ ترک کر دینا چاہیے اور دوسرے ناموں سے بنی کمیٹیوں کے ذریعہ کام کرنا چاہیے۔جس کا ذکر شاہ محمد عثمانی صاحب نے بھی کیا ہے۔

’’ایک مجلس میں مولانا سے امارت شرعیہ پر گفتگو آئی۔مولانا نے کہا بڑے اسلامی انقلابی نقطۂ نظر سے اس کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کی تاسیس میرے ہاتھوں ہوئی تھی۔لیکن ایسے بڑے انقلابی کام کے لئے جس طرح کے امیر کی ضرورت تھی وہ نہ مل سکے۔شاہ بدرالدین صاحب بہت عمدہ آدمی تھے، لیکن ان کے ساتھ خانقاہ کی بہت سی پابندیاں تھیں۔مولانا سجادؒ خود یہ بارگراں اپنے کندھوں پر اٹھانے کو تیار نہ تھے۔بس وہ نیابت کا فریضہ ادا کرنا چاہتے تھے، عظیم کاموں کے لئے عظیم صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔اس لئے میری رائے تو اب یہ ہے کہ یہ کام معمولی کمیٹیوں اور جماعتوں کے ذریعہ لیا جائے اور کل ہند امارت کے قیام کی کوشش نہ کی جائے مولانا نے کہا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جہاں امارت بن گئی ہے اس کو توڑ دیا جائے بلکہ اس کو جہاں تک ممکن ہو چلانا چاہیے۔کل ہندامارت قائم ہوئی اور غلط آدمی امیر ہوئے تو اس سے خوفناک غلط نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اصل مسئلہ تاریخ ساز افراد تیار کرنے کا ہے، جس کے بغیر ہر منصوبہ، ناکام ہو جائے گا۔ (ص۶۴،۶۵ ٹوٹے ہوئے تارے)

۞۞

بانیٔ امارت شرعیہ بحیثیت نائب امیر شریعت

مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی
نائب ناظم امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ

ابو المحاسن مولانا محمد سجادؒ (۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۷۹ء- ۱۷شوال ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸نومبر ۱۹۴۰ء) کی اصلی حیثیت تو بانیٔ امارت شرعیہ کی ہے اور اصلاً امارت شرعیہ کا قیام فکر سجاد کی عملی تصویر ہے، مولانا کی اس حیثیت کے علاوہ دوسری حیثیت نائب امیر شریعت کی ہے، یہ مولانا کی کسر نفسی اور خلوص کی بات تھی کہ سارا کچھ کرنے اور بھاگ دوڑ کے بعد جب فکر سجاد کی تجسیم کا وقت آیا تو مولانا نے اس کے کلیدی عہدے کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، حالانکہ روایت یہ رہی ہے کہ جو فکر دیتا ہے، خاکے بناتا ہے، عملی رنگ وروپ اختیار کرنے کے بعد کلیدی عہدہ اسی کے نام ہوتا ہے اور تحریک بھی عموماً اسی کے نام سے موسوم ہوتی ہے، مارکسزم، گاندھی ازم اور اب لالوازم جس میں حکمراں کوئی ہوتا ہے اور کام کوئی اور کرتا ہے، اسی تسلسل کی ایک کڑی ہے، لیکن مولانا کی یہ فکر، اسلامی فکر تھی، خیال، اسلامی خیال تھا، بھاگ دوڑ، جد وجہد سب اسلام کے لیے تھا، اس لئے مولانا نے اس کا نام بھی خالص اسلامی ''امارت شرعیہ'' تجویز کیا، پانچ سو سے زائد علماء، چار ہزار سے زائد عوام اور اعیان وطن کو محلّہ پتھر کی مسجد پٹنہ میں جمع کیا، رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے دور دراز کے اسفار کئے، جن کو تردد تھا، ان کے سامنے علمی طور پر اس مسئلہ کو واضح کیا۔ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ لکھتے ہیں:

> ''آپ نے امارت شرعیہ کی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے صوبہ وبیرون صوبہ کے علماء ومفکرین سے مختصر اور طویل ملاقاتیں کیں، ہندوستان کے سیاسی حالات ان کے سامنے رکھے، مسلمانوں کی زندگی کا نقشہ کھینچا اور پھر ان حالات میں قرآن کا مطالبہ، مسئلہ کی نوعیت اور مسلمانوں پر عائد ہونے والے فرائض کی تفصیل وتشریح کی، نیز اس باب میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات خواہ وہ علم وشریعت کے راستے سے ہوں یا دنیاوی مصلحت کی راہ سے، دور فرمائے''۔(۱)

۲۶جون ۱۹۲۱ء مطابق ۱۹شوال ۱۳۳۹ھ کو محلّہ پتھر کی مسجد میں امارت شرعیہ کے قیام کا

فیصلہ ہوا تو مولانا نے عہدے سے اپنے کو دور رکھا اور حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی ہدایت اور مشورے پر مولانا سید شاہ بدرالدین قادریؒ (م۱۳۴۳ھ) پہلے امیر شریعت منتخب ہوئے اور بہت زور ڈالنے پر مولانا نے نائب امیر شریعت کی حیثیت سے کام کرنا منظور کیا اور دو امراء شریعت مولانا سید شاہ بدرالدین قادریؒ اور مولانا سید شاہ محی الدین قادریؒ رحمہما اللہ کے عہد میں نائب امیر شریعت کی حیثیت سے اس دلجمعی اور لگن سے کام کیا، جس کی مثال مِلّی تاریخوں میں کم ملتی ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

''ان دونوں بزرگوں کی موجودگی میں مولانا محمد سجاد صاحب بدستور نائب امیر شریعت رہے اور وہی درحقیقت اس پورے نظام کا دماغ اور مرکز اعصاب تھے، امیر شریعت کی شکل میں قلب دردمند اور نائب امیر شریعت کی شکل میں ذہن بیدار اس نظام کو حاصل تھا، دل ودماغ کے اس تعاون نے اس نظام میں وہ اعتدال وتوازن اور عوام وخواص کا وہ اعتماد پیدا کردیا، جو ایسی عظیم تنظیم اور تحریک کے لیے ضروری ہے''۔(۲)

فیصلے سارے اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور اس میں خیر ہی خیر ہوتا ہے، اس فیصلے میں خیر کا یہ پہلو نکل آیا کہ بہار کی دو بڑی خانقاہوں کی سرپرستی اس ادارہ کو پہلے دن سے مل گئی، اور یہی دو خانقاہیں بہار میں اس زمانہ میں مرجع خلائق تھیں اور آج بھی ہیں، خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشیں پہلے امیر شریعت منتخب ہوئے تو خانقاہ کے سارے معتقدین ومتوسلین بیک وقت امارت شرعیہ سے منسلک ہوگئے، خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشیں کی ایما پر یہ انتخاب ہوا اور حضرت مونگیری نے اپنے مریدین پر ایک خط کے ذریعہ واضح کردیا کہ جو ہم سے منسلک ہے، وہ امارت شرعیہ سے منسلک ہوجائے اور یہ بیعت، طریقت کے خلاف نہیں ہے، امیر شریعت سے بیعت امارت وطاعت اور پیر سے بیعت طریقت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں؛ اس لیے ایک شخص کے لیے ممکن ہے کہ وہ بیعت امارت امیر شریعت سے کرے اور اپنے پیر سے طریقت میں بیعت کو جاری رکھ سکے، اس عمل کی وجہ سے دونوں خانقاہ کا جو اثر بہار میں تھا، اس کا فائدہ امارت شرعیہ کو مل گیا۔

دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کلمہ کی بنیاد پر تنفیذ شریعت علی منہاج النبوت جو امارت کا بنیادی مقصد تھا اور جس کی وجہ سے فروعی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ملی مسائل میں متحد ہونے کا اعلان کیا گیا تھا، اس کی عملی شکل کسی اور کے امیر بننے سے سامنے نہیں آتی، خانقاہ مجیبیہ کا نقطۂ نظر اعراس ورسومات اور نذر ونیاز کے اعتبار سے علماء دیوبند سے الگ ہے، البتہ وہ ایک معتدل خانقاہ ہے اور یہاں ہر دور

میں اہل علم کی سیادت وقیادت رہی ہے، اس اعتدال وتوازن کی وجہ سے یہ حضرات علماء دیوبند کے ساتھ کام کرنے کو تیار رہتے ہیں، حضرت مولانا شاہ عون احمد قادریؒ جمعیت علماء بہار کے صدر رہے اور مولانا اسعد مدنیؒ کی قیادت میں جمعیت علماء بہار کے کام کوانہوں نے آگے بڑھایا، خالص دیوبندی امیر بننے کی صورت میں ایک بڑے حلقے کے امارت سے کٹنے کا اندیشہ تھا، امیر شریعت خانقاہ مجیبیہ کے ہوئے تو وہ پورا حلقہ جڑ گیا اور لوگوں میں یہ بہت اچھا پیغام گیا کہ اتحاد کی راہ میں قیادت رکاوٹ نہیں ہوا کرتی۔

تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشیں روایتی طور پر خلوت نشیں ہوتے ہیں، حضرت مخدوم منہاج الدین راستیؒ کے عرس، سفر حج اور ہوسپٹل کے علاوہ وہ خانقاہ کے حلقہ سے باہر نہیں نکلتے، ایسے میں حضرت امیر شریعت اول کے لیے غیر منقسم بہار کے اسفار اور امارت شرعیہ کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے کی کوئی شکل نہیں تھی، کسی تحریک کو گاؤں گاؤں تک پہنچانے کے لیے اسفار اور لوگوں تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے، صرف عقیدت ومحبت کی بنیاد پر کسی تحریک کو مؤثر اور کامیاب نہیں کیا جاسکتا، ایسے میں نائب امیر شریعت کی حیثیت سے بانی امارت شرعیہ کے انتخاب سے یہ فائدہ ہوا کہ حضرت امیر شریعت کے حکم اور ہدایت کے مطابق نائب امیر شریعت کے دورے شروع ہوئے اور نائب امیر شریعت کی حیثیت سے مولانا سجادؒ کو اپنے بنائے ہوئے خاکے میں رنگ بھرنے کا پورا موقع ملا، یہ ایک قدرتی اور تکوینی نظام تھا، جس کے تحت بانی امارت شرعیہ کا نائب امیر شریعت کی حیثیت سے انتخاب ہوا اور امارت شرعیہ کا پیغام گھر گھر پہنچ سکا، مولانا نے نائب امیر شریعت بننے کے بعد پہلا دورہ بتیا، چمپارن کا کیا اور لوگوں کو امارت شرعیہ کی اہمیت اور اطاعت امیر پر ابھارا۔ مولانا انیس الرحمٰن قاسمی ناظم امارت شرعیہ نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''نائب امیر شریعت کی حیثیت سے بانی امارت شرعیہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب اپنی مخلصانہ کوششوں، ریاضتوں اور پُرعزم جدوجہد کے ذریعہ پورے بہار میں فکر امارت سے امت کو واقف کراتے رہے، لوگ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا، یہاں تک کہ بہار کا ایک بڑا مسلم علاقہ شرعی زندگی گزارنے کے لیے امیر شریعت کے ماتحت منظّم ہوگیا''۔ (۳)

بانی امارت شرعیہ نے پہلے دن سے امت کی اجتماعی شیرازہ بندی پر زور دیا، انہوں نے کلمہ کی بنیاد پر اتحاد کو امارت کا نصب العین بناکر کام کرنا شروع کیا، یہ کام آج بھی آسان نہیں ہے اس وقت تو اور بھی مشکل تھا، مولانا نے بحیثیت نائب امیر شریعت جو دورے کئے اس میں اس

موقف کو مضبوطی سے رکھا اور واضح کیا کہ فروعی مسائل کو اختلاف کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ مسلک عمل کے لیے ہے، تبلیغ کے لیے نہیں، تبلیغ اسلام کی کرنی چاہیے، مسلک کی نہیں، مولانا نے اس موقف کو مضبوط کرنے کے لیے مختلف مکتب فکر کے لوگوں کو امارت شرعیہ سے جوڑا، مختلف مجلسوں میں ان کو پابندی سے بلاتے رہے، اس طرح شدت میں کمی آئی اور بعد کے دنوں میں اسی نہج پر مسلم مجلس مشاورت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور آل انڈیا ملی کونسل کی تشکیل عمل میں آئی جن کی خدمات کے ذکر کے بغیر ہندوستان کی کوئی مِلّی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

مولانا نے بحیثیت نائب امیر شریعت مضبوط بنیادوں پر تحفظ مسلمین اور انسانوں کے مسائل ومشکلات دور کرنے کے لیے جدوجہد کی، تحفظ مسلمین کے حوالہ سے ان کے عقائد واعمال کی اصلاح، شرک وبدعات اور جاہلانہ رسم ورواج کی اصلاح کے ساتھ ان پر کوئی افتاد پڑی تو اس کے لیے سرگرم عمل ہوئے، مغربی چمپارن کے علاقہ میں جب سدھی تحریک نے اپنے دست وبازو پھیلائے تو مولانا نے مستقل وہاں قیام کیا اور اپنے لڑکے کی علالت کی پرواہ نہیں کی اور بالآخر ان کا لڑکا حسن سجاد جو دیوبند سے فارغ ہوکر آیا تھا، راہئ آخرت ہوگیا، اور مولانا کی ملاقات بقید ہوش وحواس اس لڑکے سے نہیں ہوسکی، مولانا اس کام میں اتنے منہمک ہوئے کہ اپنی صحت کی پرواہ نہیں کی اور بالآخر مرض الموت بھی بتیا ہی سے لے کر آئے اور جان جاں آفریں کے سپرد کردیا، کام کے تئیں اس قدر مخلصانہ جدوجہد کی مثالیں نایاب تو نہیں، کمیاب ضرور ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ ساتھ نائب امیر شریعت اکرام انسانیت اور انسانی مسائل ومشکلات کے دور کرنے کے سلسلہ میں بھی کافی سرگرم تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے امارت شرعیہ کی خدمات کا دائرہ مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا، ان کو امت کی فکر تھی اور انسانی بنیادوں پر کام کرنے کے لیے ان کے نزدیک امت کا مطلب امت دعوت واجابت دونوں ہوتا تھا، امارت شرعیہ نے اپنے رفاہی کاموں کو اسی نہج پر بڑھایا، آسمانی اور زمینی آفات کے موقع سے خواہ وہ زلزلہ ہو، یا آگ لگی، سیلاب کی تباہ کاری ہو یا فرقہ وارانہ فسادات کی تباہی، ہر موقع سے مولانا نے امداد واعانت میں انسانی بنیادوں کو سامنے رکھا اور جو ضرورت مند اور پریشان حال تھے، ان کی پریشانی دور کرنے کے لیے آگے آئے۔

کام جب انسانی بنیادوں پر کیا جاتا ہے تو انسانیت کی کوئی سرحد نہیں ہوتی، ملکوں کی جغرافیائی تقسیم انسانی بنیادوں کو منہدم نہیں کرتی؛ اسی لیے مولانا نے بحیثیت نائب امیر شریعت خدمات کے دائرے کو جغرافیائی سرحدوں میں قید نہیں کیا، اسرائیل کے قیام سے قبل ہی جب فلسطینی مسلمانوں

کے حقوق پر شب خوں مارنے کی تیاری تھی تو مولانا نے ۱۹ جون ۱۹۳۶ء کو جمعہ کے دن پورے صوبہ میں یوم فلسطین منانے کا اعلان کیا، مولانا کی اس آواز پر بڑے پیمانے میں احتجاج اور مظاہرے کیے گئے، دوسری طرف جمعہ کی نماز کے بعد فلسطینیوں کے لیے خصوصی دعاؤں کا اہتمام کیا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا صرف دعا کے قائل نہیں تھے، اسباب کے درجے میں احتجاجی مظاہرے کو بھی درست سمجھتے تھے اور اس زبان کا استعمال کرتے تھے، جو زبان حکمراں اور وقت کے سیاسی قائدین سمجھا کرتے تھے۔

جب فلسطینیوں پر ظلم وستم کی گرم بازاری میں اضافہ ہوا تو مولانا نے ۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کو پھر سے یوم احتجاج منایا، جس میں بڑی تعداد میں مسلمانوں نے شرکت کی اور جلسے، جلوس اور مظاہرے کے ذریعہ اپنا موقف دنیا کے سامنے رکھا اور بتایا کہ ظلم وستم دنیا کے جس حصہ میں بھی ہو، ہم ظالموں کے خلاف ہیں اور مظلوم ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔

امارت شرعیہ کے جن کاموں کو پہلے مرحلہ میں نائب امیر شریعت نے مضبوطی کے ساتھ کھڑا کیا، ان میں امارت شرعیہ کا شعبۂ قضا ہے، ایک زمانہ تک مولانا خود ہی مقدمات کو دیکھتے رہے، سماعت کرتے رہے، پھر اپنی مشغولیت کے پیش نظر یہ کام قاضی نور الحسن صاحبؒ کے سپرد کر دیا، لیکن پوری زندگی اس کام کی توسیع کے لیے فکرمند رہے، دھیرے دھیرے یہ شعبہ امارت شرعیہ کی شناخت بن گیا، آج صورت حال یہ ہے کہ ہندوستان ہی نہیں ہندوستان کے باہر بھی اس کے فیصلے اور دار القضا کے طریقۂ کار کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی تعریف کی جاتی ہے، اس نظام کے اجراء سے ایک طرف تو غیر مسلم ججوں کے یہاں لوگوں کا آنا جانا کم ہوا، دوسری طرف شرعی طور پر خصوصیت سے عورتوں پر ہو رہے مظالم کو ختم کرنے میں مدد ملی اور گلو خلاصی کی شکل بنی، مولانا کے دور میں ہی اس موضوع پر کتابیں تیار ہوئیں، اس طرح علمی اعتبار سے بھی قضا کے نظام کو مضبوط کیا گیا۔

مولانا کی نظر میں سیاست شجر ممنوعہ نہیں تھی، بلکہ وہ اسے ملی اور اسلامی کاموں کو باوقار انداز میں بڑھانے کا ذریعہ سمجھتے تھے، ان کی نگاہ مغرب کے جمہوری نظام اور اسلامی سیاست پر گہری تھی، وہ ایک طرف فقیہ النظر عالم تھے اور دوسری طرف سیاست کے بڑے رمز شناس، کہنا چاہیے کہ ان کی فکر میں دین وسیاست کی حسین آمیزش تھی، وہ اقبال کی اس فکر کے قائل تھے کہ ''جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''، اس لیے مولانا نے سیاست کے خارزار میدان میں بھی قدم رکھا اور مضبوطی سے

اپنے پاؤں جمائے، کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش کے درمیان آپ نے ان دونوں سے الگ اپنے امیدوار انڈی پنڈنٹ پارٹی کے بینر تلے کھڑے کیے اور اس کے امیدوار اتنی بڑی تعداد میں کامیاب ہو کر آ گئے کہ جب کانگریس نے جو سب سے بڑی پارٹی بن کر سامنے آئی تھی، اپنی بعض مصلحتوں کی وجہ سے حکومت سازی سے انکار کر دیا تو مولانا نے انڈی پنڈنٹ پارٹی کی حکومت بنا ڈالی، اس زمانہ میں وزیر اعظم کا عہدہ ہوتا تھا، چنانچہ محمد یونس بارایٹ لا کو اپنی پارٹی کی طرف سے وزیر اعظم بنا دیا، اور پھر یہ بادشاہ گر امارت میں اپنی فقیری بوریے پر آ بیٹھا، ایسا مولانا نے اس سیاسی اور آئینی طاقت کے حصول کے لیے کیا، جس کے بغیر ملی کاموں کو بغیر کسی رکاوٹ کے کرنا ممکن نہیں ہوتا، اسی لیے مولانا یہ چاہتے تھے کہ علماء سیاست میں بھی قوم کی رہبری کا فریضہ انجام دیں۔ مولانا کو شکایت تھی کہ!

> ''علماء ربانیین اور فضلاء عظام، ماہرین شریعت نے (سیاست میں) عملی حیثیت سے اتنا حصہ نہیں لیا جتنی کہ ضرورت تھی، اگر یہ حضرات عملاً حصہ لیتے رہتے اور اپنے اوقات کا معتد بہ حصہ اس پُر خار وادی میں گذارتے تو امید یہ تھی کہ اتنے مفاسد پیدا نہیں ہوتے اور شریعت اسلامیہ کے اصول وفروع کی اتنی بے حرمتی نہ ہوتی اور مسلمانوں کی بے عزتی جو وقوع میں آتی ہے، نہ ہوتی''۔(۴)

مولانا کے اس فکر کی عملی شکل انڈی پنڈنٹ پارٹی تھی، جس کا تاسیسی اجلاس ۱۴ستمبر ۱۹۳۲ء کو انجمن اسلامیہ ہال میں منعقد ہوا، جس کا مقصد انگریزوں سے پورے ملک کو مکمل طور پر آزاد کرانا اور مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے امارت شرعیہ کو آگے بڑھانا تھا، مولانا نے یہ گنجائش بھی رکھی تھی کہ اگر کوئی مجلس امارت شرعیہ کے اصولوں اور ضابطوں کو سامنے رکھ کر تشکیل پائے تو امارت شرعیہ اس کی حمایت کرے گی، مولانا سجاد ایک طرف نائب امیر شریعت تھے، دوسری طرف اس پارٹی کے صدر بھی تھے، اکیس نفری مجلس عاملہ مشیر کار کے طور پر تھی، جس میں اس وقت کے بڑے اور قدر آور لیڈران شامل تھے، اس پارٹی نے مسلم لیگ اور کانگریس کے ساتھ عبدالعزیز بیرسٹر کی پارٹی مسلم یونائیٹڈ پارٹی اور شفیع داؤدی کی احرار پارٹی کے مقابل بھی اپنے امیدوار کھڑے کیے اور پچاس فی صد مسلم سیٹوں پر فتح وکامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

انڈی پنڈنٹ پارٹی کی حکومت صرف ایک سو بیس دن قائم رہی؛ لیکن اس پوری مدت میں مولانا نے اس حکومت سے جو کام لیا، وہ تاریخ کا روشن باب ہے، سیاسی پارٹیاں لمبی مدت میں اتنے کام نہیں کر پاتی ہیں۔ کیوں کہ وہ عوامی مفادات کے لیے نہیں، پارٹی مفاد میں کام کرتی ہیں اور

مصلحتوں اور تحفظات کے دائرے میں قید ہوکر بڑے اور انقلابی قدم نہیں اٹھا پاتی ہیں۔ موجودہ امیر شریعت مفکر اسلام مولانا محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم نے لکھا ہے۔

''حضرت سجاد برقعہ پوش سیاست کے قائل نہیں تھے، وہ خطرات سے کھیلنا جانتے تھے، حالات سے نپٹنے کی صلاحیت ان میں تھی، وہ اپنی شخصیت کو بنانے، سنوارنے اور اس کی عظمت کے لیے داؤ پیچ کے قائل نہیں تھے، وہ ملت کی سربلندی کے خواہاں اور امت کی سرفرازی کے طلب گار تھے، اسی لیے انہوں نے اتحاد اور تنظیم کے بعد سیاسی طاقت بنانے کا فیصلہ کیا، الیکشن لڑایا، حکومت بنائی''۔ (۵)

مولانا نے بہار میں پہلی بار اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دلایا، دفاتر میں کام اردو میں کیے جانے لگے، کسان لگان کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے اور ان کی زندگی اجیرن تھی، منشی پریم چند نے اپنے مختلف افسانوں کے پلاٹ کسانوں کی اسی حالت زار سے اخذ کیا ہے، مولانا کو کسانوں کے ساتھ زمینداروں کے ذریعہ اور حکومتی سطح پر جاری ظلم وستم کا ادراک تھا، مولانا جانتے تھے کہ کسان سردی وگرمی جھیل کر مفلسی میں غذائی اجناس پیدا کرتا ہے اور ان کی ساری کمائی مہاجنی سود، زمینداروں کے لگان اور حکومت کے ذریعہ عائد ٹیکس میں ختم ہوجاتی ہے اور پھر کسان بھوکوں مرتے ہیں، مولانا نے اس قلیل مدت میں کسان پر لگائے گئے لگان میں تخفیف کا قانون پاس کرایا، جس سے کسانوں کو بڑی راحت ملی۔

۱۹۳۸ء تک اسلامی اوقاف کی حفاظت کا بہار میں کوئی نظم نہیں تھا اور اوقاف کی جائداد برباد ہو رہی تھی، مولانا نے اسلامی بنیادوں پر وقف بل امارت شرعیہ کے افراد کے ذریعہ تیار کرا کر اسے بہار حکومت سے نافذ کرایا اور اسلامی اوقاف کو ٹیکس سے مستثنی قرار دیا گیا، اس طرح ملی سرمایہ کو حکومت کے دستبرد میں جانے سے محفوظ کرانے کی قابل قدر کوشش کی۔ بعد کے دنوں میں انہیں خطوط پر وقف ایکٹ کو مزید مؤثر بنایا گیا؛ لیکن آزاد ہندوستان میں اوقاف کے حوالہ سے نائب امیر شریعت کی فکر اور طریقۂ کار کو پورے طور پر نافذ نہیں کیا جاسکا؛ اس لیے آج بھی اوقاف برباد ہو رہے ہیں اور لوٹ کھسوٹ جاری ہے۔

مولانا کو اس بات کا احساس تھا کہ ابتدائی تعلیم کو لازم قرار دیا جانا چاہیے تاکہ بچے ناخواندہ نہ رہیں، اب جب کہ ہندوستان میں رائٹ ٹو ایجوکیشن کے ذریعہ تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا ہے تو نائب امیر شریعت کی بہت یاد آتی ہے، وہ تعلیم کے لزوم کے ساتھ نصاب میں مذہبی تعلیم کی

شمولیت کوضروری سمجھتے تھے۔مولانا کی سوچ یہ تھی کہ خدا بیزار تعلیم سے جونسل اٹھے گی وہ مذہب بیزار ہوگی،اس لیے مولانا نے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود صاحب کواس پر تیار کیا کہ وہ تعلیم گاہوں میں مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کرائیں،مولانا کی اس مہم کا نتیجہ ہوا کہ ۱۹فروری ۱۹۳۹ء کو وزیر تعلیم نے ابتدائی تعلیم گاہوں میں مذہبی تعلیم کو اصولاً منظور کرلیا۔

جب اسمبلی میں ڈوری بل لایا گیا،جس کی رو سے جہیز اور مہر تک لینا جرم کے زمرے میں آرہا تھا،مولانا نے انڈی پنڈنٹ پارٹی کے ذریعہ حکومت کواس پر مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں کواس قانون سے الگ رکھے، چنانچہ اس میں ترمیم کرکے مسلمانوں کواس سے الگ رکھا گیا۔مولانا مہر کے خلاف اس بل کو مداخلت فی الدین سمجھتے تھے؛ کیوں کہ مہر عورت کا حق ہےاور قرآن کریم میں اس کے لیے واضح حکم ''وآتوا النساء صدقتھن نحلة'' موجود ہے،اس لیے کسی بھی دنیاوی قانون کے ذریعہ قانون الٰہی میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے سیاسی طور پر ملت کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ ایک سماجی گروپ بھی حزب اللہ کے نام سے قائم کیا،۹ذی قعدہ ۱۳۴۴ھ کواس تنظیم کا قیام عمل میں آیا اوراس کی شاخیں چمپارن، آرہ اور صوبہ کے دیگر مقامات پر قائم ہوئیں، ابتدا میں شفیع داؤدی اور مولوی حسن جان جیسے لوگ بھی اس میں شریک تھے،اس تنظیم نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا،لیکن مولانا کی مشغولیات کی وجہ سے یہ تنظیم زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکی اور جلد ہی تعطل کا شکار ہوگئی۔مولانا نے جن بنیادوں پر حزب اللہ کو قائم کیا تھا،اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ آج ہے،مولانا کے دور نیابت میں شاردا بل بھی اسمبلی میں پیش ہوا،جس میں ۱۸سال سے کم عمر کے لڑکے اور بارہ سال سے کم عمر کی لڑکی کی شادی کو تعزیرات کے تحت لایا گیا تھا، ظاہر ہے کہ یہ صراحتاً دین میں مداخلت تھی، اسلام میں کم عمری کی شادی بھی بعض مصلحتوں کی وجہ سے درست ہےاور ولی اپنی صوابدید پر کم عمر لڑکے لڑکیوں کی شادی کرسکتا ہے،مولانا نے اس بل کے مضر اثرات، فقہی اور قانونی طور پر اس کے غلط ہونے کے دلائل فراہم کیے،سول نافرمانی کی تحریک پر لوگوں کو ابھارا، مجلس تحفظ ناموس شریعت کے نام سے جمعیۃ علماء کے ذریعہ قائم کردہ تحریک کی قیادت کی، لوگوں کواس قانون کے خلاف عملی اقدام کے لیے تیار کیا، چنانچہ نابالغ لڑکے لڑکیوں کی شادی کے سلسلہ میں جولوگ مذبذب تھے، وہ بھی میدان میں آئے،اس مسئلہ پر امارت شرعیہ کی سرپرستی میں غیر معمولی اور تاریخی تحریک چلائی گئی،اس طرح یہ معاملہ معرض التوا میں گیا اور مسلمانوں کوان کے پرسنل لا کے مطابق

شادی بیاہ کرنے کی اجازت ملی، اتنا ہی نہیں؛ بلکہ ۱۹۳۷ء کا شریعت اپلی کیشن ایکٹ اور آزاد ہندوستان کے دستور میں بنیادی حقوق کے طور پر، پرسنل لا کی شمولیت کی داغ بیل بھی نائب امیر شریعت ہی نے ڈالی تھی، مولانا کی اس فکر کو جمعیۃ علماء ہند اور دیگر اسلامی جماعتوں نے مذہبی تحفظ کو آئینی اور دستوری بنانے کے لیے انگریزوں کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی، جو بعض وجوہ سے اس وقت دستور کا حصہ نہیں بن سکیں، مولانا نے ''ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ!

''آئندہ دستور میں ایک دفعہ بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کی ہو، جس میں دیگر قوموں کے بنیادی حقوق کی صراحت کے علاوہ مسلمانوں کے بنیادی حقوق کی تفصیلات درج ہوں اور اصولی طور پر یہ وضاحت ہو کہ مسلمانوں کے خاص باہمی معاملات اور معاشرتی رسم ورواج جو مذہبی احکام کے ماتحت ہیں، اس میں کسی قسم کے تغیر وتبدل کا اختیار کسی حکومت اور مجلس قانون ساز کو نہ ہوگا اور نہ اس کے متعلق کوئی قانون پاس ہو سکے گا، الا یہ کہ مسلمان خود اپنے مذہبی احکام کی پابندی یا ان کی ترویج کے لیے کوئی مسودۂ قانون پیش کر سکیں''۔(۶)

مولانا کے نزدیک یہ مسئلہ ہندوستان میں اسلامی زندگی گزارنے کے لیے انتہائی ضروری تھا، لیکن اس وقت جس شدت سے اس مسئلہ کو اٹھایا جانا چاہیے تھا، نہیں اٹھایا جا سکا، مولانا نے اپنے مضمون میں تحفظ حقوق مسلمین کے دعویداروں کی جانب سے اس بے توجہی کا شکوہ بھی کیا ہے، بعد کے دنوں میں یہ ہندوستانی دستور کا حصہ بن گیا اور اسی کے سہارے آج مسلم پرسنل لا کی لڑائی لڑی جا رہی ہے، مولانا کی جو معروضات تھیں اس کی معنوی پرتیں آج کے ہندوستان میں کھلتی جا رہی ہیں اور ان امور پر توجہ کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔

مولانا کی نگاہ دنیاوی قوانین اور اس کے متعلقات پر بہت گہری تھی، وہ ہر وقت بیدار اور حساس رہا کرتے تھے، ناممکن تھا کہ پورے ہندوستان میں اسلام مخالف کوئی بل پیش ہو اور مولانا اس کے لیے سرگرم نہ ہوں، مرکزی حکومت کے ذریعہ وراثت بل جب پیش ہوا جس کے بعض دفعات شریعت کے خلاف تھے، مولانا نے اس مسئلہ پر محمد علی جناح سے کھل کر بحث کیا، پھر بعد میں اسلامی حقوق اور مسلم لیگ کے موضوع پر ایک طویل خط محمد علی جناح کو لکھا، جو بعد میں اسلامی حقوق اور مسلم لیگ کے نام سے شائع ہوا۔ جناب محمد یونس صاحب بار ایٹ لا نے جو انڈی پنڈنٹ پارٹی کی اسمبلی میں قیادت کر رہے تھے اور ایک سو بیس دن بہار کے حکمراں رہے، انہوں

نے مولانا کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے کہ!

''ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے سیاست میں حصہ لیا تو وہ بھی مذہب کے لیے، الیکشن میں حصہ لیا تو وہ بھی مذہب کے لیے، کانسل اور اسمبلی کے مباحثات میں حصہ لیا تو وہ بھی مذہب کے لیے''۔(۷)

امیر شریعت سادس حضرت مولانا سید نظام الدینؒ نے صحیح لکھا ہے کہ!

''حضرت مولانا محمد سجادؒ کو جو وقت ملا، جو زندگی ملی، جو صلاحیت حق تعالی کی طرف سے ان کو ودیعت ہوئی اور جو بصیرت ایمانی اور حمیت دینی ان کو عطا ہوئی تھی، اس سے انہوں نے کام لیا اور مختصر مدت کے اندر ایک ایسا انقلابی نقشہ بنا دیا، جو آج ہمارے سامنے ہے''۔(۸)

مختصر یہ کہ مولانا کی پوری زندگی ملت کے لیے وقف تھی، اعلی فکر اور سادہ زندگی آپ کا طرۂ امتیاز تھا، ملت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے والی اس شخصیت کی خدمات پر روشنی ڈالنے کے لیے چند صفحات کافی نہیں ہیں؛ بلکہ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے، مولانا کی زندگی اور خدمات کے دائرہ کو چند لفظوں میں بیان کرنا ہو تو شاعر کے اس شعر سے مدد لینی ہوگی۔

پھونک کر اپنے آشیانے کو
بخش دی روشنی زمانے کو

مصادر ومراجع

(۱) امارت شرعیہ دینی جد و جہد کا روشن باب: ۳۲

(۲) مقدمہ: امارت شرعیہ دینی جد و جہد کا روشن باب: ۴۶

(۳) حرف تعارف: امارت شرعیہ دینی جد و جہد کا روشن باب: ۱۱-۱۰

(۴) خطبۂ صدارت: ۴۴، ۴۳

(۵) حیات وخدمات: ۳۱

(۶) مقالات سجاد: ۸-۹

(۷) حیات سجاد: ۱۸۲

(۸) حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حیات وخدمت: ۱۳

حضرت مولانا سجاد کی سیاسی زندگی اوران کی قائم کردہ سیاسی پارٹی

ڈاکٹر سید حسنین احمد ندوی
پرنسپل ایس آئی ہائی اسکول، حیدرآباد

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ ایک نابغہء روزگار اور عہد ساز شخصیت کے مالک تھے، وہ اپنی ذات میں انجمن، علم میں اکیڈمی اور عمل میں کسی ادارہ سے کم نہ تھے، ان کے خیالات میں بلا کی ندرت اور مزاج میں غیر معمولی جدت تھی، وہ صبر وتحمل کے پیکر، دینی علوم وفنون کے ماہر، ماخذ و مراجع پر گہری نظر رکھنے والے، دین کے بہترین مبلغ، اسلام کے شاندار ترجمان، ملت کے بہی خواہ اور نگاہ بلند، سخن دلنواز کی چلتی پھرتی تصویر تھے، کھلے ذہن، وسیع المشرب، ذہن رسا کے مالک اور معاملہ فہمی میں اپنی مثال آپ تھے۔

آپ نے ایک دینی گھرانے میں آنکھیں کھولی اور آپ کی تمام تر تعلیم وتربیت روایتی دینی مدارس اور اسلامی ماحول میں ہوئی لیکن اس کے باوجود آپ نے زندگی کے ہر موڑ پر جس طرح اسلامی غیرت وحمیت کا مظاہرہ کیا، دین وملت کی جس طرح شاندار خدمات انجام دیں اور نہ صرف ممبر ومحراب؛ بلکہ سیادت وسیاست کے میدان میں بھی امام وقائد کا کردار ادا کیا، اسے دیکھ کر حیرت واستعجاب کے عالم میں بے ساختہ یہ شعر نوک قلم پر آجاتا ہے: ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔

۱۹۰۵ء میں مدرسہ سبحانیہ الہ آباد سے فراغت کے بعد آپ نے عملی زندگی کا آغاز درس و تدریس سے کیا اس طرح کہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا، بعد میں آپ نے دیگر کئی اداروں میں مسند تدریس کو زینت بخشا، درس وتدریس کا یہ دور تقریبا اٹھارہ سال پر مشتمل ہے۔ مولانا کو چونکہ شروع سے ہی کتب بینی اور مطالعہ کا بے پناہ شوق تھا اس حد تک کہ اس کی وجہ سے آپ کی بینائی کافی متاثر ہوگئی چنانچہ اواخر عمر میں آپ عوارض چشم سے کافی

پریشان رہا کرتے تھے، مطالعہ کی کثرت اور وسعت وتنوع نے آپ کی بصارت پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا؛ لیکن اس کی وجہ سے ہر معاملہ میں آپ کو جو بصیرت عطا ہوئی وہ مشکل سے ہی کسی خوش نصیب کے حصہ میں آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ جس مدرسہ میں بھی گئے، اس کے قالب میں ایک نئی جان پھونک دی، معیار تعلیم کو بلند کرنے کے علاوہ اس کے نظم ونسق میں بھی کافی بہتری پیدا کی۔

۱۹۱۱ء کا زمانہ، نہ صرف برصغیر بلکہ سارے عالم اسلام کے لئے انتہائی تشویشناک اور مشکل دوڑ تھا، ہندوستان برطانیہ کی غلامی کا جوا جلد سے جلد اتار پھینکنے کے لیے بے قرار تھا، آزاد ہندوستان کا خاکہ برہمن کمیونیٹی انتہائی چابک دستی کے ساتھ تیار کر رہی تھی اور برطانیہ اس میں شاطرانہ انداز میں رنگ بھر رہا تھا، اس لئے کہ ہندوستان کے برہمن اور برطانوی اس بات پر متفق تھے کہ مسلمانوں کو مکمل طور پر تباہ وبرباد کر دینا ہے، ملک کی صورتحال تیزی سے بدل رہی تھی اور ہر طبقہ کا لیڈر آئے دن گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا، ملک میں موجودوقتی خاموشی کسی خوفناک طوفان کے آمد کا پتہ دے رہی تھی۔ ہندوستان سے مسلم حکومت کے خاتمہ اور انگریزوں کے منحوس قدم یہاں جمنے کے بعد ایک بار پھر مسلمان کراس روڈ پر آ گیا تھا، وہ وقت اس فیصلہ کی گھڑی تھی کہ مسلمان سرزمین ہند پر عزت کے ساتھ شاد وآباد رہیں گے، یا نشان عبرت کے طور پر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دئے جائیں گے۔ دوسری جانب عالم اسلام کے خلاف جاری سازشوں، خاص طور پر خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے لیے کی جانے والی ریشہ دوانیوں کی خبریں مسلمانوں کو دہلائے دے رہی تھیں۔

اس میں شبہہ نہیں کہ تقریبا چھ سو سال بوڑھی یہ عثمانی خلافت اس طرح بتدریج سمٹتی جارہی تھی جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر اپنے وطن اصلی کی جانب عازم سفر ہو؛ اس لیے کہ عالم عرب کے علاوہ یورپ وافریقہ کا تھوڑا ہی علاقہ اس کے زیر اثر رہ گیا تھا، ہندوستان ویسے بھی راست طور پر کبھی بھی اس سے متعلق نہیں رہا، جو کچھ تھا وہ عقیدت واحترام کا معاملہ تھا بالکل ایسے جیسے کسی عقیدت مند مرید کا اس کے مرشد یا روحانی پیر کے ساتھ ہوا کرتا ہے، چنانچہ ہندوستان کے متعدد حکمرانوں کے بارے میں آتا ہے کہ وہ عثمانی خلیفہ کے دربار میں بیش قیمت تحفے ونذرانے بھیجا کرتے تھے اور بدلے میں خلعت فاخرہ ودعاء اقبال مندی سے سرفراز کئے جاتے تھے، اس طرح ترکی خلیفہ کا اقتدار تو چند ملکوں تک محدود تھا؛ لیکن وہ سارے عالم اسلام میں عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، وہ عالم اسلام کے لیے اتحاد کی ایک علامت تھے، محور ومرکز تھے اور خلافت کا وہ سنہری

سلسلہ جو حضرت ابوبکر صدیقؓ سے شروع ہوا تھا، اس کی آخری کڑی تھے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان خواہ دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتا وبستا ہو، اس کا دل خلافت کی عظمت ومحبت سے ہمیشہ معمور رہتا تھا، لہٰذا اس پر حملہ یا اسے ختم کیے جانے کی سازشوں کی خبر نے سارے عالم اسلام کو بے چین ومضطرب کردیا تھا، یہ تشویش ناک خبریں اردو اخبارات اور جرائد ومجلّات میں چھپتی رہتی تھیں اور مولانا کی نظروں سے گذرتی رہتی تھیں، البتہ انگریزی پریس میں یہ موضوع کچھ زیادہ تفصیل سے زیر بحث آتا تھا۔ مولانا انگریزی سے اس حد تک واقف نہ تھے کہ براہ راست انگریزی پریس سے استفادہ کرتے، پھر بھی آپ کے سوچ کی گہرائی، وسعت نظر اور حالات حاضرہ سے بھرپور واقفیت سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بالواسطہ سہی مولانا انگریزی صحافت پر بھی نظر رکھتے تھے، اس کا سلسلہ غالباً اس وقت شروع جب آپ الہ آباد کے ایک مدرسہ میں درس وتدریس سے وابستہ تھے، آپ کے شاگردوں میں زاہد خاں نامی طالب علم کا ذکر آتا ہے، جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے اور دینی تعلیم کے حصول کے سلسلہ میں مولانا کے پاس آیا جایا کرتے تھے، اکثر وہ اپنے ساتھ انگریزی اخبار وجرائد لاتے اور اہم ملکی وغیر ملکی خبریں پڑھ کر سناتے تھے، ہر جگہ مسلمانوں کے خلاف جاری سازشوں، دشمنوں کی ریشہ دوانیوں، اپنوں کی بے وفائی، امت کی غفلت و بے عملی، اپنے اوپر خطرات کے منڈلاتے بادل سے تجاہل عارفانہ اور پل پل قریب آتے طوفان سے اغماض کے رویہ نے مولانا کے دل ودماغ کو جھنجھور کر رکھ دیا، آپ کی سوچ بالکل بدل گئی، آپ نے محسوس کیا کہ وہ سیلاب بلا جو بتدریج قریب آرہا ہے اگر اس پر فوری بند نہ باندھا گیا تو یہ سب کچھ بہا لے جائے گا اور امت مسلمہ کے لیے اس کا مداوا محال نہیں تو مشکل ضرور ہوگا، مسند درس کی اہمیت اپنی جگہ، ممبر ومحراب کی فضیلت بھی اپنی جگہ؛ لیکن جب مسئلہ امت کے فنا وبقا کا ہو، معاملہ قوم کی زندگی وموت کا ہو تو ترجیحات میں تبدیلی نہ صرف وقت کا تقاضہ ہوتا ہے؛ بلکہ قومی وملی فریضہ بن جاتا ہے۔ اس خیال کے تحت مولانا درسی گوشۂ عافیت سے نکل پڑے، سیاست کی خاردار وادی کا رخ کیا اور بتدریج درس وتدریس کے مشاغل سے دور ہوتے چلے گئے، نو وارد ہونے کے باوجود آپ نے سیاست کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیا وہ نہ صرف عام لوگوں کے لیے؛ بلکہ سیاسی گروؤں کے لیے بھی اپنے اندر حیرت واستعجاب کی دنیا سموئے ہوئے ہے، آپ کی سیاست اور آپ کی سیاسی جد وجہد کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ہم اسے بین الاقوامی سیاست اور ملکی سیاست کے عنوان کے تحت ذکر کریں گے۔

بین الاقوامی سیاست:

مولانا سجادؒ نے جب سیاست میں قدم رکھا، اس وقت ہندوستان میں چوٹی کے علماء و دانشور موجود تھے جیسے شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مفتی کفایت اللہؒ، علامہ اقبالؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا آزاد سبحانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مبشر حسین قدوائی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر سید محمود آغا، علی برادران اور ظفر علی خاں وغیرہ، یہ سب نہ صرف گفتار؛ بلکہ کردار وعمل کے بھی غازی تھے اور نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سیاست میں بھی قیادت وسیادت کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ مولانا سجادؒ نے نہ صرف بہت جلد ان کے درمیان اپنی جگہ بنالی؛ بلکہ اپنی غیر معمولی صلاحیت، اصابت رائے، معاملہ فہمی اور خلوص وللّٰہیت کی وجہ سے مسلم قیادت کے اہم ستون اور قومی وملکی مسائل کے حل کے لیے کی جانے والی ہر کوششوں کا حصہ بن گئے۔

وہ بین الاقوامی مسئلہ جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو بے چین ومضطرب کر رکھا تھا، وہ خلافت عثمانیہ کا مسئلہ تھا، دراصل صلیبی جنگ میں شکست کے بعد سے ہی عیسائی دنیا مسلمانوں سے نفرت اور انتقام کی آگ میں جل رہی تھی، ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ترکی میں موجود خلافت عثمانیہ تھی؛ اسی لیے عیسائی دنیا اس کے خاتمہ کے لیے کوشاں تھی، مسلمان خلافت کے تحفظ کو خالص مذہبی معاملہ سمجھتے تھے اور اس کی بقا وسلامتی کو مذہبی فریضہ گردانتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ترکی ہندوستان سے تقریباً ۶۰۰۰ کیلومیٹر دور ہونے اور براہ راست کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود مسلم دلوں کی دھڑکن بنا ہوا تھا، اس پر آنے والی کوئی بھی مصیبت مسلمانوں کو بے چین وبے قرار کردیتی اور وہ اس کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے، چنانچہ ۱۸۹۷ء میں جب یونان نے ترکی کے خلاف جنگ چھیڑی تو ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی زبوں حالی کے باوجود چندہ کرکے ایک بڑی رقم سے ترکی کی مدد کی، اسی طرح ۱۹۱۲ء میں جب چند یورپی ممالک نے ترکی پر حملہ کیا اور اسے ٹکروں میں بانٹ دینے کی سیاست شروع ہوئی تو ہندوستانی مسلمانوں نے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا اندیشہ جیسے جیسے بڑھتا گیا ہندوستانی مسلمانوں میں اضطراب وبے چینی بڑھتی گئی، اس کو بچانے کے لئے منظّم طور پر کوششیں شروع ہوئیں، جس کا مرکز فرنگی محل لکھنؤ اور روح رواں مولانا عبدالباریؒ تھے۔ شروع میں قانونی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا گیا؛ مگر جب اس میں ناکامی ہوئی تو برطانیہ پر دباؤ بڑھانے کے لیے اسے ملک گیر تحریک کی

شکل دینے کا فیصلہ کیا گیا۔اس فیصلہ میں مولانا عبدالباریؒ کے ساتھ مولانا سجادؒ بھی شریک تھے، خلافت کمیٹی کے نام سے تحریک کا آغاز کیا گیا اور بمبئی میں مرکزی دفتر کا قیام عمل میں آیا اور پھر لکھنؤ، پھلواری شریف پٹنہ اور گیا میں مولانا سجادؒ کے ہاتھوں اس کے دفاتر کا قیام عمل میں آیا، اس کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس کے دفاتر قائم کئے گئے۔

جس زمانہ میں سارے ملک میں خلافت کمیٹی کا شہرہ تھا، اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے مختلف طرح کی کوششیں بھی جاری تھیں، اس میں مسلمان سب سے آگے تھے، البتہ جلد ہی انہیں احساس ہوا کہ اس جدوجہد میں اپنے ہم وطنوں کو ساتھ لے کر چلنے سے منزل تک جلد پہنچنے میں مدد ملے گی، اس کے لیے کسی ہندو قائد کو شریک سفر کرنے کی ضرورت تھی؛ تا کہ ہندو اور مسلمان مل کر آزادی کے لیے کام کریں، قرعۂ فال گاندھی جی کے نام نکلا، جو برطانیہ میں تعلیم کی تکمیل کے بعد ڈربن، افریقہ میں وکالت کرتے تھے، انہیں ہندوستان واپس جا کر اپنے ملک کے لیے کچھ کرنے کا مشورہ دیا گیا، اس طرح گاندھی جی ہندوستان واپس آئے، مسلمانوں نے ہندوؤں کو اپنی جانب راغب کرنے اور ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کے لیے گاندھی جی کو خلافت کمیٹی کا ذمہ دار بنا دیا، اس طرح گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کے خرچہ پر سارے ملک کا دورہ کیا اور خلافت کمیٹی کے روح رواں بننے کے ساتھ ساتھ جدوجہد آزادی کے سب سے بڑے ہیرو بن گئے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ترکی کی خلافت کو بچانا مشکل ہی نہیں؛ بلکہ ناممکن تھا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ترک مجاہدین کی مدد پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، یہاں تک کہ غیروں کی سازشوں اور اپنوں کی غداریوں کے نتیجہ میں خلافت عثمانیہ تاریخ کا حصہ بن گئی؛ لیکن اس المیہ سے قبل ہی گاندھی جی نے تحریک کے واپس لیے جانے کا اعلان کر دیا، اس نے مرکزی خلافت کمیٹی کی کمر توڑ دی، ان مشکل حالات میں بھی مولانا سجادؒ نے مرکزی وصوبائی خلافت کمیٹی کی خدمت جاری رکھی، آپ اس سے مایوس ہونے والوں میں آخری شخص تھے۔ بہرحال خلافت کمیٹی کے آغاز و انجام اور عروج وزوال میں اهل علم ودانش کے غور وفکر کے لیے بہت کچھ ہے، اس تحریک کی اپنے مقصد میں ناکامی کے باوجود اس کے بہت سے فائدے بھی ہوئے۔ سب سے زیادہ فائدہ گاندھی جی کو پہنچا، جنہوں نے خلافت کمیٹی کے خرچہ پر سارے ملک کا دورہ کر کے نہ صرف اپنی لیڈری مستحکم کر لی؛ بلکہ وہ موہن داس کرم چند گاندھی سے گاندھی جی بن گئے اور ان کی آتما ترقی کر

کے مہا آتما میں تبدیل ہوگئی، ان کی شہرت ملک کے کونے کونے تک پہنچی جبکہ پہلے خود ان کے وطن گجرات میں بھی انہیں جاننے والے چند ہی افراد تھے،اس کے علاوہ اس سے عمومی و منظّم جد و جہد کا تجربہ بھی ہوا، جس سے آزادی کی تحریک چلانے میں کافی مدد ملی۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ خلافت کمیٹی ملک کی آزادی کی تحریک میں تبدیل ہوگئی، اس کے علاوہ مسلمانوں کے درمیان جو انتشار تھا، اس سے اس میں کافی کمی آئی اور علماء برادری ایک دوسرے کے قریب آئی۔

گاندھی جی کو خلافت کمیٹی میں لانے اور انہیں قیادت کے منصب پر فائز کرنے سے جہاں ہندو مسلم اتحاد کے نظریہ کو تقویت ملی، وہیں لوکمانیہ تلک اور ان کے رفقا کے انتہا پسندانہ نظریات سے نمٹنے میں بھی کافی مدد ملی؛ اس لیے کہ گاندھی جی معتدل مزاج کے حامل تھے اور ہر معاملہ میں اعتدال کو پسند کرتے تھے، اس طرح گاندھی جی ہندو مسلم اتحاد کے ہیرو بن گئے اور تحریک آزادی پر چھا گئے، ان کے سامنے انتہا پسندوں کی دال نہ گلی، ورنہ اگر یہ انتہا پسند افراد اپنے عزائم میں کامیاب ہوجاتے تو آزاد ہندوستان کا نقشہ کافی مختلف ہوتا۔

ملکی سیاست:

خلافت عثمانیہ کو بچانے کے لیے کی جانے والی کوششوں میں مولانا سجاد صاحبؒ کی بھرپور شمولیت، آخر وقت تک زبردست جد و جہد اور ایثار و قربانی، صرف دین و ملت کے خاطر تھی، اس میں شبہہ نہیں کہ اس تحریک سے جو توقعات وابستہ تھیں پوری نہیں ہوئیں؛ لیکن آپ نہ مایوسی کا شکا ہوئے اور نہ حوصلہ شکنی کا؛ اس لیے کہ مرد مجاہد سود و زیاں سے بے نیاز صرف جد و جہد پر اپنی نظر رکھتا ہے؛ اس لیے بغیر کسی وقفہ کے آپ قوم و ملت کی شیرازہ بندی میں لگے رہے، وہ وقت دراصل ہندوستان میں برٹش حکومت کی جانکنی کا وقت تھا، ملک سیاسی افراتفری میں مبتلا تھا، ہندو انتہا پسند قوتیں ہندوستان سے اسلامی تشخص کو مٹانے کے درپے تھیں، جب کہ اس کے بالمقابل معتدل ہندو طبقہ گاندھی جی کی شاطرانہ قیادت کے جھنڈے تلے متحد ہو چکا تھا، اس کے بالمقابل مسلمان اپنے پست حوصلے، شکستہ عزائم، غداران ملت کی ایک بڑی کھیپ اور ضمیر فروشوں کے بے ہنگم جتھے کے ساتھ سارے ملک میں پراگندہ، بے حال اور منتشر تھے، اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اکبرالہ آبادی نے کہا:

گائے کا کچھ تو ٹھکا نہ بھائی گاندھی نے کیا
شیخ جی کا اونٹ کس کل بیٹھتا ہے دیکھئے

مولانا سجاد صاحب کو یہ فکر لاحق تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ملک میں آنے والی آزادی غلامی سے بدتر ثابت ہو، اس طرح کہ مسلمان انگریزوں کی غلامی سے نکل کر برھمنوں کے غلام بن جائیں، لہٰذا ملک کی آزادی کو مسلم موافق سمت دینے اور اس ملک میں اسلام کی سربلندی کے لئے آپ نے زبردست جدوجہد کی۔ ۱۹۱۷ء سے مولانا نے سرگرم سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور زندگی کی آخری سانس؛ یعنی ۱۹۴۰ء تک سیاست کی سنگلاخ اور پرپیچ وادیوں میں پھرتے رہے۔ آپؒ کی سیاست وہ روایتی سیاست نہ تھی، جو تن کی روحانی نمائش اور من کی مادی ہوس کا نتیجہ ہوا کرتی ہے، آپ کا سیاسی محرک صرف اعلاء کلمۃ اللہ اور خدمت خلق تھا، آپ چاہتے تھے کہ اس مشکل گھڑی میں امت کی اصلاح اور ان کی بہتری کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہے، ضرور کیا جائے۔ آپ کا خیال تھا کہ علماء کی قیادت وسیادت صرف منبر ومحراب اور مدرسہ وخانقاہ تک محدود نہ رہے؛ بلکہ سیاسی میدانوں میں بھی علماء امت کی قیادت کریں، اس سلسلہ میں آپ اس روایتی تقسیم کے قائل نہیں تھے، جس کے تحت یہ سمجھا جاتا ہے کہ علماء کو صرف دینی و مذہبی امور میں قیادت کا حق ہے اور سیاسی ودنیوی میدان صرف مسٹروں کے لیے مختص ہے۔

مولانا کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ مسلمانوں کے ذلت وادبار اور زوال وپستی کی ایک اہم وبنیادی وجہ مسلمانوں کے درمیان پایا جانے والا انتشار ہے، اس کے ازالہ کے لیے آپ نے علماء کو جوڑنے اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کی؛ تاکہ علماء سیاسی میدان میں بھی امت کی رہنمائی کریں اور ملک میں پیش آنے والے کسی بھی سیاسی چیلنج سے اجتماعی طور پر نمٹنے کے لئے تیار رہیں، اس کے لیے آپ نے پورے ملک کا دورہ کیا، علماء سے ملاقاتیں کیں، اس اہم کام کی جانب توجہ دلائی اور بطور نمونہ ''انجمن علماء بہار'' کے نام سے علماء کی تنظیم کی بنیاد بہار میں رکھی، جس کے بعد ''جمعیۃ علماء ہند'' کے نام سے علماء کی تنظیم کا قیام دہلی میں عمل میں آیا اور پھر تمام صوبوں میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں، جو اس وقت سے لے کر آج تک ہر مسئلہ میں امت کی قیادت ورہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

مولانا کا دوسرا اہم کام ملکی فریم میں رہتے ہوئے ایک ایسے مرکز کے قیام کی کوشش تھی، جس کے تحت مسلمان صحیح طور پر شریعت کے مطابق اپنی زندگی گذار سکیں اور انتشار وافتراق کی وہ کیفیت کم ہو، جس نے انہیں ملک میں اس حد تک بے وزن وبے حیثیت بنا کر رکھ دیا تھا کہ ان کی حالت ھباءً منثورا کی ہوگئی تھی، جسے جو جدھر چاہے لے اڑے۔ اس صورتحال میں تبدیلی کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کا ایک متفقہ امیر ہو، جس کی رہنمائی وسرپرستی میں مسلمان اپنی زندگی دین

وشریعت کے مطابق بسر کریں اور اللہ ورسول کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مسائل حل کریں، اس کے لیے آپ نے کافی جدوجہد کی، اس سلسلہ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا ابو الکلام آزادؒ وغیرہ سے، ملاقاتیں کیں اور اس مسئلہ کو عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ ان حضرات کے سامنے رکھا، سبھوں نے اسے پسند کیا اور کافی سراہا؛ لیکن اس کے باوجود اس سلسلہ میں کوئی عملی قدم اٹھایا نہ جاسکا، چنانچہ آپ نے اس خیال کو عملی نمونہ کے طور پر پیش کرنے کے لیے بہار میں اس کی بنیاد ڈالنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ ۱۹۲۰ء میں امیر شریعت کے طور پر حضرت مولانا شاہ محمد بدر الدین صاحبؒ کا انتخاب عمل میں لایا گیا اور اس طرح امارت کا قیام عمل میں آیا، یہ امارت حکومت میں حکومت کے قیام کی کوشش نہیں؛ بلکہ اس کا مقصد صرف مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور دینی امور میں ان کی رہنمائی تک محدود تھا۔ امیر کے انتخاب کے بعد دفتر امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا، جو بیت المال اور دار القضاء پر مشتمل تھا، اس ادارہ کے فیوض و برکات اب بھی جاری ہیں اور اس نے موافقین کو ہی نہیں؛ بلکہ مخالفین کو بھی کافی متاثر کیا ہے، اس طرح جمعیۃ علماء نے جہاں علماء کی صف میں اتحاد پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا، وہیں امارت کے قیام نے مسلمانوں کو ایک امیر کے تحت متحد ہو کر زندگی گذارنے کا موقع فراہم کیا، اسے خواب سے حقیقت بنانے میں مولانا نے جو جدوجہد کی وہ بلاشبہہ عظیم ہے۔

عملی سیاست :

مولانا اس بات کے قائل تھے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کے اسلامی تشخص کی بقاء و سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیاسی وزن اور آئینی طاقت حاصل کریں؛ تاکہ ملی مسائل کو حل کرنے میں اس سے مدد ملے اور اگر کوئی چیز مسلمانوں کے لیے خلاف مصلحت ہو تو اسے روکا یا رد کیا جاسکے، چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب مرکزی اسمبلی کا انتخاب عمل میں آیا تو اس میں مسلمانوں کے لیے مخصوص تین نشستوں پر انتخاب کا مسئلہ پیش آیا، مولانا نے امارت شرعیہ بورڈ کی جانب سے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور تینوں سیٹوں پر اپنا نمائندہ کھڑا کیا، دو سیٹوں پر امارت کے امیدوار کامیاب ہوئے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت جب ۱۹۳٦ء میں صوبہ بہار میں الیکشن کا اعلامیہ جاری ہوا تو آپ نے ملک کی سب سے بڑی پارٹی کانگریس سے مفاہمت کے خیال سے انہیں مسلمانوں سے متعلق ان کی پالیسی واضح کرنے کے لئے کہا؛ لیکن کانگریس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا، ملک میں دوسری بڑی پارٹی مسلم لیگ تھی، جو ملک کے بٹوارہ کی داعی تھی، مولانا

ملک کی تقسیم کے نظریہ کے خلاف تھے اور اسے مسلمانوں کے لیے خلاف مصلحت سمجھتے تھے؛ اسی لیے آپ میثاق لاہور ۱۹۴۰ء کو دیوانے کی بڑ کہا کرتے تھے جو کہ قرارداد پاکستان کے طور پر جانا جاتا ہے، لہٰذا اس سے کسی بھی قسم کی مفاہمت کا سوال ہی نہیں تھا، اس صورتحال کے پیش نظر آپ نے اپنی پارٹی میدان میں اتارنے کا فیصلہ کیا؛ تاکہ مسلمانوں کے مفادات کا بہتر طور پر تحفظ کیا جا سکے، چنانچہ آپ نے ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' کے نام سے اپنی سیاسی پارٹی بنائی اور بہار کی ایک ممتاز شخصیت بیرسٹر محمد یونس کو پارٹی لیڈر کے طور پر منتخب کیا۔ اس موقع سے مسلمانوں کے درمیان دو مزید پارٹیاں بنیں، ایک سید عبدالعزیز صاحب کی ''مسلم یونائیٹیڈ پارٹی'' اور دوسری شفیع داؤدی صاحب کی ''احرار پارٹی''، بہار اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے چالیس نشستیں محفوظ تھیں، ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں کانگریس کے علاوہ مذکورہ تینوں پارٹیوں نے حصہ لیا، ان کے نتائج کچھ اس طرح تھے:

مسلم انڈی پینڈنٹ پارٹی	۲۰
مسلم یونائیٹیڈ پارٹی	۷
کانگریس	۴
احرار پارٹی	۰
آزاد امیدوار	۹

مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کی غیر معمولی کامیابی بلا شبہ مولانا سجادؒ کی شاندار جدوجہد، غیر معمولی سیاسی بصیرت اور ان میں پائی جانے والی قیادت کی بے پناہ صلاحیتوں کا نتیجہ تھی۔ مولانا کی پارٹی کی اس شاندار کامیابی نے نہ صرف اپنوں؛ بلکہ غیروں کو بھی حیرت زدہ کر دیا، مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی جس نے کانگریس سے جزوی مفاہمت کے پیش نظر کئی مسلم حلقوں میں کانگریس امیدوار کے مقابلہ میں اپنا امیدوار کھڑا نہیں کیا، مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کی غیر معمولی کامیابی سے کچھ اس طرح جل بھن گئی کہ کانگریس کے لیڈر راجندر پرشاد جو آزاد ہندوستان کے پہلے صدر بنے، مولانا کی پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت سازی سے انکار کر دیا، پہلی بڑی پارٹی کانگریس نے جب حکومت بنانے سے انکار کر دیا تو گورنر نے ضابطہ کے مطابق دوسری بڑی پارٹی ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' کو حکومت سازی کی دعوت دی۔ اس حقیقت کا سب کو اندازہ تھا کہ یہ دعوت ایک عارضی اور عبوری مرحلہ کے سوا کچھ نہیں ہے، پھر بھی اس خیال سے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ملت کے مفاد میں کچھ کام ہو جائے، مولانا نے چند دنوں کیلئے ہی سہی حکومت سازی کا فیصلہ کر لیا،

اس طرح بہار میں ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' کی حکومت بنی اور بیرسٹر محمد یونس بہار کے وزیر اعلیٰ بن گئے، کانگریس کے ہندو وادی لیڈرس اس حکومت کو ہضم نہ کر سکے اور بیرسٹر محمد یونس کی نہ صرف مخالفت شروع کردی بلکہ کانگریس سوشل پارٹی کے سرگرم لیڈر جے پرکاش نارائن نے تو اس حکومت کے خلاف زبردست عوامی تحریک چھیڑ دی اور سارے بہار میں احتجاج کا سلسلہ شروع کر دیا، یہ وہی جے پرکاش نارائن ہیں، جنہوں نے ۱۹۷۴ء میں بہار کے چیف منسٹر عبد الغفور کے خلاف خوفناک عوامی تحریک شروع کی تھی جو بالآخر ایمرجنسی پر ختم ہوئی۔

انتہا پسند ہندوؤں کی شدید مخالفت اور بعض مقامی لیڈروں کے کانگریس پر حکومت بنانے کے لیے شدید دباؤ کی وجہ سے ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' کی حکومت گر گئی اور اس کی جگہ کانگریس نے حکومت بنائی، اس طرح مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کا دور حکومت بمشکل تین ماہ رہا؛ لیکن اس مختصر سے عرصہ میں بھی اس پارٹی نے مسلمانوں کے لئے جو بہت سے کام کیے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

کانگریس سے تعلق :

مولانا اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ ہندوستان دنیا کا وہ دوسرا ملک ہے، جہاں مسلمانوں کی آبادی سب سے زیادہ ہے؛ لیکن اس کے باوجود چونکہ آپ ایک عملی آدمی تھے اور حالات کی نزاکت کو بہت ہی بہتر طور پر سمجھتے تھے لہٰذا آپ نے انگریزوں سے نجات کے معاملہ میں اپنے ہم وطنوں کی رفاقت وتعاون کو کافی اہمیت دی اور مشترکہ دشمن کے خلاف مل کر جدوجہد کا فیصلہ کیا اور کانگریس پارٹی کے حجم، توازن اور یک گونہ اعتدال کو دیکھتے ہوئے اس کا ساتھ دینا پسند کیا۔ گاندھی جی کانگریس کے بنیادی ستون کی حیثیت رکھتے تھے، خلافت کمیٹی کی جدوجہد میں چونکہ آپ بھی گاندھی جی کے ساتھ شریک سفر تھے، اس کی وجہ سے آپ گاندھی جی کے کافی قریب آ گئے، اس تعلق نے بھی کانگریس پارٹی سے آپ کے تعلقات میں استواری و پائیداری لانے میں اہم رول ادا کیا، پھر بھی معاملہ گاندھی جی سے شخصی تعلقات کا ہو، یا کانگریس پارٹی کی روش و پالیسی جات کا، آپ نے ترجیح ہمیشہ دین وملت کی مصلحتوں کو دیا، یہی وجہ ہے کہ جب بھی کانگریس پارٹی کی کوئی ایسی پالیسی سامنے آئی، جس کی زد میں کسی شرعی اصول کے آنے کا اندیشہ ہوا یا کسی ملی مفاد کے متاثر ہونے کا، تو آپ نے کانگریس پر تنقید کرنے اور اسے اپنے اقدام کو واپس لینے پر مجبور کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کیا۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے؛ لیکن شرعی اصول وضابطے کی پامالی کی قیمت پر نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب ہندو مسلم اتحاد کا معاملہ شرعی حدود سے تجاوز کر گیا اور ہندوؤں سے یک

جہتی و یگانگت کے اظہار کے لیے بعض مسلمان بھی قشقہ لگانے، زنار لٹکانے اور ہندوؤں کی ارتھی کو کاندھا دینے وغیرہ جیسے کاموں میں جٹ گئے تو آپ نے ان چیزوں کی سختی سے مخالفت کی اور اس کے خلاف باضابطہ فتوی مرتب کیا، جو ''جمعیۃ علماء بہار'' کے اجلاس دربھنگہ ۱۹۲۰ء میں متفقہ طور پر منظور کیا گیا اور پھر تمام علماء کرام کے دستخط کے ساتھ شائع کیا گیا۔

ترک ذبیحہ گاؤ کے بارے میں بھی مولانا واضح و جرأتمندانہ موقف رکھتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ گائے کا تقدس، احترام اور اسے ماتا قرار دینا ہندوؤں کا مذہبی معاملہ ہے، جو وہ شوق سے کر سکتے ہیں؛ لیکن دوسروں کو اس کے لیے مجبور کرنا، دوسروں پر ہندو مذہب تھوپنے کے مترادف ہے، جس کی انہیں ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی ہے، چنانچہ اخبار میں جب یہ خبر چھپی کہ گاندھی جی اہم مسلمان لیڈروں کے ساتھ مل کر ملک کا دورہ کریں گے اور مسلمانوں کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کی خاطر ذبح گائے ترک کر دیں تو مولانا بے چین ہو گئے اور فرمایا کہ گاندھی جی سے میں خود اس مسئلہ پر بات کروں گا، اگر گاندھی جی کی سمجھ میں میری بات آ گئی تو ٹھیک ہے، ورنہ ان کے مقابلہ میں سارے ملک میں جلسہ کروں گا اور مسلمانوں کو ترک ذبح گائے پر مجبور نہیں ہونے دوں گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جب گاندھی جی بکسر پہنچے تو مولانا وہاں جا کر ان سے ملے اور اپنی بات انہیں اس طرح سمجھائی کہ گاندھی جی نے بہار کے سفر میں ترک ذبح گائے کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔

بہار میں جب کانگریس پارٹی کے دور حکومت میں ٹیننسی ایکٹ کے تحت جائیدادوں پر ٹیکس کا مسئلہ اٹھا تو آپ نے حکومت پر دباؤ ڈال کر اوقاف کی جائیداد کو اس سے مستثنی کروایا۔ دیہات سدھار کا محکمہ قائم ہوا تو اس میں اہنسا کی تعلیم کو بھی شامل کیا گیا تھا، مولانا نے اس کی شدید مخالفت کی اور اسے اسکیم سے نکلوایا۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں، جن سے اس بات کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا نے سیاسی دنیا میں رہ کر کس طرح دین وملت کی پاسبانی کی۔ مولانا کے سیاست کی اہم بات یہ تھی کہ اس کا محور دین وملت کا تحفظ تھا جو وہ آخری زندگی تک کرتے رہے۔ آپ نے اس راستہ میں لوٹنے کے بجائے لٹایا اور اس بات کو سچ کر گئے:

پھونک کر اپنے آشیانے کو
بخش دی روشنی زمانے کو

ایوان حکومت میں فکر سجاد کی باز گشت

پروفیسر شکیل احمد قاسمی
چیرمین فاران انٹرنیشنل فاؤنڈیشن، پٹنہ (انڈیا)

مفکر اسلام ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد فقیہہ النفس تھے، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی کی نظر میں، سابق وزیر اعلی بہار بیرسٹر محمد یونس اور ماہرین قانون کی نگاہ میں سیاسی بصیرت رکھنے والی عظیم شخصیت کے مالک، وہ ملت کی تعمیر و تنظیم کے لیے خدمت کرنے میں سب سے آگے رہتے، عہدہ، منصب قبول کرنے میں پیچھے رہنا پسند کرتے، خلافت کمیٹی کے قیام میں وہ بے حد سرگرم رہے اور قیادت تسلیم کی حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کی، جمعیۃ علماء کے قیام میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے قیادت کا منصب حوالے کیا، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کو، امارت شرعیہ ان کے فکر و خیال سے وجود میں آئی؛ لیکن امیر شریعت بنایا خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشیں حضرت مولانا سید شاہ بدرالدین علیہ الرحمہ کو۔ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی بنائی، مولانا سجاد صاحب نے اور پارٹی لیڈر، پریمیر اور وزیر اعظم بننے کا موقعہ دیا بیرسٹر محمد یونس کو، خود پارٹی کے دستور پر کاربند رہ کر اراکان کی اس طرح ذہن سازی کرتے رہے کہ ایوان حکومت میں فکر سجاد کی باز گشت سنائی دینے لگی۔ ماہر قانون بیرسٹر محمد یونس سابق وزیر اعلی بہار حضرت مولانا کی سیاسی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ’’مولانا کے ساتھ قومی، سیاسی، دستوری اور آئینی ہر طرح کے کام کرنے کا مجھ کو شرف حاصل رہا، وہ معاملہ کی روح اور اس کی سیاست کو سمجھ جاتے تھے۔ موجودہ سیاسی لٹریچر کی زبان سے وہ نا آشنا تھے اور آئین ہند کے مطالعہ سے وہ بالکل دور تھے؛ لیکن وہ اس قدر قریب سے اسے دیکھتے تھے کہ اس کے جوار کار رہنے والا ششدر ہو جاتا تھا‘‘۔

ڈاکٹر سید محمود، سابق وزیر تعلیم، حکومت بہار کی نگاہ میں:

> ’’مولانا سجاد تدبر اور ملکی مسئلوں کے فہم و گرفت میں کسی بڑے سے بڑے سیاسی مدبر سے کم نہیں تھے، خالص قانونی اور دستوری موشگافیوں میں بھی ان کا دماغ پوری طرح کام کرتا تھا‘‘۔

بیرسٹر شفیع داؤدی احرار پارٹی کے صدر اور حضرت مولانا سجاد کے سیاسی حریف اعتراف کرتے ہیں:

''میں مولانا کے تبحر علمی اور سیاسی بصیرت کا قائل ہوں''۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سابق رکن پارلیمنٹ نے خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند مرادآباد کے سلسلہ میں فرمایا کہ!

''حضرت مولانا ابو المحاسن سجاد کا خطبہ صدارت سیاسیات اسلامی کی بہترین انسائیکلو پیڈیا ہے''۔(۱)

مولانا ریاست علی ندوی کہتے ہیں:

''مولانا کا سیاسی مطالعہ وسیع تھا، اسلامی ممالک کے حالات سے باخبر رہتے تھے، کسی یورپی زبان پر قدرت نہ رکھنے کے باوجود یورپ کے دستوری نظام حکومت کی تفصیلات پر حیرت انگیز عبور رکھتے تھے، سیاسیات کے مطالعہ کے لحاظ سے جماعت علماء میں کوئی ایسا دوسرا صاحب فضل موجود نہیں''۔

علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

''مولانا ابوالمحاسن سجاد سے سارا گھر روشن تھا، وہ وطن کی جان اور بہار کی روح تھے، ان کا وجود سارے ملک کے لیے رحمت تھا''۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پرانے چراغ میں رقمطراز ہیں:

''میرے محدود علم میں مولانا محمد سجاد جیسا دقیق النظر اور عمیق العلم عالم دور دور تک نہ تھا''۔

مولانا منظور نعمانی کا خیال ہے:

''مولانا سجاد طبقہ علماء میں اسلامی سیاست کے اعلی ماہر تھے''۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کہتے ہیں کہ!

''مولانا نے اسمبلی اور کاؤنسل پر قبضہ کر کے وزارت قائم کی اور سیاسی اقتدار وقوت ہاتھ میں لی، مولانا کا ایمان تھا کہ اسلامی نظام حکومت وزندگی بنی نوع انسان کے دینی اور دنیاوی فلاح کا ضامن ہوسکتا ہے۔ مولانا کا خیال تھا کہ ہر قوم یا جماعت کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سیاسی اور آئینی طاقت حاصل کرے''۔(۲)

مولانا عثمان غنی سابق ناظم امارت شرعیہ کے خیال میں:

''اسمبلی اور کونسل میں جب بھی کوئی مسودہ قانون آیا، جس کا کوئی اثر کسی اسلامی معاملے پر پڑتا ہو تو سب سے پہلے مولانا سجاد صاحب اس کی مخالفت فرماتے تھے اور راقم

الحروف کو خاص تاکید تھی کہ جب کوئی مسودہ قانون، یا کسی عدالت کا فیصلہ ایسا ہو، جس کی زد کسی اسلامی قانون پر پڑتی ہو تو فوراً اس کی مخالفت میں مضامین لکھو اور جمعیۃ علمائے ہند کو خط کے ذریعے اطلاع دو''۔(۳)

حضرت مولانا سجاد کی عملی سیاست میں شرکت وشمولیت کے حقیقی مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے سیاسی لحاظ سے ان سے بے حد قریب بیرسٹر محمد یونس سابق وزیر اعلی بہار کہتے ہیں:

''ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے سیاست میں حصہ لیا تو وہ بھی مذہب کے لیے، کاؤنسل اور اسمبلی کے مباحثات میں حصہ لیا تو وہ بھی مذہب کے لیے اور یہ سب ایسی باتیں ہیں، جو انڈیپنڈنٹ پارٹی کے منشور اور اس کے خطبہ استقبالیہ وغیرہ کے واقف کار پر روز روشن سے بھی زیادہ واضح ہیں، ان کی حرکت وعمل اور فکر ونظر کا مرکزی نقطہ مذہب رہتا تھا''۔(۴)

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کی عبقریت، ہمہ جہت صلاحیت وخدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہم یہاں ان کی سیاسی کوشش وکاوش کا جائزہ لیتے ہیں۔ 14/ستمبر 1936 کو انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں حضرت مولانا حافظ احمد سعید صاحب جنرل سکریٹری جمعیۃ علمائے ہند کی صدارت میں مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا تاسیسی عظیم الشان اجلاس ہوا اور قوانین ہند کے تحت 1937 کے الیکشن میں پارٹی نے حصہ لیا، 40 سیٹ مسلمانوں کے لیے ریزرو تھی، اس وقت مسلم لیگ، کانگریس پارٹی، مسٹر عبدالعزیز کی مسلم یونائیٹڈ پارٹی، بیرسٹر شفیع داؤدی کی احرا پارٹی، مولانا سجاد کی مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی موجود تھی۔

مولانا سجاد نے اپنی سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے ایسا ماحول بنایا کہ مسلم لیگ نے اپنا کوئی امیدوار میدان میں اتارنے کی ہمت نہیں کی، جمعیۃ علما، امارت شرعیہ اور خلافت کمیٹی کے پرانے کیڈر کو ساتھ لے کر الیکشن لڑا گیا، عوام کی حمایت اور اعتماد کا جو نتیجہ سامنے آیا، اس نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ 40 سیٹ میں سے مولانا سجاد کی مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کو 20 اور ان کی حمایت سے 8 (کل 28)، کانگریس جیسی نیشنل پارٹی کو 5، مسٹر عبدالعزیز کی مسلم یونائیٹڈ پارٹی کو 3 بیرسٹر شفیع داؤدی کی احرار پارٹی کو 3 اور خاتون کے لیے ریزرو سیٹ پر لیڈی انیس امام کامیاب ہوئیں۔ قابل ذکر ہے کہ مولانا سجاد کی پارٹی کے کام یاب ممبران میں 10 افراد حافظ اور مولوی تھے، انہیں میں حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی کا نام شامل ہے، جو شمالی بھاگلپور سے کام یاب ہوئے تھے۔

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کو حکومت سازی کی دعوت دی گئی۔ 3/مارچ 1937 کو امارت شرعیہ

کے امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ بدرالدینؒ، سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ نے پھلواری شریف پٹنہ میں نومنتخب ارکان اور مجلس عاملہ کے ممبران کو طلب کیا، سارے لوگ 9 بجے صبح میں پہونچے، 10 بجے حضرت نائب امیر شریعت اور پارٹی کے صدر مولانا ابوالمحاسن سجاد نے منتخب ارکان اور مجلس عاملہ کے ممبران کا تعارف کرایا، اس کے بعد حضرت امیر شریعت نے ارکان کو کاموں کے متعلق ایک مختصر سی ہدایت فرمائی، کھانے کے بعد سب لوگ بانکی پور، پٹنہ لوٹ گئے، پھر 2 بجے دن میں حاجی شرف الدین حسن صاحب کی کوٹھی پر مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا، اس کے بعد 4 بجے نماز عصر کے بعد مجلس عاملہ اور منتخب ارکان کی مشترکہ نشست ہوئی، کچھ کاروائیوں کے بعد نشست چائے اور نماز مغرب کے لیے ملتوی ہوگئی، بعد نماز مغرب بحث وتمحیص کے بعد پارٹی لیڈر وغیرہ کا انتخاب ہوا۔ پارٹی لیڈر: مسٹر حاجی محمد یونس بیرسٹر، ڈپٹی لیڈر: مولوی رفیع الدین رضوی ایڈوکیٹ، چیف وہپ: قاضی سید محمد الیاس، وہپ: مولوی سید محمد طاہر ایڈوکیٹ بنائے گئے۔ مجلس اور پارٹی کے صدر حضرت مولانا سجاد نے ایک مختصر تقریر فرمائی اور نشست 9 بجے رات میں ختم ہوئی۔ (۵)

نشست ختم ہونے کے بعد حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی کے ساتھ پیدل پٹنہ جنکشن پہنچے؛ تاکہ ٹم ٹم پر سوار ہوکر پھلواری شریف چلے جائیں؛ لیکن رات زیادہ ہونے کی وجہ کر کوئی سواری نہ مل سکی اور جس پارٹی کی بہار میں حکومت بننے والی تھی اور جس کا پارٹی لیڈر ابھی طے کر کے صدر محترم اٹھے تھے؛ خاکساری، انکساری، بے نفسی کے اس عمل پر تاریخ کو حیرت ہوگی کہ وہ پارٹی کا صدر باوقار پٹنہ سے پیدل پھلواری شریف جاتے ہوئے زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ!

میں کہاں رکتا ہوں عرش وفرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حد پرواز سے

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی نے حکومت بنائی اور مختصر مدت میں عظیم کارنامے انجام دئے، پارٹی کا دور حکومت 1.4.1937 سے 19.7.1937 تک رہا، مسٹر محمد یونس بیرسٹر فرسٹ پریمیر آف بہار کی حیثیت سے رہے؛ یعنی کل 110 دن۔ اس قلیل مدت میں فنڈ کی کمی کے باوجود انہوں نے بہار قانون ساز اسمبلی، بہار قانون ساز کونسل اور پٹنہ سول کورٹ کی عالی شان عمارت تعمیر کرائی، ان عمارتوں پر آج بھی 1937 نمایاں طور پر لکھا ہوا ہے۔

عدالتوں میں اردو رسم الخط کے استعمال کے متعلق حسب ذیل سرکاری اعلان اس وزارت نے جاری کیا۔

’’کافی غور وخوض کے بعد وزارت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ اردو تحریر کے استعمال کی اجازت پٹنہ کمشنری سے باہر بھی کیوں نہ دی جائے؛اس لیے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہاں جون 1937 سے تمام عدالتوں اور دفتروں میں اردو تحریر مستقل بنیاد پر جاری کردی جائے‘‘۔

حکومت کے اس فیصلہ پر دیگر لوگوں کے ساتھ قاضی عبدالودود بیرسٹر نے مبارک باد پیش کی ،فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رکھنے کے لیے پوری قوت ارادی کا اظہار کیا، ہندو مسلمان کے ساتھ مساویانہ سلوک، وغیرہ۔ وزارت کے ختم ہونے کے بعد بھی اسمبلی میں مضبوطی کے ساتھ اسلامی فکر کی ترجمانی ہوتی رہی؛ بلکہ اسمبلی میں اظہار خیال سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی اسلامی حکومت کا ممبر اسمبلی اپنے خیالات کا اظہار کررہا ہے، میں نمونہ کے طور پر ایک ممبر اسمبلی حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی کی ایک تقریر کا حوالہ دیتا ہوں۔

۱۹۳۷ء میں حکومت بہار نے زراعتی آمدنی پر ٹیکس لگانے کے لئے ایک بل پیش کیا، اس بل میں اسلامی اوقاف پر بھی ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی گئی تھی، مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی ممبر اسمبلی نے بل کے اس حصہ کی مخالفت میں مختصر تقریر فرمائی اور یہ بیان دیا کہ اسلامی اوقاف پر ٹیکس لگانا شرعا جائز نہیں ہے، حکومت بہار کے مشیر قانون مسٹر بلدیو سہائے نے اپنی تقریر میں چیلنج کیا کہ قرآن وحدیث سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اوقاف پر ٹیکس لگانا درست نہیں، حضرت مولانا رحمانی نے اس چیلنج کو قبول کیا اور نہایت مدلل ومفصل تقریر کی، جس کے نتیجہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے پٹنہ تشریف لائے، حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب سے گفتگو ہوئی اور حکومت کو اپنے ارادہ سے باز آنا پڑا۔ اس تقریر میں مولانا رحمانی کی جرأت وبے باکی، حاضر دماغی، مسائل پر نگاہ ونظر کے ساتھ فکر سجاد کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

مصادر ومراجع

(۱) حیات سجاد، ص:77
(۲) حیات سجاد، ص:20
(۳) حیات سجاد، ص116
(۴) حیات سجاد، ص:183
(۵) نقیب۔4/ مارچ 1937

باب چہارم

افکار ونظریات

مفکر اسلام حضرت مولانا محمد سجادؒ کے دوانمٹ نقوش

قیام امارت شرعیہ ونظام دار القضاء

حضرت مولانا محمد قاسم مظفر پوری
قاضی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

اس دار فانی میں کچھ شخصیتیں ایسی پیدا ہوتی ہیں، جن کی زندگی مر کر بھی باقی رہتی ہے، ان کے افکار وآرا، جہد مسلسل، اخلاص وللہیت، خدمت خلق، بے خوف ومصلحت کے منافقانہ خول سے آزاد ان کے باعظمت فیصلے، زہد وقناعت، علمی وفکری قوت اوران کی شب بیداری اورامت کی سربلندی کے لیے ان کی ہمہ جہت کوششیں انہیں مرنے نہیں دیتی ہیں، وہ ہمیشہ علماء، دانشوران، قائدین اورامت کے جانباز سیاحوں کے لیے ایک آئیڈیل کی شکل میں رہبر منزل کا درجہ رکھتے ہیں، زمین چاہے ان کے گوشت وپوست کو ہضم کر جائے، مگران کے فولادی افکار اورمجاہدانہ کوششوں کوتاریخ نے اپنے سینہ کی امانت بنالیا ہے، اب وہ تادیر آنے والوں کے لیے ایک روشن اورقابل تقلید شخصیت بن کر زندہ رہتے ہیں، مشہور عربی ادیب عبداللہ بن محمد البطلیوسی نے صحیح کہا ہے:

أخوا العلم حی وخالد بعد موته
واوصاله تحت التراب رحیم

ان ہی شخصیات میں سرفہرست نام مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کا ہے، حضرت مولانا کی شناخت اپنے عصر کے علماء میں فخر گلشن سے ہے، اللہ پاک نے آپ کو خالص علمی وتحقیقی ذوق، فقہی بصیرت، سیاسی شعور کی پختگی، ملکی قوانین سے آگہی، اسلام مخالف سازشوں سے باخبری، ملت اسلامیہ کے مسائل کا ادراک، امت کی شیرازہ بندی اورانسانیت کی فلاح کے لیے ہمہ جہت کوشش، جیسی اہم صفات سے نوازا تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے آپ کی ذات ایک یگانۂ روزگار کی حیثیت رکھتی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس فقہی بصیرت اورسیاسی ادراک سے نوازا تھا کہ ہم عصر علما کو ہر اجتماعی مسئلہ

میں آپ کی رائے کا انتظار رہتا اور آپ ہی کی رائے عام طور پر فیصلہ کن ثابت ہوتی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری لکھتے ہیں:

''جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب دلائل و براہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے تو حضرت مفتی صاحب (مفتی کفایت اللہ صاحبؒ) بھی بے حد متأثر ہوتے اور ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان سے کلمات تحسین نکل جاتے''۔(۱)

حضرت مولانا کی شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن اور ہمہ جہت صفات کی حامل تھی، آپ کی عملی زندگی کی اکائیاں بہت سے علما اور اہل علم ونظر کی زندگی کے برابر کہی جاسکتی ہیں، سید الطائفہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے تعزیتی مضمون میں لکھتے ہیں:

''ان کی تواضع میں بلندی، سادگی میں تناؤ اور خاموشی میں گویائی تھی، وہ اکیلے تھے؛ لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے، سراپا حال تھے، کہتے کم اور کرتے زیادہ تھے، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ راہ اور منزل کے فرق کو کبھی فراموش نہیں کیا''۔(۲)

زیر نظر مضمون میں راقم الحروف نے حضرت مولانا کی علمی زندگی کا ایک اہم تاریخی، زندۂ جاوید کارنامہ ''قیام امارت شرعیہ اور نظام قضاء'' سے متعلق کچھ سطریں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات کا نام ہے، جس میں زندگی کے تمام شعبہ جات، خواہ ان کا تعلق شخصی ہو، یا سماجی، سیاسی ہو یا معاشرتی، عدالتی ہو یا معاشی، شامل ہیں، چوں کہ تخلیق انسانی کا مقصد ہی روئے زمین پر خلافت الٰہی کا قیام ہے اور اسلام تا قیامت انسانیت کی رہبری کے لیے ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے نہایت جامع نظام عطا کیا ہے اور مسلمان ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ خدا اور رسول کے احکامات کو زندگی کے تمام شعبہ جات میں نافذ کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ صرف عقائد وعبادات میں ہی اطاعت خداوندی کی جائے اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں رب کائنات کے نازل کردہ احکامات کو پس پشت ڈال دیا جائے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ شناخت کا حامی ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت اور شرعی قوانین کا اجرا اسلام کے بنیادی احکامات میں شامل ہے اور شرعی حکومت کے قیام کی اگر کوئی صورت ہو تو اس کی کوشش ایک اہم دینی فریضہ ہے، چنانچہ ایسے

علاقے میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں اسلامی حکومت اور شرعی قوانین کا اجرا ناممکن ہو، وہاں کم از کم شرعی امارت کے قیام کی بات فقہانے لکھی ہے، علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

”وإذا لم يكن سلطان ولا من يجوز التقلد كما هو في بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار كقرطبة في بلاد المغرب الآن، يجب عليهم أن يتفقوا على واحد منهم يجعلونه واليا فيولى قاضيا أو يكون هو الذي يقضي بينهم“. (۳)

(اور جب مسلمان بادشاہ نہ ہو اور نہ ہی ایسا شخص ہو، جسے قاضی کی تقرری کا اختیار ہو، جیسا کہ یہ حالت بعض ان مسلم ملکوں کی ہے، جن پر کفار کا غلبہ ہو گیا ہے، جیسا کہ مغربی ممالک میں قرطبہ، ایسی حالت میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ متفق ہو کر کسی مسلمان کو حاکم یا والی بنالیں، پھر وہ قاضی کی تقرری کرے، یا خود ہی کار قضا انجام دے۔)

ہندوستان پر مغل حکمرانوں کے بعد جب انگریزوں کا ظالمانہ قبضہ ہوا تو رہے سہے اسلامی تشخص کے ختم کئے جانے کا اندیشہ علما کو ہونے لگا، تو سب سے پہلے مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کی نگاہ دوررس اور فقہی بصیرت نے ان حالات میں شدت سے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ پورے ہندوستان کے لیے ایک امیر کی تعیین ہو جائے اور مسلمان اپنی زندگی امیر کی اطاعت اور اس کی امارت میں گذاریں، مگر جب کل ہند سطح پر امارت کے قیام میں کچھ پریشانیاں نظر آئیں تو آپ نے سرزمین بہار واڑیسہ میں اس کا قیام عمل میں لایا اور یہاں کے مسلمانوں کو شرعی امارت کے تحت زندگی گذارنے کا موقع فراہم فرمایا۔

مسلمانوں کے لیے ایک امیر کا انتخاب اور امیر کے تحت زندگی گذارنے کی اہمیت کے سلسلے میں آپ کے دل میں جو سوز دروں تھا، اس کا اندازہ ہم آپ کی اس تقریر سے لگا سکتے ہیں:

”اسلام ایک تنظیمی مذہب ہے، اس مذہب کی روح ڈسپلن اور نظم چاہتا ہے، اگر مسلمان منتشر رہیں اور کسی ایک شخص کی اطاعت نہ کریں اور اپنا کوئی امیر منتخب نہ کریں تو یہ زندگی غیر شرعی زندگی ہوگی“۔ (۴)

قیام امارت کی ضرورت واہمیت کو واضح کرنے کے لیے آپ کے یہ کلمات علماء کرام کے لیے نہایت چشم کشا ہیں، اسی طرح پٹنہ کی پتھر والی مسجد میں جب آپ نے بہار واڑیسہ کے علماء ومشائخ کی موجودگی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں قیام امارت کا اعلان کیا تو علماء کو

جھنجھوڑتے ہوئے کہا کہ:

''جب تک حکومت کافرہ کا مسلمانوں پر تسلط ہے اور جب تک مسلمان اس ابتلا میں مبتلا ہیں اور جس وقت تک مسلمان سیاسی اقتدار کے مالک نہ ہوجائیں، اس وقت تک ایسے اقتصادی اور معاشرتی کاموں کے لیے اپنا ایک امیر منتخب کریں اور اس کی اطاعت وفرماں برداری پر بیعت کریں؛ تاکہ کفرستان میں جس قدر ممکن ہوسکے مسلمان اپنی زندگی کو شرعی بناسکیں''۔

بالآخر صوبۂ بہار واڑیسہ میں آپ کی مخلصانہ ومجاہدانہ کوششوں سے امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے آپ کو اس انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

''بہار میں امارت شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت ہے؛ کیوں کہ زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں کھلکھلاتی کھیتی کھڑی کرلینا ہر ایک کا کام نہیں''۔(۵)

قیام امارت کے بعد آپ کا سب سے بڑا کارنامہ امارت کے تحت دارالقضاء کے قیام کا ہے، کیوں کہ ایک مسلمان کا یہ شرعی فریضہ ہے کہ وہ اپنے معاملات کا حل خدا اور رسول کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق کرائے اور اسی دارالقضاء سے ہر سطح پر احقاق حق کا فریضہ ادا ہوسکتا ہے اور یہی امن عالم کا ذریعہ بھی ہے، اگر عالمی سطح پر عدالتی نظام بہتر ہوجائے تو یقیناً پوری دنیا میں عدل وانصاف کی حکمرانی ہوگی اور ظالم ومظلوم کو اس کا حق مل سکے گا اور موجودہ زمانہ میں بڑی حکومتوں کے ظلم وجور کا جو سلسلہ جاری ہے، انسانیت کو اس سے نجات مل سکے گی۔

قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے متعدد مقامات پر حکم خداوندی کے مطابق ہی فیصلہ کرانے کا حکم نازل فرمایا، ارشاد ربانی ہے:

﴿اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولیٰ الامر منکم﴾(۶)

(اللہ، رسول اور اولوالامر کی فرمانبرداری کرو۔)

یہاں اولوالامر سے مراد جس طرح ارباب حکومت ہیں، اسی طرح فقہا اور علماء دین بھی ہیں، مشہور مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''والظاهر واللّٰه أعلم أنها عامة فى كل أولى الأمر من الأمراء والعلماء''.(۷)

(میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ اس سے مراد علماء وامراد دونوں ہی ہیں واللہ اعلم)

اسی طرح مسلمانوں کی صفت قرآن پاک میں یہ بیان کی گئی ہے کہ جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردیں تو وہ سر تسلیم خم کرتے ہیں ارشاد ربانی ہے:

﴿انما کان قول المؤمنین اذا دعوا الی اللّٰہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا﴾(۸)

اسی طرح بعض آیات میں صراحت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ احکام خداوندی کے مطابق ہی فیصلہ کریں:

﴿فاحکم بینھم بما انزل اللّٰہ﴾(۹)

بلکہ مزید صراحت کے ساتھ حکم ربانی نازل ہوا کہ اے نبی! آپ حکم خداوندی کے مطابق ہی فیصلہ کریں، ان (کفار مکہ) کی خواہش کے مطابق نہیں۔

﴿وان احکم بینھم بما انزل اللّٰہ ولا تتبع اھوائھم﴾(۱۰)

مسلمانوں کو بھی تاکید کی گئی کہ اپنے مسائل کے حل کے لیے دربار نبوت میں ہی حاضری دیں اور وہیں سے اپنے فیصلے کرائیں، ارشاد ربانی ہے:

﴿فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکمون فیما شجر بینکم﴾(۱۱)

مذکورہ بالات آیات میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی کہ وہ اپنا فیصلہ احکام شرع کے ہی مطابق کرائیں، چنانچہ اگر کوئی اسے نہ مانے اور احکام خداوندی کے مطابق فیصلہ کرانے پر راضی نہ ہو تو اس کے بارے میں قرآن مجید میں سخت ترین وعید بھی نازل ہوئی، ارشاد باری ہے:

﴿من لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الظالمون﴾(۱۲)

(جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق اپنا فیصلہ نہ کرائیں تو ایسے لوگ ظلم کرنے والے ہیں۔)

دوسری بعض آیات میں ایسے شخص کو فاسق؛ بلکہ کافر سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔(۱۳)

تعبیر کی یہ سختی یقیناً معاملہ کی سنگینی کی طرف اشارہ کرتی ہے، بعض اہل تفسیر ان آیات کا مخاطب بنو اسرائیل کو قرار دیتے ہیں، مگر الفاظ قرآنی کے عموم سے اس کے مخاطب کی عدم تعیین زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے۔

شریعت اسلامی کے دوسرے اہم مصدر احادیث نبویہ میں بھی اس کی اہمیت وفضیلت سے

متعلق بہت سی روایات موجود ہیں، کتب حدیث کی تمام اہم کتابوں میں اس موضوع سے متعلق ابواب محدثین نے قائم کئے ہیں اوران میں موضوع سے متعلق احادیث کو جمع کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کارقضا سے مربوط افراد کی بہت سی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں، جن سے یقیناً اس کام کی اہمیت اوراس سے جڑے ہوئے علماء کی فضیلت کا اندازہ ہمیں ہوتا ہے۔

قیامت کے دن جن سات قسم کے لوگوں پر اللہ کا خاص کرم ہوگا اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے خصوصی سایہ میں ہوں گے، ان میں سب سے پہلا شخص وہی ہوگا، جو انصاف پرور قاضی یا حاکم ہو۔ (۱۴)

اسی طرح جن لوگوں پر رشک کیا جاسکتا ہے، ان میں ایک وہ شخص بھی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے حکمت سے نوازا ہو اور وہ اس سے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہو اوراس پر عمل بھی کرتا ہو۔"**لا حسد إلا فی اثنین... رجل أتاه اللّٰه الحکمة فهو یقضی بها ویعمل بها**". (۱۵)

کارقضا کی اہمیت وفضیلت کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تلمیذ خاص، مشہور فقیہ، صحابی جلیل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول انتہائی اہمیت کا حامل ہے، آپ فرماتے ہیں:

"**لأن أقضی یوما أحب إلی من عبادة سبعین عاما**". (۱٦)

(میں ایک دن لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں خرچ کردوں یہ میرے لیے ستر (۷۰) سال کی عبادت سے بہتر ہے۔)

اسی طرح مشہور تابعی مسروقؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن منصفانہ اورعادلانہ طریقہ پر فیصلہ کروں، وہ میرے لیے ایک سال کے جہاد سے افضل ہے۔

"**لأن أقضی یوماً واحدًا بحق وعدل أحب إلی من سنة أغزوها فی سبیل اللّٰه تعالیٰ**". (۱۷)

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ممالک میں جہاں مسلمانوں کو قوت نافذہ حاصل نہیں ہے، وہاں شرعی عدالت کا قیام کیسے ممکن ہے، اگر شرعی فیصلہ کر بھی دیا جائے تو اسے نافذ کس طرح کیا جائے گا؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو قوت نافذہ حاصل نہیں ہے؛ لیکن اگر ہم شرعی

قوانین کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جن امور میں قوت نافذہ کی ضرورت ہے، وہ چند ہی ابواب ہیں، مثلاً جنایات، حدوداور قصاص وغیرہ ابواب، جب کہ ان کے علاوہ زندگی کے دوسرے ابواب جن کا تعلق سماجی، معاشرتی اور معاشی مسائل سے ہے، ان میں قوت نافذہ خوف خدا، فکر آخرت، فلاح دارین کا جذبہ اور خداورسول کی اطاعت ہی ہے، چنانچہ ہم یہاں کے حالات کے مطابق اتنے ہی کے مکلّف ہیں کہ مذکورہ شعبۂ ہائے مسائل میں احکام شرع کے مطابق اپنا فیصلہ کرائیں اور خاص طور پر مسلم پرسنل لا سے مربوط مسائل کے فیصلے کے لیے ہم دارالقضاء کا ہی رخ کریں۔

دارالقضاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے نظام قضا کو سرکاری عدالتی نظام نے بھی سراہا ہے، جو اس کے مفید اور قابل تقلید عمل بننے کی روشن مثال ہے۔

یہ تمام جدوجہد اور خدمات مولانا سجادؒ کی نگاہ بصیرت کا کمال ہے، جس کا عکس آج ہمیں امارت شرعیہ اور دارالقضاء کی شکل میں نظر آتا ہے۔(اللّٰھم اغفر له وارحمه وعافه واکرم نزله وادخله فی جنة الفردوس)

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی نگاہ بصیرت مذکورہ بالا آیات واحادیث پر ہمیشہ رہتی تھی، آپ نے موضوع کی ضرورت واہمیت کا ادراک کرتے ہوئے امارت شرعیہ کے تحت دارالقضاء کے نظام کو مستحکم فرمایا، اور اس کے لیے پورا نظام مرتب کیا۔

دارالقضاء میں فریقین کے درخواست دینے کے مرحلہ سے لے کر فیصلۂ قاضی تک کے تمام مراحل کو ایسا منضبط اور قانونی بنایا کہ ملک کے عدالتی نظام نے بھی بارہا اسے سراہا اور دارالقضاء سے جاری کئے گئے فیصلوں کو برقرار رکھا۔

دارالقضاء کے عدالتی طریقۂ کار کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے علمی وفقہی ذوق کی بنا پر فیصلے کے طریق کار کو بھی منقح اور واضح فرمایا، جو کہ بعد کے قاضیوں کے لیے ایک گائیڈ کا درجہ رکھتی ہے، دارالقضاء امارت شرعیہ نے قضایا امارت شرعیہ (جلد اول) کے نام سے جو کتاب مرتب کروائی ہے، اس میں حضرت مولانا کے ۸؍قیمتی فیصلے بھی شامل ہیں، جن کے مطالعہ سے کارقضاء میں آپ کی بصیرت اور آپ کے فیصلوں کی اہم خصوصیات کا پتہ چلتا ہے، ان میں سے بعض اہم امور مندرجہ ذیل ہیں۔

نصوص شرعیہ پر آپ کی گھری نظر:

آپ کے فیصلوں میں ایک امتیازی پہلو جو واضح طور پر نظر آتا ہے، وہ نصوص شرعیہ کا کثرت

سے استعمال ہے، اس بارے میں آپ کے بہت سے معاصر نے لکھا ہے کہ ہر مسئلہ میں آپ کی کوشش یہ ہوتی کہ اس کی اصل کتاب اللہ میں مل جائے، یہی وجہ ہے کہ آپ فہم قرآن اور تدبر قرآن کے باب میں اپنے معاصرین میں سبقت رکھتے ہیں، آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی آپ کے منہج تدبر قرآن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا سجادؒ کو قرآن مجید سے طبعی ذوق تھا، وہ اکثر فرماتے تھے کہ میں جب قرآن مجید کی تلاوت کرنے بیٹھتا ہوں تو بہ مشکل گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں ایک صفحہ کی تلاوت کر پاتا ہوں، قرآن کی بلاغت، اس کا عمق، پھر اس کے احکام، پھر احکام کی روح اور اس کا مناط، پھر اس کے ماتحت اس کے فروع، پھر فروع کے تنوعات، پھر ان میں باہمی تفاوت اس طرح ایک ساتھ سامنے آنے لگتی ہیں کہ اس میں کھو جاتا ہوں اور اکثر دو چار آیات میں وقت ختم ہو جاتا ہے اور تھک کر تلاوت ختم کر دیتا ہوں، ایک دفعہ حضرت نے فرمایا کہ جب یہ مسموم ہوا چلنے لگی کہ ہر مسئلہ کا ثبوت قرآن سے کیا جانے لگا تو اس زمانے میں تلاوت کے وقت جزئیات فقہ اور فروعات اسلامی کے مآخذ کی طرف ذہن کا امالہ ہو گیا تو کچھ دنوں کے مطالعہ کے بعد خدا کی جانب سے یہ نوازش ہوئی کہ جب فقہ کے کسی باب کے فروعی مسائل کے ثبوت کی طرف توجہ کرتا تو آسانی سے مآخذ کی رہنمائی ہو جاتی، بلاشبہ ﴿ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیر کثیرا﴾ (اور جسے حکمت عطا کی گئی، اسے خیر کثیر مل گیا) کی بشارت کے وہ ایک فرد تھے''۔(۱۸)

احادیث کے قبول ورد میں محدثانہ ذوق:

اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآنی تدبر کے ذوق کے ساتھ ساتھ احادیث نبویہ پر بھی محدثانہ تحقیقی علم عطا فرمایا تھا، دار قطنی میں موجود ایک اثر صحابی جس میں عدم ادائیگی نفقہ کے وجہ سے تفریق زوجین کی بات نقل کی گئی ہے، آپ فرماتے ہیں:

اور حدیث دار قطنی ''فی الرجل الذی لا ینفق علی امرأتہ، قال: یفرق بینھما، حضرت سعید بن المسیب کے مراسیل میں سے ہے، یہ حدیث عندالمحدثین عن ابی ھریرہ سے صحیح نہیں ہے۔(۱۹)

مسلکی تعصب اور تشدد سے سخت نفرت:

حضرت مولاناؒ کے سامنے حنفی اور اہل حدیث حضرات کے درمیان کسی مسجد کی امامت جمعہ

کے بارے میں مقدمہ پیش ہوا، آپ نے تمام ضروری کارروائی کے بعد جو حکم صادر فرمایا، وہ آج کے علما کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ ہے، آپ لکھتے ہیں:

حضرت امیر شریعت کے انتخاب میں فرقہ بندی کا قطعاً لحاظ نہ کریں؛ بلکہ جو شخص ان میں بہ اصول شریعت احق بالامامۃ ہو، اتقی یا اورع ہو اور مختلف مسائل میں محتاط اور ہر دو فریق کو متحد رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اسے منتخب کریں۔ (۲۰)

اتحاد امت پر زور:

یوں تو آپ کی پوری زندگی ہی اتحاد امت کے ایک علمبردار کے طور پر گزری، موقع جیسا بھی ہو، آپ نے ہمیشہ اتحاد کے پیغام کو عام کیا، چنانچہ بلاضرورت دوجگہ جمعہ کے قیام کے متعلق آپ لکھتے ہیں:

''ہر دو فریق حنفی اور اہل حدیث جمعہ کی نماز ایک ہی جماعت کے ساتھ جامع مسجد میں پڑھا کریں اور دوجگہ جمعہ قائم نہ رکھیں کہ یہ اس مقام میں بلاضرورت ہے اور تفریق مسلمین کا باعث اور مسلمانوں کی شان اجتماعیت کے لیے تباہ کن ہے''۔ (۲۱)

نصوص فقهیه سے اعتنا:

آپ کے فیصلوں میں جہاں نصوص شرعیہ کی کثرت ہوتی ہے، وہیں آپ اسلاف کے علوم سے بھی خاص طور پر استفادہ کرتے ہوئے فقہاء امت کی فقہی تصریحات سے اپنے فیصلوں کو قوت بخشتے، چنانچہ بالغہ سے بلا استیذان نکاح کے متعلق مرافعہ کے فیصلہ میں آپ نے جو علمی وفقہی بحث کی ہے، وہ یقیناً اس راہ کے مسافروں کے لیے ایک خالص علمی تحفہ ہے۔ (۲۲)

امارت شرعیہ، دارالقضاء اور حضرت مولاناؒ کے چند اہم فقہی فیصلوں سے متعلق یہ مختصر سی تحریر ہے، جس سے مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی بے مثال اور یگانۂ روزگار شخصیت پر مختصر سی روشنی ڈالی گئی ہے، اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ امت کے اس بے لوث خادم کو جنت کا اعلیٰ مقام عنایت کرے۔

وصلی اللہ علی محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

مصادر ومراجع

(۱) حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد-حیات وخدمات،ص:۸۰
(۲) حوالہ سابق،ص:۴۴۵
(۳) فتح القدیر:۳۶۵/۶
(۴) حوالہ سابق،ص:۲۲۱
(۵) حوالہ سابق،ص:۴۴۶
(۶) سورۃ النساء:۵۹
(۷) تفسیرابن کثیر:۵۸۱/۱
(۸) سورۃ النور:۵۱
(۹) سورۃ المائدۃ:۴۸
(۱۰) سورۃ المائدۃ:۴۹
(۱۱) سورۃ النساء:۶۵
(۱۲) سورۃ المائدۃ:۴۵
(۱۳) دیکھئے!سورۃ المائدہ:۴۷-۴۸
(۱۴) دیکھئے:بخاری شریف،حدیث نمبر:۲۶۰/مسلم،حدیث نمبر:۱۸۳۰
(۱۵) دیکھئے:بخاری شریف،حدیث نمبر:۵۰۲۶/مسلم،حدیث نمبر:۱۸۹۴
(۱۶) السنن الکبریٰ للبیھقی:۹۸/۱۰
(۱۷) الدارقطنی:۲۰۵/۴
(۱۸) حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد-حیات وخدمات،ص:۲۳۶
(۱۹) قضایا امارت شرعیہ:۲۸/۱
(۲۰) حوالہ سابق،ص:۴۸
(۲۱) حوالہ سابق،ص:۴۷
(۲۲) دیکھئے!حوالہ سابق،ص:۶۷

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ
اوران کا نظریۂ امارت

مفتی اشرف عباس صاحب قاسمی
استاذ تفسیر وادب دارالعلوم دیوبند

تمہید:

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ ان نابغۂ روزگار شخصیات میں ہیں جنہوں نے اپنے علم، عمل، بصیرت، دقت نظری، اخاذ ذہن اور فکر رسا سے قوم وملت کے مسائل کے حل کے لیے نئے دریچے کھولے اور نئے زاویے تلاش کیے۔ محدود وسائل، اقتدار سے محرومی اور اپنی بے بسی پر محض آنسو بہانے کے بجائے خدشات کو توقعات میں بدلنے اور رہی سہی طاقتوں کو مجتمع کر کے سمندروں کو پاٹنے اور کوہ سے دریا بہانے کا بے پناہ حوصلہ فیاض ازل نے آپ کو بخشا تھا، بلاشبہ ہندوستان میں آپ نے اپنے خون جگر سے دعوت وعزیمت کی جو تاریخ رقم کی ہے اور امیدوں کا جو چراغ جلایا ہے، ناامیدیوں اور نامساعد حالات کے اندھیروں میں اس کی دھیمی دھیمی لو نے قوم وملت کو اپنی منزل کے تعین کے لیے روشنی عطا کی ہے۔ شرعی امارت قائم کر کے آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ ایک سیکولر اور غیر مسلم اسٹیٹ میں بھی کیسے بہت حد تک مسلمانوں کی اجتماعیت اور نجی واجتماعی زندگی میں بہت حد تک شریعت کی بالادستی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

تین بنیادی صفات:

مولانا سجادؒ نے بلاشبہ ایک نئی تاریخ رقم کی اور ایک نئی منزل سے آشنا کیا، وہ اپنی مخلصانہ کوششوں میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے، اصل میں کسی بھی انقلابی فیصلے اور اس میں کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے تین صفات کا ہونا بہت ضروری ہے:

(۱) **تبحر علمی:** کیونکہ اگر اسے علم کی مایا حاصل نہیں، اس کے اندر تعمق اور تبحر نہیں تو اس کا کوئی بھی نیا اقدام علمی اعتبار سے شبہات کے گھیرے میں رہے گا؛ بلکہ ممکن ہے نافعیت کے بجائے ضلالت وخسران کا باعث ثابت ہو۔

(۲) **قوت عمل**: علمی اعتبار سے بہت سے نظریے بنتے ہیں؛ لیکن عملی اعتبار سے ان میں رنگ بھرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی تو وہ محض نظریے اور افسانے بن کر رہ جاتے ہیں۔

(۳) **خلوص**: قوت علمیہ وعملیہ کے ساتھ اگر اخلاص، بے نفسی اور جذب دروں نہ ہوتو بڑے بڑے اقدام بھی کھوکھلے اور بے روح ثابت ہوتے ہیں۔

آیئے ہم سب سے پہلے مولانا سجادؒ کی زندگی میں ان صفات کا مطالعہ کریں تاکہ ان کے نظریے سے ہندوستان میں مسئلہ امارت کی قوت ونافعیت کا اندازہ ہوسکے۔

(۱) **مولانا سجادؒ کی تبحر علمی**: مولانا نے ۶/ ماہ دارالعلوم دیوبند میں بھی پڑھا؛ مگر ان کی اصل تعلیم کانپور اور الہ آباد میں ہوئی، یہ وہ حلقہ تھا جہاں معقولات کا غلغلہ تھا؛ مگر مولانا معقولات پر دسترس کے ساتھ علوم نقلیہ، فقہ وحدیث اور قرآنیات پر بھی وسیع نظر رکھتے تھے، بلاغت، معانی اور ادب میں ید طولی کا عالم یہ تھا کہ دیدار گنج پٹنہ کے ایک مدرسے میں ایک ذی علم اور عربی ادب کا خاص ذوق رکھنے والے جج (جناب کرامت حسین) کی آمد پر آپ نے ارتجالاً عربی کا ایک بلیغ قصیدہ لکھا، جس کو سن کر جج صاحب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔(۱)

مولانا کی سترہ (۱۷) سالہ تدریس کا زمانہ بھی بہت کامیاب اور شاندار رہا ہے، بہ قول امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی: ''کم لوگ اس قدر جلد علمی صفوں میں نمایاں ہوتے ہیں جس قدر جلد اور کم سنی میں مولانا کے علم وتبحر کو اہل علم نے تسلیم کرلیا''۔(۲)

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاریؒ فرماتے ہیں: جماعت کے ذمہ دار ارکان اور میں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب دلائل و براہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے تو حضرت مفتی صاحب بھی بے حد متاثر ہوتے اور ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان سے کلمات تحسین نکل جاتے۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مولانا سجاد ''فقیہ النفس'' عالم ہیں یعنی اللہ تعالی نے مسائل کی روح سمجھنے کا ان کو فکری ملکہ عطا فرمایا ہے۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ جو اس زمانہ میں علم حدیث کے مجدد گزرے ہیں، کا یہ فرمانا میرے نزدیک مولانا سجاد صاحب کے تبحر علمی کے لیے ایک بہترین سند ہے۔ بعینہ یہی بات میں نے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کی زبانی بھی سنی ہے۔(۳)

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے: ''ان کا علم محض کتابی نہ تھا؛ بلکہ

آفاقی بھی تھا معاملات کو خوب سمجھتے تھے، ان کو بار ہا بڑے معاملات اور مقدمات میں ثالث بنتے ہوئے دیکھا ہے اور تعجب ہے کہ کیونکر فریقین کو وہ اپنے فیصلے پر راضی کر لیتے تھے اور اسی لیے لوگ اپنے بڑے بڑے کام بے تکلف ان کے ہاتھ میں دے دیتے تھے؛ کیونکہ ان کے پاس اللہ تعالی کا سب سے بڑا حصہ فکر رسا اور رائے صائب تھی، مسائل وحوادث میں ان کی نظر بہت دور تک پہنچ جاتی تھی وہ ہر گتھی کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتے تھے، حریف کی چالوں کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے، باوجود تواضع وخاکساری کے اپنی رائے پر پوری قوت کے ساتھ جمے رہتے تھے اور ہٹ اور ضد سے نہیں بلکہ دلائل کی قوت اور مصالح کی طاقت سے وہ دوسروں کو منوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔(۴)

(۲) مولانا سجادؒ کی قوت عمل: مولانا کی پوری زندگی عمل اور جہد مسلسل سے عبارت تھی، کسی نظریے پر اگر انشراح ہو جاتا تو اسے زمینی سطح پر اتارنے میں ہر ممکن جلدی دکھاتے اور راہ کی رکاوٹیں آڑے نہیں آنے دیتے؛ چنانچہ مسلمانوں کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر جب مدارس کی چہار دیواری کو خیر باد کہا تو ۱۹۱۷ء میں ''انجمن علماء'' قائم کی، جس کے دو برس بعد ۱۹۱۹ء میں جمعیت علمائے ہند کے قیام میں بھی آپ کی مساعی کا بڑا حصہ ہے بہار میں۔ امارت شرعیہ کا قیام آپ کا زبردست کارنامہ؛ بلکہ بڑی کرامت ہے۔ ۱۹۳۶ء میں سیاسی اجارے داروں کے مقابلے میں امارت شرعیہ کی زیر قیادت مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کو خاص شناخت عطا کی اور آپ کی قبولیت اور عوامی گرفت کا ہی اثر تھا کہ ہر قسم کی دراندازیوں کے باوجود کانگریس کے بعد آپ کی انڈیپنڈنٹ پارٹی اسمبلی کی دوسری طاقت قرار پائی اور مسلم مفادات کے لیے اس نے بہتر فیصلے کیے، ایسا بھی ہوا کہ جواں عمر اکلوتا فرزند بستر مرگ پر زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے اور مولانا اطلاع کے باوجود دور دراز کے علاقوں میں متاثرین کی اشک شوئی میں لگے ہوئے ہیں، اخباروں میں جب یہ اعلان ہوا کہ گاندھی جی مسلم لیڈران کے ہمراہ پورے ملک کا دورہ کر کے ہندوؤں کی خاطر مسلمانوں سے اپیل کریں گے کہ وہ ذبح گاؤ ترک کر دیں خواہ قربانی کے طور پر یا عام غذا کے طور پر، تو مولانا کا چہرہ تمتما تا رہا اور فتنے کی سرکوبی کے لیے تنہا بہار کی سرحد پر بکسر پہنچ گئے؛ تا کہ گاندھی جی سے بات کر کے ان کو مسلمانوں کا موقف صاف صاف بتا دیا جائے، مولانا محمد علی جوہر کے توسط سے گاندھی جی سے آپ نے مدلل گفتگو کی، اخیر میں گاندھی جی نے بھی مولانا کے عزم کے آگے سپر ڈال دئے اور طے کیا کہ بہار کے دورے میں ترک ذبح گاؤ پر کہیں تقریر نہیں ہوگی اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں سے رواداری کی درخواست کی جائے گی اور بس۔ اس فیصلے کے باوجود مولانا برابر گاندھی جی کے جلسوں کی نگرانی

کرتے رہے اوراس سے باخبر رہے کہ کہاں کیا کہا جاتا ہے۔(۵)

جمعیت علمائے ہند نے اس اکیس سالہ سیاسی دور میں ہندوستان کے اندر اسلام کی سر بلندی اور ملک و وطن کی آزادی کے لیے برٹش حکومت کے مقابلے میں جب بھی ''دائرۂ حربیہ'' قائم کر کے سول نافرمانی کا آغاز کیا تو ہمیشہ مولانا موصوف نے اس ادارے کے امیر یا انچارج مقرر ہوئے اور مولانا نے بے سروسامان مجلس کے جھنڈے کے نیچے ہندوستان کے مختلف صوبوں کے ہزاروں مسلمانوں کی بہترین قیادت انجام دیں اور دائرۂ حربیہ کے کام کو اس خوبی سے انجام دیا کہ اس سے بہتر اس اہم اور مشکل مہم کو انجام دینا دوسروں کے لیے بہت مشکل تھا۔

مولانا یوں تو عام سیاسی افکار و آراء میں بھی اگرچہ کافی بصیرت رکھتے تھے؛ مگر آئین (کانسٹی ٹیوشن) کی ترتیب میں مولانا کا دماغ بہت رسا تھا اور وہ اس سلسلے میں بہت عمیق حقیقتوں پر بہت جلد پہنچ جایا کرتے تھے''۔(۶)

اس طرح ہم مولانا کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ ''مالی بے بضاعتی، مددگاروں کی کمی، رفقاء کی ناسپاسی اور حالات کی مخالفت کے باوجود جو کچھ کر دکھایا وہ ان کی حیرت انگیز قوت عمل کا ثبوت ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص ہے''۔(۷)

ان کا وجود گو سارے ملک کے لیے پیام رحمت تھا؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ صوبۂ بہار کی تنہا دولت وہی تھے، اس صوبے میں جو کچھ تبلیغی، تنظیمی، سیاسی اور مذہبی تحریکات کی چہل پہل تھی، وہ خود انہی کی ذات سے تھی، وہی اک چراغ تھا، جس سے سارا گھر روشن تھا، وہ وطن کی جان اور بہار کی روح تھے، وہ کیا مرے کہ بہار مر گیا، مرثیہ ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا۔

مولاناسجاد کا خلوص وبے نفسی:

حرکت وعمل سے لبریز مولانا کی زندگی کا نمایاں اور بنیادی عنصر اخلاص وللّٰہیت ہے، مولانا نے اپنی پوری زندگی قوم کے لیے وقف کر دی؛ لیکن ذاتی آسائش کے سامان کی طرف کبھی توجہ نہیں گئی، پٹنہ کے کرایے کے کھپریل مکان میں اس وقت بھی رہے جب آپ کی مسلم سیاسی پارٹی اقتدار میں تھی۔

کانگریس لیڈروں اور اس کے اداروں سے مولانا کے تعلقات ہمیشہ بے لوث رہے، لیکن عملی طور پر جب اسلامی حقوق کی محافظت کانگریس کی مخالفت کی داعی ہوئی تو مولانا کانگریس کی مخالفت سے بھی باز نہیں آئے، یہی وجہ ہے کہ کانگریس ان سے مرعوب تھی اور خائف بھی۔ علامہ

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''لیڈروں اور قومی کارکنوں کے پاس عام طور سے ان کے اثر کے ذریعے تین ہیں، دولت ہے یا حسن تقریر ہے اور زورِ قلم ہے، مرحوم ان تینوں دولت سے محروم تھے، وہ غریب تھے اور غریبوں ہی میں زندگی بسر کی، زبان میں لکنت تھی، جس کے سبب سے وہ بولنے پر قادر نہ تھے اور اسی لیے وہ تقریر بہت کم کرتے تھے اور ان کے قلم میں وہ زور بھی نہ تھا، جو آج کل کی انشاء پردازی کا کمال ہے، تاہم ان سب کا بدل ان کے پاس ان کا ایک اخلاص تھا، جو اس کمی کو پورا کر دیتا تھا، عجیب نہیں کہ زبان و قلم کا عجز ہی تھا جو ان کی قوت عمل کی صورت میں ظاہر ہوا''۔(۸)

نظریۂ امارت:

۱۸۵۷ء میں لال قلعہ پر یونین جیک لہرانے اور انگریزی اقتدار کے قیام کے ساتھ ہی اسلامیانِ ہند کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اپنے دین و ایمان کے تحفظ اور شرع متین کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کا تھا؛ کیونکہ انگریزوں نے جہاں بہت سے حقوق پر ڈاکہ ڈالا وہیں یہ بھی کیا کہ عہد مغلیہ سے قائم نظام قضاء کو بھی ختم کر ڈالا، جس پر مسلمانوں کو سخت تشویش تھی، جس کا اعتراف خود انگریز افسر ڈبلو، ڈبلو ہنٹر نے اپنی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''ہم جانتے ہیں کہ باقاعدہ قاضیوں کی غیر موجودگی میں مسلمانوں کے لیے ناممکن ہے کہ وہ اپنی زندگی مذہبی قواعد کے ساتھ بسر کر سکیں، بعض مذہبی مراسم میں ہی نہیں؛ بلکہ مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں بھی کئی ایک چھوٹے مسئلے ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا صحیح حل قاضی ہی کر سکتا ہے''۔(۹)

ظاہر ہے کہ اس وقت کی صورت حال میں یہی ایک راہ بچی تھی کہ مسلمان اس سلسلے میں خود پہل کریں اور اپنی اجتماعیت کا ثبوت دیتے ہوئے کسی امیر کے ماتحت منظّم طور پر شرعی زندگی گزاریں، اس ضرورت کا احساس یوں تو بہت سے علماء کو تھا تاہم اس کے لیے پہل اور خشت اول کی سعادت حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ کا مقدر تھی، مولانا فقیہ النفس عالم تھے، اسلام کے سیاسی اور اجتماعی قوانین پر گہری نظر رکھتے تھے، وہ کسی اسلامی ملک پر کفار کے تسلط کو نہایت تشویش کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ کفر کے اس بے پناہ غلبہ اور اثرات کو جس قدر کم کیا جا سکے کم کرنا چاہیے، جن چیزوں میں حکومت متسلطہ مداخلت نہیں کرتی اور جو چیزیں اس کے دائرہ اقتدار سے باہر ہیں ان میں اپنا مکمل شرعی نظام قائم کیا جائے، اس لیے وہ چاہتے

تھے کہ!

''جب تک حکومت کافرہ کا مسلمانوں پر تسلط ہے اور جب تک مسلمان اس ابتلاء میں مبتلا ہیں اور جس وقت تک مسلمان سیاسی اقتدار کے مالک نہیں ہو جاتے اس وقت تک اپنے اقتصادی اور معاشرتی کاموں کے لیے اپنا ایک امیر منتخب کریں اور اس کی اطاعت وفرماں برداری پر بیعت کریں تاکہ اس کفرستان میں جس قدر ممکن ہو مسلمان اپنی زندگی کو شرعی بنا سکیں''۔(۱۰)

وہ چاہتے تھے کہ زکوۃ اور عشر کا صحیح انتظام ہو، اور مسلمانوں کے صدقات وخیرات صحیح مصارف پر خرچ ہو سکیں، وہ جانتے تھے کہ ہر فرد اور ہر جماعت بہ قدر استطاعت مکلّف ہے، قوت قاہرہ کے فقدان کی وجہ سے ان احکام شرع کی تنفیذ کو ٹالا نہیں جا سکتا جنہیں مسلمان اپنی رضامندی سے اپنے اوپر نافذ کر سکتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کی یہ خواہش ایک شرعی خواہش تھی اور ۵۷ء کے اس انقلاب کے بعد جو ہندوستان میں ظہور پذیر ہوا اور جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی دولت، ان کی عزت اور ان کی شرعی زندگی اور ان کا سیاسی اقتدار ملیامیٹ اور تباہ و برباد ہو گیا، اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار نہ تھا کہ مسلمان مسجدوں کی امامت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ایک امیر بھی منتخب کرتے، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علماء کی جماعت میں وہ پہلے عالم تھے جنہوں نے وقت کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کام کو شروع کیا، اس کی حمایت میں آواز بلند کی اور اگر تمام ہندوستان میں نہیں تو کم از کم ایک صوبہ میں اس کی تشکیل کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو بتایا کہ کفر کے تسلط اور غلبہ کے بعد بھی مسلمانوں کو اپنی مذہبی زندگی کے لیے جدوجہد کرنی ہی ہوگی، مولانا محمد سجاد کی اس خالص مذہبی اور شرعی تحریک کی پوری قوت کے ساتھ اپنوں اور پرایوں نے مخالفت کی، ایک طرف حکومت مسلطہ نے اور دوسری طرف اس ملک کی بدقسمت اکثریت نے اس کو خطرے کی نگاہ سے دیکھا۔ ان سب مخالفتوں سے زیادہ ان علماء کی مخالفت تھی جن کا یہ فریضہ تھا اور قیام امارت جن کا شرعی اور قانونی فرض تھا، ان تمام مخالف قوتوں اور طاقتوں کی موجودگی میں مولانا محمد سجادؒ نے خدا کے بھروسہ پر اس کام کو شروع کیا۔

نظریہ امارت پر دلیل:

مولانا ابوالمحاسن سجادؒ اپنے نظریۂ امارت پر مضبوط دلائل رکھتے تھے، قرآن وحدیث اور فقہ

کے اصول وفروع پر چونکہ ان کی بڑی گہری نظر تھی اس لیے وہ ہر بات مدلل انداز میں کرنے کے عادی تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''اسلام ایک تنظیمی مذہب ہے اس مذہب کی روح ڈسپلن اور نظم چاہتی ہے، اگر مسلمان منتشر رہیں اور اپنا کوئی امیر منتخب نہ کریں تو زندگی غیر شرعی زندگی ہوگی، ہر پیغمبر نے ابتدائی تقریر میں دو باتیں لازمی طور پر کہی ہیں، فاتقوا اللہ واطیعون (اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) یہی اطاعت وہ چیز ہے جس پر قوموں نے مخالفت کی ہے؛ لیکن پیغمبر نے صاف کہہ دیا کہ پیغمبر کی اطاعت کے بغیر خدائی مذہب کی تکمیل نہیں ہوسکتی اور تنظیمی زندگی بھی میسر نہیں آسکتی''۔(۱۱)

حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث جو بخاری وغیرہ میں موجود ہے اس سے ظاہر ہے کہ بیعت کے لیے قوت قاہرہ ہی ضروری نہیں ہے؛ چنانچہ مولانا ایک مکتوب میں فرماتے ہیں: ''تمام محدثین واصحاب سیر کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حضرت عبادہ بیعت عقبہ اولی و بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے اور انہوں نے بیعت کی، اس کے علاوہ فتح مکہ میں بھی شریک تھے اس کے ساتھ سب کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ بیعت عقبہ اولی میں جو بیعت ہوئی تھی وہ نہ بیعت جہاد تھی نہ بیعت نصرت، اس کے علاوہ انتخاب واطاعت امیر کی روایات بیشتر وہ ہیں جو دارالاسلام یا دارالکفر کی تفریق کے بغیر اس عمل کے وجوب یا ثبوت پر دال ہیں۔(۱۲)

مولانا سجادؒ اپنے اس موقف پر فقہائے کرام کی بہت سی تصریحات بھی پیش کرتے تھے جن سے واضح ہے کہ محدود اختیارات کی صورت میں بھی امیر کا انتخاب اور قاضی کا تقرر مسلمانوں پر واجب قرار دیا گیا ہے؛ چنانچہ حافظ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

" اذا لم يكن سلطان ولا من يجوز التقلد منه كماهو فى بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار كقرطبة الآن يجب على المسلمين أن يتفق على واحد منهم يجعلونه واليا فيولى قاضيا أو يكون هو الذى يقضي بينهم ". (۱۳)

(کسی ملک میں کوئی مسلم سلطان نہ ہو اور کوئی ایسا حاکم نہ ہو جس کی طرف سے قاضی کا تقرر درست ہو جیسا کہ آج بعض مسلم ممالک مثلاً قرطبہ وغیرہ کا حال ہے جہاں غیر مسلموں کا غلبہ واقتدار ہے، ایسے حالات میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی شخص کو اپنے اتفاق ورضامندی سے اپنا والی مقرر کرلیں جو ان کے لیے قاضی مقرر

کرے یا خود وہ والی ہی ان کے مقدمات کا فیصلہ کرے۔)

علامہ ابن ہمام کی یہ تصریح دراصل آج کے بدلے ہوئے حالات میں ہمارے لیے بہترین رہنمائی ہے، اور ظاہر ہے کہ قرطبہ یا بلنسیہ جیسے شہروں میں یا موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کے منتخب کردہ امیر اور اس کے نامزد کردہ قاضی کے لیے قوت قاہرہ کی تلاش بے معنی سی بات ہے کہ حالت اختیار میں بہت سی ایسی شرطیں معتبر ہوتی ہیں جو حالت ضرورت میں لازمی نہیں رہتیں، اسی لیے فقہاء نے اختیار اور ضرورت کے حالات میں فرق کیا ہے۔(۱۴)

نظریۂ امارت پر اعتراضات:

ظاہر ہے مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے خاص حالات کے پیش نظر جو نظریۂ امارت پیش کیا وہ بہ ظاہر ایک نئی اختراع تھی، جس پر بعض حلقوں کا چراغ پا ہونا فطری تھا، البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ نظریۂ امارت پر اعتراضات دو طبقے کی طرف سے ہوئے:

(۱) روشن خیال انگریزی دانوں کا طبقہ: ہوسکتا ہے کہ اس طبقے میں بھی اپنے اختلاف میں بعض مخلص رہے ہوں تاہم اکثریت کی مخالفت کا اصل سبب نظام شریعت سے بے زاری اور علماء کی قیادت سے تنفر تھا؛ چنانچہ مولانا احمد سعید دہلوی سابق صدر جمعیت علمائے ہند تحریر فرماتے ہیں: ”سب سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ ملک کے اس تعلیم یافتہ طبقہ نے جس کو آج کل سب سے زیادہ مسلمانوں کی نمائندگی کا شوق ہے اور جو مسلمانوں کی تہذیب اور کلچر کی حفاظت کا مدعی ہے اس نے بھی اس مذہبی تحریک کو اپنے اقتدار اور اپنی مزعومہ لیڈری کے خلاف سمجھا، جو حضرات غیر شرعی قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور صرف نام کے مسلمان بن کر اسلامی قومیت کے حقوق کا بٹوارہ کرانا جن کا مقصد زندگی ہو چکا تھا اور جو اسلامی احکام کی پابندی کو اپنی آزادی ضمیر کے مخالف سمجھے ہوئے تھے، انہوں نے اس تحریک کو دقیانوسی اور تیرہ سو سالہ پرانی تحریک کہنا شروع کیا اور مولانا سجاد کی یہ کہہ کر مخالفت شروع کی کہ یہ ہم کو روشنی اور آزاد خیالی سے ہٹا کر ملاازم اور ہم کو مولویوں کے اقتدار کے ماتحت کرنا چاہتے ہیں“۔(۱۵)

(۲) بعض علماء کی طرف سے بھی اس نظریے کی مخالفت کی گئی، ان میں سے بھی بعض کی مخالفت کی کوئی خاص بنیاد نہیں تھی، وہ مخالفت برائے مخالفت کے شکار تھے، تاہم بعض اکابر محقق علماء بھی تھے جو اس نظریے کو اسلامی اصول سے متصادم اور مسلمانوں میں افتراق و انتشار کا سبب گردانتے تھے، ان حضرات کے خدشات پر سنجیدگی سے غور کرنا اور ان کے سامنے صحیح صورت حال

پیش کرنا نہایت ضروری تھا؛ چنانچہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے اس حوالے سے متعدد بزرگوں سے اس موضوع پر دوبدو گفتگو کی، ان بزرگوں میں جمعیت علمائے ہند کے بانی رکن حضرت مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلیؒ، رئیس الطائفہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہ شامل ہیں؛ بلکہ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے ساتھ دوبدو گفتگو کے علاوہ طویل مکاتبت بھی ہوئی، جس سے مسئلے کے تمام پہلو منقح ہو کر آ گئے اور حضرت مولانا کو بھی انشراح ہو گیا۔

نظریۂ امارت پر شبہات و جوابات کا خلاصہ: حضرت مولانا فرنگی کے ذہن میں جو شبہات تھے ان میں ایک اہم بات یہ تھی کہ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ جس شخص کو اس منصب پر مقرر کیا جائے کبھی وہ اقتدار کے سامنے خوف سے مرعوب ہو کر یا کسی لالچ میں آ کر جھک نہ جائے اور امت کا سودا نہ کر لے۔

دوسرا شبہ مولانا کو یہ تھا کہ ان کے نزدیک ہندوستان دارالاستیلاء ہے یعنی ایسا ملک ہے جو حقیقۃً دارالاسلام ہے؛ لیکن اس پر غیر مسلموں کو غلبہ واقتدار حاصل ہو گیا ہے، مولانا اس کے قائل ہیں کہ اس عارضی استیلاء کو دور کرنا ہمارا فرض ہے؛ لیکن وہ اس کے متلاشی ہیں کہ کیا ایسی صورت میں امیر مقرر کر لینا اور پھر اس کی بیعت کرنا لازم وضروری ہے اور کیا اس کی نظیر قرن اول میں موجود ہے، مولانا نے اس طرح کی بیعت کے جواز کا انکار تو نہیں کیا؛ لیکن ان کو لزوم میں شک ہے۔

تیسرا سوال ان کے ذہن میں یہ تھا کہ اس طرح جو امیر مقرر کیا جائے گا اس کی حیثیت کیا ہوگی، آیا وہ امام اعظم ہوگا یا والی (امیر ناحیہ) یا قاضی؟ اگر امام اعظم تسلیم کیا جائے تو پھر اس کا ٹکراؤ خلیفہ سے ہوگا اور اس کی کامیابی کی صورت میں فتنہ پیدا ہوگا اور ناکامی کی صورت میں نیا فرقہ، اور والی وقاضی کے لیے بیعت ہے نہیں؛ اس لیے اولا امیر کی حیثیت کا تعین ضروری ہے؟

حضرت فرنگی علیہ الرحمہ کے انہی نکات پر مشتمل دو خطوط کے جوابات امیر اول مولانا شاہ بدر الدین صاحب نے دئے ہیں اور تیسرے کا تفصیلی جواب مولانا سجاد نے دیا ہے، ہر دو بزرگوں کے تحقیقی جواب کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کے عام اجتماعی قانون کے تحت مسلمانوں پر نصب امیر واجب ہے چاہے وہ جہاں بھی ہوں اور جس حال میں بھی ہوں، بیعت عقبی اولی اور بیعت عقبی ثانیہ مکہ کی اس زندگی میں ہوئی جب قہر وغلبہ غیروں کو حاصل تھا مکہ ہو یا مدینہ دونوں ہی دارالحرب تھے اور اسے ایک دار مانیں یا دو بہ ہر صورت غیروں کے اقتدار میں رہتے ہوئے کچھ

افراد نے ایک فرد کے ہاتھ پر بیعت سمع وطاعت کی اور یہ بیعت محض اس بات کی نہیں تھی کہ میں جب مدینہ آؤں گا تو میری مدد کرنا؛ بلکہ سمع وطاعت اور اسود واحمر کے مقابلے میں جنگ پر بیعت تھی۔

پھر یمن کے علاقہ میں اسود عنسی کا بغاوت کرنا واقتدار حاصل کر لینا، دارالاسلام میں استیلاء کی نظیر ہے اور اس موقع پر صنعاء میں بہ وقت صبح مسلمانوں کا اجتماع اور حضرت معاذ بن جبلؓ کی امامت و امارت پر اتفاق، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اذن حاصل کیے بغیر، مرکز اقتدار سے دور مسلمانوں پر استیلاء کفار کی صورت میں نصب امیر کی دلیل ہے۔

ان حضرات نے یہ بھی بتایا ہے کہ کہیں منتخب امیر اقتدار وقت کے سامنے جھک نہ جائے اس لیے قابل لحاظ نہیں کہ اگر اس طرح کے شک وشبہ کا اعتبار کیا جائے تو انتخاب خلیفہ بھی اس طرح کے خطرہ کے پیش نظر صحیح نہ ہوگا، خاص کر جن حالات میں خلیفہ عثمانی سلطان عبد المجید کا تقرر منصب خلافت پر عمل میں آیا، وہ خلافت کی مقہوریت کا نمونہ ہے۔

ان بزرگوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ امیر شریعت کی حیثیت خلیفۂ اعظم کی نہیں؛ بلکہ والی کی ہوگی اور والی یعنی امیر ناحیہ کبھی خود خلیفہ کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے اور ایسی صورت میں اس کا عزل ونصب خلیفہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور جب خلیفہ کی طرف سے والی کا تقرر ممکن نہ ہو تو ارباب حل وعقد کی طرف سے والی مقرر کیا جائے گا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی، اسی طرح مسئلہ قاضی کا ہے، اصل صورت تو یہ ہے کہ خلیفہ یا والی کی طرف سے قاضی کا تقرر ہو؛ لیکن ایسا کسی وجہ سے نہ ہو سکے تو ارباب حل وعقد پر لازم ہے کہ وہ قاضی کا انتخاب کریں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں، پس امیر شریعت کی حیثیت والی کی ہے امام اعظم کی نہیں۔(۱۶)

قیام امارت و نصب امیر کے لیے عملی جد جهد:

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا مرحوم صرف خیالی اور نظریاتی دنیا کے بادشاہ اور ایسے اسکیم گر نہیں تھے جو بہتر سے بہتر منطقی اسکیم تو تیار کر سکتا ہے؛ مگر اسے عملا برت کر اس کو زمین پر نہیں اتار سکتا؛ بلکہ مولانا مرحوم جس چیز کو ڈوب کر فکر کی نگاہ سے ایک مرتبہ دیکھ لیتے تھے اس کے لیے سرگرم عمل ہو جاتے اور راہ کی مشکلات کو خاطر میں نہیں لاتے تھے؛ چنانچہ مولانا سجاد نے قیام امارت کے سلسلے میں عملی پیش رفت کرتے ہوئے سرکردہ علماء سے ملاقاتیں کیں، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ جب مالٹا کی اسارت سے ہندوستان واپس آئے تو حضرت مولانا دیوبند جا کر ملے اور شیخ الہندؒ سے امارت شرعیہ کے متعلق گفتگو کی، حضرت شیخ الہندؒ نے اس کو پسند

فرمایا اور مولانا سجادؒ کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ جمعیت کے اجلاس دوم میں نصب امیر کے متعلق تجویز تیار کرلی تھی؛ لیکن قاضی سید احمد حسین سابق ایم ایل سی کی اطلاع کے مطابق جو اس وقت جیل میں تھے؛ ''شیخ الہند کی علالت کی وجہ سے جب کہ وہ خطرناک حالت سے گزر رہے تھے، دوسرے اجلاس کے لیے ملتوی کردیا گیا''۔(۱۷) تاہم اجلاس ہفتم میں دارالقضا کے متعلق درج ذیل تجویز منظور ہوئی تھی۔

''ہندوستان میں شریعت اسلامی کے مطابق محاکم قضا کا قیام جس میں مسلمانوں کے طلاق ونکاح وراثت واوقاف وغیرہ کے مذہبی مسائل مسلمان قاضیوں کے ذریعے سے طے کیے جائیں، مسلمانوں کا مذہبی حق ہے، اور حکومت ہند اب تک یہ حق غصب کرتی رہی ہے، لہٰذا حکومت کا فرض ہے کہ یہ مذہبی حق مسلمانوں کو واپس دے، اور یہ جلسہ مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس کے قیام کی جدوجہد کریں''۔(۱۸)

لیکن ان تمام سعی وکوشش، جمعیت کی تجویز اور علمائے ہند کی رضا وہم خیالی کے باوجود بعض ایسے اسباب پیش آئے کہ اس وقت امیر الہند کا انتخاب نہ ہوسکا۔ تب حضرت مولانا نے صوبۂ بہار میں ہی پہلے امارت شرعیہ کے قیام کی سعی کی اور جمعیت علماء صوبہ بہار پٹنہ کے اجلاس عام مؤرخہ ۱۹/۲۰/شوال ۱۳۳۹ھ میں، جو امیر الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا، حضرت مولانا شاہ محمد بدرالدینؒ کو امیر شریعت اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا اور نو افراد پر مشتمل مجلس شوری بنائی گئی، ۹/ ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ کو دفتر امارت شرعیہ، پھلواری شریف میں قائم کیا، مولانا سید عثمان غنیؒ کو ناظم امارت شرعیہ مقرر کیا گیا، پھر دفتر امارت شرعیہ اور بیت المال کے قیام کے بعد محررین، مبلغین، عمال اور محتسب مقرر کیے گئے اور اس طرح صوبۂ بہار کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

امارت اور جمعیت علماء ہند:

یہ امر بھی واضح ہے کہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے سب سے پہلے جمعیت کے پلیٹ فارم سے ہی قیام امارت شرعیہ کی کوشش کی، جمعیت کے اجلاس عام میں اس کو منظور بھی کروایا اور اکابر جمعیت بھی اس کے حق میں تھے، لیکن مرکزی سطح پر انتخاب امیر کا مسئلہ حل نہیں ہو پایا تو مولانا سجادؒ نے بہار کی سطح پر نصب امارت کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہے، تاہم ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بہار کا یہ اجلاس جس میں امیر شریعت کا انتخاب ہوا یہ بھی جمعیت العلماء کے ہی

زیر اہتمام تھا، اور مرکز سے جمعیت کے نمائندہ حضرات شریک ہوئے تھے، اس کے بعد بھی امیر شریعت کے انتخاب کے موقع پر اکابر جمعیت کی شرکت ہوا کرتی تھی، مطلب واضح ہے کہ مولانا سجاد کی کوششوں کو جمعیت اور اس کے اکابر کی تائید وحمایت حاصل تھی، یہی وجہ ہے کہ مولانا سجاد کو بہار کا نائب امارت شریعت رہتے ہوئے ہی جمعیت علمائے ہند کا ناظم مقرر کیا گیا تھا اور انتقال کے وقت بھی مولانا ان دونوں عہدوں پر فائز تھے، حتی کہ آپ نے نائب امیر شریعت رہتے ہوئے جمعیۃ العلماء کے چھٹے اجلاس عام کی صدارت فرمائی، جمعیۃ کے اراکین وذمہ داران اس پر اس قدر مسرور اور جذبۂ امتنان سے لبریز تھے کہ اجلاس عام میں باضابطہ آپ کے لیے تجویز شکریہ منظور کی گئی، جو کہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے، چنانچہ اجلاس کی تجویز نمبر ۱۲۹ اس طرح ہے:

''جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ صدر اجلاس جمعیت علمائے ہند مرادآباد کی خدمت میں اپنا مخلصانہ شکریہ پیش کرتا ہے کہ حضرت ممدوح نے اجلاس کی صدارت ورہنمائی فرما کر اس کو عزت بخشی، حق تعالی مولانا کو اجر جزیل عطا فرمائے''۔ (۱۹)

لیکن اس کے بعد بہ تدریج امارت بہار کا جمعیت سے رابطہ منقطع ہو گیا، جمعیت کے اکابر نے بھی قیام امارت کی کوشش کی اور محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ پہلی بار کل ہند امیر الہند منتخب کیے گئے، امارت شرعیہ کے قیام کے بعد مختلف صوبوں میں امیر شریعت کا انتخاب اور شرعی پنچایتوں کا قیام جمعیت کی خدمات کا روشن باب ہے؛ چنانچہ اس وقت بھی کئی صوبوں میں جمعیت کے زیر اہتمام شرعی پنچایتیں قابل ذکر خدمات انجام دے رہی ہیں۔

تاہم اس دوران بہار کی امارت شرعیہ کی مستقل حیثیت ہوتی گئی، کام کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور جمعیت سے اس کا واجبی رشتہ رہ گیا، جمعیت نے امارت کی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دوسرے صوبوں میں امیر منتخب کیے؛ لیکن بہار کے لیے اپنی طرف سے کسی نئے امیر کا اعلان نہیں کیا، جو کہ ایک اچھی علامت ہے، تاہم ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پہلے کی طرح امارت شرعیہ بہار کو جمعیت کے ماتحت کر دیا جائے، تاہم ہماری خواہش یہ ضرور ہے کہ دونوں اداروں کے درمیان باہمی ربط وتعلق کو مزید فروغ دیا جائے؛ تاکہ دونوں ادارے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچا سکیں، میں استاذ گرامی صدر جمعیت حضرت مولانا قاری عثمان صاحب منصور پوری کی ہدایت پر منعقد اس سیمینار کو بھی اس سلسلے کی پیش رفت کے طور پر دیکھتا ہوں، جس کا سہرا قائد جمعیت حضرت

مولانا محمود مدنی صاحب کے سر ہے، ہم بہار کے موجودہ امیر شریعت کی جانب سے اگلی پہل کے منتظر ہیں۔

آخری بات:

آج سے سو سال قبل مولانا ابوالمحاسن سجادؒ نے جو نظریۂ امارت پیش کیا تھا اور قوم کو جو راہ دکھائی تھی، الحمد للہ اس کے صالح اثرات سے قوم مستفید ہو رہی ہے، ۱۹۲۱ء میں مولاناؒ کا قائم کردہ امارت شرعیہ بہار تناور درخت بن کر برگ و بار کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے، جمعیت علماء ہند کے اجلاس میں مولانا نے جو تجویز منظور کرائی تھی، اس کے زیر اثر جمعیت کے زیر اہتمام امارت شرعیہ ہند بھی سرگرم عمل ہے؛ لیکن مولانا سجادؒ قیام امارت کے ذریعے جس اسلامی زندگی کا خواب آنکھوں میں سجائے چل دیے تھے، ہم اس سے بہت دور ہیں، وہ غیر شرعی زندگی اور غیر منظّم زندگی سے بہت کڑھتے تھے، اور اس پر اس قدر روتے تھے کہ بہ قول مولانا احمد سعید دہلویؒ: ان کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں، وہ کفر کے بے پناہ غلبہ اور اثرات کو ممکنہ حد تک کم کر کے ہر جگہ اسلام کی بالادستی چاہتے تھے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس جواں مرد سے جتنا ہو سکا اس نے کیا، اور خدا کے سامنے اپنی نجات کا سامان مہیا کر کے لے گیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا احساس عمل کب جاگتا ہے، اور ان کی اس خالص فکر کو شہر شہر اور قریہ قریہ لے جانے میں کب کامیاب ہوتے ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ کے قلم نے مولاناؒ کی وفات پر مرثیہ خوانی کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''وہ اکیلے تھے؛ لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے؛ مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے، کہتے کم کرتے زیادہ تھے، وہی ایک چراغ تھا جس سے سارا گھر روشن تھا، وہ وطن کی جان اور بہار کی روح تھے، وہ کیا مرے کہ بہار مر گیا، مرثیہ ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا''۔

لیکن ہم اپنے عمل سے ثابت کر دیں کہ مولانا سجادؒ مرے نہیں ہیں؛ کیوں کہ ان کی فکر زندہ ہے، ان کے تخیلات میں رنگ بھرنے والے جواں حوصلہ علماء زندہ ہیں، ملک کے طول و عرض میں بسے مسلمانوں کی زندگی کو صحیح رخ دینے کی خاطر شرعی پنچایت قائم کرنے کے لیے جمعیت کی پر عزم قیادت زندہ ہے۔

اولوالعزمان دانش مند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پاٹتے ہیں اور کوہ سے دریا بہاتے ہیں

مصادر ومراجع

(۱) حیات سجاد ص:۳۲ مقالہ مولانا عبدالصمد رحمانی

(۲) حیات سجاد ص ۱۶

(۳) حیات سجاد: مقالہ مولانا حفظ الرحمانؒ، ص ۵۷

(۴) حیات سجاد، ص: ۵۸

(۵) حیات سجاد ص: ۴۹

(۶) حیات سجاد، ص ۸۷

(۷) ص: ۵۷

(۸) حیات سجاد، ص: ۵۹

(۹) اسلامی عدالت ص: ۴۶

(۱۰) حیات سجاد، ص: ۹۳

(۱۱) حیات سجاد ص: ۹۳ مقالہ مولانا احمد سعید دہلویؒ

(۱۲) امارت شرعیہ: شبہات وجوابات، ص: ۵۶

(۱۳) ردالمختار، کتاب القضاء، جلد: ۴، ص: ۴۲۸/ فتح ۶/ ۳۶۵

(۱۴) اسلامی عدالت ص: ۴۸

(۱۵) حیات سجاد: ص: ۹۴

(۱۶) یہ ساری تفصیلات اور اصل مکتوبات وجوابات ''امارت شرعیہ شبہات وجوابات'' نامی رسالے میں موجود ہیں، میں نے اس کے مقدمے میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا ذکر کردہ خلاصہ نقل کردیا ہے

(۱۷) حیات سجاد، ص: ۱۲۸

(۱۸) تجاویز اجلاس ہفتم، تجویز نمبر ۱۲ ص: ۳۴

(۱۹) تجاویز ص: ۲۹

اپنے عہد کا مجدد و مفکر
حضرت ابوالمحاسن محمد سجادؒ

ڈاکٹر ابوبکر عباد
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

کسے معلوم تھا کہ حضرت شیخ شرف الدین، عرف مخدوم بہاری کی سرزمین پر مولوی حسین بخش کے گھر پیدا ہونے والا بچہ محمد سجاد ہندوستان کی جنگ آزادی، مسلمانوں کی تحریک اور قومی سیاست میں ایک نئی تاریخ رقم کرے گا۔ وہ جو زندگی کے محض چار معصوم برسوں کو دیکھنے کے بعد یتیم ہو گیا تھا، جس کا بچپن میں پڑھنے لکھنے کو جی نہ چاہتا تھا، جس کا محبوب مشغلہ مکتب اور مدرسوں سے بھاگنا تھا۔ اس کھیل کے رسیا کو پڑھانے کی کیا کیا تدبیریں نہ کی گئیں، جب شوق جاگا تو جا کر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا مگر وہاں تبت کے ایک طالبعلم سے لڑائی کر بیٹھے۔ نتیجتاً الٰہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ واپس آئے اور بالآخر وہاں سے فراغت حاصل کی۔ پڑھنے کے بعد زندگی کے دوسرے دور کا آغاز پڑھانے سے کیا۔ سوانھوں نے ایک نہیں؛ کئی مدرسے بدلے، نئے مدرسے قائم کئے اور طالبعلموں کی ذہن سازی، نصابِ تعلیم کی اصلاح اور تعلیم گاہوں کی بہتری کے لیے منصوبے باندھتے اور عملی کوششیں کرتے رہے۔

یہاں چند لمحے ٹھہر کر محمد سجاد اور اب مولانا محمد سجاد کے بچپن، ان کی طالبعلمی اور مدرسی کے زمانے کا مطالعہ کیجیے تو اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں ہوگا کہ وہ روایتی طالبعلم اور نرا مولوی کاہے کو تھا؟ ایک بگولہ تھا، شعلۂ جوالہ تھا، سیماب تھا جسے نہ کہیں قرار تھا، نہ قناعت، نہ سکون۔ وہ طالبعلم بن کر جہاں جہاں رہا نمایاں رہا، بحیثیت استاذ جن جن مدرسوں میں گیا انقلاب لایا۔ لیکن دل میں کوئی تپش، ذہن میں کوئی خلش تھی جو بے چین رکھتی۔ جانیے کہ وہ ٹھہری جھیل نہیں، مانند خورشید تھا: اِدھر نکلا اُدھر ڈوبا، اُدھر ڈوبا، اِدھر نکلا۔ تب شاید کوئی فیس ریڈر، ماہر نفسیات، علم نجوم کا ماہر یا قیافہ شناس دیکھتا تو بتاتا کہ دراصل یہ نوجوان چہار دیواریوں اور منجمد ماحول میں مقید رہنے یا محض دو چار کتابوں کو ہر سال نئے سرے سے پڑھنے پڑھانے اور ان پر حاشیے لکھنے کے لیے ہرگز

پیدا نہیں ہوا ہے۔ کہ اس کے آؤ بھاؤ چیخ چیخ کر بتا رہے ہیں کہ اس کا بنیادی وظیفہ تو عوام الناس کے دل و دماغ کو پڑھنا، قوم کی قسمت لکھنا اور کائنات خداوندی کو اپنا میدان عمل منتخب کرنا ہے۔

سوالہ آباد کے مدرسے میں مدرسی کرنے والے مولانا محمد سجاد کی زندگی میں ایک زبردست بدلاؤ یا کہیے سمتِ مقصد کے تعین کا آغاز تب ہوا جب وہ اپنے ہی ایک شاگرد زاہد خاں سے انگریزی اخبارات پڑھوا کر سنتے اور دنیا میں ہونے والی ترقیوں اور ممالک اسلامیہ کی بد حالیوں کی خبروں پر بے چین ہوتے تھے، چند مہینوں بعد انھیں لگا کہ اصلاح و تبلیغ اور تعلیم و تعلم کا محور ایک مدرسہ، دو چار کتابیں، کچھ طالب علم اور چند ہزار نفوس پر مشتمل کوئی قصبہ، یا ضلع نہیں؛ بلکہ پورا برصغیر، یہاں کے مسلمان اور ان کے شرعی، عائلی، تعلیمی اور سیاسی مسائل ہیں، سو انھوں نے مدارس عربیہ کے لیے اصلاحی نصاب مرتب کیا، انجمنِ علماء قائم کی، جس کے دو برس بعد جمعیۃ علماء ہند دہلی کے قیام میں سرگرم حصہ لیا، بہار میں پہلی خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی، امارت شرعیہ کی اسکیم کو عملی جامہ پہنایا، مسلم انڈیپنڈنٹ کے نام سے ایک سیاسی پارٹی تشکیل دی اور معاہدے، مجاہدے، ابلاغ و ترسیل اور مسلسل تگ و دو سے الیکشن جیتا، وزارت قائم کی اور ملک کے بھائی چارے کو بحال اور مسلمانوں کے بعض بے حد اہم مسائل کو سلجھانے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

مولانا کی تعلیم خالص مشرقی انداز اور درس نظامیہ کی تھی، مگر وہ مدارس کے جداگانہ نظام، ان میں رائج نصاب اور طریقۂ تعلیم سے مطمئن نہ تھے، ان میں مناسب تبدیلی چاہتے تھے۔ تمام مدارس میں الگ الگ نصاب کے بجائے چند تبدیلیوں کے ساتھ ہر جگہ ایک ہی نصاب لاگو کرنے کے حق میں تھے۔ وہ مدرسوں کو سرکاری تحویل میں دیئے جانے کے بالکل قائل نہ تھے۔ مدرسوں میں صنعتی تعلیم کے خواہاں اور پورے صوبے کے مدارس کے امتحان کے لیے باصلاحیت علماء کی ایک مجلس ممتحنہ بنانا چاہتے تھے، جس کے ذمے امتحانات کے سوالات مرتب کرنا، طلبہ کی صلاحیتوں کو جانچنا اور ان کے معیار کو بہتر بنانے کا لائحہ عمل تیار کرنا ہو۔ ان کا مشورہ تھا کہ سب سے بڑے مدرسے کو جامعہ ملیہ قرار دیا جائے اور ہر قابل اعتنا مدرسے کے سپرد کوئی ایک فن مخصوص کر دیا جائے مثلاً حدیث، فقہ، تفسیر، زبان، ادب، فلسفہ، منطق، وغیرہ، جس پر ابتدا سے ہی ان مدرسوں میں خاص توجہ دی جائے۔ بعد میں یہ فن ان اداروں کی مخصوص شناخت اور طلبہ کا تخصص کہلائے۔ ظاہر ہے مولانا کی یہ انقلابی فکر اپنے عہد سے آگے کی تھی جسے اگر تب عملی جامہ پہنایا

جاتا تو قال اللہ وقال الرسول کے داعیوں کی عمومی شناخت محض ان کا حلیہ اور ایک مخصوص مزاج نہیں بلکہ ان کی پہچان الگ الگ اختصاص، طرز فکر اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین کے طور پر ہوتی۔ اس حوالے سے علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ 'مولانا کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ علماء سیاسیات میں بھی قوم کی رہبری انجام دیں۔'' (۱) مولانا سجاد صاحب سے اپنی ذاتی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مولانا نے اُس موقع سے (چھپرہ کانفرنس، 1938 کے موقع سے) یہ بھی فرمایا تھا کہ کچھ ذہین مولویوں کو انگریزی پڑھنا چاہیے، تاکہ اسمبلی میں اور پارلیامنٹ میں ان کو بھیجا جائے، جہاں قانون سازی ہوگی، اگر ایسا نہ ہوا تو مسلمان بڑے خسارے میں رہیں گے۔'' مفتی صاحب آگے لکھتے ہیں ''عقل وہوش آئے اور ملک کی آزادی کے بعد دیکھا، تو مولانا مرحوم کا یہ نظریہ سامنے آیا۔ علمائے کرام کی ایک بڑی جماعت نے جنگ آزادی میں حصہ لیا، جیل گئے، ڈنڈے کھائے، جلاوطن ہوئے؛ مگر آزادی کے بعد ان کو کوئی حصہ نہیں دیا گیا اور پوری تاریخ آزادی میں مولانا آزاد کے سوا کسی کا نام تک نہیں آیا اور نہ آنے دیا گیا''۔ (۲)

اس بلا کے ذہین، دور اندیش اور عظیم قائد کی زندگی اور کارناموں کے مطالعے کے دوران مجھ جیسے قاری کے تصور میں ان کی بڑی ہی رعب دار، متاثر کن اور پُر شکوہ تصویر ابھرتی ہے؛ لیکن ان کے معاصرین ومشاہدین کے بیانات سے ان کی ہیئت وشخصیت یوں ترتیب پاتی ہے: دُبلا جسم، لمبا قد، سانولا رنگ، چوڑا دہانہ، پتلے ہونٹ، اونچی ناک، روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، ریشم سے ملایم بال، گھنی مونچھیں، ہلکی داڑھی رخساروں پہ کم ٹھڈی پر زیادہ۔ کھادی کا لمبا کرتا، کرتے کے اوپر کھادی کی ہی صدری، ٹخنوں سے اوپر پائجامہ، پاؤں میں بالعموم بے حد پرانے جوتے، دائیں ہاتھ میں لوہے کا سام چڑھا ہوا عصا اور سر پر کھادی کا بڑا سا بے ترتیب عمامہ، وہ سفر معمولی سواریوں اور معمولی درجوں میں کرتے تھے، قیام کہیں بھی فرمالیتے، کھانے پینے میں نہ کوئی خاص پسند تھی، نہ کسی طرح کا تکلف۔

جو لوگ ابتدائی عرب کے جغرافیائی حالات یا وہاں کے بود وباش سے واقف ہیں ان کے ذہنوں کے پردوں پر مولانا کو دیکھ کر یا ان کے قلمی خاکے کو پڑھ، یاسن کر سیدھے سادے، بے ضرر، معصوم قسم کے عرب بدو کی تصویر ابھر آئے تو اسے نامعقولیت کے بجائے حقیقت سے تعبیر

کیجیے، اور یقین مانیے کہ علم و ہنر اور صلاحیتوں کا تعلق ظاہری وضع قطع سے نہیں ذہن و دل اور سیرت و شخصیت سے ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جمعیۃ علماء کے اجلاس مرادآباد میں مولانا کو دیکھنے اور ان کا خطبۂ صدارت سننے کے بعد 'زمیندار'، 'انقلاب' اور دوسرے اہم اردو اخبارات نے اپنے مشاہداتی تبصرے یوں تحریر کیے تھے: ''مولانا سجاد کی صورت اور گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ایسا شخص بھی اسلامی سیاسیات؛ بلکہ سیاسیات حاضرہ کا اس قدر مبصر اور عمیق النظر ہو سکتا ہے''۔(۳)

مولانا انتہائی متواضع، خاکسار، خوددار، غیرت مند، محنت پسند، کشادہ دل، روشن دماغ، مستقل مزاج، نکتہ رس، حق گو، بیباک، صائب الرائے اور معاملہ فہم تھے۔ حریف کی چالوں کی تہہ تک پہنچنا اور ہر گتھی کو بآسانی سلجھا لینا انھیں خوب آتا تھا۔ وہ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو کی زندہ مثال تھے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ مستعار لینے کی اجازت دیں تو کہوں کہ:

''(ان کی) خاموشی میں گویائی تھی، وہ اکیلے تھے لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے، کہتے کم کرتے زیادہ تھے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ 'راہ' اور 'منزل' کے فرق کو کبھی فراموش نہ کیا،....وہ وطن کی آزادی اور احکام مذہبی کی پیروی کے درمیان التباس اور تصادم سے کبھی بے خبر نہیں رہے۔ جذبۂ آزادی کی پوری قوت کے باوجود انھوں نے کانگریس یا کانگریسی حکومت کے غلط قدم اٹھانے پر کبھی بزدلانہ یا صلح پسندانہ درگزر سے کام نہیں لیا''۔(۴)

یوں تو دینی مدرسے کے فارغ التحصیل ہونے کی بنا پر مولانا کی فقہ اور معقولات پر عمیق نظر تھی، قرآنی نکات اخذ کرنے میں مہارت تھی، علم بلاغت، معانی اور ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور امام غزالی کے مداح تھے؛ لیکن دو مسائل و معاملات پر انھوں نے گہری ریسرچ کی تھی اور اس میں ان کا کوئی بھی معاصر مدمقابل نہ تھا، نہ ثانی ہوا۔ پہلا امارت شرعیہ کے حوالے سے زکوۃ، خراج، قضا، امامت اور ولایت کے مسائل کے علاوہ اقتصادی، معاشی، سیاسی اور تنظیمی ڈھانچے کا مطالعہ، منصوبہ اور ان کے اطلاق کا طریقہ اور دوسرے کانسٹی ٹیوشن، یا کہیے دستور یا آئین کی ترتیب، تفہیم، تخصیص اور اس کی فارمولہ سازی کا ہنر، چنانچہ جب کانگریس نے اپنے طور پر دستور بنانے اور اس پر غور وخوض کرنے سے پہلے دوسری جماعتوں سے اس میں معاونت، یا بہتر نعم البدل پیش کرنے کی درخواست کا اعلان کیا تو جمعیۃ العلماء کی جانب سے جو شاندار فارمولہ تیار

کر کے کانگریس کو بھیجا گیا تھا، اس کی ترتیب میں مولانا کی کاوشوں کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ بہار اسمبلی میں اسلامی اوقاف کے بل کے مسودے کی ترتیب اور وہاں پیش کیے جانے والے دوسرے بلوں میں ترمیم و اضافے کے مشورے بھی مولانا کی ذہانت کے ثبوت ہیں۔ مولانا کے اس نوع کے کارناموں میں 'تذکرہ جمعیۃ العلماء ہند' کے نام سے اس کی دینی، سیاسی، تعلیمی، اجتماعی اور عملی جدوجہد کی بیس سالہ تاریخ کی تصنیف کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، جسے انھوں نے مرتب کر کے شائع کروایا تھا۔ بعد میں حکومت دہلی نے نہ جانے کس خوف سے اس کی تمام کاپیاں ضبط کر لی تھیں۔

تاریخ کے مطالعے سے ایک حیرت انگیز انکشاف یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں تبدیلی لانے، چھوٹے بڑے انقلاب برپا کرنے، کسی مقصد کو تحریک کی شکل میں ڈھالنے یا کسی تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے والے شخص میں چار خوبیاں یا ان میں سے کوئی ایک یقینی طور پر ہوتی ہے۔ اول دولت و وجاہت، دوم حسن بیان، سوم زورِ قلم اور چہارم بڑے پیمانے پر مذہبی، نسلی، قومی یا نظریاتی حمایت۔ لیکن اگر کوئی ایسا شخص جو اِن چاروں خوبیوں سے عاری ہونے کے باوجود مقاصد کو تحریکات کی شکل میں ڈھال دے، تحریک کو ادارے میں تبدیل کر دے اور ان اداروں سے ملک و قوم کی قسمت بدل دے، لوگوں کی سوچ و فکر میں انقلاب بپا کر دے تو جان لیجیے کہ وہ شخص نرا رہنما نہیں ملک و قوم کا مخلص، مصلح، مفکر، مجدد اور مرد دانا و بینا بھی ہوگا۔ تسلیم کیجیے کہ مولانا محمد سجاد ان چاروں صفات سے عاری تھے۔ کہ اس مرد دانا نے جب ہوش سنبھالا تو عسرت کی زندگی دیکھی، لیکن قوم کی معاشی حالت بہتر کرنے کی کامیاب تدبیریں وضع کیں۔ علاقے تک میں کوئی خاندانی دبدبہ نہ تھا، لیکن صوبۂ بہار میں اپنی پارٹی کی وزارت قائم کی۔ زبان میں موسیٰ کلیم اللہ کی مانند لکنت تھی سو تقریر کم کرتے اور سامعین کو گل افشانی گفتار سے سحر زدہ کرنے کے بجائے مستند دلائل اور معلوم براہین سے قائل کر لیتے۔ تحریر میں نہ تو مولانا آزاد کا سا جلال و جمال تھا، نہ شبلی کی سی انشاپردازی، نہ سید سلیمان کا سا بانکپن؛ لیکن یقین مانیے کہ توضیحی، ابلاغی اور استدلالی نثر جیسی مولانا سجاد لکھتے، وہ محض انھی کا حصہ تھا۔ ان کے خطبات سے قطع نظر ان کی محض تین چار تحریریں: مثلاً ''ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی: مسلمانوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ''، ''اسلام اور مسلم قومیت کے کیا معنی ہیں گاندھی جی غور کریں''، ''مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کی اسکیم پر ایک تبصرہ'' اور ''فرقہ وارانہ معاملات کا فیصلہ کن اصولوں پر ہونا چاہیے'' کے مطالعے سے ان کی

نکتہ رسی، استدلالی قوت اور فراست کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ مولانا انگریزی اور ہندی زبانوں سے ناواقف تھے؛ لیکن عالمی سیاست و دستور اور مغربی تمدن و قانون کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ مغربی سیاست اور حکمت عملی کو برتنا، توڑنا اور جوڑنا اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولانا اپنے عہد کے مجدد، مدبر اور مفکر ہی نہیں؛ بلکہ مذہبی علماء میں جدید خیالات و افکار کے حامل غالبا سب سے پہلے شخص اور مولویوں کی جماعت کو عملی سیاست میں لا کر انھیں کمتری کے حصار سے احساس تفاخر کی بلندیوں پر فائز کرنے والے اولین بوریہ نشیں بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا انور شاہ کشمیری نے انھیں 'فقیہ النفس عالم'، مولانا شبیر احمد عثمانی نے 'تبحر علمی کی سند' اور مولانا منظور نعمانی نے انھیں 'دور حاضر میں اسلامی سیاست کا اعلیٰ ماہر' کے خطابات سے نوازا ہے۔

مولانا محمد سجاد ابتدا سے ہی ہندو مسلم اتحاد، مسلمانوں کے لیے ایک قائدانہ پلیٹ فارم اور وطن عزیز کی آزادی کے لیے غور و خوض اور کوششیں کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تو ملک کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ایک بڑی اور منظّم جماعت تیار کر سکتے تھے؛ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کہ وہ 1857 کے اسباب و علل کا بغور مطالعہ کر چکے تھے، اسلامی حکومتوں کی تباہیوں کے احوال پڑھ چکے تھے۔ سرحدی علاقے میں حضرت اسماعیل شہید کی بچی کھچی جماعت کے حشر سے واقف تھے۔ ریشمی رومال کی تحریک کا انجام، حضرت شیخ الہند کی گرفتاری اور مولانا عبید اللہ سندھی کی جلاوطنی ان کے ذہن میں محفوظ تھی۔ پٹنہ کی وہابی تحریک اور اس کی ناکامی کا بھی انھیں علم تھا۔ سو، وہ تحریکات کے حوالے سے تمام اسباب، عوامل اور انجام کے مطالعہ و مشاہدے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ جنگ آزادی کی لڑائی کے لیے مسلم قوم کی ایک علاحدہ جماعت تیار کرنے کے بجائے تمام ہمراہیوں کو لے کر برادران وطن کے ساتھ جنگ آزادی کے مشن میں شامل ہونا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے کانگریس کی بھرپور حمایت کی، محبین وطن کے شانہ بشانہ چلتے اور انگریزوں کے خلاف تحریکی، تحریری، حربی اور سیاسی محاذوں پر لڑتے رہے۔

1937 کے الیکشن میں کانگریس اور دوسری پارٹیوں کے علاوہ صوبۂ بہار میں جدید تعلیم یافتہ اور ثروت مند مسلمانوں کی بھی دو پارٹیاں تھیں۔ ایک مولوی شفیع داؤدی کی احرار پارٹی اور دوسری بہار کے سابق وزیر تعلیم سید عبد العزیز کی مسلم یونائیٹڈ پارٹی۔ تیسری پارٹی کے طور پر مولانا محمد سجاد نے جمعیۃ العلماء ہند کی تائید اور امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی تشکیل دینے کے بعد الیکشن میں جانے کا فیصلہ کیا۔ اس پارٹی کے تمام امیدواروں سے اس

اگریمنٹ پر دستخط لیے گئے تھے کہ وہ امارت شرعیہ کے منشور کے پابند ہوں گے اور اسمبلی میں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق جو بھی بل پیش ہوگا، اس میں وہ امارت کے نقطۂ نظر کی تائید کریں گے، پارٹی کے صدر خود مولانا محمد سجاد تھے، جنرل سکریٹری بیرسٹر محمود اور پروپیگنڈہ سکریٹری (پبلیسیٹی سکریٹری) مولانا منت اللہ رحمانی تھے، جو بعد میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پہلے جنرل سکریٹری اور امارت شرعیہ کے چوتھے امیر شریعت منتخب ہوئے۔

امارت شرعیہ کی تجویز کی اولین پیش کش کے تعلق سے زیادہ تر لوگوں نے 25 جون 1921 کو پٹنہ کی پتھر والی مسجد میں ہونے والے اجلاس کو اس کی بنیاد قرار دیا ہے، جو مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں امیر کے انتخاب کے لیے بلایا گیا تھا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس اجلاس سے تقریباً تین مہینے پہلے مولانا سجاد نے دربھنگہ میں منعقد ہونے والے انجمن علماء بہار کے جلسے میں امارت شرعیہ کے قیام کی تجویز منظور کروائی تھی۔ امارت شرعیہ کا جو خاکہ مولانا نے تیار کیا تھا، اس میں انھوں نے اس وقت کے جید علماء مثلاً: مولانا محمد علی مونگیری، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، علامہ انور شاہ کشمیری، مفتی کفایت اللہ اور مفتی عزیز الرحمان وغیرہ سے گفتگو، مشورہ اور انھیں قائل کرتے رہے تھے۔ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس تحریک کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بھی تائید و حمایت حاصل تھی۔ امارت شرعیہ کا پہلا خاکہ کل ہند پیمانے پر تھا اور قائد کے لیے 'امیر شریعت' کی جگہ 'امیر الہند' کا عہدہ متعین کیا گیا تھا؛ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر علماء کل ہند پیمانے پر متفق نہ ہو سکے، چنانچہ بعد میں اسے صرف دو صوبوں بہار اور اڑیسہ تک محدود رکھا گیا۔

یہ محدود وقت مولانا محمد سجاد کی تعلیمی، تدریسی، تبلیغی، تحریکی، تنظیمی اور تعمیری خدمات کے تفصیلی جائزے کا نہیں، البتہ انتہائی اختصار کے ساتھ ان تاریخ ساز فیصلوں کا ذکر شاید بے محل نہ ہو جو صوبۂ بہار کی مجلس قانون ساز میں مولانا اور ان کی پارٹی کی سعی و جہد کے مرہون منت ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ابتداً صوبۂ بہار میں عدالت اور سرکاری دفتروں کی زبان ہندی تھی، جس کی وجہ سے اردو جاننے والے ہندو مسلمانوں کو متعدد پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا؛ مگر بھلا ہو مولانا اور ان کی پارٹی کا، جن کی کوششوں نے اردو زبان کو پہلی بار بہار کی کچہریوں میں سرکاری طور پہ جگہ دلوائی۔

آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بھی سیاسی پارٹیاں کسانوں کے فلاح و بہبود کی

باتیں تو خوب کرتی ہیں؛ مگران کے مسائل حل نہیں کرتیں؛ لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ سب سے پہلے مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی نے 1938 میں دفعہ 112 میں ترمیم کروا کے کسانوں کو لگان کے بھاری بوجھ سے نجات دلوائی اوران کے لیے دوسری آسانیاں پیدا کیں تھیں۔

اسمبلی میں حکومت کے 'اغراض و مفاد' کے لیے 'زرعی جائیدادوں پر ٹیکس لگانے کا قانون(Tenancy act) بنایا جانے لگا تو اس میں وقف کی جائیداد بھی شامل تھی، جب کہ اسلامی قانون کے مطابق اغراض حکومت کے لیے وقف کی جائیداد پر کوئی اضافی ٹیکس لگانا درست نہیں ہے، چنانچہ مولانا نے اپنی پارٹی کے ذریعے اس بل کی مخالفت کی اور سول نافرمانی کے اعلان کی دھمکی دی، نتیجتاً صوبۂ بہار میں وقف کی املاک کو ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا گیا۔

اسلامی اوقاف کی حفاظت اور نگرانی کے لیے صوبے میں کوئی قانون نہ تھا، جس کی وجہ سے وقف کی املاک برباد ہورہی تھیں۔ مولانا نے شریعت کے اصولوں کے مطابق ایک جامع مسودہ تیار کروا کے اپنی پارٹی کے ذریعے اسمبلی میں پیش کیا اور اسے کسی حد تک ردوبدل کے ساتھ منظور کروایا۔

بہار اسمبلی میں جب 'ڈاوری بل' (Dowry Bill) کا مسودہ پیش ہوا تو اس میں دوسرے مذاہب کے ساتھ مسلمانوں کے لیے بھی شادیوں میں جہیز اور مہر تک لینے کو جرم قرار دیا گیا تھا۔ مولانا کی دلیل تھی کہ اسلام میں 'مہر' نکاح کی لازمی شرط اور مسلمانوں کا پرسنل معاملہ ہے۔ سو انھوں نے اپنی پارٹی کے ذریعے اس بل میں ترمیم کروا کر مسلمانوں کو اس غیر شرعی قانون کا پابند بننے سے الگ رکھا۔

ایک بہتر قوم کی تعمیر کے پیش نظر تمام بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دے کر جب اسے صوبۂ بہار میں نافذ کرنے کی پالیسی بنائی گئی تو مولانا نے اپنی پارٹی کے ذریعے اسمبلی میں دباؤ بنوایا اور خود تحریک شروع کی کہ 'ابتدائی تعلیم کے نصاب میں مسلمان بچوں کے لیے مذہبی تعلیم لازماً شامل کی جائے، ورنہ بچے مذہب سے نابلد رہ جائیں گے۔ بالآخر بہار کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ: ''حضرت مولانا ابولمحاسن محمد سجاد، نائب امیر شریعت کے کہنے پر میں نے تعلیم گاہوں میں مذہبی تعلیم کو اصولاً منظور کرلیا ہے''۔

ایسا نہیں ہے کہ مولانا محمد سجاد نے جو سوچا آرام سے کرلیا، جو چاہا آسانی سے پالیا، خوب یاد رکھیے کہ ان کے پاس نہ جادو کی چھڑی تھی، نہ قوم کے لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا، راہ ہموار

نہ تھی مرحلہ سخت تھا اور کام بے حد دشوار؛ مگر مولانا بھی جہد وعمل کے فرہاد اور، صبر وتحمل کے کوہ گراں تھے، بعض اخبار نویسوں نے ان پر اعتراضات کے تیر برسائے، مخالفوں نے بیجا الزامات لگائے، دشمنوں نے گندی گالیاں دیں، منافقوں نے ہجویں لکھیں، بعض علاقوں میں انھیں تقریر کرنے تک سے روک دیا گیا؛ لیکن مولانا بد دل نہیں ہوئے، قوم سے منھ نہیں پھیرا، انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ سب دیکھتے، سنتے، پڑھتے، سہتے اور مسکراتے رہے، نہ لمحے بھر کے لیے اپنے منصب وقار کو بھولے اور نہ ہی ذرہ برابر اپنے مشن سے پیچھے ہٹے۔

روایت ہے کہ جب اورنگزیب عالمگیر نے معزول بادشاہ شاہجہاں کو محل میں نظر بند کیا توان سے پوچھا: اپنے لیے کوئی کام بتلائیے، جس سے قید کی تنہائی میں آپ کا جی نہ گھبرائے، شاہجہاں نے فرمایا: کچھ بچے دے دو، جنھیں میں پڑھاتا رہوں، اورنگزیب زیر لب گویا ہوئے: قید میں بھی خوئے بادشاہت نہ گئی اور یقین جانیے یہ بات کہنے کا حق رعایا کے ٹیکس کے پیسوں سے عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کے بجائے ٹوپیاں سل کر اور کلام الٰہی کی کتابت سے ذاتی اخراجات پورے کرنے والے اسی اورنگزیب کو تھا، جس کی عمر کا بیشتر حصہ تخت شاہی کے مقابلے گھوڑے کی بیٹھ پر بیٹھ کر فتنہ وشورش کو فرو اور دشمنوں کو پسپا کرنے کے لیے عظیم ہندوستان کے طول وعرض کی نگہبانی کرتے گزرا، اورنگزیب نے جان لیا تھا کہ ملک کو انتشار سے بچانے، رعایا کو شر سے محفوظ رکھنے اور ملک کو فلاح وترقی سے ہمکنار کرنے کی بس یہی صورت ہے کہ محل میں طاؤس ورباب سے رشتہ جوڑنے کے بجائے میدان عمل میں نکل کر شمشیر وسناں سے دوستی لازمی ہے، یقین کیجیے کہ مولانا سجاد نے بھی اپنی قومی اور سیاسی زندگی کے کم وبیش چوبیس سال گھر کی آسائش، خانگی ذمہ داریوں، منصب وجاہ اور حب اولاد سے دور رہ کر عوام کے درمیان جہد وسعی کرتے بسر کی۔ کہیں آگ لگے، سیلاب قہر ڈھائے، زلزلہ آئے، ہولی اور قربانی کا تنازعہ ہو، فرقہ وارانہ فساد بھڑکے، مسلمانوں پر مقدمہ چلے، وہ ہر جگہ خود جاتے، معاملات سمجھتے، باز آبادکاری کے کاموں میں بذات خود شریک ہوتے اور مظلوموں کی ہر طرح سے مدد کرتے۔ مولانا کے مصاحبین ومعاصرین کا تحریری بیان ہے کہ قوم کے اتحاد وامداد کی جیسی فکر، ملک کی آزادی کا جیسا جنون، فلاحی منصوبوں کی تکمیل کا سودا اور خدمت خلق کا جیسا جذبہ مولانا سجاد کو تھا، کسی اور رہبر یا رہنما میں دیکھنے کو نہ ملا۔ اس عرصے میں وہ ہر طرح کے نشیب وفراز سے گزرے، لیکن کبھی بھی نہ آلام ومصائب سے دل برداشتہ ہوئے، نہ تحریکوں کی مقبولیت اور منصوبوں کی

کامیابی کی خوشی میں لمحے بھر کے لیے جدوجہد کی رفتار کو مدھم پڑنے دیا۔

مولانا محمد سجاد ادارہ ساز بھی تھے اور شخصیت ساز بھی۔ انھوں نے اپنی بات گاندھی جی سے منوانے کے لیے مولانا محمد علی جوہر کو قائل کیا، متعدد معاملات میں مولانا آزاد اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو ہمنوا بنایا، مولانا عبدالصمد رحمانی جیسا شاگرد پیدا کیا، مولانا منت اللہ رحمانی جیسا قائد تیار کیا، علماء کو ان کا منصب یاد دلایا اور عوام کو ان کے فرائض سے آگاہی بخشی۔ اس مرد مجدد کے یہاں غفلت پسندی، مصلحت اندیشی اور منافقت نام کو نہ تھی، خودنمائی کی خواہش چُھو کر نہ گزری تھی۔ وہ ایسے جری، حق گو، بے ریا اور بے باک تھے کہ کانگریس میں رہتے اور ہر طرح سے اس کی معاونت کرنے کے باوجود انھوں نے 'نہرو رپوٹ' سے اصولی اختلاف کیا،' واردھا اسکیم' اور' شاردا ایکٹ' پر زبردست اعتراضات کیے، اخبار' ہریجن' میں اسلامی قومیت اور نظریۂ اہنسا کے تعلق سے شائع ہونے والے گاندھی جی کے مضمون پر سخت تنقید کی اور اس کا مدلل و مسکت جواب لکھا۔ حکومت کو فرقہ وارانہ فسادات کے سد باب کی ترکیبیں سجھائیں اور ان کے فیصلوں کے اصول بتائے۔ مسلم لیگ کی جیسی مخالفت مولانا سجاد نے کی، کسی اور نے نہ کی ہوگی۔ پاکستان کے نظریے، مذہب کی بنیاد پر دونوں ملک کو دیے جانے والے علاقوں کی مجوزہ تقسیم اور نیا ملک بننے کے بعد پیش آنے والے حالات و مسائل کے تعلق سے جس نوع کے تیکھے سوالات مولانا نے مسٹر محمد علی جناح سے کیے اور ان کے مجوزہ ملک کو غیر فطری، غیر منطقی اور غیر دانشمندانہ بتایا وہ مولانا کی تحریروں کے حوالے سے تاریخ کا حصہ ہے۔

مولانا محمد سجاد کے بڑے کارناموں میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے مختلف الخیال علماء، متنوع النظریات سیاسی رہ نما اور الگ الگ قومی رضا کاروں کی شیرازہ بندی کی، انھیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ صوبے کے منتشر عوام کو ایک شرعی ادارے کے تحت یکجا کیا۔ اپنے حسن تدبیر سے بیس ہزار سے زائد گدی مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچایا۔ ڈکیتی اور چوری پیشہ ایک بڑے قبیلے کو راہ راست پر لائے، انھیں زندگی کے صحیح مقاصد بتائے، جس نے متاثر ہوکر اسلام قبول کرلیا۔ ایک وسیع علاقے کے مسلمانوں کو برسوں سے مشرکانہ رسم کی ادائیگی مثلا دیوی استھان پر چڑھاوا چڑھانے، سبھا کی پرستش اور' کھدیا گھر' (خدائی گھر) میں سجدہ کرنے جیسے اعمال پر کاربند رہنے سے نجات دلاکر مذہب کے خالص تصور سے انھیں آشنا کیا۔ متعدد مکاتب و مدارس قائم کیے، پوری قوم میں سیاسی شعور، معاشی ترقی، تعلیمی بیداری اور منظّم زندگی گزارنے کی روح پھونکی۔ علماء

کواحساس کمتری سے نکلنے، اپنے بلند منصب و مرتبے کو سمجھنے اور جدید تعلیم کے حصول پر آمادہ کیا، انھیں اجتماعیت، منصوبہ بندی، شخصیت سازی اور اداروں کی تشکیل کا ہنر سکھایا۔ فلاحی کاموں کو قوم کے مزاج کا جزو اعظم بنایا اور عوام الناس کو یہ باور کروایا کہ اگر باعزت طور پر زندہ قوم کی حیثیت سے دنیا اپنی جگہ بنانی ہے تو مذہب کو اپنی روح میں اتارنا ہوگا۔ ہر عہد کے مطابق خود کو نئے علوم و فنون سے آراستہ کرنا ہوگا۔ اپنی اجتماعی طاقت، معاشی مضبوطی اور سیاسی بصیرت ثابت کرنی ہوگی اور ان تمام اوصاف کی بنیاد پر حکومت میں شراکت داری بہر طور حاصل کرنی ہوگی۔ کہ معاملہ محض اپنے لیے جہد للبقا کا نہیں، آئندہ نسلوں کے دین و دنیا کے تحفظ اور انھیں افتخار قوم بنانے کی منصوبہ سازی اور اس پر عمل کرنے کا ہے۔

یقین کیجیے کہ مولانا کی سعی وکاوش بارآور ہوئی ہے۔ ان کی تحریک، تنظیم، منصوبہ سازی اور حقوق کی جنگ کے مشن کو آج بھی بالخصوص جمعیۃ العلمائے ہند اور علماء کی دوسری جماعتیں آگے بڑھا رہی ہیں۔ لیکن کہنے کی اجازت دیجیے کہ سرعت سے بدلتے حالات اور زمانے کی برق رفتاری کے پیش نظر جماعتوں کے قائدین کو اس میں قدرے تیزی لانے، طریقۂ کار میں تنوع پیدا کرنے، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو شامل کرنے، نئے شعبہ جات کے اضافے اور دائرہ کار کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے۔

مصادر ومراجع

(۱) حیات سجاد، ص56

(۲) کچھ یادیں اور باتیں، مفتی محمد ظفیر الدین، حضرت مولانا محمد سجاد: حیات و خدمات، امارت شرعیہ، پٹنہ، 2003 ص،384

(۳) بحوالہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، حیات سجاد، ص، ۷۷

(۴) محاسن ابولمحاسن، مشمولہ، حیات سجاد، مرتب انیس الرحمان قاسمی امارت شرعیہ، پٹنہ، 1998 ص 53

ملکی اور عالمی حالات کے تناظر میں افکار سجاد کی معنویت
سیاسی موقف کے خصوصی حوالے سے

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی

صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

یوں تو تاریخ کا ہر دور اپنے اندر کوئی مخصوص معنویت رکھتا ہے، لیکن اس کے بعض مرحلے بڑے نازک اور فیصلہ کن ہوتے ہیں، اور ان میں قوموں کی سینکڑوں سالہ مستقبل کی قسمتیں طے ہوجاتی ہیں۔ ایسے مرحلے امت مسلمہ کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں کئی مواقع پر آئے، اور پھر ان کے اچھے برے نتائج سے مستقبل کی نسلوں نے اپنی زندگیوں کو دوچار کیا۔ برصغیر کی معاصر تاریخ میں واقعات کی باریکیوں پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ برطانوی دور کے آخری مرحلہ میں، جب مستقبل کے ہندوستان کی نقش گری کی جارہی تھی، اور اس کے خد وخال پر نرم گرم گفتگو جاری تھی، تاریخ کا وہ مرحلہ مسلمانان برصغیر کے لئے فیصلہ کن ثابت ہورہا تھا، اور وقت کے مخفی ہاتھوں سے ان کی حیات آئندہ کی صورت گری انجام پارہی تھی۔

مسلمانان ہند کی خوش بختی ہے کہ اس نازک موقعہ پر انھیں نامور اور قدآور شخصیتوں کی قیادت حاصل رہی، جنھوں نے متعدد جہتوں سے اور مختلف میدانوں میں امت مسلمہ کے دین و شریعت اور تہذیب و اقدار کے تحفظ کے لئے عملی اقدامات کئے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس نازک وقت میں قوم مسلم نے وہ سب کچھ حاصل کرلیا جو ان کے مطلوبہ مستقبل کی ضرورت تھی، اور ایسا ہونا ممکن تھا بھی نہیں، کیوں کہ اُس دور زوال میں قوم کی جھولی سے ایک کے بعد ایک سرمایہ لوٹا جارہا تھا، اور ان کی سیاسی، سماجی، تعلیمی اور قانونی تنگدستی ہر دن فزوں ہوتی جارہی تھی۔ لیکن ایسا بھی نہ ہوا کہ ملت مسلمہ نے وقت کے جبر کے آگے سپر ڈال دیا ہو، اور اپنی متاع دین و دانش کوڑیوں کے مول لٹانے پر راضی ہوگئی ہو، بلکہ ان سالاران قافلہ نے ملت کی آبرو باقی رکھی اور اپنی شناخت پر حرف نہ آنے دیا۔

انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول برصغیر کی سیاسی، علمی اور تہذیبی تاریخ میں تبدیلی کا مرحلہ یعنی Turning Point ہے۔ اس وقت ملک ایک نئی کروٹ لے رہا تھا، نئے تجربے، نئی قانون سازیاں، نئی صورت حال، نئی آراء اور نظریات، نئی منصوبہ بندی اور نئی دستور سازی' یہ سب اسی دور طوفان بلاخیز کی موجیں تھیں جو حالات کو تہہ و بالا کر رہی تھیں۔ مولانا ابو المحاسن محمد سجاد اسی تاریخ کشاکش پیہم کا حصہ ہیں اور ان کی بھرپور زندگی نے وقت کے دھاروں کو ملت مسلمہ کے حق میں موڑنے میں اپنی سی پوری قوت صرف کردی، اور وہ راہیں متعین کردیں جن پر آج بھی امت ہندیہ کا قافلہ اپنے سرمایہ دین کے ساتھ گامزن ہے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ (1881-1940) اپنے معاصرین میں کئی پہلوؤں سے امتیازی خصوصیات رکھتے ہیں' جن کی وجہ سے انھیں تاریخ ہند میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یہ امر حیرتناک ہے کہ دیگر معاصر شخصیات کے مقابلہ میں مولانا محمد سجادؒ پر یادگاری اور تحقیقی کام بہت کم انجام پائے، اور نئی نسل تک ان کا فکری سرمایہ اس طور پر نہیں پہنچایا جاسکا، جو کسی بھی زندہ قوم میں وقت کے تقاضوں کی روشنی میں فکری کام کو آگے کی سمت میں لے جانے کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے، جب کہ افکار سجاد کی معنویت معاصر ہندوستان میں بہت زیادہ تھی اور جس رخ پر انھوں نے کام شروع کیا تھا، وہ مسلمانان ہند کے لیے سرمایہ حیات اور آب زلال کی مانند تھا، فکر سجاد نے عالم اسلام کے نقشہ میں جو رنگ بھرنا چاہا تھا، وہ بھی مستقبل کے ان اندیشوں کی آگاہی تھی، جو آج حقیقت بنتے جارہے ہیں۔ پس ملک اور عالم اسلام کے موجودہ دگرگوں حالات میں فکر سجاد کے سیاسی، اجتماعی اور بین قومی روابط کے پہلوؤں کی معنویت زیادہ بڑھ گئی ہے اور ان کے علمی جائزہ ونقد اور قدر اندازی کے ذریعہ مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں بڑی مدد لی جاسکتی ہے۔

مولانا محمد سجادؒ کی زندگی کے چند نمایاں پہلو تھے، ایک جانب وہ گہرے عالم دین تھے، ان کا فہم دین اور فقہی شعور بالیدہ تھا، امت کی اجتماعی زندگی کا خاکہ ان کے ذہن میں واضح تھا، درپیش حالات کے تناظر میں قرآن کے اصولوں اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات سے رہنمائی حاصل کرنے میں انھیں درک حاصل تھا۔ دوسری جانب وہ بڑے متحرک وفعال تھے، عملی اقدام فوری کرتے اور ان کو پوری تیاری، جہد مسلسل اور استحکام کے ساتھ انجام دیتے، حالات کے سامنے سپر انداز نہ ہوتے؛ بلکہ ان کا سامنا کرتے ہوئے ممکنہ راہ نکالتے اور مطلوبہ کام انجام دے جاتے تھے۔ تیسری طرف مولانا محمد سجادؒ سادگی اور استغنا کا پیکر تھے، قربانی اور بے نیازی

بھری ہوئی تھی، جاہ ومنصب سے دور بھاگتے؛ لیکن ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے اور فرض کو انجام دینے میں نہ ہچکچاتے تھے۔ چوتھی جانب مولانا محمد سجادؒ کے اندر پر جوش دینی حمیت تھی، ان کی غیرتِ دینی خطرات سے نبرد آزما ہوجایا کرتی تھی اور وہ اسلامی شعائر کے اظہار اور استحکام پر پوری قوت واستدلال کے ساتھ مدمقابل ہوجاتے تھے۔ مولانا محمد سجادؒ کی ان صفات کو ہم ان کے افکار کے عناوین بھی قرار دے سکتے ہیں۔ آیئے، ہم دیکھتے ہیں کہ ان افکار کا اظہار ان کی حیات میں کس طور پر ہوا اور آج ان کی کیا معنویت ہے؟

مولانا موصوف بنیادی طور پر ایک عالم دین تھے، دین کے دونوں سرچشمے یعنی قرآن مجید اور سیرت مطہرہ پر گہری نظر رکھتے تھے اور اسی لیے کسی مسئلہ پر شرعی موقف طے کرنے میں وہ آسانی کے ساتھ صحیح اور مستحکم رائے تک پہنچ جایا کرتے تھے۔ یہی وہ آپ کا وصف تھا کہ متعدد سوانح نگاروں کے بقول علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے آپ کو 'فقیہ النفس' قرار دیا تھا۔ مولانا محمد سجادؒ نے اپنے پیچھے تحریروں کا بہت بڑا مجموعہ تو نہیں چھوڑا ہے؛ لیکن آپ کے تقریبا دوسو کی تعداد میں فتاوی امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ سے شائع ہو چکے ہیں، نیز آپ کے بعض کتابچے اور خطابات جیسے حکومت الٰہی، جمعیت علماء ہند کے اجلاس مرادآباد کا خطبہ صدارت، ترک موالات کا فتوی اور امارت شریعہ کے لئے اجرائی احکام وغیرہ، ان سے آپ کے علم کی گیرائی، پختگی اور قوت استنباط کا واضح اظہار ہوتا ہے، آپ کا یہ وصف آپ کے معاصرین میں بھی معروف تھا اور وہ اس کے معترف بھی تھے۔

کوئی بھی فکر، جب تک عمل کا روپ نہ لے، نہ تو اس کی شکل واضح ہوتی ہے اور نہ اس کی عملی افادیت کی تحقیق ہو پاتی ہے۔ مولانا محمد سجادؒ نے متعدد محاذوں پر عملی اقدامات کئے، اور اپنے سفر میں بڑے سرگرم اور تیز گام رہے۔ آپ نے عملی قدم ان راہوں پر اٹھائے جہاں پھولوں کی سیج نہ تھی اور نہ زمین ہموار؛ لیکن آپ کے فولادی عزم، اپنی رائے پر مستحکم یقین اور بے لوث جہد پیہم نے فکر کو حقیقت کے سانچہ میں ڈھال دیا۔ یادش بخیر کہ جب عالمی جنگ عظیم اول (1914-1918) میں خلافت عثمانیہ کی شکست وریخت کے بعد پورا عالم عرب اور عالم اسلام اتحادی قوتوں کے استبدادی شکنجہ میں کس چکا تھا، ارض مقدس فلسطین میں خبیث بیج بودیے گئے تھے اور مرکز خلافت استنبول سے جمہوریت کے پرفریب نعروں میں خاتمہ خلافت کا المناک اعلان ہورہا تھا تو یہی وہ وقت ہے، جب مولانا محمد سجادؒ کے سوزِ دروں کی جلوہ گری اور نفس بیتاب

کی بے قراری نے انھیں مدرسہ کی پرسکون مسند سے اٹھا کر ہنگامہ کارزار میں لا کھڑا کیا۔ وہ وقت ہے اور پھر زندگی کا لمحہ آخریں کہ مولانا محمد سجاد پیکر عمل، جہد مسلسل، نفس گرم، تصویر غم والم، مقصد کے لیے دیوانہ اور صلہ وستائش کی تمنا سے بیگانہ، اپنی حیات عارضی کے ہر لمحہ کو ہزار جتن کے ساتھ کام اور صرف کام کے لیے وقف بنائے رہے۔

آپ کی کوششوں کا آغاز امت کے لیے اجتماعیت کے قیام سے ہوتا ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی شرعی تنظیم قائم کرنے اور ایک امیر کے ماتحت زندگی گذارنے کے اسلامی اصولوں کے مطابق مسلمانوں کی زندگی کا پورا نقشہ آپ کے ذہن میں تھا، اس کا آغاز کرتے ہوئے انھوں نے 1917 میں صوبہ بہار کے علماء کو جمع کیا اور انجمن علمائے بہار قائم فرمائی، عالمی حالات کے اثرات ملک کے مسلمانوں پر بھی مرتب ہو رہے تھے، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کی کوششیں اور سازشیں' مسلمانان ہند کے لیے سوہان روح بن رہی تھیں، ان حالات کے پیش نظر 1919ء میں انھوں نے دیگر علماء کے ساتھ مل کر بمبئ میں مطالبہ بحالئ خلافت کے لئے' خلافت کمیٹی' قائم کی اور پھر دوسری علاقائی کمیٹی گیا میں اور تیسری پھلواری شریف پٹنہ میں قائم فرمائی، علماء کی اجتماعیت کے کام کو ملک گیر سطح پر انجام دینے کے لئے دہلی میں منعقدہ خلافت کانفرنس کے موقع پر' جمعیت علمائے ہند' کے قیام میں سرگرم حصہ لیا، پھر اس جمعیت کے پہلے اجلاس منعقدہ دسمبر 1919 بمقام امرتسر کے موقع پر آپ نے اپنے اصل خیالات کا منصوبہ پیش کرتے ہوئے پورے ملک کی سطح پر امارت شرعیہ کے قیام اور امام المسلمین کی ضرورت پر مدلل گفتگو فرمائی، پھر اس کے دوسرے اجلاس منعقدہ نومبر 1920 دہلی میں پانچ سو علماء اور ارباب حل وعقد کے منتخب مجمع میں' امارت شرعیہ فی الہند' کے قیام کی تجویز پیش کی۔ صدر جلسہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے اس تجویز کی تائید فرمائی؛ لیکن اس اجلاس میں انتخاب امیر کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا اور جب آئندہ اجلاسوں میں بھی انتخاب امیر کا مسئلہ معلق رہ گیا، اور صوبہ وار امارت کے قیام کی تجویز منظور ہوئی، تو مولانا محمد سجادؒ نے' انجمن علمائے بہار' کے اجلاس دربھنگہ' مئی 1921 میں امارت شرعیہ کے قیام کی تجویز منظور کرائی۔ پھر پٹنہ کے خصوصی اجلاس زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد میں چار ہزار شرکاء کی موجودگی میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے سجادہ نشین مولانا شاہ بدرالدین صاحب کو' امیر شریعت' اور مولانا محمد سجاد کو' نائب امیر' منتخب کرلیا گیا۔

یہ کام آسان نہ تھا، مولانا محمد سجادؒ نے نہ صرف اس کو قائم کر دکھایا بلکہ اس شرعی تنظیم کے

پورے نظام کو مستحکم بنانے کے لئے انتظامی اور عملی دونوں سطحوں پر مسلسل کام انجام دئے۔ اور انہی محنتوں کا نتیجہ ہے کہ امارت شرعیہ کا یہ نظام صوبہ بہار کی سطح پر بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنی صدی پوری کرنے جارہا ہے۔ مولانا محمد سجادؒ کا یہ خاکہ عملی شکل میں' اور وہ بھی خود ان ہی کے ہاتھوں سے ظاہر ہوا۔

مولانا محمد سجادؒ کے کام کا اصل میدان مسلمانوں کی شرعی تنظیم تھی، اس کے لیے آپ نے مفصل خاکہ پیش کیا، جو آپ کے ذریعہ قائم ہونے والے اداروں جیسے' انجمن علمائے بہار'،' جمعیت علمائے ہند'،' خلافت کمیٹی'،' مسلم انڈپنڈنٹ پارٹی' اور' حزب اللہ' وغیرہ کے علاوہ آپ کے فکری سرمایوں اور تحریروں میں موجود ہے۔ آپ کی کتاب' حکومت الٰہی' اور اجلاس جمعیت علماء ہند مرادآباد (جنوری 1925) میں آپ کا' خطبہ صدارت' اس سلسلہ میں خاصہ کی چیزیں ہیں، اور ضرورت ہے کہ یہ اور دیگر تحریروں کی روشنی میں اس فکر کے خدوخال پر تجزیاتی کام کیا جائے۔ مولانا محمد سجادؒ نے دین کے ساتھ سیاست کی وابستگی' تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں اس کی نافعیت' سیاست سے علماء کی کنارہ کشی کے نقصانات اور موجودہ وقت میں اس کی شدید ضرورت پر مدلل گفتگو کی ہے، ہندوستان کے جیسے ان معاشروں میں، جہاں حکومت اسلامی بنیادوں پر قائم نہیں ہے، شریعت کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی، مذہبی آزادی اور دینی شناخت کی حفاظت کے اصول اور خاکہ کو بھی مولانا محمد سجادؒ نے بڑے سلجھے، مستند اور قابل عمل بنا کر پیش کیا ہے اور ہندوستان میں مختلف سطحوں پر اس کا عملی نمونہ بھی قائم کر دیا ہے۔

مولانا محمد سجادؒ اس سلسلہ میں جو فکری خاکہ رکھتے تھے، اسے بیان کرنے کے لیے آپ کے چند اقتباسات پیش کرنا مناسب ہوگا۔

مسلمانوں کی شرعی تنظیم کی ضرورت کے بارے میں مولانا محمد سجادؒ کہتے ہیں:

''اسلام ایک تنظیمی مذہب ہے، اس مذہب کی روح ڈسپلن اور نظم چاہتا ہے، اگر مسلمان منتشر رہیں اور کسی ایک شخص کی اطاعت نہ کریں اور اپنا کوئی امیر منتخب نہ کریں تو یہ زندگی غیر شرعی زندگی ہوگی۔ ہر ایک پیغمبر جو دنیا میں آتا ہے اس نے اپنی ابتدائی تقریر میں دو باتیں لازمی طور پر کہی ہیں: ﴿فاتقوا اللّٰہ واطیعون﴾ یعنی اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور یہ اطاعت وہ چیز ہے جس پر قوموں نے مخالفت کی ہے۔ عام طور سے قومیں خدا کی قوت اور طاقت تسلیم کرنے کو آمادہ ہو جاتی تھیں؛ لیکن پیغمبر کی اطاعت پر رضامند نہ

ہوتی تھیں، پیغمبر کی اطاعت کو وہ اپنی عزت و برتری اور اپنی سرداری کے منافی سمجھتی تھیں''۔(۱)

مولانا کی رائے ہے کہ مسلمانوں کی یہ شرعی تنظیم اگر مکمل طور پر اور زندگی کے تمام میدانوں میں ممکن نہ ہو، تب بھی اس سے پہلوتہی نہیں برتنی چاہیے؛ بلکہ جس حد تک ممکن ہو اور جن میدانوں میں یہ تنظیم قائم کی جاسکتی ہو، وہاں انجام دینا ضروری ہے:

''کفر کے اس بے پناہ غلبہ کو جس قدر کم کیا جاسکے کرنا چاہیے، اس راستے میں جس قدر قربانیاں پیش کرنے کی ضرورت ہو اس سے دریغ نہ کیا جائے، جن چیزوں میں حکومت مسلطہ مداخلت نہیں کرتی اور جو چیزیں اس کی دست برد سے باہر ہیں، ان میں اپنا مکمل نظام قائم کیا جائے''۔(۲)

مولانا کا واضح خیال تھا کہ ہندوستان جیسے ممالک میں بھی، جہاں مسلمان سیاسی اقتدار کے مالک نہیں ہیں، مسلمانوں کو اقتصادی اور معاشرتی کاموں کے لیے ایک امیر کی ماتحتی میں زندگی گذارنا ضروری ہے اور جس قدر ممکن ہو، وہ اپنی زندگی کو شرعی بنائیں:

''جب تک حکومت کافرہ کا مسلمانوں پہ تسلط ہے، اور جب تک مسلمان اس ابتلاء میں مبتلا ہیں اور جس وقت تک مسلمان اپنے سیاسی اقتدار کے مالک نہیں ہوجاتے، اس وقت تک اپنے اقتصادی اور معاشرتی کاموں کے لئے ایک اپنا امیر منتخب کریں اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری پہ بیعت کریں؛ تاکہ اس کفرستان میں جس قدر ممکن ہوسکے، مسلمان اپنی زندگی کو شرعی بناسکیں''۔(۳)

مسلمانوں کی یہ شرعی تنظیم مولانا کے نزدیک 'نظام اسلام کا خاکہ' ہے، اور وہ شخصیت پرستی نہیں ہے؛ بلکہ جمہوریت کی غلط راہ کے مقابلہ میں اسلام کی راہ سنت ہے:

''یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ میں جس نظام کی دعوت دے رہا ہوں، اس سے مقصود شخصیت پرستی ہے؛ بلکہ میں وحدت پرستی کی دعوت دیتا ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ جس طرح شخصیت ملعونہ کے قلادہ کو نکال پھینکئے، اسی طرح جمہوریت منحرفہ کے طوق کاٹ ڈالئے اور اس سنت سنیہ کو اختیار کیجئے، جس کی اتباع میں دارین کی فلاح ہے اور سنت سنیہ کی راہ وہی ہے، جس کا ادنی خاکہ میں نے پیش کیا ہے اور اگر مسح خفین کا مسئلہ حسب بیان بعض صحابی قرآن میں موجود ہے تو میرا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ نظام اسلام کا وہ خاکہ بھی جو میں نے پیش کیا ہے، یا جمعیت علماء کے سامنے ہے۔قرآن میں موجود ہے:

" لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة " وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين وعضوا عليها بالنواجذ". (۴)

مولانا محمد سجادؒ صاف لفظوں میں بتاتے ہیں کہ سیاست دنیا دین سے علاحدہ کوئی چیز نہیں ہے؛ بلکہ وہ دین ہی کا حصہ ہے۔

''سیاست دنیا' مذمومہ شے نہیں ہے جو اس پر لعنت کی جائے، یا اس سے کنارہ کشی کی جائے، اگر سیاست منافی دین ہوتی اور دنیا مذمومہ ہوتی تو علماء محمد یہ کو انبیائے بنی اسرائیل سے تشبیہ دے کر ان کے سیاست میں قدم ڈالنے کی ترغیب نہ دی جاتی''۔(۵)

کیوں کہ ان کے نزدیک سیاست کے اندر سماج کی خدمت اور مالی انتظامات کے کام آتے ہیں:

''سیاست وہ قانون ہے جو رعایت ونگرانی، آداب مصالح وانتظام اموال کے لیے وضع کیا گیا ہو''۔(۶)

مولانا محمد سجادؒ سیاست کی اس اہمیت کو بیان کرنے کے بعد شدت سے یہ احساس ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام کے سیاسی نظام پر اس طرح توجہ نہیں دی گئی اور نہ اس پر اس طرح کام کیا گیا، جس طرح اسلام کے دیگر ابواب بالخصوص عبادات اور معاشرتی معاملات پر کام انجام دئے گئے:

''جس طرح کتاب الطہارت، کتاب الصلاۃ اور نکاح وطلاق کے ابواب میں بال کی کھال نکالی گئی ہے، نظام اسلام کے اصول وفروع میں اس تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے''۔(۷)

ان کے نزدیک موجودہ زبوں حالی کی وجہ اس میدان سے اہل دین اور علماء کا اعراض و بے توجہی بھی ہے:

''سیاست مدن اور اور اجتماعی زندگی کے باب میں علمائے ربانیین اور فضلائے عظام اور ماہرین شریعت نے عملی حیثیت سے اتنا حصہ نہیں لیا جتنی کی ضرورت تھی، اگر یہ حضرات عملاً حصہ لیتے اور اپنے اوقات کا معتد بہ حصہ اس پر خار وادی میں گذارتے، تو امید یہ تھی کہ اتنے مفاسد نہ پیدا ہوتے اور شریعت اسلامیہ کے اصول وفروع کی اتنی بے حرمتی نہ

ہوتی اور مسلمانوں کی بے عزتی جو وقوع میں آئی ہے، نہ ہوتی، جس کے تصور سے آج بدن پر لرزہ آتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور دل کے ٹکڑے ہونے لگتے ہیں‘‘۔(۸)

وہ مزید وضاحت کرتے ہیں:

’’میرا مقصد یہ نہیں کہ میدان سیاست میں ان حضرات نے کبھی قدم نہیں رکھا، اور اجتماعی زندگی کی خار دار وادی میں انھوں نے کبھی بادیہ پیمائی نہیں کی، اگر خدانخواستہ یہ حضرات ان ابواب میں کچھ بھی نہ کرتے تو مسلمان جس حالت میں اس وقت موجود ہیں غالباً یہ بھی نہ ہوتا؛ بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ جس قدر کرنا چاہیے تھا، وہ قرون اولی کے بعد نہ ہوا اور ان میدانوں میں ہمیشہ علمائے ربانیین کی کمی نمایاں طور پر محسوس ہوتی رہی، اگر علمائے کرام کی معتد بہ جماعت علمی وعملی حیثیت سے ان میدانوں میں پیش پیش رہتی تو غالباً معاملہ اس حد تک نہ پہنچتا‘‘۔(۹)

مولانا محمد سجادؒ نے اس موضوع پر کام کی نہ صرف ضرورت بیان کی ہے؛ بلکہ اس کا خاکہ بھی پیش کیا ہے:

’’سب سے پہلے نظام اسلام کے تمام اصول وقواعد کو نہایت ترتیب وتہذیب کے ساتھ مرتب کیا جائے اور اس کی ترتیب میں درج ذیل امور کو مدنظر رکھا جائے: اول یہ کہ شرعی اصول سے تمام دنیائے اسلام میں اقتدار خلافت کے قیام کے لیے جن جن امور کی ضرورت ہے، سب کو نہایت تفصیل کے ساتھ اس میں داخل کیا جائے، اور ان امور ضروریہ کے اندراج میں کسی خوف وملامت کی پرواہ نہ کی جائے‘‘۔(۱۰)

مولانا کا خیال ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام صرف مسلمانوں کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ وہ عام انسانیت کی ضرورت ہے:

’’نظام اسلام تمام دنیا کی نجات کا باعث اور تمام مخلوق الٰہی کے لیے ابر رحمت ہے اور نظام اسلام ہی کے استوار ومحکم ہونے سے تمام ان احکام پر بہتر طریقہ پر عمل ہوسکتا ہے، جو انفرادی واجتماعی زندگی کی فلاح وبہبود سے متعلق ہیں‘‘۔(۱۱)

مولانا محمد سجادؒ نے اسلام کے سیاسی نظام پر گفتگو کرنے کے ساتھ موجودہ جمہوریت اور اس کے خدوخال پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اس جمہوریت کے کون کون سے پہلو سماج کو نقصان پہنچاتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں اسلامی نظام کے اندر پائی جانے والی آزادی اور

حریت کیا چیز ہے۔ مولانا محمد سجاد کے نزدیک اسلامی آزادی سے مقصود علی الاطلاق آزادی نہیں؛ بلکہ قوانین الٰہی کی پابندی کے دائرہ میں محصور رہتے ہوئے انسانی غلامی سے آزادی ہے:

''اسلامی حریت' حریت مطلقہ نہیں؛ بلکہ مقیدہ ہے، اور حریت مفرطہ نہیں؛ بلکہ حریت عادلہ معتدلہ ہے اور مسلمان انسانوں کی غلامی سے بالکلیہ آزاد ہونے کے باوجود سر سے پاؤں تک اس دنیا میں قوانین الٰہی کی زنجیروں میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ ان زنجیروں کو توڑ کر وہ آزاد نہیں ہوسکتا؛ بلکہ انہیں زنجیروں میں جکڑ بند رہنے کے ساتھ تمام خود ساختہ پرداختہ انسانی غلامی سے آزاد ہے اور بالکل آزاد ہے''۔(۱۲)

وہ بتاتے ہیں کہ موجودہ جمہوریت کیونکر انسانی سماج کے لئے مضر ہے اور اس میں قومی وسائل کا ضیاع ہے۔

''انسانی نفسیات وجذبات کا اقتضا یہ ہے کہ انسانوں کے وضع کئے ہوئے قانون پر خود انسانوں ہی کے اکثر وبیشتر افراد کا اعتماد نہ ہوگا اور جب قوانین پر اعتماد نہیں، تو ان قوانین کا انسانوں کے ہاتھوں پامال ہونا بھی ایک ضروری امر ہے، یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ جہاں بھی جمہوریت کے نام سے حکومتیں قائم ہوتی ہیں، وہاں جمہوری قوانین پامال ہورہے ہیں، انسانی زندگی ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہتی ہے۔ اصل مقاصد کیا پورے ہوتے ایک عظیم مصیبت باشندگان ملک پر نازل ہوجاتی ہے؛ کیونکہ مفروضہ جمہوریت میں جو پارٹی برسر اقتدار اور حکمراں ہوتی ہے، اس کے نقائص کی بناء پر اس پارٹی کے اقتدار کو ختم کرنے اور اس کے بنائے ہوئے قانون کو منسوخ کرنے کے احساس سے باشندگان ملک میں ایک طبقہ پیدا ہوجاتا ہے، جو ہر وقت اسی دھن میں لگا رہتا ہے۔

ان مصائب کے علاوہ ایک عظیم مصیبت یہ ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کو ختم کرنے کی صورت تو یہی ہے کہ پارلیمنٹ اور اسمبلی توڑ دی جائے اور پھر سے واضعین قانون کا انتخاب ہو اور ہر انتخاب میں انسانوں کی محنت ومشقت سے حاصل کئے ہوئے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہادئے جائیں، اس کے سوا ظالم واضعین قانون اور ان کے اقتدار کے ختم کرنے کا کوئی آئینی ذریعہ نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح بار بار مال ضائع کرنا انسانی مقصد 'حفظ مال' کے نقصان کا اعتراف کرنا ہے۔

تم سوچو کہ ہر تین یا پانچ سال کے بعد اگر کوئی ایک پارٹی برسر اقتدار آتی رہے اور وہ

سابق قوانین کو منسوخ کر کے اپنے منشا کے مطابق قوانین بناتی رہے تو باشندگان ملک کسی حال میں بھی چین سے بیٹھ سکتے ہیں؟ اور عزت و آبرو کے ساتھ کاروبار چلانے، زندگی بسر کرنے کے لیے کسی ایک نہج وطریق کو اختیار کر کے اطمینان کی سانس لے سکتے ہیں"۔(۱۳)

سیاست کا جو نظریہ مولانا محمد سجادؒ نے پیش کیا تھا، حالات نے انھیں ان نظریات کو عملی جامہ پہنانے کا موقع بھی فراہم کر دیا اور اس وقت مولانا سجاد نے ملک کی عملی سیاست میں بھرپور طریقہ پر؛ لیکن اسلامی اصولوں کے مطابق حصہ لیا، مولانا نے پہلے تو دیگر جماعتوں کے اشتراک کے ساتھ کام کرنا چاہا؛ لیکن جب اس میں اسلامی اصولوں اور امارت شرعیہ کے شرعی مفادات کی بارآوری خطرہ میں محسوس ہونے لگی، تب امارت شرعیہ بورڈ، بنا کر باضابطہ 'مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی' قائم فرمائی۔ 1936 میں انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں اس کے تاسیسی اجلاس کے اندر مولانا محمد سجادؒ کو ان کے انکار کے باوجود متفقہ طور پر پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔

اس پارٹی کے دو مقاصد طے کئے گئے:

1۔ ملک کی مکمل آزادی

2۔ دینی امور میں امیر شریعت کی ہدایات کو قبول کرتے ہوئے ان پر عمل کرنا

اور جب بہار میں الیکشن کا وقت آیا اور مسلمانوں کی دیگر دو پارٹیاں بھی میدان میں آگئیں تو مولانا محمد سجاد نے اولا کوشش کی کہ انھیں اپنی پارٹی میں ضم کر لیں؛ لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ملی تو تنہا انتخاب کا سامنا کیا، اور بھرپور محنت اور حکمت عملی کے ذریعہ مسلم انڈ پنڈنٹ پارٹی کے کل 40 مسلم امیدواروں میں سے 20 نے نشستیں جیت لیں، جن میں متعدد علماء دین اور وہ مسلم دانشور شامل تھے جن سے مولانا محمد سجادؒ نے امارت شرعیہ کی اطاعت کے عہد نامے پر دستخط لیے تھے، یہ پارٹی بہار میں کانگریس کے بعد دوسری بڑی پارٹی بن کر ابھری، پھر جب کانگریس نے حکومت بنانے سے انکار کر دیا تو مولانا محمد سجادؒ نے گورنر کی دعوت قبول کرتے ہوئے اپریل 1937 میں بہار میں وزارت سازی انجام دی۔ اپنی پارٹی کے مسٹر محمد یونس کو وزیر اعظم بنایا اور اپنی کابینہ میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی جگہ دی۔ چنانچہ بابو گرسہائے لال ایڈوکیٹ اور کمارا جیت پرشاد سنگھ کو اہم محکمے سپرد کئے۔ مولانا محمد سجادؒ نے خود کوئی عہدہ اپنے لیے نہیں قبول کیا اور نہ ہی حکومت کی جانب سے کسی قسم کی ذاتی مراعات اور سہولت حاصل کی۔

گو کہ کانگریس کی مخالفت کی وجہ سے مسٹر محمد یونس کی حکومت 120 دنوں کی قلیل مدت تک

کے لیے ہی رہی اور پھر کانگریس نے اپنی حکومت بنالی؛ لیکن اس مختصر مدت میں ہی مولانا محمد سجادؒ کی حکومت نے کسانوں کی فلاح کے اہم اقدامات کے علاوہ اردو کو سرکاری زبان کے طور پر منظور کرلیا۔

مولانا محمد سجادؒ نے سیاسی امور کی بابت صرف ملکی سطح تک خود کو محدود نہیں رکھا؛ بلکہ عالمی سطح پر مسلمانوں کے احوال سے بھی سیاسی دلچسپی لی، چنانچہ پچھلی سطور میں مذکور ہوا کہ ترکی میں اسلامی خلافت کے خاتمہ کے موقع پر ملک کے اندر خلافت کمیٹی کے قیام اور اس کے تحت خلافت کے بقا کی جدو جہد میں آپ بڑھ چڑھ کر شریک رہے۔ اس موقع پر آپ نے علمی طور پر کاوشیں انجام دیں اور خلافت کے الغا کے لیے جو اسباب بیان کئے جا رہے تھے، ان کے مدلل جوابات دئے۔

خلافت پر یہ اعتراض کہ یہ حقیقی نہیں؛ بلکہ ایک خیالی اور وہمی چیز ہے، مولانا کہتے ہیں:

> ''اس کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہیں کہ اسلام نے اتحاد اسلامی اور مرکزیت کی جو تعلیم دی ہے اور خلافت کی نعمت کی جو بشارت دی ہے، یہ سب چیزیں وہمی ہیں اور خلافت اسلامیہ کے قیام کا اصول ایک ناقابل عمل اصول ہے، اس عذر سے بدتر عذر کیا ہوسکتا ہے''۔(١٤)

آپ نے اپنے خطبہ صدارت اجلاس جمعیت علماء ہند مرادآباد میں مسئلہ خلافت کو ام المسائل قرار دیا، اور موجودہ دور کے تین اہم فکری امراض کا تذکرہ کرکے، جو آپ کی نظر میں الغائے خلافت کے اصلی اسباب تھے، ان کی غلطی واضح کی، مولانا کی نظر میں پہلی بیماری آزادی کا غلط تصور ہے، یورپ نے اسلامی آزادی کا غلط معنی پہنا کر یہ باور کرایا کہ کسی بھی شخص کی اتباع' خواہ وہ نبی اور پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، مخلوق کی غلامی ہے اور آزادی کے خلاف ہے۔ مولانا نے واضح کیا کہ یہ نفس اور شیطان کی غلامی ہے، اسلام میں انسان کی غلامی سے بالکلیہ آزاد ہونے کے باوجود قوانین الٰہی کی پابندی ہر فرد کے لیے ہے، خواہ وہ خلیفہ وقت ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرا مرض جمہوریت فاسدہ ہے، موجودہ جمہوریت، اسلامی جمہوریت کے مقابلہ میں ناقص ہے؛ کیوں کہ اس میں انسانوں کے قوانین انسانوں پر جاری ہوتے ہیں، اگر حکمراں جماعت کوئی ظالمانہ قانون بنالے تو اس پر عمل کرنے والے کا ہاتھ کوئی پکڑ نہیں سکتا، جبکہ اسلامی جمہوریت میں حکم الٰہی کی خلاف ورزی پر بڑے سے بڑے شخص پر پابندی لگائی جاسکتی ہے، اسی طرح اسلامی جمہوریت میں شوری کے اصحاب متعین اور محدود نہیں ہوتے؛ بلکہ ملک کا ہر اہل الرائے والعلم صاحب شوری ہوسکتا ہے، چاہے دنیاوی حیثیت سے اس کی کوئی وجاہت نہ ہو، جبکہ مروجہ جمہوریت میں شوری

چندافراد میں محدود ہوتا ہے اوران منتخب افراد کے علاوہ ان سے زیادہ اہل عقل وفہم بھی مشورہ نہیں دے سکتے ہیں۔تیسرا مرض وہ قومیت ہے، جس کی تعمیر وطنیت کی زمین کی بنیاد پر ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں مختلف ممالک کے مسلمان ایک دوسرے سے بے نیاز ہوکراس وطن پرستی میں مشغول ہوجائیں گے، جو یقیناً اتحاد عالم اوراسلامی مرکزیت کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنادے گا۔اسلامی قومیت کی تعمیر صرف کلمہ 'لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ' اوراصول اسلام کی تسلیم اورانقیاد پر ہے اور یہی اسلامی قومیت حدودجغرافیہ سے بالاتر ہے۔(۱۵)

آپ نے عالمی حالات پرنظر رکھتے ہوئے الجزائر میں جاری جدو جہد آزادی کے رہنما غازی امیر عبدالکریم کے تعاون کے لیے مسلم ممالک سے اپیل کی اوراس کی عدم فراہمی پر حسرت و افسوس کا اظہار کیا۔مولانا کی رائے تھی کہ ساری مسلم دنیا میں اتحاد قائم کیا جائے،اس کے لیے تمام ممالک اسلامیہ میں وفود روانہ کئے جائیں، جو گفتگو کر کے نظام اسلام پر عمل درآمد کے لیے ان سے عہد و پیمان لیں، پھر عالم اسلام کی ایک بڑی موتمر منعقد کر کے خلافت اسلامیہ کی بنیاد ایک مستحکم نظام پر قائم کیا جائے اور یوں دنیائے اسلام کوایک سلک سے منسلک کر دیا جائے۔

مولانا محمد سجادؒ نے اپنے ان تمام کاموں میں دو اوصاف کے ساتھ بڑی مضبوط وابستگی رکھی۔اول یہ کہ آپ نے اسلامی اصولوں اوراحکام شریعت کے باب میں کسی مداہنت کوقبول نہیں کیا۔حالات کواپنے مطابق اوراحکام شرع کے دائرہ میں رکھنے کے لیے جہاں حکمت ودانائی سے کام لیا، وہیں اپنی جرات و بیباکی کے لیے بھی آپ معروف رہے، اورآپ کی سوانح زندگی میں اس جرات ایمانی اور غیرت شرعی کی متعدد حیرتناک مثالیں موجود ہیں۔

ملک کے اندر غیر مسلموں کے ساتھ اتحاداور صلح کے معاملہ میں آپ کافی پیش پیش رہے، لیکن شرعی محاذ پرآپ کی صلابت بے مثال تھی۔اس بابت آپ اصول بتاتے ہیں:

''آپ صلح وآشتی ہرقوم سے کیجئے،آپ کا وجود ہی اس لیے ہے کہ دنیا کوامن کا پیغام دیجئے؛مگراس کے ساتھ خیال رہے کہ مدارات قولی وفعلی میں ایک ادنی شائبہ بھی اس کا پیدا نہ ہوکہ مذہب اسلام کی سطح کے برابر کسی دوسرے مذہب کوکسی جہت سے جگہ دی جارہی ہے ''۔(۱۶)

اوراس راہ میں ہونے والی بے راہ روی اورغلط طرزعمل پرآپ نے گرفت کرتے ہوئے فرمایا:

''جب ہندوؤں سے صلح وآشتی کے لیے بڑھے تو پھراس جوش صلح میں حدود سے

تجاوز کر گئے، یہ چیزیں رفتہ رفتہ عوام الناس سادہ لوح مسلمانوں کو کفر تک پہنچا دیں گی‘‘۔(۱۷)

دوسرے یہ کہ آپ نے اپنی ذات کو سراپا استغنا بنا کر رکھا، سیاست کے میدان میں بالخصوص جبکہ کامیابیاں قدم چوم رہی ہوں، عیش فراواں اور نعمت و راحت تو ارزاں ہی نہیں ضرورت میں داخل ہونے لگتی ہیں؛ لیکن مولانا محمد سجادؒ نے اپنی ذات کے لیے منفعت بخش کوئی عہدہ قبول نہیں کیا، نہ کوئی سہولت حاصل کی؛ بلکہ آپ کی زندگی کے اوراق پر اپنے مقاصد اور جدو جہد کی راہ میں قربانیاں ہی قربانیاں لکھی ملتی ہیں۔ آپ نے اپنی زمین جائیداد کا نقصان کر لیا اور اپنی راحت وصحت ہی نہیں؛ بلکہ جواں سال فرزند کی جدائی برداشت کر لی؛ لیکن امت کے مصالح اور مفاد کے کاموں میں دم آخریں تک مصروف رہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کی سیاسی فکر موجودہ حالات کے تناظر میں کس طرح مسلمانوں کے اتحاد، ان کی بالادستی اور ان کے امپاورمنٹ کے لیے کیا کچھ معنویت رکھتی ہے، مولانا سجاد کی فکر سیاسی کے عناصر کو اگر نکات کی شکل میں یکجا کیا جائے تو وہ کچھ اس طرح ہو سکتے ہیں:

☆ سیاست دنیا دین کا حصہ ہے اور اس میدان میں علمائے ربانیین کی موجودگی ضروری ہے؛ تاکہ مسلمانوں کے ساتھ پوری انسانیت کو صحیح رہنمائی حاصل ہوتی رہے، مسلم قوم کی موجودہ زبوں حالی کی ایک وجہ اس میدان سے علماء کی کنارہ کشی ہے۔

☆ اسلام کے سیاسی نظام کے خدوخال پر مسلم علماء و مفکرین کا کام بے حد کم ہے، ماضی میں جس طرح شریعت کے دیگر ابواب پر تفصیلی کام ہوئے، فکر سیاسی اور نظام سیاسی کی تشکیل وارتقا پر کام نہیں ہوئے، یہ موضوع وقت کی شدید ضرورت ہے۔

☆ شرعی اصولوں کے اندر کسی مداہنت کے بغیر اور پوری جرات کے ساتھ سیاست کے میدان میں عملی شرکت کی جائے، قیادت اپنے ہاتھ میں رکھی جائے اور دیگر اقوام کے ساتھ اشتراک اپنے اصولوں کے مطابق کیا جائے، اپنے افراد کو شرعی احکام کا پابند رکھا جائے۔

☆ مسلمانوں کی زندگی اجتماعیت کے بغیر نہیں ہو سکتی، غیر مسلم معاشرہ کے اندر بھی ایک امیر کی ماتحتی میں ان کی زندگی گذرنی چاہئے۔ امارت شرعی کا پورا نظام مسلمانوں کا اپنا ہونا چاہئے، اور اس کے ذریعہ تعلیم، معاشرت، معیشت، سیاست، قضا اور خود حفاظتی کے کام انجام پانے چاہیے، اگر مطلوبہ کام مکمل طور پر پورا کرنا ممکن نہ ہو تو جس قدر ممکن ہو اُسے انجام دینا چاہیے۔

☆ اسلامی سیاست کے سربراہان استغنا کی صفت سے آراستہ ہوں، سیاست انتظام امور اور خدمت کے لئے ہے، نہ کہ ذاتی منفعت کا ذریعہ بنانے کے لئے۔

☆ مسلمانوں کا اتحاد عالمی سطح پر بھی ضروری ہے، اس کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں۔

یہ چند وہ نکات ہیں جو مولانا محمد سجادؒ کی سیاسی فکر اور عملی روش سے سامنے آتے ہیں۔ ان کو سامنے رکھا جائے، اور ملک کے اندر مسلمانوں کی دن بدن بڑھتی سیاسی بے وزنی، اور اس کے نتیجہ میں ان کے مذہب وشریعت، ادارہ واملاک اور ان کی جان وآبرو تک پر بڑھتے حملے کی سنگینی محسوس کی جائے۔ آج کس طور پر ان کے مسلسل مطالبوں کو ٹھکرایا اور ان کے وجود کو بے حیثیت بنایا جارہا ہے اور سیاسی قوت کے فقدان کی وجہ سے ان کی صدا نقار خانے میں طوطی کی آواز بھی نہیں بن پارہی ہے، ان سب پر مسلمانوں کا باہمی انتشار اور کسی متحدہ آواز کا فقدان، ان کی مزید بے حیثیتی کا سبب بن رہا ہے۔

یہاں اس تلخ تجربہ کی یاددہانی شاید کوئی بہتر احساس جگا سکے کہ جس سیاسی قوت کے حصول کی فکر اور عملی اقدام کی دعوت مولانا محمد سجادؒ نے دی تھی، گو کہ ان کی خلوص بھری زبردست محنتوں اور بے مثال قربانیوں کی وجہ سے صوبائی سطح پر ہی سہی، وہ عمل کی شکل لے پائی تھی اور وہ اپنی سیاسی پارٹی کا وزن بھی محسوس کرا سکے تھے؛ لیکن وہ دعوت اُس وقت بھی لیت ولعل کا شکار رہی تھی، اور اس کی قبولیت میں بڑی سست روی برتی جارہی تھی، آج وہ بے یقینی اور بے سمتی مزید بڑھی ہوئی ہے اور ان کے نتائج زبوں جگ ظاہر ہیں، کیا یہ صورت حال ایسی ہی برقرار رہے گی؟ بہتر ہوگا کہ فکر سجاد کی روشنی میں موجودہ صورت حال پر سنجیدہ غور وخوض کیا جائے، اور مستقبل کا لائحہ عمل طے کیا جائے۔

مصادر ومراجع

(۱) مولانا محمد سجاد، حیات وخدمات، صفحہ ۲۲۱

(۲) مولانا محمد سجاد، حیات وخدمات، صفحہ ۲۲۲

(۳) مولانا محمد سجاد، حیات وخدمات، صفحہ ۴۰۵

(۴) خطبہ صدارت، مولانا محمد سجاد، امارت شرعیہ پٹنہ، ۱۹۹۹، صفحہ ۱۳۵

(۵) خطبہ صدارت، مولانا محمد سجاد، امارت شرعیہ پٹنہ، ۱۹۹۹، صفحہ ۴۷

(۶) خطبہ صدارت، مولانا محمد سجاد، امارت شرعیہ پٹنہ، ۱۹۹۹، صفحہ ۴۷

(۷) خطبہ صدارت، مولانا محمد سجاد، امارت شرعیہ پٹنہ، ۱۹۹۹، صفحہ ۷۰

(۸) خطبہ صدارت، مولانا محمد سجاد، امارت شرعیہ پٹنہ، ۱۹۹۹، صفحہ ۴۳۔۴۴

(۹) خطبہ صدارت، مولانا محمد سجاد، امارت شرعیہ پٹنہ، ۱۹۹۹، صفحہ ۴۰

(۱۰) مولانا محمد سجاد، حیات وخدمات، صفحہ ۲۷۹

(۱۱) مولانا محمد سجاد، حیات وخدمات، صفحہ ۲۷۵

(۱۲) خطبہ صدارت، مولانا محمد سجاد، امارت شرعیہ پٹنہ، ۱۹۹۹، صفحہ ۳۳

(۱۳) مولانا محمد سجاد، حیات وخدمات، صفحہ: ۲۲۵

(۱۴) مولانا محمد سجاد، حیات وخدمات، صفحہ ۲۶۹

(۱۵) خطبہ صدارت، مولانا محمد سجاد، امارت شرعیہ پٹنہ، ۱۹۹۹، صفحہ ۳۱۔۳۶

(۱۶) مولانا محمد سجاد، حیات وخدمات، صفحہ ۲۸۴

(۱۷) مولانا محمد سجاد، حیات وخدمات، صفحہ ۲۸۳

فکر سجاد کے چند اہم گوشے

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

بے قرار دل، دور رس نگاہ، خداداد بصیرت و آگہی، انتھک جذبۂ عمل، دن کی جلوتیں خدمتِ خلق کے جذبۂ صادق اور ملت کی فکر بے نہایت سے اور شب کی خلوتیں نالۂ نیم شبی اور آہ سحر گاہی سے معمور، اگر ان اوصاف کو بشری پیکر عطا کر دیا جائے تو اس کا نام ہوگا ''ابوالمحاسن محمد سجادؒ'' --- علوم اسلامی کا سفر جب عرب سے عجم کی طرف ہوا، تو عجمی مزاج کے مطابق خطابات والقاب کی کثرت ہونے لگی، یہاں تک کہ کوئی بڑا عالم یا کوئی بڑا مصنف ایسا نہیں ہوتا، جس کے نام کے ساتھ کسی لقب کی شمولیت نہ ہو، اس میں بعض اوقات مبالغہ بھی پیدا ہو جاتا، برصغیر میں بھی زمانۂ قدیم سے ایسی مثالیں موجود ہیں؛ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض دفعہ القاب مبنی بر حقیقت بھی ہوتے ہیں، حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحبؒ کے ساتھ ''مفکر اسلام'' کا لقب اسی کا مصداق ہے۔

حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کے افکار اور ان افکار پر مبنی لائحۂ عمل میں چند امور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے:

راستہ اور منزل کا فرق:

پہلی بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ راستہ اور منزل کے فرق کو سامنے رکھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ قومی تحریکوں اور تنظیموں میں شرکت ایک ضرورت ہے، ہندو مسلم اتحاد ایک انسانی فریضہ بھی ہے اور ہندوستان کے کثیر مذہبی معاشرے میں پُرامن زندگی گزارنے کا واحد راستہ بھی؛ اس لیے وہ پوری قوت کے ساتھ کانگریس میں شامل رہے اور کانگریس نے جو تحریکیں اُٹھائیں، ان میں جی جان سے شرکت فرمائی؛ لیکن وہ ایک لمحہ کے لیے بھی مسلمانوں کے ملی مفادات اور مذہبی تشخصات کی قربانی کے لیے تیار نہیں ہوئے، جب بھی کانگریس کی طرف سے کوئی ایسی تجویز آتی، جو مسلم مفادات کے خلاف ہوتی تو کسی رُو رعایت کے بغیر اس کے خلاف آواز اُٹھاتے؛ چنانچہ ہندوستان کے محدود اختیارات آزادی کے سلسلے میں نہرو رپورٹ آئی، پھر ۱۹۳۰ء میں سائمن

کمیشن رپورٹ آئی، اس میں مسلمانوں کے مفادات کی کماحقہ رعایت نہیں کی گئی، مسلم پرسنل لا اور اردو زبان کے لئے ضمانت نہیں دی گئی، قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کا تناسب بھی کم رکھا گیا، صوبہ ممبئی میں سندھ شامل تھا؛ اس لیے مسلمان اقلیت میں ہو جاتے تھے؛ مگر سندھ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی؛ اس لیے مسلمان چاہتے تھے کہ سندھ کو الگ صوبہ بنایا جائے؛ مگر ان رپورٹوں میں علاحدہ سے صوبہ سندھ کو تسلیم نہیں کیا گیا، مولانا نے فوراً ان رپورٹوں کی مخالفت کی اور جمعیت علماء صوبہ بہار اور امارت شرعیہ کے تحت نیشنلسٹ مسلم کانفرنس بہار منعقد کی اور ان تجاویز کو رد کر دیا۔

اسی پسِ منظر میں مولانا کی کوشش اور شدید خواہش تھی کہ ملک کے آزاد ہونے سے پہلے ہی مسلمانوں کے عائلی مقدمات کے لیے دارالقضاء کے نظام کو عدالتی اختیارات حاصل ہو جائیں؛ کیوں کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد اس حق کا حاصل کرنا زیادہ دشوار ہوگا؛ مگر افسوس کہ اس میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی؛ اسی لیے مولانا کانگریسی تو تھے؛ لیکن کانگریس سے ایک گونہ فاصلہ بھی برقرار رکھتے تھے اور جہاں اس کا کوئی قدم مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہوتا تھا تو برملا اس سے اختلاف کا اظہار بھی کرتے تھے۔

شریعت، ہر عمل کی اساس:

مولانا کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ وہ جو بھی کرتے، اس کے لیے شریعت کی بنیاد تلاش کرتے، اس کی واضح مثال امارت شرعی کا نظام ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ جب رانچی میں نظر بند کئے گئے تو مولانا سجاد صاحبؒ نے وہاں جا کر ان سے ملاقات کی، مولانا آزاد مسلمانوں کی ایک الگ تنظیم کی تاسیس کا تصور رکھتے تھے اور اُن کے ذہن میں اس کا نام ''حزب اللہ'' تھا، مولانا سجاد صاحب نے مولانا آزاد کے اس نقطۂ نظر کے مقابلہ امارت شرعی کے نظام کا تصور پیش کیا، اور فرمایا کہ اگر یہ تنظیم قائم کی جائے تو یہ محض ایک سیاسی تحریک نہیں ہوگی؛ بلکہ شریعت کی اساس پر مبنی ہوگی، اس طرح ایک اہم شرعی فریضہ ادا ہو سکے گا اور مسلمانوں میں اس کو مقبول بنانا بھی آسان ہوگا۔

۱۹۱۶ء میں کانگریس نے عدم تشدد پر مبنی احتجاج کے لئے انگریزی سامانوں کے بائیکاٹ کی تحریک چلائی، خلافت کمیٹی نے بھی اس کی تائید کی، مولانا نے اس کو ایک شرعی رنگ دیا، غیر مسلموں کے ساتھ دوستی نہ رکھنے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس احتجاج کو ''ترک موالات'' کا عنوان دیا گیا، اور مولانا نے اس پر ایک تفصیلی فتویٰ مرتب فرمایا، جس پر پانچ

سوعلماء نے توثیقی دستخط کئے، اور مسلمانوں کے درمیان اس تحریک کا نام ہی بائیکاٹ کے بجائے ترک موالات پڑ گیا۔

مداہنت سے بچتے ہوئے رواداری:

ملے جلے سماج میں امن وامان اور بھائی چارے کو برقرار رکھنے کے لئے مروت ورواداری کی بڑی اہمیت ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض دفعہ رواداری کی سرحدیں مداہنت سے جاملتی ہیں، اور دوسروں کی شناخت کو قبول کرنے کے پیچھے خود اپنی شناخت گم ہو جاتی ہے، مولانا سجاد صاحب ہمیشہ رواداری اور مداہنت کے درمیان فاصلہ برقرار رکھتے تھے، اس طرح کی بہت سی مثالیں مولانا کی زندگی میں موجود ہیں، اس کی ایک مثال ذبح گاؤ کا مسئلہ ہے، بہت سے ہندو لیڈروں کا مطالبہ تھا کہ مسلمان ذبح گاؤ سے باز آجائیں، کانگریس تو یہ چاہتی ہی تھی، گاندھی جی بھی خواہاں تھے کہ مسلمان علماء قانونی طور پر ذبح گاؤ کی پابندی کو قبول کرلیں، مولانا ابوالکلام آزاد بھی اس کے حق میں تھے، جب بقرعید کے موقع سے یہ آواز زور وشور سے اُٹھی اور مولانا سجاد صاحب کے سامنے یہ بات رکھی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ بہت سے غریب مسلمان بکرے کی قربانی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، اگر گائے کی قربانی پر پابندی لگادی گئی تو وہ قربانی کرنے سے محروم رہ جائیں گے، دوسرے: مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کی جائے، جب وہ اپنے سامنے ان مورتیوں کو دیکھتے ہیں، جن کی عبادت کی جاتی ہے تو انہیں سخت رنج ہوتا ہے؛ لیکن دوسرے اہل مذاہب کے احترام کی خاطر وہ اسے برداشت کرتا ہے، اسی طرح دوسری قوموں کو بھی صبر وبرداشت سے کام لینا چاہیے، آپ نے اپنے ایک مضمون میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کا فیصلہ کن اصولوں پر ہونا چاہئے؟ اس میں انہوں نے ذبح گاؤ اور برادران وطن کے مذہبی جلوسوں کے بارے میں ایک اصولی بات کی ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''یا مثلاً گائے ذبح کرنا مسلمانوں کا اور ہر اس شخص کا جو گائے کا گوشت کھاتا ہے، ایک حق ہے، جس کی انہیں پوری آزادی ہونی چاہئے؛ لیکن پردہ کے ساتھ اور اپنے گھروں میں؛ کیوں کہ اس طرح پر عمل کرنے سے نہ کسی کی دل آزاری ہوسکتی ہے اور نہ کسی کے مشتعل ہونے کی کوئی وجہ ہے، ہاں، اگر کوئی شخص مندر کے سامنے یا پبلک مقامات پر علانیہ گائے ذبح کرنا چاہے گا تو آزادی کے حدود کو توڑے گا؛ کیوں کہ اس میں دوسروں کی دل

آزاری اور اشتعال کا خطرہ ہے، اسی طرح ہندوؤں کو اپنے مذہبی پیشواؤں اور بتوں کے جلوس نکالنے کی اجازت اسی وقت مل سکتی ہے، جب یہ جلوس کسی پبلک جگہ پر کوئی ایسی حرکت نہ کرے، جس سے عام پبلک یا مسلمانوں کو اشتعال پیدا ہو اور یہ جلوس ایسی چیزوں پر مشتمل نہ ہو جو منافی اخلاق ہوں''۔ (مقالات سجاد: ۵۳)

اس وقت بعض علماء کا بھی رجحان بن رہا تھا کہ ذبح گاؤ پر پابندی قبول کر لی جائے؛ کیوں کہ یہ صرف مباح ہی تو ہے، واجب نہیں ہے، مسلم لیگ جو اپنے آپ کو مسلمانوں کا نمائندہ کہتی تھی، نے بھی ذبح گاؤ سے بچنے کی تجویز پاس کر دی تھی، مولانا نے ۱۹۳۹ء میں جمعیت علماء بہار کے اجلاس کے موقع سے ایک فتویٰ مرتب فرمایا، اس میں آپ نے قشقہ لگانے، ہندوؤں کے جذبۂ گاؤ پرستی کی رعایت کرتے ہوئے ذبح گاؤ سے پرہیز کرنے وغیرہ کو ناجائز اور ان چیزوں کو بہتر اور جائز سمجھنے کو کفر پر راضی ہونے کی بناء پر باعث کفر قرار دیا۔

اس طرح کی بہت سے مثالیں مولانا کے مقالات اور فتاویٰ میں موجود ہیں، اسی زمانہ میں شیعہ حضرات کی طرف سے تبراء کے جلوس کا مسئلہ اُٹھا، مولانا اس کے باوجود کہ اتحاد کے بڑے داعی تھے، اور اس کی بڑی تڑپ رکھتے تھے، اس پر سخت ردعمل کا اظہار کیا اور ایک اصولی موقف اختیار کیا، اس کی جو اہمیت اس وقت تھی، وہ آج بھی ہے؛ اگرچہ یہ اقتباس کسی قدر طویل ہے؛ لیکن اس کی اہمیت و معقولیت کی وجہ سے اسے پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

''میری توجہ ان بیانات اور اپیلوں کی طرف مبذول کرائی گئی ہے، جو ملک کے ذمہ دار حضرات کی جناب سے ''تحریک تبرّاء'' اور ''شیعہ وسنی مفاہمت'' کے متعلق اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں، میں نے ان بیانات کو غور سے پڑھا؛ لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں مفاہمت و مصالحت کے بنیادی اصولوں کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے؛ اس لئے اس موضوع کی تشنگی اسی طرح باقی رہ جاتی ہے، ان حالات میں غور وفکر کے لیے چند اصولی باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں، جن کا لحاظ ہر مصالحت و مفاہمت میں ضروری ہے:

۱۔ یہ ملک ایسی مختلف قوموں سے آباد ہے، جس کے مذہبی عقائد اور مسلک کا اختلاف انتہاء کو پہنچا ہوا ہے، ہر ایک فرقہ کے بہت سے اصولی عقائد ایسے ہیں، جن کا اظہار دوسروں کے لیے حد درجہ تکلیف دہ ہے، مثلاً عقیدہ بت پرستی ہے، جس کا تخیل بھی موحدین کے لیے ناقابل برداشت ہے، تعزیہ داری ہے جو اہل سنت کے لیے تکلیف دہ

ہے، گاؤ خوری ہے، جن سے گاؤ پرست تکلیف محسوس کرتے ہیں اور گاؤ پرستی موحدین کے لیے دل آزار ہے اور جب صورت حال یہ ہے تو اس ملک کے رہنماؤں اور ارباب حکومت کو مصالحت یا کسی موقع پر ''مذہبی آزادی'' کے حدود کو اس طرح متعین کرنا چاہیے کہ کسی فرقہ اور گروہ کے ساتھ ناانصافی نہ ہو اور تمام فرقہ کے مذہبی اور شہری حقوق میں یکسانیت نظر آئے۔

۲۔ اب سوچنا یہ ہے کہ مذہبی آزادی کے حدود کیا ہیں؟ جن کی پابندی سے حتی الامکان تمام فرقوں کے ساتھ بڑی حد تک منصفانہ سلوک ممکن ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں اہل اسلام اور تمام عقلاء دہر متفق ہیں کہ ہر فرقہ وگروہ کو اپنے عقیدہ کے اظہار اور اس پر عمل کی آزادی دو شرطوں سے مشروط ہے۔

اول یہ کہ عقیدہ ایسا نہ ہو، جس کا پبلک مقامات میں اعلان، اظہار اور عمل سے انسانی تہذیب وشائستگی کو نقصان پہنچے۔

دوسرے یہ کہ اس عقیدہ وعمل کا اعلان یا طریق اظہار دوسروں کے لیے اشتعال انگیز نہ ہو، ان ہی دو شرطوں کے ساتھ مذہبی وشہری حقوق کی آزادی ہر فریق کو ہونی چاہیے اور جس فرقہ کے عقیدہ وعمل کا اظہار واعلان مذکورہ بالا حدود کو توڑتا ہو، ان کو آزادی نہیں دی جاسکتی، مثلاً ہندوستان میں ایک گروہ ایسا موجود ہے، جو مادرزاد برہنگی کے ساتھ سڑکوں پر چلنا پھرنا، مندروں اور دریا کے گھاٹوں پر جانا اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہے؛ مگر چوں کہ اس عقیدہ پر عمل کرنا انسانی تہذیب کے خلاف اور حد درجہ حیا سوز ہے؛ اس لیے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اسی طرح کسی فرقہ کے پیشواؤں کو علانیہ سب وشتم کرنا یا ان کے خلاف علانیہ دل آزار باتیں کہنا انسانیت کے منافی ہے اور حد درجہ اشتعال انگیز ہے؛ اس لیے اس عقیدہ کے مطابق عمل کی آزادی نہیں دی جاسکتی''۔ (مقالات سجاد:۵۱-۵۲)

امت کی اجتماعیت اور شیرازہ بندی:

مولانا کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت مسلمانوں کے اتحاد واتفاق کی تھی، ان کا دل ہمیشہ اس کے لیے تڑپتا تھا اور زبان وقلم ہمیشہ اتحاد امت کی دعوت میں سرگرم رہتا تھا، آپ نے مختلف مواقع پر دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث علماء وقائدین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور بہار کی مختلف خانقاہوں کو جوڑا، اسی جذبۂ اتحاد کے تحت تحریک خلافت میں شامل ہوئے، ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک یہ ملک کی سب سے سرگرم تحریک رہی اور اس میں ہندو مسلم اتحاد کا جو مظاہرہ ہوا، پھر

ایسا منظر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں، مولانا اس کے مؤسسین میں تھے اور ممبئی میں خلافت کمیٹی کی بنیاد کے بعد سب سے پہلے آپ ہی نے گیا اور پھلواری شریف میں خلافت کمیٹی قائم کی؛ کیوں کہ آپ خلافت عثمانیہ کو اس کی بعض کمزوریوں کے باوجود مسلمانوں کی وحدت کا نمائندہ اور ملت اسلامیہ کا محافظ سمجھتے تھے۔

اسی طرح علماء اسلام کو متحد کرنے کے لئے منعقدہ انجمن علماء بہار قائم کی، پھر جب ۱۹۱۹ء میں جمعیت علماء ہند قائم ہوئی تو آپ اس کے محرکین میں تھے، کیوں کہ یہ آپ کے دل کی آواز تھی اور اس کے بعد دل وجان سے جمعیت علماء کے کاز کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہے۔

امت کی شیرازہ بندی کی اس تڑپ نے آپ کو امارت شرعیہ کے نظام کی طرف متوجہ کیا اور جمعیت علماء ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس ۱۹۲۰ء میں آپ نے امارت شرعیہ ہند کی تجویز پیش کی، جو منظور ہوئی؛ لیکن کل ہند سطح پر اس کا قیام عمل میں نہیں آسکا؛ اس لئے جون ۱۹۲۱ء میں امارت شرعیہ بہار قائم فرمایا، آپ نے امارت شرعیہ کے نظام کا کچھ ایسا خاکہ بنایا، جو پوری طرح اسلامی خلافت کے اسلوب پر تھا، مسلمانوں کے نزاعات کے فیصلہ کے لئے دارالقضاء، شرعی رہنمائی کے لئے دارالافتاء، غریبوں اور بیواؤں کی مدد کے لئے بیت المال، مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی تحفظ کے لئے شعبۂ تحفظ مسلمین، اسلام کی اشاعت اور ارتداد کے مقابلہ کے لئے شعبۂ تبلیغ وغیرہ، آخر مولانا کی یہ کوشش ایک تحریک بن گئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ مجھے دو تحریکوں نے سب سے زیادہ متأثر کیا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی ''تحریک دعوت وتبلیغ'' اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی ''تحریک امارت شرعیہ'' اور اب ان تمام ملکوں میں اس کی افادیت وضرورت محسوس کی جارہی ہے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔

تبلیغ اسلام:

جن امور کی طرف آپ کی بہت زیادہ توجہ تھی اور جس کو آپ ہندوستان میں نہایت ضروری سمجھتے تھے، ان میں ایک ''تبلیغ اسلام'' ہے، ہندوستان میں ۱۹۲۲ء میں تحریک خلافت کو کمزور کرنے اور ہندو مسلم اتحاد کو متأثر کرنے کی غرض سے انگریزوں کی شہہ پر فرقہ پرستوں نے شدھی تحریک شروع کی اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی مہم چلائی، جمعیت علماء ہند نے ۱۹۲۳ء میں اس کے مقابلہ کے لئے شعبۂ تبلیغ اسلام قائم کیا، مولانا اس کے ذمہ داروں میں تھے، اور آپ نے اس کے لئے ایک پورا لائحۂ عمل مرتب کیا۔

چمپارن کا حلقہ علمی، دینی، تہذیبی اور معاشی اعتبار سے زیادہ پسماندہ تھا، وہ خاص طور پر فتنۂ ارتداد کا شکار ہوا، وہاں گدیوں کی ایک بڑی آبادی تھی، جن کے نام تک ہندوانہ تھے، سروں پر ٹیکیں رکھتے تھے، داڑھیاں نہیں رکھتے تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے؛ اگرچہ نسلاً وہ مسلمان تھے؛ مگر اسلام سے ان کا دُور کا تعلق بھی نہ تھا، آریہ سماجیوں نے ان پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے، عنقریب انہیں باضابطہ مرتد کر لینے کا پروگرام تھا کہ مولانا سجاد صاحب کی قیادت میں امارت کے مبلغین نے جا کر اسلام کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا اور اس طرح ایک بہت بڑی آبادی مرتد ہونے سے بچ گئی۔

گورکھپور کے ایک علاقہ کے چار سو گدی مرتد ہو گئے، مولانا سجاد صاحبؒ سخت مشقتیں جھیل کر وہاں پہنچے اور اُن سب کو توبہ کرائی، ہزاری باغ میں پانچ سو مسلمان شدھی تحریک کے زیر اثر مرتد ہو گئے، مولانا نے فوراً وہاں مبلغین کا وفد بھیجا اور وہ دوبارہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے، چھپرہ میں بھاٹوں کی دوسو کی جمعیت مرتد ہوگئی، مولانا نے اپنی کاوش سے ان کو توبہ کرایا۔ مجموعی طور پر اس طرح ارتداد سے تائب ہونے والوں کی تعداد ۲۵ر ہزار سے زیادہ ہے۔

پھر مولانا نہ صرف یہ کہ ان کو اسلام کی طرف واپس لائے اور توبہ کرائی، بلکہ ان کی آبادی میں مسجدیں بھی تعمیر کرائیں، مکاتب بھی کھولے اور ان کے بچوں کو دینی مدارس میں اپنی نگرانی میں تعلیم دلائی، وقتاً فوقتاً ان کی تالیف قلب بھی کرتے رہے، اسلام لانے کی وجہ سے ان پر جو ابتلائیں آئیں اور جو مقدمات وغیرہ ہوئے، اس میں آخر دم تک تن من دھن لگا کر دلچسپی لیتے رہے، اور اپنی دنیا داؤ پر لگا کر ان کی مدد فرماتے رہے۔

چمپارن کے ایک حلقہ میں ڈوموں کی آبادی تھی، یہ بہت جرائم پیشہ لوگ تھے، حکومت برطانیہ نے ان کی اصلاح اور سماجی سدھار کے لئے مسیحی مشن کا تقرر کیا اور ان کا بھرپور تعاون کیا، مولانا فوراً اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے، ایک تبلیغی وفد امارت شرعیہ سے وہاں بھیجا اور خود بھی پہنچے، اس مختصر سی جمعیت کے پاس اخلاص اور دعوتِ دین کی لگن کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں تھا؛ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی پُرخلوص مساعی کو کامیاب بنایا اور جوق در جوق لوگ اسلام میں داخل ہو گئے، یہ لوگ اچھوت شمار کئے جاتے تھے، ہندو اور مسلمان دونوں ان کو حقارت سے دیکھتے تھے، مولانا نے ان کو اپنے ساتھ بٹھایا، ساتھ کھلایا، خاطر و مدارات کی، بلا تکلف ان کے ساتھ رہے؛ حتی کہ ان کے دل میں یہ احساس گھر کر گیا کہ یہی لوگ ہیں جو مجھ سے برابری کا

سلوک روا رکھ سکتے ہیں، مولانا کی اس تدبیر نے بڑا کام کیا، آریہ سماجیوں نے اس کے بعد بہت کوشش کی کہ وہ اسلام سے منحرف ہوجائیں؛ مگران کی ایک نہ چلی۔

اس کے علاوہ بھی مولانا کی ذاتی جدوجہد اور امارت شرعیہ کے شعبۂ تبلیغ کی مساعی-- جو مولانا ہی کی زیرنگرانی کام کرتا تھا-- سے بہت سے لوگ دامن اسلام میں آ گئے، مندرجہ فہرست کے مطابق بھی ان کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔

جیسے جمعیت میں آپ شعبۂ تبلیغ کے قائم کرنے میں شامل رہے، اسی طرح آپ نے بہار میں فتنہ ارتداد کے مقابلہ اور غیر مسلموں میں دعوت کے کام کے لئے امارت شرعیہ کے تحت تبلیغ کا مستقل شعبہ قائم کیا، اور یہ اُن کی زندگی میں امارت شرعیہ کا ایک مثالی شعبہ رہا۔

قانون شریعت کا تحفظ:

مولانا کی زندگی کا ایک اہم مشن قانون شریعت کا تحفظ تھا، وہ اس کو آزادی کی لڑائی سے زیادہ اہمیت دیتے تھے، اور ان کا خیال تھا کہ آزادی تو آج نہ کل حاصل ہو ہی جائے گی؛ اس لیے کہ غلامی ایک غیر فطری چیز ہے؛ لیکن مسلمانوں کے لئے یہ بات بڑی اہم ہے کہ وہ برطانوی دور میں ہی اپنے مذہبی تشخصات کو محفوظ کرلیں؛ ورنہ آزاد ہونے کے بعد یہ کام اور زیادہ دشوار ہوجائے گا، اس سلسلہ میں خاص طور پر شاردا بل اور اوقاف کا مسئلہ قابل ذکر ہے۔

۲۳ر ستمبر ۱۹۲۹ء کو اسمبلی میں شاردا بل پیش ہوا، جس کا مدعا یہ تھا کہ ۱۸ر سال سے کم عمر کے لڑکوں اور ۱۶ر سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی شادی نہیں کی جائے، اور جو شخص اس کا مرتکب ہوگا، یا اس میں واسطہ بنے گا، یا اس کے گارجین اس نکاح پر اپنی رضامندی کا اظہار کریں گے، ان سب پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ عائد کیا جائے گا، اس قانون سے مسلمانوں کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا؛ حالاں کہ اس طرح کی پابندی اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے، اس موقع پر ہندوستان سے برما تک مسلمانوں نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور قانونِ اسلامی کے تحفظ کے لئے جمعیۃ علماء نے ''مجلس تحفظ ناموس شریعت'' قائم کی، مولانا ہی اس کے ناظم اور ذمہ دار قرار پائے؛ چنانچہ اس موقع پر مولانا نے اس کی فقہی، قانونی اور سماجی حیثیت پر متعدد مضامین قلم بند فرمائے اور مسلمان کو مشورہ دیا کہ حکومت ان کے مطالبہ کو تسلیم نہ کرے تو وہ ''سول نافرمانی'' کی تحریک چلائیں، امارت شرعیہ کے زیر سرپرستی بہار واُڑیسہ میں بھی اس کے خلاف زبردست احتجاج ہوا، مولانا نے جابجا اس قانون کی خلاف ورزی کراتے ہوئے کم عمری کی شادیاں کرائیں، مولانا ہی کی ایماء پر

اس سلسلہ میں ''متحدہ کانفرنس'' منعقد ہوئی، جو مسلمانوں کے مختلف گروہوں اور مکاتب فکر کے لوگوں پر مشتمل تھی۔

حکومت برطانیہ نے بہت سے مسلم اوقاف پر ناجائز قبضہ کر رکھا تھا، جن میں بعض کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں ہی غصب کر لیا گیا تھا، مولانا نے اس کے خلاف پُر زور تحریک چلائی ''مجلس تحفظ ناموس شریعت'' کے تحت پورے ملک کے مسلمانوں نے حکومت کے خلاف اس غاصبانہ قبضہ پر احتجاج کیا، آپ نے اس موقع سے تمام ممبران اسمبلی کے نام اپنی اپیل اور ''مغصوبہ اوقاف'' کی تفصیل بھیجی، نیز عام مسلمانوں سے بھی اپیل کی کہ اس قسم کی تمام مساجد کا فوٹو اندر اور باہر سے جلد از جلد لے لیں، جس پر فوٹوگرافر کے علاوہ کم از کم دو گواہوں کے دستخط ہو۔

شریعت اپلیکیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء اور قانون انفساخ نکاح ۱۹۳۹ء کے پیچھے جو قوت کار فرما تھی، وہ جمعیت علماء ہند ہی تھی، اور اس قانون کا خاکہ بنانے اور مجوزہ قانون کا مسودہ تیار کرنے میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کا بڑا حصہ تھا۔

علماء اور سیاست:

مولانا سیاست کو اسلام کا بنیادی حصہ تصور کرتے تھے، آپ کہتے تھے کہ سیاست عین دین ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''حضرات علماء کرام! سیاست دنیا مذمومہ شئی نہیں ہے، جو اس پر لعنت کی جائے، اس سے کنارہ کشی کی جائے، اگر سیاست منافی دین ہوتی اور دنیا مذمومہ ہوتی تو ایسا ارشاد نہ ہوتا (**تسوسهم الأنبياء**) اور پھر علماء امت محمدیہ کو انبیاء بنی اسرائیل سے تشبیہ دے کر ان کے سیاست میں قدم ڈالنے کی ترغیب نہ دی جاتی''۔ (خطبۂ صدارت: ۴۷)

مولانا چاہتے تھے کہ علماء سیاست میں حصہ لیں، اور یہ بھی کہتے تھے کہ علماء کے عملی سیاست سے کنارہ کش ہو جانے کی وجہ سے اسلام کے نظام سیاست پر کما حقہ علمی کام بھی نہیں ہوا، وہ اس سلسلہ میں عالم اسلام کو سامنے رکھ کر ایک وسیع کام کا تصور رکھتے تھے؛ چنانچہ فرماتے ہیں:

> ان حالات کی بنا پر میرے نزدیک مسلمانان ہند کا اولین فرض یہ ہے کہ:
>
> ا۔ سب سے پہلے نظام اسلام کے تمام اصول وقواعد کو نہایت ترتیب وتہذیب کے ساتھ مرتب کیا جائے اور اس کی ترتیب میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے:

(الف) شرعی اصول سے تمام دنیائے اسلام میں اقتدار خلافت کے قیام کے لیے جن جن امور کی ضرورت ہے سب کو نہایت تفصیل کے ساتھ اس میں داخل کیا جائے اور ان امورضروریہ کے اندراج میں کسی خوف وملامت کی پروانہ کی جائے۔

(ب) رخصت کے اصول کی رعایت اُسی حد تک کی جائے جس سے کسی بنیادی اصول کے اندر خلل واقع ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

(ج) نظام اسلام کی ترتیب میں اولیت اور سابقیت کا مرتبہ حالت اختیار کے اصول کو دیا جائے اور بعدہ بدرجہ مجبوری حالت صبر کی صورتوں میں درج کیا جائے۔

(د) تمام اصول ونظام کی ترتیب میں صرف اقوالِ فقہائے کرام اور محدثین ومتکلمین کو سامنے نہ رکھا جائے؛ بلکہ ہر ایک اصول کے مدارک کو معلوم کر کے اور اصول استصلاح کا لحاظ کر کے مرتب کیا جائے۔

۲۔ نظام اسلام جو مذکور الصدر طریقہ پر تیار کیا جائے اس کی ایک شرح مبسوط لکھی جائے جس میں تمام دفعات کے ماٰخذ ومدارک شرعیہ کو واضح کیا جائے اور ہر دفعہ کے اخذ ونتائج کو بیان کرتے ہوئے اس کے ترک، یا اس کی مخالف صورت کو بھی ظاہر کیا جائے۔

۳۔ اصل نظام اسلام اور اس کی شرح کو عربی، اردو، انگریزی میں بکثرت شائع کیا جائے اور تمام دنیائے اسلام کو اس پر غور کر کے عمل کرنے کی دعوت دی جائے۔

آپ نے اجلاس جمعیت علماء ۱۳۴۳ھ منعقدہ مرادآباد میں جو خطبۂ صدارت دیا ہے، وہ آپ کی بالغ نظری اور گہری بصیرت کا آئینہ دار اور ہر صاحب علم کے لئے سرمۂ چشم بنانے کے لائق ہے، اس میں آپ نے مسلم اقلیتوں کے لئے اسلامی نظام کا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے۔

نظام سیاست میں مولانا کا تصور تھا کہ طویل منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ فوری طور پر جو فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جائے، جیسے ۱۹۳۷ء میں بہار میں الیکشن ہوا تو آپ نے کانگریس کے رویہ سے بے اطمینانی کی وجہ سے مسلم انڈی پینڈینٹ پارٹی قائم کی، آپ خود اس کے سرپرست تھے، امارت شرعیہ نے الیکشن میں اسی پارٹی کی تائید کی؛ چنانچہ الیکشن میں کانگریس کے بعد سب سے زیادہ سیٹیں اسی پارٹی کو حاصل ہوئیں؛ لیکن کانگریس نے حکومت بنانے سے انکار کر دیا، مولانا نے محسوس کیا کہ اگر مسلم انڈی پینڈینٹ پارٹی حکومت بنا لیتی ہے تو یہ مسلمانوں کے مفاد میں ہوگا؛ چنانچہ اس پارٹی نے حکومت بنائی اور جناب محمد یونس وزیر اعلیٰ

بنائے گئے، اس حکومت نے مسلمانوں کے حق میں کئی اہم فیصلے کئے، جن میں ایک اُردو زبان سے متعلق تھا، یہاں تک کہ کانگریس کے فرقہ پرست لیڈر محسوس کرنے لگے کہ انہوں نے حکومت نہ بنا کر غلطی کی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں حکومت بہار نے زرعی انکم ٹیکس کا قانون پاس کیا اور مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، مولانا نے اس کی سخت مخالفت کی، مسلم ممبران اسمبلی کے ذریعہ اس کے خلاف اسمبلی میں آواز اٹھوائی، اور عوامی فضاء ہموار کی، بالآخر ۲۹/ اپریل ۱۹۳۸ء کو اسمبلی میں حکومت بہار نے مولانا کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا اور وقف کی جائداد کو ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا، پھر اس کے بعد آپ نے مسلم اوقاف کا ایک بل مرتب فرمایا اور اسے بہار اسمبلی میں پیش کرایا، جو منظور ہوا۔

۱۹۳۹ء میں ایک قانون پاس ہوا، جس میں مہر اور جہیز کو جرم قرار دیا گیا تھا، مولانا نے اس کی سخت مخالفت کی اور امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید محمد منت اللہ رحمانیؒ -- جو مولانا کی تائید سے رکن اسمبلی منتخب ہوئے تھے -- کے ذریعہ بہار اسمبلی میں اپنے موقف کی ترجمانی کرائی، بالآخر مسلمان اس سے مستثنیٰ کر دیئے گئے۔

جب شدھی تحریک شروع ہوئی تو کانگریس کے اعلیٰ قائدین کی رائے تھی کہ مسلمان اس کی مخالفت میں زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کریں اور کانگریس کے مسلم قائدین بھی تذبذب میں تھے؛ تاکہ ہندو مسلم نفرت کی فضاء پیدا نہ ہو جائے، جو انگریز چاہتے تھے؛ لیکن مولانا کی اسلامی حمیت نے اس معاملے میں کسی رواداری کو گوارہ نہ کیا، آپ نے پوری قوت وشدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی اور عملی طور پر ہندو فرقہ پرستوں کی اس مہم کو ناکام بنا دیا۔

یہ مولانا سجاد صاحب کی فکر کے کچھ اہم گوشے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ قومی جدوجہد میں ملی مسائل نظر انداز نہ ہو جائیں، رواداری ایسی نہ ہو کہ اس کی سرحد مداہنت سے جا ملے، جو بھی جدوجہد ہو، وہ شرعی بنیادوں پر مبنی ہو، کلمہ کی اساس پر ملت کے اتحاد کو فروغ دیا جائے، سیاست سے بے تعلقی نہ ہو، اور جو مواقع دستیاب ہوں، ان سے استفادہ کیا جائے، شریعت کا تحفظ اور اسلام کی دعوت کو مسلمان سب پر مقدم رکھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک کے موجودہ حالات میں بھی حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کے افکار ہمارے لئے بہترین رہنما ہیں۔

مفکرِ ملک وملت ابوالمحاسن مولانا سیّد محمد سجادؒ

چند سیاسی جہات

مولانا عبدالحمید نعمانی (دہلی)

تمہید:

مفکرِ ملک وملت ابوالمحاسن مولانا سیّد محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے کئی ایسے پہلو ہیں، جن میں ہمارے لیے آج بھی روشنی اور رہنمائی ہے اوران کی معنویت وضرورت موجودہ حالات اورآج کے بھارت میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ گزشتہ کچھ دہائیوں کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں ہمیں سیاسی اثرات اور کام زیادہ تر حاوی نظر آتے ہیں۔ آزادی سے پہلے ملک کے حالات فرقہ وارانہ صورتِ حال ہندو، مسلم اور برٹش انگریزی سامراج کے مثلث میں رہنمائی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سہ طرف جاتے راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرکے منزل کی نشاندہی کے ساتھ، خود چلنا اور دوسروں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش ہر کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ عام طور پر ہمارے اکابر کو ملاّ مولوی کہہ کر، زندگی کے مختلف شعبوں میں کم تر دِکھانے بلکہ نظر انداز کرنے کرانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

تاریخ تحریک آزادی میں نظرانداز کا عمل:

تاریخِ آزادی پر لکھی جانے والی چھوٹی بڑی کتابوں میں، ابوالمحاسن مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ جیسے منفرد و بے مثل دل و دماغ اور حیرت انگیز شعور وسیرت والے نابغہ روزگار شخصیات کو پوری طرح سے نظرانداز کردیا ہے۔

اپنی کوتاهی:

ویسے ہم لوگوں نے بھی اپنے رہنما بزرگوں کو نا قابلِ توجہ سمجھنے اور بنانے میں کوئی کم کردار ادا نہیں کیا ہے، تاہم ایک عرصہ کے بعد، جس میں بہت سی دستاویزات اور یادداشتیں ضائع اور گم نامی کا شکار ہوجاتی ہیں، یاد کرکے ان کے نقوشِ قدم کو نقوشِ راہ بنانے کی کوشش وقدم کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

بدلتے حالات میں رہنمائی و روشنی:

آج کے بدلتے سماجی، سیاسی حالات میں جب ہم مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی بصیرت، قانونی، آئینی اور تاریخی شعور و فیصلے اور بروقت اقدام و رہنمائی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں رہنمائی و روشنی کے ساتھ بہت سی چیزوں پر از سر نو غور و فکر اور اپنے رویے و عمل کا جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ اگر مولانا سیّد سجاد رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر آج ہوتے تو وہ موجودہ حالات میں کیا لائحۂ عمل، فیصلہ، اقدام و عمل کرتے؟ گزشتہ کئی دہائیوں سے مسلمانوں کی سیاسی پارٹی اور سیاسی موقف اختیار کرنے کے متعلق کئی طرح کی باتیں اور سوالات سامنے آتے رہے ہیں، اس طرح کے سوالات کے جوابات ہمیں ابوالمحاسن مولانا سجادؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ کے گفتار و کردار میں ملتے ہیں۔

بھارت کی مخصوص حالت:

ملک کے حالات ضرور بدلے ہیں، لیکن ہمارے مسائل کوئی زیادہ نہیں بدلے ہیں۔ حضرت مدنیؒ، مولانا سجادؒ اور بعد کے دنوں میں حضرت فدائے ملتؒ مولانا سیّد اسعد مدنیؒ نے جن حالات میں ملک و ملت کی خدمات انجام دی ہیں، وہ حالات اب بھی ہیں، ہاں اقتدار میں تبدیلی ضرور ہوئی، تاہم جہاں تک اکثریت کے سماج کے جن عناصر سے ہمارا مقابلہ اور آمنا سامنا رہا ہے، ان کی ذہنیت میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا ہے۔ آج کی تاریخ میں ہمارے سامنے ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ مفکرِ ملت ابوالمحاسن مولانا سجادؒ کے کاموں اور باتوں سے موجودہ حالات میں ہم کیا کچھ لے سکتے ہیں، کیا کچھ ان کی روشنی میں اجتماعی اجتہاد کر کے کم زیادہ کر سکتے ہیں، حضرت مفکرِ ملتؒ نے ہندو مسلم سے الگ ایک تیسری طاقت کے دورِ اقتدار میں جو کہا اور کیا تھا، وہ اپنے حق میں وزن بنانے اور سیاسی استحکام اور فائدے کے پیشِ نظر حکمت عملی اختیار کر کے اقدامات کرتی تھی اور مختلف فرقوں کے درمیان ایک مخصوص طرح کا ماحول بنائے رکھنا چاہتی تھی۔ آزادی کے بعد محکوم فرقوں میں سے ایک کمیونٹی کے افراد ہر شعبہ میں غلبہ اور اقتدار کی کرسی پر براجمان ہو گئے ہیں۔ اب ملک کے اپنے شہریوں کے مخصوص طبقات ملک کے نظام پر حاوی ہو گئے ہیں۔

اپنا رول:

ایسی حالت میں اپنی آزادی کے تحفظ اور ملک کے وسائل میں منصفانہ حصہ داری طے

کرنے کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں، اس کا جواب پانے کے لیے ہمیں جن اکابر کے حالاتِ زندگی، جدوجہد اور اس کے طریقوں کا جائزہ و مطالبہ کرنا پڑے گا۔ ان میں ایک نمایاں نام مولانا سیّد سجادؒ کا نام نامی بھی ہے۔ گرچہ ان کی خدمات اور سرگرمیوں اور مختلف شعبوں میں جدوجہد کا پورا ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں ہے، تاہم جو کچھ ہمارے سامنے ہے، اس سے بھی ہمیں ضرورت بھر روشنی و رہنمائی ملتی ہی ہے۔

قیادت کی صلاحیت

صحیح اور تعمیری سیاست کے لیے جن خوبیوں، تاریخ کا علم، سماج کے متعلق معلومات، قانون و آئین کے گہرے شعور و آگہی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ساری خوبیاں مفکرِ ملت و ملت مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ میں تھیں۔ فراست و بصیرت، جرأت، ملکی وملّی حالات، وسائل سے وہ ہر وقت باخبر اور ایک بلند نگاہ بھی ان میں تھی۔ سیاسی مسائل کے متعلق بروقت اقدامات کی خوبی بھی حضرت مفکرِ ملت میں نظر آتی ہے، چاہے ملک کے حالات ہوں، ملّی و مذہبی مصالح ہوں، ان کے متعلق انھوں نے جو فیصلے کیے اور ان کے مطابق جو بروقت اقدامات کیے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مفکرِ ملتؒ کا بڑا گہرا شعور تھا۔ بعد کے واقعات و حالات نے بھی تصدیق کی کہ ان کے فیصلے اور اقدامات، حالات کے صحیح تجربے و مطالعے پر مبنی تھے۔ کم از کم چوبیس پچیس برسوں تک قومی سیاسی میدان میں ان کی جو خدمات ہیں، وہ ہماری قومی و سیاسی تاریخ جدوجہد کا اہم باب ہے۔ اس دور کی دیگر اہم مسلم، غیر مسلم شخصیات اور مسائل کا جائزہ لینے سے بھی حضرت ابوالمحاسنؒ کی سیاسی، سماجی ژرف نگاہی و بصیرت و فراست ہمارے سامنے آتی ہے۔

عهد رهنمائی:

۱۶-۱۹۱۵ء کے عہد سے ۱۹۴۰ء تک مختلف اہم درپیش مسائل پر فتویٰ دینے کے ساتھ ساتھ زبانی و عملی اقدامات، حتیٰ کہ مختلف مسائل میں آئینی و قانونی رہنمائی، مسودہ کی تیاری وغیرہ میں ان کے کام کی چھاپ نظر آتی ہے۔

اعتراف:

اس کا اس عہد کے عظیم رجال اور رہنما شخصیات نے بھی کھلا اعتراف کیا ہے۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے لکھا ہے کہ جس طرح حضرت مولاناؒ کو علوم نقلی و عقلی میں کمال حاصل تھا، اسی طرح؛ بلکہ اس سے زیادہ سیاسی و اجتماعی مسائل میں بھی ان کو یدطولیٰ حاصل تھا۔

ہندو مسلم یونٹی کانفرنس لکھنؤ الہ آباد میں انھوں نے جس بصیرتِ سیاسی کا ثبوت دیا ہے اس کا اعتراف شرکاء کانفرنس ہندو مسلم دونوں نے کیا اور بعض سیاسی مبصرین نے مجھ سے کہا کہ یہ شخص جب بات کرنا شروع کرتا ہے تو لکنت اور عجز گفتگو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ خواہ مخواہ ایسے مسائل میں کیوں دخل دیتا ہے؛ لیکن جب بات پوری کرلیتا ہے تو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس شخص کا دماغ معاملات کی گہرائی تک بہت جلد پہنچ جاتا ہے اور تہہ کی بات نکال کرلے آتا ہے۔

مرادآباد میں جب جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا اور مولانا نے بحیثیت صدر خطبہ صدارت سنایا تو زمیندار، انقلاب اور دوسرے اسلامی اخبارات نے خطبہ صدارت پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مولانا سجاد کی صورت اور گفتگو سے اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ایسا شخص بھی اسلامی سیاسیات؛ بلکہ سیاسیاتِ حاضرہ کا اس قدر مبصر اور عمیق النظر ہوسکتا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ مولانا کا یہ خطبہ صدارت سیاسیات اسلامی کی بہترین انسائیکلوپیڈیا ہے۔(۱)

ریکارڈ:

امارتِ شرعیہ بہار، اڑیسہ، جھارکھنڈ کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند کے مطبوعہ، غیر مطبوعہ ریکارڈ میں بھی کئی امور سے متعلق ایسی تفصیلات ملتی ہیں جن سے حضرت ابوالمحاسنؒ کی سیاسی جرأت و بصیرت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

اکابر کا مسلک:

اس کی ایک نمایاں مثال مسلم لیگ میں شامل ہونا اور پھر بروقت اس سے جمعیۃ علماء ہند کے دیگر اکابر حضرت مدنیؒ وغیرہ کے ساتھ الگ ہوجانا بھی ہے، ایسا اس لیے بھی ہوتا رہا ہے کہ ہمارے اکابر کے سامنے سیاست کرنا نہیں؛ بلکہ کچھ اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے سیاست محض ایک وسیلہ وذریعہ ہے نہ کہ خود کو نمایاں کرنے اور ٹھاٹ باٹ سے ذاتی زندگی گزارنا، آزادی سے پہلے ملک کا جو ماحول تھا اور جس طرح کا ملک وسماج پر مسلم لیگ نے دباؤ بنا دیا تھا، اس کا مقابلہ کرتے ہوئے نکل آنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایسا ملّی شعور اور سیاسی بصیرت وجرأت کے بغیر نہیں ہوسکتا ہے۔

علیگ سے علیحدگی:

حضرت شیخ الاسلامؒ نے اس پر 'مسٹر جناح کا پراسرار معمہ اور اس کا حل' میں بصیرت سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں مسلم لیگ کی سیاست سے متاثر افراد نے آدھی ادھوری باتیں

کر کے مسئلے کو غلط رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مفکرِ ملت مولانا محمد سجادؒ اور حضرت مدنیؒ نے مسلم لیگ سے علاحدگی کی وجہ امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ کی وجہ سے ساری قوم مسلم کے عام رجحان کے خلاف مسلم لیگ کو ترک کر دیا اور اپنی علیحدہ پارٹی کی تشکیل کی۔ مولانا سجادؒ اور مولانا مدنیؒ غیر علماء کی قیادت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی قیادت اور سیاسی رہنمائی کا حق صرف اسلامی علماء کو حاصل ہے۔ اس سلسلے میں متحدہ قومیت کا اپنا مزعومہ معنی لے کر حضرات مفکرِ ملت اور شیخ الاسلامؒ پر غلط تنقیدیں کی جاتی ہیں، اب وقت نے اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ حضرت مفکرِ ملتؒ وغیرہ کا موقف و عمل صحیح اور سیاسی و مذہبی بصیرت پر مبنی تھا۔ اگر انتخابات میں کامیابی کے بعد محمد علی جناح طوطا چشمی سے کام نہ لیتے اور حضرت مفکرِ ملتؒ اور حضرت مدنیؒ کے مسئلہ متحدہ قومیت کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی تو ملک کی تاریخ کچھ دوسری ہوتی۔ اگر باہمی تعاون و اشتراک اور احترام سے کام لیا جاتا تو یقیناً ملک و ملت کے حق میں بہتر اثرات و نتائج سامنے آتے۔ غیر علماء کی قیادت حضرت مفکرِ ملتؒ اور حضرت مدنیؒ کے لیے زیادہ مسئلہ نہیں تھا، بلکہ حقائق و شواہد بتاتے ہیں کہ محمد علی جناح ہی علماء کے تعلق سے احترام و تعاون کا سرے سے ذہن ہی نہیں رکھتے تھے اور ان کو سماج میں بے اثر کر کے اپنے حساب سے ملک و ملت کا نقشہ بنانا چاہتے تھے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ ملت اسلامیہ کی دینی و تہذیبی بقاء و شناخت خطرے میں پڑ جاتی۔ محمد علی جناح چاہے اچھے وکیل اور جدید سیاست کے ماہر مانے جاتے ہوں؛ لیکن ملتِ اسلامیہ کی دینی و تہذیبی بقاء و شناخت کے سلسلے میں ان پر پوری طرح اعتماد و انحصار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مسلم لیگ میں شمولیت اور علاحدگی اور متحدہ قومیت کے سلسلے میں حضرت مدنیؒ نے خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، تاہم حضرت مفکرِ ملتؒ نے بھی اس سلسلے میں بہت اعتدال کے ساتھ اپنے موقف کو پیش کیا ہے۔

علماء پر غلط الزام

علماء پر یہ الزام صحیح نہیں ہے کہ وہ سیاسی معاملے میں بھی غیر عالم کی سیادت و قیادت کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ ہم یہ بات سارے علماء کے تعلق سے نہیں کہہ سکتے ہیں، لیکن حضرت مفکرِ ملت مولانا محمد سجادؒ اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے متعلق تو یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سیاسی معاملات میں بھی ملک و ملت کے مفاد اور دینی و تہذیبی بقاء و شناخت کو اوّلیت و ترجیح دے کر کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عالم و غیر عالم کی قیادت و سیادت میں فرق نہیں کیا۔ ایسا تو

مسلم لیگ کے کٹر حامی بھی مانتے اور جانتے رہے ہیں، اس پر مولانا مسعود عالم ندویؒ کی مرتب کردہ کتاب 'محاسنِ سجادؒ' میں شامل جناب راغب احسن ایم اے کا مقالہ اور اس پر مولانا سیّد احمد عروج قادریؒ کے طویل تبصرہ سے بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ راغب صاحب مسلم لیگ کے زبردست حامی تھے، ساتھ ہی حضرت مفکرِ ملت مولانا سیّد محمد سجادؒ کے مختلف جہات کے قدردان بھی تھے، تاہم ان کے مسلم لیگ سے علیحدہ ہونے کے بعد کچھ بدظن بھی ہوگئے تھے، بلکہ شدید مخالف ہوگئے تھے، لیکن انھیں بھی اس سچائی کو تسلیم کرنا پڑا کہ مولانا سجاد صاحبؒ کی قابلیت و صلاحیت، سیاست دانی و سیاست کاری اور مسلمانوں کی تنظیم و تقویت کے لیے حقیقی تڑپ کا برابر معترف رہے۔ (محاسنِ سجاد، ص ۱۰۱)

مخالفین کا اعتراف:

اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ رسومِ زمانہ کے خلاف؛ لیکن سنتِ نبویؐ کی رہبری میں رئیس اعظم گیا کی بہو کو ایک دوسرے کے صوبے کے مسلمان کے ساتھ عقدِ ثانی پر آمادہ کرکے اور تمام مخالفتوں کے باوجود اپنی حمایت عملی سے اس کو انجام دلا کر مولانا نے اپنی بے نظیر سیاست کاری اور اپنی اقدامی صلاحیت کا ثبوت دیا تھا۔ (۲)

اگرچہ سیاسی مقاصد کے تحت حضرت مفکرِ ملتؒ کی سیاسی عبقریت و بصیرت کی طرف سے عوام کی توجہ ہٹانے کی غلط کوششیں کی گئیں تاہم جب ان کے کارناموں اور عملی سیاسیات پر نظر ڈالی گئی تو مخالف سے مخالف کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ حضرت مفکرِ ملتؒ جدید اسلامی ہند کی صفِ اوّل کے رجالِ دین و سیاست میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ وہ ان چند واقعی لائق ترین سیاسئین میں تھے، جن کو تحریک خلافت نے پردۂ گمنامی سے اُبھار کر ہندوستانی سیاست کے صفِ اوّل میں کھڑا کیا تھا، پھر وہ تحریک خلافت کے رہنماؤں میں اپنی اصابتِ رائے، سیاست دانی، معاملہ فہمی، نکتہ رسی، ذہانت، عملی صلاحیت، تنظیمی طاقت، عزم و استقلال کے ساتھ ایک نصب العین کے ساتھ مسلسل یکسوئی سے محنت کرنے کی قابلیت، حالات و ضروریات کے مطابق زمانہ کے ساتھ چلنے اور ساتھ دینے کی اہلیت اور مقاصد کے لیے معیارِ اصول سے فروتر لوگوں اور چیزوں سے مصالحت کر لینے کی قوت کے لیے ممتاز تھے۔

ماہر اسلامی اصول سیاست:

'محاسنِ سجادؒ' اور دیگر تحریروں سے بھی یہ پوری طرح واضح و ثابت ہوجاتا ہے کہ حضرت مفکرِ

ملتؒ اسلامی سیاسیات، اسلامی اصولِ شریعت، اصولِ قانون و دستور، اسلام کے اصولِ سلطنت و عدالت، بین الاقوامی تعلقات، نظامِ اقتصادیات و معاشیات وغیرہ وغیرہ پر زبردست عبور رکھتے تھے۔ حضرت مفکرِ ملتؒ حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر و فہم رکھتے تھے، نہ صرف یہ کہ وہ مفکر اور آئیڈیلسٹ تھے بلکہ اپنے نصب العین کو عملاً حاصل کرنے کے لیے صلاحیت و قابلیت بھی رکھتے تھے۔ مسلم لیگ سے وہ اس کے صدر کی غلط روش و پالیسی، جس کے متعلق وہ ایمانداری اور دیانت داری سے سمجھتے تھے کہ ملک و ملت کے لیے مضر ہے، کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے تھے، ورنہ مسلم لیگ کی تاریخ اور ریکارڈ میں یہ درج ہے کہ حضرت مفکرِ ملتؒ مسلم لیگ سے ہمدردی رکھتے تھے؛ بلکہ اس کے اصول وضوابط کی توضیع میں بھی حصہ دار رہے تھے۔ 'محاسنِ سجادؒ کے مقالہ نگار جناب راغب احسن نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی پارٹی پالیٹکس یعنی مولانا حسین احمد صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند کا غلو اور ضدان کو اس حقیقت کے اعلانیہ اعتراف سے روکتی رہی ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ ساری جمعیۃ علماء کے اندر مولانا سجاد ہی مسلم لیگ سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ (۳) اگرچہ حضرت مدنیؒ کو درمیان میں لا کر اصل بات سے توجہ ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تصلب اور اپنے فکر و عمل میں استحکام کو غلو اور ضد نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس پر بحث ایک الگ موضوع ہے، تاہم یہ تو تسلیم کیا جاتا ہے کہ حضرت مفکرِ ملتؒ جمعیۃ علماء ہند میں مسلم لیگ سے سب سے زیادہ قریب تھے۔

لیگ سے علیحدگی کے بہتر نتائج:

اس کے باوجود مسلم لیگ سے حضرت مدنیؒ کے ساتھ مولانا سیّد محمد سجادؒ جب الگ ہو گئے تو اخلاص و دیانت سے اس کے اسباب و وجوہ کا پتہ لگانے کی ضرورت ہے اور یہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت مفکرِ ملتؒ کا مسلم لیگ سے بروقت علاحدگی کا فیصلہ بالکل صحیح تھا، اگر وہ مسلم لیگ کے ساتھ رہ جاتے تھے تو تقسیم وطن کے بعد اور اس کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوئے اس کے پیشِ نظر آج یہ کہنا اور لکھنا پڑتا کہ حضرت مفکرِ ملتؒ نے مسلم لیگ کی بھیانک غلطی کو نہ سمجھ کر کسی بہتر سیاسی بصیرت کا ثبوت نہیں دیا، مگر جب وہ مسلم لیگ سے الگ ہو گئے تو ہمیں یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہ جاتا ہے کہ مولانا سیّد محمد سجادؒ نے سیاسی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے ہماری حفاظت و عزت کے تحفظ کے لیے بہتر رہنمائی کرانے کا کام کیا ہے اور آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ تقسیم وطن کے جرم میں ہندستان میں رہ جانے والے مسلمان شامل نہیں ہیں۔ اس کے متعلق بذاتِ خود معاملے میں شریک حضرات کی شہادت اہم ہے۔ حضرت مدنیؒ اور ایک دو دیگر معاصر تحریر سے بھی مسلم

لیگ سے علیحدگی کے حضرت مفکرِ ملتؒ کی صحیح اسباب سامنے آجاتے ہیں۔ ہندستان کی سیاسی وملّی تاریخ میں ۱۹۳۶ء کا سال بہت اہم ہے۔حضرت مدنیؒ نے تحریر کیا ہے کہ بذاتِ خود مسٹر جناح، مولانا شوکت علی، چودھری عبدالمتین، چودھری خلیق الزماں صاحب،نواب اسماعیل خاں صاحب وغیرہ حضرات مارچ ۱۹۳۶ء سے آئندہ الیکشن کے لیے بورڈ وغیرہ بنانے میں بے قرار نظر آتے تھے، جلسے اور اجتماعات اس کے لیے کیے جاتے تھے،ان پر غور کیا جاتا تھا کہ کس طرح اس میں حسب منشا کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے اور جس طرح یونٹی بورڈ میں کوشش کرکے جمعیۃ علماء ہند کو داخل کیا گیا تھا اور ان کی مختلف جماعتوں میں صلح کرائی گئی تھی،اس طرح آئندہ بورڈ کے لیے ان کی امداد واعانت حاصل کرنے کی مساعی کی جاتی تھی جن کی بڑی وجہ یہی تھی کہ مسلم عوام پر جمعیۃ کے اراکین کا اثر تھا۔

مسٹر جناح نے اراکین یونٹی بورڈ کو مشورہ دیا کہ وہ زیر قیادت مسلم لیگ مشترکہ بورڈ بنائیں جو مسلم نیشنلسٹ پارٹی، جمعیۃ علماء خلافت کمیٹی، احرار پارٹی وغیرہ سب کو جاری ہو،اس کے لیے جلسے خصوصی کیے گئے اور اراکین جمعیۃ کو بار بار بلایا گیا۔

دو تین اجتماع کے بعد قرار پایا کہ (حضرت شیخ الاسلام) حسین احمد کو بلایا جائے، اس مفاہمت میں شریک کیا جائے اور باوجود کہ چند رجعت پسندوں نے یہ کہا کہ ہم سبھوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرسکتے ہیں مگر حسین احمد کے ساتھ اشتراک نہیں کرسکتے،تاہم مجھ کو تار دے کر ملتان سے (جب کہ میں وہاں بعض جلسوں میں شریک کی غرض سے گیا ہوا تھا) بلایا گیا۔

صبح کو تقریباً آٹھ دس بجے تک تبادلہ خیالات اور گفت وشنید ہوتی رہی اور مسٹر جناح نے زور دیا کہ پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہوکر آپ لوگوں کو الیکشن میں حصہ لینا اور عمدہ سے عمدہ آزاد خیال لوگوں کو امیدوار اور کامیاب بنانا چاہیے۔

ان اساس میں ان اراکینِ جمعیۃ اور احرار کا نام چن چن کر جب کہ وہ کشمیر میں تھے،شائع کرایا اور پھر لاہور کے اجلاس میں دعوتی خطوط بھیج کر سب کو بلایا۔ میری بلاخواہش اور اسی طرح بغیر خواہش صدر و ناظم جمعیۃ علماء یہ نام چنے گئے اور پھر میرا نام بلا میری خواہش صدر یوپی کی مجالس میں بھی چنا گیا اور باوجود ہر قسم کی مشکلات اور اعزار کے مجھ پر کام کرنے اور ہر امیدوار کے حلقے میں جانے کا حکم دیا گیا،جس کو میں نے بغیر کسی قسم کے لالچ اور نفع مالی کے انجام دیا۔‘‘

اس سے پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ مولانا محمد سجادؒ اور دیگر اراکینِ جمعیۃ علماء کو باقاعدہ

زوردے کر بورڈ میں شریک کیا گیا تھااوروہ اطمینان حاصل کرنے کے بعد شریک ہوئے تھے۔محمد علی جناح کے حتمی وعدے کے بعد کہ رجعت پسندوں اور برطانیہ کے کاسہ لیسوں کو مسلمانوں اور ہندستان کی سیاست سے نکال دیا جائے گا اور آزادی کی جنگ ہندو مسلمان دونوں کے متحدہ محاذ سے لڑی جائے گی۔اس کے بغیر آزادی حاصل کرنا ناممکن ہے۔

محمد علی جناح کے اخباری بیانات:

حضرت مفکرِ ملتؒ اور اراکینِ جمعیۃ علماء شریک ہوئے تھے۔ مذکورہ امور کے متعلق محمد علی جناح نے نہ صرف یہ کہ زبانی وعدے کیے بلکہ اخبارات میں بیانات بھی دیئے کہ حریت پسند مطمئن ہوجائیں۔اس کے متعلق حضرت شیخ الاسلامؒ نے 'مسٹر جناح کا پراسرار معمہ اور اس کا حل' میں شواہد کو جمع کردیا ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ مسٹر محمد علی جناح نے نہایت زوردار الفاظ اور طریقوں سے ہم کو اطمینان دلایا کہ رجعت پسند طبقہ اور خود غرض لوگوں کو ہم آہستہ آہستہ لیگ سے نکالیں گے اور آزاد خیال اور قوم پرست (پرور) مخلص لوگوں کی اکثریت کی کوشش کریں گے اور ایسے ہی لوگوں کے انتخاب کو عمل میں لائیں گے۔ہم نے بعد بحث ومباحثہ اس پر اطمینان کیا اور تعاون پر آمادہ ہوگئے،جس کی زوردار خواہش مسٹر محمد علی جناح اور ان کے رفقاءِ کار کی اس وقت تھی۔

اس کتاب میں حضرت شیخ الاسلامؒ نے مولانا بشیر احمد بھٹہ کٹھوریؒ کے ایک جلسے کی روداد کا بھی حوالہ دیا ہے،جس میں ہے کہ ہم کو یہ بتلایا جائے کہ ہم یا آپ کسی طرح بھی اس میں کامیاب نہ ہوسکے کہ پارلیمنٹری بورڈ آزاد خیال منتخب ہوتو پھر آپ کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اس پر بہت جوش کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ اگر میں کسی طرح بھی اس پر قادر نہ ہوا تو مسلم لیگ کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ آجاؤں گا،اس پر بے انتہا خوشی کا اظہار کیا گیا اور سب حضرات نے فرمایا کہ ہم بھی یہی چاہتے تھے۔

گرچہ ملک تقسیم ہوکر پاکستان ایک ملک وجود میں آچکا ہے،تاہم تاریخی ریکارڈ ہمارے سامنے ہونا چاہیے،تاکہ ہم ماضی سے روشنی ورہنمائی لے کر حال اور مستقبل کے لیے بہتر کام کرسکیں۔

حضرت ابوالمحاسنؒ کا موقف اور اج کا بھارت:

حضرت مفکرِ ملت مولانا محمد سجادؒ اور جمعیۃ علماء کے دیگر اراکین کی مسلم لیگ میں شمولیت اور پھر علاحدگی بہت اہم معاملہ ہے۔اس سے ہم سبق لے سکتے ہیں کہ تاریخ میں لمحوں نے کیا خطا کی

ہے جس کی سزا صدیوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ آج کے بھارت کے پس منظر میں یہ سوچنا اور ضروری ہوجاتا ہے۔ ماہ جون ۱۹۳۶ء میں بمبئی کرانیکل اور فروری ۱۹۳۷ء کے مدینہ اخبار بجنور میں محمد علی جناح کا ایک بیان شائع ہوا تھا، اس سے بہت کچھ واضح ہوجاتا ہے، اس سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر جمعیۃ علماء اور مولانا سیّد محمد سجادؒ کے موقف ونہج پر معاملے میں پیش رفت ہوتی تو آج کی تاریخ میں ہمارے سامنے بھارت کسی اور شکل میں ہوتا۔

محمد علی جناح کے بیان کے اہم نکات:

محمد علی جناح کے بیان میں کہا گیا ہے کہ:

(۱) مسلم لیگ کی پالیسی کا مقصد ایک ایسے نظام کا بروے کار لانا ہے جس کے ماتحت ترقی پسند اور آزاد خیال مسلمانوں کے اعلیٰ ادارے متحد ہوجائیں۔

(۲) مسلم لیگ موجودہ دستور سے بہتر ایسا دستور حاصل کرنے کے لیے جو سب کو پسند ہوگا، کانگریس کا ساتھ دے گی اور حکومت پر دباؤ ڈالے گی۔

(۳) مسلم لیگ اس اصول کو برقرار رکھتی ہے کہ بطور اقلیت مسلمانوں کو کافی تحفظ حاصل ہوگا۔

(۴) اسمبلی میں لیگ تمام قومی معاملات میں کانگریس سے تعاون کرے گی اور اس کے ساتھ رہے گی۔

(۵) لیگ کے صدر کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ ایسے چالاک لوگوں کو جن کا مقصد حکومت کے ماتحت عہدے حاصل کرنا ہے اور جنھیں عوام کے حقوق، ضروریات اور مفاد کی مطلق پروانہیں، سیاسی میدان سے نکال دیا جائے۔

شمولیت و علیحدگی کی وجوہ:

ان مذکورہ امور پر ایک نظر ڈالنے سے پوری طرح واضح ہوجاتا اور اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور جمعیۃ علماء کے دیگر ارکان مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں کیوں شامل ہوئے تھے اور الیکشن میں پوری پوری مدد دی تھی۔ محمد علی جناح نے تمام تر وعدے، معاہدے، شرائط و پیمان کو یکسر بھلا دیا اور مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے مولانا سجادؒ اور جمعیۃ علماء کے اراکین کو باہر نکالنے کا ماحول پیدا کردیا۔ علماء سے بڑائت کے اظہار کے ساتھ ان کی توہین بھی کی، اس تعلق سے جمعیۃ علماء کے اہم رکن اور ایم ایل اے مولانا محمد اسماعیل سنبھلی کا بیان بہت اہم ہے، انھوں نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ:

''۱۹۳۶ء میں مسلم الیکشن کے سلسلے میں جب کہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی تو ہم لوگ اس بورڈ میں صرف اس توقع پر داخل ہوئے تھے کہ یہ جماعت آزاد خیال افراد پر مبنی ہوگی اور اس کی تمام تر مساعی اور کوششیں آزادیٔ وطن اور رجعت پسند طبقہ کو زیر کرنے کے لیے ہوں گی، چنانچہ صاف اور واضح الفاظ میں مسٹر محمد علی جناح نے اس کا وعدہ کیا اور ہر طرح جماعت علماء کو اطمینان دلایا اور بڑی حد تک الیکشن کے زمانے میں اس وعدہ کی پابندی بھی کی گئی، لیکن الیکشن سے فارغ ہونے کے بعد فوراً ہی جناح صاحب نے (جو کہ اس بورڈ کے ڈائرکٹر مطلق تھے) نہ معلوم کن مخفی وجوہ کی بنا پر اپنی روش بدل دی اور باوجود ہماری زبردست مخالفتوں کے انھوں نے اس رجعت پسند طبقہ کو شامل کرنا چاہا، جس سے دورانِ الیکشن میں مقابلہ رہا تھا اور اس مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو، جو مسلم لیگ، جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اور کانگریس کے ممبران سے ترتیب دیا گیا، کانگریس کے مدمقابل بنانے کی انتہائی کوشش کی اور کانگریس کو خالص ہندوؤں کی جماعت قرار دینا شروع کیا، جب ہم نے اس معاملے میں احتجاج کیا اور جناح صاحب کو ان کے مواعید یاد دلائے اور بتلایا کہ جمعیۃ علماء اس بورڈ میں صرف اس بنا پر داخل ہوئی تھی کہ کانگریس سے مل کر آزادیٔ وطن کے لیے کوشش کی جائے گی اور رجعت پسند طبقہ کو ایک ایک کر کے علیحدہ کر دیا جائے گا اور یہ صرف آزاد خیال لوگوں کی جماعت رہے گی، آج آپ رجعت پسندوں کو اس میں داخل کر رہے ہیں اور کانگریس کے ساتھ بجائے اشتراکِ عمل اور اتحادِ عمل کے جو آپ کے مینوفیسٹو میں درج ہے، مخالف جا رہے ہیں، تب جناح صاحب نے اور بعض دوسرے لوگوں نے بورڈ کی میٹنگ میں ہتک آمیز رویہ اختیار کیا اور کہا کہ ہمارے سارے وعدے ایک سیاست تھی، علماء سیاست سے بالکل ناواقف ہیں، اگر جمعیۃ علماء ہمارے اس طرزِ عمل کو نہ پسند کرے تو ہمیں مطلق اس کی پروا نہیں ہے''۔

یہ سب تفصیلات حضرت شیخ الاسلامؒ کی کتاب 'مسٹر جناح کا پراسرار معمہ اور اس کا حل' میں موجود ہیں۔ ان سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت مفکرِ دین وملت رحمۃ اللہ علیہ، جمعیۃ علماء اور امارت کے دیگر ارکان کا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ صحیح تھا اور ان کی سیاسی و سماجی بصیرت کا بین ثبوت، اس طرح مولانا سجادؒ پر یہ الزام بھی شواہد وحقائق کی بنیاد پر ثابت نہیں ہوتا ہے، ان کے متعلق موافق ومخالف دونوں قسم اور عام غیر جانب دار تحریروں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ

ان کے سامنے عالم، غیر عالم کی سیادت و قیادت پیشِ نظر نہیں تھی، بلکہ دین وملت اور ملک وقوم کے مفادات پیشِ نظر تھے۔ ان کے مدنظر ہی فیصلے کیے جاتے تھے۔ عالم، غیر عالم سب ہی حضرت مفکرِ ملک وملتؒ کی سیاسی بصیرت اور عمل واقدام کی اصابت کے معترف تھے۔ 'محاسن سجادؒ میں شامل مسلم لیگ کے خاص حضرات کی تحریروں میں یہ موجود ہے کہ مولانا سجادؒ نے مولانا آزادؒ کے مقابلے میں مولانا محمد علی جوہر کا ساتھ دیا تھا جو اصطلاحی عالم نہیں تھے، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اگر مولانا سجادؒ نہرو رپورٹ کی مخالفت نہ کرتے اور مولانا جوہر کا ساتھ نہ دیتے تو مولانا ابوالکلام آزاد طبقہ علماء کو اپنے سحرِ سامری سے جمعیۃ علماء کو مسحور کر کے اپنے ساتھ بہالے جاتے۔

اجلاس دهلی اور نهرو رپورٹ:

یہ بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ مولانا سجادؒ جمعیۃ علماء کے لیڈروں کو لے کر مسلم کانفرنس کے اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے، جو یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو آغا خاں کی صدارت میں بمقام دہلی منعقد ہوا تھا، اس اجلاس میں نہرو رپورٹ کے مقابلے کے لیے وہ مطالبات وضع کیے گئے تھے، جن کو محمد علی جناح نے مارچ ۱۹۲۹ء میں چودہ نکات کی شکل میں ترتیب دیا تھا۔ محمد علی جناح کے ذریعے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں مولانا سجاد اور دیگر علماء کی شرکت سے عالم، غیر عالم کی بحث کی تردید ہوتی ہے۔ اس سے متعلق حضرت شیخ الاسلامؒ نے اس سلسلے کے جو نکات اپنی کتاب میں پیش کیے ہیں، ان کے جوابات بھی مسلم لیگ کی تحریروں میں نہیں ملتے ہیں۔ انھوں نے مثالیں دیتے ہوئے لکھا ہے کہ تحریک خلافت میں علی برادران اور ان کے جیسے انگریزی خوانوں کے زیر قیادت مولانا سجاد کے ساتھ دیگر علماء بھی سرگرم عمل ہو گئے تھے۔

علماء کی کانگریس میں شرکت:

۱۹۱۹ء کے بعد سے تحریک کانگریس میں بڑی تعداد میں علماء شریک ہو گئے تھے۔ ۱۸۸۷ء سے ہی علماء کانگریس میں شامل ہونے لگے تھے، جب کہ اس وقت تک کوئی بھی اس کا صدر عالم نہیں بنا تھا۔

متحده قومیت کا مسئله:

متحدہ قومیت کے مزعومہ غلط تصور کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کے درمیان غلط تشہیر کا بھی کوئی جواز نہیں ہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ اور حضرت مفکرِ ملتؒ نے کتاب وسنت، سیرت اور قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں جو تصور پیش کیا تھا، اس کے سوا ہندوتوادیوں اور فرقہ پرستوں کے نظریے پر

مبنی راشٹرواد کے مقابلے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے، اس پر راقم سطور نے اپنی تحریر 'ہندوتو اور راشٹرواد' میں قدرے تفصیلی بحث کی ہے۔ حضرت مفکرِ ملتؒ اور حضرت شیخ الاسلامؒ نے جو کچھ کہا تھا اور موقف پیش کیا تھا، اس کی صحت کو وقت اور تاریخ نے بھی تسلیم کرلیا ہے، ان اکابر کے پیش کردہ متحدہ قومیت کا یہ مطلب قطعاً نہیں تھا اور نہ ہے کہ مسلمان خود کو ہندو اکثریت میں ضم و جذب کردیں، ایسا سمجھنا ان کے ساتھ صریح زیادتی و ناانصافی ہوگی۔ متحدہ قومیت کو مذہب جدید کا ایجنٹ اور امام قرار دینا سراسر ناسمجھی پر مبنی ہے۔ آج کے بھارت میں راشٹرواد کا مسئلہ جس طرح بہت نمایاں ہوکر سامنے آیا ہے، اس کے پیشِ نظر حضرت مفکرِ اسلامؒ و ملتِ اسلامیہ کا موقف ہمارے سامنے ہونا چاہیے؛ تاکہ ہمیں اپنے نقطۂ نظر کو واضح انداز میں رکھنے میں رہنمائی ملے۔ متحدہ قومیت پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مفکرِ ملتؒ نے لکھا ہے:

''بنیادی مسئلہ اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے اور وہ ہندستانی قومیتِ متحدہ کی تخلیق کا مسئلہ ہے۔ بلاشبہ یہ امر واضح ہے کہ ہندستان میں جتنے انسان آباد ہیں، چاہے وہ کسی نسل سے ہوں، کسی مذہب کے پیرو ہوں یا سرے سے مذہب ہی کے معتقد نہ ہوں، ہندستانی باشندہ ہونے کی حیثیت سے وہ سب کے سب ایک قوم ہیں اور اس ایک حیثیت سے تمام باشندگانِ ملک کو ایک قوم کہنا صحیح و درست ہے؛ یعنی سب کے سب ہندستانی ہیں، یعنی نہ وہ ایرانی و تورانی ہیں اور نہ چینی و جاپانی وغیرہ اور بحالت موجودہ ہندستانی متحدہ قومیت کی خاص خصوصیت صرف اس قدر ہے کہ اس ملک کی قدرتی و مصنوعی پیداوار کے حصول میں سب کا اشتراک ہے اور اس ملک کی آب و ہوا اور سامانِ خورد و نوش سے بھی لوگوں کے جسموں کی تربیت ہوتی ہے اور ان خصوصیات کو قطع نظر کر کے مغربی سیاسئین کے نظریے کا اتباع کرتے ہوئے اس براعظم میں اس قسم کی قومیتِ متحدہ کی تخلیق کی سعی کرنا جو یورپ کے کسی ملک میں ہے، محض بے سود ہی نہیں، بلکہ ملک کے لیے تباہ کن بھی ہے؛ کیوں کہ اس ملک کی دو بڑی جماعتیں مسلمان اور ہندو بحیثیت مجموعہ وہ علیحدہ علیحدہ تمدن کے مالک ہیں اور ہر شخص بین طور پر ایک کے تمدن کو دوسرے کے تمدن سے ممتاز پاتا ہے اور یقین کرنا چاہیے کہ جب تک ان دونوں کا امتیاز باقی ہے، مغربی تخیل کے مطابق ہندستان میں متحدہ قومیت کی تخلیق ناممکن ہے اور اس حیثیت سے ہندستانیت اتحاد و وحدت کے باوجود ان دونوں تمدنوں کے لحاظ سے ہندو اور مسلمان دو قومیں آج بھی ہیں اور کل بھی رہیں گی''۔ (۴)

اس سے پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ ملک کی مشترکہ سیاسی جدوجہد اور متحدہ قومیت کے تئیں مولانا محمد سجادؒ کا کیا موقف تھا۔

دیگر سیاسی امور:

حضرت مفکرِ ملک وملتؒ کے اور بھی بہت سے کام ہیں، جن سے ان کی سیاسی وسماجی بصیرت وجرأت اور بروقت فیصلے کا ثبوت ملتا ہے، سیاست میں وقت کے ضروری مسائل اور ان میں سے ترجیحات کی بنیاد پر نسبتاً اہم تر مسائل کے انتخاب اور بروقت سامنے لانے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر ان کی تمام ضروری باتوں اور کاموں کا ریکارڈ محفوظ ہوتا تو ہمیں مسائل کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی؛ تاہم جتنا کچھ ہمارے سامنے ہے، ان سے بھی حضرت مفکرِ ملک وملتؒ کے اعلیٰ سیاسی فہم وخدمات کو کئی جہات سے دیکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے سیاسی راہ سے مرتب ہونے والے مفید ومضر پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور تمام تر ضروری امور کو زیر ذکر لاکر ملک وملت کو متوجہ اور اقدامات کرنے کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی تشکیل:

اس سلسلے میں مولانا محمد سجادؒ کی طرف سے مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی تشکیل ہے، اس سے مولانا سجادؒ نے یہ ثابت کردیا کہ وہ صرف نظریاتی اور گفتار اور دوسروں کی طرف سے جاری سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہونے تک ہی محدود ہیں؛ بلکہ باقاعدہ عملی سیاست کا حصہ ہوتے ہوئے سیاسی قیادت کی اہلیت وبصیرت بھی رکھتے ہیں۔

حضرت مفکر ملت کا نقطۂ نظر اور سیاست میں حصہ داری کی اہمیت وضرورت:

حضرت مفکرِ ملتؒ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ صرف عام مسلمان اور غیر علماء ہی نہیں بلکہ علماء بھی مذہبی ودینی امور ومعاملات کے علاوہ سیاسی امور میں رہنمائی کریں، اس سے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کو ساتھ لے کر سیاسی قوت بننے کی کوشش کی راہ بھی ہموار ہوگی اور مسلمانوں کو متحد کرنے کا کام بھی ہوسکتا ہے۔ ملک میں مختلف مقاصد کی تکمیل کے لیے سیاست کی جس قدر اہمیت ہوتی جارہی تھی اور ماضی میں بھی اہم رہی ہے، اس کے پیشِ نظر ان کا احساس تھا کہ سیاست سے کنارہ کش رہ کر بہت سے دینی، سماجی، وطنی اور قومی مفادات کا تحفظ وتحصیل نہیں ہوسکتا ہے۔ یہی وہ احساس ہے، جس کے تحت انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا وقت کی ضرورت وتقاضا سمجھا اور مختلف مواقع

پر جس طرح انھوں نے بہتر مقاصد کے حصول کے لیے سیاسی اثر ورسوخ کا استعمال کیا اس سے اچھی طرح ثابت ہوجاتا ہے کہ حضرت مفکرِ ملتؒ کے دیگر کارناموں اور خدمات سے سیاسی خدمات وکارنامے کوئی کم اہم نہیں ہیں۔

ایک اہم قابل توجہ پہلو:

حضرت مفکرِ ملتؒ کی عملی سیاست کا ایک اہم اور قابلِ توجہ پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مختلف ومتضاد عقائد وخیالات کے علماء وعوام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی تشکیل اور دیگر امور کے تناظر میں حالات اور وقت نے ثابت کردیا کہ حضرت ابوالمحاسنؒ کا یہ سیاسی اقدام ملک وملت کے حق میں مفید ثابت ہوا اور مضرات ونقصانات کی تلافی کا ذریعہ بھی۔

دستور کی توضیع کے اثرات:

۱۹۳۵ء اور بعد میں نئے دستور کی توضیع اور مرکزی وصوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے سلسلے میں جو مسائل پیدا ہوئے اور مسلمانوں کو غلط پالیسیوں کے تحت کانگریس نے نظرانداز کردیا، اس کی تلافی میں مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی اور مولانا محمد سجادؒ کے سیاسی اقدامات نے اہم رول ادا کیا۔

کانگریس کا رویہ:

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ کانگریس نے بیشتر اوقات ملک وقوم کے مجموعی مفاد کے پیشِ نظر کام کیا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں ہمیشہ سے کچھ طاقتور فرقہ پرست عناصر بھی رہے ہیں۔ مختلف مواقع پر مسلم اقلیت، دلتوں اور آدی واسیوں کو نظرانداز کرکے ان کو حاشیے پر رکھنے میں کامیاب بھی ہوجاتے تھے۔ آزادی سے پہلے ۱۹۳۵ء میں انتخابی ایکٹ بننے کے بعد جو انتخابات ہوئے تھے، ان میں جہاں کانگریس اور دیگر فرقہ پرست پارٹیوں نے مسلم اقلیت کے جذبات کو مجروح کیا تھا، وہیں دوسری طرف اس کو نظرانداز کرنے کا کام بھی کیا تھا۔ ایسی حالت میں اگر کوئی جذباتی قیادت ہوتی تو اس وقت کی کانگریس کے متعلق انتہاپسندی کا رویہ اختیار کرکے دوسرے کنارے پر کھڑی ہوجاتی، جس کا عملی طور پر مسلم اقلیت کو نقصان ہوتا، لیکن حضرت مفکرِ ملتؒ نے انتہائی سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے مسلم اقلیت کے پلڑے میں وزن ڈالنے کے لیے کئی کارگر اقدامات کیے۔

مرکزی اسمبلی کے انتخابات:

جب مرکزی اسمبلی کے انتخابات کا فیصلہ ہوا تو خلافت، بہار کانگریس اور جمعیۃ علماء کے رہنماؤں کی مشترکہ مدد سے الیکشن لڑنا طے ہوا، اس کے لیے مسلم یونٹی بورڈ قائم کیا گیا، اس میں مولانا سجادؒ کا بنیادی رول تھا۔ ان کی جدوجہد اور بہتر حکمت عملی سے چار امیدواروں میں سے تین (بدیع الزماں وکیل کشن گنج، مولانا عبدالحمید دربھنگہ اور مولانا محمد نعمانی پٹنہ) کامیاب ہوئے۔ اس سے پہلے کی صورتِ حال بدل گئی جب صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں کانگریس نے مسلم حلقہ ہائے انتخاب پر توجہ دی، لیکن حضرت مفکرِ ملتؒ کو معلوم تھا کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں کو سماج میں مسلم دینی اداروں اور علماء کا اشتراک ورسوخ پسند نہیں تھا۔ وہ جمعیۃ علماء ہند اور امارتِ شرعیہ کو نظر انداز کرکے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف مولانا محمد سجادؒ کے پیشِ نظر یہ حقیقت بھی تھی کہ سیاسی پارٹیاں مسلم امیدواروں سے اپنی کمیونٹی کی نمائندگی کے بجائے اپنے مفادات کے ساتھ جوڑے رکھنے پر زیادہ توجہ دیتی ہیں، مسلم نمائندے بھی کمیونٹی اور ملک کے مجموعی مفاد سے زیادہ پارٹیوں کے زیادہ وفادار ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں بسا اوقات ملک کے ضروری مسائل کو بھی نہ سامنے لاتے ہیں اور نہ ان کے لیے مؤثر جدوجہد کر پاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال جس طرح آج بھی باقی ہے، آزادی سے پہلے، مولانا محمد سجادؒ کے عہد میں بھی یہی بات تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تھی۔ اسی کے پیشِ نظر حضرت ابوالمحاسنؒ نے مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی تشکیل کی تھی۔

امارتِ شرعیہ کی طرف سے تجویز کی منظوری:

ایسا امارتِ شرعیہ کی ایک تجویز کے تحت کیا گیا تھا، تجویز میں یہ کہا گیا ہے کہ امارتِ شرعیہ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے خود آگے بڑھے اور الیکشن مہم کو سر کرنے کے لیے ایک نئی پارٹی تشکیل دی جائے، اس تجویز کے تحت فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حضرت ابوالمحاسنؒ نے امارت، خلافت اور جمعیۃ علماء کے رہنماؤں کے علاوہ دیگر کھلے ذہن اور ترقی پسند حضرات کی مدد سے پارٹی بنا کر اس کے پلیٹ فارم سے انتخابی مہم چلائی، اس تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا سجادؒ کی سیاسی جدوجہد اپنے دائرۂ کار میں بڑی حد تک کامیاب رہی۔ اتحاد و یک جہتی کے ہمیشہ مختلف جہات سے فائدے ہوتے ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کا رول:

اس زمانے میں امارتِ شرعیہ اور جمعیۃ علماء ہند مستقل الگ الگ ادارہ اور تنظیم نہیں تھی، ایک

دوسرے کے مشترک ارکان وعہدے داران ہوتے تھے۔ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی جدوجہد کی کامیابی میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کا خصوصاً اور دیگر جمعیۃ علماء کے رہنماؤں اور کارکنوں کا عموماً بڑا اہم کردار رہا ہے۔ پارٹی کا پہلا تاسیسی اجلاس جو ۱۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں منعقد ہوا تھا، وہ جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ کی صدارت میں ہوا تھا، اور اسی تاسیسی اجلاس میں حضرت ابوالمحاسنؒ کے انکار کے باوجود ان کو متفقہ طور پر مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ پارٹی کے اغراض ومقاصد میں سے ایک اہم مقصد ملک کی مکمل آزادی کی حمایت تھا۔

پارٹی کی ورکنگ کے اہم ارکان:

ہفت روزہ 'نقیب' پھلواری کی خصوصی اشاعت مولانا سجاد نمبر (اپریل ۱۹۹۹ء) اور دیگر تحریروں میں درج تفصیلات کے مطابق، پارٹی کی ورکنگ کمیٹی اکیس ارکان پر مشتمل تھی، ان میں سکریٹری کے طور پر جناب محمود بارایٹ لا پٹنہ اور جسٹس خلیل احمد شامل تھے اور مولانا محمد اسماعیل تاجر پٹنہ کو خازن بنایا گیا تھا۔

پارٹی کی کامیابی:

چار نائبینِ صدر، چار جوائن سکریٹریز، ایک اسسٹنٹ سکریٹری اور نشرواشاعت کے لیے ایک اسسٹنٹ سکریٹری بنائے گئے تھے۔ مذکورہ خصوصی اشاعت، 'حیاتِ سجادؒ'، 'محاسنِ سجادؒ' اور دیگر تحریروں میں درج تفصیلات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا سجادؒ نے جو سیاسی وسماجی حکمت عملی اختیار کی تھی، اس کے تحت مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کو توقع سے زیادہ کامیابیاں ملیں، یہاں بھی ان کی سیاسی بصیرت ظاہر ہوتی ہے۔ حضرت ابوالمحاسنؒ نے جہاں ایک طرف الگ الگ مسلم پارٹیوں کو متحد کرنے اور اپنی پارٹی میں ضم کرنے کی کوشش کی وہیں دوسری طرف اپنی پارٹی کو مستحکم ووسیع کرنے پر بھی پوری توجہ دی، اس وقت جناب عبدالعزیز بیرسٹر کی مسلم یونائیٹڈ پارٹی اور جناب شفیع داؤدی کی احرار پارٹی تھی، ان دونوں کو مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی میں ضم کرنے کی حضرت مفکرِ ملک وملتؒ نے امکانی حد تک ہر ممکن کوشش کی تھی؛ لیکن دونوں پارٹیوں کے سربراہ اتحاد وانضمام کے لیے تیار نہیں ہوئے تو مولانا سجادؒ نے اپنے بل بوتے پر انتخابات میں اُترنے کا فیصلہ کیا اور مذکورہ پارٹیوں کے علاوہ کانگریس کے ان امیدواروں کا مقابلہ کیا، جنھوں نے امارتِ شرعیہ کے عہد نامے پر دستخط نہیں کیے تھے۔ حضرت ابوالمحاسنؒ اور حضرت شیخ الاسلامؒ

اور دیگر اکابر امارت و جمعیۃ کی ملک میں اپنی خدمات اور جدوجہد کی وجہ سے جو اثرات تھے، ان سے عوام کی گہری وابستگی تھی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب مسلم یونائیٹڈ پارٹی اور احرار پارٹی نے حضرت ابوالمحاسنؒ کی دعوت کے باوجود اتحاد و انضمام نہیں کیا تو اسے عوام نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اس کے اثرات انتخابات کے نتائج کی شکل میں بھی سامنے آئے، عوام خصوصاً مسلمانوں میں پارٹی سے جو ہمدردی اور اس کے تئیں جوش و جذبہ پیدا ہوا، اس نے مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا، انھوں نے اس کی ہر طرح کی مدد کے ساتھ انتخابات میں کھل کر ساتھ دیا۔

پارٹی کے امیدواروں کی کامیابی:

اس کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہار کی کل چالیس مسلم سیٹوں میں سے مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کو بیس سیٹوں پر کامیابی ملی، جب کہ کانگریس کے کل پانچ امیدوار کامیاب ہوئے۔ احرار پارٹی کو تین اور مسلم یونائیٹڈ پارٹی کو کانگریس کے برابر یعنی پانچ سیٹیں ملی تھیں۔ دیگر چھ آزاد امیدوار بھی کامیاب ہوئے تھے۔ خواتین ریزرو سیٹ سے سیّدہ انیس امام کو کامیابی ملی تھی، اس الیکشن کا ایک قابلِ توجہ پہلو یہ بھی ہے کہ مسلم لیگ کو، جس نے امارتِ شرعیہ اور جمعیۃ علماء سے وابستہ علماء اور کارکنان کی اَن دیکھی کی تھی، اور ان کو سماج میں بے اثر کرنے کے لیے کوشاں تھی، بہار میں ایک سیٹ پر بھی کامیابی نہیں ملی، البتہ ملک کی سطح پر مسلم لیگ کو 485 مسلم سیٹوں میں سے 108 سیٹوں پر کامیابی ملی تھی جب کہ دوسری طرف 482 سیٹوں میں سے کانگریس کے کل 26 امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔

زیر ذکر انتخاب میں مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی بہار میں پچاس فیصد سیٹوں پر کامیابی حاصل کر کے سب سے بڑی پارٹی بن کر سامنے آئی تھی، وہیں پارٹی کی سطح پر کانگریس کے بعد دوسری بڑی پارٹی کے طور پر اُبھری تھی۔ اس میں ظاہر ہے کہ حضرت ابوالمحاسنؒ کی سیاسی بصیرت و حکمت عملی کا بڑا دخل اور امارت و جمعیۃ علماء کے خادموں کی جدوجہد کا ثمرہ تھا۔ اس کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے لکھا تھا:

> ''ظاہر میں تو یہ ایک معمولی واقعہ تھا، لیکن کیا یہ کم حیرت و تعجب کی بات ہے کہ جن صوبائی وزارتوں کا یہ حال رہا ہے اور آج بھی یہ حال ہے کہ مسلم لیگ کے اس زور و شور اور مسٹر جناح کی قیادت کے اس ہنگامہ کے دور میں کہ جمہور مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں، آج تک ایک صوبہ میں بھی مسٹر جناح اور ان کی مسلم لیگ کو خالص لیگی وزارت حاصل نہ

ہوسکی اور کسی صوبائی لیجسلیچر پر ان کو کامل اقتدار حاصل نہیں ہے، ایک صوبہ میں ایک بوریہ نشین کی معمولی جدوجہد سے اس کی پارٹی کو اگرچہ عارضی سہی مگر وہ اقتدار حاصل ہوگیا، جس نے بہار میں قابلِ قدر اور قابلِ تقلید خدمات انجام دیں اور بعد کے دنوں میں جو حالات پیدا ہوئے ان کے پیشِ نظر حضرت ابوالمحاسنؒ کی رہنمائی میں بہار میں جناب محمد یونس نے وزارت ترتیب دے کر پارٹی کی سرکار بھی بنائی گئی۔ یہ ایک طرح سے ایک نیا واقعہ تھا کہ ایک عالم کی سربراہی اور رہنمائی میں حکومت سازی ہوئی تھی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک محدود مدت کی اس حکومت کے بہت سے اچھے کام ہوئے، مسلمانوں کے جو جائز وواجب مطالبات تھے وہ پورے ہوئے، ایک نمایاں کام، ہندی رسم الخط کے ساتھ ساتھ اُردو رسم الخط کو بھی سرکاری حیثیت ملی، اسے بعد میں قائم ہونے والی کانگریس سرکار کو بھی باقی رکھنا پڑا''۔(۵)

پارٹی کے اغراض و مقاصد:

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے بنیادی اغراض و مقاصد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوالمحاسنؒ نے ملک وملت کے مقاصد ومفادات کا پورا پورا لحاظ وخیال رکھا تھا، اس پارٹی کا چوں کہ بنیادی مقصد مسلم اقلیت کے معاشرتی، مذہبی، سیاسی واقتصادی، تعلیمی، سماجی ضروریات کی تکمیل اور حقوق واختیارات کا تحفظ ومفاد تھا؛ اس لیے اس کی جدوجہد کا زیادہ تر دھیان مسلم اقلیت کے مسائل پر تھا، اس وقت کے حساب سے یہ صحیح بھی تھا۔ مشترکہ عام ہندستانیوں کے لیے کانگریس اور علاقائی اور دیگر کمیونٹیز کے مسائل اُٹھانے کے لیے دیگر مختلف پارٹیاں تھیں، پارٹی کے بنیادی اغراض ومقاصد میں جن امور کو خاص طور سے شامل کیا گیا ہے، ان پر ایک نظر ڈالنے سے بات بہت حد تک واضح ہوجاتی ہے:

☆ اس امر کی کوشش کرنا کہ نظامِ حکومت کی مشینری، خاص کر بڑے عہدے داروں پر کم سے کم خرچ ہو؛ تاکہ صوبہ کی سرکار کی آمدنی کا روپیہ قوم وملت کی ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود میں زیادہ صرف ہو۔

☆ حکومت کے کسی شعبہ میں خاص کر مجلس مقنّنہ میں جب ایسے معاملات پیش آجائیں جن کا مذہب سے تعلق ہو، اس قسم کے تمام معاملات کو امارتِ شرعیہ میں بھیجنا تاکہ قوم کے تمام اسلامی فرقوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہر فرقہ کے مستند عالم دین سے استصوابِ رائے کے بعد وہ جو

کچھ مشورہ دے اس کے بعد عمل کرنا یا خود امارتِ شرعیہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے مستند علمائے دین سے استصوابِ رائے کے بعد کسی مسودہ قانون کو پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرے اور وہ پارٹی کو اس کی طرف متوجہ کرے، تو ایسے مسودہ قانون کو مجالس مقنّنہ سے منظور کرانے کی سعی کرنا۔

☆ قانون میں ہر فرقہ کی رعایت ہو اور کوئی ایسا قانون نہ بن جائے جو کسی فرقہ کے مذہب کے خلاف اس فرقہ پر نافذ ہو جائے۔

☆ کاشت کاروں، مزدوروں و دیگر اقتصادی طبقات کے فلاح و بہبود کی ہر ممکن طریق سے سعی کرنا۔

☆ سیاسی مسائل اور دیگر امور کی اشاعت کے لیے اُردو میں رسائل و کتب شائع کرنا۔

☆ مادری زبان اور رسم الخط کو ذریعہ تعلیم، علوم و فنون قرار دیئے جانے کی سعی کرنا۔

☆ قوم و وطن کو غیروں کی غلامی سے آزاد کرنے کی حسب استطاعت سعی کرنا۔

☆ مسلمانوں میں عام بیداری اور سیاسی احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کی سعی کرنا۔

☆ مسلمانوں کے تمام سیاسی، اقتصادی، معاشرتی و مذہبی حقوق کی حفاظت اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا۔

☆ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور مالی ترقی کی سعی کرنا۔

☆ سیاسیات میں مسلمانوں کے تمام فرقوں اور نسلی و نسبی قبائل کو متحد رکھنے کی سعی کرنا۔

☆ مسلمانوں میں دینی و دنیاوی تعلیم کو وسیع کرنے اور تعلیم جاری کرنے کی سعی کرنا۔

پارٹی کے اثرات:

ان مذکورہ اغراض و مقاصد سے انڈی پنڈنٹ پارٹی اور مولانا سجادؒ کا نقطۂ نظر واضح ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ پارٹی کی بہار میں حکومت قائم ہونے سے وہاں کی اقلیت میں جہاں امید و حوصلہ پیدا ہوا، وہیں اسے برسوں سے انگریزوں کی حکومت کے قیام سے پیدا احساسِ کمتری سے نکلنے کی راہ بھی ہموار ہوئی۔

سیاست میں اخلاقی اقدار کا لحاظ:

مولانا سجادؒ سیاسی معاملات میں اصول کے پابند اور اخلاقیات کا لحاظ رکھتے تھے۔ حکومت سازی کا کام کانگریس کو کرنا چاہیے تھا، لیکن وہ چھ صوبوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد گورنر کی

طرف سے خصوصی اختیارات استعمال نہ کرنے کی یقین دہانی کی غیر ضروری شرط کے ساتھ وزارت سازی پر اڑ گئی، جب کہ پہلے سے جدید دستور کو ناقص اور قابلِ استرداد کہا جا رہا تھا، کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اعلان و فیصلہ بھی یہی تھا۔ اسے مولانا سجادؒ غلط مانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ گورنر کے شرط کو مان لینے سے جدید دستور قابلِ عمل کیسے ہوسکتا ہے؟ کانگریس کے موقف کے حساب سے متعلقہ قانون قطعی ناقابلِ عمل ہے۔ حضرت ابوالمحاسنؒ کے نقطۂ نظر کے مطابق دستور سازی کا حق ہندستان کے باشندوں کو ہے نہ کہ برطانوی پارلیمنٹ کو۔ موجودہ قانون کے خلاف جدوجہد ضروری ہے اور کانگریس یہ کر نہیں رہی تھی۔ دوسری طرف گورنر سے تنازعہ کی وجہ سے وزارت سازی کا عمل بھی رکا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں سیاسی خلا کو پر کرنے اور ملک وقوم کی خدمت کا تقاضا یہی ہے کہ صوبے میں وزارت سازی کی جائے، اس کے پیش نظر انڈیپنڈنٹ پارٹی کی سرکار بہار میں بنائی گئی ہے۔ اس موقع پر مولانا سجادؒ نے یہ بھی کہا کہ ہماری پارٹی کی دلی خواہش ہے کہ کانگریس اور گورنر میں سمجھوتا ہو جائے۔

اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ مولانا سجادؒ کے سامنے کس طرح کے اصولِ سیاست اور اخلاقیات تھے، آج کے سیاسی اخلاقی زوال میں ان کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔

جمہوریت و شورائیت کا خیال:

ایک جمہوری وشورائی نظام میں باہمی مشورے اور اجتماعی فیصلے کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس کا مولانا سجادؒ پورا خیال رکھتے تھے۔ پارٹی کی وزارت سازی سے پہلے انھوں نے مجلس عاملہ اور مجالس مقنّنہ کا اجلاس طلب کر کے پوری بحث وتمحیص کی تھی۔ مولانا سجادؒ وزارت سازی کے حق میں تھے، اجلاس میں بارہ کی رائے ان کے موافق تھی اور گیارہ کی مخالفت میں۔ تین حضرات غیر جانب دار رہے تھے۔ مولانا منّت اللہ رحمانیؒ کی رائے بھی مولانا سجادؒ کے برعکس تھی۔ اکثریت کی آراء کے مدنظر وزارت سازی کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ مولانا سجادؒ کا خیال تھا کہ سیاسی تعطل مفید نہیں ہے۔ سرکار بنا کر ملک وملت کے لیے مفید پروگراموں کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ غریب کسانوں، مزدوروں، کاریگروں اور تاجروں کے لیے مفید کام حکومت سازی کے بعد کیے جاسکتے ہیں اور ہوا بھی۔ محض دو چار ماہ کی مدت کار میں انڈیپنڈنٹ سرکار نے نسبتاً بہتر ومفید خدمات انجام دیں۔

سرکار کی کچھ اہم فوائد:

سرکاری دفاتر میں اُردو زبان جاری ہوئی، اس وقت کے قانون کی دفعہ ۱۱۲ جو کسانوں سے متعلق تھی، ترمیم کی گئی، اس سے کسانوں کو لگان کی ادائیگی میں سہولت ہوئی اور ان کو فائدہ ہوا۔

بعد کے دنوں میں کانگریس سمیت دیگر پارٹیوں نے بھی کسانوں سے متعلق پارٹی کی اس پالیسی کو اختیار کیا۔ امارتِ شرعیہ کی طرف سے پیش کردہ اوقاف کے تحفظ سے متعلق مسودہ قانون کو منظور کیا گیا، اس سے پہلے کوئی قانون نہیں بن سکا تھا۔ زرعی جائیدادوں کی طرح وقف املاک کو ٹیکس میں شامل کردیا گیا تھا۔ حضرت ابوالمحاسنؒ کی کوششوں سے سرکار نے قانون میں ترمیم کی کہ اوقاف کو ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ تعلیم گاہوں میں مذہبی تعلیم کو بھی اصولاً منظور کیا گیا، مولانا سجادؒ نے اس بات کی جدوجہد کی کہ ابتدائی تعلیم میں مسلمان بچوں کو بھی لازمی تعلیم میں شامل کیا جائے۔ مسلمانوں کے جماعتی مفاد کے خلاف کانسٹی ٹیوشن اسمبلی کی تجویز میں بھی مطلوبہ ترمیم کرائی۔

مولانا سجادؒ اور پارٹی کا اہم کام مسلمانوں کو ڈوری ایکٹ، جس کے تحت مہر لینا تک جرم قرار پاتا تھا، سے بچانا بھی ہے۔ ان کی جدوجہد سے ایکٹ میں ترمیم کرکے اس کا بندوبست کیا گیا کہ اس قانون کا اطلاق مسلمانوں پر نہیں ہوگا۔

صورتِ حال میں تبدیلی:

اس طرح کے اقدامات سے جو اثرات مرتب ہو رہے تھے ان کو دیکھتے ہوئے بہت سے افراد کی سوچ میں تبدیلی شروع ہوگئی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد گورنر جنرل اور گاندھی جی میں سمجھوتا ہوگیا اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی وزارت کی تشکیل کی اجازت دے دی۔

دیگر معاملات میں سیاسی و سماجی شعور و آگھی کا اظہار:

بہار میں مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی تشکیل اور سرکار سازی کے علاوہ بھی بہت سے امور ہیں، جن سے حضرت ابوالمحاسنؒ کی بصیرت و جرأت پر زبردست سیاسی جدوجہد اور کارناموں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت ابوالمحاسنؒ کے شائع شدہ مکتوبات، بیانات اور دیگر اقدامات سے بھی ان کی مختلف قسم کی سیاسی جہات ہمارے سامنے آتی ہیں اور ان سے آج کی تاریخ میں مسلم پہلو کو تھوڑا ہلکا کردیا جائے تو ہمارے لیے رہنمائی و روشنی کا بڑا سامان ہے۔ سیاست میں عموماً سماجی، اقتصادی اور تعلیمی مسائل بہت اہم ہوتے ہیں۔ اگر کسی کے سامنے سماجی، اقتصادی و تعلیمی مسائل کی تصویر اور معاملات کا شعور نہ ہو تو سیاسی جدوجہد زیادہ بامعنیٰ نہیں ہوسکتی ہے۔ مولانا سجادؒ میں مذہبی و دینی شعور کے ساتھ سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور قانونی شعور وفہم بھی بدرجہ اتم تھا؛ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ملک وملت کے چھوٹے چھوٹے مسئلے اور ان کے جن پہلوؤں کو عموماً رواروی میں ناقابلِ توجہ سمجھا جاتا ہے، ان پر بھی حضرت مفکرِ ملتؒ کی پوری توجہ ہوتی تھی۔ تحریک آزادی،

کانگریس میں شرکت وشمولیت، شاردا بل، دائرہ حربیہ، وراثت بل، ترک موالات، سائمن کمیشن، کمیونل ایوارڈ، فرقہ وارانہ مسائل، مسلم اوقاف، شدھی تحریک، ہندو مسلم اتحاد، زرعی انکم ٹیکس، ڈوری بل، جبری تعلیمی اسکیم، واردھا تعلیمی اسکیم، دیہات سدھار اسکیم، حکومت اسلامی کے متعلق نقطۂ نظر، جمعیۃ علماء بہار کی بنیاد وغیرہم جیسے امور ومعاملات کو جس طور سے پیش کیا گیا ہے، اس سے مولانا سجادؒ کی بیدار مغزی، سیاسی ژرف نگاہی اور بلند نگاہی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ایسا ان کے مختلف شخصیات اور اداروں کے نام خطوط سے بھی ثابت ہوتا ہے، خاص طور سے ان کے محمد علی جناح، ڈاکٹر سیّد محمود اور وائسرائے پٹنہ کے نام جو مکتوب ہیں، ان سے اور بھی سیاست پر گہری نظر وفہم کا اظہار ہوتا ہے۔ محمد علی جناح کے نام خط میں حضرت ابوالمحاسنؒ نے کئی اہم مسئلے اُٹھائے ہیں، جن میں وراثت، ترکہ کی تقسیم، اوقاف، اسلامی تہذیب، ذبیحہ گاؤ، زبان، مسلم اور اہل کتاب کے درمیان رشتہ نکاح، دو سگی بہن سے شادی پر الٰہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ، مسودہ فسخ نکاح ایکٹ، داڑھی، چوٹی، زنار، نمسکار، ترنگا جھنڈا، یونین جیک، کانگریس، مسلم لیگ میں فرق اور مقصد، تمام صوبائی اسمبلیوں اور کونسلوں، مسلم پرسنل لاء کی حفاظت کے لیے مسودہ قانون پیش کرنے، مختلف صوبائی مسائل، لوکل باڈیز کے بائیکاٹ کا مسئلہ، لوکل باڈیز بل، وقف بل، برطانوی حکومت کا منظور کردہ فیڈریشن، سول نافرمانی، گاندھی جی کا نظریہ عدم تشدد جیسے درجنوں مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر الذکر مسئلہ عدم تشدد اور پرامن جدوجہد سے متعلق کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں نے گاندھی جی سے پہلے شروع کردیا تھا۔ انھوں نے ضلع چمپارن کے کاشتکاروں کی جدوجہد اور لکھنؤ کے مدحِ صحابہ وغیرہ کی مثالیں دیتے ہوئے بتایا ہے کہ ۱۹۰۷ء میں شیخ گلاب اور شیخ عدالت نے انگریزی ظلم وناانصافی کے خلاف اور ۱۹۰۹ء میں لکھنؤ میں حکومت یوپی کے مقابلہ میں مدحِ صحابہؓ کے تصفیے میں پرامن اور عدم تشدد پر مبنی جدوجہد، جیل جانے وغیرہ کی شکل میں کی تھی۔ مکتوب میں ایک جگہ صدر لیگ کو یہ بھی لکھا ہے کہ جو سرمایہ دار لیگ میں جمع ہوگئے ہیں ان سے اور دیگر مسلمانوں کی مدد سے چار کروڑ روپے جمع کرکے صنعتی کارخانے اور فیکٹریاں کھولیں؛ تاکہ ایک طرف سرمایہ میں اضافہ ہو اور دوسری طرف تباہ ہو رہے تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کے لیے ذریعہ معاش پیدا ہوجائے۔

ڈاکٹر سیّد محمود وزیر تعلیم بہار کے نام مکتوب میں حضرت مفکرِ ملک وملتؒ نے اصلاحِ دیہات اسکیم کے مالہٗ وماعلیہ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے دیگر کئی امور ونکات پر بحث کی ہے، انھوں

نے ڈاکٹر سیّد محمود کو بتایا ہے کہ گاندھی ازم اوران کے مخصوص معتقدات کو دیہات سدھار اسکیم میں شامل کرنے کا اصل مسئلہ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ وائسرائے ہند کے نام مکتوب میں مولانا سجادؒ نے ساردا ایکٹ کے مسئلے پر قانونی اور شرعی لحاظ سے روشنی ڈالی ہے اوران کے نقطۂ نظر کو غلط بتایا ہے۔

خلاصہ اور نتائج:

غرض کہ درجنوں ایسے مسائل ہیں، جن پر حضرت ابوالمحاسنؒ نے دین وشریعت اور ملک و ملت کے مفاد کے پیشِ نظر سماج کی بہترین رہنمائی کی ہے۔ ہم آج بھی ان سے روشنی لے کر آگے بڑھ سکتے ہیں، ان کا آزادی سے پہلے ۱۹۴۰ء میں انتقال ہو گیا تھا۔

بعد میں حالات میں کئی طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں، حضرت شیخ الاسلامؒ نے آزادی کے بعد کے دنوں میں پوری جرأت وبصیرت سے ہماری رہنمائی کی ہے۔ ہم اپنے اکابر کے مجموعی فکر وعمل سے راہِ عمل اور لائحۂ عمل تیار کر کے آگے بڑھنے کا راستہ نکال سکتے ہیں، گرچہ اصل مسئلہ تہذیبی وفکری شناخت وتحفظ کا ہے، تاہم سیاسی جہات بھی اہم وسائل میں سے ہیں۔

حضرت مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے جو نقاطِ نظر مختلف حوالوں سے پیش کیے ہیں، ان کی روشنی میں حالات کے جائزے اور مطالعے کی ضرورت آج کی تاریخ میں پہلے سے سوا ہو گئی ہے۔ اس پر ایک مقالے میں بحث وگفتگو کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ قدرے تفصیلی بحث ایک اچھی خاصی کتاب کی متقاضی ہے۔ آج جس طرح بنیادی عقائد ونظریات کو سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس سے حضرت مفکرِ ملک وملت مولانا محمد سجادؒ کے افکار وخیالات اور پیش کردہ عملی نمونوں پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

مصادر ومراجع

(۱) حیاتِ سجاد، ص ۷۷

(۲) ص ۱۰۶

(۳) ص ۱۴۸

(۴) خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی منعقدہ ۱۲-۱۳ ستمبر ۱۹۳۶ء، حقیقتِ سجاد، ص ۴۱

(۵) دیکھیں حیاتِ سجاد، ص ۸۰-۸۱

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن سیّد محمد سجاد کی انفرادیت

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی
ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید المرسلین. اما بعد!

صوبہ بہار کا ضلع پٹنہ علمی و دینی اعتبار سے بڑا مرکز رہا ہے، چودہویں صدی ہجری؛ جس میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، تعلیم پائی اور خدمات انجام دی؛ بڑے مشہور علماء وصوفیا کا دور رہا ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے معاصر علماء میں علامہ سید سلمان ندوی صاحب ''سیرۃ النبی''، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب ''النبی الخاتم''، مولانا عبدالرؤف داناپوری مولف ''اصح السیر'' جیسے رجال علم تھے۔ بزرگوں میں حضرت مولانا شاہ بدرالدین قادری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد علی مونگیری قدس سرہ تھے، مولانا محمد سجاد علیہ الرحمۃ کے عہد سے پہلے مشہور محدث علامہ شوق نیموی صاحب ''آثار السنن''، علامہ شمس الحق ڈیانوی صاحب ''عون المعبود'' اور مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی تھے اور ان سے پہلے علامہ محبّ اللہ بہاری صاحب ''سلم العلوم'' و ''مسلم الثبوت'' گذرے تھے، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اردو زبان کی تین کتابیں: سیرت النبی، اصح السیر اور النبی الخاتم کے مصنفین حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے ہم عصر اور ہم وطن ہیں اور یہ تینوں کتابیں ایسی ہیں، جن کی ثانی اردو زبان میں اب تک دوسری کتابیں نہیں لکھی گئی ہیں۔ اسی معیار کی دو کتابیں حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی حکومت الٰہی اور خطبہ صدارت بھی ہیں، ان کی دیگر کتابیں، مقالات ومضامین کے مجموعے، فتاویٰ اور قضایا ہیں، یہ کتابیں ان کے علمی تفوق اور تفقہ فی الدین کی روشن مثال ہیں، خاص طور پر حکومت الٰہی اور جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس مرادآباد میں پیش کردہ خطبۂ صدارت ایسی کتابیں ہیں، جن میں اسلام کے نظام سیاست وحاکمیت سے بحث کی گئی ہے اور اس آخری کتاب کے بارے میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ یہ خطبہ صدارت سیاسیات اسلامی کی بہترین انسائکلو پیڈیا ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے، ۲۲؍سال کی عمر میں دینی علوم کے مروجہ درس سے فارغ ہوئے، انہوں نے عربی درجات کی ابتدائی کتابوں سے لے کر جامع ترمذی و دیگر کتب حدیث وتفسیر قرآن کی تعلیم دی، ۱۷؍سال تک آپ درس وتدریس سے منسلک رہے۔ پھر ۲۲؍سالوں تک قومی وملی کاموں میں مشغول ہوئے اور ۵۹؍سال کی عمر میں ۱۷؍شوال ۱۳۵۹ھ کی شام رفیق اعلیٰ سے جاملے۔ اللہ آپ پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ (آمین)

وہ اپنے اخلاق و عادات میں بے مثال تھے اور راہ طریقت میں سلسلہ نقشبندیہ کے پیرو تھے، بے نفسی ان کی خوبی تھی، تواضع ان کا سراپا تھا، صبر وتحمل، حق گوئی و بے باکی، تفکر اور دوراندیشی اور عزم وہمت ان کی شخصیت کے عناصر اربعہ تھے، انہوں نے تعلیم کے ساتھ تربیت اور نوجوان علماء ودانشوروں کی کردار سازی ومردم گری کا بڑا کام کیا اور ایسے افراد تیار کر گئے، جنہوں نے ان کے بعد آئندہ پچاس برسوں تک ان کے کاموں کو آگے بڑھایا، بلاشبہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی، ملی وسیاسی کاموں میں ان کے خلاف مخالفتوں کے طوفان برپا ہوئے، طنز وتعریض کے تیر ونشتر چلے؛ مگر ان کے پائے استقامت کو ہلا نہ سکے اور نہ ہی انہوں نے صبر وتحمل کے دامن کو چھوڑا۔

حضرات! اگر ہم غور کریں کہ ان کی زندگی کا بنیادی کام کیا تھا؟ تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا مشن ''اعلاء کلمۃ اللہ'' تھا، ''امارت شرعیہ'' کا قیام، ''جمعیۃ علماء'' کی تاسیس، ''مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی'' کی تشکیل اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں؛ مگر امت کا ایک طبقہ آج بھی تذبذب کا شکار ہے، حالانکہ ان کی فکر پر سو سال گذر چکے ہیں، مگر علم ودانش کی کمی، یا حالات کا صحیح جائزہ واندازہ نہ کرنے کی وجہ سے ابھی تک شک وارتیاب کے کانٹے دل ودماغ سے نہیں نکلے ہیں۔

حضرت مولانا محمد سجادؒ کی واضح رائے تھی کہ اس ملک کے مسلمانوں کی زندگی شریعت اسلامی کے مطابق ہونی چاہیے اور جس قدر وسعت ہو، حالات جس قدر اجازت دیں شرعی نظام کو اپنے او پر نافذ کرنا چاہیے؛ اسی لیے انہوں نے امارت شرعیہ کو قائم کیا، نظام قضاء وافتاء، بیت المال، تحفظ مسلمین، دعوت وتبلیغ، تنظیم وتعلیم کے شعبے اسی فکر کے تحت قائم ہیں اور آپس میں مربوط ہیں، امارت شرعیہ یا دیگر ملی کاموں کے لیے وہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور تنظیم کو ضروری قرار دیتے تھے، وہ اتحاد مسلک ومشرب کی بنا پر نہیں؛ بلکہ کلمہ واحدہ کی بنیاد پر چاہتے تھے۔ اسی اصول

پر امارت شرعیہ ایک امیر شریعت کی اطاعت میں سرگرم عمل ہے۔ وہ جانتے تھے کہ آپسی اتحاد ہی سے قوت نافذہ حاصل ہوتی ہے، وہ قوت نافذہ کے ظاہری امور؛ پولیس وحکومت کے منکر نہیں تھے؛ مگر وہ چاہتے تھے کہ جس قدر ممکن ہو ایسی قوت حاصل کر کے کام کرنا چاہیے۔

جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس میں حضرت مولانا محمد سجادؒ شامل تھے، ان کی فکر تھی کہ علماء کو منظم کیا جائے؛ کیوں کہ علماء کے اتحاد پر امت کا اتحاد موقوف ہے؛ اسی لیے انہوں نے ۱۹۱۷ء میں ''انجمن علماء بہار'' کے نام سے جمعیۃ علماء بہار قائم کی تھی، ان کی فکر تھی کہ پورے ملک کی سطح پر یہ قائم ہو، حضرت مولانا محمد سجادؒ خلافت تحریک میں بھی پیش پیش تھے، جب وہ خلافت کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں تھے تو ۲۳/نومبر ۱۹۱۹ء کی صبح ۱۲/اکابر علماء کرام دہلی میں درگاہ سید حسن رسول نما میں مشورہ کے لیے جمع ہوئے، جس میں جمعیۃ علماء ہند کے قیام کا مشورہ ہوا۔ ان علماء میں مولانا محمد سجادؒ کے علاوہ مفتی محمد کفایت اللہؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی تھے۔ پھر دوسرے دن ۲۴/نومبر ۱۹۱۹ء کو پچیس علماء مشورہ کے لیے جمع ہوئے اور باہمی مشورہ سے چند دنوں کے بعد ۲۸/نومبر ۱۹۱۹ء کو مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی دعوت پر جب جمعیۃ علماء ھند کا پہلا اجلاس امرتسر میں ہوا، جس میں جمعیۃ کے اراکین وذمہ داران کی تعیین ہوئی تو حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ بھی اس میں شامل تھے اور اراکین میں منتخب ہوئے، اس وقت سے وفات تک وہ نہ صرف جمعیۃ علماء ہند کے بنیادی اراکین میں شامل تھے ؛ بلکہ اس کے دل و دماغ بھی تھے، ۱۹۴۰ء میں جب اکابر علماء نے اصرار کے ساتھ ان کو جمعیۃ علماء ھند کے ناظم عمومی کی ذمہ داری دی تو چھ ماہ تک انہوں نے خدمت کی تھی، اس کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی سیاسی بصیرت زبردست تھی، وہ اس ملک کے مسلمانوں کو سیاسی طور پر لولا لنگڑا نہیں رکھنا چاہتے تھے، وہ سیاسی طاقت کا حصول ضروری سمجھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۵ء میں انگریز حکومت کی طرف سے سیاسی پارٹیاں بنانے اور انہیں الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت ملی تو مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی'' بنائی، وہی اس کے پارلیمنٹری بورڈ کے صدر تھے، ۱۹۳۷ء میں اپنی پارٹی سے مسلم امیدواروں کو الیکشن میں کھڑا کیا اور جیتنے کے بعد پہلی وزارت بھی ''بیرسٹر محمد یونس'' کی قیادت میں بنوائی، ان کی سیاسی بصیرت، لائحہ عمل اور منصوبہ پر جس قدر غور کیا جانا چاہئے تھا، وہ نہیں ہوا۔

وہ جنگ آزادی ہند کے مجاہدین میں تھے، ''ترک موالات'' کا مشہور فتویٰ انہیں کا مرتب کردہ ہے، وہ ہندوستان کی آزادی کو ضروری سمجھتے تھے اوراس کے لیے وہ ہندو مسلم اتحاد کے داعی بھی تھے؛ مگراس اتحاد میں شریعت پر آنچ نہ آنے دینا چاہتے تھے، ہندو مسلم اتحاد کے خدوخال، ان کے خطبۂ صدارت میں موجود ہیں۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ حالات کا صحیح علم رکھتے، اس کا تجزیہ کرتے، عالم اسلام اور دنیا کے مختلف ملکوں کے طریقۂ حکومت کا وہ علم رکھتے تھے، حالات کو سمجھنا، مشکلات ومسائل کے حل کے لیے دل اور دماغ کو پورے طور پر کام میں لانا، سوچنا، مشورے کرنا، نقشۂ کار تیار کرنا اور فیصلہ کے بعد بہتر تدابیر کے ساتھ میدان عمل میں خود آنا ان کی شخصیت کا امتیازی پہلو تھا، وہ دور اندیش تھے، آئندہ پچاس اور سوسال کو آگے رکھ کر سوچتے تھے، انہوں نے نظام شریعت کے لیے امارت شرعیہ کا مضبوط لائحۂ عمل پیش کیا، آج وہ نہیں ہیں؛ مگر ان کا اسوہ موجود ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کواس فکر پر غور کر کے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

تأثرات واعترافات

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ

علماء اور مشائخ کی نظر میں

ڈاکٹر مفتی اعجاز ارشد قاسمی (دہلی)

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد رحمۃ اللہ علیہ؛ بیسویں صدی میں ہندوستان کے ان گنے چنے لوگوں کی صف میں نمایاں تھے، جنہوں نے اس ملک کے مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے حوصلے کو مضبوط کیا، ان کے ذہن وفکر کو پستی اور شکست کے احساس سے باہر نکالا اور انہیں اپنے دین وایمان سے وابستہ رہنے اور ہزار سالہ اسلامی وراثت کو مضبوطی سے تھامے رہنے کا حوصلہ بخشا۔ مولانا سجاد کی شخصیت ہمہ جہت تھی، ان کا ذہن، ان کی فکر، ان کا سیاسی تدبر، مسائلِ حاضرہ پر ان کی نگاہ، مسلمانوں کے معاشی، سیاسی وسماجی مشکلات کو دور کرنے کے تئیں ان کی فکرمندی نہایت اہم اور مستحکم تھی۔ انہوں نے بغیر کسی نام ونمود اور حصولِ شہرت کے جذبے کے؛ خالص خدمت دین واسلام کے نصب العین کے تحت جو اقدامات کئے، وہ ہندوستان بالخصوص بہار کے مسلمانوں کو دین سے جوڑے رکھنے میں غیر معمولی ثابت ہوئے۔ مولانا سجاد نے اپنی ذات اور اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا اور وہ گویا اپنے آپ سے پوری طرح بے نیاز ہو گئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مسائل اور ان کی مصیبتوں کو دور کرنے کی فکر میں اپنے گھر، اپنے اہلِ خانہ اور اپنی اولاد تک کی پرواہ نہیں کی، انہیں رات دن اگر فکر ہوتی تھی تو مسلمانوں کی؛ اگر ان کے سامنے کوئی مسئلہ ہوتا تھا تو یہ کہ مسلمانوں کو کس طرح سماجی و سیاسی عزت وعظمت کی راہ پہ گامزن کیا جائے اور کیسے ان کے دین وایمان کے سرمائے کا تحفظ کیا جائے، اسی احساس کے تحت انہوں نے وقت کے کبار علمائے ہند کے ساتھ مل کر امارت شرعیہ کا خاکہ بنایا، اس کے شعبہ ہائے کار متعین کئے، مسلمانوں کو اس سے جوڑا اور اس کی افادیت کو یقینی بنایا۔ اسی طرح ہندوستان گیر سطح پر مسلمانوں کی صلاح وفلاح کے لیے جب جمعیۃ علمائے ہند کے قیام کی تحریک شروع ہوئی تو اس میں بھی پیش پیش رہے اور اپنے فکر وعمل سے

جمعیت کی بنیاد کو مضبوطی عطا کی۔

صوبۂ بہار ضلع نالندہ کے پنہسہ نامی ایک گاؤں میں آپ کی پیدائش ہوئی، یہ گاؤں اب بھی شہروں کی چہل پہل سے دور اور بازاروں کی رونق سے محروم، چھوٹی سی آبادی پر مشتمل ایک ٹھیٹھ دیہات ہے، جہاں نہ شہری تہذیب وتمدن ہے اور نہ بازاروں کی چمک دمک، گاؤں پر سر سری نظر ڈالیے، تو معلوم ہوگا کہ یہاں کے لوگ غریب، مگر ایماندار اور قانع ہیں، لوگوں کا پیشہ کاشت کاری ہے اور ہر شخص اسی میں مشغول ہے۔ آپ کے والد کا نام مولوی سید حسین بخش تھا، ماہ صفر ۱۳۰۱ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی، گھر میں خوشی منائی گئی، گاؤں والوں نے آکر مبارکباد دی، آپ کے والد نے آپ کا نام ''محمد سجادؔ'' رکھا اور کنیت ''ابوالمحاسن'' ہوئی۔ یہ معلوم نہیں کہ کنیت کس نے رکھی؛ لیکن مولانا کی عملی زندگی اور اس کی سرگرمیوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس کنیت کا انتخاب ایک الہامی معاملہ تھا اور آپ واقعتاً ''ابوالمحاسن'' تھے۔ اللہ پاک نے گوناگوں علمی و عملی خوبیوں کو آپ کی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ آپ جس میدان میں گئے اپنی انفرادیت اور ہمہ جہتی کا لوہا منوایا اور جس شعبۂ عمل سے وابستہ ہوئے اس میں نئی جان ڈال دی۔ تعلیم وتدریس سے لے کر سیاست وقیادت تک کے ہر میدان میں آپ نے مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ قدم رکھا اور اپنی ذہنی، علمی وفکری صلاحیتوں کی بدولت کامیاب وسرخرو ثابت ہوئے۔

صرف چار سال کی عمر میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد بڑے بھائی مولوی احمد سجاد نے آپ کی علمی وفکری تربیت میں ہر ممکن رہنمائی وتعاون کیا۔ مدرسہ اسعدیہ بہار شریف، دیو بند، کانپور اور الہ آباد کے مدارس سے استفادہ اور علوم وفنون کی تکمیل کی اور ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۵ء کو مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں آپ کی رسم دستار بندی ادا کی گئی۔ مختلف مدارس میں ایک کامیاب استاذ کی حیثیت سے تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد شعبان ۱۳۲۹ھ میں آپ ''گیا'' منتقل ہوگئے، جہاں آپ نے مولانا عبدالوہاب فاضل بہاریؒ کے قائم کردہ مدرسہ انوارالعلوم کو ازسرنو قائم کیا اور نہایت محنت ومشقت اور جاں فشانی کے بعد اسے ایک مرکزی تعلیم گاہ میں بدل دیا۔ آپ کا زمانۂ تدریس بہت شاندار اور مکمل طور پر کامیاب ومقبول رہا، جس مدرسہ سے بھی منسلک ہوئے، وہاں کا نقشہ بدل دیا، مولانا جس ادارے سے وابستہ ہوجاتے وہ کامیابی کی منزلوں کو طے کرنے لگتا۔ ہندوستان میں ایک سے بڑھ کر ایک اساتذہ اور فن تدریس کے ماہرین گزرے ہیں، مگر کم لوگ ایسے ہوئے ہیں، جنہیں ابتدائی زمانۂ تدریس میں ہی علمی حلقوں

میں غیر معمولی مقبولیت وشہرت حاصل ہوگئی ہو، مولانا ایسے ہی خوش نصیب لوگوں میں سے تھے، وقت کے کبار اہل علم وفضل نے درس وتدریس کی ابتدا میں ہی آپ کے علمی تبحر کو تسلیم کر لیا۔

سیاسی و سماجی میدانِ عمل میں:

ایک عرصے تک اس ادارے میں مقیم رہ کر خاموشی کے ساتھ درس وتدریس میں مشغول رہے؛ مگر اس دوران آپ کے دل دماغ میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی سیاسی وسماجی خدمت کا خاکہ تیار ہوتا رہا، اس دوران آپ نے محسوس کیا کہ مسلمان شرعی زندگی سے دور ہوتے جارہے ہیں اور ان کی رہنمائی کے لیے کوئی منظّم ادارہ نہیں ہے، بہت سے مسلمان دینی مسائل سے پوری طرح بے خبر ہیں اور انہیں اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات و ہدایات سے بھی آ گاہی نہیں ہے، شریعت نے زندگی گزارنے کے لیے جو آئین وقانون مقرر کیا ہے مسلمان اس سے پوری طرح بے خبر ہیں اور نکاح، طلاق، خلع، یتیموں کی دیکھ بھال، زکوۃ وعشر کی تقسیم، تبلیغ واشاعتِ دین اور مسلمانوں کے تحفظ وغیرہ جیسے اہم شعبوں اور مسائل میں ان کی کوئی رہبری بھی نہیں کی جارہی ہے۔ انہی حالات کے پیش نظر آپ نے اپنے ذہن میں مسلمانوں کی ایک ''شرعی تنظیم'' کا خاکہ بنایا اور یہ طے کیا کہ ملک کے نمایاں ارباب علم وفضل اور مشائخ کو جمع کر کے ان کے سامنے پوری صورت حال سامنے رکھی جائے اور آگے کا عملی نقشہ مرتب کیا جائے، چناں چہ سب سے پہلے اس مقصد کی تکمیل کے لیے ۱۹۱۷ء میں انجمن علمائے بہار قائم فرمائی، اس کے بعد مولانا نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا، قومی رہنماؤں، علما و مشائخ سے ملاقاتیں کیں، مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے خصوصی ملاقات کی، ان کے سامنے اپنے عزائم تفصیل کے ساتھ بیان کیے اور ان کے اثر ورسوخ کو سلیقے سے استعمال کیا جس کے نتیجے کے طور پر صرف ایک سال بعد خلافت کمیٹی بھی قائم ہوئی اور جمعیۃ علماء ہند کا قیام بھی عمل میں آیا۔ ان دونوں اداروں کے قیام میں مولانا کا کردار نہایت اہم تھا، یہی وجہ ہے کہ مولانا ان دونوں اداروں کے قیام کے سلسلے میں برپا کی گئی بنیادی مجلسوں میں فعال نظر آتے ہیں، پھر مولانا ہی کے ہاتھوں دوسری خلافت کمیٹی گیا میں اور تیسری پھلواری شریف میں قائم کی گئی۔ دیگر اکابر علما وفضلا سے ملاقاتیں بھی کامیاب رہیں۔ جمعیۃ علمائے ہند کے ناظمِ عمومی (اول) سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ قیامِ جمعیت کے حوالے سے مولانا سجاد کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''''مولانا مرحوم سے سب سے پہلی ملاقات خلافت کانفرنس میں ہوئی، بعض اہلِ

علم نے مشورہ کیا کہ ہندوستان کے علما کی تنظیم ہونی چاہیے؛ چنانچہ علما کی ایک مختصر اور مخصوص جماعت کا اجتماع دہلی کے مشہور بزرگ سید حسن رسول نماؒ کی درگاہ پر منعقد ہوا، اس میں تمام حضرات نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، حضرت مولانا سجاد صاحبؒ نے بھی اس جلسہ میں مختصر تقریر فرمائی تھی، اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا کے جذبات ایمانی کا ترجمان تھا، حاضرین کی تعداد اگرچہ دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی؛ لیکن کوئی آنکھ اور کوئی دل ایسا نہ تھا، جس نے اثر قبول نہ کیا ہو۔ اس جلسہ کا اثر تھا کہ جمعیۃ علمائے ہند قائم ہوئی اور اس کا پہلا اجلاس امرتسر میں خلافت کانفرنس کے ساتھ منعقد ہوا۔ اس کے پہلے اجلاس میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم شریک ہوئے اور انھوں نے اپنے خیالات کا پھر اعادہ فرمایا، اس اجلاس کے صدر حضرت مولانا عبدالباری تھے''۔(۱)

مسلمانوں کو شرعی زندگی و دستور حیات پر لانے کے لیے اور اس وقت کے ہنگامہ خیز سیاسی و معاشرتی ماحول میں اپنی مذہبی شناخت کو قائم اور برقرار رکھنے اور عائلی وسماجی مسائل میں بہ راہ راست قرآن وسنت اور اسلامی ہدایات سے مستفید ہونے کے لیے اور انہیں ایک امیر شریعت کے تحت اکٹھا کرنے کے لیے مولانا سجادؒ کی جدوجہد ملک گیر تھی۔ اس سلسلے میں جمعیت علمائے بہار کے کئی جلسے ہوئے، جون ۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالکلام آزادؔ کی صدارت میں منعقد ہوا، اس میں مولانا آزاد سبحانیؔ، مولانا سبحان اللہ خاں اور صوبہ بھر کے سو سے زاید علما نے شرکت کی، جس کے روح رواں مولانا ابوالمحاسن سجادؒ ہی تھے۔ عام مجلس کے بعد انتخاب امیر کے لیے خصوصی نشست منعقد کی گئی، اس کی صدارت مولانا آزادؔ نے کی، امارت اور اس کے متعلقات پر طویل بحثیں ہوئیں اور اتفاق رائے سے حضرت مولانا شاہ بدرالدین پھلوارویؒ کو امیر شریعت منتخب کیا گیا، جب کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا۔

اس کے بعد مولانا نے اپنے آپ کو پوری طرح امارت شرعیہ کے لیے وقف کر دیا، امارت کے قیام کے سوا تین سال بعد ہی امیر شریعت اول کی وفات ہو گئی، جس کے بعد حضرت مولانا شاہ محی الدین قادریؒ کو امیر شریعت دوم بنایا گیا اور مولانا سجاد بدستور نائب امیر شریعت رہے۔ لگ بھگ بیس سال تک آپ نے امارت شرعیہ کی تن من دھن سے خدمت کی، صوبے کے مسلمانوں کی ہر ممکن خیر خواہی اور صلاح وفلاح کے لیے جدوجہد کی، مسلمانوں کے سیاسی، سماجی و عائلی مسائل میں دینی رہنمائی کا مضبوط نظام قائم کیا، عوام کو علما سے جوڑا اور ان کے درمیان اعتماد کی

فضا قائم کی، اپنے آپ کو پوری طرح ملت اور امت کے لیے وقف کردیا۔ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے پلیٹ فارم سے امارت شرعیہ نے ۱۹۳۵ء کی انتخابی سیاست میں بھی حصہ لیا اور مختصر مدتی حکومت بھی کی۔

حضرت مولانا سجاد امارت شرعیہ ہی کے کاموں سے چمپارن کے دورے پر تھے کہ واپسی میں طبیعت خراب ہوئی، جو سنبھل نہ سکی اور ۱۸؍نومبر ۱۹۴۰ء کو اسلام اور مسلمانوں کا یہ عظیم خادم چل بسا۔

علماء و مشائخ کا حسن اعتراف:

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کی شخصیت اپنے وقت میں نہایت بلند و بالا تھی، ان کی فکر میں وسعت اور ان کے ذہن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بے پناہ قوت رکھی تھی۔ ان کا علمی سراپا بھی پرکشش تھا، وہ تدریسی زندگی میں ایک مثالی مدرس واستاذ تھے اور طلباء ان کے گرویدہ رہتے تھے، وہ اپنے زمانے کے حالات ومسائل پر بھی بصیرت مندانہ نگاہ رکھتے تھے، فقہی باریکیوں اور نکات پر ہی نہیں ہندوستانی دستور وآئین پر بھی ان کی نکتہ ورانہ نظر تھی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایسے وقت میں اس ملک کے مسلمانوں کو مجتمع کرنے کا خاکہ بنایا جب قومی یا علاقائی سطح پر ایسی کوئی بھی چھوٹی یا بڑی کوشش نہیں کی گئی تھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے نہایت دور بینی اور قابلیت کے ساتھ اپنی سوچ کو عملی جامہ بھی پہنایا اور بلا اختلاف مسلک ومشرب پہلے صوبۂ بہار کے علما کو ایک اسٹیج پر جمع کیا اور پھر قومی سطح پر اس اتحاد کے قیام میں بے مثال کردار ادا کیا۔ مولانا کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ صرف کام کرنے میں یقین رکھتے تھے، کسی بھی ناموری اور شہرت سے انہیں نفرت تھی، رات دن مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے فکرمند رہتے اور نئے نئے منصوبے بناتے، مگر جب نام اور شہرت کا مرحلہ آتا تو وہ خود پیچھے ہٹ جاتے، وہ اپنے دور میں بے نفسی اور منکسر المزاجی کی ایک روشن مثال تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی ان خصوصیات کو ان کے زمانے کے اہلِ نظر علما ومشائخ اور اہلِ بصیرت نے نہ صرف مانا بلکہ ان کی قدر بھی۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ:

امارت شرعیہ کے قیام سے قبل اس کے لیے اکابر علما کو ذہنی طور پر آمادہ وتیار کرنے کے لیے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے ایک مفصل خط تحریر فرما کر ملک بھر کے اربابِ بصیرت علما وفضلا کو بھیجا تھا، اس خط میں آپ نے امارت کی ضرورت، بہار اور ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی ومذہبی صورت حال وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کی تھی۔ بیشتر علماء نے اس خط کا مثبت جواب دیا

اوراسی کا نتیجہ تھا کہ باقاعدہ امارت شرعیہ قائم کی گئی اور امیر شریعت کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔اس خط کے جواب میں حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے مولانا محمد سجادؒ کو تحریر فرمایا:

''آپ کی حمیت اسلامی اور علو ہمتی اور دینی مستعدی سے نہایت مسرت ہوئی، آپ کی باتیں تو طبیعت کو ایسی بھائی ہیں کہ جس سے دل بے چین ہوگیا؛ مگر میری حالت نے ایسا مجبور کر رکھا ہے کہ اب میں کسی کام کا نہیں ہوں، جنون کی سی کیفیت ہے، اب بجز اس کے کہ قلب میں اس حالت کو دیکھ کر درد اور بے قراری ہو اور کچھ نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب فرمائے۔(آمین)''۔(۲)

حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ:

۱۹۲۲ء میں جمعیۃ علمائے ہند کا ایک اجلاس گیا میں منعقد ہوا، جس کی صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نے فرمائی تھی، اس سے ایک سال قبل حضرت مولانا محمد سجاد کی سربراہی میں جمعیۃ علمائے بہار کے زیر اہتمام امارت شرعیہ قائم کی جاچکی تھی، امیر شریعت بھی منتخب ہوگئے تھے اور امارت اپنے مقاصد واہداف کے حصول کی راہ میں گامزن بھی ہوچکی، حضرت مولانا عثمانی نے اس اجلاس صدارتی خطاب فرماتے ہوئے جہاں امارت شرعیہ کی ضرورت واہمیت پر فاضلانہ گفتگو فرمائی، وہیں بہار کے علما بہ طور خاص حضرت مولانا محمد سجاد اور ان کے احباب کی جم کر تحسین فرمائی، آپ نے کہا:

''علما و مشائخِ کرام بہار کا مسلمانوں پر بھاری احسان ہے کہ انھوں نے اپنے صوبے میں امارت شرعیہ قائم کرکے ایک سڑک تیار کردی ہے، ہم ان حضرات کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ دوسرے صوبوں کے علما بھی جلد از جلد صوبۂ بہار کی تقلید کریں گے''۔(۳)

اسی طرح جمعیۃ کے دہلی کے اجلاس میں جب آپ نے امارت شرعیہ کے قیام کی تجویز پیش کی، تو جس جوش وخروش کے ساتھ اس وقت کے رئیس الطائفہ حضرت شیخ الہندؒ نے اس کی تائید فرمائی اور اصرار فرمایا کہ اسی اجلاس میں امیر کا انتخاب ہوجائے، اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا سجادؒ کی رائے اور ان کی فکری بصیرت کو کس نظر سے دیکھا اور انہیں ان کی اس رائے میں کتنا وزن محسوس ہوا، جمعیۃ کے ناظم اول مولانا احمد سعید دہلویؒ تو جمعیۃ کے قیام کی وجہ بھی مولانا کی تحریک کو ہی قرار دیتے ہیں، ان کے علاوہ اس وقت کے کبار

اہل علم وفضل حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا آزاد سبحانیؒ اور دیگر اکابر علما وقائدینِ ملت کی نگاہ میں بھی مولانا سجاد کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ:

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی خود قومی سطح کے رہنما، محدث اور مرکزیت رکھنے والے عالم دین تھے، آپ کی شہرت ملک بھر میں مولانا سجادؒ سے کئی گنا زیادہ تھی؛ مگر آپ بھی مولانا کی قدر کرتے تھے، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ کی کتاب ''امارت شرعیہ: دینی جدوجہد کا روشن باب'' کے تفصیلی تعارف میں لکھا ہے:

''مجھے دارالعلوم دیوبند میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے دولت کدہ پر ۱۹۳۱ء میں پہلی بار ان (مولانا سجاد) کی زیارت اور بار بار ان کی مجلسوں اور صحبتوں میں شرکت اور یکجائی کی سعادت حاصل ہوئی، میں نے مولانا مدنی کو کسی کا ان سے زیادہ احترام کرتے ہوئے نہیں دیکھا''۔(۴)

امیر شریعت ثانی مولانا شاہ محی الدین قادریؒ:

مولاناؒ کی وفات پر امیر شریعت ثانی مولانا شاہ محی الدین قادریؒ اپنے درد انگیز تعزیتی تاثرات میں مختصراً مولانا کی بلند اخلاقی، علمی وفکری برتری، ملت کی خیر خواہی اور ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے تئیں ان کی بے مثال دردمندی، بے لوثی، سیاسی بصیرت پر نہایت بصیرت افروز کلمات تحریر فرمائے، انہوں نے لکھا:

''مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد غفر اللہ لہ ورحمہ کا حادثۂ ارتحال بے حد جاں سوز اور صبر آزما ہے، ایسی ذات جس نے دین ومذہب کی حمایت اور مسلمانوں کی اصلاح میں جان و مال اور عافیت وآرام سب کچھ لٹا دیا تھا، وہ خلوص مجسم تھے.... اخلاص کے ساتھ مولانا سجاد پیکرِ عمل اور کامل مدبر بھی تھے، مفید تحریکات پیدا کرنا، پھر اس کو عمل میں لانے کی جو صلاحیت وہ رکھتے تھے، اس صلاحیت کا آدمی اب نظر نہیں آتا''۔(۵)

علامہ سید سلیمان ندویؒ:

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان کی وفات کو ایک عظیم خسارہ قرار دیتے ہوئے لکھا:

''ان کا وجود سارے ملک کے لیے پیامِ رحمت تھا، وہی ایک چراغ تھا، جس سے

سارا گھر روشن تھا، وہ وطن کی جان اور ملت کی روح تھے، جس نے اپنا سب کچھ لٹا کر ملک وقوم کو وہ دیا، جو اس صدی میں کوئی اور نہ دے سکا''۔(٦)

ڈاکٹر سید محمود:

ڈاکٹر سید محمود؛ ہندوستانی سیاست کا ایک بڑا نام ہے، انہوں نے تحریک آزادی کے دوران کانگریس کے پلیٹ فارم سے سرگرم رول ادا کیا، پھر آزادی کے بعد لوک سبھا کے ممبر رہے اور وفاقی کابینہ میں نائب وزیر خارجہ کے طور پر اہم خدمات انجام دیں۔ انہوں نے مولانا کی وفات پر اپنے درد وکرب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''ایسا بے لوث خادم قوم آسانی سے نہیں پیدا ہوتا، مسلمانوں کو خود اپنی حالت کی خبر نہیں، جیسے افراد کی بدقسمتی ہوا کرتی ہے، ویسے ہی قوموں کی بھی بدقسمتی ہوتی ہے اور اس سے زیادہ کسی قوم کی بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ اس میں سے ایسے مخلص، جانباز مجاہد روز اٹھتے چلے جائیں۔ مولاناؒ عام علماء کی طرح محض ایک صاحبِ درس عالم نہیں تھے، تدبر اور ملکی مسئلوں کے فہم وگرفت میں وہ کسی بڑے سے بڑے سیاسی مدبر سے کم نہیں تھے، اور تو اور خالص قانونی اور دستوری موشگافیوں میں بھی ان کا دماغ اس طرح کام کرتا تھا، جیسے معمولی فقہی مسئلہ سلجھانے میں''۔(٧)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ:

دیدہ ور عالم دین اور جماعت اسلامی کی ترویج واشاعت میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے دست راست رہنے والے مولانا امین احسن اصلاحی نے مولانا سجاد بہاریؒ کی اخلاقی برتری، بے لوثی اور انکسار وتواضع وکشادہ ظرفی کا دل کھول کر اعتراف کرنے کے ساتھ مولانا کی علمی گیرائی، تدبر اور فقہی بصیرت کے بارے میں اپنی ایک تحریر میں لکھا ہے:

''مولانا نے اسلامی قانون کا نہایت اچھا مطالعہ کیا تھا، تمام حاضر الوقت مسائل میں وہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ شرعی نقطۂ نظر متعین کر لیتے تھے، ان کی نظر نہایت گہری تھی، بسا اوقات پہلی نظر میں ان کی رائے کمزور معلوم ہوتی؛ مگر ان کی تنقیحات کے بعد جب مسئلہ پوری روشنی میں آجاتا، تو ہر شخص ان کی اصابتِ رائے کی داد دیتا، پھر وہ صرف جزئیات کے مفتی نہیں تھے؛ بلکہ اسلامی نظام کو اس کے تمام اشکال وصور میں جانتے اور سمجھتے تھے اور اس کے اصولی وفروعی مسائل کی پوری معرفت رکھتے تھے، ان معاملات میں بصیرت

رکھنے والے ہندوستان میں بہت کم ہیں‘‘۔(۸)

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ:

معروف اسلامی اہل قلم اور مفکر مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ مولانا سجاد بہاریؒ سے خصوصی انس و تعلق رکھتے تھے، وہ ان کے علمی، فکری و فقہی مقام و مرتبہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

’’علومِ اسلامیہ اور مغلیہ دور کے عقلی علوم میں مولانا کو جو دسترس حاصل تھا، خلافِ معمول اس سلسلے میں ان سے میں ہمیشہ مرعوب رہا، خصوصاً فقہی جزئیات پر ان کی وسعت نظری پر ہمیشہ اعتماد کرتا تھا، اسی کے ساتھ علاوہ دماغ کے مولانا مرحوم کے سینے میں درد سے بھرا ہوا جو دل تھا اور جس سے کم ہی لوگ واقف ہوں گے، اس باب میں میں ان کا گویا ’’محرم اسرار‘‘ تھا‘‘۔(۹)

نائب امیر شریعت ثانی مولانا عبدالصمد رحمانیؒ:

نائب امیر شریعت ثانی مولانا عبدالصمد رحمانی نے ان سے متعلق ایک شعر لکھوا کر دفتر امارت شرعیہ میں آویزاں کروایا:

پھونک کر اپنے آشیانے کو
بخش دی روشنی زمانے کو

یہ شعر آج بھی وہاں لٹکا ہوا ہے اور بانیِ امارت کی بے لوث خدمات و قربانیوں کی یاد دلاتا ہے۔ بلاشبہ یہ شعر حضرت مولانا سجاد کی زندگی اور ان کی جدوجہد کی حقیقی تصویر کشی کرتا ہے، آپ نے پوری زندگی جس طرح اپنے آپ سے بے پرواہو کر امت کے مسائل کو اپنے سینے سے لگائے رکھا اور مسلمانوں کی سیاسی و سماجی مشکلات کو دور کرنے کے جتن کرتے رہے اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔

مولانا رحمانی کو مولانا سجاد سے شاگردی کا شرف حاصل تھا، الہ آباد میں بھی مولانا کی صحبت میں رہے اور جب وہاں سے مولانا گیا آ گئے اور وہاں ایک ادارہ قائم کر کے طلبا کی علمی و فکری تربیت کا آغاز کیا تو مولانا عبدالصمد رحمانی ان کے ساتھ ہی گیا آ گئے تھے، انہیں مولانا کی زندگی کے معمولات، ان کے علمی فضل و کمال اور بہ طور استاذ ان کی خوبیوں کو بہت قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملا، انہوں نے اپنے ایک مضمون میں مولانا سجادؒ کی تدریسی مہارت اور انفرادیت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا پڑھانے کا انداز اس وقت رائج طریقۂ تعلیم سے

بالکل مختلف تھا، وہ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت استاذ کا طریقۂ تعلیم افراط وتفریط سے الگ بین بین تھا، وہ طلبہ کو کتاب سے اخذِ مطلب پر زور دیتے تھے اوراس طرح ان کی قوت مطالعہ میں پختگی ہوجاتی تھی اور کتاب سے خاصی مناسبت پیدا ہوجاتی تھی..... حضرت استاذ پہلے کتاب کی تفہیم فرماتے، پھر نفس مسئلہ کی طرف رہنمائی فرماتے، اس طرح پڑھنے والے میں تحقیق، تلاش، محنت، مطالعہ کا جذبہ پیدا کردیتے تھے اور پڑھنے والے کے دماغ کی تربیت فرماتے تھے''۔(۱۰)

مولانا رحمانی نے ہی اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے کہ قرآن کریم سے مولانا سجادؒ کو بے پناہ انس اور مناسبت تھی، جب تلاوت کرنے بیٹھتے تو آیاتِ قرآنی میں تفکر وتدبر کی وجہ سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں بمشکل ایک صفحہ تلاوت کرپاتے۔ اسی طرح انہوں نے لکھا ہے کہ حدیث اور فقہ کے تعلق سے مولانا کا مطالعہ اوران کی نظر نہایت گہری تھی، وہ حدیث کو قرآن کی تشریح قرار دیتے اور فقہ کی جزئیات پر ایسی دسترس رکھتے تھے کہ کسی بھی نئے پیش آمدہ مسئلے کو ایسی خوبی اور مہارت سے حل کردیتے تھے کہ لگتا تھا کہ یہ مسئلہ پہلے سے ہی ان کے ذہن میں موجود تھا۔

مولاناسید ابوالحسن علی میاں ندویؒ:

مفکر اسلام مولانا علی میاں ندوی، مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کی خدمات جلیلہ کے بے انتہا قائل تھے، ان کی نگاہ میں ملت اسلامیہ ہند کے لیے مولانا سجاد کا مخلصانہ کردار جتنا عظیم تھا، اتنی انہیں شہرت نہیں ملی اور قوی امکان ہے کہ ایسا مولانا کی متواضع شخصیت اور خلوص وللّٰہیت کے نتیجہ میں ہوا ہو۔

مولانا علی میاں ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا (ابوالمحاسن محمد سجادؒ) کو اگرچہ علمی حلقوں میں وہ ناموری اور شہرت حاصل نہیں ہوئی، جس کے وہ مستحق تھے، لیکن میرے محدود علم میں ان کے جیسا دقیق النظر اور عمیق العلم عالم دوردور تک نہ تھا، فقہ بالخصوص اصولِ فقہ پر ان کی بڑی گہری نظر تھی، سیاست و تمدن اور تاریخ کا بھی انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، خاص طور پر قانونی ودستوری باریکیوں اور ہندوستان کے دستور اور سیاسی نظاموں سے وہ گہری دلچسپی رکھتے تھے اوران کا انھوں نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا، ان کے تکلم وخطابت اور تحریر وانشا کے حصے کی قوت و صلاحیت بھی مسلمانوں کے موجودہ حالات، مستقبل کے خطروں اور ہندوستان میں ان کے

مقام کے تعین کے مسئلہ پر صرف ہوئی تھی، وہ بدلتے ہوئے ہندوستان کو اپنی چشمِ بصیرت سے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسا کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اس وقت چشمِ بصارت سے بھی نہیں دیکھ پا رہے ہیں''۔

یقیناً مولانا سجادؒ کی شخصیت اپنے زمانے میں اس ملک کے لیے اور خاص طور پر اس ملک کے مسلمانوں کے لیے ایک گراں قدر نعمت تھی۔ آپ نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے علمی، عملی، جسمانی و مالی قربانیوں میں صرف کی اور بالآخر اسی فکر میں اس دنیا سے چل بسے۔ ضرورت ہے کہ نئی نسل ایسی عظیم محسن شخصیت کی زندگی اور قربانیوں سے نہ صرف واقفیت حاصل کرے؛ بلکہ ان کے نقش قدم پر چلنے کا عزم مصمم بھی کرے، کیوں کہ ہر قسم کی کامیابی اپنے ایسے ہی بے لوث اور جلیل القدر اسلاف کی راہوں پر چل کر حاصل کی جا سکتی ہے۔

مصادرومراجع

(۱) حیات سجاد، صفحہ: ۵۳

(۲) تاریخ امارت، ص: ۳۷

(۳) خطبۂ صدارت جمعیۃ علمائے ہند، بموقع اجلاس گیا ۱۹۲۲ء

(۴) ص: ۲۲

(۵) حیات سجاد

(۶) امارت شرعیہ دینی جدو جہد کا روشن باب، ص: ۱۱۲

(۷) محاسن سجاد، ص: ۴۶

(۸) محاسن سجاد، صفحہ: ۵۰

(۹) پیش لفظ: حقیقت سجاد

(۱۰) حیات سجاد

المفكر الإسلامى الشيخ العلامة أبو المحاسن محمد سجاد رحمه اللّٰه وإمارته الشرعية

الشيخ نور الحق القاسمى
الأستاذ بالمعهد العالى للتدريب فى القضاء والإفتاء
لمنظمة الإمارة الشرعية لولايات بيهار وأديشه وجهاركهند

فى بداية القران الرابع عشر الهجرى أنجبت الهند شخصية بارزة ذات عبقرية نادرة كثيرة الجوانب مختلفة النواحى متعددة الإهتمامات وهى شخصية العلامة أبى المحاسن محمد سجاد رحمه اللّٰه، الذى كان له يد طولى فى جميع العلوم الإسلامية وخاصة فى الفقه والفتاوىٰ والتاريخ والأدب والمنطق والفلسفة وهو الذى تم على يده المباركة تأسيس منظمة الإمارة الشرعية فى ولايات الهند الثلاث -بيهار وأديشه وجهاركهند -وهى تجربة من نوع فريد وخدمة مثالية لإبراز الحياة الإسلامية الإجتماعية وتطبيق الأحكام الشرعية على المجتمع الإسلامى فى دولة غير إسلامية ومثال لجميع الأقليات المسلمة التى تعيش فى دولة غير إسلامية.

تعد مدينة بتنا عاصمة ولاية بيهار من المدن القدمية الشهرية فى الهند إنها لم تزل تتمتع بالمركزية فى كل دور فى أدوار التاريخ فكانت العلم والأدب والسياسة فى عهد الملوك الهندوس وفى ؤأيام السلاطين المسلمين كذلك، فنبغ فيها كثير من الرجال فى كل فن من الفنون والعلوم الشرقية ولمؤلفاتهم أهمية خاصة وكانت مدينة بيهار شريف قصبة من مديرية بتنا سميت تلك الولاية باسمها، وهذه القصبة (قصبة بيهار شريف)تشرفت بكونها سكنا للعالم الربانى الكبير الشيخ شرف الدين يحیٰ المنيرى رحمه اللّٰه الشهير بالمخدوم البيهارى.

إن منطقة بيهار شريف منطقة خصبة ذات أهمية تاريخية كثيرة تبغ فيها كثير من العماء والصلحاء والأقطاب والأعلام وخاصة فى العهد الأخير :أمثال

العلامة أبو المحاسن محمد سجاد والعلامة السيد سليمان الندوى والعلامة السيد مناظر أحسن الكيلانى(رحمهم اللّٰه).

على بعد أميال من هذه القصبة محل يسمى"راجكير"جعلها المخدوم البيهارى مركزاً لعبادته ورياضته وعلى الشارع الذى يتجه من بيهار شريف إلى راجكير تقع قرية "بَنُهَسَّا" على بعد ستة أميال من بيهار شريف إلى الجانب الغربى من هذا الشارع وهى قرية صغيرة بعيدة كل البعد عن عمران المدينة وزحتمها وصخب الأسواق، ومهنة أهلها الزراعة.

ولد الشيخ محمد سجاد فى تلك القرية فى بيت المولوى حسين بخش الذى كان رجلا تقيا ومن وجهاء القرية ومالكا للأراضى، كان تلقى العلوم العربية ولكنه لم يتفق له أن يكمل الدراسة العربية والدينية فاشتغل بالتدريس مدة من الزمان ثم، انتقل إلى الزراعة التى كانت مهنة آبائه إلى أن لحق رفيقه الأعلٰى، وكان حسن الخلق، كريم النفس، متواضعا للّٰه، مكرما للضيوف، جواداً سخياً فكان الذاهبون إلى راجكير والراجعون عنها يمكثون فى بيته يوماً على الأقل.

ولد الشيخ محمد سجاد فى مطلع القرن الرابع عشر الهجرى فى شهر صفر المظفر عام ١٣٠١ه الموافق عام ١٨٨١م، سماه أبوه محمد سجاد واشتهر بكنيته أبى المحاسن ولما بلغ من عمره أربع سنوات توفى أبوه حسين بخش فأصبح يتيما فأحاطته العناية الإلٰهية وانتقل إلى رعاية شقيقه الأكبر المولوى أحمد سجاد، بدأ الشيخ حياته العلمية فى قريته التى ولد فيها، ثم التحق بالمدرسة الإسلامية بيهار شريف التى تقع على بعد ستة أميال من بيته فى عام ١٣١٠ه وكان مؤسس المدرسة ومديرها آنذاك الشيخ الحافظ السيد وحيد الحق الأستهانوى رحمه اللّٰه وكانت بينهما قرابة مصاهرة حيث كان الشيخ وحيد الحق زوج ابنة عمه، كماتم فيما بعد زواج ابنة الشيخ بالشيخ محمد سجاد، ولما استكمل تلقى العلوم بتلك المدرسة عن شيوخها رحل فى طلب العلم فكانت أول مدينة رحل إليها هى مدينة كانفور ولاية اترابراديش، وكان قد بلغ من عمره حوالى ١٤/عاماً، وتلمذ على

أساتـذتها وخاصة دخل فى حلقة درس الشيخ أحمد الشيخ الكانفورى رحمه اللّٰـه، ثـم سـافـر إلـى أزهـر الهـند دارالعلوم ديوبند ومكث بها مدة لا بأس بها واستفاد من علمائها الكبار، وأخيرا التحق بالمدرسة السبحانية بإلٰه آباد ولاية اتـرابـراديـش لأخـذ الـدراسة العليا فى علم الحديث والتفسير والفقه والعلوم الـعـقـلية واستـفـاد مـن الشيـخ الكبير عبدالكافى رحمه اللّٰه واستكمل معرفة معظم العلوم الشرعية فيها وتخرج منها عام ١٣٢٢ھ وأعطى شهادة الفراغ من الـعـلـوم الشـرعية والـعـلـوم الـعـقـلية فى حفلة توزيع الأسناد قامت المدرسة السبحانية بعقدها فى ١٧. إلى ١٩/ربيع الأولٰى١٣٢٢ھ.

الشيخ محمد سجاد فى مجال التدريس:

ثـم عـاد رحـمـه اللّٰـه إلى بلده بعد أن استوعب كل العلوم التى رحل فى طـلبهـا وتـمهـر فيهـا واستـقبـلـه أستـاذه الشيـخ وحيـد الحق، وأكرمه وأنزله بـالـمـدرسة الإسـلامية التى كان تدرس فيها وجعله استاذها وقصده الطلبة من كـل أنهـاء الـولاية وطـار صيتـه ودرّس بهـا ثلاث سنوات وازدهرت المدرسة كثيرا فى عهده.

ثـم طـلبـه أستـاذه الـكبيـر الشيـخ عبـدالـكـافى رحمه اللّٰه إلى المدرسة السبـحانية بإلٰه آباد التى كان تخرج منها وعينه فيها مدرسا ومفتيا وذلک فى عام ١٣٢٥ھ، فدرس فيها وأفتى إلى عام ١٣٢٩ھ، وكان ممن تلمذ عليه هناک فـضيـلة الشيـخ الـفـقيـه الأستـاذ عبـدالـصـمـد الرحمانى رحمه اللّٰه، صاحب التصانيف الكثيرة الشهيرة ونائب أمير الشريعة الثانى الأسبق للإمارة الشرعية فـاشتهـر هـنـاک درسـه وطـار صيته إلى أن قصده الطلاب من جميع المناطق الـمـجـاورـة ومـدارسها وغادر كثير من الطلاب من كانفور إلى إلٰه آباد مع أنه كان هناک كبار العلماء والأساتذه الفضلاء وكان من أولئک الطلاب الشيخ الـكبيـر عبـدالـحـكيـم الـمـغـفـور لـه الذى أصبح مديرًا لمدرسة أنوارالعلوم بمدينة''غيا''فيما بعد.

وكان عهد تدريسه النهائى فى مدينة''غيا''ولاية بيهار فقام بإنشاء مدرسة فيهـا بـاسم ''مدرسة أنوارالعلوم''وجعله مركزاً لجهوده وجهاده، غادر فضيلته

من الـمدرسة السبحانية بإلٰه آباد إلى مدينة غيا ولاية بيهار فى شعبان ١٣٢٩هـ للإقامة فيها مستقلا فارتحل معه كثير من طلاب ولاية بيهار الذين كانوا يتدرسون هناك وذلك لصلتهم بالشيخ وشهرته العلمية، وكان الشيخ الكبير عبدالوهاب البيهارى رحمه اللّٰه أنشأ فى مدينة غيا مدرسة دينية باسم"مدرسة أنوارالعلوم"ولكنها كانت توقفت وانتهت بسبب مفارقته إياها، فقام الشيخ محمد سجاد رحمه اللّٰه بإنشائها ثانيا، فأصبحت هذه المدرسة مدرسة مثالية ومركز العلوم الإسلامية والعربية فى ولاية بيهار فى مدة قصيرة، بدأ يدرس أولا فى منزل مستاجر، ثم لما وقفت سيدة مسلمة أراضيها لبناء المدرسة وتم إنشاء المبانى فيها انتقلت المدرسة إليها.

وقد واجه الشيخ صعوبات كبيرة فى سبيل إنشاء المدرسة فى مدينة غيا وتطويرها، وخاصة عندما كانت المدرسة تسير فى منزل مستاجر، وكذلك الطلاب الذى جاؤا مع الشيخ من إلٰه آباد. يعتبر من أهم حوائج المدرسة توفير الغذاء والسكن للطلاب الفقراء، فكان يشكو قلة الوسائل والإمكانيات المادية ولذلك ماكان يستطيع أن يوفر لهم الغذاء والحوائج الأخرىٰ على وجه حسن ولكنه كان قوى العزم، عظيم الهمة، كثيرالصبر، فلم تعرقل مسيرته الصعوبات والمحن والشدائد ولم تمنعه من المضى فى سبيل مراده وتحقيق أهدافه فأثمرت جهوده المخلصة ونجح فى مسعاه وبعد إنشاء مبنى كبير للمدرسة توفرت للطلاب سبل الراحة فى الإقامة والدراسة والمطالعة والغذاء ولاتزال هذه المدرسة تجدد ذكرى مؤسسها العظيم غير أنها ليست على المستوى الرفيع الذى كانت عليه فى عهد الشيخ المغفور له.

وكانت شخصية الشيخ محترمة محبوبة بين الطلاب والأساتذة فى زمن الدراسة بفرط ذكائه وشغفه إلى التعليم وجهده فى الدراسة والمطالعة ومواهبه العلمية ولذلك قام أساتذته الكبار بجعله مدرسا فى مدرستهم ومارس مهنة التدريس حوالى سبعة عشر عاما وكان عهد تدريسه ناجحا للغاية، فأى مدرسة شرفها بقدومه الميمون ازدهرت فى مدة قصيرة، وكان وصوله إليها ضمانا لرقبها.

سلوكه مع الطلاب:

وكان سلوكه مع الطلاب سلوك الأب الرحيم والمربى الناصح الحكيم، فمن خصائص الأستاذ والمربى الناصح أن لا تكون صلته بالطلاب رسمية فحسب، وأن لا يكتفى بالتدريس فى الأوقات المحدودة بل يجب أن يكون دائم التفكير فى إيقاظ مواهب الطلبة ورفع مستواهم العلمى والاهتمام بشئونهم التعليمية والتربوية، فكان مدرسا ناجحا بارعا ومربيا عطوفا حكيما بمعنى الكلمة، فكان يدرسهم خارج الأوقات المحدودة كما كان يعنى بجميع شئونهم ويقوم بمساعدة المحتاجين منهم وعيادة المرضى، فكان يذهب بهم إلى الطبيب ويسقيهم الدواء بنفسه كصديق ورفيق، ولذلك كان إقبال الطلاب عليه كثيرا وحبهم له زائداً، فكانوا يؤثرونه على أنفسهم ويتهافتون عليه تهافت الظمآن على الماء والفراش على النور واعترف كثير من تلامذته بشفقته عليهم وحسن سلوكه معهم، يقول تلميذه الرشيد الشيخ عبد الصمد الرحامى رحمه اللّٰه: فكان كلما عطلت المدرسة لسبب من الأسباب لأسبوع أو أسبوعين فكان ينتخب عدداً وجيها من طلاب العربية الذين لا يحب الشيخ انقطاع دراستهم فيذهب بهم إلى منزله فى قريته ويدرسهم هناك فى أيام العطلة ويقوم بضيافتهم جميعا.

فحياة فضيلته نموذج صالح للأساتذة والمدرسين اليوم فى المدارس والمعاهد الذين يعكفون على تربية نش ء اليوم وعدة المستقبل فعليهم أن يتعظوا بحياته.

مكانته العلمية:

وكان سماحته ماهرا بارعا فى جميع العلوم النقلية والعقلية وبناءً على رسوخه فى جميع العلوم الإسلامية والعربية كان يلقب بجامع العلوم وخاصة فى الفقه وأصوله كان له نظر ثاقب وبراعة كاملة كما كانت له يد طولىٰ فى البلاغة والمعانى والأدب العربى، يقول تلميذه الشيخ عبدالصمد الرحمانى:وأتذكر هناك قصة وهى أن قاضيا جاء لزيارة مدرسة داراكنج التى أنشأها الشيخ بجوار المسجد الملكى الواسع العظيم الذى كان يقع على

ضفة النهر وكان يريد أن يجعلها معهدا مهينا مع العناية بالتعليم الدينى واطلع الشيخ على مجيء القاضى قبل عشرين دقيقة وحيث أن ذلک القاضى كان ذا علم وكان له ذوق خاص بالأدب العربى كتب الشيخ قصيدة بليغة فى مدحه ارتجالا فتأثر بها القاضى كثيرا.

شغفه بالقرآن العظيم:

وكان الشيخ ذا علاقة قوية وشغف زائد بالقرآن الكريم وكان يقول لى أحياناً: إنى إذا جلست لتلاوة القرآن الكريم فلا استطيع أن أتلو أكثر من صفحة فى نحو ساعة، حتى يظهر لى أثناء التلاوة بلاغة القرآن الكريم وعمقه وأحكامه، ثم أسرارالأحكام وحكمها وروحها ومناطها، ثم فروعها التى تأتى تحت المناط، ثم التفاوت بينها ولا أزال أفكر فى هذه الأشياء حتى تستغرق كثيرا من الوقت آية أو آيتان.

وقال لى مرة: إنه عند ما نادى بعض الناس بإثبات كل مسئلة من القرآن الكريم فحينذاک كان ينتقل ذهنى عند التلاوة إلى مأخذ الجزئيات الفقهية والفروع الإسلامية فكان من فضل اللّٰه علىّ بعد مطالعة القرآن الكريم أياما أننى كلما توجهت إلى إثبات المسائل الفرعية لباب من أبواب الفقه فكان الفضل الإلٰهى يرافقنى ويرشد إلى مأخذها من القرآن الكريم وذلک فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء.

وبمناسبة مشروع زراعى عندما طرحت مسألة للبحث والمناقشة فى مجلس النواب أنه لا يجوز فرض الضريبة الزراعية على الأوقاف فسألت (السائل الشيخ عبدالصمد الرحمانى) عن مأخذ ذلک فى القرآن الكريم، فأجاب قائلاً: ان مأخذه الآية الكريمة﴿فمن بدله بعد ما سمعه فإنما إثمه على الذين يبدلونه إن اللّٰه سميع عليم﴾(البقرة: ١٨١)وذلک لأنه لما لم يجزأى نوع من التغيير والتبديل فى الوصية التى تكون فى مرض الموت لوجه اللّٰه تعالىٰ فلا يجوز ذلک فى الوقف بطريق أولى، حيث أنه يوقف فى سبيل اللّٰه فى حالة الصحة والطمانينة وعلى هذا الأصل تبتنى الضابطة الفقية: شرط الواقف كنص الشارع. (حاشية ردالمحتار، كتاب الوقف: ٦٤٩/٦)

وكان الشيخ أية فى الذكاء حيث كان يشير فى أحاديثه إلى بعض النكت الدقيقة التى تدعو إلى الإستعجاب، فقال لى مرة:إن جماعة المغضوب عليهم والضالين التى أريد بها اليهود والنصارىٰ هى أخطر وأضل من الكفار وعبدة الأصنام والأوثان من بعض النواحى ولذلك أمر المسلمون بالتبرىء عنهم والتجنب عن طريقهم فى سورة الفاتحة التى يقرؤنها فى الصلوات الخمس والوتر والسنن الراتبة ٣٢/مرة فى كل يوم، وذلك لأن فطرتهم الجماعية فى نظر القرآن الكريم هى أنهم فقدوا استعدادهم لقبول الحق لتمردهم وطغيانهم، حيث يقول القرآن الكريم﴿ولن ترضى عنك اليهود والنصارىٰ حتى تتبع ملتهم﴾(البقرة: ١٢٠)، وأما نظرية القرآن الكريم عن المشركين فتكشفها الآية الكريمة﴿ودوا لو تدهن فيدهنون﴾(القلم:٩١).

وقلت له مرة:إن العلامة الزمخشرى أخطأ فى تلاوة الآية الكريمة ﴿فإن زللتم من بعد ما جاء تكم البينات فاعلموا ان اللّٰه عزيز حكيم﴾(البقرة: ٢٠٩)فقرأ:"غفور رحيم"مكان﴿عزيز حكيم﴾فلما سمعه البدوى قال:لا يمكن أن يكون ذلك من كلام اللّٰه تعالىٰ.

وذكر الزمخشرى سبب ذلك أن أرباب العقل والفكر لايذكرون الرحم والمغفرة بعد الزلة لأن ذلك يدفعه إلى الإجتراء على الجريمة والمعصية مع أنه ذكر الرحم والمغفرة فى القرآن الكريم بعد عصيان العصاة والمخطئين فنبهنى الشيخ قائلاً:إن سبب إنكار البدوى لم يكن ماذكره الزمخشرى بل هو كلمة ﴿فاعلموا﴾الذى ينافى ذكر الرحم والمغفرة فى هذا المقام.

نظريته عن الأحاديث:

وكانت نظرية الشيخ عن الأحاديث عالية جدا فكان يقول:إن كل حديث تفسير لآية من آيات القرآن الكريم وكذلك كل حديث دليل قوى على أن التبيين والتفسير والشرح الذى صدر من النبى الكريم صلى اللّٰه عليه وسلم للآيات القرآنية، وجدالإشارة إليه فى نفس ألفاظ القرآن الكريم كما أن الفقهاء والمجتهدين يجدون فى الآيات المنصوصة إشارات إلى أساس الحكم، ثم يجعلونها مبنى لقياساتهم ويستخرجون منها الأحكام الفرعية

ولـذلک کـان يرى الشيخ واجبا على أساتذة الحديث أن يوضحوا علاقة كل حـديـث بـالـقـرآن الـكريم أمام الطلاب كما كان يؤكد على مدرسى الفقه أن يـوضـحـوا عند ذكر كل نوع من المسائل الفقهية ما ثبت بالقرآن الكريم أولا ثـم مـاثبـت بـالأحـاديـث ثانيا ثم ماقام به الفقهاء المجتهدون من الخدمات فى استنباط الأحكام من النصوص الشرعية ثالثا.

مكانته فى الفقه:

والـجـديـر بـالذكر أن أصول الجمع والتطبيق كما تستخدم فى اختلاف الأحـاديـث فيحمل ما يوجد من الخلاف فى الأحاديث على اختلاف الأحوال ومـقـتـضـيـات البيـئـات أو عـلـى اختـلاف الـمدارج أعنى الإبـاحة والرخصة والعزيمة كذلک كان الشيخ يستخدم تلک الأصول فى باب الفقه وبذلک كـان يـجمع بين مختلف أقوال الفقهاء فكان يحمل اختلاف الإمام الأعظم مع صـاحبيـه وكـذلک اختـلاف غيـره مـن الأئـمة كـالشافعى وغيره وخاصة فى الـمعاملات على مقتضيات البيئة وغيرها من الأسباب وكان يقول: إن الأحكام التـى اختـلفت بسبب الجهات المختلفة لا اختلاف فيها من حيث الواقع وبناء عـلـى هـذه الـنـظرية كان يقول: إنه لا بد للمفتى أن يطالع باب الاستصلاح من كتاب الإمام الغزالى رحمه الله "المستصفى" حتى يتمكن من الإفتاء على وجه البصيرة فى الحوادث الجارية الآتية.

وبـنـاء عـلـى هـذه الـخصائص والميزات كان الشيخ يظهر رايه الصائب السـديـد فـى الـمسـائل التى تظهر فى صور حديثة لأسباب ارتقائية وكنا نشعر أنـه ۹ كـان قـد تـوصـل إليهـا بـالإمـعـان والتـفـكير السابق بعد النظر فى جميع أشباهها ونظائرها.

مـرة عـرض عـلى بساط البحث فى اللجنة الإدارية لجمعية علماء الهند مسألة وهـى أن الـقـرار الذى يصدر فى الشئون الإدارية بكثرة الرأى أو برأى رئيـــس الـلـجـنة هـل يـوجـد لـذلک نـظيــر فــى عهـد الـرسـالة أو الخلافة الـراشـدة؟ فأجاب الشيخ على الفور قائلا: إن نظير ذلک هو اللجنة التى ألفها الخليفة الراشد الثانى عمر بن الخطاب رضى الله عنه لانتخاب الخليفة الثالث

فكان قد صرح أن هذه اللجنة لو انقسمت نصفين فينتخب الخليفة من الجانب الذى يكون فيه عبد الرحمن بن عوف رضى اللّٰه عنه (رئيس اللجنة) وإلا فيعمل على كثرة الرأى.

وإننى اعتقد أن الميزة الكبرىٰ للشيخ محمد سجاد التى كانت تميزه عن أقرانه هو التفقه فى الدين والرسوخ فى العلم، وعندما كان يغادر المدرسة السبحانية بإلٰه آباد إلى مدينة غيا ولاية بيهار كانت جماعة من أهل العلم وأعيان المدينة موجودة فى المحطة لتوديعه وكان كل واحد منهم يقول: إن الفقه يرتحل اليوم من إلٰه آباد". (حياة السجاد، ص: ٣١ ـ ٣٢)

الخطابة:

كان الشيخ إلى جانب كونه مدرسا ناجحا ومربيا عبقريا، خطيبا بارعا كذلک وبالرغم من أن فى لسانه كان عقدة ولكنه كان يقدر على التعبير عما فى ضميره من الأفكار والآراء بصراحة ووضوح، فكان يشارک فى الإجتماعات الدينية وحفلات السيرة النبوية ويرأس الإحتفالات على إصرار مسئوليها، سمعت أحدا من المستفدين منه من سكان منطقته وهو الشيخ الحكيم عبدالجبار خان رحمه اللّٰه وكان من خريجى المدرسة العزيزة ببيهار شريف: إن الشيخ كان يدعى فى اجتماعات السيرة النبوية وكان لا يرأس الإحتفال كما هى العادة اليوم أن يأتى رئيس الحفلة فى نهاية البرنامج ويلقى كلمته ثم يعلن بانتهاء الحفلة؛ بل كان يجلس على المنصة من بداية البرنامج ويستمع إلى أحاديث جميع الخطباء وكان هو يتحدث فى نهاية الحفل بالتفصيل، فكان يعد حديثه خلاصة الحفلة وكان يشجع فى كلمة الرئاسة الخطباء البارزين كما كان ينبّههم على أخطائهم، فكان يقول: إن القصة الفلانية التى ذكرها الخطيب الفلانى ليست ثابتة وإن الرواية التى ذكرها العالم الفلانى ضعيفة أو منكرة مثل ذلک كان يتناول البرنامج كله بالنقد والتعليق.

مآثره العلمية والفقهية:

وكان له ذوق سليم للكتابة والبحث والتحقيق فنشرت مقالاته وبحوثه

العلمية والفقهية والمواد الإصلاحية الهامة وخطبه ومواعظه فى أوقات مختلفة فى الصحف والمجلات والجرائد كجرية الإمارة وصحيفة"نقيب"الصادرة من الإمارة الشرعية كلسان حالها، وكذلك صحيفة "الجمعية"الصادرة من جمعية علماء الهند وغيرها من الجرائد والمجلات المؤقرة فى الهند وهذه البحوث والمقالات والخطب والمواعظ تنطق بعظمة صاحبها ومكانته العلمية الرفيعة والواقع أن الشخصيات البارزة التى يخلقها اللّٰه تعالىٰ للقيام بأعمال جليلة وخدمات دينية عظيمة يودع فيهم المواهب العظيمة والمؤهلات الفائقة المتنوعة فقد عمل الشيخ مفتيا وقاضيا فى الإمارة الشرعية، قام بفصل خصومات عديدة هامة مرفوعة إلى دارالقضاء المركزية للإمارة الشرعية وحكمه فى تلك الخصومات محفوظ كنموذج فى دارالقضاء يستفيد منه القضاة والعاملون فى دارالقضاء والإفتاء، قام سماحة الشيخ مجاهدالإسلام القاسمى رحمه اللّٰه رئيس هيئة القضاء السابق بالإمارة الشرعية بنشر بعضها فى مجلته الفقية"بحث ونظر"ثم طبعت فى صورة كتاب من الإمارة الشرعية، كما أن مجموعة من فتاواه نشرت قبل عشرين عاما فى مجلد ضخم من جانب الإمارة الشرعية وهو مجلد أول من فتاوىٰ الإمارة الشرعية التى يجرى عملية ترتيبها وقد طبع منها حتى الآن خمس مجلدات وهى مرجع فقهى ثمين لرجال الإفتاء من العامة والخاصة علق على المجلد الأول منها وقدم له سماحة الشيخ مجاهد الإسلام القاسمى رحمه اللّٰه مؤسس مجمع الفقه الإسلامى بالهند الذى زاد من قيمة الكتاب وكان الشيخ محمد سجاد رحمه اللّٰه أقام دارالإفتاء فى مدرسة أنوار العلوم بمدينة غيا التى كان هو مؤسسها وظل يكتب الفتاوىٰ ويجيب عن الإستفتاء ات إلى سنوات عديدة، كما أدى مسئولية كتابة الفتاوىٰ فى المدرسة السبحانية بإلٰه آباد مع التدريس والأسف أنه لم يبق من فتاواه محفوظا إلا الفتاوىٰ التى كان مكتوبة مسجلة فى سجل دارالإفتاء التابعة للإمارة الشرعية.

وله كتاب قيم صغير الحجم كبير القيمة باسم"حكومة إلٰهى"ذكر فيها خصائص الحكومة الشرعية الإلٰهية وكون اللّٰه تبارك وتعالىٰ مصدرا وحيدا للتشريع والقانون وكون الإنبياء عليهم السلام وسلية وحيدة للإطلاع على

القوانين الإلٰهية ويشتمل هذ الكتاب على ١٣٦/صفحة من القطع الصغير، وله بحث قيم على موضوع السياسة الإسلامية كتبه بمناسبة مؤتمر لجمعية علماء الهند المنعقد فى مدينة مرادآباد كخطبة الرئاسة وهى خطبة مؤثرة قوية ذات أهمية تاريخية بل هو كتاب مستقل يشتمل على أكثر من مأة صفحة ويشهد بعبقرية صاحبه وبصيرته السياسة علق على هذه الخطبة بعض الصحف الصادرة آنذاک مثل صحيفة''زميندار''و''انقلاب''تعليقا بليغا فكتبت أنه كان من الصعب للمشاركين فى المؤتمر، نظرا إلى صورته وبساطته فى الملبس والظاهر التقدير بمكانته العلمية الرفيعة ودقة نظره ورسوخه فى السياسة الإسلامية والسياسة العصرية معا ولاشک فإن خطبته موسوعة السياسة الإسلامية.

وكذلک انتقد الشيخ بين آونة وأخرى ضد مشروع قانونى للحكومة ورتب المسودات القانونية لمنع الحكومة عن التدخل فى قوانين الشريعة الإسلامية للحصول على الموافقة عليها من الحكومة.

مجموعة سبعة كتب للشيخ محمد سجاد:

وبمناسبة مؤتمر الشيخ محمد سجاد الذى قامت الإمارة الشرعية بعقده فى ٢٠-٢١/ابريل ١٩٩٩م الموافق محرم ١٤٢٠ھ (أعنى قبل الآن بعشرين عاما) نشرت مجموعة من كتبه وبحوثه ومقالاته باسم''سلسلة مآثر سجاد'' وكان من هدف هذا المؤتمر تجديد ذكرى مؤسس الإمارة الشرعية ومآثره وتقديم تراثه العلمى والفكرى أمام العلماء وأهل الفكر والنظر والجيل الحاضر ليجعلوه قدوة لهم ويستفيدوا منه فى هذا العصر الرهيب وهذه المجموعة تشتمل على سبعة كتب ورسائل للشيخ محمد سجاد، الأول: حكومت إلٰهى (الحكومة الإلٰهية) الذى سبق ذكره، والثانى:خطبۂ صدارت (خطبة الرئاسة) كانت جمعية علماء الهند عقدت مؤتمرا سنويا فى مدينة مرادآباد ولاية اترابراديش فى ١٢/جمادى الأخرى عام ١٣٤٣ھ تحت رئاسة الشيخ محمد سجاد رحمه اللّٰه وقد سبق ذكره آنفا، والثالث:مقالات سجاد، مجموعة مقالاته السياسة والإصلاحية، والرابع:قضايا سجاد، مجموعة

الأقـضية التـى قـضـى فيهـا الشيـخ محمد سجاد فى المنازعات المرفوعة إلى دار الـقـضـاء المركزية للإمارة الشرعية، والخامس: مكاتيب سجاد، مجموعة الـرسـائـل التى بعث بها إلى كبار العلماء والمشائخ والمسئولين عن الحكومة أو رد عـلـى رسـائـلـهـم، والسـادس: إمـارت شرعية شبهات وجوابات، رد فيه الشيـخ عـن الشبهـات التـى أثـارهـا بـعـض الـعـلـماء أنه لا يمكن إقامة الإمارة الشرعية والنظام الإسلامى بدون السلطة والقوة القاهرة وأجاب أن المسلمين مـلـتـزمـون بـأحـكـام الإسـلام أيـنما كانوا حسب استطاعهم كما ذكر العلماء والـمـفسـرون والفقهاء، والسابع: قانونى مسودے. كان الشيخ انتقد بين آونة وأخـرى ضـد مشـروع قـانـونـى لـلـحـكومة ورتب المسودات القانونية لمنع الـحـكومة عن التدخل فى قوانين الشريعة الإسلامية وللحصول على الموافقة عليها من الحكومة وأوضح فى رسالة أن فرض الضريبة الزراعية على الأوقاف مـن الـحـكـومة تـدخـل فـى الدين وفيه مسودة للشيخ لنظارة الأمور الشرعية وطـالـب فيهـا الشيـخ مـن الـحـكـومة أن تقوم بإنشاء هيئة تشرف على شئون الـمـسـلـميـن الـدينية والتعليم والتربية وتعمل للحفاظ على قوانينهم الشرعية ويـكـون فيهـا حاكم ذا سلطة يقوم بنصب القضاة لفصل خصومات المسلمين طبق الشريعة الإسلامية ويحافظ على جميع مصالحم.

والـحـاجة ماسة إلى ترتيب بحوثه ومقالاته ورسائله الأخرى التى نشرت فى الصحف والجرائد والمجلات فى صورة كتب فى مجلدات.

الشيخ محمد سجاد فى مجال السياسة والقيادة:

والـمـرحـلة الثالثة من حياته تتعلق بالسياسة والقيادة وهذه المرحلة تبتدى بعد ما بلغ من عمره أربعين عاما إلى آخر حياته وهى ذات أهمية خاصة تمتد إلى حـوالـى عشـرين عاما ومن حسن المصادفة أنه دخل فى مجال السياسة والقيادة بـعـد مـا بـلـغ أشـده وبـلـغ أربـعيـن سنة بعد ما مارس مهنة التدريس وقام بتربية الشبـاب والـطـلاب حـوالـى عشرين سنة بعد ما رسخ فى علمه ونضجت فكرته وتـوسـعـت تـجـاربه وأصبح ذا نظر واسع عميق على الأحوال الدولية والعالمية والسيـاسة الـمـعـاصـرـة التـى لا بد منها للرواد والقواد المخلصين ويرى علماء

النفس أن دخول المرأ فى مجال القيادة قبل تجاوزه أربعين عاما لايلائم، جملة القول:أنه دخل فى مجال القيادة والإصلاح الإجتماعى عندما اجتمعت فيه جميع المؤهلات المطلوبة فى هذا المجال.

وكان سبب دخوله فى القيادة والسياسة منقطعا عن التدريس والتعليم والأشغال الأخرى كما ذكر بعض كتاب سوانحه، أنه عندما كان مدرسا فى المدرسة السبحانية بإله آباد كان رجل يأتيه لتعلم الرياضة والمعقولات وكان يجيد الإنجليزية فكان يأتى بالصحف الإنجليزية ويقرأها على الشيخ فيطلع بذلك على أحوال العالم الإسلامى وماكان يواجهه من الخلاف والفرقة والتدهور والمشاكل والأزمات فكان ذهنه وقلبه يتألم بذلك ويتوجع وهو الذى كان سببا لتغيير مجرى حياته وعلى حد تعبير سماحة الشيخ منة اللّٰه الرحمانى الأمير الرابع للإمارة الشرعية:فكان الذهن الذى يتفكر فى دقائق العلوم والفنون والفكر الذى كان يستخدم فى حل المشكلات العلمية بدأ يتفكر فى قضايا المسلمين فى العالم ومشاكل الهند كان امامه قبل ذلك المدارس وطلبتها وأساتذتها ومسائلهم فبدأ يتفكر فى مسائل كل مسلم فى العالم وكل مواطن فى الهند كان غذائه الفكرى أولا العلوم والفنون المتداولة فبدأ يتفكر فى المسائل الجديدة والقضايا المتولدة كل يوم فى الهند وفى العالم الإسلامى كله وبذلك وجد الشيخ الشىء الذى كان يحتاج إليه بل كان خلق لأجله.(المرجع السابق:١٧)

تأسيس جمعية علماء بيهار:

كان الشيخ رحمه اللّٰه يعتقد فى ضوع دراسته العميقة للكتاب والسنة وبصيرته النادرة أن السبب الوحيد لتخلف المسلمين على المستوى العالمى هو اختلافهم فيما بينهم وجدالهم فى المسائل الفروعية كما كان يعتقد أن قيام الإمارة الشرعية ونصب الأمير وتنظيم شئون المسلمين لازم لبقاء الإسلام والمسلمين فى الهند فى عزة وسعادة يبغيها الإسلام، ولكن العائق الكبير فى هذا السبيل كان اختلافهم فيما بينهم فى المسائل الفروعية والسياسية وكان يحب أن يجمع كلمتهم ويوحد صفوفهم على أساس كلمة

لا إلـه إلا الـلّٰه ولكن هذه الوحدة والتضامن وهذا الوئام والائتلاف كان يتوقف عـلـى اتـحاد العلماء وتضامنهم وكان يقول رحمه اللّٰه:إن وحدة الأمة لا تتحق إلا بـوحدة العلماء فلا بد أن يتحدوا فيما بينهم نابذين جميع الخلافات عرض الحائط، مراعاة لمصلحة الدين لأن العلماء هم الرواد والقواد للأمة الإسلامية فبـذل قـصـارى جهـده لتـوحيد صفوف العلماء وكان من دأب الشيخ أنه كان يـعـقـد كل عام اجتماعا سنويا لمدرسة أنوارالعلوم غيا، فوجه بتلك المناسبة دعوة خاصة إلى علماء الولاية فى أكتوبر ١٩١٧م، وقام بإنشاء جمعية العلماء على مستوى ولاية بيهار وهذا الجهد هو الذى هيأ الجو لتأسيس جمعية علماء الهـند حيث أنشئت بعد عامين من تأسيس جمعية علماء بيهاروكان الشيخ من كبـار دعاتها وأنصارها فأول مجلس استشارى انعقد فى دلهى لإنشاء الجمعية عـلـى مستـوى عـموم الهند كان مشتملا على اثنى عشر نفرا من الشخصيات الإسـلامية البـارزـة فـى الهـنـد وكان المغفور له فى طليعتهم وجعل كل واحد منهم عضوا من الأعضاء المؤسسين لتلك الجمعية بعد إنشائها، وبذلك قد أدى الشيخ دورا هاما فى تأسيس جمعية علماء الهند.

إنشاء الإمارة الشرعية لولايتى بيهار وأديشه:

فـكـمـا أن الشيـخ هيأ الجو لتأسيس جمعية علماء الهند بتأسيس جمعية عـلـماء بيهار كذلك أراد أن يقيم منظمة شرعية باسم"لاإمارة الشرعية"على مستـوى الـولاية أولا لتـوحيـد صـفـوف الـمسـلـمين وتطبيق شريعة اللّٰه على الـمـجتـمـع الإسـلامـى الهـندى ويجعلها مثالاً للهند كلها فبمناسبة الإجتماع الـذى كـانت عقدته جمعية علماء بيهار فى مدينة دربنجه فى ٢٣ـ٢٤/شعبان عام ١٣٣٩ھ، وافـق الـعـلـمـاء الـمشـاركـون فيـه على مشروع إنشاء الإمارة الشـرعية عـلى مستوى ولاية بيهار وكان ذلك قبل استقلال الهند وانقسامها إلـى دولتيـن الهـنـد وبـاكستان وكانت ولاية أُديشه حينذاک جزءاً من ولاية بيهـار وبناء على ذلک القرار قام الشيخ محمد سجاد رحمه اللّٰه بعقد احتفال كبيـر لاختيـار أمير الـمسـلمين للولاية ولإنشاء الإمارة الشرعية تحت رئاسة إمـام الهـنـد الشيـخ أبى الكلام آزاد رحمه اللّٰه بـمدينة بتنا فى ١٨ـ١٩/شوال

١٣٣٩هـ الموافق ٢٥/يونيو عام ١٩٢١م، حضره أكثر من مائة عالم كان أكثرهم من الولاية وبعضهم من خارجها وكانوا يمثلون مدارس فكرية مختلفة وكان عدد عامة المشاركين من الجماهير والشخصيات البارزة العاملين فى مجال السياسة والفلاح الإجتماعى حوالى أربعة آلاف وانتخب المشاركون الشيخ الصالح وعالم الهند الكبير الشيخ بدرالدين رحمه اللّٰه صاحب الزاوية المجيبية بمدينة فلوارى شريف بتنا أميرا أولا للإمارة الشرعية والشيخ أباالمحاسن محمد سجاد رحمه اللّٰه نائب الأمير على تائيد من العالم الربانى الكبير الشيخ محمد على المونكيرى رحمه اللّٰه مؤسس ندوة العلماء بلكناو (الهند)وكان يوما محمودًا مشهودًا فى تاريخ الهند الدينى الذى كان يتطلب من المسلمين تأسيس الإمارة الشرعية ونصب أمير شرعى لهم منذ سقوط حكومة المسلمين فى الهند واستيلاء الإنجليز عليها كليا، وبذلك تحققت فريضة دينية كبيرة تتجه مسئوليتها على السكان المسلمين للبلاد بعد استيلاء غير المسلمين عليها حول نصب الأمير.

فقامت نظام الإمارة الشرعية على قدم وساق، وهذه المنظمة الشرعية أيقظت الروح الإيمانية والعواطف الدينية فى نفوس جماهير المسلمين فى الولاية وأقيمت فيها دارالقضاء الشرعى لفصل خصومات المسلمين طبق الشريعة الإسلامية ودار الإفتاء لإرشاد المسلمين فى شئون دينهم والإجابة على أسئلتهم الفقهية وقسم بيت المال لجمع أموال الزكاة والصدقات وتوزيعها على مستحقيها وقسم تنظيم الإمارة الشرعية لربط كل قرية ومدينة يقتطن فيها المسلمون بالإمارة الشرعية وأربعة أقسام أخرىٰ وهى قسم التعليم وقسم الدعوة والإرشاد وقسم صيانة المسلمين وقسم النشر والتوزيع، وقام الشيخ بجولات واسعة فى كل ناحية من أنحاء الولاية للتعريف بهذه المنطقة الشرعية بين المسلمين وإيضاح أهدافها ومراميها وما يقع على المسلمين من مستوليات تجاهها، وأوصاهم بالرجوع إلى الكتاب والسنة والتمسك بأهداب الشريعة فى كل شعبة من شعب الحياة والرجوع إلى دارالقضاء لحسم خلافاتهم وبذل جهده المستطاع لإنشاء قسم تنظيم الإمارة الشرعية

فـى كل مسكونة وسافر إليها لربطها بالإمارة الشرعية المركزية، والغرض من إنشـاء هـذا الـمـجـلـس الـديـنـى فى كل قرية وبلد، هو الإشراف على شؤون الـمسـلمين والسعى لإصلاح أحوالهم والعودة إلى أحكام اللّٰه وشريعته وأطلق عـلـى كـل مسـئـول ديـنـى يتولى فى القرية أمر هذا المجلس المسمى بتنظيم الإمـارـة الشـرعية لقب"نقيب"طبق التعبير القرآنى ويكون هذا النقيب وسيطا بيـن الإمـارـة الشـرعية وبيـن أهـل الـقـرية ويـقـوم بتبـليغ ما يصدر من الإمارة الشـرعية مـن التوجيهات بين آونة وأخرى إلى أهل القرية ويسعى لتنفيذها مع أعـضـاء الـمـجـلـس الآخـرين، كما يخبر المسئولين عن الإمارة الشرعية عن أحـوال الـقـرية والـمـناطق المجاورة لها ويستشيرهم فيما يهم المسلمين من الـقـضـايـا والـمشـاكـل ويـعـمـل بهـديهم وإرشادهم ويقوم بفصل خصومات الـمسـلـميـن الـمـحـلية إذا وفق لذلک وإلا رفعها إلى دارالقضاء الفرعية فى الـمـديرية أو المركزية والحق أننا إذا أمعنا النظر فى هذا النظام الشرعى الذى أقامه الشيخ لمسنا فيه لمعة من لمعات الخلافة الإسلامية.

وقف الشيـخ حياته كلها بعد إنشاء الإمارة الشرعية منقطعا عن التدريس والأعـمـال الأخـرى وأحـكم قواعدها وبنيانها بتضحياته الجسيمة المتواصلة وأصبحت معروفة مشهورة بين جماهير المسلمين بفضل جهوده وجهاده.

ومما يجدر بالذكر أن ابنه الوحيد الاستاذ حسن سجاد الذى كان تخرج مـن جـامـعة ديـوبند قبل شهور، وكان زميلا لسماحة الشيخ منة اللّٰه الرحمانى وكـان بـلـغ من عمره حوالى خمسة وعشرين عاما، مرض مرضا شديدا وكان الشيـخ يقوم بجولة فى المناطق المتضررة بالزلزال عام ١٩٣٤م ويعمل لإغاثة الـمتـضررين والمنكوبين فى مناطق مديريتى جنبارن ومظفرفور وأصبح مرض ابـنه خطيرا فأرسلت إليه برقيات للعودة السريعة لزيارة ابنه ومعالجته، فأوصى أهـل بيتـه بـمـعالجته فى المستشفى ومنعه اشتغاله بخدمة آلاف من أبناء الأمة الإسـلامية مـن أن يـفـكـر فـى خـدمة ومـعالجة ابنه الوحيد، وعندما وصل إليه رسـول مـن بيتـه أثناء رحلته وهو يخبره أن ابنه فى حالة احتضار، وكان الشيخ أحمد سعيد الدهلوى الأمين العام الأسبق لجمعية علماء الهند رفيقا له فى هذه

الـرحلة فأشار عليه أن يغادر إلى بيته وأصر على ذلک فغادر إلى بيته آنذاک، فـلـمـا وصـل إلـى بيته وجد ابنه أنه يلفظ نفسه الأخير، فألقى عليه نظرة توديع وشـارک فـی تـجهيـزه وتـكـفيـنـه ولا شک أنـه کان مصداقا صحيحا لقول الشاعر الهندى الذى يقول:

بھـونک کـر اپـنـے آشیانے کو

بـخــش دی روشـنـی زمانے کو

يعنی أنه حرق غشه يمنح الزمان الفور والضياء.

خدماته السياسية:

كان الشيخ مع جميع خصائصه التى أكرمه اللّٰه بها يتمتع ببصيرة سياسية أعـلـى، كـماكان ذا اطلاع واسع عميق على قضايا العصر الحديث والسياسية الـعالمية ولكنه دخل فی مجال السياسة فی الأصل لغرض الحفاظ على قوانين الشـريـعة الإسـلامية ولـصيـانتهـا مـن تـدخل الحكومة ولأجل الحصول على الـمـوافـقة عـليهـا مـن الـحـكـومة ومنحها الحفاظ والصيانة دستوريا وقد قام بتـكـويـن حـزب سيـاسـی مستـقل باسم''الحزب الحر''تحت إشراف الإمارة الشـرعية ولـكن لما ذا أقدم على تكوين حزب مستقل للمساهمة فی السياسة والـعـمـل لـصـالح المسلمين؟لأنه جرب طويلا أن الأحزاب السياسية الهندية الـمعروفة التى تتهيأ لتمثيل المسلمين إنما تعود لعية بعد قليل فی أيدى تلک الأحـزاب وهـی لاتستطيع أن تنحرف عن مواقفها المحددة قيد شبر وبذلک تـكـون عـاجـزة عن التمثيل الصحيح للمسلمين والتوصل إلى الحل الصحيح لـقـضـايـاهـم ومشاكلهم فلذلک قام بتكوين حزب مستقل للمسلمين كحل لهذه المشكلة.

وعـلـى كـل حـال فسـاهـم ذلک الحزب الحر فی الإنتخاب وكلل اللّٰه سـعيه بالفوز والنجاح وقدر له أن يشكل وزارة وحكومة فی ولاية بيهار، وكان سـاعـده الأيـمـن فـی تـلـک الـحـكـومة تلميذه الرشيد فضيلة الشيخ منة اللّٰه الـرحـمـانی(الذى انتخب أميرا رابعا للإمارة الشرعية بعد مدة)وان ماقامت به هـذه الـوزارـة مـن الخدمات لصالح الملة الإسلامية والإنسانية ولصالح اللغة

الأردية فهو تذكار تاريخى يذكر على مر العصور والأجيال.

جملة القول: أن ما قام به الشيخ محمد سجاد رحمه اللّٰه من الخدمات المخلصة فى مجال العلم والدين والسياسة والإجتماع ستعد من الباقيات الصالحات وصدقة جارية له عنداللّٰه، وصفحة بيضاء من التاريخ الإسلامى فى الهند، ولكن تأسيس الإمارة الشرعية من أبرز خدماته وأهم مآثره وسوف تبقى إلى يوم القيامة بإذن اللّٰه ترشد المسلمين فى الهند بل فى جميع الدول والحكومات الغير الإسلامية التى يعيش فيها المسلمون كأقلية ومن واجب الأقليات الموجودة فى دول غير إسلامية وحكومات علمانية أن تجعل هذه المنظمة الشرعية مثالا لها فتقوم بتنظيم أعمالها طبق هذا النظام الإسلامى المنقطع النظير وأن تختار لنفسها أميرا ينفذ عليهم أحكام اللّٰه وينصب لهم القضاة المسلمين لفصل نزاعاتهم طبق كتاب اللّٰه وسنة رسوله صلى اللّٰه عليه وسلم وليس هناك نظام أحسن من هذا فيما أظن لتنظيم شؤون المسلمين وجميع كلمتهم وتنفيذ شريعة اللّٰه على المجتمع المسلم الذى يعيش فى دول غير إسلامية وللحفاظ على الشعائر الإسلامية فى بلاد غير إسلامية.

وحقا كان هذا العمل العظيم المبارک مسک الختام لخدماته الجليلة وجهوده المخلصة وكفاحه الطويل، إنه قام وحده بخدمة جبارة لاتقوم بها جماعات وله بذلک منة كبيرة على الشعب المسلم الهندى وبمثل هذه الحياة الحافلة بالخدمات والبطولات قضى العلامة محمد سجاد رحمه اللّٰه عمره وسجل له خلودا منقطع النظير فى تاريخ الهند الإسلامى وانتقل إلى رحمة اللّٰه فى ١٧/شوال عام ١٣٥٩ھ الموافق ١٨/نوفمبر ١٩٣٠م.

رحمه اللّٰه رحمة واسعة وغفرله زلاته وأسكنه فسيح جناته

مختصر روداد

مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجادؒ و مؤرخ ملت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ سیمینار

(منعقدہ ۱۵، ۱۶ دسمبر ۲۰۱۸ء، بہ مقام دہلی)

مفتی اختر امام عادل قاسمی
مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف سمستی پور

جمعیۃ علماء ہند نے اپنی صد سالہ تقریبات کی مناسبت سے یہ تاریخی فیصلہ لیا کہ جمعیۃ کے بانیان اور اہم معماروں پر سیمیناروں کا انعقاد کیا جائے؛ تاکہ ان کی روشن زندگیوں سے کچھ کرنیں اگلی صدی کے لئے محفوظ کی جائیں اور ماضی کی روشنی میں مستقبل کا سفر شروع کیا جائے، نیز اس کا بھی جائزہ لیا جائے کہ وہ کیا حالات تھے جن میں اس کام کی شروعات کی گئی تھی اور آج ایک صدی گذرنے کے بعد ہمارے سامنے کیا حالات ہیں؟ آج کے حالات کا تقاضا کیا ہے؟ آج اس کام کو نئی جہتوں اور نئی بلندیوں سے آشنا کرنے کی ضرورت ہے۔اوہ ان قدسی صفات معماروں کے لیے خراج عقیدت بھی پیش کیا جائے، جن کے صدق وخلوص کی طاقت اور مقرر کردہ خطوط کی بدولت ہم ایک صدی کا طویل سفر مکمل کر سکے، جب کہ اس دوران کتنی ہی تنظیمیں، جماعتیں اور ادارے وجود میں آئے اور راستے میں ہی بے نشان ہو گئے۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ سیمینار کی علمی ذمہ داری اس حقیر راقم الحروف کو دی گئی تھی اور حضرت مولانا محمد میاں دیوبندی سیمینار کی ذمہ داری مولانا ضیاء الحق خیر آبادیؒ کے حوالے کی گئی۔کئی ماہ قبل سے سیمینار کی تیاریاں شروع کی گئیں، مختلف مقامات کے اسفار کئے گئے، اصحاب علم وقلم سے رابطے کئے گئے، مطبوعہ، غیر مطبوعہ، نئے پرانے، دستیاب، کمیاب اور نایاب ایک ایک تحریر تلاش کی گئی، مواد کی تلاش میں شہروں اور دیہاتوں کی خاک چھاننی پڑی، بڑے چھوٹے کتب خانوں میں ہفتوں ورق گردانی میں صرف ہوئے، پوری وسعت نظری کے ساتھ موافق ومخالف ہر ایک کو دعوت قلم دی گئی، الحمداللہ ذمہ داروں کے صدق وخلوص اور کارکنوں کی جہد وکاوش کے اچھے اثرات مرتب ہوئے، الحمداللہ پورے ملک میں اس پروگرام کا استقبال کیا گیا، کسی حلقہ سے بھی اس کی مخالفت کی کوئی آواز نہیں اٹھی، یہ اس سیمینار کی سب سے بڑی

کامیابی تھی، پھر مقررہ تواریخ پر جب سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا تو ملک کے ہر خطہ اور ادارہ کی نمائندگی شامل ہوئی، حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ پر تقریباً پینتالیس (۴۵) اور حضرت مولانا میاں صاحب پر چھتیس (۳۶) اہل قلم نے اپنے مقالات قلمبند فرمائے، علاوہ ملک کے نامور قائدین اور ملی رہنماؤں نے زبانی طور پر خراج عقیدت پیش فرمائے اور ان بزرگوں کو ملت کا عظیم سرمایہ قرار دیا اور جمعیۃ علماء ہند کو دل کھول کر مبارکباد پیش کی۔۔۔۔اس دن دہلی کے اردو اخبارات میں ''ہمارا سماج'' نے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ پر اور روزنامہ ''صحافت'' نے حضرت مولانا میاں صاحب پر خصوصی گوشے شائع کیے، جس میں ملک کے مؤقر اہل قلم کے مضامین شامل تھے۔اس سیمینار کی تین نشستیں ہوئیں:

افتتاحی نشست:

افتتاحی نشست ماؤلنکر پیلس رفیع مارگ میں ہوئی، جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے، وسیع وعریض ہال اوپر نیچے انسانوں سے بھرا ہوا تھا، جن میں زیادہ تر اہل علم تھے، اس نشست کی صدارت حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری صدر جمعیۃ علماء ہند واستاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے فرمائی، پروگرام کی نظامت مولانا محمود اسعد مدنی ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند، مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری استاذ حدیث ومفتی مدرسہ قاسمیہ شاہی مرادآباد اور مولانا عفان منصور پوری صدرالمدرسین مدرسہ امروہہ نے مشترکہ طور پر انجام دی۔ اس نشست میں بہت سی اہم شخصیتوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان بزرگوں کی شان میں خراج عقیدت پیش کیا، حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ کو جمعیۃ علماء ہند کے لیے بنیاد کا پتھر قرار دیا تو حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ترجمان جمعیۃ۔حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب نے فرمایا کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حضرت مولانا محمد سجاد کو فقیہ النفس کہتے تھے۔مولانا انیس الرحمٰن قاسمی ناظم امارت شرعیہ پٹنہ نے کہا کہ حضرت مولانا محمد سجادؒ نے ۱۹۱۷ء میں انجمن علماء بہار کے نام سے جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد ڈالی، انہوں نے یہ بھی کہا کہ اتحاد بین العلماء والمسلمین کے لیے ہمیں اپنے بزرگوں سے سبق لینا چاہیے۔مولانا سید محمود اسعد مدنی صاحب نے فرمایا کہ اکابر پر سیمینار کا مقصد نئی نسل کو ان کی ملکی وملی خدمات سے روشناس کرانا ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع الحسنی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے مرسلہ تحریری پیغام میں فرمایا کہ ان سیمیناروں سے نئی نسل کی صحیح رہنمائی ہوگی۔

پروفیسر اختر الواسع صاحب صاحب نے کہا کہ اپنے محسنوں کو یاد رکھنا چاہیے؛ تا کہ نئی نسل مستقبل کی راہ کا تعین کر سکے،۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے عہد حاضر میں فکر سجاد کی معنویت پر روشنی ڈالی،۔۔۔ مفتی عتیق احمد بستوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے مولانا سجاد کی فقہی اور قانونی بصیرت پر اپنا مقالہ پیش کیا، اور اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ سمینار صرف ماضی کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے نہیں ہے؛ بلکہ سو سالہ سفر میں جو حالات پیش آئے ہیں، اس کی روشنی میں نئی منصوبہ بندی کی جائے گی۔ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے حضرت مولانا میاں صاحب کی کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' پر علمی تبصرہ پیش کیا۔ مولانا سید ساجد میاں ابن مولانا محمد میاں صاحبؒ نے بھی اپنے والد ماجد کی شخصیت پر اپنا تفصیلی مقالہ پیش فرمایا۔۔۔ مولانا ندیم الواجدی صاحب نے مولانا محمد میاں کی شخصیت پر مقالہ پیش کیا، پاکستان کے معروف عالم دین اور رکن اسمبلی مولانا عطاء الرحمٰن صاحب نے کہا کہ گرچہ تقسیم وطن کے بعد خطے بدل گئے ؛مگر نظریات کی تقسیم نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے جمعیۃ علماء ہند پر اپنی جاندار نظم پیش کی، ان کے علاوہ مولانا سفیان احمد قاسمی مہتمم دار العلوم وقف دیوبند، مولانا عبد اللہ معروفی استاذ دار العلوم دیوبند، ڈاکٹر ابوبکر عباد دہلی یونیورسیٹی، مولانا اسعد محمود رکن قومی اسمبلی پاکستان، مولانا رحمت اللہ کشمیری رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند، مولانا عبد الشکور رکن قومی اسمبلی پاکستان وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ حقیر راقم الحروف نے بھی بحیثیت کنوینر کلمات تشکر پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ آج سے ایک صدی قبل ۱۵؍دسمبر ۱۹۱۷ء ہی کی تاریخ کو مدرسہ انوار العلوم گیا میں جمعیۃ علماء بہار کی تاسیس عمل میں آئی تھی، ایک صدی کے بعد پھر ۱۵؍دسمبر ہی سے صد سالہ تقریبات کا آغاز کر کے ارباب جمعیۃ نے ماضی سے اپنی وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی نے بھی اپنے کلمات تشکر میں اکابر جمعیۃ کی پر عزیمت تاریخ کا ذکر کیا۔

دوسری نشست:

دوسری نشست بعد نماز مغرب شروع ہوئی، اور تقریباً پانچ گھنٹے چلی، یہ نشست حضرت مولانا سجادؒ کے لیے مخصوص تھی، اس نشست کی صدارت مولانا رحمت اللہ کشمیری نے کی اور نظامت کے فرائض راقم الحروف (اختر امام عادل قاسمی) نے انجام دیئے، اس نشست میں تقریباً سینتیس (۳۷) اصحاب قلم نے اپنے مقالات کی تلخیص پیش کی، جن میں خاص طور پر قابل ذکر حضرات کے اسماء گرامی ہیں:

ڈاکٹر سعود عالم قاسمی سابق ڈین فیکلٹی دینیات مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ، ڈاکٹر کفیل احمد ندوی

(بہارشریف)، مولانا عبدالحمید نعمانی جنرل سیکریٹری مسلم مجلس مشاورت، ڈاکٹرفہیم اختر ندوی صدرشعبہ اسلامیات مولانا آزاد یونیورسیٹی حیدرآباد، مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، جناب ایس، ایم شرف صاحب متولی اعظم صغریٰ وقف اسٹیٹ بہارشریف، مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند، مفتی سعیدالرحمٰن صاحب مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، مولانا محمد نوشاد نوری استاذ دارالعلوم وقف دیوبند، مفتی محمد سلمان منصورپوری مفتی مدرسہ شاہی مرادآباد، مفتی خالد حسین نیموی استاذ مدرسہ بدرالاسلام بیگوسرائے، پروفیسر شکیل احمد قاسمی چیرمین فاران انٹرنیشنل فاؤنڈیشن، مولانا مفتی اشرف عباس قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند، مولانا صفدرزبیرندوی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی، مولانا شمشاد رحمانی استاذ دارالعلوم وقف دیوبند، اورمولانا محمد قاسم صاحب صدر جمعیۃ علماء بہاروغیرہ۔

تیسری نشست:

تیسری نشست ۱۶؍دسمبر ۲۰۱۸ء کوصبح ۹؍بجے شروع ہوئی اوردن کے ایک بجے تک جاری رہی، جس کی صدارت جناب مولانا محمد اشہدرشیدی صاحب مہتمم مدرسہ قاسمیہ شاہی مرادآباد نے کی اورنظامت کے فرائض مولانا ضیاء الحق خیرآبادی نے انجام دیئے۔

اس نشست میں تقریباً تیس (۳۰) اہل علم نے اپنے مقالات کا خلاصہ پیش کیا، جن میں خاص طور پرحضرت مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مفتی جمیل احمد نذیری ناظم مدرسہ عین العلم مبارکپوراعظم گڑھ، مولانا مفتی محمد سلمان منصورپوری استاذ حدیث ومفتی مدرسہ شاہی مرادآباد، مولانا محمد ندیم الواجدی (دیوبند)، مولانا فضیل ناصری استاذ جامعہ الامام انوردیوبند، مولانا فیصل بھٹکلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا اسجد قاسمی (مرادآباد)، نمائندہ مولانا واضح رشید ندوی معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مفتی ریاست علی رامپوری استاذ مدرسہ اسلامیہ امروھہ، وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب دامت برکاتہم کی دعا پر یہ مجلس اختتام پذیر ہوئی۔

اس طرح ماشاء اللہ سیمینار بے حد کامیاب رہا اور پورے ملک سے اس کونمائندگی حاصل ہوئی۔ (فالحمد و المنة لله)